

लाल बहादुर शास्त्री राष्ट्रीय प्रशासन अकादमी

L B.S. National Academy of Administration

मसूरी

MUSSOORIE

पुस्तकालय

LIBRARY

अवाप्ति संख्या

Accession No.

18207

वर्ग संख्या

Class No.

U

891.43905

पुस्तक संख्या

Book No.

Afk

No- 164-166



قومی ترقی میں معاون

فراخ دلی سے
قرضے دیے
چھوٹا کاروبار کرنے والوں
کی مدد
کرتا ہے

افکار - فیض نمبر



اعلیٰ معیار خدمت ہم بھی رکھتے ہیں

صنعتی ہو ————— بہت ارق ہو ————— یا شخصی

اسٹینڈرڈ

ہمیشہ ہی آپ کو بہت کم کی سہولت دیتے اور

بنکاری

کی بہترین خدمت مہیا کرنے کیلئے کا خیال رکھتے

ہم کی شاخیں مشرق وسطیٰ پاکستان بھوش پیمیں ملتی ہیں،

اور بنائے دنیا کے تمام اہم تجارتی مراکز میں موجود ہیں۔

اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس —

مقامی ہاؤس

میکلوڈ روڈ

کراچی



جب آپ ڈالدا کا انتخاب کرتی ہیں...

خدا ان بچہ کو منتخب کرے کہ وہ سب سے زیادہ اچھا ہو
اور اس کے بعد وہ سب سے زیادہ اچھا ہو
یہ سب سے زیادہ اچھا ہو
یہ سب سے زیادہ اچھا ہو

...کہ جب آپ ڈالدا کا انتخاب کرتی ہیں...

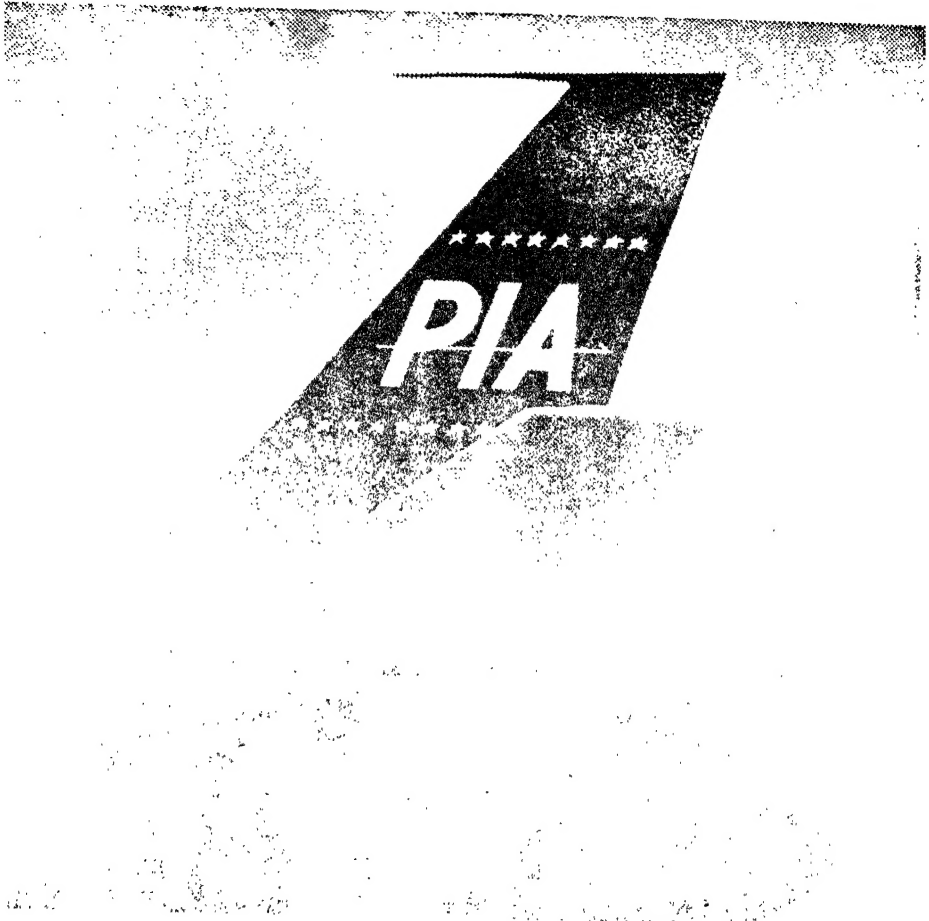
...کہ جب آپ ڈالدا کا انتخاب کرتی ہیں...



امی اور ڈالدا
...خاندان بھلا پنکا

نیو بیل ورلڈ کا دایا ہوا





پیشانی

پاکستان
ایئر لائنز

باکمال لوگ
لاہواب پرواز

[illegible]

وہی جواب ہے۔
 کہہ دے کہ میں نے اس کو سنا ہے کہ وہ ایک بڑا بڑا آدمی ہے۔

پر مسرت تقریبات کے لئے



برائے مہربانی اپنے ہم راہ راشن کارڈ ضرور لائیے

افکار - فیض نمبر

ٹریٹ کی دسویں سالگرہ



سبقت کے 10 سال

اب سے دس برس پہلے پاکستان میں پہلا ریزر بیڈ تیار ہوا۔ اس کا نام تھا ٹریٹ — ٹریٹ بیڈ کی روداد وہیں سے شروع ہوئی ہے جس کا ہر ورق محنت، استعداد اور مستقل مزاجی سے عبارت ہے۔ ان دس برس میں مسلسل تحقیق اور ان تھک کوشش کے نتیجے میں ٹریٹ کے انجینئرز شیو بنانے والوں کیلئے بہتر سے بہتر بیڈ پیش کرتے رہے۔ ٹریٹ بیڈ کی بال سے بھی باریک دھار عمدہ ملائم اور آرام دہ شیو بنانے کیلئے مشہور ہے۔ بیڈ سازی کے میدان میں جب سے انک ٹریٹ ہمیشہ پیش پیش رہا ہے اور یہ سبقت اب تک قائم ہے۔ اس صنعت میں بہتر بیڈ بنانے کیلئے جب بھی کوئی نئے گڑھاں دے تو یہ بہتر بیڈ سب سے پہلے ٹریٹ ہی پیش کر چکا۔ تحقیق کا عمل ترقی کی منزلیں دونوں لامحدود ہیں اور اسی صورت ٹریٹ کی کاوش اور کامیابیاں بھی۔

ہر چہرے کیلئے موزوں **ٹریٹ**

آزمودہ کوالٹی آزمودہ نام



وزیر صحت ایڈمنسٹریٹو لمیٹڈ - پی او بکس نمبر ۴۲۰۹، ویسٹ واران، کراچی

ریڈیو

مسئلہ تحقیق جاری رہی ہے۔ آج فلمیں کی لیبارٹریز میں... ۳۰۰ سے زائد آئندہ ان سلسلے میں معدودہ فلموں کی تصنیف کی گئی ہے۔ ان کی ایجادات اور مصلحتات سے تمام دنیا میں فلمیں کی ریڈیو ٹیکنیک میں ترقی آگئی ہے۔ اور اپنے ریڈیو کی برتری پرستار رکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

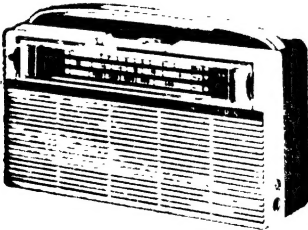
فلمیں برائڈر: فلمیں کامیاب پہچاننا آپ کے لئے زندگی کی ضمانت ہے پاکستان اور دنیا میں فلمیں ریڈیو کی برتری ہونے لگیں۔ حقیقت کی تصدیق کرتی ہے فلمیں کی مصنوعات دنیا کے ۱۲۵ ممالک میں فروخت ہوتی ہیں اور لاکھوں لوگ صبح و شام ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں دنیا کا مہذب ترین ٹرانزسٹر ریڈیو آج ہی اپنے نزدیک ترین فلمیں ڈیڑے کے پاس دیکھئے۔

جواب سہل ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کیا یہ نام مشہور و معروف ہے؟ کیا یہ فلمیں ہے؟ اور فلمیں، یہ کیوں؟ فلمیں اس لئے کہ یہ نام صد فیصد لاجواب کارکردگی کی ضمانت ہے فلمیں اور ریڈیو دو جدا چیزیں نہیں کیونکہ فلمیں کی لاجواب کو انٹی۔ ریسرچ اور شہرہ آفاق مقبولیت نے اس نام کو ۳۸ سال میں بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔

فلمیں کو الٹی۔ بریڈیو کی ساخت میں فلمیں کہیں ایک نمایاں حیثیت کی مالک ہے ان کا پسند ریڈیو شہرہ آفاق میں فروخت ہوا۔ اس کے بعد آج تک فلمیں کے ہائی ٹیکنیکل فن کی مسلسل جدوجہد میں مصروف رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے وہ آج آپ کو دنیا کا بہترین اور لائق ٹرانزسٹر ریڈیو پیش کر رہے ہیں۔

فلمیں ریسرچ بر فلمیں کے ریڈیو لائف ہیں۔ کیونکہ ان کو بر لحاظ سے پیتا اور نیکل بنائے گئے تھے

عملہ ٹرانزسٹر ریڈیو
خریدتے وقت آپ
رکن بالتوں کا خیال
رکھتے ہیں؟



یہ نشان اس امر کی ضمانت ہے کہ فلمیں کی مصنوعات

فنی اعتبار سے برتر۔ بلحاظ ساخت لائق۔ قیمت میں مناسب اور انتہائی دیرپا ہیں



آپ

اور اس کا مستقبل

آپ کے بچے کا مستقبل آپ کی اہم ذمہ داری ہے۔
اپنے بچے کے لئے ایک ایسے مستقبل کی فکر کیجئے جس میں
تعلیم، مکان، علاج اور دیگر بنیادی ضروریات کی ضمانت ہو سکے۔
ہر ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز کیجئے اور جلیب بینک
میں جمع کرتے جائیے

فیملی سیونگ اکاؤنٹ کی خصوصیات :-

- ★ صرف پانچ روپے سے اکاؤنٹ کھولا جاسکتا ہے
- ★ پچاس ہزار روپے تک ہر ماہ فیصد منافع
- ★ ادائیگی بذریعہ بینک

آج ہی

جلیب بینک میں فیملی سیونگ اکاؤنٹ کھولئے

جس مشرقی و مغربی پاکستان میں

سے نامہ نشانیں ہیں۔

جلیب بینک

کو بہتر خدمت کا موقع دیجئے

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ
جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ۵ جون ۱۳۹۹ھ

افکار

فیض مبر

مرتبہ
صہبیا لکھنوی
کشش صدیقی

قیمت
بارہ روپے



زوسالانہ
بارہ روپے

مکتبہ افکار
راہ بسن روڈ کراچی

لندن ۱۱ منہ

۱۔ دیورلے کورٹ۔ برائڈس بری پارک۔ لندن۔ این۔ ٹیلیو۔ ۶

تلوک چہند محروم

کلام فیض

گھڑی حکیم — جناب فیض احمد فیض کی ادبی خدمات کے متعلق کچھ
کہنا سوجھ کو چراغ دکھانا ہے۔ اردو شاعری کے مدرجہ پر فیض کا نام ایک
اعتباری حیثیت حاصل کر چکا ہے اور ان کے کلام کی حسن قدر اور حسن طریقے سے قدر انداز
کی جائے دل کو تحسین تسلی ہے۔ ان کا دارِ فیض مغربہ وستان پاکستان اور دکن
میں یقیناً مقبول ہو گا۔ میری بیاض میں دو شرح ایک قطعہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۵ء
تاریخ کے ساتھ مرقوم ہے۔ یعنی میں ان کا پیرانا ملاح ہوں۔ وہ قطعہ یوں ہے۔

کلام فیض مثال نگاہ خوش پشماں
نوائے راز بھی ہے اور شرح راز بھی ہے
ملے نہ کیوں دل اہل نظریں جا اس و
کہ دل نواز بھی ہے اور دل گذار بھی ہے

نیا رنہ منور چہند محروم
14.1.65



سکونت : عزیز کارنامہ شیطانی مارنگ نیوز

غیر مطبوعہ عکس خطوط

(۱۳)

(ادیب کے نام)

۵۹	عبدالرحمن خٹمان	سلام پھیل شہری
۶۰	حمید اختر	احسان بی بی قاسمی
۶۱	اجدر قادری	ڈاکٹر عیادت ربیوی
۶۲	نسیم سیہ	دربت لدھیانوی
۶۳	ابراہیم طیس	صہب رحیموی
۶۴	ایک دعوت نامہ

غیر مطبوعہ خطوط

(۵)

(ادیب کے نام)

۶۵	جیل کی ساخت سے	فیض
----	----------------	-----

گلشن دہیار

(۹۳)

(نایاب اور تاریخی تصاویر)

۹۵	ایک تصویر مطالعہ	فیض کے نن گلشنیت
----	------------------	------------------

کلام فیض ۱۳

۱۹ اشعار

۲۰ قلمی انجمن پندار

۲۵ فیض احمد فیض مستند حالات

جسٹ منقول

(۱۴)

(۱) دروید وگرتا زرد و غیر مطبوعہ

۳۰ آواز نام اور خاکے علم نام

۴۰ نسیم لب

۴۱ سہرا

۴۳ لے و من

۴۴ تین گیت

۴۵ شام غم

۴۶ دو یادگار نظمیں

۴۹ فلکات

۵۱ بچوں کے لئے

۵۵ دو طنز

موضوع سخن

(پیغامات و آثار)

سورہ جعفری	۱۹۰	نکھو کی ایک رات
حمید اختر	۱۹۷	فیض شخصیت کی چمچیلیاں
شیر محمد حمید	۲۰۳	فیض، آئینہ خاستہ میں
فقیر سنیل ویدالدین	۲۲۱	فیض، ایک دستِ ایکٹ اختلا
حمید نسیم	۲۲۷	کد فیض صاحب کے بانیہ میں
'اغا' افتاب قریشی	۲۳۱	پیامِ آشتیا گویم
انور عظیم	۲۴۱	ماسک کی ایک رات
نصیر احمد زبیری	۲۴۲	پیکر سولائیہ فیض کی بے نقاب
شعیب منفی	۲۴۳	فیض احمد فیض چند ناویہ
سبط فاروق	۲۵۱	شاعرِ بحر
محبوبہ اللہ محیب	۲۵۷	فیض الہ آباد میں

ذکر یار

(۳۸) ہم عصر شعراء کے نذر نے

سعود اختر جناب	۲۶۷	نشانِ مستقبل
الطاف شہدہ	۲۶۸	فیض، میرا ساتھی
سلام مچھلی شہری	۲۶۹	فیض، ایک چراغِ فکر
رفعت سوشی	۲۷۱	رفیقِ منزل
فارغ بجاری	۲۷۲	شاعرِ عصر
فضا ابن فیضی	۲۷۳	آہوئے رما
نریش کمار شار	۲۷۵	فیض
ستیا فیضی	۲۷۶	فقرِ خیراوی
شینہ رومانی	۲۷۷	سفرِ درد
ادیبہ سہیل	۲۷۸	فیض ڈھلے کی
جوہر سمیدی	۲۷۹	اک دیدہ بیدار
جزیرہ لہریا نوی	۲۸۰	فیض احمد فیض
قمر ہاشمی	۲۸۱	شاعرِ وہاں
عبد الرؤف عمر	۲۸۲	روشنی کی آواز

جوش ملیح آبادی	۱۱۵	جوشِ ایں اسے جن
بیگم شائستہ اکرام اللہ		ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ہمت علی رحمانہ		پروفیسر آل احمد سور
ڈاکٹر ابوالکلام صدیقی		ڈاکٹر مسعود حسین خاں
ڈاکٹر ستیا مہدیشہ		ڈاکٹر گیان چند جین
شانہ الحق حق		مہرج سلطان پوری
ڈاکٹر محمود الہی		عید الرحمن خٹک
ستیا الطاف علی بریلوی		پشپا کمار بریار
عشرت ملیح	۱۱۷	خوش کا شیری
پرونیو سلاستہ خاں		سید عتیق
میر رسول بخش تالپور		ڈاکٹر عید اوحید
نارم سیتا پوری		محمد عتیق صدیقی
ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ		ڈاکٹر اکرم الیٰ خٹک خلیل خاں
ماہر القادری		محمد طفیل
الطاف حسن قریشی		امریک آنند
شعیب کنولہ		تمج سعید
کوشش چندر	۱۵۰

محبوبِ نظر

(۱۶) زندگی و شخصیت

ایلس فیض	۱۵۹	یادوں کے سائے
سقا وظہیر	۱۶۳	شخص دیکھ
شاہد احمد دہلوی	۱۷۰	فیض صاحب
ڈاکٹر ملک راج آنند	۱۷۵	فیض، ایک پیرائے شخصیت
ڈاکٹر عبدت بریلوی	۱۷۹	چند یادیں چند اشعار

۲۸۳	انتظار	۲۵۷	علی عباس صبیحی	۲۵۷	شاعر عامل
۲۸۴	ای نثر نگار	۲۶۱	شاد عارفی	۲۶۱	نغان نامہ پر ایک نثر
۲۸۵	البیلا فن کار	۲۶۵	ڈاکٹر مسعود حسین خانہ	۲۶۵	تار حریر دورنگ
۲۸۷	شاعر رنگین نوا	۲۷۳	جسٹس جلالی	۲۷۳	فیض ایک تقابلی مطالعہ
۲۸۸	فیض تنزیہات	۳۹۹	سید ابوالغیر کشفی	۳۹۹	وقت بقول فراہی ہم او میں
۲۸۹	بشارت	۴۱۹	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۴۱۹	فیض کی غزل
۲۹۰	عزم جذب دروں	۴۲۴	انجم اعظمی	۴۲۴	فیض کی داخلیت پسندی
۲۹۱	فیض بڑا فن کار	۴۳۰	دکتر میری اسحق محمد	۴۳۰	فیض میری نظریں
۲۹۱	اندھیری رات کا چراغ	۴۳۵	احمد علی خاں	۴۳۵	فیض ایک صحافی
۲۹۲	پرستار امن	۴۳۸	فضیل جعفری	۴۳۸	فیض کا اسلوب شاعری
۲۹۲	وہ شعلہ بیان وہ شعلہ نغمہ	۴۴۴	برگینڈی برنگزار احمد	۴۴۴	مرکز و استا ہے فیض
۲۹۳	فیض	۴۴۷	ابن فرید	۴۴۷	فیض کی شاعری چند نمونے
۲۹۴	شوکت عابدی	۴۵۶	سحر انصاری	۴۵۶	فیض ایک نثر نگار
۲۹۴	رشید احمد شاری	۴۶۷	اختر حیات	۴۶۷	فیض کے دوست
۲۹۵	رضا ہدائی	۴۷۹	کشمیری لالہ ذاکر	۴۷۹	فیض کی شاعری میں ہر ایک قصہ
۲۹۵	نیل راجپوری	۴۸۳	ماہر القادری	۴۸۳	فیض کی شاعری اور بیانِ خیال
۲۹۶	عبد اللہ علیم	۴۹۲	ڈاکٹر طلحہ حسنین	۴۹۲	فیض کی شاعری پس منظر پر نظر
۲۹۶	احمد وحید اختر	۵۱۰	اظہر قادی	۵۱۰	فیض غم جاناں غم دورانِ یک

تذکرہ و تنصیحات

(۱۳) (مختصر و جامع)

۵۲۱	پروفیسر علی خورشید کفری	۵۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۵۲۱	پروفیسر ذوق گورکھ پوری	۵۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۵۲۱	کلیم الدین احمد	۵۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۵۲۱	عزیز احمد	۵۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۵۲۱	عابد علی عابد	۵۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۵۲۱	عبدالرحمن حقیت	۵۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۵۲۱	احمد ندیم قاسمی	۵۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی

بارش سنگ

(۲۵) (تذکرہ و تنصیحات)

۳۰۳	فیض کی انفرادیت	۳۰۳	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۰۹	فیض کی شاعری اور نثر	۳۰۹	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۱۵	دل پر خون کا بہرہ تو دیکھو	۳۱۵	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۲۱	فیض کا فن شاعری	۳۲۱	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۲۸	فیض کی شاعری اور نثر	۳۲۸	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۳۹	شاعر محبت شاعرانیت	۳۳۹	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۵۲	شاعر حیات و کائنات	۳۵۲	پروفیسر رشید احمد صدیقی

فیضے اور نئے نسل

(۳) (مطالعہ و تجاویز)

فیض احمد فیض	۶۸۷	داغستان میں چند روز
"	۶۹۵	ایک یادگار تقریر
"	۶۹۷	شعریں انہماق و ترجمانی
"	۷۰۰	آہنگ
"	۷۰۲	کچھ ڈراموں کے بارے میں
"	۷۰۶	چند روز اور
"	۷۰۹	کچھ رنگ و رنگ کے بارے میں

۵۲۷	مقدم کے کھیت بچوں کے ہاتھوں پر	اضافہ الرحمت
۵۴۳	فیض فکر و فن کے آئینے میں	امجد گنت باقی
۵۵۰	فیض احمد فیض اور ان کی شاعری	ساحرائے آبادی
۵۵۵	فیض کی شخصیت شاعر کی نظر میں	نغمہ تفتہ

لوٹ و تلم

(۴) (انتخابی کلام)

(۱۰) (افسانہ و فکاہیہ)

ابراہیم جلیس	۷۲۳	سبک بیز فیض
اجڑے افسانے	۷۲۶	فیض صاحب اور میں
کوثر بیات پوری	۷۲۹	مرے در پیکیں
یونس رحمتی	۷۳۳	نشاں تری نظیروں پر
جنتیم منیم احمد	۷۳۶	سازگاری میں بن کا ذکر نہیں
سجاد ظفر	۷۴۰	تاریک راہوں میں مارے گئے
ذکا الرحمت	۷۵۱	دروازے کا وہ پیاؤں
رجعت	۷۶۱	خدا وہ وقت ڈالے
کنہیا لال کپور	۷۶۰	تہائی (پیر و عی)
نیزا ابوالبرکات نظم	۷۶۷	پاس رہو (۷۷)

۵۹۳	نفس فریادی	فیض
۵۸۸	دستِ صبا	"
۶۱۸	زندان نامہ	"
۶۳۸	دستِ تہہ رنگ	"

حرفِ سادہ

(۱۱) (مفتاح میں فیض)

۶۶۷	لڑن میں ایک مضافہ	فیض - عبادت
۶۷۵	فن کار اور ترقی پذیر معاشرہ	فیض احمد فیض
۶۷۸	حدیثِ زمیں	"
۶۸۳	پاکستان کہاں ہے؟	"

فیض نمبر کے جملہ مضامین نظم و نثر کا حق و اشتیاق سے محفوظ ہے
تمام تحقیقات بنیاد و راستہ کا صلہ و حکمت کی گنجینہ ہیں
اور یہ سہل بارش شاعری ہو رہی ہیں

اکیسواے سالہ

(اپریل - مئی - جون ۱۹۶۵) شمارہ : ۱۶۷ - ۱۶۵ - ۱۶۶

مطبوعہ : جمہور دانش پبلیکیشنز کراچی دفتر : رابن روڈ لاہور فون : ۷۳۵۹۳

مدیر ناشر : اشیا لکھنوی

اشارے

— اور اب "فیض نمبر" پیش خدمت ہے !

زندہ و باکمال شخصیتوں کے اعتراف عظمت کی جس نئی روایت کا آغاز افکار نے "جوش نمبر"

سے کیا تھا، وہ "فیض نمبر" تک، آگے پہنچا۔

افکار کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے نامساعد حالات اور بے وسایلی کے باوجود اس صدی کی تین عہد آفرین شخصیتوں — جوش علی آبادی، حفیظ جانا بھڑو اور فیض احمد فیض کی زندگی، شخصیت، اور فن پر جامع و مستند خصوصی اس غنیمت پر پیش کر کے اردو زبان و ادب کی نئی تاریخ مرتب کی۔ یہی نہیں، اس نے ان عظیم فن کاروں کو ان کے بیٹے جی خزانہ تیس ادا کر کے "مرزا پرستی" کی اہانت پر کاری ضرب لگائی، اور انہیں ناقہ ری کا شکار ہونے اور خصوصی اشاعتوں کے لئے سوئے گئے انتظار کی رشت سے ہی بچا لیا۔ اس بے نام سعی و کوشش کا ایک روشن و تاریک پہلو یہ ہے کہ زندہ مشہور علم و ادب کی قدر دانی اور اعتراف کمال کی رسم اب کسی نہ کسی زبان میں پڑی ہے۔ — علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی اردو اور پاکستان سے لے کر کچھ کم یا عثِ محترمہ و استنان نہیں کہ "جوش نمبر" "حفیظ نمبر" اور "فیض نمبر" سے قبل دنیا کی کسی بھی زبان میں — کسی بھی زندہ و باکمال شاعر پر اتنی عظیم و پُر شکوہ ستائشیں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہوں۔ خدا سے بڑا بگ و برتر کا شکوہ احسان ہے کہ یہ تاریخ ساز اشاعتیں افکار کا اعزاز پہنچیں !

"فیض نمبر" سے افکار کی ادبی زندگی کا ۲۱ واں سفر شروع ہو رہا ہے۔ ۲۰ سال کی طویل و صبر آزماء جدوجہد کی داستان سنانے کا یہ وقت ہے نہ حوصلہ — بس یوں سمجھئے کہ ادبی جہاد کی طاقت دہری، نامساعد حالات، ادب دوستی اور علم پروری کا فقدان، وسائل کی

کمی، حکومت اور کاروباری اداروں کی اردو زبان و ادب سے عدم دلچسپی وہ سُرخیاں ہیں جن سے یہ داستان عیارت ہے — پھر بھی کچھ سر پھرے ادبی جنوں میں مبتلا ہیں، اور خونِ جگر سے ادب کے لالہ نادروں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ ”فیض نمبر“ بھی جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے — اسی ذوق و شوق، لگن اور سعی و جہد کا حاصل ہے جس کے بارے میں شاعر مشرق کا ارشادِ قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے ع

نقش میں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر!

سو خونِ جگر صرف ہوا — اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ ”فیض نمبر“ فیض صاحب کے شایانِ شان ہے یا نہیں۔ ویسے ہمارے لئے وہ لمحہ بے حد جاں گداز تھا جب کتابت شدہ مودوں کو سیٹنے کے بعد یہ علم ہوا کہ ”فیض نمبر“ ۵۰۰ کے بجائے تقریباً ۱۱۰۰ صفحات پر پھیل گیا ہے — ہمارے جیب و دامان کی وسعتیں اور وسائل کی انتہا معلوم — چنانچہ تمام ترکوشوں کے باوجود سارے کتابت شدہ مضامین نظم و نثر شامل ”فیض نمبر“ نہ ہو سکے جس کا، ہمیں دلی انوس ہے — پھر بھی یہ نمبر ۵۰۰ کے بجائے تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

”فیض نمبر“ میں جیسا کہ آپ دیکھیں گے — ہم نے کچھ نئے تجربے کئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ ”جوش نمبر“ اور ”حقیقت نمبر“ کی روایت کچھ اور آگے بڑھ سکے۔ چنانچہ مخصوص عنوان — ”روشنیوں کا شہر“ کے تحت جو افسانے پیش کئے جا رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ ان افسانوں میں فیض کی شخصیت اور شاعری نے زندہ کرداروں کا روپ دھار لیا ہے۔ کسی شاعر پر افسانے لکھوانے کا تجربہ بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا — بارے ہم اُن رفیقوں کے احسانمند ہیں جنہوں نے ہمارے اس خیال کو نہ صرف پسند کیا بلکہ افسانے لکھ کر ہمارے تجربے کی لاج بھی رکھ لی۔ توقع ہے کہ آپ ان افسانوں کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

فیض اور نئی نسل — اس نمبر کا ایک اور اہم حصہ ہے جس میں کالیوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء و طالبات کے منتخب مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔ افکارِ پہلی بار نئی نسل کے ہونہار ادیبوں کی نمائندہ تحریریں ”فیض نمبر“ میں فخر کے ساتھ پیش کر رہا ہے — سچ پوچھئے تو اسی نسل پر زبان و ادب کے درخشاں مستقبل کا انحصار ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ”فیض نمبر“ کی منفرد ترتیب و تدوین بھی آپ سے داد و ستاد لئے بغیر

نہ رہے گی۔ مجموعی طور پر اس نمبر کے ہم سال ۹ ابواب میں منقلم کتابت اور یہ التزام رکھا ہے کہ ہر عنوان "فیض نمبر" کے مضامین نظم و نثر سے، مثنوی طور پر ہم آہنگ رہے۔

جانبے مضمون، نگاروں نے دیے اور موضوع سخن، مہذب، پختہ، ذکور، باور، سنگت، لوح و قلع، حرفہ سادہ اور روشنیوں کا شہر، یہ ہیں وہ عنوانات جو ہم ترکلام فیض کا عطیہ ہیں۔ اور ہر لحاظ سے ممکن اور گہر پور۔ ان عنوانات کے تحت، نادر دیا و گار تیار، نایاب اور غیر مہمہ تخلیقات، قلمی خطوط، شعراء کے نثر، اساتذہ، اصحاب، انجمنیت و فن پر خصوصی مضامین تذکرے اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔

ابتداء میں مستند حالات کے ساتھ فیض نامہ میں شامل ہے تاکہ آئندہ نسل ان حوالوں کی مراد سے فیض کی زندگی، شخصیت اور فن پر مزید کام کر سکے۔ اس سلسلے میں ہمسما ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن، انجمن ترقی اردو کراچی، نیشنل لائبریری، لائبریری کراچی، کے علاوہ شمیم حنفی دربار، اسکالر، اردو یونیورسٹی، احمد آباد، کراچی، احمد وحید اختر دیکور پٹا وریونیورسٹی، اور صاحب حسین دکن، کے مضمون ہیں جن کے استراک و تعاون سے یہ کتابیات مرتب ہو سکی۔ ان حضرات کے علاوہ فیض صاحب اور ان تمام فنکار دوست اور اس قلم بھی شکر کے مستحق ہیں جن کی رفاقت و اعانت سے یہ دستاویزی نمبر مکمل ہو سکے۔ اس تاریخ ساز اشاعت کی سرت میں وہ حضرات بھی شریک ہیں جن کے مضامین نظم و نثر شرکت ہت کے باوجود ناگزیر حالات کے سبب شامل فیض نمبر نہ ہو سکے۔

"فیض نمبر" کے آغاز سے تکمیل کے آخری ابواب تک جن رفیستان افکار اور سنے راتوں کو جاگ جاگ کر جس خلوص، محبت اور ایثار کا ثبوت دیا اور جن ترتیب اور جن معیار کے ساتھ "فیض نمبر" آپ تک پہنچایا۔ اس کے لئے یہ دونوں حضرات بھی دلی شکر کے مستحق ہیں۔

— اور آخر میں ہیں بس اتنا ہی اور کہنا ہے

میتا ہو مٹا مٹا قبا کہ چکے ہیں ہم

۱۴
۲۰۶۵

فیض احمد فیض

قائم انگشت بدندان



مگر صبا و بکری
 "میں کہاں کے دانے تھے، کس ستر میں لٹا تھے"
 یہ نیکر تو غیر صغیر و احد ہے، لیکن ہمیں آئینہ کا
 یہ صبر دشمنی کے بجائے دوستوں کے گھر میں، وہاں کہ
 تو از شہائے بیجا، اگا گدھے جسکی تازہ مثال
 آئیے لکھا کردہ دفتر کے صورت میں سب کے سامنے ہے،
 لہذا ہر کسی پر اکتفا نہیں آتا، اس ستر طریقہ کی

داد بھی جو بھی کے چاہتے ہیں، اسی اُفتاد میں رہے لوگ
 (یا جو بھی لوگ) کبھی اُنسا سے کام لیتے ہیں کبھی تعلق
 کے، عجب عیسے عام آدمی تو صرف اُقامہ انگشت بدندان
 اور ناطقہ سرنگریباں ہی ہا، عذرِ پنشن کر سکتے ہیں
 خُردہ پستی سے رُخاں تو خیر اچھی باب
 ہے، لیکن سچ ہو چھپے تو میں جیتے جاگتے چلے پاسوں کے
 بارش میں اسی طویل دُعا لہو خاشیہ آرائی کے بہت متفق
 نہیں، اس کے اقل تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آگے رہے میں
 مجموعہ حسن قابلِ تحفہ کر چیلے اس لئے اُنکے اعمال و کردار
 کے لوہے کا رخ، میں زندہ ناخن کسوں کی جائے،
 دوم یہ شبہ ہوتا ہے کہ اب بھلتا اس لئے کر رہے ہیں کہ
 کسی کو غیبی ہے جی تو دوست اعیانِ بردت ہی میں

کسی اکبر آدم کا کلمہ عزیر کہ گزشتہ بار
 التفاتِ دل دوستانہ ہے نہ ہے
 یہ سو و نون کو حفرِ سخن کسے نہ بارش ہے
 در نہ آگے خلوصِ لہرِ جن نیت پہ کس کا فر کو شہ ہے ہوتا، لہ
 انکی ہمد و ثناء شکر و سپاس سے اعزاز کیے
 ممکن ہے، حقیقتِ میر کا ہے تو ہے آپ کے کہ عزیر دوسرا
 ہونے کے لئے کسبِ حال میں جتنی سعی و تلاش لازم تھی
 میر نے آسانی یا شاید اس کا بھی کچھ اس حد تک
 بقول اقبال

طبعِ بدن و سرِ بدین چہ لذتے دارد
 خوش گیسے کہ بدیناں محملِ است ہنوز
 فیض

۲۲/۱۲/۲۰۲۵

صہبا لکھنوی

فیض احمد فیض

زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ

ہمارے دہے کے نئے نئے بچوں میں ابھی بچوں
عباس شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہیں سے سنت مصروف ہیں زندہ ہے
ہیں سے باقی ہے گل دامن و گل کلمہ (فیض)

خاندان نامہ فیض احمد فیض • اذیت نامہ و تخلص فیض احمد فیض
ھیوٹاریف و سرے پرانی ۱۳۱۳ (۱۹۹۱) • بمقام سیالکوٹ

فیض کی پیدائش سنہ ۱۳۱۳ء میں ہوئی تھی۔ چنانچہ تذکرہ میں بھی ہمیشہ غلط اندازات ہوتے رہے۔ فیض بکر کی
تیار کی دوران کالی فیض و تبس کے بعد ہی پیدائش اور مستند تاریخ و سنہ پیدائش کا انکشاف ہوا۔ چنانچہ آئندہ ہماری اور حوالہ کے فیض کا
بکس قریشیہ کیا جا رہا ہے۔

تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات سرے صوبہ ۱۹۱۱ء
سرے صوبہ ۱۹۱۲ء درج ہے، سرے حال کے سرے و مدت کے
زمانہ پیدائش کی غلطی وہ یہ لکھتے کہ دفتر بلدیہ کے پیدائش کے اندراجات کا
ریکارڈ دیکھ کر محکمہ تاریخ معلوم کرنے کا کوشش کر رہا تھا کہ حقیقت
کے مطابق بلدیہ کے کاغذات سرے ۱۳۱۳ء (۱۹۱۱ء) تاریخ پیدائش درج ہے
فیض احمد فیض

۶۵/۲/۱۶

آب و جہد

قسم کا لاف و وضع سیالکوٹ۔ فیض کے
اب و جہد مولد و مکن ہے۔ بیشتر افراد زمان زراعت پیشہ
نقہ۔ فیض کے والد موجودہ و سسلطانت محمد خاں
نے خانہ دانی پیشہ کر اپنا نہ کے یسے غری، فارسی اور انگریزی میں
دستگاہ مائل کی اور افغانستان کے ایک سرکاری دنگی پیشہ فیض پلا ہو
سے اس کے ہمراہ کا بل چلے گئے یہاں امیر عبدالرحمن
دانی افغانستان نے آپ کی بیویوں

پہلا شعر

سن ۱۹۵۰ء میں مرے کالج سیالکوٹ کی ادبی
تفہیم، اخوان الصفا کے پیشہ غرضی مشاعرہ
کے لئے فیض۔ جو جرنل کہی اس کا پہلا شعر
یہ تھت سے
لب بند ہیں ساقی، مری آنکھوں کو پڑے
دو جہت م جو منت کش صہا نہیں ہوتا
یہ شعر نے مدح قبول ہوا۔ اور اسی مشاعرے سے فیض
کی ادبی شہرت کا آغاز ہوا۔

دہانت، قنایت اور صلاحیت کا
سے مت شہر پہلے آپ کو افغان
شہزادوں کا انا میں مسقر کی۔ پھر
پیٹ سکر کے اعلیٰ عہدے پر
ترلا دی۔ اور بعد میں افغان
کامیاب کر مقرر کر کے آپ کو انگلن
کھینچا۔ جہاں آپ نے نین سانہ
ہدایت محنت اور خوش اسیرلی سے
سفارتی فرائض انجام دیئے۔ مگر
کے دوران قیام میں آپ نے ہرگز
کا احترام پس کر لیا۔ یہیں آپ کی

علامہ قسبال سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ یہی سال کے بعد
آپ افغانستان واپس آئے اور ایک درباری سے شادی
کی۔ کچھ عرصہ بن حکومتی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ
آپ بھی اُس کی زد میں آ گئے۔ بدقت تمام پانی جان بچ کر کمان توں
رات سرحدیں کی۔ روزین سفر آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا
جون توں سیالکوٹ پہنچے۔ پیرس کی حیثیت سے نیا
زندگی کا آغاز کیا۔ اور عدلیہ خدا نے آپ کو عزت و دولت اور
شہرت سے نواز دیا۔ یہاں آپ نے دوش دیا رکھیں جن سے

چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ فیض کی والدہ کا نام سلطان
فاطمہ ہے جو بیضی خدا بقیہ حیات میں۔ فیض کے والد کا ۱۹۴۳ء
میں سیالکوٹ میں ہی انتقال ہوا۔

وراثت شعر و ادب

فیض کے والد موجودہ حری سلطان محمد خاں سیالکوٹ
کے نامی گرامی اور ذوی حیثیت پیرسٹروں میں تھے۔ علم و ادب
سے آپ کو بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبال، سر عبد القادر،
ڈاکٹر ضیاء الدین، صاحب اجزاء
آفتاب احمد خان، حبیب الرحمن
شیروانی، علامہ سید سلیمان ندوی
اور دیگر ممتاز علم و ادبی شخصیتوں
سے آپ کے ذاتی مراسم و رشتہ جو
روابط تھے۔ اور آپ کا بیشتر
وقت ان حضرات کی صحبتوں اور
محفلوں میں گذرنا تھا۔ علی گڑھ
یونیورسٹی کوڑے کے ممبر، انجمن
اسلامیہ سیالکوٹ کے ممدادہ انجمن
نمائند اسلام کی مجلس اطفال
کے ایک سرکردہ رکن کی حیثیت سے

آپ نے کراں مایہ علمی و تعلیمی خدمات انجام دیں۔ آپ کی شہور
نمائندہ میں امیر عبدالرحمن کی سوانح عمری و انگریزی میں،
اور افغانستان کے دستوری قوانین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ فیض
نے بن وقت سیالکوٹ کی ادب خیر سرسبزین پیرسٹروں کو
اس وقت ان کے والد کا شاہ عروج پر تھا۔ مگر علم و ادب
کے چہرے تھے۔ اور ارادہ و صاحبان کمال کا اجتماع تھا۔ چنانچہ
فیض کی ذہنی اور فکری تربیت میں اس ماحول نے بھی نمایاں حصہ
لیا جس کے باعث حصول علم اور مطالعہ کا ذوق ان میں بچپن سے ہی پلنگ

فیض اور کجائی بہن

- ۱ - حاجی طفیل احمد
- ۲ - فیض احمد فیض
- ۳ - میر عنایت احمد
- ۴ - بشیر احمد
- ۵ - بیگم شجاع الدین
- ۶ - بیگم حمید
- ۷ - بیگم حبیب الرحمن
- ۸ - بیگم انجم علی
- ۹ - رشیدہ سلطانہ

دو بہنیں — حاجی فیض احمد

اور بشیر احمد — دو تین بہنیں —
بیگم حبیب الرحمن، بیگم انجم علی اور
رشیدہ سلطانہ فوت ہو چکی ہیں۔

اہترائی اور اعلیٰ تعلیم

۱۹۱۵ء میں چار برس کی عمر میں حفظہ قرآن
سے تعلیم کا آغاز ہوا۔

۱۹۱۶ء میں مولوی ابراہیم میرسیا کوٹلی کے مشہور مکتب
میں داخل ہوئے، اہل اردو، فارسی اور عربی کی
تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۱ء میں سیالکوٹ کے اسحاق مشن ہائی اسکول کی
چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور ابتدائی درجات
امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔

۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈیوٹین میں میٹرک پاس کیا۔

۱۹۲۹ء میں مرہے کالج آف سیالکوٹ سے فرسٹ ڈیوٹین
میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اسی دوران میں علامہ اقبالؒ

کے اُستاد شمس العلماء مولوی سید رحیم حسن سے فارسی اور
عربی میں دستاویز بھی حاصل کی۔

۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے اور عربی میں
بی۔اے (آنرز) کے امتحانات پاس کئے۔

۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم اے کیا۔

۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے کیا اور
فرسٹ ڈیوٹین حاصل کی۔

ملازمت

۱۹۳۵ء میں ایم اے، او کالج امرتسر
میں انگریزی کے پیکر کی حیثیت
سے ملازمت کا آغاز کیا۔

۱۹۴۰ء میں پہلی کان آف کامرس
میں انگریزی کے پیکر مقرر
ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں بحیثیت کمپن فوج میں
ملازم ہوئے اور لاہور سے
دہلی منتقل ہو کر شعبہ تعلقات
عامہ میں خدمات انجام دیں۔

۱۹۴۳ء میں میجر اور ۴۴۴ میں لفٹننٹ کرنل کے عہدے پر
ترقی مل گئی۔

۱۹۴۷ء میں پہلی جنوری کو فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے کر
لاہور واپس آ گئے۔

۱۹۵۹ء میں پاکستان آگٹ کونسل لاہور کے سیکریٹری مقرر
ہوئے اور جون ۶۲ء تک خدمات انجام دیں۔

۱۹۶۴ء میں لندن سے پاکستان واپس آ کر کراچی میں مستقلاً رہائش
اختیار کیا اور یکم اپریل سے عدلیہ لاہور میں کالج کراچی کے
پرنسپل ونگران کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

پہلی نظم

جنت کا دشوائے "میرے
معصوم قاتلے" تھا۔ پھل
بارسنگ ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ
۵ بیج لاہور کے مشہور رسالہ
"راوی" سے شائع
ہوئے تھے۔ یہ نظم نایاب ہے

ادارت

۳۹-۱۹۳۸ء۔ ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور کی ادارت کے قرائض انجام دیئے۔

۵۸-۱۹۴۷ء۔ فروری سے پروگرس پیمیز لٹریچر کی تحریک شائع ہوئے ولسلہ مشہور حبیاء روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ

میل و نبار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

پہلا شعری مجموعہ

نقشہ قریہ ادب
۱۹۴۱ء میں شائع ہوا

کے الزام میں چار سال ایک ماہ گیارہ دن تک سرگودھا، شنگری، حیدر آباد، کراچی اور لاہور کی جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا ہوئے۔

۱۹۵۸ء۔ دسمبر میں دوسو سے زیادہ سیٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء میں رہائی ملی۔

خطابات و اعزازات

۱۹۴۶ء۔ یو فوجی ملازمت کے دوران - ایم - بی - ای کا خطاب ملا۔

۱۹۶۲ء۔ میں دنیا کا مشہور ترین لیسنے اے اے انعام حاصل کیا جس سے صرف فیض کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی بلکہ پاکستان اور اردو زبان و ادب کا وقار بھی بڑھ گیا۔

تلمذ و تلمیذین

شروع سے لے کر سلسلے میں فیض نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار کی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے ذوق و دھیان کو بے پروا و خود مختار بنایا اور خود مختار بننے کا شہرہ بنا کر ہمیشہ اپنے کلام پر نفاذ کی۔ بس کے علاوہ چند شخص اور قریب احباب سے جن میں ایم، ڈی، تاج، صوفی غلام مصطفیٰ، شبیر، مولانا چلغ، جن حسرت، پیرس، بخاری، اور کرنل حیدر ملک، عبور خاص قابل ذکر ہیں، مشورے کرتا رہا۔

شادی اور بچے

۱۹۴۱ء میں لندن شرافتوں میں ایس جارج سے دوجو بیگم تاج کی حقیقی بہن ہیں، اسلامی شرع کے مطابق عقد نکاح ہوا۔ شیو کشیشیر شیخ عسکرا اللہ نے نکاح پڑھایا۔ ایس جارج اولیٰ دنیا میں ایل سے فیض کے نام سے مشہور ہیں۔ فیض کی والدہ نے اپنی چھٹی بہو کا اسلامی نام "گلشوم" رکھا ہے۔

۱۹۴۲ء۔ میں پہلی بیٹی سلیمہ اور ۱۹۴۵ء۔ میں دوسری بیٹی منینہ پیدا ہوئی۔

پہلا نثری مجموعہ

مکانات
۱۹۶۲ء میں شائع ہوا

قید و بند

۱۹۵۱ء۔ ہمارے کو پہلے بیکار سینٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے، اور راولپنڈی سائرس

معنوی اساتذہ

○ طرف ○ اہل اقبس ○ عرب ○ عربیہ ○ محاسر کے
شوار ○ حافظ ○ سودا ○ میر ○ غالب
○ انیس ○ نظیر اکبر آبادی ○ اقبال
○ حسرت ○ سربانی ○ فیض پیر ○ شیخ
○ براؤننگ ○ اور ○ کیٹن ○

علم و مطالعہ

ذوق علم اور ذوق مطالعہ —
فیض کو دورے میں ملا ہے — زمانہ

طالب علم سے ملازمت یا ایام اسیری تک اور سفر و سیاحت
سے پرہیز کے دور تک انہوں نے ادب، فلسفہ، نفسیات
سیاسیات، تاریخ، مذہب، سائنس، فرض کہ بر موضوع پر دست
مطالعہ لکھے۔ فکری طور پر جن غنیمتوں کی تعلیم تخریکات
و تحقیقات سے وہ متاثر ہوئے یا ان سے استفادہ کیا، ان میں
سے چند یہ ہیں: — سرسید، حالی، گوئٹے، ڈائٹل، ملٹن

طالسٹائی، برنارڈشا، سقراط، افلاطون
ارسطو، کانٹ، ہیگل، مارکس، برگس
لنٹش، شوپنہاؤر، ہیوم، آئن اسٹائن
فرائڈ، ڈارون، جیمز جین، کالی داس
سور داس، بھبھوئی، جیسی داس، بیکریک
ملک محمد جاسی، رحیم خان خاناں، فرید
روز بربگ، ہیولاک الیس، ویفرہ۔

سیاحت و سفر

برصغیر کے تمام قدیم ذکر شہروں کے علاوہ فیض نے
سنہ ۳۸ء اور سنہ ۳۹ء میں سان فرانسسکو اور جینیوا،

فیض پر انگریزی میں پہلی کتاب

پوسٹ سے کاٹی فیض سے
انتخاب و ترجمہ
دکے - جمے - کیرنٹ
(سنہ ۹۵ء)

سنہ ۵۸ء میں تاشقند اور جولائی ۶۴ء سے جنوری ۶۴ء تک
انگلستان اور روس کے تمام علاقوں کے علاوہ سیلون، کیوبا
الجزیرا، مصر، لبنان، ہنگری اور کئی یورپی ملکوں کا وسیع
پہانے پر سفر کیا۔ اور متحدہ کافر نسوں
میں حصہ لیا۔ ۶۲ء اور ۶۴ء کے
دوران ان کا بیشتر قیام لندن میں رہا۔

ادبی و سماجی خدمات

سنہ ۱۹۳۶ء میں مہیا دہلی اور
صاحبزادہ محمود الغفر کی تحریک پر
لاہور میں انجمن ترقی پسند معنفین کے

قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ فیض کی ذاتی دلچسپی اور عملی سامی
سے پنجاب میں انجمن ترقی پسند معنفین بہت جلد ایک عوامی
ادبی تحریک کی صورت میں پھیل گئی۔ قیام پاکستان کے بعد
فیض نے مزدور تحریک میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ ٹریڈ یونین
فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نمائندہ کی حیثیت
سے انہوں نے آئی۔ یو۔ او کے ابلاس منفقہ سان فرانسسکو
اور جینیوا میں بھی شرکت کی۔

فیض نے عموماً کم سخن اور خاموش
بلکہ شہور میں لیکن اس حقیقت کا بہت
کم لوگوں کو علم ہوگا کہ آزادی تحریر و
تقریر اور شہادی حقوق کے تحفظ میں
انہوں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور
کبھی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوئے
اس حق کوئی دے پاکی کی خاطر اگرچہ انہیں

دو یادگار انتسابات

”دستِ صبا“ — ”کلمتہ“ کے نام
”ہیزان“ — پطرس، تاثیر، حسرت
عمود اور رشید جہاں
کی یاد میں —

قید و بند کی مصیبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، لیکن وہ بھی
”رفیق حق“ سے محروم نہیں ہوئے عمل و کردار کی صداقت
و یکسانیت بہت کم شخصیتوں کا مقدر بن سکتی ہے۔

فیض کی حیثیت ڈرامہ نگار

۳۸ - ۱۹۳۹ء کے دوران فیض نے رہا ہوئے۔
 کئی کامیاب ڈرامے لکھے جو لاہور سے نشر ہو کر کافی مقبول ہوئے
 ان ڈراموں میں - توہینِ عدالت، پرائیوٹ سکریٹری، سب
 کی چھتری، تماشا مرے آگے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صرف
 ایک ڈرامہ - پرائیوٹ سکریٹری ادیب لطیف لاہوری نے شائع

ہوا ہے۔ باقی غیر مطبوعہ ہیں
 لیکن خود فیض کے پاس ان
 ڈراموں کے مسودے موجود ہیں

فیض فلمی دنیا میں

فیض نے اب تک صرف
 دو فلموں کے گانے اور مکالمے
 لکھے ہیں۔ پہلی فلم - جاگو ماسو برا
 تھی جو ۱۹۵۹ء میں نمائش
 کئے پیش کی گئی۔ اس فلم پر
 بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا
 ہے۔ دوسری فلم - "دورِ بہرِ کمر" کا
 گانہ "زیرِ کمر" ہے۔

فیض کی تصانیف

- ۱ - نقشب فریادی سے اشاعت ۱۹۴۱ء
 - ۲ - دستِ صبا " ۱۹۵۳ء
 - ۳ - زخماں نامہ " ۱۹۵۶ء
 - ۴ - دستِ بہرنگ " ۱۹۶۵ء
 - ۵ - میزان (مجموعہ مضامین، " ۱۹۶۲ء
- دستِ بہرنگ کو چھ ڈگریوں کے تینوں شاعروں کے اب تک

کئی کئی ایڈیشن شائع ہو کر عوام و خواص میں مقبول ہو چکے ہیں
 زیرِ قیاس ہے - اردو شاعری کا انتخاب پاکستانی پلر
 زاہر اور انگریزی میں - اقبال کی شاعری -

فیض کی چند پسندیدہ تخلیقات

فیض کر اپنے شاعری کے زمانے میں سے جو تخلیقات بہت زیادہ
 پسند ہیں - ان کی تفصیل یہ ہے -

۱۔ نقشب فریادی
 ۲۔ دستِ صبا
 ۳۔ زخماں نامہ
 ۴۔ دستِ بہرنگ
 ۵۔ تماشا مرے آگے
 ۶۔ چھتری
 ۷۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۸۔ جاگو ماسو برا
 ۹۔ دورِ بہرِ کمر
 ۱۰۔ زخماں نامہ
 ۱۱۔ میزان
 ۱۲۔ نقشب فریادی
 ۱۳۔ دستِ صبا
 ۱۴۔ زخماں نامہ
 ۱۵۔ دستِ بہرنگ
 ۱۶۔ تماشا مرے آگے
 ۱۷۔ چھتری
 ۱۸۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۱۹۔ جاگو ماسو برا
 ۲۰۔ دورِ بہرِ کمر
 ۲۱۔ زخماں نامہ
 ۲۲۔ میزان
 ۲۳۔ نقشب فریادی
 ۲۴۔ دستِ صبا
 ۲۵۔ زخماں نامہ
 ۲۶۔ دستِ بہرنگ
 ۲۷۔ تماشا مرے آگے
 ۲۸۔ چھتری
 ۲۹۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۳۰۔ جاگو ماسو برا
 ۳۱۔ دورِ بہرِ کمر
 ۳۲۔ زخماں نامہ
 ۳۳۔ میزان
 ۳۴۔ نقشب فریادی
 ۳۵۔ دستِ صبا
 ۳۶۔ زخماں نامہ
 ۳۷۔ دستِ بہرنگ
 ۳۸۔ تماشا مرے آگے
 ۳۹۔ چھتری
 ۴۰۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۴۱۔ جاگو ماسو برا
 ۴۲۔ دورِ بہرِ کمر
 ۴۳۔ زخماں نامہ
 ۴۴۔ میزان
 ۴۵۔ نقشب فریادی
 ۴۶۔ دستِ صبا
 ۴۷۔ زخماں نامہ
 ۴۸۔ دستِ بہرنگ
 ۴۹۔ تماشا مرے آگے
 ۵۰۔ چھتری
 ۵۱۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۵۲۔ جاگو ماسو برا
 ۵۳۔ دورِ بہرِ کمر
 ۵۴۔ زخماں نامہ
 ۵۵۔ میزان
 ۵۶۔ نقشب فریادی
 ۵۷۔ دستِ صبا
 ۵۸۔ زخماں نامہ
 ۵۹۔ دستِ بہرنگ
 ۶۰۔ تماشا مرے آگے
 ۶۱۔ چھتری
 ۶۲۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۶۳۔ جاگو ماسو برا
 ۶۴۔ دورِ بہرِ کمر
 ۶۵۔ زخماں نامہ
 ۶۶۔ میزان
 ۶۷۔ نقشب فریادی
 ۶۸۔ دستِ صبا
 ۶۹۔ زخماں نامہ
 ۷۰۔ دستِ بہرنگ
 ۷۱۔ تماشا مرے آگے
 ۷۲۔ چھتری
 ۷۳۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۷۴۔ جاگو ماسو برا
 ۷۵۔ دورِ بہرِ کمر
 ۷۶۔ زخماں نامہ
 ۷۷۔ میزان
 ۷۸۔ نقشب فریادی
 ۷۹۔ دستِ صبا
 ۸۰۔ زخماں نامہ
 ۸۱۔ دستِ بہرنگ
 ۸۲۔ تماشا مرے آگے
 ۸۳۔ چھتری
 ۸۴۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۸۵۔ جاگو ماسو برا
 ۸۶۔ دورِ بہرِ کمر
 ۸۷۔ زخماں نامہ
 ۸۸۔ میزان
 ۸۹۔ نقشب فریادی
 ۹۰۔ دستِ صبا
 ۹۱۔ زخماں نامہ
 ۹۲۔ دستِ بہرنگ
 ۹۳۔ تماشا مرے آگے
 ۹۴۔ چھتری
 ۹۵۔ پرائیوٹ سکریٹری
 ۹۶۔ جاگو ماسو برا
 ۹۷۔ دورِ بہرِ کمر
 ۹۸۔ زخماں نامہ
 ۹۹۔ میزان
 ۱۰۰۔ نقشب فریادی

فیض کی بین الاقوامی حیثیت

فیض کا کلام پاکستان کی بھارت اور
 دنیا کے تمام ترقی یافتہ زبانوں میں
 منتقل ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں
 مقبول، تین سالہ شاعر ہے۔ ان کا مجموعہ
 شعری انگریزی میں شائع ہوئے لیکن ان کے کلام
 کے انفرادیت، جذبہ، گیر مقبولیت اور ادبی
 عظمت اس حقیقت کے خلاف ہے کہ شاعر
 صرف تعدادِ اشعار یا مجموعہ ہائے کلام کے
 کے کثرت پر مبنی نہیں۔ لہذا وہ اب تک
 انفرادیت، عظمت کے نوع اور اس کے
 عمومییت کو رہا ہوا ہے۔

فیض پر تحقیق

دوس کی دینی یونیورسٹی اور پیکو سلاوی میں فیض کے
 فن پر طلباء تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔

فیض نامہ

فیض احمد فیض کی زندگی کی شخصیت اور فن پر
شائع شدہ اہم تذکروں تبصروں اور مضامین
کی تفصیلی کتابیات ۱

کتابیں

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ناشر یا ملنے کا پتہ	اشاعت
۱	پروفیسر آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۴۲ء
۲	پروفیسر اختر انصاری دہلوی	ایک ادبی ڈائری	ایک نثار انٹراکٹ - لاہور	۱۹۴۴ء
۳	پروفیسر فراق گورکھ پوری	اردو کی عشقیہ شاعری	سنگم پبلشنگ ہاؤس، لاہ آباد	۱۹۴۵ء
۴	پروفیسر آل احمد سرور	نئے پڑنے پر غور	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۴۶ء
۵	پروفیسر افتخار حسین	روایت اور بغاوت	ادارہ اشاعت اردو - حیدر آباد دکن	۱۹۴۷ء
۶	کرشن پرست اوکول	نیا ادب	انجمن ترقی اردو پاکستان - کراچی	۱۹۴۹ء
۷	سرور احقر	ترقی پسند ادب	انجمن ترقی اردو سندھ علی گڑھ	۱۹۵۱ء
۸	پروفیسر افتخار حسین	تنقیدی جائزے	لاہ آباد پبلشنگ ہاؤس، لاہ آباد	۱۹۵۱ء
۹	" " "	تنقید اور عملی تنقید	ادارہ فروغ اردو - سکسٹ	۱۹۵۲ء
۱۰	غلام حسین ایم اے	مختصر تاریخ زبان اردو	مشاد اینڈ کمپنی، کراچی	۱۹۵۲ء
۱۱	اصغر حسین خان نقیو لہیائی	مختصر تاریخ ادب اردو	عشرت پبلشنگ ہاؤس - ناہور	۱۹۵۳ء
۱۲	سجاد ظہیر	روشنائی	آزاد کتاب گھر - دہلی	۱۹۵۴ء
۱۳	پروفیسر رشید احمد صدیقی	جدید نثر	سلسلہ خطبات افسانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۵۵ء
۱۴	ڈاکٹر عیاد بریلوی	روایت کی اہمیت	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۱۹۵۶ء
۱۵	ڈاکٹر اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۵۶ء
۱۶	آغا شہر کا شجری	میزان شعر	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور	۱۹۵۶ء
۱۷	ڈاکٹر حمید انور حمید	جدید شعرائے اردو	فیروز سنٹر، لاہور	۱۹۵۸ء

فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر	صہبا بکھڑی
۱۹۵۹ء	اردو دنیا - کراچی	ڈاکٹر عیادت بریلوی
۱۹۵۹ء	مکتبہ افکار - کراچی	مجیبی حسین
۱۹۶۰ء	اردو اکیڈمی سندھ - کراچی	ڈاکٹر ابواللہ صلیقی
۱۹۶۰ء	کاروان پبلشرز - الہ آباد	ڈاکٹر اعجاز حسین
۱۹۶۱ء	ادبی اکیڈمی - کراچی	پروفیسر منوں گو روکھ پوری
۱۹۶۱ء	اردو دنیا - کراچی	ڈاکٹر عیادت بریلوی
۱۹۶۲ء	شیخ غلام علی اینڈ سنز - لاہور	پروفیسر عبدالقادر سروری
۱۹۶۲ء	اردو اکیڈمی، سندھ - کراچی	نماز حسین
۱۹۶۲ء	پاک کتاب گھر ڈھاکہ	نظیر صدیقی
۱۹۶۲ء	اردو مرکز دہلی	فیض الرحمن اعظمی
۱۹۶۲ء	دارالادب - بہاول پور	عبدالحمید ارشد
۱۹۶۳ء	کتاب منزل - پٹنہ	پروفیسر حکیم الدین احمد
۱۹۶۳ء	اردو اکیڈمی سندھ - کراچی	سید ابوالخیر کشفی
۱۹۶۳ء	ادبی دنیا، لاہور	ڈاکٹر وزیر آغا
۱۹۶۳ء	ادارۃ ادبیات مشرق، ماسکو	ادارہ
۱۹۶۴ء	عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور	ڈاکٹر سلام سندیلوی

رسالے

نمبر شمار	مصنعت	عنوان مضمون	رسالہ	اشاعت
۱	عباس تبسم عبدالرحمن	فیض احمد فیض	آجکل، دہلی	۱۵ جولائی ۱۹۴۵ء
۲	جلال الدین احمد	نقشب فریادی پمیک نظر	نقشب، لاہور	شمارہ : ۲۳-۲۴
۳	پروفیسر آل احمد سرور	دست صبا	اردو ادب، گل گڑھ	جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء
۴	مجیبی حسین	چودوق نقد کیمانی	افکار کراچی	افسانہ نمبر ۱۹۵۳ء
۵	ڈاکٹر عیادت بریلوی	دست صبا اور فیض	افکار کراچی	سالانہ ۱۹۵۴ء
۶	پروفیسر رکن الدین حسان عثمانیہ	فیض کا شانہ خزانہ	مشرق کراچی	جغدی ۱۹۵۴ء
۷	دیویندر ناتھ	فیض کی شاعری	مشاہرہ، دہلی	اپریل ۱۹۵۴ء

مہیا لکھنؤ	افکار فیضی خبر	فیض احمد فیض
۸	ایسے حمید ناز	فیض کے ذہنی ارتقا کے چند پہلو
۹	ستیا بھائی کرشنی	اسعد ادب کے دس سال
۱۰	ایس فیض	فیض احمد فیض
۱۱	ابو الفضل تید محمود قادری	فیض کا شہود
۱۲	فرمان فقیروں	فیض کا ذہنی اور فنی ارتقاء
۱۳	ایکال مہدی	فیض - ایک عظیم فن کار
۱۴	عابد علی عابد	زمان نامہ پر ایک نظر
۱۵	محمود جمال	کچھ فیض کے بارے میں
۱۶	شش کنزل	فیض سے ایک انٹرویو
۱۷	اثر لکھنؤ	زمان نامہ کا سرسری جائزہ
۱۸	شمیم کرمانی	سفینہ غزل اور فیض
۱۹	انجم اعلیٰ	فیض کی ایک نظم
۲۰	نامی انصاری	زمان نامہ، ایک مطالعہ
۲۱	شہاب حقیقی	فیضی زبان و انون کی نغزیں
۲۲	رشید حسن خاں	فیض کی شاعری پر ایک نظر
۲۳	وحید الدین خاں متین	فیض اور دست صبا
۲۴	حمید اختر	فیض احمد فیض
۲۵	مہیا لکھنؤ	فیض احمد فیض
۲۶	اثر لکھنؤ	بسیار سفر باید.....
۲۷	ہسیل بخاری	فیض کے کلام میں جمود
۲۸	رشید حسن خاں	فیض کی شاعری
۲۹	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی	فیض اور حافظ
۳۰	الحاف من قریشی	انتخاب کلام فیض
۳۱	ممتاز حسین	فیض - شاعر امن
۳۲	"	"
۳۳	ظا، انصاری	فیض کی شاعری
۳۴	منظر علی سید	فیض کی میزبان
۳۵	تاجد سامری	فیض کی شاعری پر ایک نظر

۳۶	سیارہ قرصی	'میزان' پر تنقید و تبصرہ	نگار پاکستان، کراچی	نومبر ۱۹۶۲ء
۳۷	قاری	دو دو گزات اور ایک خط	تماس، دہلی	فروری ۱۹۶۳ء
۳۸	صدیق کلیم	فیض کی شاعری - ایک تجزیہ	میل دہنار، لاہور	۴ مارچ ۱۹۶۳ء
۳۹	سیارہ کلیر	اندو شاعری کے چند مسئلے	عمامی دور، دہلی	اپریل ۱۹۶۳ء
۴۰	بدباشی کینہ	نبیض کی شاعری	ساقی، کراچی	مئی ۱۹۶۳ء
۴۱	نہیر صدیقی	نبیض کی نظریاتی شاعری	شاعر، بمبئی	جولائی ۱۹۶۳ء
۴۲	محتسب	باز پرس	تحریک، دہلی	ستمبر ۱۹۶۳ء
۴۳	ڈا، انصاری	شام انتظار کا تنہا شاعر	صبا، حیدر آباد دکن	نومبر ۱۹۶۳ء
۴۴	اوین احمد دراز	جدید نظم نگاری میں بہتتی تجزیہ	شاعر، بمبئی	دسمبر ۱۹۶۳ء
۴۵	عرش صدیقی	نبیض کی شاعری میں رومانی عناصر	ادبی دنیا، لاہور	شمارہ علا ۱۹۶۳ء
۴۶	فتح مہر ملک	نئی شاعری اور جدید شاعری	فنون، لاہور	شمارہ ۷ ۱۹۶۳ء
۴۷	انور محمد خالد	نبیض احمد فیض کی شاعری	کریسٹ مجلہ ہمایہ کلچر لاہور	جنوری ۱۹۶۳ء
۴۸	مسترا علی ہاشمی	نبیض اور راشد (ثقافتی مطالعہ)	کتاب، کھٹھ	فروری ۱۹۶۳ء
۴۹	الطاف حسن قریشی	نبیض سے اثر واپس	اردو ڈائجسٹ، لاہور	اپریل ۱۹۶۳ء
۵۰	مجدد، ارجن زخمی	اردو شاعری کے جدید میلانات	شاعر، بمبئی	اپریل مئی ۱۹۶۳ء
۵۱	منیر فاروقی	نبیض کا تصور محبوب	فکری خیال، کراچی	مئی جون ۱۹۶۳ء
۵۲	عرش صدیقی	نبیض اور جدید شاعری	خیابان عید پشاور یونیورسٹی	خاص نمبر ۱۹۶۳ء

نقشہ فریادی

۱۹۷۱ء میں 'نقشہ فریادی' کے، ایک شاعر سے فیض کے ادبی عظمت اور جدید شعری ادب کے نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کے اشاعت کے فوراً بعد سلام بچھو شہر میں نے ذیل کے نظم لکھ کر فیض کو خارج تحسین ادا کیا تھا۔ یہ غیر مطبوعہ نظم پہلی بار شائع ہو رہی ہے

نقشہ فریادی کا مجموعہ دلکش اور میں
شجر ماہ کی شاخوں کے تلے مچھو خیال
زندگی گیت ہے ان گیتوں میں کچھ دھبی ہے
درد کو گیت سمجھ لوں تو میں گاؤں کیسے
چاندنی رات میں رقصہ ہیں نازک اجسام

سوچتا ہوں انہیں جیسے سے لگاؤں کیسے
گیت ٹوٹے ہوئے بر لبہ پہ سناؤں کیسے
دیکھوں تاریکی غم میں کوئی ہے ہوشیاد
لے شب ماہ کے جلوہ! میں ابھی آتا ہوں!

سلام بچھو شہر، ۵ (۱۹۷۱ء)

جائزہ مضمونوں

جائزہ مضمونوں کے لیے ہی شاہد معنیٰ ہے یہی

- ★ آج کے نام اور آج کے علم کے نام
- یستیم ہو
- ★ سہرا
- اے وطن
- ★ تین گیت
- شامِ غم
- ★ دُویا دگارِ نظیں
- ثلعات
- ★ بچوں کے لئے
- دو طہریئے
- ★ غیر مطبوعہ خطوط - احباب کے نام
- بہوی کے نام

فیض احمد فیض

آج کے نام
اور آج کے علم کے نام

مکر کوں کی اسرہ جانوں کے نام
اکرم خوردہ دلوں اور زبانون کے نام
پوسٹ مسیوں کے نام
تائنگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے کھوکے جیالوں کے نام
بادشاہ جہاں 'دالی' ماسوا، ناسٹ اللہ فی الدرجہ
جسے ڈھوروں کو عالم نکالے گئے ہیں،
جسکی بیٹی کو ڈاکو اٹھالے گئے ہیں۔
ماقمہ بھوکیت کے ایک انگشت پر دارنے مار دی ہے

دوسری مالے کے بہانے سے سر مارنے مالتی ہے
 حکیم گنگ زور والوں کے پاؤں تلے
 دھنسیاں چوڑی ہے

اُن دکھی ماؤں کے نام
 رات میں جھکے بچے بلکتے ہیں
 سنز کی مار کھاتے ہوئے بازوؤں کے نچلتے ہیں
 دُکھ بھرتے ہیں
 مستوں زاریوں کے پہلے ہیں

اُن حسناؤں کے نام
 فنی آنکھوں کے گل
 سنز کے حلقوں اور دیر چوں کی سیوں پہ بیکار کھل کھل کے
 مرجھا کر ہیں

اُن بیاہتاؤں کے نام
 منہ بدن بے محبت رہا مار سیموں پہ سچ سچ کے
 اُن کے لئے نہیں
 بیواؤں کے نام
 کٹریوں اور گلیوں میں کے نام،
 خلی ناپاک خاشاک کے چاند راتوں
 کو ۶۶ کے کرتا ہے اکثر و غور
 خلی غاروں میں لڑتی ہے آہ و بکا
 اُمنوں کی طرح صفا
 چوڑیوں کی گھنگ
 گالوں کی مہک
 آرزو مند سیموں کی اپنے چہلے میں چلیں گی پو،
 مایوسوں کے نام
 وہ جو اصحاب لعل و علم
 کے دروں پر کتاب اور قلم

لہذا صابر، { تم بھلائے
 پہنچے مگر لوٹ کر گھر آئے،
 وہ موصوم جو بھولسن سے
 وہاں اپنے تھے چراغوں میں لڑکی لکڑی
 لکڑی تھیں، تھیں
 سترے تھے، لکڑی لکڑی ہے استراحتوں کے سائے،
 ان السیروں کے نام
 جنکے سینوں میں نرزا کے سبب تاس لوم
 جلدی لڑکی کی نوریدہ لڑکی کی غرو میں
 انہیں سب سے پہلے
 چلنے والے کے انجمن میں تھے،
 آئے والے دلوں کے معنیوں کے نام
 وہ جو تھوڑے کل کی طرح
 اپنے پیغام پر خود مذاہرے ہیں

فیض یتیم لہو

کہیں نہیں بٹا، کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
 نہ دست و ناخن قاتل نہ آتیس پہ نشان
 نہ سہیلی لبِ صنجر نہ رنگ نوکِ سناں
 نہ خاک پر کوئی دھیرہ نہ بام پر کوئی دارغ
 کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
 نہ صرف خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
 نہ دیں کی نذر کہ بیعاً نہ جزا دیتے
 نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
 کسی علم پہ رستم ہو کے مشتہر ہوتا
 پکا رہتا رہا بے آسرا یتیم لہو
 کہی کے پاس سماعت کا وقت ہوتا نہ دارغ
 نہ مدحی نہ شہادت حساب پاک ہوا
 یہ خونِ خاک نشیناں تھا مرقِ خاک ہوا
 کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

فیض

سہرا

فیضے اور سہرا۔ ہی باں ابا ت کچھ عجیب سی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار ممکن ہے کہ
 فاجہ کی طرح فیض نے جن سہرا لکھے کی رسم نہی ہی ہے اور اس میں بھی اُن کا منفرد اسلوب نمایاں ہے۔ اس
 سہرے کے مخاطب طاہر نعیم (جو فیض کے استغنیٰ دینے کے فورا بعد آرٹے کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر
 ہوئے) اور پیاسہ سہیت استغنیٰ از دفتر یہاں نماز علی گڑھ میں جن کی تقریب شادی ۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء
 کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ مقطع میں جو سخن شاد و یاقوت ہے اس کی تمام تر ذمہ داری فیض کے سر ہے، یا
 طاہر نعیم اور یا سہیت استغنیٰ۔ یہ فیض مطبوعہ سہرا بلا شیدہ نمائے کی چیز ہے جسے انکار نے دریافت کر کے
 ”فیض نبر“ کے لئے یا وقت مناسب کیا ہے۔“
 (طاہر)

سجاء و بزم، درے کدہ کشا و دکرو
 امٹاؤ سا ز طرب، اہتمام بادہ کرو
 جلاؤ چاند ستارے، چراغ کافی نہیں
 یہ شب ہے جشن کی شب روشنی زیادہ کرو
 سجاء و بزم کہ رنج و الم کے زخم سہلے
 لباس طرب و محبت پہ آج یا رات
 دعا کو ہاتھ اکٹھاؤ کہ وقت نیک آیا
 رنج غریزہ پہ سہرے کے آج پھول کھلے
 اکٹھاؤ ہاتھ کہ یہ وقت خوش مدام ہے
 شب نشاط و لباس طرب دوام رہے
 مہتاب راہیں منور ہو مثل صحن چین
 اور اس چین میں بہاروں کا انتظام رہے

(۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء)

فیض

اے وطن اے وطن

تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن
 آگے ہم خدا ہوں تیرے نام پر
 تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن
 تڑکیا دیں کہ ہم مال والے نہیں
 آن والے ہیں اقبوں والے نہیں
 ہاں یہ جاں ہے کہ کسکد جس نے دیکھا نہیں
 یا یہ تن ہیں پہ کپڑے کا ٹکڑا نہیں
 اپنی دولت یہی اپنا دھن ہے یہی
 اپنا جو کچھ بھی ہے اسے وطن ہے یہی
 وار دیں گے یہ سب کچھ تیرے نام پر
 تیری لٹکار پر تیرے پیغام پر
 تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن
 ہم کٹا دیں گے جانیں تیرے نام پر
 تیرے غدار غیرت سے منہ موڑ کر
 آج پھر ایروں غیروں سے سر جوڑ کر
 تیری عزت کا بھانڈا لگانے چلے
 تیری عصمت کا سودا چکا نہ چلے
 دم میں دم ہے تو یہ کرنے دیں گے نہ ہم
 چال ان کی کوئی چلنے دیں گے نہ ہم
 مجھ کو کیجئے نہ دیں گے کسی دام پر
 ہم ٹا دیں گے جانیں تیرے نام پر
 سرکٹ دیں گے ہم تیرے پیغام پر
 تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن!

فیض

تین گیت

جاگو ہوا سویرا کے فلع ساز اچے کاردار کی نئی فلع دورے سکھ کا
کاؤں کے مکاں سے اور گیت فیض احمد فیض نے لکھے ہیں۔ ذیل کے
تینوں گیت اسے زیر تکمیل فلع کے ہیں۔ (ادارہ)

①

ندیا رانی میٹھا بول

پنکھی راجہ سے پنکھی راجہ میٹھا بول

جوت جگی ہرمن میں

سُندر گوری رے

کھنورا گونجے ڈالی تھوڑے

سُندر گوری میٹھا بول

بستی باڑی بن میں۔

جیسے روپ جوانی

جوت جگی ہرمن میں

بات کرے تو پھول کھلیں

اکھیاں ایک کہانی

ندیا رانی رے

جیسے دُور سے تارا چمکے

ندیا رانی میٹھا بول

چمکے روپ جوانی

میٹھا بول

جیسے روپ جوانی

گھاٹ لگی تاؤ

جوت جگی ہرمن میں

رات جگی سکھ جاگا

پنکھی راجہ میٹھا بول

پائل باندھو، ناچو گاؤ

ندیا رانی سُندر گوری

گھاٹ لگی ہر تاؤ

(۱۲)

سُکھی رہے تیری رات چندا سُکھی رہے تیری رات
دو رہے چین کی لُجڑی چندا دو رہے سُکھ کا گادوں
جانے کیسے راد کے لُگی ہرے تھک تھک پاؤں
وٹ میں بیٹھے یہی چندا، تھم لے میرا ہاتھ
سُکھی رہے تیری رات —

تیری دیسے دیپ جلا ہے اس پاپن کے دوارے
جانے کیسے بجائے، میں بھول گئے دُکھ سارے
من کا پیہ، منی دھڑلے، چندا چھوٹ نہ جائے ساتھ
سُکھی رہے تیری رات

(۱۳)

بُجھ گیا چندا نٹ گیا، باقی بچھ گئی رے
دینا راہ دکھاؤ
موری باقی بچھ گئی رے، کوئی دیپ جلاؤ
روئے سے کب رات کے لُگی بدل نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ
کالی رات سے جوتی لاؤ
اپنے دُکھ کا دیپ بناؤ
مٹ نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ

۶۱۹۶۲

فیض

شامِ غم

ہر گھڑی عکسِ رُخِ یار لئے پھرتی ہے
کتنے مہتابِ شبِ تار لئے پھرتی ہے

سُن تولو، دیکھ تولو، مانو نہ مانو لے دل
شامِ غم سیکڑوں اقرار لئے پھرتی ہے

بے وہی حلقہ موہوم مگر موجِ نسیم
تارِ کیسویں حسم دار لئے پھرتی ہے

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاجِ گلشن
ہر کلیات میں تلوار لئے پھرتی ہے

فیض

دو یادگار نظمیں

ذیل میں فیض احمد فیض کی دو ایسی یادگار نظمیں پیش کی جا رہی ہیں جو ان کی ادبی زندگی کے آغا تا وہ طالب علمی کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک نظم "اقبال" پر ہے اور دوسری انگریزی میں جسے ہم ترجمہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ یہ دونوں نظمیں ۱۸-۱۹ سال کے اس فیض کی ہیں جس نے بھی نام نہاد طبع کی موجودگی میں قدم رکھا تھا۔ ۱۹۲۹ء - ۱۹۳۰ء کے دوران لاہور میں "نرمائیت اور فلسفے کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ یہ تعلقات "راوی" میں بھی لکھیں اور نیا یادگار نظمیں، "میر، مراد، دم سدا، حیدر، گو، اور دم" وغیرہ کے ناموں پر لکھیں۔ انہی یادگار تحفہات ہیں انہیں۔ (ادوارہ)

اقبال

زما نہ گھٹا کہ جہاں سے رہا تھی رحمت میرا تو	میں نے وہ یاد بقیہ بچتی یاد دے انسان میں
بہار و ہریں میری یہ سب سلوک میری دگر تھی	صبر و شکر خواہی کہ جس بھی نہ جی اس بزم دیہاں میں
ہرگز نہ شوق میں خون زندگی ہم کھنکھنے کے چہرے	خدا کی ہر رنگ تھا گزرا ملت کی بہاروں میں
نفسا کی گود میں چھپ سکتا تیرا تیرا شکم	شہیدوں کی گراہیں سوری تھیں کارزاروں میں
سختی و مرنے کی مست نزل نے آواز درا آخر	تیرے تھوڑے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی
نئے غصے کے ماتے تو میرا دیرینہ سے چٹا اگلے	خود لگا ہی سے برلی قلب و جاں کی خود فراموشی
عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوا	نہروہ مشت خاک تر سے پھر لاکھوں شہر نکلے
زمین سے نوریاں آسمان پر دیر کے ستارے	یہ جہاں کو زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے
ہنود و یورپ کے مسابہ و زور و بھروسے بھٹا	مرات و مات کو تو نے اس کے امکانات جھلنے
ہر اک قطرے کو دوست دے کے دیرینہ کو یاد	ہر اک ذرے سے کو ہم درخش شرع کر دیا تو نے
خود بخود کردی بستیوں کیا دگر ڈالیں	زحیاں زندگی کو آتش و دھواں سے بھر ڈالا
ہلیم کن سے تیرا نذر جان سوز کیا کہ ہے	کہ تو نے صد ہزار ایویوئیں کو مَر دکر ڈالا

(سن: ۱۹۳۰ء)

فیض احمد فیض
انجمن عظمیٰ

Musion

(Verse Libre)

To a desolate, heart, sick with
longing, there came a dream
— the most beautiful of dreams.
It came as death, as an end of
—
The dream of becoming
— Perfect.
It went the way it came, but
the face of man's world was
changed.
The shrouded creature's demoniac
laughter,
And the bustling cities were
dead.
The imperious tower — clock
striking my its steely hours,
Now silent, and the
Temple's hushed —
How absurd!

(1930)

Fair

خواب کی نشان

ہاں خواہش کے بیمار مرے تنہا دل نے
اک خواب بھی خوابوں کی طرح پیارا دیکھا
لیکن مرے سب خوابوں کی طرح
یہ خواب بھی بے معنی نکلا
یہ خواب کہ بن جاؤں گا کسی دن —
— بورڈنگ کا مانیٹر رہیں
حیرت کہ ہوا ایسا ہی مگر
تھی کسی کو خبر
اس موڑ پر اکوخت رسا سو جائے گا
زینوں کی صدا آسید زدہ
حمام میں غم کی گرداں
اور ایک خوشی کا پیرک
میتا رہو گی
پر گھنٹہ گراہی وقت کے لیے رستہ پر
آواز تھکن میں ڈوبی ہوئی
میں، مگر مکھ سنا، سنا ہی رہا
مُن سُن کے مگر یہ کہنا پڑا
یہ خواب بھی کتنا اہل تھا

گامِ سرسبزِ علمو

دیدہ تر ہے، جن کون تھا کرتا ہے

شبنمِ حسم میں خوش ب جگر لے کے علمو

اب اگر جاؤ گے عرسِ دہلیب روانے حضور

دستِ وکٹ کو نہیں جاؤ سر لے کے علمو

سر آواز
۱۲/۴/۶۵

شاید کبھی انشاء ہو گا جو یہ بھاری

ہر سادہ ورق جس سخنِ کشتہ کے فوں ہے

شہد کیجیے اس کثرت کا رجم و سرافراز
جو آمدِ حرکت کی تھا مسرتوں ہے،
شہد کیجیے اس دل کی کوئی ترسہ نہیں چاہے
جو بندِ سراہ کی، سبز زبوں ہے سر

سیر
۵۶۵/۳/۲۰

نوحہ

۲۹ دسمبر ۵۹ء کو شہر سے ہر روز نماز اور سناں جوات سال
صحافی محمد اختر کے احیائے موت سے متاثر ہو کر

نزدیک ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلہ تکیں نہیں اور آکر بہت ہے
امید یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

فیض

بچوں کے لئے

بہت سے حضرات کو ملے ہوگا کہ فیض نے بچوں کے لئے بھی نظمیں
 کہیں ہیں۔ ذیل میں ملے اُن کے دو سنہایت خوب صورتے اور یادگار
 نظمیں برادرِ محطّٰ ازید سے۔ اور سعود احمد بکائی کے
 شکر یہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ یہ فیض کے شاعری کا ایک نیا رُخ
 ہے جو اب تک تاریکی میں تھا۔

۱۱۱۱۱۱

مینرہ کی سالگرہ

ایک مینرہ پیاری سی ہے جو بہت ہی پیاری سی ہے،
 ہم ہی لب اسکو پیار کرتے ہیں، سب کے سب اسکو پیار کرتے ہیں
 کیسے سب کو نہ اسے پیار اس پر ہے دی تو پیاری ڈکٹیٹر
 پیار کے جو بھی جی چاہیگا، وہ ضرور اس سے مار گھٹکے گا،
 فیضیہ بات تو سنہی کی ہے، ویسے سچ مجھ بہت وہ اچھا ہے،

بھول کی طرح اُس کی نہ گنت ہے، چاند کی طرح اُس کی صورت ہے،
جب وہ خوش ہوئے مسکراتی ہے، چاندنی ملک سے بھیل جاتی ہے،
پڑھنے لکھنے میں خوش رہتی ہے، اٹھینے کو دے میں کامل ہے،
عمر دیکھو تو آٹھ سال کی ہے، عقل دیکھو تو ساٹھ سال کی ہے،
پیرہہ گانا بھی اچھا گاتی ہے، اگرچہ گلوں سے سنا ہے،
بات کرتی ہے ارفقہ میٹھی، جیسے ڈالنی ہر گوت بھیل کی،
۴۸ کوئی اُس کو یہ سنا ہے، باب ذرا غصہ آ ہی جاتا ہے،
پر وہ جلدی کے من ہو جاتا ہے، کب کسی کو عہد سنا ہے،
ہے شکستہ بہت مزاج اُس کا، سارا عہد ہے کام فاج اُس کا۔

ہے میزہ کی آج س لگرا، ہر طرف شور ہے مبارک کا،
چاند تارے دو میں دیتے ہیں، بھول اُس کی بد میں لیتے ہیں،
باغ میں گاری ہے یہ بھیل، آج سدا میں رہو میزہ گل،
اتنی ابا، بھی لور باقی بھی، انیٹوں، کچھ بہن جانی بھی،
آج سب اُس کو چار کہتے ہیں، مل کے سب بار بار کہتے ہیں،

بھری ہوئی سونہرے مارک کا
 آٹے سو بار تیری سالگرہ
 سو تو کھو ہزار بار آئے
 یوں کہو آجے سنسٹا رہا آئے
 لے کر بار اپنے ساتھ خوشی
 اور سب کھا کر کس یوہنی،
 یہ مینزہ ہماری بیٹی ہے،
 یہ بہت ہی پیاری بیٹی ہے،

(۵۰) و (۵۱)

پرسا، پرسو، پرس ام

ایک لڑکا جس کا پرسا نام تھا
 پڑھنے لکھنے میں بڑا ناکام تھا
 اُس نے جب بھی امتحان کوئی دیا
 اُس کو ہر پرچے میں انڈا ہی ملا
 اُس نے سب انڈے اکٹھے کر لئے
 بیچنے کو ٹوکری میں دھر لئے

چیسز عمدہ تھی، ملے گا کہ ہزار
بن گیا بس اس طرح وہ مالدار

باقی اندھے جو بچے اسے مہرباں
اس نے اس پر لا بھٹائیں مرغیاں

میں دن کے بعد وہ چوڑے بنے
جن کو کھانے کے لئے ملتے چنے

ہر گئے جس وقت وہ پل کر جواں
ڈھیر لگ جاتا تھا انڈوں کا دیاں

بیچتا تھا روز "پرسا" بے شمار
لوٹتا رہتا تجارت کی بہار

چار پیسے جیب میں رہنے لگے
لوگ اب "پرسو" اسے کہنے لگے

نیم اب دولت ہے اس کے پاس عام
لوگ سب کہتے ہیں اس کو پرسِ ام

(۱۹۵۶ء)

فیض احمد فیض

دو طہنریے

فیض کی ابتداء نثر کے دو یادگار نمونے جو تقریباً
 نایاب تھے۔ ذیل میں پیش کے 'جاریے' ہیں۔ یہ دونوں
 طہنریے جو مکالموں کے صورت میں ہیں فیض نے 'اج
 ۳۵ تقریباً' سال قبل رمانٹک طالب علموں میں لکھے تھے
 ان کو پیش کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ فیض کے ادبی
 ارتقا کا جائزہ لیتے وقت ان کے اولین تخلیقات کو دیکھ
 سناٹے رکھا جائے۔ (ادارہ)

شکست

(ایک طہنریہ)

پہلا لڑکا، سلی تم جانتی ہو کہ میں خاموشی کا عادی ہوں
 لیکن گھر والوں کی گفتگو میں تمہارا ذکر آجائے،
 تو مجھے زبان پر قابو نہیں رہتا۔ میرے الفاظ
 خود بخود غریبوں میں چل جاتے ہیں۔ کئی
 بار والدہ مجھ کو پوچھتی ہیں۔ آخر تمہیں سلی سے

افراد

سلی _____ ایک لڑکی،
 پہلا لڑکا _____ دوسرا لڑکا

سدا ہے : (پہلے لڑکے سے) تم نے آج بال بھی نہیں بنائے !
 دوسرا لڑکا : راتوں کی کیف اور چاندنی میرے لئے ایک نفرین
 جاتی ہے۔ اُس کے عبرتیں گیسوں میں کس قدر
 نشے خوابیدہ ہیں۔ صبح کی نیم بیدار زنگینوں کو
 صرف ایک تڑا دیا ہے۔۔۔ اس کی لعنت نواز
 آنکھوں میں کتنے میکرے آباد ہیں !
 سدا ہے : (پہلے لڑکے سے)۔ تمہارے کوٹ کا لڑکتا
 گندم ہے۔

دوسرا لڑکا : سوچتا ہوں کہ اگر تم میری ہو جاؤ تو ہم دونوں
 شرب و شہری ہو موم دنیا میں نکل جائیں جہاں
 آفتاب حدت سے محروم ہو اور مہتاب شہری
 سے نا آشنا۔

وہں دم کی شدت سے نفے نہ اُچھتے ہوں
 ناکام نگاہوں سے آنسو نہ چھلکتے ہوں
 وہاں زیست کا ہر لمحہ عشرت کی کمائی ہو
 مہتاب ہو ساغر ہو، یادہ ہو جوانی ہو
 اس دنیا کی ہر شام زہرہ کے مدہوش نمزوں سے
 مرتش ہو اور اس کی ہر صبح بہار کے فوئیر پور
 سے سطر۔

سدا ہے : (پہلے لڑکے سے) تم تو گنوار ہو۔
 دوسرا لڑکا : ہم پر ندوں کی خرت آنا دہوں۔ آزاداں
 بے فکر۔ تمام دن ہم قدرت کے وسیع و شاداب
 مرغزاروں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کر
 اور۔۔۔۔۔

(سنہ ۱۹۳۱ء)



اتنی کیا دلچسپی ہے ؟
 سدا ہے : (دوسرے لڑکے سے)۔ کس قدر تیز خوشبو
 رکا رکھی ہے۔ آج مجھے سرور نہ ہو جائے۔
 پہلا لڑکا : (تقریریں کرتے ہوئے)۔ ہمیں نہیں معلوم
 کہ میرے لئے کیا کچھ ہو، ہمیں دیکھ کر جانا ہوں
 تو دنیا کی ہر شے سرور نظر آتی ہے۔ پڑھنے
 بیٹھنا ہوں ٹوکاٹ کا خشک چہرہ منہم دکھائی
 دیتا ہے۔

سدا ہے : (دوسرے لڑکے سے)۔ جہاں تک مجھے یاد ہے
 تمہارے لباس میں کبھی کوئی بے جا شکن نظر
 نہیں آئی۔ جھلا کہتیں اپنے ہوا اور کس سے
 محبت ہوگی !

پہلا لڑکا : سلی ! جب ہم بچے تھے تو تم مجھ سے طنز
 کی فرمائشیں لیا کرتی تھیں۔ اور جب ان میں سے
 کوئی پوری نہ ہوتی تو روٹھ جایا کرتی۔ حسرت
 ہے مجھے اب بھی کوئی حکم دو چلو را نہ ہو سکے
 اور تم روٹھ جاؤ۔۔۔۔۔
 ہمیں منانے کے لئے کیا کچھ نہ کروں۔

دوسرا لڑکا : (دیکھتے ہوئے)۔
 تم کس قدر حسین ہو میری ملکہ۔ ہمیں یاد کرتا
 ہوں تو دل کا ہر تار و فرد شوق سے کلپنے لگتا
 ہے۔ تمہارا تصور کرتا ہوں تو خیال کی نیل تار کی

فضائیں دوپٹی کرنیں دوڑ جاتی ہیں، اور ہمیں
 دیکھتا ہوں تو۔۔۔ دل چاہتا ہے کہ بہار اور
 اُس کی تمام زنگینیاں تمہارے آتشیں ہونٹوں
 کے ایک ٹکے سے تیسیم پر بچھا ور کر دوں۔

یادِ رفتگاہ، دی امبابہ (ایک اور وطن)

دسمبر ۱۹۳۰ء کو ایک شاعر

منظر: نیوہوسٹل میس: ایک پتر: سحر
شرفانہ جسے کافر نیچر ایک
معترا اسٹول پر مشغل ہے۔ خوش
پرچائے کے برتن سے گڑھے کے خالی
پیکٹ اور جڑے ہوئے ٹکڑے دیکھو،
بڑے ہیں۔ فضا میں ایک شہر
موم بقی کے روشنیوں کو گھنٹا رہے
ہے۔

امبابہ سیاہ بیاڑے اتر رہے، ستین
چہرے بٹائے اہستہ اہستہ، راحت
ہوتے ہیں۔

چوہدری صاحب داستانِ عمارت
پر بیلہ کدواں چھینکے ہیں۔
تے اور تہ میں بحث چھڑ جائے
ہے۔ تے دیوار سے ٹکے لگا کر اوٹ گئے
لگے تھیں۔ نظر ایک کرنے میں
سکیا ہے بھرتا ہے۔ تم شاعر
کہتا ہے۔ تے کاٹا ہے

۱۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ

تہذیب کا سنگ بنیاد روس میں رکھا گیا۔
یونکر موجودہ ہندوستان کا ہرادیب اور
ہندوستانی مدی مہندسین کے تخیل کا نمونہ انسان
ہے۔ سید گڑھ کو سب سے پہلے روسیوں نے
روح دیا۔ ٹاسٹاٹھ پینڈاٹھن تھا جس نے
دارحی کی حمایت میں مہم چار بند کیا، اور انکو
ترگنیف پیدائش ہوتا۔

دیکھو۔ اے کوٹ میرے دل سے پوچھو

توے تیر نیم گشتے کو،

ح: کیسی لالینی باتیں کرتے ہو یا۔ ہر ویں جس انسان

جسے تمام ازل سے حقواری سی عقل رسا

ودیت کی ہے، اس بات کا اور اک رکھتا ہے

کہ ہندوستانی قومیت کا موجودہ نہوں

غالب اور اس کے بعد کی تعلیم کا نتیجہ ہے اقبال

کا ایک مصرع ہے

خوشا کہے کہ بدریا سفینہ ساخت مرا

ہزار ترگنیف کے تخیل —

چوہدری صاحب:۔ پریم، مشکین،

شنتی —

شے: سالوں بویاں نہ مارو پیسے،

شے: ادھو ہو — آہا — اہی ہی — غالب

کون بلا تھا، اور اقبال کیا چہرہ ہے۔ میں کہتا

ہوں ترگنیف ترگنیف اور دوست و سکی۔

امبابہ

ن - ح - ش - ف - ع - م

چوہدری صاحب

کیوت؟

اُن کی آہ و بکا کے تاثرات سے لرزہ برافرا

ہیں۔

ف : ۷

وفائے دلبران ہے اتفاقِ درخاستے ہمد

اثر فریادِ دلہائے حریف کا بس نے دیکھا ہے

ص : آہ سیزن ختم ہمد رہے اور انہیں ابھی

تک خبر نہیں۔

م : مصرع ہو گیا۔

سب : خاموش — خاموش — م صاحب

نے مصرع لکھا ہے۔

م : 'بدلی تری نظر' مری دنیا بدل گئی

سب : واہ واہ کیا کہتے ہیں — م صاحب —

قلم توڑ دیا۔

دو قفسے

ف : مجھے تو یہود معلوم ہوتا ہے۔

چوہدری صاحب : واقعی نظر تھی یا اغیار

کا یور۔

ص : ہاں، اور تمام مصرع میں فارسی کی ایک سی

حرکیہ نہیں۔

ف : اور خیال بھی کچھ نیا نہیں۔ دوستو سکی۔

ف : ہمارے دوستو سکی، کانٹ اور قاب۔

د نصف درجن سیسے صلو تیں،

چوہدری صاحب : صابان نیشنل انیمم۔

د سب کھڑے ہو کر گلتے ہیں :۔

وہ کافر صنف کیا خدا ہے کسی کا

وہ کا آفر صنف کیا

د موصے بتی بچھ جاتے ہے

(یکے انا حبابِ فیض، ن ۱۹۳۰ء)

ف : چوہدری اُسکٹ نکالو۔

د م : اگر ایک شعر کا رقبہ ساڑھے تین مرثیہ

ہو تو ایک مصرع کا طول۔

چوہدری صاحب : انوس تو یہی ہے کہ بہتیا

کوٹ اور بریک کی اخلاقی تصویریت نے قیضاً

بیک نہیں۔ تم نوک روحانی تجربات کو فوری

لذات پر قربان کر دیتے ہو، اور امتیاز کی حقیقی

اقدار کو ان کی صوری اقدار سے تیز کرنے کی

صلاحیت نہیں رکھتے۔ رمل اور منظم کی

تعلیم۔

ف : دنیا میں صرف دو حقیقتیں ہیں، عشق اور سگریٹ

اور دونوں میں سہ سگریٹ زیادہ سہ گیر اور

نیا دہ سہل الحصول ہے۔ اس نے سگریٹ

نکالو۔

ص : کوئی شیکو کار نہیں، ایک بھی نہیں۔

ف : دنیا کی واحد حقیقت لغویت ہے کیونکہ 'من'

عشق، شعر سب لغو ہیں۔

ف : اور تم؟

ف : ہا ہا ہا۔

ف : بجا ہے۔ کیوں م شعر نہیں ہوا۔

م : ایک مصرع کا لیفٹ آؤٹ کمزور ہے۔

چوہدری صاحب : ہاں، مجھے تہذیبی جبین نیاز

اور کسی کے آستانِ ناز میں کتنا فاصلہ

پاتی ہے؟

ص : کچھ نہ پوچھے، آج کل اُن کی تینگ چڑھی

ہوئی ہے۔ آفرود سال کی محنت کا اتنا بھی

صلہ نہ ملتا۔ میرے کمرے کی دیواریں ابھی تک

فیض احمد فیض

غیر مطبوعہ خطوط

سلام مچھلی شہری کے نام

Almagordo Estate
Sondia
(1940)

تو یہ سدا مچھلی
آگیا خط پہنچا، افسانہ کیا۔ اسکی سی جانی
کون بابت تھر۔ نظم جھینپتا ہوئی۔ پسندیدگی کا شکر یہ۔
تیار مند

فیض

پھر کوئی آیا دل زار! ہنس کوئی ہنس۔
راہرو ہوگا کہیں اور جلا جاسکا
ڈھل چکی رات بکمر نے لگا تاروں کا عیار۔

(دکھو) نے لکھے الیالوں میں خواہیدہ خراج -
 سو گری راستہ تک تک کے ہر اک را انگزار -
 ایسی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ -
 گل کروستہ میں بڑھا دوے و سیاہ ایاغ -
 اپنے بے خواب گواروں کو قفل کر لو -
 اب یہ کوئی مہنی کوئی نہیں آسٹا -

عبدالرحمن چغتائی کے نام

سنٹرل بیلر، حدید رابا، رندہ

۱۶ نومبر خشتی حب قند، آداب و سلام -

جب سے آپ ہم فضا آئے ہیں سرِ نقول غالب اسے یوں لئے

کوئی پوچھ کہ یہ کیا ہے تو چھپے ہوئے

پھر تاجوں کہ

اکلی یا، اور سی میرے لئے انتظار کا باعث ہے اور اگلی محبت وسیلہ

تکسیر جیہ کہ آئے لکھا ہے زندگی کا سلسلہ تو کسی طور جلتا ہے

رہتا ہے اہم بات یہ ہے کہ تخلیق کا لہر لکھ کر اور فن کی شمع بجھنے

نہ پائے، جب تک یہ سلسلہ جلتا ہے اور یہ شمع جلتی ہے دیگر مہاسب ان

نعمتوں کے مقابل، سمجھ میں اور سطوتِ جم 'سرمایہ'، 'نعم فریاد' کے نہ
ہیں آ سکتی،

میری نئی کتاب 'دسب' کا نام ہے چھپ رہی ہے، انیسویں کہ
میری غیر فارسی کے باعث اس میں آکھجے موقع کا حق اٹھانہ ہو سکا۔

میں خبرِ دعا صفت ہوں، امید ہے کہ آپ اور ادیب و اقرباء

یہاں
فیض

تجربیت پورے - فوطا

احمد ندیم قاسمی کے نام

(د)

5, Cornwall Avenue
Finchley, London N.3

برادر عزیز

۲۹ جنوری (۱۹۶۳)

ابھی ابھی ایک اور دورے سے لندن واپس پہنچا ہوں۔

آپ کا خط رکھا تھا، بہت مسرت ہوئی تھی میرے بارے میں

آپ کا شبہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا بات صرف یہ ہے کہ میں اپنے

عزیزوں کو سدا دم و پیام دل میں زیادہ لیکن جاننے پر کسم لکھتا ہوں

تو آپ لوگ کچھ صفائی باطن پر توجہ دیجئے کہ یہ دنیا مالت آپ
تک پہنچ جایا کریں۔ کچھ دن ہوئے میں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ بعض
روسی اور امریکی سائنس دان مگر تو *the world* سے متعلق تحقیق
کر رہے ہیں اس لئے کچھ تعجب کا محل نہیں اگر ظاہر و باطن کے علوم
آخر یکجا ہو جائیں۔

چونکہ کتاب گوئی خزن چمک ہوں، نہ جانے آجکل فون دل
بہینے والوں کو فویدار کتنے ہیں لیکن یہ بازار بالکل سرد بھی کبھی نہیں
ہوتا غالباً کافی دنوں تک سرد اور شکم کی آزمائش ہوتی لیکن آپ
اسکے عادی ہیں۔ بہر صورت میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔
مجموعے کے بارے میں شرمسار ہوں، آنے سے پہلے بیسیوں کی
ضرورت تھی، اسلئے وہ تو میں کارواں کے تحت بیچ آیا تھا لہذا
پہلے ایڈیشن کے دام بھی وصول کر چکے ہوں فی الحال اور نو کچھ گڑھ میں
نہیں البتہ جیل سے لکھے ہوئے خطوط ابھی ابھی ایس نے یکجا کئے
ہیں انکا مسودہ چند دنوں تک ببط کو بھیج رہے ہوں، آپ
میں دیکھ لیجئے، اگر آپ کے مطلب کی چیز ہو تو چھاپ دیجئے۔ یہ خطوط
انگریزی میں ہیں اسلئے ترجمے کا بھگتہا ہوگا۔ ببط کو اسی غرض

سے بھیج رہے ہوں۔ آپ دونوں مطالعے کے بعد مجھے رائے لکھ دیجئے
 رسالے کے لئے آپ کی فرمائش کی تعمیل میرے سر ہے۔
 ابھی تک تو اس بر فناک فضا میں شرم کا دور و سراغ نہیں
 ملتا۔ آپ کے کہنے کے شاید سریر خام میں نوائے سرش سنائی دے جائے
 بہر صورت کوشش فرد کر دینا۔

آپ کے میں نے فی الحال ذکر کیا تھا کہ بعض غیر ملکی ناشرین پاکستانی
 ادب (شرعاً انسانہ) کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے
 نہیں کیا تو یہ کام اب میں نے ذمے لے لیا ہے۔ یہاں بیٹھ کر سب تکلیف
 کھٹکا لےنا تو ناممکن ہے البتہ بہت سی چیزیں پہلے سے میرے
 ذہن میں ہیں اور یہاں کے *Department of Education*
 کا کتب خانہ کافی اچھا ہے، اگر آپ اپنی لحدیدہ چیزوں کی فہرست
 بھیج سکیں تو کچھ سہولت ہو جائیگی، خراج گانا دل اور اپنی فی کتا بہر تو
 بہر صورت بھجوا دیجئے لیکن سوانہ ذکر سے، کتاب کے پیچھے بھیج
 دئے جائینگے۔

میر غنی بھاسل ارداں کے اولاد تک لوٹ آؤنگا،
 گزشتہ وقت بیشتر جہاں ردی میر گزرا، اب کچھ پڑھنے

لکھنے کی کوشش کر دے گا۔ 'جنگ' کی فرمائش پر صافتی مراسلہ
کا ایک سلسلہ بھی زیر غور ہے۔ دلیں کے غیر حاضری مجھے خود بھی
بہت گوارا نہیں (ہوس سید و عاشا سو وہ کم ہے بلکہ) لیکن
حدیث شریف میں ہے 'زر عنقا' اردو 'حسن' (کم ملد کرد تاکہ
محبت میں اضافہ ہو) چنانچہ یہ فراق تو سنت کی پیروی میں
خدیجہ اور پھر کو پیار اپنی دیکھے۔ ذرا داس بچا ہوں تو انہیں
بھی لکھو نہا۔

خلیفہ
فیض

(۲)

معدن

۶ مارچ (۱۹۳۳ء)

برادرِ ندیم

آج دو دنوں خط لکھا کہ گھر میں
کچھ تھک رہی ہوں اور مجھے یقین تھا کہ محض وعدہ فردا سے اس کی تسخیر
ہو جائے گی، اب مشکل سے صبح بڑی صورت نہ سمجھتی تھی
کی صورت ہو سکتی ہے، کچھ خاصہ نہیں بلکہ خانہ پوری تو عا
ہو جائیگی۔

مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفہ سہری نے
تھے بزم سیریب دو در بزم کے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے
یہ خانہ سعد جاگ بدل لے کر کیا تھا
مہلت ہی نہ دی مفضل کبھی بختہ لگاری نے

(۳)

لندن
۲۸ اکتوبر (۱۹۶۲)

برادرم نذیر، سلام اور پیار،

دو چار دن ہوئے سونا چوں، آہم خط منتظر آیا
یعنی اب تو سیروں فون خشک کر کے بھی پھرہ بڑ کی صورت
نظر نہیں آتی اس لئے غزل تو کوئی ہوئی نہیں، بون توں کر کے
ایک نظم گھسیٹی تھی سو بھیم بچہ بچوں، چھپنے کی شرط یہ ہے کہ
اول مجھ اپنی منتخب کردہ کہانیوں کی نہرست بمعنی لور یہ بھی لکھے
کہ انہی دستیابی کی صورت کیا ہے۔ دوم خدیجہ کی ناول اور سال

کہیں گے۔ سوم چچہ استاد دامن احمد راہی اور دوسرے پنجابی شواہد
 ہا منتخب مکالمہ ہے کہ زیادہ وقتہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دس
 سندھ نظمیں کافی ہیں اگر آپ فارغ بخاری، شیخ ایاز اور کسی بلوچی
 حد کے ذریعے پشتو، سندھ، اور بلوچی کے نئے ترقی شدہ شواہد
 کا مکالمہ بھی نسل کر سکیں تو بہت ہی عمدہ بات ہو، بہتوں کا بھلا
 ہوگا، کم از کم پہلی دو چیزیں فوراً بھجوا دیجئے۔

مثنوی کا دوسرا شمارہ مل گیا ہے، صورت اچھی ہے،
 سیرت کا ابھی مطالعہ نہیں کیا، قدیم، نظمیں اور سب احباب کو
 پیار پہنچا دیجئے (قدیم کے گویا پتہ اپنے نہیں لکھا) نقطہ

منظر
 منظر

رنگ ہے دل کا

تہ نہ آئے تو ہر چیز دی تھی کہ جو ہے
 آسمان حد نظر، رنگ، رنگ، شیشہ، شیشہ ہے
 اور اب شیشہ دے، رنگ، رنگ، رنگ، رنگ
 رنگ ہے دل کا ہے، "جونِ حلوے رنگ"

یہ چمکی زندگانی، راحت دیدار کا رنگ
 سرمئی رنگ نہ ہے، ساقی بنزار کا رنگ،
 زرد پتوں، حس و خار کا رنگ،
 سُرخ پھولوں کا، دیکھتے ہوئے ٹکڑا کا رنگ،
 زہر کا رنگ، مہو رنگ، شبِ تار کا رنگ،
 آسمان رنگ، رگزار شیشہ ہے
 کوئی بھگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی راز
 کوئی ہر خط بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹہر دکھ کوئی رنگ، کوئی رست، کوئی شے
 ایک بلکہ پر ہر گز ہے
 پھر کے اکبر، راکھ چیر دی ہو کہ جو ہے
 آسمان ہر خط، رگزار، شیشہ ہے شیشہ ہے

حمید اختر کے نام

(۱)

لغز

۱۰ اگست ۱۹۶۳ء

عزیز سی محمد اختر

تمہارا خط آمد، مستر ہوئی، ہمارا رنگ

گزشتہ خط سے آپ لوگوں کے اندیشہ ہٹے دور دراز اور
 غمگین منصوبوں کا سہارا نہ رہا، ٹھیک ہے ہم خود 'لہ تعقلو' کے قائل
 ہیں آپ لوگوں کی گارڈی چل نکلتے تو بہت اجتماع ہو، بہر صورت
 اس پر ہمارے لندن کی سیر ہو جائے تو کیا برائی ہے، ارے کس نے
 بارے میں کچھ ایسی پریشانی کی بات نہیں جب تم آؤ گے تو دیکھا
 جائے گا، اپنے یہاں، یا اس اس کس اور، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔
 وہ ہر سیر آجکل تو کچھ مل رہا، یوں تو بول ہیں کہ
 موجودہ موسم تو کبھی بہار کہتے ہیں لیکن بقول شاعر

جبکہ بہار یہ جو مھر آئی کی خزاں۔ نو چہم

اگلے ہفتے ہم لندن لوں گے، پھر کسی اور لندن جا رہے ہیں
 اگرچہ اب سب درمئی ملک ہیں تو ایک ہی کے دکھائی دیتے ہیں
 ایسے چھپی اور سنیز و خوش ہیں صرف اپنا جی ہر دلی کے مفکر
 ہے، فیصلہ اب چند مہینوں کی بات ہے۔

سعدیہ اور بچوں کو جمع سب کی طرف سے چھارے

مخلص
فیض نیر

باقی عند الملاح

(۲)

Curwall Avenue
London N 3.

4/6/63.

ذیر محمد اختر،

میکہ، دونوں خطا مینج، کوئی قابل ذکر بات نہ
تھی اسلئے پہلے خط نہیں لکھا، مائیکسٹر کے تمہارے دوست دو
ماہ اردن ہوئے تل کئے تھے باقی ایک دو حضرات جن کا نام نے ذکر
کیا ہے ابھی نہیں پہنچے، کاردار بھی قریباً دو ہفتے کے یہاں ہے
لیکن P9A کے کام میں مفرد، آج جرمنی گیا ہے غالباً دو تین
دن میں لوٹے گا۔ اُسے توقع تھی کہ فلمی سامان کے دسترس
کے بارے میں تمہارے ہاں سے کوئی اطلاع پہنچیں گی جواب تک
ابھی نہیں سنئی، اس بارے میں اطلاع دیجئے، تمہارے آنے میں
کوئی تک ٹوائس کے بعد ہی پیدا ہوگی۔
'فنون' ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ ماسکی جی کو یاد دلواؤ
ویسے نیا دون کی نئی توڈ کے ارشادات تو ادھر آ رہے ہیں

ہی رہتے ہیں، اور اب تو انکی باتیں بھی سُرانی ہو گئی ہیں،
 سب سے گناہ کیا تھا، ایک آدمی دن میں جواب لکھتا تھا
 شکر کہ ان کی اطلاع تھی، کس حال میں ہیں محمود صاحب کے
 کہتے کہ یہاں پہنچ کر قہر اور کڑھتے پر اطلاع کر دیں ٹیلیفون
 نمبر FIN 0714 ہے، آج کل یہاں جو کسم با کسل ہو رہا ہے گدی جاڑوں
 کا ہے لیکن وہ بات کہاں،

نفیس صحبت و اراں نہیں تو کیا کیجئے
 یہ رقص سایہ سر و دھن چار ماہوسم
 ہم سب کی طرف سے سحر یہ لہر کچوں کو مست کیا ہمار
 منقہ خلع
 فیض

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

Cornwall Avenue
 Finchley N-3
 آپ کے یہاں کون سا کام دیکھنا
 Tel. FIN 0714

مگر تجھ خیال نہیں کہ اس رسم سے جو کچھ ہوتا ہے اس سے کچھ
توڑ کر ناچا گیا ہے کچھ تیار کر دیا گیا اس سے کچھ جو اس کو
دوبارہ رکھتے، اگر یہ وقت موزوں ہو تو مجھے سیشن پر مطلع کر دیجیے
بیتجہ مدد خود کو دوا
مفتی

انہی قادی کے نام

پاکستان
لاہور
۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء

مکرمی اطہر علی، علی

اپنے خط کا شکر، دلالت ہے کہ
کے سلسلے میں یہاں گفتگو کی ابتدا ہو چکی ہے
عزرا دیوں سے آگے شور رہا ہے، کوئی
محملی جو یہ مرتب ہو جائے کہ بعد آپ حضرات

کو مطلع کر دیا گا، آپ کو اردو اور منہج
ادبیوں کو یکجا کرنے کی سعی کرتے رہے گو ششتر
ہی ہو نا چاہیے کہ یہ فقہ ذاتی اور سیاسی امتدادیات
سے الگ رہے اور اسے خالص ادبی نقطہ نظر سے
دیکھا جائے، اگر عملی ادارہ لیں وہاں کو
بھیجا دیں نقد و تنقید

حزین لدھیانوی کے نام

مکرر خیر و تسلیع

آج کل سب اس عاجز صفت پر
اس لئے اُنکی دُعاں میر دیکھ رہے ہوں

جگہ ہوتا ہے "کے بارے میں پھر اعتراضات
کے بالکل متفق ہوں، غالباً محبت میں کسی
نے غور نہیں کیا،

غزل کے متعلق غالباً سب طبع حسن
والہ پر آپ کو مطلع کر سکتے، فقط
خلفہ
فین

شیم پیر کے نام

موصوفان، اٹکن، لدور

۱۹ / ۴ / ۶۵

عزیزی

آپ کا خط ملا، آپ کو شروع کی شکست سرگم آچو
پیش آئی، آپ صحت سے کام نہ جانے کی کوشش کیجئے، اگر مجھے کہیں
پتہ کی صورت تو آئی تو ذہن میں رکھوں گا۔ فقط

فین
فین

صہبا لکھنوی کے نام

دور

۲۵ مارچ ۱۹۵۹ء

مکرم صہبا جی، شکس،

نظمِ ہارنہ، ناخبر کہ تے معذرت خواہ تھیں
منہ
منہ

دلفگارو حلو

بشمِ غم جانِ شوریدہ گامی نہیں،
تہمتِ عشقِ پوشیدہ گامی نہیں،
آج باز ارمیں یا بھولان حلو
دستِ افشان حلو، مست و درو قد حلو
خاکِ میر حلو، خونِ بدایاں حلو
راہِ تلتا ہے سب شکرِ جانان حلو
خلوتِ خاص لہی، جمعِ عام بھی،

شیر الزام بھی شہنشاہ دشنام بھی ،
 صبح ناشاد بھی ، روزِ ناگام کبھی ،
 افکارِ مساز اپنے سوا کون ہے ،
 شہدِ جان میں اب با صدف کون ہے ،
 دستِ قاتل سے شاہانِ راج کون ہے ،
 رختِ دل باندہ لودِ نفکار و حلو ،
 سحرِ بھیس قتل ہو آئیں بار و حلو ،
ابراہیم جلیس کے نام

پاکستان آرٹ گیلری
 لاہور
 (۱۹۹۰)

برادرم جلیس دعاؤں میں ،
 آگے نظر پہنچا ، ستِ سریت کوئی ، شیرِ آباد
 کے ایک دو خط اسی سلسلے میں بھیجے گئے ہیں

نہ بد صدیقی و حب کو سب دن جوئے معذرت کا خط
 لکھا تھا، معلوم ہوا کہ راستے میں خود برد ہو گیا،
 بعضی قصہ یوں ہے کہ حیدر آباد دیکھنے لگا حجہ خود بہت
 اشتیاق ہے ملک مجبوریاں تمہیں معلوم ہیں، فی الحال کوئی
 صورت جاننے کی نہیں ہے ورنہ ضرور جاننا۔ میری جانب
 کے معذرت۔ بعد اظہار تاسف لکھ بھیجی، اور یہ بھی کہ
 خندہ پر نوشتہ محبت باقی ہو۔

امید ہے کہ آپ لوگ لبائیت مونس۔

فصل
 نثر

ایک خط، ایک عورت نامہ

بارون کالج
 شاہ ولی اللہ روڈ، کھنڈہ، کراچی

۲۲ نومبر ۱۹۶۲ء

میری تحلیم،

اتوار ۲۲ نومبر ۱۹۶۲ء کو جاریے کالج میں

انجمنِ اساتذہ کرام کالج کی طرف سے

"عوامی تعلیم کے مسائل"

پر ایک مذاکرہ منعقد ہوگا جس کی صدارت

جناب ڈاکٹر سعید الامام صاحب مدلیق، چیئر مین پٹیالہ کی آغا

فرمائیں گے، اور اسی روز کالج کے ادارہ اعلیٰ علمی تحقیقات کے اختتام میں

شہرہ العالی ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پورہ کی میزبانی پر

منائے جائے گی جس کی صدارت

جناب ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم "خلیل"

فرمائیں گے۔

دو دن اجلاسوں کے پروگرام اس وقت کے ساتھ منسلک ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جناب ان تقریبوں میں شریک ہو کر مجھے اور

کالج کے اساتذہ کو فہم فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص

فیض اللہ فیضی

پر سپر

فیض احمد فیض

جیل کی سلاخوں سے

(بیوقوف کے نام)

(۱)

۱۲ جون ۱۹۵۱ء

شبانم

مجھے امید ہے کہ تمہیں میرا پچھلا خط مل گیا ہوگا۔ ان خط کو اسنے سارے ہاتھوں سے گزرا پڑتا ہے کہ ان کے پچھنے میں تاخیر ناگزیر ہے۔ اس لئے اگر تمہیں کافی عرصہ تک میرا کوئی خط نہ ملے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ طویل عرصہ کی تنہائی اور بے کاری کے باعث انسان چند موضوعات پر کچھ عجیب انداز میں سوچنے لگتا ہے اور غالباً میرا پچھلا خط اسی کیفیت کا مائل تھا۔ لیکن تمہیں اس پر کوئی خاص توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو صرف اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ دل باتیں کرنے کو چاہتا ہے ایسی باتیں جو ہم نے کافی مدت سے نہیں کی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ باتیں مجبوراً برسر عام کی جارہی ہیں۔

تیرہ جون کے بعد سے میں نے اپنی چھٹی نظم مکمل کر لی ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے کچھ نیا نیا تقریباً اٹھ ماہ میں لکھ لیا ہے جتنا پچھلے تین سالوں میں لکھا تھا لیکن یہ شاعرانہ جذبہ بھی اب اپنے اتمام پر پہنچا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں ہمارے ارد گرد اس قدر شور مچا رہا ہے اور تڑپ مالت ہے کہ اس عالم میں سوچ بچار ممکن ہی نہیں۔ اس کے علاوہ ہم اپنے مقدمہ کی تیاری بھی کر رہے ہیں۔ اس لئے خود اپنی ذات کے متعلق کچھ کرنے دھرنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ میں نے اپنی کھوئی ہوئی محسوس کچھ حصہ واپس حاصل کر لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ جب یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا تو میں پھر لکھنے کی جانب منسوب ہو جاؤں گا۔

یہاں موسم گرم ہونے لگا ہے لیکن ہوا چلتی رہتی ہے۔ اس لئے ناقابل برداشت نہیں ہوا ہے۔ لاہور تو تپ رہا ہوگا بچوں کا کیا حال ہے؟ تم بھی ہو؟ کیا تم نے خبر پرچ کا صاحب متوازی کر لیا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم پریش نیوں میں گھبریں ہوگی لیکن ہم اس سے بڑی پریش نیاں بھی جھیل چکے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں تمہاری فکر کرنے کے علاوہ میں قانع اور خوش و خرم ہوں۔ اب تو ہم شطرنج اور ٹینس بھی کھیلتے ہیں۔ اور کھانے پینے کی چیزیں بھی وافر ہیں مجھے ابھی تک تمہارا خط نہیں ملا اس لئے ہندو خط لکھو۔ مہتری اور مٹی کو میری جانب سے پیار کرلو۔

اور اگر فرصت ہو تو میری ان کی ٹھکانے بندھانے کی کوشش کرو۔

تمہارا فیض

(۲)

۱۸ اگست ۱۹۵۷ء

جان من !

مجھے انہیں کہے کہ میں تمہارے خط کا جواب جو مجھے چار روز قبل موصول ہوا تھا تاخیر سے دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس دور میں میرا آخری خط مل گیا ہوگا۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوگا کہ تمہاری مکان کی پریشانی بالآخر دور ہوگئی۔ ان تمام پریشانیوں اور مسائل سے ابھٹنے کے لئے تمہیں تنہا چھوڑ کر میں خود کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔ لیکن شاید اس میں بھی بہتری کی کوئی صورت ہو۔ جب تک لوگوں کو صاب کا سامنا نہ ہو۔ ان سے بڑا آزار ہونے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ پھر بھی میری خواہش ہے کہ کشمیر میں تمہیں ان سے پیٹنے کے لئے تنہا نہ چھوڑنا۔ بلکہ ہم دونوں مل کر تمام مشکلات کا سامنا کرتے بہر حال ہمت رکھو تمام پریشانیوں بند ہی دور ہو جائیگی۔ زندگی میں، بے شمار ایسی باتیں ہیں جن کے لئے انسان زندہ رہنے کے تھکا کرنا رہتا ہے یہ درست ہے کہ انسان ہمیشہ جوان نہیں رہتا اور فیضی سے پہلے کے چند سال بیش بہا ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میں ان چند سالوں کو اچھی طرح گزارنے کا موقع ضرور ملے گا۔ یہ سوچ کر کہ یہاں کے نوجوان میل جول کا ادب و احترام کئے ہیں مجھے تسلی بھی آتی ہے اور دوا بھی۔ خاص طور پر اُس نوجوان کپتان کا جذبہ احترام دیکھ کر جسے میں قرآن پڑھاتا ہوں۔ چونکہ یہاں کے فقر سے حلقہ میں لوگ فوجی عہدوں کی بابت زیادہ ترجیح نہیں دیتے۔ اس لئے ہر ایک سے ہی امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنا کام خود کرے لیکن یہاں بھی مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ مجھے سگریٹ یا آئینہ گلاس بانی کے لئے اٹھانا نہیں پڑتا۔ اس کا ایک افسوس ناک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ میری وہ تمام اچھی عادتیں جو میں نے لاپٹونریل میں بنائی تھیں تیزی سے چھوٹی جا رہی ہیں اور میں پہلے کی مانند بننا چاہتا ہوں۔ ان کے لئے تم سے غلط کہہ سکتا ہوں۔ ہماری ملاقات رات گئے ہوئی تھی اور تم گئے تھے انہیں یہ منافع اس بنا پر ہوا کہ ہم انتہائی کشیدہ ماحول میں ملے تھے۔ انہیں یہ گمان تھا کہ مجھے اُن سے کوئی نکلے ہے اس لئے وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگے اور تم جالو صفائی پیش کرنے کا فعل مجھے عجب دیر لگنا چاہیے کہ مجھے زیادہ نہیں کہنا تھا اس لئے ہمارى ملاقات جیسی خوشگوار ہوئی چاہئے تھی نہ ہو سکی جس کا مجھے رنج ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ میری صحت بالکل اچھی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس بات کا انہیں ہے کہ میرا وزن بڑھ رہا ہے اور وہ دس پونڈ وزن جو لاپٹونریل میں کم ہو گیا تھا واپس مل رہا ہے البتہ بات یقیناً پریشانی کی ہے کہ ہم سب ٹینے ہوتے جا رہے ہیں چونکہ یہاں گرو زیادہ ہے اور میرے بالوں کی حالت جو عام طبع پر خراب رہتے ہیں بدتر ہوئی جا رہی ہے مجھے تو اندیشہ ہے کہ اس وقت تک جب میں جیل سے باہر نکلوں میں اپنی جنسی کیش بالکل کو چکا ہوں گا جو یقیناً قابلِ رحم حالت ہوگی۔ اس لئے کہ پھر اس کی نڈل چھلانے والے کیونکر میرے متعلق کوئی نواہ چھلا سکیں گے۔ ایک بوڑھے اور گنتے سے کوئی اس کی نڈل منسوب کرنا بلاشبہ دشوار ہوگا۔

اچھا اورا کا بڑا پیارا خط ملا ہے۔ یہ خط میرا خط پہنچنے سے قبل لکھا گیا ہے۔ بہر حال اب انہیں میں داخل مل گیا ہوگا۔ تمہیں فرصت ہو تو میرے خط کا انتظار رکھنے پر مجھ خط لکھیں راکر دو۔ میرے پاس تو تمہیں بتانے کے لئے کئی باتیں باقی ہیں ہوتی نہیں۔ لیکن میں تمہاری خیریت اور کیوتوں کی بابت معلوم کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہوں۔ یہ جان کر کہ وہ کیا کر رہے ہیں مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ کیونکہ میں ان کا تصور کر لیتا ہوں اور اس طرح ان کا قرب محسوس کرنے لگتا ہوں۔

اب یہ بات یقینی ہے کہ یہ مقدمہ چار پانچ ماہ چلتا رہے گا۔ لہذا تم اپنے آٹکے پر ڈرامہ میں اسی کے مطابق رد و بدل کر سکتی ہو۔ نوٹرز نے مجھ سے کہا ہے کہ فکیل ستمبر میں آنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ آئے ہیں تو تم بھی ان کے ساتھ آ سکتی ہو۔ مجھے کتا میں مل گئی ہیں۔ بلکہ یہ کتا درست ہو گا کہ کتا میں یہاں پہنچ چکی ہیں اور مجھے جلد ہی مل جائیگی، میں نے حیدر کو لکھا ہے کہ میرے پاس امروز اور پاکستان ٹائمز بھیج دیا کرے کیونکہ مجھے انہیں منگولنے کی اجازت مل گئی ہے اور میں بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر انھوں نے بھیجنا شروع نہیں کیا ہے تو تم کہہ جلد بھیجوا دو۔

جب تک میرا بیٹا نہ پیدا ہو اور جب تک مضموم جیلر کو میری جانب سے جوم لو۔ زیادہ پیار قبول کرو۔ میسرے کو اب کی جانب سے سالگرہ کی مبارکباد دیجئے۔

فیض -

(۳)

اتوار ۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

جان عزیز !

جیسی کا ہفتہ ختم ہو رہا ہے اور کل ہم سب اپنی دروزمرہ کی بیگیا میں پھر مصروف ہو جائیں گے۔ اس ہفتہ ہم نے کئی سماجی تقاریر سنیں۔ پہلی تقریر "دوست گھر" یہ کہنے کی دعوت تھی جس میں ہمارے گھر کے علاوہ ایک اور صاحب بھی مدعو تھے۔ دھت اس ٹکوری کا پیٹریٹ کے اعزاز میں دی گئی جو بریڈ پیٹریٹ کو آم اور دیگر پھلوں کے ساتھ اپنی بیوی کی جانب سے موصول ہوئے۔ باہر جا کر کھانا کھانے کا تاثر قائم کرنے کی غرض سے ہم نے خاص لباس پہنا۔ دوسری سٹار تقریر وہ عید پارٹی تھی جس کے بارے میں ہمیں بتا چکا ہوں۔ یہ غالباً پہلا موقع ہے کہ میں بچوں کی آوازوں کے نغموں سے محفوظ ہوا۔ سالانہ ماضی میں انھیں کبھی گواہ نہ کر سکا۔ اگر کے بچے اور تین چار دوسرے قیدیوں کی بیویاں اور بچے بھی آئے تھے جن کے ساتھ چند دوسرے رشتہ دار اور مددگار بھی تھے اور اس طرح ہمیں فرار کے چند گھنٹے نصیب ہو گئے۔ مجھے یقیناً انتہائی مسرت ہوئی اگر تم بھی یہاں موجود ہو تیں لیکن شاید یہ بہتر ہی ہو کہ تم شریک نہ ہو سکیں۔ ایسے موقعوں پر دو دو کرب کا ناخوشگوار تاثر قائم ہو جاتا ہے اور اس لئے مجھے وقتی مسرت و سکون کے بجائے اس غلغلے و کرب کا زیادہ احساس رہا جو بیویوں اور بچوں کے دلوں میں ایسے لمحات کے گزر جانے کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ مسیحا و لزوم کا یہ ممد اب تک حل نہیں ہو سکا۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ انسان وقتی مسرتوں سے محض اس لئے کنراہ گئی کرے کہ اس کے بعد پیدا ہونے والے اضطراب سے بچ جائے۔ کیونکہ یہ یکن نہیں ہے کہ منہ جو وہ اور آنے والے لمحات کو متوازن کیا جاسکے۔

مہال کی زندگی معمولی جنینات میں اتنی الجھی ہوئی ہے کہ کسی کو اخلاق و فطرت پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ چند دنوں تک دیکھ اپنے نئے ریڈیو سٹ میں آٹھ ٹکڑی دیکھتی رہتی تھی۔ وہ جتنی دیکھتی تھی اتنی ہی فکریں میں لیتی ہے۔ اس کے بعد ایک کالی طے نے حمایت وارڈ میں ایک سیاہ و سپید بچے کو ختم دے کر ہمارے لئے بچوں کی پرورش کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ پھر عید کی دعوت کے لئے کھانے کی اقسام ملنے کرنے کا مسئلہ آیا۔ ان کے علاوہ بھی متعدد داخلی مسائل ہیں۔ مثلاً ہمارے زندان کے لئے پردوں کی فراہمی۔ چار پائی اور صبح کی چائے کا انتظام وغیرہ۔ ان تمام مراحل کے درمیان دنوں کی یکسانیت کے اوپر یادوں کے سائے پھیلے جاتے ہیں اور وقت کی منہج سدھم ہوتی جاتی ہے۔

چونکہ دن چھوٹے ہونے لگے ہیں۔ اس لئے جب ہم صبح کی چلنے کے لئے اٹھتے ہیں تو کافی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ میرا یہاں ہے کچھ طویل سحر سے اور سوئے جیسے پہلے جاؤ کو رفتہ رفتہ رو پہلے جتے دیکھتے ہوئے سالوں گزر چکے ہیں۔ وہ جیل کی یو امدوں میں بھی حسین نظر آتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ تمام پریشانیوں کے باوجود زندگی کا شکر کیا دیا گیا جائے۔

تائید کی کتاب مجھے آج مل گئی ہے۔ میں عزیز دی کارروائی جلد ہی کروں گا۔ کاش مجھے اتنا ذہنی سکون میسر ہو تاکہ میں اس کے ماتحت انصاف کر سکتا ہوں۔ بہر حال میں اپنی بہترین کوشش کروں گا۔ ان کی نظموں کا کیا بنا؟ اگر مسودہ مکمل ہو چکا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ ہم اسے چھپوا دو۔ اس کے لئے حمید احمد خاں سوانی خاک تحریر کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد کسی تعارفی مضمون کی ضرورت نہ رہے گی۔ بالآخر جیل کے افسران سے براہِ درویش کا چیک مل گیا ہے لیکن اس میں تمہارا لائسنس بھی شامل ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے تمہیں تقریباً چھ سو روپے کا گناٹا دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے جیل کے اخراجات کے لئے دوسروں کا پانڈا لائسنس منظور کیا گیا ہے اور یہ رقم تمہارے لائسنس کے علاوہ ہوگی۔ لیکن اب ان لوگوں نے دونوں کو ملا کر قین سو کی رقم بنا دی ہے اس پر متواہد کہ ان لوگوں نے اس کی ادائیگی 4 مارچ کے سبب سے لے کر جس دن میں گرفتار کیا گیا تھا اس دن یعنی 18 مارچ سے شروع کی تھی تاہم حیرت ہے۔

میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس کے متعلق جج ججک کروں۔ سن شاید تم اس کی بابت کچھ کر سکو۔ ججٹ دیکھ تمہیں خود دیکھو تا محسوس کرنے کی نوبت آئے۔ میں تمہیں اس خط کی نقل دیتا ہوں۔ جیل والے تمہیں رقم بھی بھیج دیں گے۔ کم از کم یہاں اگر راجی کھا کر ایہ تو نہیں ہی آئے گا۔ میرے خیال میں میرے لایسنس منتقل کئے جانے کے امکانات کم ہیں۔ اس لئے تم اپنے بروکرام کے مطابق آسانی ہو۔ میں بصداقت یا قیاساً منتظر ہوں۔ تمہیں اور بچوں کو بہت بہت پیار۔

(۳)

نمبر ۲۰ مئی ۱۹۵۵ء

حسان عزیز

تمہارے تمام خط مل گئے۔ انھیں پا کر میں خود کو منہموں اور گرم محسوس کرنے لگا ہوں (غالبا مجھے گرم کے بجائے سرد سمجھا چلے ہیں اس لئے کہ جہنم کی قسم کی یہاں سخت گرمی ہے) چونکہ میں ابھی اگلے بیس سال تک اسی زبان کو استعمال کرنا ہے اس لئے میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ انگریزی محاوروں کو جو سننے کی تھی جائے اور گرم کے بجائے سرد مسودہ کے بجائے گرم اور صوب کے بجائے بارش وغیرہ کا استعمال شروع کر دیا جائے۔ حیدر آباد میں اکبر اور میں نے اس قوی کام میں ہاتھ بٹائے اور اردو کے محاوروں کو انگریزی میں منتقل کر کے کرشن کی بھٹی جٹا۔ (Heart being garden garden) دل باغ باغ ہو گیا۔ دلچسپ نہ ہوتے ہوئے بھی کافی مشہور ہے لیکن چند دیگر مثالیں تو واقعی جواب ہیں مثلاً (He is straightening his own owl) وہ اپنا تو سیدھا کر رہا ہے۔ یا (He is striking in every place) ہر طرف اس کا طوطی بول رہا ہے۔ لیکن میں تو گرمی کی بات کر رہا تھا۔ یہاں جہنم کی گرمی بڑی ہی ہے اور لاہور بھی اس سے بہتر نہ ہوگا۔ ممکن ہے بدتر ہو۔ بہر حال میں زیادہ پریشان نہیں ہوں۔ ناشتہ کے بعد ہی میں خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا ہوں۔ میرا کمرہ کافی ٹھنڈا ہے جس کے لئے میں غفار خاں کا شکر

فیض احمد فیض

انکارِ غصہ منیر

جیل کی سلاخوں سے

گزارہ ہوں۔ وہ بھی نہیں رہ چکے ہیں۔ اور پھر اس وقت تک باہر نہیں نکلتا جب تک دن ڈھل نہیں جاتا۔ میرا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن اب میری بیانی پہلے جیسی نہیں رہی اور مجھے بار بار رک کر اپنی آنکھوں کو آرام پہنچانا پڑتا ہے جس سے پڑھنے کا لطف جاتا رہتا ہے۔ انسان خلا میں نہ سوچ سکتا نہ محسوس کر سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے ایک ہی اہمیت میں روزِ بزرگ کے تمام خطوط پڑھ ڈالے۔ مگر بار بار مجھے کتاب رکھ دینا پڑی ہے تاکہ اپنی سانس سمیٹ سکوں انہیں پڑھتے ہوئے میرا گلابھرتا رہا ہے۔ ان دنوں میں فریڈرک مشہور کتاب "سنہری شاخ" (GOLDEN BOUGH) پڑھ رہا ہوں۔ میں نے اس کتاب کو کالج کے ایام میں سرسری طور پر پڑھا تھا اور میرے دل میں اسے اطمینان سے پڑھنے کی خواہش موجود تھی۔ (جن دو عمری کتابوں کو اطمینان سے پڑھنے کی خواہش باقی ہے ان میں ہولاک ایلس اور برٹن کی تخلیقات یونانی ڈرامے رادھا کرشنن کی کتاب ہندوستانی فلسفہ اور نیوشس کی تصنیفات شامل ہیں۔ تم فراخ دل دوستوں کے شعلت پران کتابوں کو تلاش کرتی رہنا) میں ختم کروں تو تم بھی فریڈرک کا مطالعہ کر لو۔ ہمارے ملک کے لوگوں کی بنیادی تعلیم کے لئے اس کا معاملہ لازمی ہے۔ رجنی بات میری شاعری کی تو حقیقت ہے کہ ذہن میں تو مہبت کچھ ہے لیکن کاغذ پر ہوائے نام جیل سے متعلق جتنے مونیوات ہو سکتے تھے ان سب پر لکھ چکا ہوں اور اب جیل میں کسی نئے مونیوات کی توقع نہیں ہے۔ جیل کے باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے متعلق کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ بہر حال میں دو تازہ نظمیں منسلک کر رہا ہوں۔ ایک کا محرک روزِ بزرگ ہے اور دوسری کالا ہوئے جیل۔ یہ نظمیں ایسی تو نہیں کہ خاص طور سے تمہارے پاس بھیجی جائیں لیکن ممکن ہے وکٹر انہیں مجموعہ میں شامل کرنے کے لئے اپ نہ کرے۔

مقامی اخبارات میں مجھے شبیہ کا دلچسپ چہرہ نظر آیا ہے۔ میں بچہ خوش ہوا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ شہرت حاصل کرنے کے لئے میری کون سا کارنامہ انجام دینے والی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی، اور قبل اس کے کہم جان سکیں ہمارا گھرانہ ایسی بے بیوقوفیوں سے بھر جائے گا!

جیسا کہ تم دیکھ سکتی ہو، میں خوش و خرم ہوں لیکن تمہاری اور بچوں کی یادوں میں کچھ کے ماری رہتی ہے۔ اپنا خیال رکھو اور کسی بات کی فکر نہ کرو۔ کیونکہ اب یہ ہماری جدائی کا آخری موسم گرما ہے۔ چند ہفتوں بعد ہم آخری سال کے ٹیلیسے اور پہنچ چکے ہوں گے اور پھر اپنے ملاپ کے بقیہ مہینوں کی ڈھلوان پر اتنا شروخ کر دیں گے بچوں کو میری جاہلیت سے بے پروا کرو۔

گولڈ ماری

فیض

(۵)

ہفتہ ۱۳ جون ۱۹۵۴ء

تجانبہ!

دو روز ہوئے تمہارا خط ملا جو خوشگوار نہ تھا۔ لیکن اور چیزوں کے علاوہ ان دنوں موسم بھی ایسا نہیں ہے کہ بہت بڑھا سکے۔ آدھم دونوں ان حالات پر اس انداز میں غور کریں۔ اگلے دو دنوں کے بعد ہم جون کے وسط میں ہوں گے اور اگلے دو ہفتوں کے بعد ہم موسم گرما کے وسط میں ہونگے اور ایک ماہ بعد ہم اس خراب موسم گرما کو پیچھے چھوڑ چکے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ایک ہفتہ کے بعد دن چھوٹے ہونے لگیں گے۔ راتیں طویل اور سایہ گھٹنے لگیں گے۔ یہ ہیں برادرسنگ کی وہ نظم یا قلم

ہو گی۔

سال کے اس حصہ میں دن کافی طویل ہوتے ہیں

لیکن راتیں۔ کم از کم راتیں تو چھوٹی ہوتی ہیں

تم کہو گی کہ یہ تمام باتیں اجتماع نہ ہیں کیونکہ ان سے نہ دن کی تمازت میں کمی آجائے گی نہ ہماری جیب میں کوئی رقم پہنچ جائے گی۔ ممکن ہے تمہارا خیال صبح ہو لیکن موجودہ حالات میں ہمارے پاس الفاظ اور جذبات کے علاوہ اور کیا ہے؟ مثلاً امید۔ ہمت اور محبت یہ سب قابلِ فخر سرمایہ ہے جس سے روح کی بالیدگی اور دل کی مسرت قائم رہتی ہے لہذا لازم ہے کہ ہم مسرور و شادمان رہنا اور گرمی۔ خالی جیبوں اور یرقانِ دلوں کو جہنم میں جھونک دیں۔ ظاہر اور جہان کے متعلق جان کر دکھ ہوا، مضمون بچے۔ میرے خیال میں یہی بہتر ہو گا کہ وہ تمہارے ساتھ ٹہریں اور پسند و ناپسند پر سفر کر لیا کریں۔ کچھ زیادہ خرچ بھی نہ آئے گا۔ عنایتِ ملتان میں ہے اور ممکن ہے کہ وہ کچھ مدد کر سکے۔ مجھے اس کے خط کا جواب دینا ہے اور میں اگلے ہفتہ اُسے خط لکھنے کی سوچ رہا ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ موسم کی وجہ سے تم نہ آ سکو جس کا یہ مطلب ہو گا کہ ہفتہ کے بجائے میں تمہیں بیر کو خط لکھوں گا۔ مجھے تمہاری مالی پریشانیوں کا حال سن کر افسوس ہوا۔ میری رائے میں مناسب یہ ہو گا کہ تم اپنی مختصر صحبت میں سے اتنی رقم نکال سکتی ہو جو زندگی کی جانب واجب الادا ہے اس لئے کہ جلدیادیر سے روٹ وہ رقم ضرور لو کر دے گا اور اُس وقت تم اپنی بچت سے نکالی ہوئی رقم واپس کر سکتی ہو۔ تم کراچی کے اخباروں کیلئے مضامین کیوں نہیں لکھتے؟ ضروری نہیں کہ تم انسانی نفسانے ہی لکھو۔ اس کے لئے تمہیں سکون اور محنت کی ضرورت ہو گی لیکن تم عورتوں اور بچوں کے بارے میں مضامین یا رپورٹس لکھ سکتی ہو اور مجھے امید ہے کہ تمہیں ان کا معاوضہ مل جائے گا۔

دکتر کو خط لکھو تو لکھ دینا کہ اگر اس کے خیال میں میرے وہ مضامین جو میں "نیو اسٹیٹسٹ" کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اچھے ہیں تو وہ انہیں بھیجتا رہے۔ چند سال قبل کنگسٹن مارٹن نے مجھ سے کچھ ترجمے مانگے تھے لیکن میں نے کہہ دیا تھا کہ میرے پاس اچھے ترجمے نہیں ہیں۔ اب بھی میری ہی رائے ہے لیکن ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وکٹر یا نائیر انگلستان کی کسی اچھی نرسری سے بچوں کے بیج کے چند پیکٹ خرید کر مجھے بھیج دیں۔ انھیں ضرور معلوم ہو گا کہ وہاں گرمیوں کے ادھیڑوں کے کون سے پھول ہوتے ہیں۔ ————— چھوٹے پیکٹ کی قیمتیں چند پنس سے زیادہ نہ ہونگی اور ایک خرچ بھی چند فلنگ سے زیادہ نہ ہو گا۔ دوکاندار خود میرے پاس بذریعہ ڈاک بھیج سکتا ہے۔

میں نے فینسی ڈریس کی تصویق کی ہے بھالے چہروں کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میری بھارت نے میری مدد نہ کی۔

یہاں گرمی ضرور ہے لیکن ناقابلِ برداشت نہیں اور میں بالکل تندرست اور توانا ہوں۔ بالکل قلموں سکے کے مانند۔۔۔۔۔ یہ جلد چوس کر کاٹے جو ان دنوں میرے مطالعہ میں ہے۔ مجھے موسم کی تبدیلی کا انتظار ہے۔ وقت سے پہلے کیونکہ اس کا مطلب فرضِ موسمِ بہار کی آمد سے کچھ زیادہ ہو گا۔ مہما بھی انتظار ہے۔

تون ماری

فیض۔

گلشیہ ادبیات



پھلکے ہی ہے جوانی ہراکٹ بن مٹو سے

فیض کا شباب - ۱۹۳۳ء میرے کورسٹنٹ کالج لاہور سے ایف اے کرنے کے بعد



جلال
فرق
سنگدار
کونفر
نمبر ۱



میرزا محمد علی خان
نمبر ۱





کیسے اک چہرے کے کھڑے ہو مانوس نقوش
دیکھے دیکھتے یک نخت برل جساتے ہیں



افکار فیض گبر



فیض، ایلس فیض کے ہمراہ
راویٹری سائیکس سے رملی کے نور ایڈیٹر ۱۹۶۵ء



فیض جنیوا کی بین الاقوامی کانفرنس میں
پاکستانی مندوب کی حیثیت سے ۱۹۶۹ء



فیض فلم جاگو ہوا سویرا کی شوٹنگ کے دوران
مشرقی پاکستان کے ایک گاؤں شبتولے میں (۱۹۵۵ء)



فیض، پاکستان نامہ کرکٹ کلب کے سٹیپین
کی حیثیت سے فیملی میں ۱۹۵۶ء



منیزہ، فیض، ایلس فیض اور سلیمہ



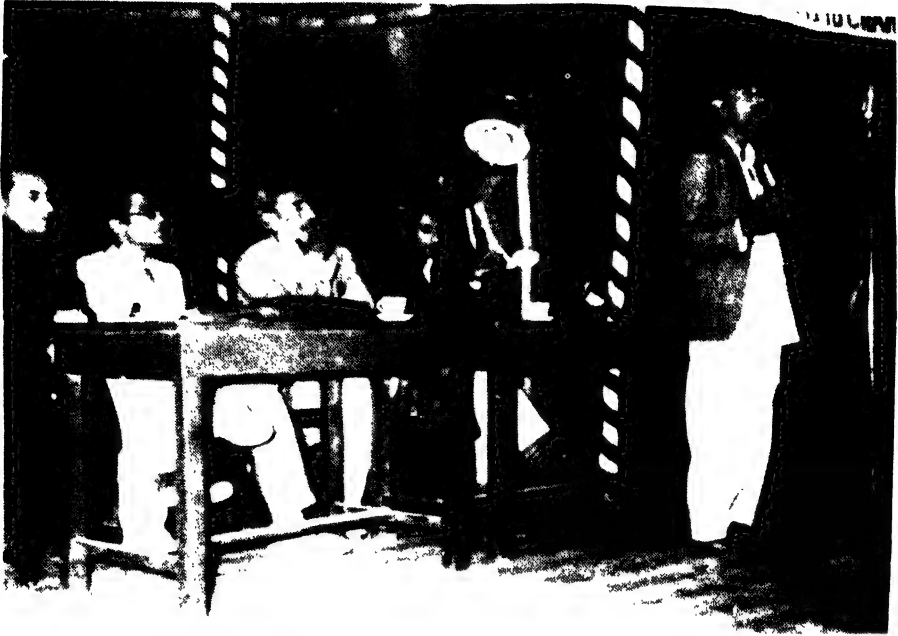
ایلس فیض، منیزہ، سلیمہ اور فیض



کے پاکستان پوسٹمیں یونین کے صدک جیدیت
 انہوں نے پاکستان یونین کے صدر کی تقریر ۱۹۶۵ء



رب کے مودے ۱۹۶۵ء یونین کے نائب صدک جیدیت
 انہوں نے پاکستان یونین کے صدر کی تقریر ۱۹۶۵ء



انجمن ترقی ہند، مصنفین پاکستان کے سالانہ کانفرنس (۱۹۵۵ء)
جبے کے مشترک صدارت رہے (بایں سے) فیض احمد ندیم قاسمی
سید محب فرید اپنی اور ریاض رؤف نے کمی



لاہور کے قلمی اڈے پر روسے ادیبوں کے وفد کے ہمراہ (۱۹۵۵ء)
دائیں جانب شمس بہار احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، ممتاز حسین، فیض



فیض، پکستان ٹائمز کے کرسٹے ادارت پر کے ایچ، خورشید
صدر آزاد کشمیر اور امین ترین کے ہمراہ - (لاہور ۱۹۵۶ء)



فیض، ہندو سازش کیس سے رہائی کے بعد پاکستان ٹائمز
اور، سروز کے عمل کے استقبال کے دنوتے میں - ۱۹۵۵ء



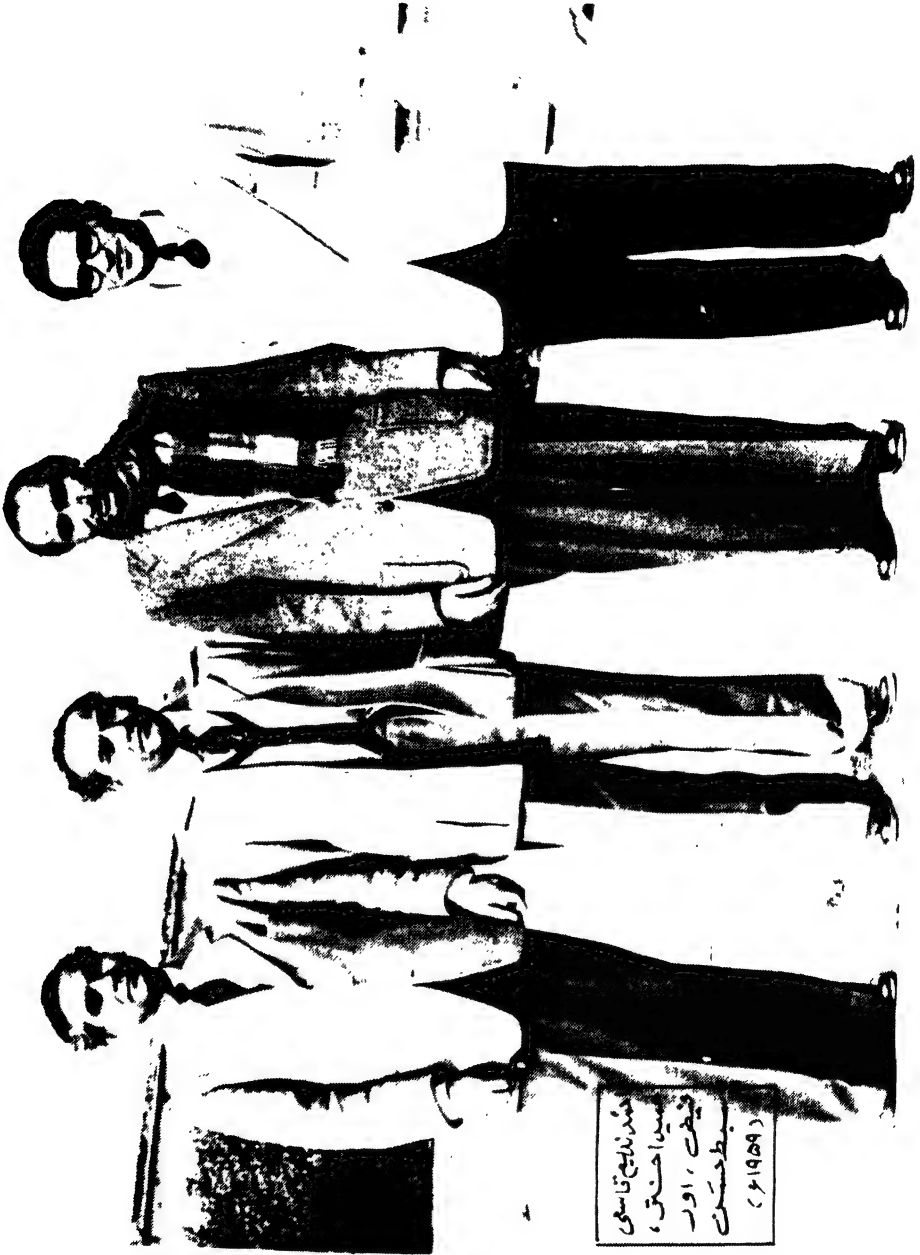
ایشیائی کانفرنس دہلی کے دوران
 وائس شہ: سر جارج جیکس - بنیادیں، فیض،
 بیگم قدیمہ زینب - جینڈر کمیشنر ایچ ایم سوری
 بیگم زینب کے گھر (۱۹۵۶ء)



روسی ادیبوں کے وفد کے استقبال کا ایک منظر ۱۹۴۹ء پہلی صف میں دانش سے
پہلے شہر پر قبیل شفق، چوتھے نمبر پر فیض، اور آخر میں شہر ہاشمی نظر آ رہے ہیں



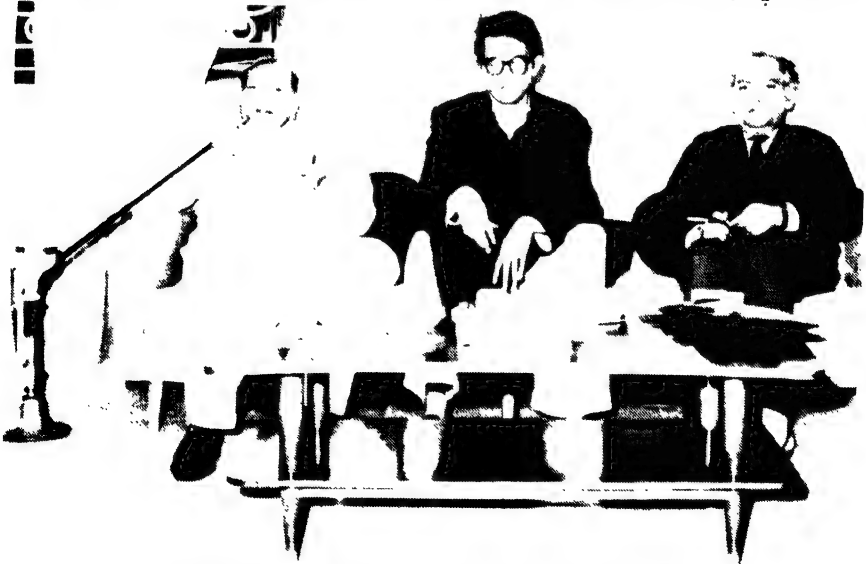
فدحہ جاگروہوا سویا کے یونٹ کے ممبر ۱۹۵۰ء۔ ساتھ فیض اور وزیر آباد بنگوی نظر آ رہے ہیں



مذہب تاسی
شیر، احسن،
اولر، ریشی،
طوس (۱۹۵۹ء)



فیض اویسنے ایرتھ ہیڈ لائبریری میں فنے کا رزویا، ایران کے تخلیق معبسم فیض کے ساتھ (۱۹۹۰ء)



فیض، مصور صادقین اور فقیر وحید الدین (۱۹۶۳ء)



بائیں سے: فدیسا راج پور سلطانہ مجبوری میمن، سواد، مجبوری، غصمت چغتائیک اور محمد زبیر ربیبی،



پاکستان کے ہائی کمشنر
راجہ فضل الرحمن خاں کے
زیارت نامہ یوں اقبال کے
موقع پر دھن کا ایک لہند
دیباکے مشاعرہ جوئے میں
بھارت کے نائب صدر
(موجودہ صدر) رادھا
کرشنن اور وزیر
خود کے اجیت پرشاد
جین نے بھی شرکت
کے - (۱۹۵۶ء)



نیدرلینڈ
کے ایک مشاعرے میں
فیض بکر کے پسر
بہت نظمیں
دائیں جانب شوبہت
تھوڑی اور اساتذہ
دائیں نظر آ رہے ہیں

فیض کے
صدائے
ادب احمد
تبیخ تاقی
کا سلام
لاہور کا
ایک مشاعرہ
(۱۹۵۶ء)





مدد تدبیر قاسمی، فیض اورایت بھارتی ادیب



قتیلہ شطانی، کشمیری لالہ ڈاکٹر، فیض اور سنا حویدہ نیازی
(ہندو پاکت مشاعرہ دہلی - ۱۹۵۶ء)



فیض بکر، فقیر وحید الدین اور ابراہیم جلیسے
فیض وحید الدین کی تعریف، سن ۱۹۶۵ء کی تقریب اشاعت پر ایک ٹریسنگ فوٹو



بائیں سے: اظہار نظر، احمد ندیم قاسمی، فیض بکر، معین بیہو پالی، اور جعفر منصور
کل پاکستان مشاعرہ ۱۹۶۵ء

انکار فیض بکر



فیض اور ہندوستان کے مشہور اداکارہ نوکس - دیپتی



فیض پاکستانی فلمسٹار یاسمین کے ساتھ لاہور



کارٹونوں کی نمائش

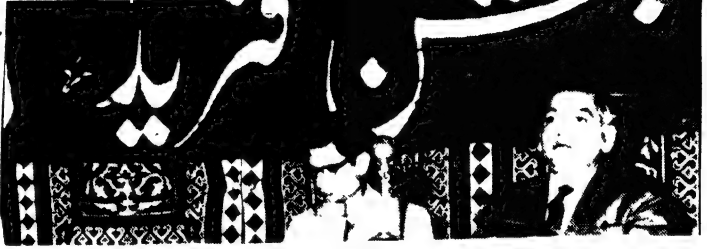
(۱۹۶۴ء)

افتتاح کے بعد
فیض کارٹونوں
دیکھ رہے ہیں
ان کے وائیں چوب
فیضیہ اور
چوب مشہور کارٹون
غزیر ہیں

جشن فریدمان کی مجلس مذاکرہ

(۱۹۶۲ء)

فیض کی صدارت پر
ان کے وائیں چوب
مستعد اشعر ہیں



مزار قائد عظمیٰ پر

(۱۹۶۵ء)

اگلے صف میں
فاطمہ رسول حمزہ
رسول حمزہ
فیض
شوکتہ صدیقی
جمیلہ الدین علی
اور
کمانڈر انوور



فیض
سر سید گز کا لہ کرپو
کے
اراکین یونین دیوبند
کا ساتھ

فیض برائے یونین
کے بنام ادب کے
انجام یافتہ
نہایت کے ساتھ
ادبیت
توسیع و سعید
ہجرت مسرور
رجحہ نامی مقامہ
اسیہ خیالات
فیض
سرینت جعفری
اور شہلا ترنہ



فیض
عزیز ترین سرینت
کری میں بی بی تاج
فدائے کشتہ کبیر
دائیں چہرہ
تیرہ بڑے
نہایت کا لہ
جس کا لہ کا لہ
فیض
سحاب قریش
ابن اللہ
ابراہیم بھٹی
مشتاق کو
ادبیت اختر

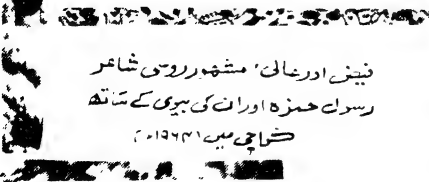


(ستائشند ۱۹۵۰ء)

دائیس سے : فیض ،
شہرہ افاق ترکی شاعر
ناظم حکمت ، پیٹے نمبر
پرعفیظ جالشہریت اور
اٹھویں نمبر پیر
ڈاکٹر ملک راج اٹند



فیض بھشنہ تیسرے
ادکاروں کے ہمراہ
(ستائشند ۱۹۶۳ء)



فیض اور عالی مشہور روسی شاعر
رسول حمزہ اور ان کی بیوی کے ساتھ
ضراچی میں ۱۹۶۳ء

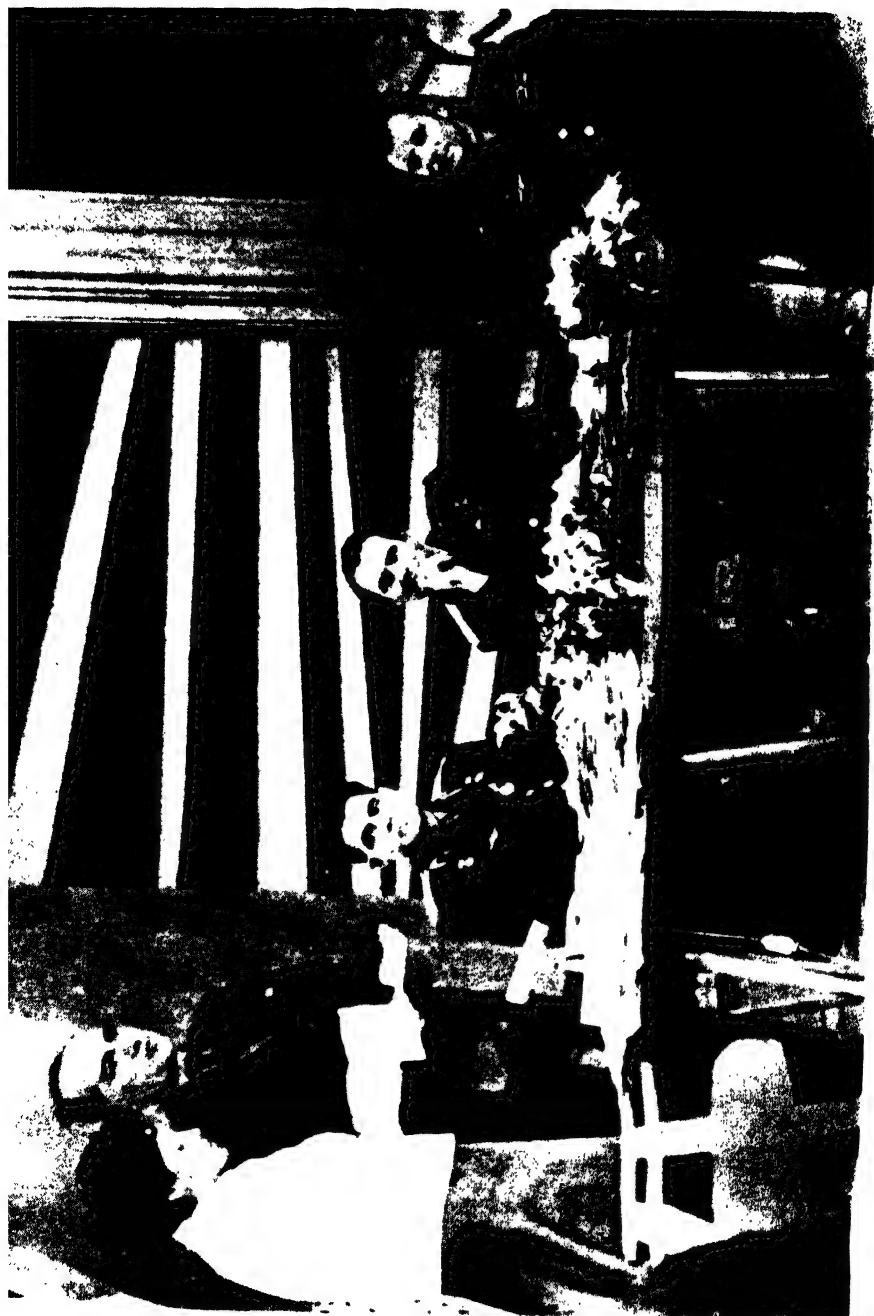




فیض - لدی - امن - انعام - عثمانی کے صدر - پروفیسر - نیشنل کے سانیو
۱۹۶۰ء - داسکو میں ششم انعام کی تاریخ برسر

نمبر - ماسکو کے ایک نذر خانے میں
(۱۹۶۲ء)
نیولین کے خلاف جنگ آزادی کے مناظر دیکھ رہے ہیں







موضوع سخن

اینا موضوع سخن الے سوا اور شہیدیں

چند رقیبے

○ پیارے فیض - ہم اس خبر سے بہت مسرور ہیں کہ تم ایک بار کچر آزاد ہو۔ سویت عوام اور یونین کی بے شمار ٹخمنوں کی جانب سے تمہارا کبار قبول کرو۔ ہماری دعا ہے کہ تم صحت و عافیت کے ساتھ دیکھ کے عوام کی جن میں پاکستانی عوام بھی شامل ہیں، ایک جہتی اور خوش حالی کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں سے عرصہ دراز تک خدمت کرتے رہو۔

ماسکو - ۴ مارچ ۱۹۵۹ء (مرزا ترسون زادہ - اٹولی سوئسٹرو زوف)
○ جیل سے آپ کی رہائی پر ہم سب نے خوشی محسوس کی۔ دوبارہ آزاد دفع میں سانس لینے پر دلی مبارکباد۔ پاکستانی ادب کے ارتقاء، امن کی حدود جہاد اور افروایشیائی مصنفین کے دوستانہ روابط کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ہم اپنی نیک تمناؤں، آپ کے ساتھ ہیں۔

پکنیگ - ۲۵ اپریل ۱۹۵۹ء (میرزا، نگین مصنفین عوامی جمہوریہ چین)
○ پیارے فیض - ہم آپ کی رہائی کی خبر سے بے حد مسرور ہوئے۔ آسٹریلیائی ادیب اور عوام آپ کی ادبی کاوشوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ماسکو کے دوران قیام آپ سے ملاقات کی یادیں آج بھی میرے لئے فرحت بخش ہیں۔

ملبورن (آسٹریلیا، یکم جون ۱۹۵۹ء)
○ پچاس سالہ میسن سانچہ پر پہاڑی دلی مبارکباد۔ عالمی امن و آزادی کے محابہ، ہماری دعا ہے کہ آپ، عرصہ دراز تک زندہ و سلامت رہیں، اور اپنی شاعری میں نئی ویمیں پیدا کریں۔

ماسکو - ۱۹۶۱ء
○ آپ کے پچاس سالہ جشن سالگرہ کے شکر کا
ممبران انجمن مصنفین سویت یونین

○ بین الاقوامی یونی امن انعام حاصل کرنے پر دیریت نام کے عوام اور امن کی جدوجہد کرنے والوں کی جانب سے پُر غوص مبارکباد۔ عالمی امن کی بقا و استحکام کے سلسلے میں آپ کی کامیابی کے لئے ہم دعا گو ہیں۔

مصلیٰ دشانی ویت نام، ۴ مئی ۱۹۶۱ء (ویرت نام امن کمیٹی)

جوش ملیح آبادی

نیل لون: دفتر: ۲۲۱۹۳۱
مکان: ۲۱۳۴۲

۹۵۲ - اردو منزل، بمبئی
کراچی ۵۰۰۰۰۰



جوش ملیح آبادی

مجلسیہ پیشہ روزی و ندرت
ترقی اردو بورڈ

فیض کو تین ایک زمانہ دراز سے جانتا ہوں، لیکن اُس

وقت سے جب کہ وہ محض ایک طالب علم تھے —

یہ غالباً ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کی بات ہے کہ فیض نے مجھے لکھنؤ

کے ایک نیم سرمدی شاعر سے لکھنؤ سے بلدیا تھا، وہ دن اور

آج کا دن، میرے تعلقات ان سے نہایت ہی خوش گوار رہے ہیں،

اور مجھ کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میرے اُن کے بزرگانه و

خود رانہ تعلقات، صرف محفوظ بنیاد پر قائم ہی نہیں، بلکہ رو بہ ترقی ہیں

یہ غالباً ۱۹۳۳ء کے کل بھگ کی بات ہے کہ میں نے ایک

سیاسی اختلاف کی بناء پر اُن کی ایک نظم پر ایک طنزیہ نظم کہی تھی،

جسے فیض کہ میں نے سنایا بھی تھا، معلوم نہیں وہ نظم کون صاحب

اُس زمانے میں لے اڑے تھے، اور اب مُکرم ہوا ہے کہ اُن صاحب نے
 اس قدر مدت دراز کے بعد اُسے چھاپ دیا ہے، میرے نزدیک اُن
 ”نزرگ وار“ کا یہ فعل کسی اچھے یا اِصلحی جذبے کا حامل نہیں ہے،
 فیض کے مزاج میں، اُن کے کلام کی کُرَح، ایک
 نرمی اور ایک ہٹھاس پائی جاتی ہے۔ اور اُن کے تبسم میں
 منصوبیت کی جھلک آج بھی دل موہ لیتی ہے۔

اُرُود شعراء کی سیرت کے متعلق میں اچھی رائے نہیں
 رکھتا، یہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنے، اور ایک دوسرے کو ذلیل
 کرنے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ —

میں نے اپنی تمام مُتحررہ معرفت تین چار شاعروں کو
 پاک نفس دیکھا ہے، اور مجھ کو ان کی راست گوئی کی کُرَح اس
 بات کے اظہار سے مشرت ہو رہی ہے کہ اُن چند اِنے کہنے پالنے شُکرا
 کے درمیان فیض کا چہرہ بھی دنگ رہا ہے۔

میرا سا اہل اب سامنے آچکا ہے، میری کتنی آئے بادیان

لیٹے جا رہے ہیں، لیکن ڈوب جانے سے پیشی تریہ کہ دینا چاہتا

ہوں کہ میں المیہاں سے کروں گا، اور شخص اس بنیاد پر کہ اُردو ادب کے ایک مدح کو اپنے پیچھے چھوڑے جارہے ہوں، اور اس مدح کا نام ہے فیض۔

اللہ اُن کی سحر کو دراز کرے، فن اور زبان کے دروازے اُن پر کھول دے، اور رفتہ رفتہ اُن کو آسمانِ ادب کا ایک ایسا آفتاب بنادے جو کبھی ڈوبنے کا نام بھی نہیں لیتا۔

جوشِ مرعوم

۱۱/۲/۶۵

جسٹس ایس اے رفیق

۷۸۶



PAKISTAN
SUPREME COURT

MR. JUSTICE
S. A. RAHMAN, H. PR

۶۵ گٹرگ لاہور

۵ نومبر ۱۹۶۵ء

ملکی السلام علیکم۔

میں ناام ہوں کہ آپ مرتقاؤں کے باوجود انکار کے

فیضِ نیر کے لئے کچھ رنگوں کا۔ لکھنے کی تائید ڈاکٹر عبادت بریلوی مہ
خط سے بھی ہوئی۔ میرا اندر محض کرم فرمتی ہمن کی جھنجھٹ لگے میں
ڈال رہے ہیں جن سے لگو خلاص کن نہیں اور جو ادبی مشاغل کے آڑے
آتے ہیں۔ یہ چند بطور محض بطور امثال امر لکھ رہا ہوں۔

فیضِ شہب ہندوستان کے ادبی حلقوں سے اپنا لوہا
منوا چکے ہیں اور شاعری کے نئے دلستان میں ان کی آواز شاید سب سے
اہم ہے۔ میری نظر میں جو بات ان کے در سے جدید قسم کے کئی شعراء سے
متاثر کرتی ہے، اسی کا اردو شاعری کی روایت سے ربط ہے۔ انہوں نے
شاعری میں نئے تجربے بھی کئے ہیں اور ان کا اندوختہ تخیل جدید ذہن
کے ہم آہنگ ہے لیکن انداز بیان کے لحاظ سے ان کی شاعری کی
جڑیں ادبی روایت میں مضبوط ہیں۔ ایم ای اور الہامی کیفیتیں جو
شاعری کی جان ہیں ان کے کلام میں بار بار وافر موجود ہیں لیکن آجکل
کی پہیلی قسم کی نظم طرازی کے وہ گنگنا رہیں ہوئے۔ نہ ہی ان کے

ان حرف و خیال کا وہ گھر دریا ہیں ہر جو نئی شاعری کے بعض نمونوں
 میں ذوقِ سلیم پر گراں گذرتا ہے۔ ان کی نظموں میں بھی لطیف
 تخیل کی دھیمی دھیمی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ ان کا تاریخی شعور
 ان کا ذوقِ خیال، اور ان کا فنی حوصلہ ان کی جہتی شرافت
 کے سائے میں پروان چڑھے ہیں۔ کسی نے ان کی شاعری لطیف
 احساسات کا مرقعہ ہے۔ ان کے سیاہ نقطہ تشریح اور اندازِ سخن ہر
 لیکن ان کی ادبی دیانت، ظاہر اور خفا کی ہے انکار اور کمال
 ہوگا۔ کیونکہ ان کی شاعری ذاتی فحاش اور انفرادی تجربہ پر مبنی ہے۔
 اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مبداءِ فیاض سے فیض کو
 انتظامی سلسلہ میں بھی عطا ہوئی ہیں۔ جب وہ پاکستان آرٹس کونسل (پاکستان
 ٹیچرز کے گریجویٹ ہوئے تو اس میدان میں ان کے جوہر کھلے اور انہوں نے
 اپنی سرگرمیوں سے انجمن کی کارکردگی میں وہ اضافے کئے جو کہ وہ
 سے خراجِ تحسین حاصل کیے بغیر نہ رہے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو اس بات

کی زندہ تردید ہر کہ شاعر محلی دنیا میں فصولِ مد سے زیادہ حشیت، ہنر
 رکھتا۔ حق یہ ہر کہ وہ فطرت کے شاہدہ کے ساتھ حیات کے مجاہدہ کے
 کب مر رہے ہیں۔ اور شاید ان کا یہ وصف بھی نوجوان ذہنوں کے
 لیے کم جاذبِ توجہ نہیں ہوا۔

مخلص
 السید عکرم

بیگم شائستہ اکرام انڈ

کراچی
 صفحہ ۱ بہتر شدہ
 مکرمی تسلیم -

آپ کے درخواست کی تفصیل میں جلد مقررہ
 حاضر ہے۔ - فیض کی سی شخصیت اور آپ کے
 قابلِ قدر کوشش پر اس سے بہت زیادہ لگنا چاہیے
 جسے آپ کی پریشانی اور کام کے بوجھ سے بالکل دبی ہوئی
 اپنے امید کے آپ اس لیے ہی ناکامی پیلیج
 کا بُرا نہ مانتے تھے۔ - آئندہ خدانے چاہے تو افکار کے

لیے کوئی چیز بہت محنت سے تیار کر کے پیشہ کروہ
گئی فقط

پیسے بہت ہی ناکامی اور تشویش - دماغ
تفکرات کے مجموع سے بدلے کا پسہ کر دیا اگر آپ
الکوتائے ہونے کے قابل نہ سمجھیں تو مجھے ہرگز
شکایت پسہ ہوگی۔ دراصل یہ اشاعت کے قابل
نہیں ہے۔

افکار کا فیض بجز یقیناً ایک قابل قدر چیز
ہوگی۔ کیونکہ جاہل تک مجھے معلوم ہے فیض کے صلاح
اور مقام پر اب تک کوئی جا نے چیز نہایت پسہ ہوگی۔
فیض زمانہ حال میں ابود کے صف اول کے شاعر
ہیں وہ نہ صرف ایک نئے طرز فکر اور طرز ادا
کے موجد ہیں بلکہ انہی اور انہی میں ہی اپنی کمال
حاصل ہے۔ ان کے انعام میں یا بہت سے حقیقت
میں ممکن ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ غزائے کی شریعتی

اور لطافت بھی ہے کیونکہ بقول انٹہ
 چاہا ہے اسی رنگ سے اسی وطن کو
 تزیینا ہے اسی طور سے دل اسی لکھنؤ سے
 دھونڈ کا ہے یہ نہی شوق نہ آسائش منزل
 رخسار کے خم میں کہیں کمال کی زندگی ہے
 انکس نہ عمریں انہی زندگی کی آئینہ دار ہے خون دل
 سے لکھی ہوئی ہے ایسے ایسے درد کی لک ہے -
 انکار نہ انٹہ کلام کو نظر عور سے دیکھنے نہ
 دموت دیکر ایک فرد کی ادب خدمت انجام دے ہے
 فقط
 فاکار
 ہستیہ سرور دی اکرام اللہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

Pro-Vice-Chancellor

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.

۴ جنوری ۱۹۶۵ء

مترجم - مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ انکار کا فیض نمبر

غفریب شائع ہونے والا ہے ۔

قیقہ ہماری زبان کے جوڑ کے شاعروں میں میں ہیض غزل
اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے ۔ فیض کی غزل میں ایک
نئے آئینہ کا احساس ہوتا ہے ۔ انھوں نے زندگی کے جدید تقاضوں کو
غزل کے پرانے رومز میں بڑی خوبی سے سمویا اور اپنے حسن و
ادا سے شعر کا جادو جگایا ہے ۔ تجھے پوری توقع ہے کہ فیض نمبر
کی پوری طرح قدر ہوگی ۔ فقط بولور

حسن علی اے رحمان

Karamally A. Rahman
VICE-CHANCELLOR
UNIVERSITY OF SIND.



Phone { Office: 3004

HYDERABAD
WEST PAKISTANI

Dated 196

مکرمی صہبہ صاحبہ ۔ السلام علیکم

مجھے یہ معلوم کر کے بھری خوشی ہوئی کہ آپ افکار
کا فیض نمبر بھی شائع کرتا چاہتے ہیں ہمارے شعراء ادباء اور علماء کی
قدر دانی دراصل ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کی قدر دانی ہے ۔

باہر کے لوگ ان کو دیکھ کر ہماری قوم سے متعارف ہوتے ہیں۔
یہ اور بات ہے کہ رطب و یابس اور حسن و قبح ہر گدہ اور ہر قوم
میں پایا جاتا ہے۔ تاہم فیض صاحب سے بالواسطہ اور بلا واسطہ
دونوں طرح ادب اور معاشرے کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ خدا
کرے کہ آپ کی سسی مشکور ہو۔ شکریہ

حسن علی امجدی

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو علی گڑھ

۶۹۵/۳/۱۹

مئی صبا صاحب

آپ کے خطوط کا جواب دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔ ہندوستان ایڈیشن، پراپ میں پیش لفظ شام کر رہی ہے۔ اس
کے بعد کسی تحریر کی ضرورت کیلئے۔

فیض کو میں اس دور کے چولی کے شعرا میں شمار کرتا ہوں۔ ان کے تینوں مجموعے، 'نقش فریادی'، 'دست صبا'، 'ذغالی'،
متعدد نظموں اور غزلوں کی وجہ سے ہمارے شعری تجربوں میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ فیض کی نظموں میں مجھے تنہائی، ممنوع سخن،
رقیب سے، دوستی، اسے روشنیوں کے شہر، یہ بات اس درو کا شجر سے، ہم جوتا ریک راہوں میں مارے گئے، یاد، دو کپڑے مجھے
بہت پسند ہیں اور انہیں میں نے بار بار پڑھا ہے۔ ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ جب پہلے پہلے موضوع سخن، شائع ہوئی تھی، تو ایک
ملاقات میں جگر صاحب نے "بھوک اٹکے" پر اعتراض کیا تھا۔ جس نے ان سے کہا تھا کہ جب آنکھوں سے تارے ٹوٹ گئے ہیں،
تو کھیتوں سے بھوک اٹکے پراپ کو کیوں اعتراض ہے۔ ان کی مصنف مزاحی کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس کے بعد اپنا اعتراض
واپس لے لیا تھا۔ دست صبا کی بعض غزلیں بھی مجھے پسند ہیں۔ فیض کی فنائیت اور صورت گری ان کی خصوصیات ہیں۔ ان کی تنقیدوں
میں بھی ایک یا شعور فن کار کی بعیرت کار فرما ہے۔ وہ چاہیں تو بڑے اچھے مضمون لکھ سکتے ہیں۔ پطرس پر جتنے مضامین لکھے گئے ان

میں فیض کا مضمون مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس میں پرستش کا جذبہ نہ تھا۔ ایک فن کار کا دوسرے فن کار سے محبت کا جذبہ تھا۔ انہوں نے فیض کی چیزیں ادھر بہت کم دیکھے ہیں۔ خاموشی کے دور سے ان پر پہلے بھی پڑ چکے ہیں۔ اس لئے امید ہوتی ہے کہ اب جو بند ٹوٹے گا تو بعض معرکے کی چیزیں دیکھنے میں آئیں گی۔ فیض کی زندگی کے حسن سے محبت اور اس کے پیچھے مضمونیت اور غریب کو پلنے کی کوشش ان کے کلام کو وسیع اور برگزیدہ بناتی ہے۔ اس کی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔ انسانیت کے اس پرستار کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔

مخلص: آل احمد سرور

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی



شعبا اردو
کراچی یونیورسٹی
کراچی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۱۱ مارچ ۱۹۶۵ء

صبا صہب کرم۔ السلام علیکم۔

آپ فیض بھر نکال رہے ہیں۔ مبارک ہو۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری بیوری تو مرنے پرست بلکہ مقبرہ

پرست ہے۔ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ جو لوگ اسلاف

کے مقبروں کو پیچ ڈالیں وہ کیسے مرنے پرست ہو جائیں گے۔

نزدیکی میں ہمارے ادیبوں کو جس ناتقدری، دلہندہ سادہ

اور پریشانیوں حالی ہمارا ہوتا ہے خدا کا شکر ہے کہ فیض صاحب

کو اس کی شکایت نہ ہو گی کتنی زندہ اور صابر ادیبوں

دور شاعروں کی تہ درانی اور ان کے کلام و سمال و اعتراف
ایک ایسی روایت ہے جو ان کے روایت و درجہ حاصل کر سکے
مترشح یہ سہارے دن اور ان کے روں کے حق میں ایک مبارک
خال ہوگی - والسلام
ایک
اور ایسی ہی حدیثی

ڈاکٹر مسعود حسین خان

MASUD HUSAIN KHAN
M. A., Ph.D. (Wg.), D. Lit. (Paris)
PROF. & HEAD, DEPARTMENT OF URDU
Osmania University, Hyderabad - A. P.

19-A, D. U. BUNGLOW
OSMANIA UNIVERSITY
HYDERABAD - A. P.
Phone 71138

۸ جنوری ۶۵ء

خواب مکرم ، لیلیات

یاد آوری کا شکر یہ ! : سن کر مسرت ہوئی کہ آپ
انکار کا حمزہ شمار اس بار مین لعدنیف کی شفیت اور غی
کے لئے وقف کر رہے ہیں - فیض ایک واسی مستحق تھے ، اسلئے
اپنی تمام مانی و فنی خامیوں کے باوجود انہوں نے جدید اردو شاعری کو
ایک نیا آفتاب اور لہجہ عطا کیا ہے - میں ان کا اتنا بڑا پرستار
نہیں کہ انہیں ابھی سے غالب و اقبال کی صف میں لا کر رکھوں ، لیکن
اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اردو شاعری کی کئی جہات میں توجہ

کی ہر: ان کا مخصوص عہد ہی انداز ' نرم و پرسوز لہجہ ، تہ دار
 تشبیہات و استعارات ، اور سب سے بڑھ کر ایک نیا و صہ ان اور
 شعور جس میں فرد اور ساج دولاز تاجر و رنگ کی طرح بے
 ہوئے ہیں ، یہ سب مل کر ایک عجیب انداز کی شاعری کو جنم دے
 ہیں ، جس سے ہم ان کے ہمارا ادب آشنا ہیں مگر - تاریخی نقطہ
 نظر سے اردو شعر کے سلسلے میں فیض نے سب سے بڑی خدمت یہ
 کی ہر کہ اے خطیبانہ طمطراں اور انعقدی لڑہ زنی سے نجات
 دلائی - ایک انعقدی شعور کے باوجود انہوں نے فن اور محبوب
 کے ساتھ اپنا عہد استوار رکھا ، کاش وہ فن کی خاطر اپنی شاعری
 میں محبوب کے عطر کو اور کم کر سکیں ، اور " سیاہی لیڈر کے نام "
 " صبح آزادی " " لوح و قلع " " زنداں کی ایک صبح " اور " ملاقات "
 (گو اس نظم کا عنوان بہت ہلکا ہو گیا ہے) جیسی نظمیں لکھتے رہیں -
 مجھے امید ہے افکار کا نامزدہ سلسلہ فیض کے
 ادبی قد و قامت کے متین کرنے میں ایک کامیاب کوشش ہوگا ،
 اور اس دو طرفہ بے انتہائی سے عاری ہوگا جو کبھی غیر ادبی پرستش

ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر گیان چند جین

افکار فیض نمبر

موضوع سخن

اور کبھی ادبی انسانیت و عناد کی شکل میں ہماری تنقید میں ظاہر
ہوتی ہے ۔

مجلس آفاق

مسو حسن

ڈاکٹر سید عبداللہ

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۱۲ ارجنٹ ۱۹۶۵ء

محرمی سلام علیکم ۔

عنایت نامہ نمبر ۲۶ روکمر ۱۹۶۵ء موصول ہوا ۔ شکریہ ۔

یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ آپ نے فیضیہ سمجھ لکھنے کا ارادہ فرمایا ہے ۔ یقیناً آپ کی یہ کوشش افکار اور
اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کرے گی ۔ دعا کرتا ہوں کہ حق قلم آپ کو اس نیک مقصد کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے
نفع و سلامت ۔

ڈاکٹر گیان چند جین

Sian Chand Jain

M. A. D. Phil., D. Litt.

36, MALVIYA NAGAR
BHOPAL

مترجم تسلیم

آپ کا پہلا سال کا کرم نامہ مل گیا ۔ شکریہ ۔ فیض کا
ادبی مرتبہ مجھ جیسے بیچ سداؤں کے پینا م کا محتاج نہیں لیکن چونکہ آپ
کی فرمائش ہے اس لئے تخیل ارشاد میں "چھوٹا منہ بڑی بات" کے
معداتی ذیل کا پینا م پیش کرتا ہوں ۔ اگر آپ اس فصوص شری
کی ایک کاپی مجھے بھی مرحمت فرمائیں تو میری ہفت و پشت کو

مضمون فرمائیں گے۔

مجموعہ خوشی ہے کہ آپ انکار کا فیض نبر شائع کر رہے ہیں۔
زندہ ادیبوں کے خصوصی نبر مکانا ایضاً محترم حضرات کے نزدیک
بدعت ہے لیکن میری تقریریں انتہا کا صحیح اصول یا ہونا چاہیے کہ
صرف ان ادیبوں کے نبر شائع کئے جائیں جو جیتے جی تاریخ ادب
میں بقائے دوام حاصل کر سکتے ہوں یعنی ان کے مستقل ادبی مقام
کے باعث ان کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہو نہ کہ اس کے برعکس
خصوصی نبر کا لہرہ ادیب کی نگاہ میں اس غرض سے لگایا جائے کہ شاید
اسی سہارے سے اسے بقائے دوام مل جائے۔ عبدالحق۔ اقبال۔ جوش
اور فیض اکی پائے گئے ادیب ہیں جن کے لئے کسی رسالے کا خصوصی
شمارہ مکانا کوئی فخر کی بات نہیں، رسالے کے لئے ان کا نبر
مکانا باعث فخر ہے۔

اگلے دہائیوں کے مقدس بزرگ ترقی پسند ادب پر اس
لئے جزیرہ ہوتے ہیں کہ اس میں با اوقات ادبی اور جانی چہرے کو
نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن فیض ایسے محدودے فہم شعرائے
ہیں جن کے جہاں زندگی کو آگے بڑھانے کا شعور بھی کبھی سے کم نہیں
اور جو ادبی مذاق کو بھی پھر پورا سوداگی بخشتے ہیں۔ ان کی آزاد نظم
پر پابند نظم کے ایسا ہی سر دھنتے دیکھے گئے ہیں۔

کھتا ہے بوجھ جاتا کہ فیضِ نظم کے نئے شاعر ہیں کہ
غزل کے؟ تو قائل دیکھ عجیب دُعا میں بڑا کمر سبکی کی جان کو کوسے جا
کتو کہ فیضِ اردو ادب کی تاریخ میں ان عمارتِ پنج عمارتیں آئے ہیں جن کی
نظم، غزل سے بہتر ہے اور غزل، نظم سے بہتر۔ زمانہ کی آواز غزل کے صالح
ترنم غزل سے فیض ہی تک پہنچا رہے ہیں۔ سیاسی صحافیوں کو تغزل کے خوشام
جامے میں لپیٹ کر پتھر کر کے کوا روکش فیض ہی کی چوٹی پر لے رہے ہیں۔

مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک دو صدی بعد بھی فیض کا
نام اردو ادب کی تاریخ میں عمارت رکھا جائے گا۔ یہی بڑے ادیب کی
نشانی ہے۔

بیانِ لکھنؤ
نیاں لکھنؤ

شان الحق حق



۶۷۲ - اردو منزل
جمشید پور

کراچی

اردو نامہ (۱۰۷۱)

ٹیلیفون: ۳۲۱۶۳

(کونسلر) ۹۶۷

برادر گرامی، فیض!

فیضِ عمر وفاقِ مبارک ہو۔ میں آپ کے ساتھ

بہنوں سے محظوظ و مستفید ہو رہا ہوں۔ (اور کچھ تحویرات لکھ رہا ہوں)

اب اس کمزور اشتیاقی رہے گا (اور امید ہے کہ یہ تمام تر
کدورت سے پاک ہوگا)۔ میں آپ کی مددراہیہ صلاحتوں
کا بھی معترف ہوں اور فیض کے شاعرانہ رتبے کا بھی۔ یقین
ہے کہ یہ کمزور دونوں کے شایان شان ہوگا۔

دینام نورہ دیا کرتے ہیں جہیزیت سے لایا کرتا ہوں۔
میں ابھی اس عیشیت میں ہیں ہوں، لہذا اسے صرف نام
تہنیت کہتا ہوں۔

ہرچا
طالعہ

مجموعہ سلطان پوری

majrooh sultanpuri

6, Shikhar colony • juhu road • santacruz • Bombay - 40 • Phone: 3559114

۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء

میرا جواب۔۔۔ میں ابھی بھی کیا ہرگز کہہ سکتا ہوں آپ نے
نرا صاحبزادہ ہی بنا ڈالا۔ فوراً
آپ نے تفسیر کر کے مجھ سے کوشش غزل یا نظم موضوع
سے متعلق مانگی تھی، نظم یا غزل تو سنہ ۱۹۵۸ء کی نذر تھی، البتہ ایک

خط سہ ماہ سبھی کو حاضر ہے۔

فیض صاحب، سجاد، ان م راشد، افراتہ علی، خدوم محمد الدین
اور علی سردار جعفری، کوٹیلے میر، پیش رو حسن، شمسہ میر، جب میر، عری
مردی کی تو انیس کے بیشتر حضرات صاحب دیوان ہو چکے تھے۔ لہذا کم و بیش ان
کبھی کا عقیدہ تھیں لیکن یہ بات کہنے میں مجھے شک نہیں کہ ان م راشد اور
فیض صاحب کی شاعری اردو کھیلے ایک نیا طرز ہیں لیکر آئی۔ جبکہ بنیادی
رشتہ خواہ ابتدائی سے ہوتے ہوئے غزل، ناسخ، تک جابلے ہوں لیکن پھر بھی یہ زبان
افسر حضرات کی دین کبھی جا بھگی گو ان کے پنج اصول میں پنجاب کے بیشتر
شعراء ہی نئی ہی اور بدلتی ہوئی زبان میں شعر کہہ رہے تھے لیکن ان دو
حضرات جتنے وہ لوگ کامیاب شاعری نہیں کر سکے۔ چنانچہ ان دونوں میں بھی
ان م راشد کی شاعرانہ زبان، تسکین و اعتدال، پختہ رہی لیکن فیض نے اسکی
معدی کو سوز و غم، گمان، اندیشہ، محبت، عطا کی اور پیرت وہ اپنے چشموں میں
سرمیلے ہوئے۔ محار کی سرمتی نے عورتی دور تک اللہ ساتھ دیا لیکن اسکا سبب
تو وہ خود بھی سب کا ساتھ چھوڑ گئے۔ چنانچہ آج فیض کی مقبولیت کا یہ عالم
ہے کہ ان سے شاعر و غیر شاعر کسی نہ صرف عظمت بلکہ محبت بھی کرتے ہیں یہ

انکی جادو سبائی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

البتہ فیض کے بارے میں انکی ہی عری کے اعتراضات کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں یہ بات بھی غامض ہے کہ فیض صاحب بہت سے سیاسی اور سماجی مسائل کو اتنا کھل کر نہیں بیان کرتے جتنے کہ وہ مسائل مستحق ہیں۔ میرے ذہن میں یہ سوال کہ اس طرح اُنٹا ہے کہ فیض صاحب نے عراق اپنے ملک کے جدید معاشرے کو ابھار دینے کی کارکنی سے کتنے دنے میں کامیاب کیوں نہیں ہے! کہیں اسے تو نہیں ہے کہ جب انکی آواز کو "خوف حق" کی طرح بلند ہونا چاہیے تو انکی صدا "پیام زیر لب" بن کر رہ جاتی ہے۔ اور غوغا سے فتنہ و شرم میں لوگ فیض کے لب تو پلٹے دیکھتے ہیں کہیں جو کہ بات کچھ اتنے دھیمے لہجے میں کہتی ہے کہ آواز سنائی نہیں دیتی جید انکی رہنا زچہ ہی آواز ہو سکتی تھا۔

بہر حال یہ تو ہر شخص کی اپنی اپنی راے جزوی حقیقت سے ہوئی لیکن مجموعی حقیقت سے فیض کا عری شکار گل کی طرح پھولوں سے لدا ہو چکی ہے۔ اب یہ ہر مندوں پر منحصر ہے کہ پھول کی پتی سے "ہیرے" کا جگر کاٹ دیں۔

مخلص

موجود

ڈاکٹر محمود الہی

DR. MAHMOOD ILAHI
M. A., Ph. D.
Head of the Urdu Deptt.



GORAKHPUR UNIVERSITY

GORAKHPUR 196

۶۶۵/۲/۲۲

صہبا صاحبہ محترمہ

محبت نامہ مدد - شکریہ - آپ نے دو لمحہ آفریں
شخصیتوں پر افکار کے حصوں، شمارے اس طرح مرتب کیے کہ انہیں
دستاویزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بڑی خوش ہوئی کہ ایک اور
عظیم کارنامہ پایہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بکھیل
جہڑوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور فیض بھر، جوش بھر اور حقیقت بھر
سے نیا رنگ دیتے ہو گے۔

آپ کا "اندیشہ" کلمہ نہیں۔ اب اتنا وقت کہاں کہ
میں فیض بھر میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کروں۔ ایک بات
اور ہے، میرے راستے میں صرف وقت مانگی نہیں، فیض پڑکھنے
کے لیے جس جہڑات اور طرف کی ضرورت ہے، میں اس سے عاری ہوں۔
نہ جانے اس کا سبب کیا ہے کہ بن شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا اور
میں جن کا نلہ رہا رہا ہوں، ان پر کچھ لکھنے کا جب میں نے ارادہ کیا تو
سجدی کا یہ شعر مجھ میں منتر کی آواز آ رہا ہے، وہاں یہ

مجھے گھر نہ چھوڑا :

کہ دہشت گرفت؟ ستینم کہ قم

میں وہ وقت نہیں بھولا ہوں جب ایک طرف قال اللہ اور
قال الرسول کے درمیں میں معروف رہتا تھا اور دوسری طرف ابوالکلام
آزاد، اقبال اور فیض کی تخلیقات میں گم رہتا تھا۔ میں ایک عربی
مدرسے کے "دورۂ حدیث" کا طالب علم تھا ایک بات بات پر فیض کے
اشعار دہراتا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے "عواصی الی کلب"
کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس میں اکثر فیض کے اشعار پر بحث
ہوتی تھی اور جب کوئی "عالم" ان کی نحو اور صرفی غلطی پر
کچھ کہتا تھا تو میں اس سے قوی تر "سند" پیش کر کے اسے خاموش
کر دیتا تھا۔

میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ ان محسنوں پر جن سے
مناجناہ فور پر میں نے استفادہ کیا ہے، کچھ کھانا میرے خالق میں
شامل ہے اور انوری کے الفاظ میں میں اس کا اعتراف کرتا رہتا ہوں کہ

یکے جریدہ اجمالی خود نگر دم کشت

ہزار کس را کہ دم بدم مستغرق

لیکن "مذہبنا ہذا خویش" پیشہ کرتے ہوئے وہی انوری والی بات
آجاتی ہے کہ

زبدہ نون بیکد ہر بدن بجلد عرق

اب آتی توفیق ضرور ہوئی کہ ابوالکلام آزاد اور اقبال دو ذہین اور

اہل الرائے حضرات کے سپرد کر دیئے گئے ہیں جو چاہیں ایچ ٹی کے لیے مقابلہ لکھ رہے ہیں۔ شاید فیض پر بھی خود لکھنے کی یا کسی سے لکھوانے کی نوبت آجائے۔

میرا مزاج فارسی اور عربی ادبیات کے سائے میں پلا بڑھا ہے اور اسے فیض کی شاعری سے تسکین ملتی ہے۔ مجھے اس کا احساس کبھی نہیں ہوا کہ ان کے اسلوب میں وہ قدریں نہیں ہیں جو طرفہ امر العیس، حافظ، سعری، عرفی اور غالب کے اسالیب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ فیض اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز کرتے ہیں لیکن ماضی کی حسین روایات سے انھوں نے اعراض نہیں کیا۔ امید ہے کہ آپ میرا غم قبول کریں گے۔ پھر کہیں۔

والسلام

ممدوالہی

عبدالرحمن جغتائی

دور جدید میں ترقی پسندانہ جذبات نے دیکھتے دیکھتے ہندوستان بھر کو پھراس انداز سے اپنے گھر سے میں نے باتھا کہ اُسے دیکھی نہ کسی تنہا سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ شاعری اور ادب کی بددی ہوئی دنیا نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ ہر جاننے والا ہر لکھنے والا جو کچھ کرتی نہ سکتی۔ گستاخا اس تحریک کی لپیٹ میں ایسا ابھی کہ اس کے بغیر اندرونی میلانات کا پتہ چلنا دشوار ہو گیا۔ سیاسی سماجی اور ادب کی ترقی پسندانہ تحریک سے جس غلو کا اظہار پنجاب کے فن کاروں نے کیا وہ قابل رشک تھا۔ میں تو بھی جدید ہندوستانی معنوی کے اسکول سے وابستہ رہا ہوں۔ (درج بھی ہماری روایات کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھ رہا تھے۔ تو اپنا خمیر بچا اٹھا اور احساس ہونا نکالی ہے کیا جو کچھ نہیں لیتی۔ سرتیافت نے کسی نہ کسی رنگ میں اس کی کائنات کیا جو جدید تحریک نہ ہونے سے محسوس ہوتی تھی۔ شاعری کے جدید اور ترقی پسندانہ اور ان تحریک کو ہر سو سے انداز کے دوش بدوش چلنے والا کہ تیار تھا حقیقتاً جلد ہی نئے اردو کے فروغ کے لیے اپنی دنیا میں کچھ کم ہوسے نہ دیتے تھے۔ قائد غلام آزاد ظلم کے امام راشد ہمدرد جعفری فیض احمد دوسرے ترقی پسند ادیب دانش اور حسرتی مسکن سے دوچار رہے ان کی ہتھک خدات کا اعتراف ہر مکتبہ خیال کے افراد نے تاہم قدر کیا۔

سید الطاف علی بریلوی

All Pakistan Educational Conference

Registered No. (334 - 1951, 52) under act XXI of 1860.

سہ ماہ نومبر ۱۹۶۳ء

فیض احمد فیض کا کلام میں نے بہت کم
 پڑھا اور سنا ہے بالمشافہ ملاقات کمالی برائے نام اتفاق ہوا
 ہے۔ لیکن ان کی مقبولیت عام بالخصوص نوجوان طبقہ میں۔
 خاص مرموب کن ہے۔ یہ مقبولیت بدوم نہیں ہوتی ہے۔ یقیناً
 فیض صاحب کے کلام میں کوئی ایسی ندرت اور تاثیر ہے کہ لوگ
 دیوانہ وار اُن کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ فیض صاحب ایک بلند پایہ
 پرونیس اور ادب نامہ پاکستان ٹائمز جیسے بڑے اخبار کے
 ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ لیکن بحیثیت ایک نثر گو شاعر اُن کا مرتبہ بلند
 سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے کلام میں سوز و گداز اور کمی تعریف
 کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اُداسے مطالب کے لادحسن زبان
 و بیان کا جواب ہے۔ کاش اسی قادر الکلامی کے ساتھ معصوم
 دشمن کچھ زیادہ واضح ہو جائے اور قوم میں جوش عمل پیدا

کرنے کے لئے رجائیت کا رنگ نکھر جائے تو فیض اس خلد کو
معتد بہ حد تک پیر کر سکتے ہیں جو علامہ اقبال کے وہمال کے بعد
پیدا ہو گیا۔

سید احمد علی شاہ

پشپاکما پر کیا رہتے

کوئٹہ - سیلون

۴ - مارچ ۱۹۶۵ء

آپ کے مانتا ہے کہ فیض فیر کیلئے پیغام بھیجتے ہوئے میں جید خدمت میں کرتا ہوں۔ ایک سیلون شاعر کی حیثیت سے
مجھے میں پاکستانی شاعر فیض احمد فیض سے ملنے اور شاعری میں ان کا کلام سنانے کی سعادت اکثر حاصل ہوئی ہے۔ میں عیس کرتا ہوں
کہ مختلف ملکوں کی مختلف زبانوں میں ہم سب ایک ہی مشترکہ مقصد کے واسطے میں سوچتے اور لکھتے ہیں اور اس دھڑکی کا مقدس ترین مقصد
انسانیت کو ہر طرح کی محکومیت سے نجات دلانا ہے۔ جس کے لئے ہم سارے ہی ادیبوں شاعروں اور فن کاروں نے خود کو وقف
کر رکھا ہے۔

عظیم ثقافت کی سرزمین پاکستان نے ہمیشہ شاعروں اور ادیبوں کو جنم دیا ہے (اور یقیناً مستقبل میں بھی جنم دیتی رہے گی۔) جو
دانشی حاصل کر کے اپنی قوم کو بیدار کر کے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ عوام میں بیدار کرتے رہے ہیں وہ حکومتوں اور ان کے ارتقا
کی راہ کا سنگ گراں ہیں۔ یہ شاعر اور ادیب عوام کے دوست اور ان کے دشمنوں کے دشمن ہیں، یہ دانش ور عوام کو متحد کرنے
اور مفاد پرستوں اور سازشیوں کی عوام دشمنی کو ناکام بنادینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے

پاکستانی شاعروں کے نغمے آج بھی تاریخ کے ایوانوں میں گونج رہے ہیں۔ ان کے جرات مندانہ نغمے جو سرمایہ داروں کے
ظلم و نا انصافی اور استحکام شکنی کے لئے انھوں نے تخلیق کئے اس مشترکہ نصب العین کی راہ نشی ثل ہیں جسے افریقا اور ایشیا کے
ادیبوں اور شاعروں نے اپنایا ہے۔ چنانچہ اب نہ کوئی عداوت ہمارے اتحاد میں رشتہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ کوئی بدولت ہمیں
--- ہمارے دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ایک سیلون شاعر کی حیثیت سے میں دعا کرتا ہوں کہ فیض احمد فیض اور رقیق کا فیض احمد فیض صحت مند
اور نامور رہیں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ افریقہ کی عوام کی سلامتی و اتحاد اور فلاح کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ عہد
انجام دینے میں رہیں گے۔

سید احمد علی شاہ

غرض ملیانی

سر جیکل دیو

۶۲/۱۲/۱۱

سچا ہمنہ کلم -

مجھے سرت ہے کہ انکار کا فیض نمر شدہ ہو اور
 اس کے بدلے جوش نمر اور خفیہ نمر قبول عام کی سند حاصل کر چکے
 ہیں۔ فیض کا درجہ اور دوشا عوی میں بہت فاصلہ ہے۔
 ان لاگوں کی صف میں، پیش پیش ہیں جنہوں نے اردو نظم اور
 غزل کو نیا لہجہ اور نیا اوزار دیکر عطا کیا، ایسے بالکمال شاعر
 کہ لے کسی رسالہ کا خاص نمر وقف ہونا بڑی اچھی بات ہے۔
 ہمیں امید ہے کہ اس شمارے میں فیض کی شاعری کا صحیح جائزہ لیا
 جائے گا۔ مطلب یہ کہ محض مدح سرائی پر ہی لوہا نہ لگے اور صرف

نہیں ہوگا۔

معین
 عاتقہ

شورش کا شیری

فیض ذہنی رشتے کے اعتبار سے تو تاثیر کے ہم زان میں ہی۔ لیکن شاید ادبی اعتبار سے بھی ہم زلف ہی ہیں۔ قامت،
 نقش فریادی، لہجہ دست صبا۔ رنگ سرخ و پییدا آنکھیں سانو کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلائیں۔ خود ہوسے گل گلہ نہ
 دل اور گرد و پیش دو دریاں غفل۔

میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ مجھ سے پہلی سی محبت مری غروب نہ لگتے لاپتے تھے۔ بڑے ہی چپ چاپ

یعنی نفل آواز، مجلس نواز، اندر ہی اندر سلگنے کے عادی۔ پہلے پروفیسر نے نئے پیمبر ملٹری میں چلے گئے۔ اور وہاں تعلقات عامہ کے عسکری و فزیشن لیفٹننٹ کرنل ہو گئے جناب کے خاتمہ پر ملازمت سے سکندرشہنشاہیلا۔ ادھر پاکستان ہی گئی تو پاکستان ٹائٹلز میں مدیر بن گئے۔ چند سال ہوئے، راولپنڈی کے مقدمہ سازش میں دھڑلے لگے تھے۔ اور قید و بند کے ایام گزارتے رہے۔

موتے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

چہرے پر یاس، آنکھوں میں سوخت، ہونٹوں پر حسرت، بالوں میں ابطاء۔ بظاہر نغمہ، باطن نوحہ۔

ترقی پسند شعراء کے امام - شاعری میں نئے ہیئت اور نئے تجزیوں کے داعی - فیض احمد فیض

ایک فرصت گنہ گاہی وہ بھی چاروں

دیکھ ہی ہم نے حوصلے پروردگار کے

پروفیسر سلامت اللہ خاں



DEPARTMENT OF ENGLISH
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

۳۰ فروری ۶۵ء

برادرم - السذوم علیکم -

سچ کا ہر فردی کا خط آیا۔ جواب میں تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ میں علی گڑھ سے باہر تھا۔

مجھے یہ سن کر ہی رستہ ہٹی گا آپ انکار کا فیض خیر نکال رہے ہیں۔ میں فیض کے بہت پرانے مداحوں میں سے ہوں یعنی اس زمانے سے جب ادگ معتقد قلمبہر شہرہ ہوتے تھے۔ اور اب بھی جب کبھی ان کی کوئی چیز پڑھنے کو مل جاتی ہے تو غور سے سر اٹھا کر دیکھتا ہوں کہ یہ شاعر اور زبان کا ہے۔

انکا محفل
سنت اسلم

سید محمد تقی

روزنامہ جنگ کے کواچے

یہ فردی — ہاں غالباً فروری ۱۹۶۴ء ہی کا ذکر ہے۔ اسپرمل پولی دہلی میں آل انڈیا مسلم یونیورسٹی پیرس ایڈیٹرس کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا جس میں ملک بھر کے مسلم اخباروں کے نمائندے شریک تھے۔ میں نے فیض صاحب کو پہلے پہل اس کانفرنس میں دیکھا۔ نمل کارڈ اور چپل پہنے ہوئے دھولے مجمع میں متاز نظر آ رہے تھے۔ انگریز کے عہد میں کسی انگریزی اخبار سے وابستگی ایک ناقابل تصور اعزاز رکھتی تھی، خاص طور پر ایک مسلمان کے لئے جن میں انگریزی دال سلم اخبار نویس خاں غالب ہی ہوتے تھے۔ اور ان میں سے کبھی چند ہی ایڈیٹری کے آخری زینے پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ پھر یہ بات بطور حقیقت

کے مان لگتی تھی کہ انگریزی اخبار والوں پر انگریزی لباس پہننا سہی کالے ہندوستان پر کیا بائیں نہیں چھٹا کالو ایس دالے البتہ اس کھیت سے مستثنیٰ تھے جو ہونٹیاں بالمدتے تراق چاق انگیزی بولا کرتے تھے۔ اس لئے آل انڈیا مسلم یوزپرس ایڈیٹرس کانفرنس نے احساس کمتری زدہ ماحول میں فیض صاحب کی یہ بدعت چوتھا کر دینے کا سبب بنی۔

سیرے ذہن میں اس ملاقات کی ایک اچھٹی سی یاد داتی رہی جو کوئی سولہ سترہ سال بعد کراچی میں تازہ ہوئی۔ جب کراچی کے کسی ہوٹل میں ان سے ایک ضیافت میں ملاقات ہو گئی۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی میں فیض صاحب ابھی ایک دو سال کے مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے ہیں۔ اس عمر میں ان سے بار بار اور طویل ملاقاتیں ہوتی رہیں اویں ہمیشہ ان سے مل کے یہ تاثر دیتا کہ یہ سیدھی سادی طبیعت صاف مزاج، اور کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ ادبی مقام شاعرانہ بلند پروازی اور نظریاتی بلوغ سے قطع نظر اگر انھیں محض ان کی حیثیت سے تو لا جائے تو وہ انسانوں کو اس میں نظر آئیں گے جو خانقاہی اخلاق کا دورہ لیکر زندگی گزارنے کے نظر پہ چلتی ہے۔ انھیں بآسانی دھوکہ دیا جاسکتا ہے، لیکن وہ مزاج کے ان تشکیل عناصر سے محروم ہیں جو چلت پھرت اور تہہ دار کردار کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔

تاریخ کے تمام وہ لوگ جو سہج کے عام سطح سے ابھر کر تاریخ کے باذہن شامل ہو سکے ہیں کامیاب رہے ہیں عام طور پر ذہنی شخصیت گذارنے پر قدرت رکھتے تھے۔ بلکہ نفسیات کے پس منظر کی خواص کا جائزہ دیا جائے تو ہر انسان کسی نہ کسی درجہ میں بیک وقت دوسرے کرداروں کا بھی اٹھائے رہتا ہے۔ اس کی ہر ذہنی شخصیت فرد پر سماج کی، تو دل کے باد سے پیدا ہونے والے اخلاقی فالک کی، بہتہ وجود میں آتی ہے۔ تاریخ میں خرد کی بڑائی بڑی حد تک اس بات پر منحصر رہی کہ وہ اپنے ہر ذہنی کردار کی غلاف کو کس زبان کے ساتھ استعمال کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اسباب سے سازگار ماحول میں غلاف اور کھلی زندگی بچا لینے کا آرٹ جانتا ہے۔ دوسرے ذہنی حیات بھی جہد لبقاء کی دوڑ میں اس خول پسندی کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ انسانوں کی سطح پر غلاف اور کھلنے کی یہ عادت سماجی تعامل کے پیدا کردہ شخصیت غلاف اور کھلنے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ان جرماتی بنیاد پر ہی نہیں اور ٹھنڈا کردہ ذہنی بیاد سے بھی استعمال کرتا ہے۔ اور وہ لوگ سہج سے زیادہ کامیاب معاملات کو ہلتے ہیں جو اس سماجی خول یعنی سہج کے غلاف کو رد و خور ذہنی توانائی کے ساتھ ادھر شعوری عیداری کی حالت میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر سماجی قدر دل کہنے ہوتے برعکس پہچنے رہتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس پر وہ کو چاک کے کے باہر تھک جاتے ہیں اور اپنی حقیقی شخصیت کا پر تو ڈال گئے ہوں۔ سماجی پردوں کے پچھ رہنے کی بنا پر یہ بڑا مشکل ہے کہ انسان کو اس کے صحیح رنگ میں دیکھا جاسکے اور اس کی حقیقت کو متعین قدروں کی ترازو میں تولی جاسکے۔ اپنی ہر ذہنی شخصیت کے سہارے ذہن رہتے ہیں کہ ان سے سب سے بہتر طور پر سیاست داں جلتے ہیں جبکہ اپنی اندرونی شخصیت پر جماعت عام طور پر ادبا، مفکرین اور دانشور کو دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں متعدد استثناء بھی ہیں لیکن یہ یقیناً ان میں متعلقہ دانشور کو دانشوری کے دائرے سے نکال کر سیاست دانوں کے زمرے میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ گویا یہ چند لوگ ان بکریاں ہیں جو بھڑینے بن کر تھکتے ہیں جو سیر رہی سادی زندگی گذارنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ فیض صاحب پر بھی سہج نے دوسری شخصیت تھوپ دی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں انھیں سیر ہا سادا۔ صاف طبیعت یعنی اپنی شخصیت کا حاسن سمجھتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی سماجی شخصیت کو سیاست دانوں کی طرح استعمال کرتے نہیں جانتے۔ اور اس سے ان کے کردار میں جاذبیت اور ان کی شخصیت میں چاٹو پیدا ہو گیا ہے۔

لوگ افراد کے لئے جو پہلے چاہیں تاہیں مل گئے ہیں پتھا ہوں کہ افراد کی ناپ تول کا ٹھیک ٹھیک پیمانہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی کس شخصیت میں زندگی گزارتے ہیں اور انھیں سہج سے متصاف ہونے کی وجہ سے جو کردار ملے اس کے استعمال کے فن سے کس قدر ناواقف ہیں۔ جو جتنا ناواقف ہے وہ، قاتل یا باری شخصیت رکھتا ہے اور اس فن میں جو جتنا سلیما ہو گا ہے اسی قدر کھلے کردار کا مالک۔

میر رسول بخش تاپور

ہیدر آباد مغربی پاکستان

فیض نے بین الاقوامی اعزاز حاصل کر کے اردو زبان و ادب اور پاکستان کی عظمت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری اچھوتے خیالات اور زندگی کے حقائق کی آئینہ واسپہ ہے۔ اردو ادب میں فیض عیسائی کم ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ مجھے غرور و مسرت ہے کہ میں ان سے نیاز مندوں اور عقیدت مندوں میں شامل ہوں۔

وہ بڑے منکسر المزاج انسان ہیں۔ ان کی پوری شخصیت نہ صرف کشش الگیز بلکہ سحر الگیز ہے۔ دوستوں میں بھی مقبول ہیں۔ عوام و خواص میں بھی مقبول۔ فیض کو اپنے وطن ملک سے محلوں کی حد تک محبت ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ مسلمان قوم میں پیدا ہوئے کسی کی ناکدری اپنے غموں کے ساتھ ایک روایت نہ بن چکی ہے۔

فیض نہ صرف شاعر ہیں بلکہ ایک حوصلہ مند و فکرمند انسان بھی ہیں۔ بڑی سے بڑی محبت اور پریشانی کے عالم میں میں نے انھیں ہمیشہ مسکراتے دیکھا ہے۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے غم میں بھی برابر کے شریک رہتے ہیں اور ان کی خوشیوں اور مسرتوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ واقعی ان کی شخصیت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ ان کی زندگی اور فن پر ہزاروں نثری کتابیں لکھے گئے جائیں تو کم ہے صہبا صاحب۔ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے زندگی میں تدریسی اور خراج تحسین کی روایت کا آغاز کیا۔ ان کے اس اقدام کی پوری قوم کو قدر کرنی چاہیے۔

اسرائیلی

ڈاکٹر عبدالوحید

فیروز سنز سیٹڈ لاہور

۱۲ جنوری ۶۵ء

عمری صہبا صاحب! سلام سنو

آپ نے انکار کے عام نمبروں کے ذریعہ مردہ پرستی کا بت توڑ کر زندہ دوستی کا جو طرح ڈالی ہے اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خداوند تعالیٰ آپ کو مزید بہت و استقامت مرحمت فرمائے۔

فیض صاحب سے میں واقعی طور پر متاثر ہوں۔ مگر انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ کلام اللہ پڑھ لے اور بحیثیت ایک ایک قلمی کے ان کی عظمت کو سراہا اور مانجئے۔ ان کے نظریات و عقائد سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن جدید روش شاعری میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے نئی نسل کی ایک نیا ہی تعداد کو اپنے انکار سے متاثر کیا ہے۔

فیض کی ایک بڑی خوبی جس کا میں غلوں کے ساتھ معترف ہوں ان کا اعتدال اور متوازن انداز بیان ہے۔ وہ اپنے نظریات و مسائل پر بے زبردستی تھپنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بڑے نرم و مانگ پھٹے ہیں اور یہی خصوصیت انھیں اپنے ہم عصر ترقی پسند شعرا میں ممتاز

کر قلب ہے۔

اردو کے شعراء میں یہ فخری صرف فیض ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے مختصر ترین شعری سرمایہ کے باوجود عالمگیر شہرت پائی اور نین پر لو کے کردار دو کا سرخڑے بلند کر دیا۔

امید ہے کہ افکار کا فیض بڑی خوش نبر کا طرح ایک عہد آفرین ادبی و سادہ نامہ ہو گا۔

عبدالحمید

نادم سیتاپوری

۱۶ جنوری ۱۹۶۵ء

نئی نسل کو "نئی غزل" کے نعرہ و فن کا پیامراج مہیڈ، داؤں میں فیض ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کے یہاں محض مشاہدہ نہیں ہے بلکہ مجاہدہ بھی ہے اس نے لکھا: "نورِ کردار کی غیر مربوط کڑیوں کو ہم آہنگ کر کے غزل جیسی فرسودہ صنف سخن کی آبرورکھی۔"

"فیض بلاشبہ ترقی پسند، رجحانات اور برزخِ ادبیت کے مابین ایک ایسا خوشگوار اور پائیدار سمجھوتہ ہے جسے اردو ادب کی تاریخ بہت دنوں تک فراموش نہ کر سکے گی۔"

نادم سیتاپوری

محمد نسیق صدیقی

جائعہ ٹکڑے نمٹے دھولے ۲۵

۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء

محترمی صہبیا صاحبہ تسلیم

نوازشِ امامہ مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۶۴ء - دلی سے باہر تھا، اسی وجہ سے جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ یقیناً ہے کہ آپ معاف فرمائیے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس کا کھلے دل سے اعتراف ہی ہے، کہ پاکستان کی آب و ہوا مسائل کے لئے بے حد سزاگوار ہے۔ وہاں کے اکثر مسائل کے عام نمونہ اپنا ہمارے بیشتر مسائل کے خاص نمونے سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں "افکار" تنہا صہبت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس نے بڑا کامیابی سے خوش نبر اور حفیظ نبر نکال کر پاکستان کے ادبی مسائل کی اگلی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے، بلکہ مشرق کی روایتی روایتی سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی ہے، جو بال سے زیادہ پارک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ خوش اور حفیظ کے بعد افکار نے ہمارے عہد کے اردو کے سب سے بڑے مفکر کا عر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یقیناً ہے کہ افکار کا فیض نبر بھی اسی قدر عظیم ہو گا، جس قدر فیض کی شاعری عظیم ہے۔

آپ کے فیض نبر کے ساتھ صبح کی اور میری بہترین خواہشات اور توقعات حالتہ بھی۔

محمد نسیق صدیقی

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

حیدر آباد
۱۱/۱۵/۶۵

مکرمی تسلیم!

منیر کا یہ عقیدت ہے۔ ایک حکم کا تعمیل کر
رہا ہوں۔ کیا پیغام لکھتے سہمہ میں نہیں
آتا، بہ حال چند طور بے بیع رہا ہوں

معلم

نبی بخش

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس سال فیض احمد صاحب فیض کی ۵۴ ویں سالگرہ پر مکتبہ افکار فیض بئر کا انعقاد ہے۔
فیض اس صدی کے ہر و لغز نے یادگار اور انقلابی شاعر ہیں۔ وہ اس دور میں ایسی شخصیت کے مالک ہیں جو آئندہ نسلوں
کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے۔
افکار کے فیض نمبر کی اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ نمبر افکار کی زندگی میں رنگ
میں کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ایم آئی شیخ خلیل حیدر آبادی

صدر حیدر آباد
۱۳/۱۱/۶۵

حضرت مہربا لکھنو: یادگار سلام مننون

جب آپ کی تجویز سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ افکار کا فیض بئر نکال رہے ہیں تو میں دیر تک ایک غوریت کے عالم میں سوچا رہا کہ اس پرتعلو
کائنات کی انیرنگیاں کس قدر عجیب ہیں اور کتنی دلکش کہ ان کی طرف خیال کرتے ہی انسان کی ادھر ہی عالم میں پہنچ جاتا ہے اور دیر تک اسے
اپنی دنیا سے بے خبری رہتی ہے۔

اس سائنس اور شین کے زمانے میں ادب شعری طرف توجہ کرنا نا اہل ہر ایک عجیب کمالات معلوم ہوتی ہے۔ لوگ تو چاند پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور کہہ ارضی کے فاصلوں کو سمیٹ کر کم سے کم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس مادیت کی بیان اور نمکشن میں ادب شعری لطافتوں کی طرف خیال متقل کرنا میرے خیال میں خورد عایت یا روحانیت سے کوئی مقابلہ جذبہ ہو سکتا ہے اور اس جذبے میں ایک سکون ایسا طیمان ایک ٹھکے ہوئے مسافر کے سایہ طلب جذبہ کی کسی تلاش اور سلامتی کا پیغام محسوس ہوتا ہے۔

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ پرستی چھوڑ کر آپ نے زندہ اور چمکے دیکھتے جوہروں کی قدردانی پر مکرماندگی ہے یہ ایک خود بہت بڑی علامت حیات ہے۔ جوش نیر اور حنیف نے بڑے بڑے انکار کا فیض بڑھایا آپ کا اعلیٰ درجے کا سماجی ادبی، اخلاقی اور معاشرانہ کارنامہ ہو گا۔ بلاشبہ فیض صاحب اپنی باطنی کیفیات قلبی وادلات اور ظاہری احسان کے اعتبار سے ہمارے ملک کے ایک ایسے ہی فو ہیں جو اس حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں جو آپ کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ کیا غضب ہے کہ سات سندھ پار کے لوگ فیض کو دیرین کے عزیز سے دیکھ سکیں اور ہم پاس رہتے ہوئے بھی اس محترم شخصیت کا شاہدہ نہ کر سکیں۔

صہبا صاحب میں سندھ نثر اور سندھی ہوں۔ تمدنی طور پر میرا تعلق سندھی ادب سے ہونا چاہیئے اور بے مگر تبدلات عمر سے آج تک ادب ادب سے میرا چلی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ قدسے آج تک جتنے شعرا گزرے ہیں سب پر قریب قریب نظر ہے مگر موجودہ دور میں اردو کے دو بڑے نامور شاعر ایسے ہیں جن سے دوسری بین الملکی زبانیں بھی متاثر ہیں اور جوش اور فیض کے کام کو بہت ہی اہمیت دیتی ہیں۔ ملک کا وہ حصہ جس کو سابق سندھ کہتے ہیں اس کے اکثر ادیب و شاعر فیض سے آشنا ہیں اور اس کے انکار کے قدردان۔

انکار کا فیض نیر آپ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے ارباب طقوں اور شعری غلوں کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ مجھے بھی انہیں میں سے ایک سمجھ لیں۔

خلیل حیدر آبادی

ماہر القادری



جناب مکرم! اسلام علیکم

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں یہ وہ دور ہے کہ مرنے کے بعد اہل مکانات کی خوبیوں کا اعتراف کیا جاتا ہے زندگی میں ان کے ہر لوگوں کو کمی نظر آتے ہیں۔ انکار نے زندہ شاہیر پر خاص نمبر شائع کر کے 'صحیح قدس' کا ثبوت دیا ہے۔ اور دینا کہ ادب میں بڑی اچھی مثال قائم کی ہے،

جوش نیر کے بعد حنیف نیر اور اب فیض نیر کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو قہر ہے کہ یہ سلسلہ الذہب جاری رہے گا۔

کامسر احمد درسا

محمد طفیل

نہترے لاہور

۲۶ مارچ ۱۹۶۵ء

برادرِ م آداب

میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پایا کہ کچھ فیض صاحب کے بارے میں عرض کروں۔ اس لئے کہ اچھا مبصر تو وہی مبتلا ہے جو اپنی دود کی لڑی لائے جو خوفِ کار کے دہم و گمان میں بھی نہ ہوتا کہ ننگ کا لڑی مبصر کا مٹھ دیکھے اور تعاری بھی۔ آپ تو میری ایک چھوٹی سی بات سن لیں۔ وہ یہ کہ میں فیض سے زیادہ فیض کی شناسی سے محبت کرتا ہوں۔

محمد طفیل

الطاف حسن قریشی

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ

۵۵۵۵ سہ ماہی

جناب مکرم! اسلام علیکم

میں بے حد شرمسار ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ تو یہ احساسِ رہا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں اور کچھ وقت کے جال میں پھنسا رہا۔

آپ کا فیض نمبر نکلنے کا عزم اور اس عزم کے پچھتے پنا ہوا احساسِ اردو ادب کے لئے قوت کا سرچشمہ ہے۔ فیض صاحب کے خیالات اور ان کے عقائد سے ہزار اختلاف ہی لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے سوچ کی نئی راہیں نکالی ہیں، اظہارِ ایمان کے نئے سانچے تراشے ہیں اور ان کے کلام کی شہنائی اور نغمگی نے کتنے ہی دلوں اور ذہنوں کو مسحور کیا ہے۔ ایک اچھے فن کار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور اس کے فن کے مختلف زاویوں کو یک جا کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ جتنا صاحب آپ فی الواقع مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ ایک مشکل کام جو فن کار کی زندگی میں ادبی مشکل ہو جاتا ہے اپنا خون جگر چھوڑ کر سر انجام دے رہے ہیں۔ خدا آپ کی صلاحیتوں کو جان کر کرے۔

مجھے یقین ہے کہ فیض نمبر انشاء اللہ آپ کے بھرپور عزم کی حقیقی مثال ہوگا۔ میری طرف سے نیچلی مبارکباد و قبولِ فرما ہے۔

للفتح حسن

امریک آئندہ

Pagdandi
AN URDU MONTHLY

Office : 2234
Phone : {
Res. : 4710

مستقر
۱۰- دسمبر ۱۹۶۷ء

برادر م!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کہ لے شکریہ! آپ کے حسب خواہش فیض نبر کے لیے اپنے تاثرات و مدح ذیل کر رہا ہوں بھائی
نیک تمناؤں قبول کیجئے!

افکار نے خوش نبر کے ذریعہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی خدمت میں ان کی ادبی خدمات کے لیے موندن خراج عقیدت پیش
کیا۔ یہ قطع فیض نبر جوش کے شایان شان تھا! حفظ نبر کی قبل وید تھا۔ تمام مسرت ہے کہ آپ افکار ایک خصوصی اشاعت فیض
نبر پیش کر رہے ہیں!

فیض نے اردو شاعری کو نیا آہنگ دیا۔ اور نظم و غزل میں نیا رنگ اور نیا موز کلام فیض سے آیا۔ معاصر (باب سخن اور ادب
ایک ایک یاد و سحر بھارت) اپنے دل کی بات زبان پر لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن فیض نے کمال ہے باکی اور بے خوفی سے انسان کے اپنے
بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کے نغمے گائے ہیں۔ تیر و بند بھی اس کی زبان بندی کر سنے سے قاصر رہی اور زندان نامہ میں اس
نے اپنے جذبات و احساسات کا حسب سابق کل کل اظہار کیا۔ آج بھی وہ اپنے کلام کے ذریعہ انسانیت کی سرخروئی کے لیے لڑتا ہے
فی الحقیقت نظم میں فیض اور نثر گلشن، این کرشن چندر انسانیت کا ترجمانی کر رہے ہیں۔

ہم فیض نبر کے لیے ویلی نیک تمناؤں پیش کرتے ہیں۔ اور متوقع ہیں کہ باب فوق اس خصوصی شمارہ کا خاطر خواہ فہم و مقدم کریں
گے۔ تاکہ افکار جلد ہی کرشن چندر نبر بھی پیش کرے۔

امریک آئندہ

شمس کنول

ماہنامہ شمس کنول کے کلیات (مبارکباد)

۲۱ مارچ ۱۹۶۷ء

عزیز برادر محترم!

آپ کا اٹھائیس نومبر کا گزرا ہوا موصول ہوا۔ آپ کی فرمائش کے مطابق افکار کے فیض نبر کے متعلق میں اپنی تاحیر رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔
آپ جیسے حضرات نے اردو پسندوں کو ایک شعور بخشا ہے! تموڑی سی شراب ادیبینے ہوئے گوشت کی چند ٹیٹیوں کے لئے تڑپے والے غالب آج
اگر زندہ ہوتے تو خوشی سے سچھو لے نہ سکتے! ان کی زندگی میں کسی جریدے کے ان کی ادبی شان میں کوئی نمبر شائع کرنا تو دوسری بات تھی

مرا کی زندگی میں تو ان کا دیوان بھی پہنچے سے رشتہ ہو گا، یا اس کے ٹیلے کا غدیہ بھری طباعت کے ساتھ ان کا دیوان چھپا تھا جس کی قیمت چند آنے تھی، غالب کھانا محرم لکھا جاتا ہے، واسطہ وہ تو اپنی زندگی ہی میں قدما شناسا نہ لے کے ہاتھوں مرحوم بن چکے تھے۔۔۔ ادب اور ادبی مہتمموں سے زندہ دوستی اور اعتراف کمال کے سلسلے میں آپ نے پہل کی ہے، افکار کا جوش نثر، بیرونی نظر سے گزرتا تھا نیز خیالات میں وہ ادب کی تاریخ کی ایک دستاویز تھی، شاید ہی کسی جریدے سے نہ پامردی کے سوانحی شخصیت کے بارے میں اتنا مفصل مرقوم ملتا، مستند اور مکمل نمبر شائع کیا ہو، وہ نمبر صبحِ محلی میں لائبریری کے لائق تھا اور تعلیمی نصاب میں شامل کئے جانے کے قابل تھا۔۔۔ جو کچھ نمبر اور حقیقتاً نمبر کے بعد فیض بئر آپ کی میسر کی کوشش ہے۔ آپ کے پچھلے اعلیٰ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ آپ کی یہ میسر کی کوشش بھی کامیاب ہوگی اور افکار کا فیض بئر پڑھنے والوں کو فیض پہنچائے گا۔۔۔ یوں جو جوش، حقیقتاً اور فیض کسی تعارف کے محتاج نہیں، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے سے بڑا شاعر اور ادیب اپنی زندگی میں زمانے کی ناقصی کی بنا پر بڑی مدد دلی سے اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔ آپ اپنے ان نمبروں کے قدیمے نائی ادیبوں اور شعرا کی زندگی کو توانائی بخش رہے ہیں اور آپ کی یہ خدمت آپ کی بخشش کے لیے کافی ہے۔۔۔ آپ کے ارد گرد سولے موٹے، نچھم اور شکل سیسے نثر شائع کرنے کی بدولت عام ہے مگر وہ غیر عقل اندہ اور ذہن کی تازہ دہی نہیں تو لے جا سکتے، ان کا افادیت معلوم کرنے سے لے کر ان کو سیروں اور ذہنوں میں لونا پڑتا ہے، واسطہ وہ غیر تو دوست نوازی، اور بددی اور گروپ بندی کے نظر ہوتے ہیں۔۔۔ حال ہی میں ایک جریدے کے ہالیائی نمبر کے مدحوئے میری نظر سے گزرے، اس میں اردو زبان کے دو ایسے قلم کاروں کی آپ بیتیاں بھی شامل تھیں جو ابھی صبحِ طور پر اردو، بھی نہیں لکھ سکتے اور نہ افسانے کی تکنیک سے واقف ہیں، ان کی آپ بیتی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی، ان پر تو ابھی بیت رہی ہے۔۔۔ امید ہے کہ جوشِ نمبر اور حقیقتاً نمبر کی طرح فیض بئر بھی مصحفِ اندیشی سے پاک ہوگا، معتقدانہ طور پر یہ بھی عرض کروں کہ میں نے خود لفظِ اعلیٰ اور جاہلدار اور منافقت کو مصحفِ اکتا ہوں، میرے یہاں لغت میں مصحف سے اور کوئی معنی نہیں۔۔۔ بہر حال فیض بئر کے سلسلے میں میری نیک خواہشات اور شہید کا منائیں آپ کے ساتھ ہیں، قدرت کو کہ آپ کو کامیابیوں کی کشتیاں، مقرر کی ہمارا وصیت کے بھوں نصیب ہوں!

شکرِ نور

تاج سعید



ارتقا

برادرِ مکرم - سلام و نیاز

آپ کا لازمی نامہ موصول ہوا، آپ نے فیض بئر کے لیے بطور ایک صحافی مجھے بھی ایک پیغام تحریر کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ کی اس توجہ کا شکریہ۔

فیض اس عہد کے بہت بڑے شاعروں، ان کی اپنی زندگی ہی میں جو عالم گیر شہرت ملی ہے انہی فن کی وجہ سے 'دہائے مستحق تھے

لیکن آپ نے ان کی زندگی شخصیت اور فن کے بارے میں جو ضخیم تحریر لکھنے کا ہر دوگرام بنایا ہے، اس سے انکی عظمت کو چار چاند لگے گی گے۔ اور وہ لوگ جو انکی شاعری کے لاکھوں مزاج کے قائل نہیں ہیں وہ بھی معترف ہو جائیں گے۔

یہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ ابھی کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جن کو فیض کی بڑا کی قیام کرنے میں تاثر ہے۔ خیر یہ تو اپنی انجمن کا معاملہ ہے۔ پھر بھی انہیں پرائز کے انعام یافتہ کے طور پر فیض نے نہ صرف اردو ادب کا مان بڑھایا ہے، بلکہ ان کی فنکاری نے پاکستان کو دنیا بھر میں عزت و شہرت بھی بخشی ہے یہ کارنامہ کئی معمولی نہیں۔

آپ قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے زندہ شخصیتوں کو ان کی زندگی میں خراج تحسین پیش کرنے کی جو رعایت قائم کئے ہیں، فیض نبر کی شاعری سے اس روایت کو مزید تقویت ملے گی۔“

اسماعیل

پہلے چھپے

کرشن چندر

پہلی

۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء

پیارے صاحب

معاف کرنا، بیت پریشاں اور معرفت کا —

فیض نبر، شہسب بہر مدبر کا بڑا اور فیض کو بھی — تم نے

زندگی میں قدر رانی کی تھی روایت شردے ہو گئے تاریخی

خدمت انجام دلا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ 'بوش نبر' اور

'دعوت نبر' سے زبان بہہ رہا، 'فیض نبر' مقبول و

کامیاب رہے گا۔ مجھے تہوار سے غوص، تہوار کا صفت اور

تہوار کے عزم و عمل سے اسی کی توقع ہے۔

'فیض نبر' ۵۱ کے دو تین روزہ ہیں ضرور کوئی

مختصر سا مضمون روانہ کر دوں گا۔ تہوار

میرا انتظار کرو۔ کرشن چندر

ایگل ایک عالمگیر قلم



دستیاب ہے
• نامیرا۔ کویت۔ سائیلون
• ہنگائی۔ شام۔ بھارت
• پاکستان۔ لبنان۔ ایران

ہر جگہ
• پرتگیزی مشرق افریقہ
• کینیا۔ ترکی۔ برما
• ملائیشیا۔ اردن۔ عراق

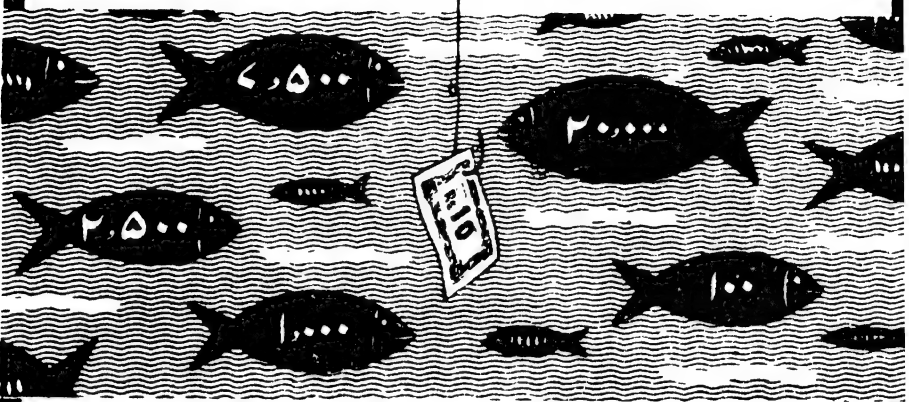
سولہ کثیر پائے مشرق پاکستان -

سولہ کثیر پائے مشرق پاکستان -

صلیقہ اینڈ سنز، ۱۱ شافٹی باغ - ڈسٹرکٹ سلطان شاہ اینڈ کمپنی، ۱۱ بریس روڈ، کراچی۔

آزاد و سربلند و سربلند و سربلند

سنہری مچھلی آپکے ہاتھ بھی لگ سکتی ہے



بیس ہزار روپے کا انعام حاصل کرنے کے لئے

آج ہی دس روپے کا انعامی بونڈ خرید لیجئے

ہزار روپے والے انعامی بونڈ پر ہر ساہی ۵۰۰ روپے
کے ۱۳۶ مختلف انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جیتنے والے
انعامی بونڈ آئندہ قرعہ اندازیوں میں بھی شامل رہتے ہیں۔
ہر سلسلہ کے جس قدر بونڈ چاہیں خریدیں۔ بھنائے ہوئے
بونڈ دوبارہ فروخت کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ ان پر بھی
انعام حاصل کر سکیں۔
انعامی بونڈ ہر منظر و شدہ بینک، ڈاکخانوں و ذیلی
ڈاکخانوں سے دستیاب ہیں۔

انعامی بونڈ

کنہ کے لئے بچائیے — قوم کے لئے بچائیے

صحت اور دانت



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن' جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد متل کیا گیا ہے دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو اسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن انڈینک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے نگوین وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیرپا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



ہمدرد منجن

مسکراہٹ پرکشش اور دانتوں میں پتے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے



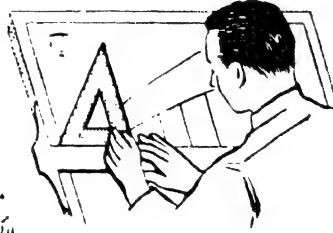
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور



آج کی ترتیب



کل کی تعمیر



پاکستان کو قومی تعمیر
منسوبوں کی تکمیل کے لئے بہت سے
لائق انجینیروں کی ضرورت ہے آپ کا
ہونہار بچہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا
ہے.... بشرطیکہ آپ اُسے مناسب تعلیم دیں۔
جیب کی لائف پالیسی لیجئے اور اپنے بچے کا مستقبل بنائیے۔

تفصیلات کیلئے:-

جیب انشورنس کمپنی لمیٹڈ

افسار - فیض نمبر

تھری اسٹارز



☆ اصلی کارکردگی

☆ دیرپا

☆ صحیح ویٹیج

تھری اسٹارز سیل میں اول سے آخر، خول سے مرکز تک ایک بڑھیا سیل کی سب خوبیاں شامل ہیں۔ مثلاً بہترین کیمیاوی اجزاء ساخت کے دوران کڑی جانچ اور سب سے بڑھکر سیل سازی کا طویل تجربہ۔ تھری اسٹارز سیل خریدیے۔ یہ نام اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ سیل بازار میں اپنی قسم کے ہر سیل سے عمدہ ہے۔ تھری اسٹارز سیل اپنی اعلیٰ کارکردگی، دیرپائی اور صحیح ویٹیج کی وجہ سے لاکھوں خریداروں میں مقبول ہے۔



سیل سازی کی
بہترین کاریگری کا نشان

تھری اسٹارز

پاکستان بیٹری مینوفیکچرنگ کمپنی کراچی

نقش فریادی؟



بہارِ حیات میں ایک تصویر
 پر ہیں اس تصویر سے اس کا جزو ہونے کی
 فکروں میں اس کا حصہ ہونا ہے۔
 اس کے لئے جس وقت اس کے سامنے ہے
 خیال کوئی کرنا ہے اس کے لئے
 کہتا ہے۔
 بے جا حریف سے استسرا
 کہیں اور بھائی ہوئی رستم سے سپرد کا اوزل
 کہوئے۔

وہیں مسئلہ انجیل
 جسٹس کیسیر

میں آتش
 کہوئے



محبوبِ نظر

آکے نظر تھے مولا کے محبوب کے نظر تو دیکھو

- ★ یا دوں کے راتے
- شخص و عکس
- ★ فیض صاحب
- فیض ایک پیاری عظیم شخصیت
- ★ چند یادیں، چند تاثرات
- لکھنؤ کی ایک رات
- ★ فیض شخصیت کی چند جھنکیاں
- فیض، آئینہ دل میں
- ★ فیض ایک دوست، ایک دانشور
- کچھ فیض صاحب کے بارے میں
- ★ پیغام آشن گویم
- ماسکو کی ایک رات
- ★ چیکوسلواکیہ میں فیض کی مقبریت
- فیض احمد فیض، چند زاویے
- ★ شاعر سحر
- فیض الایاد میں

ایستے فیض تذیب سید ابوالخیر کشفی

یاد رکھو

یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کسی ایسے شخص کے بارے میں معروف بن کر بات کی جائے جو پچیس سال تک رگ جال کی طرح ساتھ رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جو میراثو ہے۔

فیض پر کچھ وقت ذاتی باتیں اور شرک تجربات کثرت کی طرح دامن دل کو کھینچتے ہیں لیکن جب انتخاب کا یہ مرحلہ آجائے کہ کیا تمہیں "تو دبی باتیں چنی چاہئیں جو دوسروں کی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کر سکیں۔ دوسروں کے دلوں کو یوں چھوئیں کہ ان کا لمس جسم اور قہم کی تحریک بن سکے۔" یہی نہیں بلکہ وہ باتیں آنسوؤں کی سرحد تک پہنچا دیں۔

میں ماضی کی طرف دیکھتی ہوں۔ اور میری نگاہیں ناگزیر طور پر زندان کے دروازوں تک پہنچتی ہیں۔ جیل کے یہ سال ہماری باہمی زندگی میں ایک زندگی کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر ان برسوں نے ہم دونوں کو وہ کچھ دیا ہے جو کسی طرح بھی ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ چند سال جن میں ٹھنسیوں چلی ہوئی ایک بچی، چھوٹی سی لڑکی بن گئی جن میں ایک لڑکی آہستہ آہستہ نوجوان خاتون بن گئی۔ جن میں زندگی کی ایک اچانک موڑ کی طرح، کسی "کے" پر کے بالوں پر سفیدی غالب آگئی۔ اور کسی کے چہرے پر جھریاں آہستہ آہستہ اپنا جال بیتی رہیں۔ زندان کے دروازے ہمارے درمیان عائلے تھے۔ لیکن ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے، ان سے لکھے ہوئے، زنجیروں کی ہلکا دار دار تالوں میں کچھ یوں کے گھومنے کی آواز کے ساتھ زنجیر و سلسلے کے یہ ایام اپنے جلو میں سمرت سے بھر پور لمبے کر آئے۔ ناقابل یقین طور پر خوشیوں سے گل بداماں گئے۔ میں ان دلائل کے علم بلکہ غموں کی بات نہیں کر سکتی۔ کیونکہ موت (اور غم) نے اپنی خواہشیں ہم دونوں کو دی ہیں۔ میں تو خوشی کے لمحوں کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ سوجھ بوجھ کی روشنی سے یہ سیتہ ہوئے شات جلد گلا گھسیں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ سائے بھی اتنے ہی عزیز ہوتے ہیں۔

جب ماسچ کی ایک برگ کو فیض نے مجھے اور سوتے ہوئے بچوں کو ڈھانڈھا تو میرے سامنے سب سے پہلا اور سنگین مسئلہ یہ تھا کہ چار سو روپے ماہانہ انڈی سے گھر کو کیسے پہنچایا جائے گا؟ یاد دل نا خواستہ ہم نے شفیع اللہ کے علاوہ دوسرے پرانے نوکروں کو الگ کر دیا۔ شفیع اللہ جو

اب بھی ہمارے ساتھ ہے فیض کی سربا اہلام سوتیلی بہن بللی ہمارے ساتھ رہنے کے لئے آگئی۔ تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات میں زندگی بسر کرنے میں میری مدد کر سکے۔ پہلی ضرب ہمارے کپڑوں پر پڑی۔ کوئی میری کالج سے ان کا نام کٹوا کر گنبدِ دانش سکول میں داخل کرنا پڑا۔ مجھے تو اس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ فیض ہماری جھوٹے گستاخوں سے منہ بٹا رہا تھا۔ مزید اتر مجھے برا بھلا کہتی: جب ابویساں تھے تو میرے پاس ایک آیت تھی۔ سکول میں جھوٹے تھے چکر لگنی تھی۔ طرح طرح کے کہیں تھے..... اپنے نئے ماہوں میں سے غریب پریشان ہو گیا لیکن دعا کے لئے غریبوں نے: میں ایک عجیب سا ذہنی اور نفسیاتی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ میری زندگی کے حوالے کے باوجود وہ رات کو سوتے سے پہلے اپنے ٹھنڈے پر بھج کر غم کو رکھ کے سے عالم میں آسانی پاپ کی حمد۔ بڑی ہوئی اور قدر سے مضحک اردو میں منانی۔ ایک ماہ جب وہ اپنے خالق سے ممد و فدا ہو گئی اور ہم سے ملنے کے لئے منتظر تھے اس نے کہا: "اور آسانی پاپ..... تم جو حیدر آباد میں ہو، جلدی سے واپس آؤ۔" جب ہم نے اپنی گھٹی ہوئی مہنی پر قابو لیا اور مزید وہی باقی دعا سن لی تو اسے ستر میں لٹا دیا۔ پھر سے (غیم میداری کے عالم میں) یہ کہتے ہوئے سنا۔ "باجی۔ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

جیل میں ملاقات کی اجازت مدتوں کے انتظار کے بعد ملتی اور ہر ملاقات کی یاد آگئی وہ ملاقات تک ہم سینے سے ملے رہے۔ اگلی ملاقات تک ہر پہلی ملاقات کی ایک ایک نگاہ، ایک ایک مہظ، ایک ایک جنبش کو ذہن میں دلی ایک تہ عجز کی طرح محفوظ رکھتے۔ یہ ملاقاتیں دو تین بیسے میں ایک بار ہوتیں۔ ہر ملاقات کے لئے ہمیں حیرت، سحر، دستوں کو ملے کرنا پڑتا۔ یہ سفر تھا کہ دینے والے بھی تھے۔ اور پھر اس تھکن پر اعتراضات کا، منافیہ کیجئے جیسے ہر ملاقات کی گمراہی کرتا۔ خاص طور پر میری ملاقات کی گمراہی کیونکہ مجھے "مکمل" معلومات کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم ملاقات کے ان محو کوٹھے بچھکے واقعات اور دوستوں کے پہچانات سے تیسری مرتباً ملے تاکہ ان کا بوجھ رفاقت سے دھب جائے۔

مجھے اچھا علاج یاد ہے کہ ایک ملاقات کے موقع پر وہ میں ایک کہانی سنائی تھی ہمارا جیلر اس کہانی کی دسپسوں میں یوں کم ہو گیا کہ جب سنتری اور صبر کی ڈیوٹی کا وقت پورا ہو گیا تو اس نے دوسرے جیلر سے کہا: "کبھی بھڑکی دیر بھر جاؤ، میں اس کہانی کا انجام تو سن لوں۔" دوستوں نے مجھ سے اکثر پوچھا کہ بھلا کسی غریبی موجودگی میں باتیں کیسے ہوتی ہوں گی؟ دوستوں کی ملاقات کے درمیان ایک سیر وجود۔ ہر بات سننا ہوا آدی۔ پتہ چوچھے تو آپس اکثر کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی کب ہوتا تھا۔ اباب کبھی کبھی حجاب درمیان کی موجودگی، ملاقات کو آلودہ کر دیتی تھی جیسے شروع شروع میں جیلر صاحب میرے اوفیس کے درمیان بیٹھے پراسرار فرماتے تھے۔

فیض کی گرفتاری اور ان کی غیر قانونی قید و تہا، اس غیر قانونی اس لئے کہ میری جیلوں کا ایک مقررہ مدت سے زیادہ کسی شخص کو قید و تہا کے عذاب میں مبتلا نہ کرنا قانونی ہے، (کے قید نامہ بعد میں) دونوں جیلوں کے ساتھ ان سے ملنے لانا پوزیشن مل گئی۔ یہیں ہر منٹ ٹوٹ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا: اس نے میرا نام پوچھا میں نے بتا دیا۔ پھر اس نے ہم تینوں کو دیکھا۔ مجھے اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس لمحہ بہت تنہا، مایوس و دملوں اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہمارے چہرے ہماری ذہنی کیفیت اور زندگی کے آئینے بن گئے ہوں۔ ہر منٹ ٹوٹ کے مجھ سے پوچھا: "آپ کی ہی دو بچیاں ہیں؟" میں نے اسے بتایا کہ یہی بچیاں ہماری متاع ہیں۔ ہماری زندگی کا حامل ضرب۔ اس نے جھجکے ہوئے سوال کیا: "کوئی لڑکا نہیں ہے؟" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ اس نے ایک آواز میری۔ ایک طویل آہ۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا: "کیسے انھوں کی بات ہے۔ کبھی انھوں سننا کہ بات۔" اس کے بعد مجھ سے مجھے برا احساس ہوا جیسے اب کسی بیٹے کی ماں مذہاب سے منع میں نہیں جیسے۔ میرا سہاگ لٹ چکا ہو! اور جب فیض کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بچیاں دوڑتی ہوئی ان کی آغوش میں سما گئیں۔ مزید وہ نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا: "ابو!

”وہ کہتے تھے کہ آپ کے ہاتھ اوپر کاٹ ڈال جائیں گے۔“ وہ، کون تھے، یہ مجھے کبھی نہیں معلوم ہو سکا لیکن اس لمحے جب ہماری (ہیری اور فیض کی) نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو ہمیں معلوم ہوا کہ ایسے ہی — کے تجربے اور خوف سے ہم ہی نہیں گزر سکتے (مگر ہماری پیدائش بھی ایسے ہی کے کریمیں مبتلا تھیں)۔

حیدر آباد تک ہم اسے سفر کا مطلب تھا۔ زیادہ مذاقات۔ ان سوتھوں پر ہم ہمدردی مرقوم کے ساتھ قیام پذیر چلتے۔ جو ”مزم“ کی قانونی پیروی کر رہے تھے۔ سلیم اور عزیز، ہمدردی صاحب سے جیسے بے ساختہ پیرا کر رہے تھے۔ اور ان سے قریب — ڈی ٹین۔ ہمدردی مرقوم بچوں کے لئے رقص کی موسیقی کی دھن پر رانڈ کر رہے تھے۔ دائرہ میں رقص — ایک دن سیم نے اپنے سر ڈھکیٹے ہوئے کہا: ”آج میں نہیں ناچوں گی۔“ لیکن منیرہ فوراً چل کر کھڑی ہو گئی۔ ہمدردی صاحب نے اپنا ہاتھ لٹے بڑھایا۔ اور پرانی دنیا کے آداب کی سراسر انصوریہ بن کر مہیے رقص کی فراکش کرتے ہوئے قدر سے تھکے۔ منیرہ نے ایک نوجوان قانون دان کو اس درخواست کو قبول کر لیا۔ ہمدردی صاحب کا چہرہ لباشا سے کھل اٹھا اور وہ دونوں کے مے میں مل گیا۔ امیر اور مدیم سے فرانسیسی انڈاز کے شہناز رقص (Valse) میں مصروف ہو گئے۔ بعد میں ہمدردی صاحب نے گاڑی میں دیر سے سندھ تک چلنے کی تجویز پیش کی۔ اور پھر وادی کی میووں پر کشتی چلائے ہوئے، انھوں نے سب ایک چٹائی پر لوگسٹ سٹایا جو ان کیوں کو پہلے سے یاد تھا۔ یہ سب کچھ کس قدر پر رطقت تھا کہ جب ہم یہ سوچتے کہ یہ کبھی اور صاحب جو ہر آدمی میں صریح حصولِ انصاف کے لئے جیل کی چاندیواری کے اندر اپنی جبر و جہد پر شروع کر دے گا۔ تو ہر بات اہل اور بے عمل حنوم ہونے لگتی۔

”دربارِ وطن میں جب آنکھیں...“

یہ فیض کی محبوب ترین اور مقبول ترین قوالیوں میں سے ہے۔ مجھے حیدر آباد جیل کی ایک عید یاد ہے۔ جب منیرہ قیدیوں کے خاندان تک جا ہو گئے تھے۔ شوخ رنگوں کے رنگ بنگا، اندھ کھیلنے پر پڑے ہوئے اتنے بچے وہاں جمع تھے جنہیں دیکھ کر دیکھنے والا بھی بھولی جانا کہ بلا کسی استثناء کے ان سب کے باپ ایسے الزامات میں ماضو تھے جن کی بنا پر استغناء منزلے موت کا مہالہ لگ سکتا تھا۔

عید کی اس پارٹی میں یہ قوالی جس جوش، چاؤ اور تیز من میں گاؤں گئی، اس کا تصور بھی ایک شکل کام ہے۔ اور جب قوالی ختم ہوئی تو اس وقت تک تمام بچے ہویاں اور مائیں، سب ہی اس قوالی میں شریک ہو چکی تھیں۔ سب کے ہونٹوں پر صرف یہی بول تھے:

دربارِ وطن میں جب ایک دن...

ہم سب نے نہایت پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ اور جب ہر گھر ”یعنی ڈاک بنگے“ واپس پہنچے تو بچوں نے کہا: ”ایسا کھانا تو ہم نے بہت دفعہ نہیں کھایا تھا۔“ ہوتا ہی۔

کھانے کی بات پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب فیض کو نزاری جاسی تھی۔ اور وہ اپنی معاذ قید شکرگی جیل میں پوری کر رہے تھے۔ منیرہ اور سلیم نے اپنے ابو کو خط میں لکھا: ”ہم آپ سے ہیں۔ آپ دیکھ کر کھانے کے لئے کوئی ایسی چیز مقرر کر دیتے ہیں؟“ ہمیں ایک ساتھ دھڑک دھڑکنا، کھانے کی اجازت دیدی تھی تھی۔ جب ہم لوگ شکرگی جیل پہنچے تو نائب پرنسپل ڈاکٹر لودھی صاحب نے منیرہ سے کہا: ”تمہاریے ابو نے تعینا تجارے لئے کوئی خاص چیز پکائی ہوگی۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ منیرہ نے پوچھا۔

”میں نے تمہارے خط میں پڑھا تھا۔“ اودھی صاحب نے جواب دیا جیل کے اباب حل و عقد یقیناً خطوں کا اعتبار کرتے تھے۔ مہاجر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”تو کیا تم میرے خط پر تھمتے ہو؟“

”ہاں۔“ اودھی صاحب بولے۔

”اوت۔“ بدلتی کہیں گے۔“

میں اپنی کہہ سکتی کہ یہ عجیب سن کر اودھی صاحب پر کیا مٹی۔ لیکن مجھے یہ بھی طرح یا جبے کہ ان کے چہرے پر اس وقت کیسے تاثرات تھے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ یہ سچا ہے اودھی صاحب

جب ۱۹۵۹ء کے ابتدائی ہفتوں میں مارشل لا کے تحت فیض پھر جیل خانہ میں لایا گیا تو وہ جیل سے وہ قدرتی طور پر منتقل کر دیئے گئے۔ میں غائبانہ سے ملاقات کی درخواست دی۔ جس پر ”آئی جی“ کے ذمہ دار نے اسے دانتہ جھوٹے کام پر لے گئے۔ انہوں نے اس بات سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ فیض لاہور جیل سے قلعہ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس دانتہ جھوٹ کی وجہ سے میں لاہور جیل کی۔ احمد دہان پہنچا کہ فیض تو وہاں سے جا چکے ہیں۔ اور جب میں نے ملاقات کے لئے دوبارہ درخواست دی تو میں غصہ کے ماسے سے سچ بولی کہ ”آئی جی“ نے ان کو لاہور میں اپنی بولی میں اس کے ساتھ قلعہ لاہور پہنچا۔ فیض کو ان کی کوٹھڑی سے بلا لیا گیا۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو کر یا تو انہیں شیو کر کے اجاڑ دیئے، دی گئی یا انہوں نے خود ہی داڑھی بنانے کی رحمت گوارا نہیں کی۔ ان کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے پچھلے چوہوں میں گھٹنے خوشگوار ہرگز نہ تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے ناشتر کیا ہے؟“

فیض نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں۔“

”کیا؟“ یہ تمامیر اور دوسرا سوال

”او۔۔۔ ایک بن۔“ ایک پیانی چائے۔“ فیض نے جواب دیا۔

”بن“ کا لفظ سننے پر میں جیسے باوجود گئی۔ جیسے کسی نے بندوبست کی سبھی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میرے مزاج کی یہ کیفیت کیونکر ہوئی؟ اس کا جواب خود مجھے بھی کبھی نہ مل سکا۔ لیکن شاید اس وقت ”بن“ ایک علامت بن گیا تھا۔ ایک انشاء۔ ان تمام نا انصافیوں، دکھ درد، ذلت، غریب اور دور کوئی کا جن کا اس گزشتہ کئی ماہ سے شکار تھی۔

میں غصہ سے بے قرار ہو کر جیل کی طرف پٹی اوپر چلی۔ ”تم نے میرے شوہر کو بن دیا۔ صرف بن“ جیلر کا منہ کھلا۔ مگر میں نے اسے ایک لفظ کہنے کا موقع نہ دیا۔ میں پھر میری پڑی۔ ”تم کیا ہانو۔“ انہوں نے اپنی ننگی ہڈی میں بھی بن نہیں کھایا۔ ”تم نے بن ہی تو کہا تھا؟ بن۔ بن۔“

یہ وہ غریب آدمی کچھ نہ بولا لیکن اپنی پر جو شیطانت کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ اب اطمینان جیسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس وحشت آمیز اور ختم ناگ سانس کے ایک ہڈی بعد جب میں گھر گئی تو میں نے اندازہ نہیں کیا، ڈیل روٹی سے ایک ٹوکری بھری اور جیلر کے نام ایک پڑہ لکھ کر بھیج دیا کہ ”ناشتر اس قسم کی چیز کو کہا جاتا ہے۔“

بعد میں ”بن“ کے واقعہ پر ہم دونوں بے شمار مذاکرات کرے تھے۔ اسی جتنی جو تھمتے ہوئے کوئی تھی۔ کیونکہ قلعہ لاہور کی کسی کال کوٹھڑی

میں بقدر آدمی کے لئے بن کی اہمیت ہی کیا تھی؟ — سیکن شاید اس وقت اس بن کی اہمیت اس مچھلی اور تھوڑا سی بے والی سنہائی اور کھوکھلے پن سے وابستہ ہو گئی تھی جو مستقبل کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔

میری ساس نے مجھے لہجے میں بتایا کہ میری پرورش فقہ پر کی گئی تھی۔ یہ سمجھی تھی کہ میں کوئی نیا یا قلعہ میں اڈتا ہوں، اپنی کئی کئی سس پر میں بگڑ رہی تھی۔

فیض سے (مختلف جنسوں میں) ملنے کے لئے میں اکثر میں گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ تہہ بہ تہہ درمیانے درجے میں سفر کرتے تھے۔ ایسی ہی جہیوں کو ہم سفر سے مستثنیٰ کیا گیا تھا کیونکہ پڑتی تھی۔ (لاچکے نکلا سوں کے مسافر۔ تو یہ۔ کسے رہا کہے کا یہ نباشد۔ سلیم سے جب کوئی پوچھا کہ اس کے والد کون ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں، تو وہ ہجھک جاتی تھی۔ ایک ایسے موقع پر میں نے اسے یہ کہتے سنا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے شدید رعبوت سے نفرت تھی) ابو حنیسا با دین کام کرتے ہیں۔ "میزہ اس کی طرف ڈری اور غصہ میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہے ہوئے ہوئی۔ "جیل جیوں! میں کی، وہ جیل میں ہیں۔"

کچھ دن سچے مجھے ایک کاپی ملی۔ جس میں جیل سے فیض کی واپسی کے بعد ملک کے واقعات ہیں۔ اسے دہلی کی پھر عارضی کے بعد میں ایک بار پھر فیض کو اپنی ٹھہریوں زندگی کا قصہ بنانا تھا۔ ہاسی ٹھہریوں زندگی جو پیدائشی نظام کی جگہ ایک خاص اور مضبوط ماضی اور نظام بن گئی تھی، اس کاپی کو "وحدت کا منصوبہ" (One Unit Plan) کہتے تھے۔ اور ہم بہت کم ایک ناکام پاکستان کے کسی سابق صوبہ کے نام پر تھا۔ اس وحدت میں ایک بھائی کو بخشا گیا تھا۔ ہمارا کام اور فیض پر تھا کہ برائی اور عاداتوں میں اور ٹھہرے نے ان کے ساتھ اختلاف رکھے یا تصفیہ کریں ٹھہریوں زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لئے۔ ہم ہر طبقہ ایک جادہ کرتے تھے۔ شکایات پیش ہوتی تھیں۔ اور ان کے حل تلاش کیے جاتے تھے۔

اب میں اس کا پی پر نظر دے لیں تو ایسی تحریریں اور یادداشتیں نظر آتی ہیں۔

”میں کچھ سہیلیوں کو چائے پر بلانا چاہتی ہوں؟ کیا اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔“

”ہمیں گھر پر اللہ کی پاری کرنی چاہیے۔“

”الو کو باں روم ڈانسنگ سیکھنے کی مشق ضرور کرنی چاہیے۔“

”نصیر کو اپنی الماری کے خالے خود صاف کرنے چاہئیں۔“

ابو بکر اکیڈن میں تیس سے زیادہ سرگرمی میں جھونکنے جا رہے تھے۔ انہوں نے بائیں گے تو میں نے نکالتے ہوئے پانی پر رخ کر رہے تھوں گی۔

مگر جب کوئی دعوت ہو تو بڑے کسانوں کو بھی بلایا جائے۔ ”کئی کئی برسوں علاقہ ”کیرج“ میں یہ پروردگار نے اور سوچا ہے۔ اس کا نسل میں یہی طاقت عاشقی کسانوں میں آئی۔ عین سترھویں صدی کے وسط میں کئی ایک ایسے لوگوں نے جن سے یہی تعلق تھے، جن میں ”شیخ شامہ“ اس لکڑی کی بھی میں دوسرے کیے نعت اور لکھنؤ کا سبب بنائی۔ ہمارے ہاں رساں محمد وحید اور علی بڑھتی ہی جاتے تھے۔ ان میں بہت ہی بچی چاند کی تحریک کرنی پڑی تھی۔ اسان اردو میں راجن بند) اور یہ تکرید اس وقت تک لازم تھی جب تک فیض جیل سے نکل کر دوبارہ کام نہ شروع کر دیتے۔ لیکن جلد ہی ہمارا جمہوری نظام کامیاب ہو گیا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد ہمارا گھر اس نوجوانوں پر رہا جسے گھر پرست ہے۔ اس گھر سے باہر کبھی گیا ہی نہ ہے۔

(انٹرنیٹی سے)

سبّادِ ظہیر

شخصِ عکس

محمود امرتسریں دو ڈیڑھ سال سے تھے لیکن ان کی یارشیدہ کی پنجاب کے ادیبوں سے اس وقت تک ملاقات نہیں ہوئی تھی وہ پڑبانے میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی کام میں مشغول رہتے۔ رشیدہ ڈاکٹری کرتی یا کبھی کبھی انہی نے کھلیے۔ ہم نے مشورہ کیا کہ ناہور چلیں اور وہاں اپنے مشترک دوست میاں افتخار الدین اودو دستور سے مددے کر ادیبوں سے ملیں۔

نیکو قبل اس کے کہ ہم لاہور جا میں ہیر غفر متوقع ملے غفری مدد ملی۔ امرتسریں میرے ایک دو دن کے قیام کے بعد ایک دن رشیدہ نے کیا رنگی کہا۔ "محمود! وہ جو تمہارے کالج میں ایک نیا لڑکا آیا ہے نا، انگلش ڈیپارٹمنٹ میں، کیا نام ہے اسکا؟ اور کچھ میری طرف مڑ کر" میرے خیال میں تم اس سے مل لو۔"

محمود بہت بخید گئے آخری میں "بوندہ بنا مطلب ہے۔ ہمارے آخری کے لئے کچھ نہیں احمد!" "ابہ! ہر کچھ کوئی بھی نام مجھے یاد نہیں رہتا وہ بوتا تو ہے نہیں۔ تمہارے کالج میں وہی ایک لڑکا۔ سہو دار معلوم ہوتا ہے۔ جتنے کو اس سے ملنا چاہیو؟"

محمود صاحب نے اس بات کو اپنے کالج اور اس کا واسطہ پر سہل ہونے کی حیثیت سے اپنے اوپر حملہ تصور کیا اور ذاتی سے لہے "ادیبوں کیا معلوم۔ میرے کالج میں کون سمجھتا رہے اور کون نہیں؟ تم کتنوں سے ملی ہو؟ اور جن سے تم ملی ہو ان کے نام تک تو کہیں یاد نہیں۔"

اب کیا تھا رشیدہ بالکل اپنے اصلی رنگ میں آگئیں اور چمک کر بولیں "سب تو بھرے ہیں تمہارے کالج میں جنہیں ان کے نام بتا دیں نہیں آتا۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں۔ میں اسٹاف کی بات کرتی ہوں۔ لڑکوں کی نہیں۔ نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ صورت سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔"

— اس پر ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا "اچھا بھئی! یہ طے کر دو کہ ان سہو دار نہیں احمد صاحب سے کب ملاقات ہوگی؟"

— محمود صاحب نے جواب دیا۔

”و میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی فیضی سے ترقی پسند مصنفین کے بارے میں باتیں کر لی ہیں اور تمہارا بھی ان سے ذکر کر دیا ہے۔“ سچا پتی ڈائری دیکھ کر کہا: ”مناجی سارے چار پرچمیں آ رہے ہیں۔“
 ”دیکھا تم نے ان حضرت کی باتیں“ رشید نے مجھ سے فرد کے بھائی کا ”میں نے بھی تو آخر یہاں کا تھا کہ فیضی کو تم سے ملنا چاہیے۔ یہ مخاہ خواہ مخفیے بھرے مجھ سے اچھے ہوتے ہیں۔“ محمود مسکراتے رہے کچھ نہیں بولے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے اعلان کیا۔

”مجھ اب کالج چلا۔ مہربانی کر کے چارے لے، سینڈویچ وغیرہ بنوا دینا۔“ پھر ڈائری دیکھ کر انہوں نے کہا۔ ”اور کل چائے پی کر کم موٹے لاہور کے لئے روانہ ہونگے۔ فیضی بھی ہمارے ساتھ ہونگے۔“ میں نے افتخار کو اعلان کر دی ہے، ہم ان کے یہاں ہی ٹھہریں گے، فیضی اپنے گھر نہیں جے۔“
 ”اور کچھ طے ہوا ہر تودہ بھی اچھی تبادو۔ ذرا ڈائری کا اٹکا، سفر تو دیکھو، برکٹسٹ اور نئی کس کے یہاں کھانا پڑے گا؟“
 رشید نے پوچھ ہی لیا۔

”یو آر جسٹ اسپرسل“ محمود نے کہا اور مثبت ہوئے چلے گئے۔
 بارے تیسرے پیرچہ ”فیضی احمد صاحب“ سے ملاقات ہوئی تو جس کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ یعنی فیضی نہیں بولے۔ کسی نے آری کے گفتگو شروع کرنے اور اسے جاری رکھنے کا مشکل فن مجھے بھی نہیں آتا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس میدان میں مجھ سے بھگڑے اناری پائے جاتے ہیں۔

فیضی کی رازداری کا کمال یہ تھا کہ اس وقت تک محمود اور رشید کو اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ فیضی شاعری بھی کرتے ہیں ان کی نظریں تو بس وہ ادب خاص طور پر انگریزی ادب سے لپکے رکھتے دالے ایک ذہنی نژاد تھے۔ جن میں کچھ کچھ ترقی پسند و سچا پتے پائے جاتے تھے۔ محمود نے مجھ سے ان کے ذوق سلیم کی تعریف کی تھی جس کا پتہ انہیں اس طرح ملا تھا کہ وہ محمود کے یہاں سے اچھی اچھی کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لئے لے جایا کرتے۔ اور انہیں بڑے شوق سے پڑھتے۔

ہم نے شاید انگلستان کے نئے شاعر اسٹیفن اسپنڈرا اور آڈن کا تذکرہ کیا۔ جن کے شعور کے نئے مجموعے ان دنوں شائع ہوئے تھے اور جن کی شاعری میں انگریزی شاعری کے مردہ لٹریس۔ المیہ کے پھیلنے سے تلخی اور نامرادی کے رجحانات سچے الگ ہٹ کر انسانیت کے نئے اشتراکی مستقبل اور یورپی عوام کی ناشٹ دشمنی و جدوجہد کی امید بھل گئی تھی۔ مجھے اس پر کافی تعجب ہوا کہ فیضی ان شاعروں کا نام پڑھ چکے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں ہم نے اس وقت تک جو کیا تھا سب بتایا اور اس سے پوچھا کہ کیا اب اس کے امکانات ہیں۔ فیضی نے اپنے بشر سے کسی خاص رنج و غصے یا انہماک کے جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا بس ایسا سپنڈرا کی مسکرت ہٹ کے ساتھ بڑی مشکل سے اتنا کہا۔

”لاہور چلے دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہاں پر کچھ لوگ تو شاید ہم سے متفق ہونگے“ معلوم ہوتا تھا کہ تہہ کے آئے ہیں کہ سنیں گے، مسکرائیں گے، مگر بوسے نہیں آئے۔ آخر کو رشید چلا پڑیں۔

”یہ بھی خوب ہے، کچھ لوگ شاید متفق ہونگے۔“ جناب ہیں اس سببی نیسٹر پر بہت سے دھوکے کے دستخط لیتے ہیں اور پھر لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بناتی ہے۔“

محمود اور دینِ رضیہ کی اس حرکت پر غصے گئے: ابھی ہماری فیض سے بے تعلقی نہیں تھی، اور میری تو بالکل پہلی ملاقات تھی اور رشیدہ انہیں کہ اس ہمارے شریکے یہاں کی تعلیم کرنے گئیں اور اس پر فقرے چست کر دیں تھیں، انہیں روکنے یا منع کرنے کی کسے ہمت تھی۔ پھر بھی فیض کے لئے مس نہ ہوئے البتہ اب کی ذرا اور کھل کر مس کرے اور بے۔
 "لاہور چلنے کو شش کرتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

ہم اپنے پروگرام کے مطابق اس کے دوسرے دن لاہور چل پڑے۔ اور چراغِ طے وہاں پہنچ گئے، فیض اپنے گھر چلے گئے اور ہم تینوں سیدھے کینال بنک میاں افتخار الدین کے کوٹھی پر گئے۔ وہاں میاں صاحب کے نوکروں نے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ میاں صاحب اور بیگم صاحبہ کسی پارٹیا پر گئے ہیں۔ ہم جا ملے میں شام کے وقت، ۳۰-۴۰ میل موٹر پر چل کر آئے تھے اس لئے کوئی ٹھہرے ہوئے تھے اندر آتے نہ ان میں بڑی اچھی جگہ مل رہی تھی۔ چپ چاپ اسے گھر بکا کر بیٹھ گئے۔ نوکر مہذب سے ہمارے لئے چائے بنا کر لائے۔ اہل کی گرمی اور چائے نے ہمارے موڈ پر اچھا اثر ڈالا۔ سفیدہ ایک نرم کشن میں بندھ چھا کر تالین پر لیٹ گئیں محمود کا ہاتھ سے اپنے جیب میں گیا اور انہوں نے پانی نکال کر پینا شروع کر دیا۔ لیکن وہ وقت ضائع کرنے کے قابل نہیں تھے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی نوٹس بک اور میرے ساتھ دوسرے دن کا پروگرام طے کرنے کے ان کے نوٹس کی پی ۲۰-۲۵ نوٹس کی ایک لمبی فہرست تھی لاہور کے ادیبوں، شاعروں، ادبی دہلی دہلی نے والوں ادیب کے، دگلروں، آرٹسٹوں، پرنسپلوں کے فہرست۔ انہوں نے کیا میرے لئے مفروضہ ہے کہ ان سب سے فرداً فرداً لوگوں اس انکسٹنٹ پر سمجھ کوئی تعجب ہوا اور میرے ان سے پوچھا: تم تو کہتے تھے کہ تم یہاں کے ادیبوں کو جانتے ہی نہیں پھر یہ اتنی بڑی فہرست کیسے بنائی؟ انہوں نے جواب دیا۔
 "تمہارے آنے سے پہلے فیض اور میں اس سوسائے سے متعلق کئی باتیں کر چکے ہیں۔ میں تو ان سے ایک ہک دو سے واقف ہوں۔ لیکن فیض اکثر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ یہ فہرست انہیں نے کھوئی ہے۔"

مجھے محمود کی اس مستعدی سے بڑی خوشی ہوئی۔

یاد رہے کہ حیاتِ بگیا پوچھے ہیں، تم ہی کہتے ہو کہ فیض نے اور میں نے پہلے ہی سے طے کر لیا ہے۔ میرے لئے تو تم نے کچھ چھوڑا تو نہیں معلوم ہوا ہے کہ میرے اتنے دور آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں نے نہیں کہا۔

ابھی اس بات پر ہے کہ فیض کے ساتھ پنجاب میں پروگراموں کے واسطے ضرورتاً آکر ملنا کمزور کرنے کے بارے میں میں نے کئی بافتیل سے باتیں کیں تھیں اور ہم خود لاہور آتے۔ اتنی جلد کا ہمارے یہاں آنے کی توہین اسید بھی نہیں تھی؟

ان کے بعد چند دن فیض احمد فیض کی رہائی میں لاہور کے مختلف ادیبوں سے لکھے گھر جا کر ملنے میں گزارے لیکن انہوں نے یہ کہ اب ان کے لئے مجھے مرنے دوئے ماننا سامانِ طور پر یاد ہے۔ ایک صوفی غلام مصطفیٰ اسبم اور دوسرے اختر شیرانی مرحوم۔ فیض شاید صوفی صاحب کے خاکہ درود پکے تھے اس لئے وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے اور غالباً رشیدہ اور محمود بھی فیض کے توسل سے ان سے پہلے سے واقف تھے۔

اختر شیرانی کے یہاں بھی مجھے فیض لے گئے۔

اختر شیرانی کو دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہوا میں نے پریشان ہو کر فیض کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر ہمدردی اور سکون کی عجیب کیفیت تھی۔ زبان سے کچھ بے بغیر جیسے انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ ایک اختر شیرانی ہی نہیں، ہمارے زیادہ تر ادیب

میں سے رُئی و دون کا نفرت کرتے کیلئے ایک چٹا سا بال دینے، لیکن کوئی بھی راضی نہیں ہوا۔ آخر کو کم نے کسان کانفرنس والوں سے کہا وہ بڑی خوشی سے خلی وقت میں اپنا پنڈال دینے کیلئے راضی ہو گئے۔ راجہ جے۔ پنجاب کے کسان اپنے عوامی مصنفین کی صورتیں تو دیکھ لیں اور مصنفین کے لئے بھی کسانوں کے سامنے میں اپنی کاروائی کرنا مفید ہو گا۔ مجھے تعجب اس پر تھا کہ ایم لے۔ او کا لچ والوں نے بھی ہاں نہیں دیا۔ تاثر اس کے پر نہیں تھے۔ اور معین دہال پر بلب تھے۔ فیض نے کہا: "بس مجھے یہاں کے بعض خلیے ہماری انجمن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟"

اس کانفرنس کی رو داؤ مجھے یاد نہیں ممکن ہے معین کو یاد ہو۔ یا ان کے پاس کانفرنس کی تجاویز اور بحثوں کی رپورٹ محفوظ ہو۔

— ترقی پسندوں کے نفاذ معین سے ایک مناظرہ منعقد (دہلی) دہلی میونسپل کارپوریشن کے بڑے ہال میں جلسہ ہوا۔ اول پایا۔ سر مرزا علی مرحوم، اس کی صدارت کیلئے بلائے گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک پر عمل کرنے کے لئے دلی کے دو نامور اصحاب تھے۔ خواجہ محمد شفیع، نادولی اور افسانہ نگار اور شاعر — دوسرے مولوی سعید احمد تھے — مولوی صاحب مذوقا مصنفین (دہلی) کے ایک رکن تھے اداس ادارے کے ماہانہ علمی اور دینی رسالے "مہربان" کے ایڈیٹر تھے ترقی پسندوں کی طرف سے اس خطے کا کارڈ کرنے کے لئے فین احمد معین اور یں چنے گئے تھے — چلے کی کاروائی صدر سر رفعت علی کی تشریح پر ہی سے شروع ہوئی — اسے ابتداً خواجہ محمد شفیع صاحب نے تقریر کی۔ خواجہ صاحب کی تقریر نہیں تھی ترقی پسندوں پر چونکہ ایک سلسلہ تھا انہوں نے آزاد شاہی کے مذاق کا مذاق اڑایا۔ زبان کی غلطیاں بتائیں۔ ان کے تصورات کو حزب اخلاق اور سبت اور غیر شعائر ثابت کرتے کی کوشش کی۔ غرضی کا لازم بھی سمجھ رہا تھا۔ ہم ان اعتراضات کے سننے کے عادی سوچتے تھے گون کی ٹیٹھ زبان اور اتنے پیارے بچے ہی تھے اس کے پہلے گامیاں نہیں سنی تھیں۔ مجمع پر خاصا اثر ہوا۔ اور میراجی لاشو اور محمود جالندھری کی چند نظموں کے ٹکڑے جب پڑھے گئے۔ تو اس پر کافی تہقیر لگا۔

خواجہ صاحب نے بد نہیں بولے۔ وہ حضرت معلوم ہو کا مقابلے کو توجہ دے اٹھ کر سیدھے بیٹے میں آئے ہیں انہیں کپڑے بدھے بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اور مذمت گزرنے کی رو کی زیب تن تھی۔ ان کا بال ہی دلی والوں کو غیر ادبی معلوم ہوا تھا۔ مجھے سمجھتا ہوں کہ ارباب ہوتے گئے۔ فین سے یہاں نے کہا۔

"بکڑے تو بدل لے ہوتے۔" انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"سب ٹھیک ہے کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں۔"

فیض تقریر شروع کرتے ہی مسئلے کی تہ پر چلے گئے۔ اور خواجہ صاحب کے اعتراضات کا براہ راست جواب دینے کی انہوں نے زحمت نہیں کی۔ انھوں نے عالمانہ انداز میں اور بڑی متانت سے یہ بات کیا کہ ترقی پسندی ادب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سماج میں تبدیلی اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی اور ترقی ہوتی ہے۔ اسے روکنے کی کوشش کرنا فضیلت ہے ترقی پسند ادب کی تحریک ان کے پاس ہے۔ البتہ اسکو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ فین کی تقریر میں جوش اور طنز یا جملے کا انداز بالکل نہیں تھا۔ اس میں لادنی، متانت اور درس دینے کی سی کیفیت تھی۔ مجھے تو وہ اور خاموشی سے ان کی تقریر سنی۔ نہ تہقیر تھی اور نہ تالیل میں۔

— اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور کے رسالہ "ادب و تعلیم" نے ترقی پسند ادب کی خاص طور پر اقدار و ادب کی عام طور پر بہت اہم خدمت انجام دی ہے ۱۹۳۹ء اور سن ۱۹۴۰ء میں غالباً فیض امرتسر سے لاہور آئے تھے اور ایک کالج میں انگریزی کے لکچرر ہونے کے ساتھ ساتھ اسی رسالے کے بھی ایڈیٹر بن گئے۔ ان کے اداروں اور تنقیدی مضامین نے ترقی پسند نقطہ نظر کو واضح کیا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے اس دور کے واقعات کا حق بیان کروں یہ کام فیض یا کرشن چندر سے کہنے کا ہے

— ۱۹۳۹ء میں جب عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تھا اور اسکے ساتھ ساتھ ملک کی خوامی تحریکوں پر حملہ، تو سامراجی تباہ کاریاں اور جبر و تشدد کی اس فضا کو ہمارے دو شاعروں مخدوم اور نبین نے اپنی دو برسی تین اور پراختلافوں میں پیش کیا تھا مخدوم نے کہا تھا۔

راست کے ہاتھ ہیں ایکریہ دورہ عمری
یہ تیغے ہوئے گارے یہ دمنا ہوا چاند
جگر کے نور میں مانگے کے اجالے میں نکل
یہاں جوں عروس سی ہے یہی ان کا کفن ہے

لیکن اس نے آخر میں یہ بشارت دی تھی۔

رات کے معلق پہ آندہ ستاروں کا چمچ
صوت خورشید درخشاں سے نکلے تک ہے
اور فیض نے وطن کی آزادی کے عہدوں سے کہا تھا کہ جبر و تشدد کے اس دور کو صرف شجاعانہ عقائد سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے
بول کے لب آزاد ہیں قیرے
بول زبان اب اس کی تری ہے
فیض نے اپنی نظم "سیاسی لیڈر کے نام" میں ملک کے افریقاریوں کی سیاست پر کٹہہ چھنی کی جو اس عظیم کارزار کی صحیح نوعیت کو نمونہ سمجھتے تھے۔ فیض نے ان سے کہا۔

تجہ کو منظور نہیں غلامی حکومت لیکن
اور مشرق کی زمین دھڑکی ہوا
تجہ کو منظور ہے یہ بات ظہر جائیں
سات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

— اس دارد گیر کے زمانے میں بھی فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے آثار کے موضوع پر جواہر نیکلی ہوئی اس میں سے بھی بہترین ترقی پسند مضامین کی ہی نگارشی ہے اور اگر پابند کی مثال ہے تو انہیں کی بعض نظموں اور انہیں کے لکھے ہوئے چند افسانوں اور مضامین کو۔ فیض کی وہ نظم جو اس معرکے سے شروع ہوتی ہے۔

یہ داغ داغ اجالہ شبِ محزینہ سحر
کبھی بھلائی جا سکتی ہے؟ اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ جن جھانک کی چین و ناز میں مصوری کی گئی ہے وہ ہمارے گتے کے لئے
بعد سے شروع ہوئے پورے دوسرے ماہیت کا فنکارانہ تعبیر کرتے ہیں۔
(دروشنائی سے)

شاید احمد دہلوی

فیض حسا

کوئی تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ دلی میں بھاد نلہر ایک دفعہ آئے تو ڈاکٹر اختر حسین نے پوری کی معرفت مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہوئے۔ کتاب "انکسے" شائع ہو کر ضبط ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ ایک باؤلی منڈیا بھی جماد کے چور ہے پر پوئی ہی اس کے ایک ساتھی بھاد نلہر بھی تھے۔ اس لئے میں ان کے نام سے خوب واقف تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے گھر جاکے پر بلایا اور سیٹھ پھر سے ملوایا۔ بہت ہونہمندی کی۔ لندن میں کئی سال سے گھر واپس آئے تھے۔ نہایت تجملہ اور بردبار۔ ہنستے بھی تھے تو فحشہ دندان نما سے لگے نہیں بڑھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ترقی پسند مصنفین دلی میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اور اس شخص کے تمام مددیاں لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہ تہربانی مجھے اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں قرار دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس وقت ساقی کا سوج چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر ترقی پسندی اسی کا نام ہے کہ ادیب کو زندگی کا آخر کار بنایا جائے تو ٹھیک ہے۔ لیکن قائم ہو جانے کی۔ اور انجمن انصاف نامی اور فیض حق قریشی کی مدد سے قائم ہوگئی۔ دلی کے تقریباً سبھی بڑے ادیب اور دو اور ہندی کے۔ اس کے جسوس میں شریک ہونے لگے۔ اور بغاوت پر مبنی ہو گئے۔ جلسے باری باری مختلف گھروں میں ہوتے تھے۔ کبھی میرے ہاں، کبھی نانہری صاحب کے ہاں، کبھی خیری صاحب کے ہاں۔ اور کبھی خندکدار کے ہاں۔ ایک ایسا ہی جلسہ چاندنی چوک میں نیل کے ٹھہرے کے پہلو میں ڈاکٹر شوکت انصاف کے۔ خانے میں ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر انصاف کے بہت قریبی عزیز تھے۔ وراثتی کی طرح گھر سے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ حارند برسوں پیرس میں رہ کر لائے تھے۔ اس جلسے میں ایک طرف ایک ایسے صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے جن سے ہم میں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہماری انجمن کے دو ایک جلسوں کے بعد ہر جلسے میں دو ایک نئے آدمی آتے لگے تھے۔ پہلے تو ہم انھیں ادیب یا شاعر کہتے تھے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سی، آئی، ڈی والے ہوتے ہیں۔ اگلی دفعہ میں انھیں جلسے میں سے نکال دیا۔ اعلان سے نکلنے کے بعد سب انرجن صاحب سے شکایت کی۔ دو ایک ہی گروگ باران دیدہ ملے ہوئے۔ آپ کو دوس سے کتنی رقم ملتی ہے؟" میں نے کہا "کچھ بھی نہیں" بولے "تو تو آپ ان کیوں لائوں میں کیسے فیض لگے؟" میں نے کہا "روس یا کیونسٹوں سے اس انجمن کا کوئی تعلق نہیں ہے" بولے "آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کا ریلوڈ بالکل صاف ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس سے الگ ہو جائیں یا کوئی اور انجمن بنالیں۔ ورنہ آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے" میں نے گھر آکر سید ذہیر کو پوری روداد لکھی اور پوچھا کہ اگر کل کلان کو میں قید ہو گیا تو آپ میری کیا مدد کر سکیں گے؟ جواب آیا "ہم کسی قسم کی مدد نہیں کر سکیں گے" ان کے اس مجلس سے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے دلی کی انجمن فوٹو سٹوڈیو اور اس کی بجائے انجمن تہذیب ادب قائم

کر دی جس نے اپنی پیش رو انہیں سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اور اس کے جلسوں میں سی، آئی، ڈی کے لوگ بھی نہیں آتے تھے۔
 ہاں تو ڈاکٹر شوکت انصاری کے ہاں جلسے میں جو ایک جہتی شخص نظر آتا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے قریب جا کر پوچھا یہ کون ہے ؟
 ڈاکٹر صاحب کسی قدیر ان لوہر شرمندہ ہو کر بولے۔ ”آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ فیض احمد فیض ہیں۔ اسلامیہ کالج اتر سری پر دغیر میں۔ میں
 پیر بھی نہیں سمجھا اور اپنی لائبریری چھاننے کے لئے خاموش ہو رہا جیسے شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے صدارت کی۔ مضامین پڑھے گئے، ان پر گفتگو
 ہوئی۔ نگلیں پڑھی گئیں۔ واہ واہ ہوئی۔ آخر میں ضابطہ صدر نے فیض صاحب سے کلام سننے کی درخواست کی، انہوں نے اڑا راہ
 انکساری نہیں کر کے مگر جب انھوں نے اپنی ایک نظم سنائی تو ہم سب کے کان کھڑے ہوئے اور دیدے بچھے کر پر میں شاعر اب تک کہاں
 چھپا رہا؟ پھر تو چاروں طرف سے ایک اور، ایک اور، ایک اور کی آوازیں آئے گئیں، ہم سب ان کا کلام سن کر بہت خوش ہوئے اور وقت
 رخصت میں نے فیض صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کی تعریف کی۔

یہ فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد، بلکہ تین چار سال بعد علامہ مدین مشہور ادیب ایم۔ اسلم صاحب کے مکان پر ڈاکٹر انیراج موم کے ساتھ فیض صاحب سے
 دوسری ملاقات ہوئی۔ وہ کم گو آدمی ہیں۔ اور مجھے اپنی زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔ ابتداً سلام دعا اور مزاج پر سی سے آگے بات نہ چلی، ان
 کے چل جانے کے بعد اسلم صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر انیراج کی ہم صاحب کے ساتھ جوانی کی ایک سہیلی تھیں، ان سے فیض صاحب کی شادی ہو گئی
 ہے۔ ابتداً انیراج فیض اب تک ہم نہ ملے ہیں۔

جب دوسری عالمگیر جنگ نے زندگی کو توجہ کا یا پلٹ دیا تو ہمارے بعض ادیب جو فوجی حکومت کے سخت مخالف تھے فوجی
 دفتروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لئے ایک دم سے چولا بدل کر حکومت کے وفادار ہو گئے۔ سب سے پہلے محمد یلک فوجی وادی بنے
 نئی دلی میں دکھائی دیئے۔ مجھے تو جھٹکاساٹھ گروہاں آنکھ پڑیں تک نہیں تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر انیراج فوجی دفتروں کی ڈاکٹر سرین کمار نے
 انہیں دیکھ کر ادبی زیادہ انکسوس ہوا کیونکہ یہ تو کھنڈر کا گستا اور کھنڈر کا پاجا نہ بننا کرتے تھے۔ ان کے بعد فیض صاحب دکھائی دیئے
 کپتان کی وردی پہنے ہوئے۔ حدیہ کہ کچھ دنوں بعد چار عرصہ سست بھی وردی پہنے ایک فوجی اخبار کی ایڈیٹری کرتے گئے، ایک صاحب
 تھے عارف آن انڈیا ریڈیو میں اٹھنے لگے جی ریڈیو بھونڈ کر وردی پہن لی، ایک اور صاحب تھے بدر، وہ بھی وردی میں دکھائی دیئے گئے
 حدیہ کن۔ م۔ راسٹر کی ریڈیو چھوڑ کر وردی پوش ہو گئے۔ وردی میں سب سے پہلے حضرت موم اپنے لئے ڈول جم اور فٹ پیر آگے
 چلنے والی تو نئی دہ سے گئے تھے۔ یہ معاملہ ہوتا تھا کہ انھوں نے وردی کو انہیں بلکہ وردی نے انھیں پہن لیا ہے۔ اور سب سے زیادہ
 انکسوس فیض صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ نہ صرف آدمی کیوں اس پکڑ میں نہیں گیا؟ اس وقت روایت یہ مشہور تھی کہ تیرے فیض کو
 بھانپ ہے۔ تاکہ وہ فخر سے یکسر سکے کہ دیکھو میں نے خطہ عدلی نہیں لکھا موم سے یہ کچھ بعد بھی نہیں تھا کہ۔

مہر تو دو بولے میں صنم، تم کو بھی لے دو میں گے

کہہ کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے دو میں۔

جنگ کے نہ لگنے میں دلی میں اردو کی اچھی خاصی کھپ لگتی تھی۔ احمد شاہ بخاری دیپس) ریڈیو میں پہلے سے موجود تھے انہوں
 نے اپنے گروہ اردو کا خاص اثر حلقہ قائم کر لیا تھا۔ ن۔ م۔ راشد، شوکت تھانوی، انصار نامی، بھارت رحمانی، غلام عباس، محمود
 نظامی، بنیر احمد کنوی تو جنگ سے پہلے ہی ریڈیو میں آچکے تھے۔ جنگ کے زمانے میں چار عرصہ سست، ڈاکٹر انیراجین رائے پوری، منٹو،

میراجی، اوپنڈناٹھا اشکنا، راجنہنگہ بندی، حامد علی شاہ اور کرشن چندر بھی ریڈیو میں آگئے۔ فوجی دفاتر میں مجید ملک، تاجر فیض اور بدر آگئے تھے۔ سوئٹ پی بی سی میں حفیظ احمد نعیمی تھے اور پولیٹکنک میں حمید احمد خان، بطرس کے اشنائے پر ایک اور بچے درجے کا ادبی حلقہ بنی دینی بنایا گیا۔ اور اس کے جلسے بھی بطرس کی کوٹھی پر اور کبھی تاثیر کے بچے پر ہونے لگے۔ مجھے بھی خبر نہیں کہ یوں یاد فرمایا جاتا تھا، بطرس اگر واقعی دل سے کسی کی عزت کرتے تھے، تو وہ پروین سرزاد احمد سعید تھے جن سے انھوں نے ایک زمانے میں بڑھا تھا۔ ان کی لیے اندازہ علیحدت کے بطرس قابل تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ طحہ کے پہلے جلسے میں مرزا صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ محمود نظامی نے ”اردو شاعری میں عورت“ کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور کوئی بات ایسی نہ لگی کہ اس پر بطرس نے مرزا صاحب کو متوجہ کیا۔ مرزا صاحب دوچار لفظ بول کر خاموش ہو گئے۔ بطرس نے فیض صاحب کو اشارہ کیا اور خبر نہیں انھوں نے دائرہ یاد اندازہ آغاز کلام اس فقرے سے کیا کہ ”یہ تو مرزا صاحب آپ جانتے ہی ہیں کہ یونان کی تہذیب روم کی تہذیب سے قدیم تر ہے۔“ اتنا سنا تھا کہ مرزا صاحب کو جلال آگیا۔ چمک کر بولے: ”ہی ہاں، میں جانتا ہوں، اور اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔“ اور پھر جوان کے علم کے سمندر میں غوفان آئے۔ تو انھوں نے وہ کھنڈے میں قدم تھارے کو کھنڈال کر رکھ دیا۔ بھاری صاحب زریاب مسکرا مسکرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھتے رہے جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ بطرس نے چپکے سے تیز پچائے کسان لگوایا اور مرزا صاحب کا کچر تم ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ ”آئیے حضرات، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ فیض صاحب کی طرح ہم سب کو بھی مرزا صاحب کی تقریریں مزہ آگیا۔ اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ بطرس جو عزت مرزا صاحب کی کرتے ہیں واقعی مرزا صاحب اس کے سحق ہیں۔ اس ایک جلسے کے بعد مرزا صاحب کچر تم کی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ان جلسوں میں فیض صاحب کا کلام اکثر سننے میں آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ دئی کے ناؤں ہاں میں ایک بہت بڑا اشناء ہوا تھا۔ جن کی مصداقت بطرس نے کی تھی۔ اس میں فیض صاحب نے ”برقاب سے جیم“ والی نظم سنائی تھی۔ ایک صاحب جو میرے برسرین بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ ”برف سے جیم تو ہوتے تھے یہ برفاب سے جیم کیا ہوتے ہیں؟ میں نے کہا ”جورف جیسے نہیں بلکہ برف کے پانی جیسے ہوں۔ بولے ”لا حول ولا قوۃ۔ یہی کوئی بات ہوئی؟“ میں نے یس اور جلا لے کے کہہ دیا۔ بات تو ہوئی۔ جو برفاب میں ہے وہ برف میں کہاں، ستر سال پہلے غالب بھی تو کہہ گئے ہیں۔ ”خس خانہ و برفاب کہاں سے ملاؤں؟“ کوئی تو بات ہے جو انھوں نے برف نہیں باندھا۔ برفاب باندھ گئے۔ ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

جنگ کا ہی زمانہ تھا کہ کرشن چندر ایک شام کو کتب خانہ علم و ادب پر اردو بازار میں آگئے۔ یہاں مغرب اور عشاء کے درمیان آدمیوں اور شاعروں کا جگمگا رہا تھا۔ جامع مسجد میں جب عشاء کی آوازیں ہونے لگیں۔ تو ہم سب اپنے اپنے گھر جانے کیلئے اٹھ پڑے ہوئے۔ کرشن چندر مجھے باتوں میں لگا کر ایڈورڈ پارک لے گئے۔ اور بہت پس و پیش کے بعد بولے کہ ”میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے شائع کریں گے؟“ میں نے کہا ”ضرورت شائع کروں گا۔ بولے۔“ تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے اس کی قیمت ایک ہزار شیگی دیدیں؟“ میں نے کہا ”یو میکرب چاہئے؟“ بولے۔ ”جب آپ دے سکیں۔ میں کٹمہ ہاں ایک بیٹنے میں ناول لکھ لالوں گا۔“ اور دو تین میں جب ایک بیٹنے بعد وہ کٹمیر سے واپس آئے تو انھوں نے میرے گھر آکر شکست کا مسودہ میرے حوالے کر دیا۔ ڈھالی بیٹنے بعد یہ ناول شائع ہو گیا اور اس کی دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک دفعہ فیض نام سے اس پر تنقید لکھی، اٹنا اثر ہوا کہ ناول کی شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اب جسے دیکھتے وہ کہہ رہا ہے۔ کہ میں بھی ناول لکھوں گا۔ اشک نہا“ میں نے بھی ناول لکھنا شروع

قسم کے آدمی تھے اور میں۔ مگر کیونٹ ہونے کا لنک کاٹنا اگر ایک دفعہ کسی کے لگ جائے تو شاید پھر ساری عمر جھیلے نہیں چھوٹتا۔ غالباً اسی طرح بدنامی کی جسے فیض صاحب "پاکستان ٹائمز سے، احمد ندیم قاسمی" امروز سے اور سبط حسن "میل و نهار" سے پیچیدہ کر دیے گئے۔

جب راولپنڈی کا سپر لی کیس میں معین بڑے فوجی افسروں کے ساتھ فیض صاحب بھی گرفتار کر لئے گئے تو میری طرح بے شمار لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ شریف آدمی اس نرغے میں کیسے آگیا۔ یہ کوئی بہت اونچے درجے کی سیاست ہے۔ جسے معمولی عقل کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ ابداً ہم نے غلط

رموزِ مملکتِ خورشید خسرواں دانستہ

کہہ کر مہر کر لیا۔ غالباً تیس ساڑھے تین سال فیض صاحب قید و بند میں رہے۔ اس زمانہ میں ملک بگمے کے مردانہ و امرا بر حالات کا مٹا ہوا بلالہ دمت کی۔ اور اپنی جھیل کے معیار زندگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ ان کی تعلیم بھی جالی نہ تھی۔ افسانہ کے، جیسے خراج بھی چلتے رہے۔ میں نے یکم فیض کو خاندان کے دفتر میں پسینے میں مشرب و نہایت اہمک سے کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ان کے قریب جا کر اعلیٰ اس سوسلے کی داد دیتا۔ دور سے انھیں دیکھا اور بھاری دل اور بھاری قدموں کے ساتھ چلا آیا۔ بارے یہ اتلا کا دور بھی ختم ہو گیا اور فیض صاحب بری ہو کر اپنے گھر گئے۔ ان کے جیل میں رہنے کا ایک فائدہ فیض صاحب کو ہوا ہوا نہ ہوا ہو۔ ہمیں یہ ہوا کہ ان کی منتقلیات کے دو مجموعے "زنداد فامہ" اور "درست صبا" ہمیں مل گئے۔

بلے بعد لا لای کے زمانے میں فیض صاحب نے ایک فلم کے مکالمے دیکھے تھے۔ اور اس پر بین الاقوامی انعام ملا تھا۔ باغلم بائی اور فلم بائی سے کسی بھلے آدمی کو کیا سروکار؟ فیض صاحب دراصل تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ مگر کسی پونیورسٹی نے کوئی پیش کش نہیں کی۔ شاید اہل اختیار کے کٹنگ کے ٹکے سے ڈرتے تھے۔ بارے جب لاہور میں آرٹس کاؤنسل کی شاخ قائم ہوئی تو فیض صاحب اس کے سکریٹری مقرر ہو گئے۔ اس کے کچھ مصلحتاً اعلیٰ اینٹی پرائز دینے کا اعلان روس نے کیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب پاسٹرناک کو اس کی کتاب ڈاکٹر یوگو پر نوئل پرائز دے جانے کا اعلان ہوا تھا۔ اور حکومت روس نے اس بوڑھے مصنف کی ادراک سے بدتر کردی تھی۔ اب اسی کمیونزم کے منہج سے فیض صاحب کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا! سب نے دم سادھ لیا کہ اللہ خیر کرے۔ دیکھئے اب کیا عمل کھلتا ہے؟ مگر حکومت پاکستان نے اس پیر علی، موز پر روس کی طرح تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شکر ہے کہ ہمارے اندیشہ منطاً ثابت ہوئے۔ جب فیض صاحب انعام لینے کے لئے روس جانے لئے تو کراچی پہنچتے ہوئے گئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے آرٹس کوئٹل میں ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا اس جلسے کی صلاحت کا فریض صاحب ہوا۔ منجملہ اور باتوں کے میں نے اپنی مدداری تقریر میں اپنی حکومت سے شکوہ کیا کہ فیض صاحب کو اپنی حکومت سے اب تک کوئی انعام یا اعزاز نہیں ملا۔ اور سات سمندر پار کے ایک بہت بڑے ملک نے انھیں ان کے اتنے بڑے انعام کا مستحق سمجھا۔ شاید ہمارے ملک میں زندہ ایجن کی قدر دانی کا دستور نہیں ہے جی تو پاکستان کا سب سے ہر روز شاعر و موزم اتھا ہے۔

جب فیض صاحب دوسرے عداوت ہو گئے تو یہاں افواہ اڑنی شروع ہوئی کہ وہ اپنے آئے ہی وہ گرفتار ہو جائیں گے۔ بلالیا کوئی جامعانہ اقدام نہیں کیا گیا۔ اور فیض صاحب شاد و باخود واپس آ گئے۔

روس سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد اس کا فیض صاحب لندن چلے گئے ہیں۔ اور پاکستانی کچھ پروموجہ کر کے کتاب لکھیں گے۔ غا سے

ڈاکٹر ملک ارج آئند تجسس سبب صفا کا طبعیت

فیض - ایک سپاری عظیم شخصیت

بھگی ہوئی کشادہ پیشانی، نرم آنکھیں۔ ہونٹوں پر گریزاں تبسم اور اس کا سراپا کر کے خواب آلود فضا میں ڈوبا ہوا جس پر نیم دا پردہ سے چھن کر صبح صادق کی دھندلی روشنی پڑ رہی تھی۔
یوں میں نے فیض کو پہلی بار دیکھا۔

رات کی گھاڑی سے میں الرآبت استریٹ پہنچا تھا۔ اور اسٹیٹ سے سیدھا ڈاکٹر تاثیر کے مکان گیا۔ جہاں فیض بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر اور ان کی بیگم بھی موصوفات کے آس لئے ان کا نوکر مجھے اس کمرہ میں لے گیا تھا جس میں کنوارا شاعر بطور رہبان قسماں پڑ رہا تھا۔ جوں کہ میں نے تمام رات ایک کیمبل میں گزار دی تھی اس لئے میں سردی میں ٹھہر سا گیا تھا۔ جب میں نے فیض سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ فوراً اپنے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہا کہ میں ان کے بستر میں سوہوں۔ یہ کہہ کر وہ میرے لئے چلنے کا انتظام کرتے چلے گئے۔ میں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن ہندوستان کے ایک عظیم شاعر سے ملاقات کی مسرت میرے لئے کچھ اتنی بیان انگیز بھی کہ میں کوشش کے باوجود سو نہ سکا۔

حبیب چائے آئی اور فیض نے صبح کا پیلا سگریٹ جلا تو ہم دونوں ایک دلچسپ بحث میں پوری طرح الجھ بیٹھے تھے۔ میرا استدلال تھا جلد یا بدیر ہندوستانی زبانوں کی شاعری اپنے رواجی بندھن توڑ کر آزاد ہو جائے گی تاکہ صحیح جذبات کی ادائیگی اور ترجمانی اس ہو سکے۔ فیض کو میری رائے سے اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ روایت سے انحراف نامناسب ہے۔ ممکن۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس سلسلہ میں ان کی تو جھڑپیں شاعر آر تھوڑی سی جانب مبذول کرانی تھی جو ویسے ملک کا شاعر تھا۔ جہاں روایت پسندی اور فی فذروں کا رجحان بے حد قوی ہے لیکن اس کی آزاد شاعری اس ملک کی شاعری میں انقلاب لے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نو کوئی ایسی المیہ کی مشہور نظم "الفریڈ روڈرک کا نغمہ محبت" کا پیلا بندھی پڑھ کر سنا یا تھا۔

تو آؤ ہسم دونوں چیلیں

اُن رنم مسلمان قیدیوں میں
جو جانی پہنی جانی تھیں

جن میں بڑے دھڑے لیسٹو۔ ان میں اور موٹے ٹکڑوں کی دوکانیں۔ اس کردار جس میں عورتیں آتی جاتی ہیں اور سائیکل انیسٹو کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔

جواباً فیض نے میرے لیے تحفہ شریعت سے سوئے مہربانے، ناول نمود کیجا اور صرف ایک سونڈ کا ۔ ابوہمید بن
یہ حقیقت ہے کہ فیض کا غرض بالکل کیا اور درست تھا ۔ میں تقریباً دس گیارہ سال اس سے جاوطن تھا، اس دوران
میں لندن، پیرس، آئینجر، ریمان اور برلن میں گھومنا رہا تھا۔ اس آدابہ و گردی کے بازو خود میں نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا تھا، لیکن غریب
مشاوشی و خوف زدہ ہونے کے باوجود میں سے میرے وہاں کا کچھ ۔ میرے دل میں دینا کا کچھ رہا ۔ لیکن آئینجر اور اس کی غیر متکثر ہیں
میری دینی پر مقرر تھی ۔ اس وقت کے وقت جو میرے سونڈ کے لیے لڑاؤ کی تیار تھی سے میرے یہاں اس کی رحمت میں جو تھا، جب میں
خود گھنٹا یعنی اس وقت میری عمر تھی ۱۷ سالہ تھا ۔ میں یہاں آئینجر میں تھا ۔ لیکن اس وقت میں نے دیکھا تھا ۔ میرے وہاں میرے
آئینجر رحمت میں ہی تھی ۔ لیکن میں نے یہ دیکھا تھا ۔

[illegible]

ہمدردی، محبت، ہمدردی، انسانیت کے اس پردہ کے باوجود ہمیں نے خود اپنی ذمہ داری سمجھا سنے کے لئے خطرہ اُتر دیا تھا۔
میں نے موسیٰ کا کہ فیضِ ربانی شاعری سے دلہا زنگا دُر کھٹا ہے۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد شمس الدین جہاں بہ درویش نے پورا موسم کو سامنے
گزارا مجھے ان احساسات و جذبات کا اندازہ بہرے لگا۔ جن پر فیض کی شاعری کا اساس ہے۔

میں ان تمام مشاعروں میں موجود تھا جہاں فیض نے اپنی عزلیں پڑھیں اور مجھے احساس ہوا تھا کہ اپنی محبت کے انبار میں فیض کا شعور بہت بگڑے تھا۔ اس کے الفاظ کہیں زیادہ پرخوس مسوس ہوئے ان گھٹے الفاظ اور نپٹوں کے مقابلے میں جو ارد گرد کی دنیا کی شاعری میں ایک سنگ ستارہ دینے والے ہیں۔ جبریت کی رہنمائی میں، سرائی اور غلوں کی، کہ اپنی کھلم کھلی، جو

کہم حیرت و استعجاب کے عالم میں پکارا کھڑے ہیں: واقعی؟ میرا بھی یہی خیال ہے؟ 'یا' میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا: 'اھ اس قسم کی تباہی کھپائی اور اس کے خطوط کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ پہلی زندگیوں اور اس کے بدلے ہوئے رجحانات کے اس قدر مطالقت رکھتے ہیں۔

اس سے لپڑے میں ملک تقیم ہو گیا اور ہندوستان پاکستان آزاد ہو گئے۔ آزادی کے فوراً بعد انسانیت سوز اور شرمناک فسادات کی آگ بجھائی گئی جن سے فیض کی روح بھی لرز کر رہ گئی اور اس نے ہمیں ایسے لمحے شائے جن میں زخم خوردہ انسانیت کا ماتم تھا۔ کیوں کہ انسانی اقدار اور عالمگیر اخوت پر فیض کے خیالات کسی دھکے چھپے نہیں گئے۔ انسانیت کی تحسیر، تذبذب پر وہ بھی نگین و آیدر لکھا۔ اس کی مشاعری اب اس شعلہ کے اندر کچی جو غم و الم کی ٹھنڈی راکھ سے ابھرتا ہے اور خود جلا ہوا بڑھنے والے کے دل میں ان کے جذبات کا خیال کے بغیر درآتا ہے۔ مشترک درد و الم کا احساس دو بھائیوں کو بھی متحد کر دیتا ہے چنانچہ ڈاکٹر اگرچہ گھر کے دو حصوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن اگر کوئی اپنا مقدر خود پسند کرنے کی جرأت کرے اور غم و الم کو جو انفرادی سے سہا بھی کئے لوہین و بن کا بغیر منقسم تہ مزور کامیاب رہے گا۔ اور اس طرح ایک دل دوسرے کا آئینہ بن جائے گا۔

(۵)

پچھلے دس سال میں فیض سے میری ملاقات صرف بین الاقوامی اجتماعات میں اشاک پرم، ممبئی، مسکو اور برلن میں ہوئی ہے۔ ایسے اجتماعوں میں ذاتی دوستی کا تعلق برقرار رکھنا قدر سے دشوار ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر صاحب ہم ملے تو ہم نے ان بڑی کاغذوں کو بے تکلف دوستی کی اس فضا میں تبدیل کر دیا جو ہماری پہلی ملاقات میں اس مجموعے سے کمرے میں قائم ہوئی تھی۔ اور اس طرح ہم نے ایک دوسرے کو صرف الفاظ سے مجبوراً ان الفاظ سے جو ہماری بربادی کی تلخ یادوں کے ساتھ ساتھ اب بھی کبھی کبھی ہمارے لب پر آتے ہیں اور جو اس آگاہی کے ساتھ آتے ہیں کہ یہ دنیا بڑی بے وفا ہے لیکن ہمارے حضرات و احساسات نے گریز اں اور تغیر پسند ہیں کہ انھیں حرف آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جام ہمیشہ ہمارے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو ہمیں اپنے دور کی تکلیف دہ اور گڑھی ہوئی فضا سے اوپر اٹھا کر مستقبل کے پرامن اور وحنو گئے میں لے جاتے ہیں اور ہم امید کر لیتے ہیں کہ ہم پھر ملیں گے اور ستاروں کو چھو لیں گے۔

فیض صاحب

دسمبر ۱۹۷۷ء سے آگے

لوہین وحنو ملک وہ لندن میں رہے۔ اور یہاں واپس آکر بھی فیض خاصی مدت ہو گئی مگر وہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ شاید ان کی شانوار سہیل انگلی مانیع ہے۔

سال ڈیڑھ سال پہلے سنا تھا کہ فیض صاحب گرینی یونیورسٹی میں انٹرنری کے مسند شعبہ بنائے جاسے ہیں۔ اس خبر سے خوشی ہوئی تھی۔ کہ یہاں ان کے لئے موزوں بھی تھی۔ اور خود بھی یونیورسٹی کے لئے بھی لائق فخر، مگر پروفیسر احمد علی کی طرح فیض صاحب کو بھی ادب الیٹ و کشاد لئے مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جو بہر قابل ہوتے ہیں انھیں قسداں مل ہی جاتے ہیں۔ اب وہ ایک بہت بڑے مشاہیر پر ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔ بہر حال ان کی طرف رجوع ہوئی ہے۔ فیض صاحب اقلیتی سلسلے کے آدمی تھے۔ پھر تعلیمی سلسلے ہی میں آئے۔ جی بقی دار رسید،

ڈاکٹر عبادت بریلوی

چند یادیں چند ناشران

یادش بخیر لکھنؤ یونیورسٹی میں کسی زمانے میں خوب چمکتی۔ ادب کے چرچے اور سیاست کے ہنگامے شاید ہی کسی یونیورسٹی نے اس طرح دیکھے ہوں جیسے کہ لکھنؤ یونیورسٹی نے دیکھے ہیں۔ میں جس زمانے میں وہاں پڑھتا تھا وہاں مذہب و ادب کے یہ چرچے اور سیاست کے یہ ہنگامے اپنے منجاب پہنچتے بڑی جان دار اور صحت مند فضا تھی۔ گوشے گوشے سے زندگی کے طوفان امڈتے تھے۔ دونوں میں ہی انگلیں اٹھائیں اچھی تھیں اور سنے جنوں کے لئے دہرائوں کی توش کا خیال ہر طرف برسات کے بادلوں بلکہ ساروں کے گھٹاؤں کے طرح چھایا ہوا نظر آتا تھا۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ کہ اس زمانے میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں اور اپنے عنوان شباب کی منزل میں لے کر لای تھیں۔ ہر طرف جدید ادب کا چرچا تھا۔ ادبی محفلوں اور مقامی اخباروں میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی میں جدید ادب کے کئی علمبردار موجود تھے، ڈاکٹر عظیم، احمد علی، سید احتشام حسین، علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی وغیرہ کی موجودگی سے وہاں جدید ادب کا اچھا خاصا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ نئے رسالے آتے تھے اور ان میں نئے لکھے والوں کی جو تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان کو عرصہ شوق و اشتیاق سے پڑھا جاتا تھا بلکہ ان کی جانچ اور پرکھی جاتی تھی۔ ایک ایک نظم پر ادب کا ایک ایک کمانی پر ہنٹوں اور مہینوں کیڑوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

جدید شاعروں میں فیض اراشد اور میراجی اس زمانے میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی نظمیں اس زمانے کے رسالوں میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں اور جدید شاعری کے پرستار انہیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور بلاشبہ ان نظموں میں انہیں ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا تھا۔

مجھے فیض کی شاعری سے انی زمانے میں آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں ان کی کچھ علیحدگی کی رومانی نظمیں لاہور کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں۔ بعض ترقی پسند دوستوں پر ان نظموں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ بلکہ ان میں انقباض کی گھن گرج کے فقدان سے وہ کچھ بالوں سے ہوئے اور انہوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ان نظموں میں جدت ضرور ہے لیکن ان میں زار کا احساس ہوتا ہے اس لئے ان کو اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن مجھ پر ان نظموں کا گہرا اثر ہوا۔ میں نے انہیں دیکھی سے پڑھا۔ تبتنا

جھپکا رہا ہے خسارِ کیفِ آئیں اکوز، خواب، تیرا روئے حسین

نہ نجوم کہیں پابندی کے دامن ہیں، نجومِ مشرق سے ایک دل سے بقیہ الہی

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں سنا

راہِ ہر ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

راہِ ہر ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ذرا صبح کی رات بھر نے نگاروں کا غبار

راکھڑا نے نگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سوئی راستہ تک ملک کے ہر ایک راہِ گزرا

ان مشغلوں میں مغفورانِ شباب کے مخصوص جذبات کا جوارِ نشاط ہے وہ آج بھی اسی طرح اتر کر رہا ہے۔ جیسے آج سے برسوں پہلے کیا کرتا تھا آج بھی ان کو پڑھ اور زندگی کر رہیں محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے وہ تصویرِ مسخوڑ کر دینے والی پابندی چٹکی ہوئی ہے اور زندگی نے اس پابندی میں اپنے آپ کو کچھ مسطرعِ غری کر دیا ہے کہ دور دور تک اس کو کچھ اور نظری نہیں آتا۔ زندگی کے یہ لمحے بھی کتنے حسین ہوتے ہیں، اس میں شہر بھی کہ یہ ہمیشہ جاتی نہیں رہتے۔ وقت کا دھارا انہیں بہا کر دے جانے کہاں سے جاتا ہے۔ لیکن یادوں کا وہ اختیار رکھتے وہ پھر بھی زندگی کے ساتھ رہتے ہیں اور کسی حال میں بھی اسلاف کا بیچا نہیں چھوڑتے۔

ابھی نقشِ فریادی کو مشائخ ہوئے کوئی سال بھرتی ہوا تھا کہ فیضِ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے لکھنؤ آئے اور اس طرح انہیں دیکھے اور بھران۔ سے ملنے کا مجھے موقع ملا۔

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ یہ مشاعرہ کئی لوگوں نے کیا تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ اس میں پرانے شعراء کے علاوہ نئے اور بدلتا پسند شاعر دل کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور یہ خبر سن کر کہ فیض بھی اس میں شریک ہو رہے ہیں میں بھی اسی میں گیا تھا۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد رام پوریا ہاں میں مشاعرے کی یہ تحفہ ترتیب دی گئی تھی بھابی جاٹوں کے دن تھے۔ بڑی ہی خوشگوار غنچ کی رات کو آٹھ بجے کے قریب مشاعرہ شروع ہوا۔ مولانا حسرت مہدانی، حضرت جگر مرآ آبادی، جاوید، جان نثار اختر، جزیل اور فیض اس مجلس میں موجود تھے مشاعرہ شروع ہوا مختلف شعراء اپنا کلام سناتے رہے۔ جب صدر نے فیض سے کلام سننے کی درخواست کی تو ایک صاحب سیاہ شہر والی ادب سفید پا جائے میں لمبوس ایک طرف سے اندر اسٹیج پر آئے اور اٹھ کھڑے۔ رات کی احاطہ سے اپنا کلام پڑھا شروع کیا اس زمانے میں ترخم سے پڑھنے کا بڑا زور تھا۔ جگر صاحب اپنے دلاور ترخم سے مشاعروں کی فضا میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تو ان کے علاوہ اس وقت کے نظم گو شعرا میں ترخم سے پڑھتے تھے۔ حفیظ، ساغور، روشن، احسان دانش سب نے اپنے ترخم سے مشاعروں کی فضا کو رنگین اور پرکار بنا رکھا تھا۔ لیکن بعض نوجوان شعراء، تحت اللفظ بھی پڑھتے تھے لیکن نے بھی اس مشاعرے میں اپنا کلام تحت اللفظ پڑھا۔ لیکن سامعین ان کے معنی خیز کلام اور پڑھنے کے مخصوص، معمولانہ انداز سے

ہے حد متاثر ہوئے۔ ایسی داد ملی کہ سماں بندھ گیا، فیض کا کلام تو اس زمانے میں خاصا مشہور تھا۔ آج ان کی زبان سے ان کے کلام کو سن کر یوں بہت غصہ ہوتا ہے۔ مجھے بھی ایمان کی بات ہے کہ ان کے کلام اور پڑھنے کے انداز دونوں نے بہت لطف دیا۔

مشاعرے کے بعد وہ چند روز لکھنؤ میں اور پھر سے اور ان درونوں میں مجھے ان کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا ملاقات تو اس کو نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ میں بغیر کسی تعارف کے خود کسی سے ملنے میں بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ بڑی شکل سے کھلتے ہوں اس وقت بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت فیض نے کہاں اور کس کے مکان پر ملاقاتیں جوتیں بہر حال اتنا یاد ہے کہ ہم چند طالب علم اپنے چند شاعرہ قسم کے احباب کے ساتھ فیض سے ملنے کے لئے گئے تھے اور ان سے کئی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ یہی یاد ہے کہ فیض بولے بہت کچھ۔ میرے نوجوان ساتھیوں میں بعض بڑے تیز اور چاب زبان لوگ تھے۔ انہوں نے فیض سے ہر پہلو سے بات کرنے کی کوشش کی، خدا جانتے کتنے سوال پوچھ ڈالے لیکن جواب ہوں، ہاں، اے سوا کچھ ہی نہ ملا۔ خاص و دیگر باتیں کرنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ فیض کا وطن سیالکوٹ ہے لاہور میں تعلیم حاصل کی ہے شاعری چھپنے سے کہ رہے ہیں، لیکن گورنمنٹ کالج لاہور کی فضا میں ان کی شاعری کو پہلے پھرنے کا موقع ملا ہے آج کل اہل علم اور کچھ امرتسر میں انگریزی زبان اور ادب پڑھاتے ہیں، شعر کہنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرتے جب کوئی جذباتی تجربہ شعر کے ڈبچے میں ڈھلنا چاہتا ہے تو اس کو ڈھال دیتے ہیں۔ نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی شرمیکہ سے متاثر نہیں لیکن روایت سے کسی حال میں بے رشتہ نہیں کر دیتا پاتے۔ لیکن یہ تمام باتیں فیض نے خود نہیں کہیں۔ ہم تہہ سے بعض لوگوں نے مختلف سوال کر کے یہ معلومات فراہم کیں۔ لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوال طویل تھے لیکن فیض نے جو جواب دیئے ان میں حد درجہ اختصار تھا۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ یاد دہانی کر نہیں سکتے یا زبان نہیں چاہتے۔

میں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ فیض بنیاد میں شریعت آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ باتیں نہیں کرتے، شاید کبھی نہیں سکتے۔ طولانی سوالوں کا جواب بھی ہوں، ہاں سے دیتے ہیں۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں گفتگو تو انہیں ذرا بھی پسند نہیں تھی۔ تو وہ دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ برعکس ان کے ان کے مزاج میں مجھے عجوبہ وانگہار کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آئے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی طبیعت میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً انہیں اپنی شاعری کے بارے میں غلط فہمیاں نہیں ہیں۔ وہ براہیں سمجھتے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے زندگی اور ادب میں کوئی انقلاب برپا کر دیا ہے وہ تو بس اس لئے شعر کہتے اور شاعری کرتے ہیں کہ ان کو جی چاہتا ہے اور کوئی ماحول صوفی خلق نہیں دیا کرے کہ بے محبور کر رہی ہے۔

فیض سے اگر یہ سیری یہ ملاقات متفرق لیکن اس ملاقات نے مجھے بہت لطف دیا۔ کیونکہ آج مجھے ایک ایسے شاعر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع ملا۔ جس کی شاعری کو ہم نے مڑے لے کر پڑھا تھا۔ اس وقت میں سمجھتا تھا کہ ان کی جذبات و احساسات کے فیض و فراز اور سماجی زندگی کے تدویر کی ایک واضح تصویر نظر آتی تھی۔

دوسرے ہی دن فیض امرتسر واپس چلے گئے۔

اس وقت دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ ہندوستان میں ایک ہلچل مچ رہی تھی۔ برطانوی حکمرانیت یہ کہتی تھی کہ یہ جنگ امن اور انسانیت کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے لیڈروں کو اس سے اشتعال تھا۔ بڑے بڑے رہنما حیل میں تھے۔ ان کا زمانے میں اشتراکیوں اور ترقی پسندوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ جنگ واقعی امن اور انسانیت کی جنگ ہے۔ چنانچہ بہت سے اشتراکی اور

ترقی پسند ادیب تو را کر دیے گئے۔ لیکن دوسرے سماجی لیڈر جیلوں میں رہے۔ حبیب المہسن اور کشمکش کا زمانہ تھا۔

سے زیادہ اپنی جنگ آزادی سے دمچی تھی۔ لوگوں کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ اس جنگ کو جیتنے کے لئے برطانوی حکومت نہ صرف ہندوستان کی دولت بانی کی طرح بجائی جا رہی ہے۔ بلکہ ان کے سپوت بھی صرف ہندو سکوں کے غرض جنگ کے مختلف میدانوں کو اپنے خون سے سیراب کر رہے ہیں۔ اس احساس نے نوجوانوں کے دلوں میں برطانیہ کے ظوف نفرت کی ایک آگ سی بھڑکا دی تھی اسی زمانے میں یہ فہرستی کو فیض نے کاغذ کی ملازمت چھوڑ کر فوجی ملازمت کر لی ہے اب وہ تقیظ کرنل فیض احمد فیض ہو گئے ہیں اور دلی میں ان کا تقرر حکمران تعلقات عامہ کے اس محکمہ میں ہو رہا ہے جس کو برطانوی حکومت نے جنگ کی پلیٹی اور چمکینہ کے لئے قائم کیا ہے۔

یہ میری کرافرس جی ہوا کسی حد تک غصہ آتا ہے اس خیال سے کہ فیض کے ایسے حساس اور لطیف مزاج رخصتے والے شاعر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مہینوں اس پر نگہبندی اور اہل حقوں میں بحثیں ہوتی رہیں۔ ترقی پسندوں نے اس کو سراہا۔ اس لئے کہ اس جنگ میں روس بھی شامل تھا۔ اور ان کے لئے یہ جنگ اتنا انسانیت کی جنگ ہو گئی تھی۔ لیکن میں اس خیال سے مطابقت پیدا کرنا اور فیض کی یہ فوجی ملازمت مجھے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن پھر ان خیالات سے اپنے آپ کو بھانسنی کو عشق کی کہ انسان غیر رہتا ہے۔ جنگ نے حالات خراب کر دیے ہیں معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ گرائی بڑھ گئی ہے، جینا دو بھر ہو گیا ہے۔ زلیت و شرم اور یہ بریور سٹی اور کاغذ کی ملازمت میں کیا ملتا ہے۔ حالات نے فیض کو مجبور کر دیا ہو گا۔

اسی زمانے میں جاننے والے کو کہ ایک مشاعرے میں اپنی وہ نظم پڑھی جس کا مضمون تھا۔

گر غل نہیں ہوں، خان بہادریں ہیں میں

اور جس کی وجہ سے عرصہ تک ریڈیں انکا داخلہ بند رہا۔ دراصل اس میں فیض کی اس ملازمت ہی کی طرف اشارہ تھا اور مجاز کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف کسی نام مشاعرے میں بلکہ ریڈیو کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھی۔ اور اس پر خاص عرصہ تک ہنگامہ ہوتا رہا۔

فیض کئی سال دلی میں رہے۔ اسی زمانے میں انگریزی اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے انٹیکو عربک کالج دلی میں ہو گیا۔ دلی کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اس زمانے میں لاہور کے بھی بہت سے ادیب اور شاعر دلی میں قیام پزیر تھے۔ بخاری صاحب دیپنسا ناخیر، حامد علیاں، حمید احمد خان، حفیظ، فیصلہ راشد، میراجی، ممتاز صدیقی، اعجاز ڈیلو، ضیاء جہاندھری، اتفاق سے یہ سب لوگ اسی وقت پرسنل ملازمت دلی میں جیتے تھے۔ اور ان کی وجہ سے جدیداوب کا نام ماحر چا تھا۔ اس زمانے میں نوجوان ادیب حلقہ اور باب ذوق کے جلسوں میں ہوا تو ان کو مل بیٹھے تھے۔ شروع شروع میں یہ جلسے میں میزبان مرحوم کی زائنش پر انٹیکو عربک کالج بالکے سٹج بہتر تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد کالج کے ارباب اختیار کو اس پر کچھ اعتراض ہوا تو یہ جلسے کالج ہی میں میری میزبان قیام پر ہونے لگے۔ ماخذ اور تاثیر تو ان جلسوں میں ہوتے تھے لیکن فیض ان جلسوں میں بھی شریک نہ ہوئے۔ غالباً اس کی وجہ ان کی سرکاری مصروفیت تھی لیکن اس زمانے میں بخاری صاحب اور تاثیر صاحب نے ایک حلقہ احباب قائم کر رکھا تھا جو کچھ بھی لکھی بخاری صاحب یا ناخیر صاحب کے مکان پر اپنی تکنیک وغیرہ میں ہوتے تھے۔ تاثیر صاحب نے کئی ان جلسوں میں شرکت کی۔ یہاں کبھی کبھی فیض بھی آتے تھے اور دلی

میں انہیں مجلسوں میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن ان مجلسوں میں بچوں نے یہ دیکھا کہ فیض بولتے بہت کم ہیں۔ سخیاری صاحبہ اور تاثیر صاحبہ تربانہ و بہار سہم کے موجب تھے۔ اور اپنی باتوں سے گل و گلزار کھلاتے تھے۔ لیکن فیض نے ان مجلسوں میں بھی کبھی دو ایک جملوں سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ ان کی اس کم سخن گوئی نے مجھے ان سے دور رکھا اور میں کبھی اس زمانے میں ان سے کھل کر باتیں نہ کر سکا۔ تاثیر صاحبہ سے مجھے خاصی بے تکلفی تھی اور وہ گفتگوں میں مجھ سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے دفتر میں اولاد سکرٹریٹ بھی چلا جاتا تھا۔ اور وہ سرکاری کام کو چھوڑ کر مجھ کو اپنی باتیں شروع کر دیتے تھے۔ لیکن فیض کے ساتھ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کی کم سخن گوئی ہمیشہ ہمارے درمیان حائل رہی۔ میرے مزاج کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ذرا مشکل سے کھلتا ہوں۔ چنانچہ اسی مزاج نے مجھے اس زمانے میں فیض کے ساتھ بے تکلف نہیں ہونے دیا۔ ان سے ملنے اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے کی آرزو دیرپہ دلیں رہی مگر اس آرزو کی تکمیل سے ہمکنار ہونے کا موقع نہ ملا۔

چند سال اسی طرح گزرے۔ اس زمانے میں پاکستان کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور قیام پاکستان سے بہت پہلے لوگوں کی بات کا احساس ہو چکا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے قیام میں راہ کار و راہ نہیں بن سکتی۔ چنانچہ بصیرت رکھنے والے لوگوں نے اسی زمانے میں پاکستان کے لئے مختلف قسم کی تیاریاں شروع کر دی تھیں ان میں پاکستان کے لئے نئے اخباروں کو جاری کرنے کا خیال بھی تھا۔ انصار الدین مرحوم نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اقدام کیا اور لاہور سے پاکستان ٹائمز اداوارہ نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ چند سال میں اس منصوبے کی عملی شکل اختیار کی اور لاہور سے یہ دونوں اخبار نہایت آب و تاب سے نکلے۔ فیض پہلے پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر اور پھر ان ادارے سے شائع ہونے والے تمام اخباروں کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوجی ملازمت چھوڑ دی۔ حکاقت کی دنیا میں قدم رکھا اور اس میدان میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ان کی ادارت کے زمانے میں ان اخباروں کو معیارِ امتداد بلند ہوا کہ یہ اخبار اس وقت کے جرنلسٹک اخباروں میں شمار ہوتے تھے۔ تاہم یہ کہ اس میں فیض کی صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

فیض پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے جب قیام پاکستان کے بعد لاہور پہنچا۔ صحافت کی زندگی بڑی مصروف زندگی ہوتی ہے۔ یہ بھی شروع شروع لاہور میں برقی طرح مصروف رہا۔ اس لئے فیض سے مراد: چند مختصر ملاقاتیں ہوئیں کبھی کسی جلسے میں مل گئے کبھی کبھی مکانے یا جگہ پر سہ ہمسری سی ملاقاتیں ہو گئی۔ کبھی اطمینان سے بیٹھ کر تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس زمانے میں جب میں پنجاب یونیورسٹی کی کچن اڈو کا صدر مقرر ہوا تو فیض سے مفصل ملاقاتوں کے کئی مواقع ملے۔ اداران ملاقاتوں سے زندگی کے متعلق ان کے خیالات اور ادب کے بلے میں ان کے نظریات کا اندازہ ہوا۔

انہیں کے فیراہ تمام میں نے کچھ ایسے جلسے ترتیب دیے جن میں مشہور شعرا اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے تھے اس سلسلے میں میں نے فیض کو بھی دعوت دی اور انھوں نے اس دعوت کو اپنی مصروفیت کے باوجود بخوشی قبول کیا۔ جلسے میں ملنے۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں تعریف کی اور تاریخی ترتیب سے اپنی نظمیں سنائیں۔ جلسے آخر میں... استادوں، طالب علموں اور ادیبوں نے بعض سوالات بھی کئے اور فیض نے ان کے جواب دیے۔

فیض نے اس جلسے میں بتایا کہ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت، جنوری ۱۹۱۷ء ہے ان کا سپین سالگرہ ای میں گزارا۔ ابتدائی تعلیم (سکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں ہوئی۔ شمس العلماء مولوی میر حسن اور مولوی میر ابراہیم سیالکوٹی ان کے اساتذہ۔ ان بزرگوں کا شمار اپنے زمانے کے بڑے فاضلوں میں ہوتا تھا۔ ان کی شخصیتوں نے ان پر گہرے اثرات چھوڑے ان کی

شاعری کا آغاز اسکول ہی کے زمانے سے ہوا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھیں۔ انعامات ملے اس زمانے ہی اسکول سے باہر گیا لکڑیاں
فشر و شاعری کے چرچے تھے۔ چنانچہ ان مشاعروں میں بھی شرکت کی، اور اپنے اشعار پڑھ کر داد حاصل کرتے رہے۔ پیرس پاس کر کے
وہ تعلیم کی غرض سے لاہور آئے۔ محکمہ تعلیم کاٹھ میں داخلہ دیا۔ یہاں وہ بخاری صاحب، شیخ صاحبانہ مولوی تبسم صاحب کے زیر
اخوانی اور اس زمانے میں انہوں نے پاکادہ شاعری شروع کی۔ اسی زمانے میں انہیں نے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریکوں سے
مجھ سے پیدا ہوئی اور ان تحریکوں کے زیر اثر ان کی شاعری روزِ زندگی کے نئے شعور سے آشنا ہونے کا موقع ملا آج بھی یہ اثرات ان کی
شاعری میں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جگہ دکھاتے ہیں۔ — وعزہ وعزہ

اس مختصر تقریر کے بعد فیض نے اپنی مختلف نظمیں تاریخی ترتیب سے سنائی اور اختصار کے ساتھ ان کا پس منظر بھی
بیان کیا۔ اس جلسے میں فیض لوگوں نے فیض سے ان کی محنت نظموں کے بارے میں سوالات بھی کیے۔ اور فیض نے ان کے جوابات بھی دیے
مٹی تھنے کی اس دلچسپ صحبت نے فیض کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشوں کو ہم لوگوں کے سامنے بے نقاب کیا۔ آج مجھے ایک
بار پھر اس بات کا احساس ہوا کہ فیض کو دوسرے شاعروں کی طرح اپنے کلام کے بارے میں غلط فہمی نہیں ہے اور وہ اس معاملے میں ذرا
تعمق سے کام نہیں لیتے۔ برطانوی اس کے وہ اپنی شاعری کے نشیب و فراز کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اس کے ایک باشعور نقاد
بھی ہیں۔ — فیض نے انہیں اردو میں غامی پچھلی اور اس کے جلسوں میں اپنی مصروفیتوں کے باوجود پابندی سے شریکیت جتنے
بے اس زمانے میں مجھے فیض کو زیادہ قریب سے دیکھے مگر ان کے خیالات و نظریات سے آشنا نہ ہونے کا موقع ملا۔

اسی زمانہ میں ایک دن مجھے وہ خبر ملی جس کو سن کر میں مسئلے میں اچھا۔ اور وہ خبر یہ تھی کہ فیض کو کچھ اور لوگوں کے ساتھ
بنادت کے الزام میں گرفتار کر دیا گیا ہے۔

سہ ہر کا وقت تھا میں مال روڈ پر باغ جناح کی طرف کی سیر کی غرض سے جا رہا تھا کہ راستے میں اخبار والے کی آواز
سنائی دی جو کسی اخبار کا منیجر پر رہا تھا۔ اور اس کی یہ آوازیں نفساؤں میں گونج رہی تھیں۔ — ”باغیوں کو گرفتار کر دیا گیا
— سازش ناکام ہو گئی۔“

میں نے اس سے اخبار کا منیجر دیا اور باغ جناح میں جا کر اس کو پوچھا۔ اس میں فیض کی گرفتاری کی خبر بھی تھی۔ اس خبر کو پڑھ
کر طبیعت بہت بد مزہ ہو گئی۔ رات بھر پریشان رہا۔ نیند نہیں آئی۔ بے شمار خیالات آتے رہے۔

صبح کو یہ خبر ملی کہ جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں ان پر مقدمہ چلایا جائیگا لیکن اس کی کڑواہٹ بڑھشیدہ رہے گی چنانچہ مقدمہ
چلایا لیکن اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا سب کو سزا دیں ہو گئیں۔
فیض اس طرح کی سزاؤں میں رہے۔

میں میں ان پر کیا جاتی اس کا نتیجہ علم نہیں کیونکہ میں نے اس تلخ عرصہ میں کبھی ان سے بات نہیں کی۔ البتہ اس زمانے میں
انہوں نے جو نظمیں لکھیں چھپ کر ملے آئی رہیں۔ حکومت کی طرف سے ان کی نظموں اور غزلوں کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں لگائی
گئی بلکہ ان کا دوسرا مجموعہ دستِ مصباحی زمانے میں چھپ کر سامنے آیا۔ جب وہ میل میں تھے۔

یہ مجموعہ مکہ کارواں لاہور کی طرف سے ریلوے ہٹام کے ساتھ ساتھ لکھا گیا اس کے ناشر چوہدری عبدالحمید نے لاہور
کے ایک اعلیٰ درجے کے رستورمان (اس وقت اسکاتلنڈ یا وہیں رہا) میں لاہور کے تمام ادیبوں شاعروں فنکاروں اور اداکاروں

کو جمع کیا تھا۔ اعداد و ست مبلکہ نئے تقسیم کئے تھے۔ ان تمام نسخوں پر فیض نے جیل سے محبت سے ۷ کے الفاظ لکھ کر بھیجے تھے۔ اور نیچے ہدفہ دخط بھی لکھے تھے۔

اس مجرم کو جیل سے جسے ذوق و مشرق سے پڑھا۔ اور اسپر ایک مفصل مضمون بھی لکھا۔ جو غالباً امر و نہ کی قاسم بنبر میں شائع ہوا تھا۔ اس مجرم میں نقش زبانی کی کلمات تو میں بھی لیکن اس سے یہ مضمون و اندازہ ہو کر فیض کی شاعری کے جس دھماکے کو محافت نے وقتی طور پر روک رکھا تھا وہ اپنے حالات کے زیرِ شامی دھچک پر نکلا ہے۔ اس میں جو غلیں اور غزلیں شامل ہیں ان میں جذبات کی گرمی اور شعور کی روشنی کچھ اور بھی نمایاں تھی اور کہیں ایسی تھوڑی سی حتیٰ کا احساس بھی ہوتا تھا۔ لیکن ان میں آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی کے مخصوص حالات کے مد و جزو کی ایک تصویر یہ صورت یہ جو دیکھی۔ اور باشعور و زجر انوں کے دلوں کی دھڑکنوں کا مخصوص نمونہ یہ حال مانتا بیٹا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ پانچوں باب آواز لیا گیا۔ اور اس کو نقشِ فریادی سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی فیض کے ساتھ دلچسپی اس زمانے میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے سفیدیائی ہو گئے تھے انکی شاعری نے انہیں لوگوں کی نظروں میں مقبول اور محبوب بنا دیا تھا۔ کاجوں اور لونیو کیسطیوں کے ساتھ وہ اور طلبا و تان کے دل و جان سے سفیدیائی تھے۔ وہ ایک سنگین الزام میں گرفتار تھے لیکن اس زمانے میں کاجوں میں جرئت شاعرے ہوتے تھے وہاں فیض کی غزلوں پر غزلیں بھی جاتی تھیں۔ شاعروں میں خیر کی ہونے والے شاعر اشاروں اور نمایاں ہیں ان کی شخصیت اور شاعری کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

اس صورت حال نے بعض ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں اس خیال کی بھر پور آگ کی نہیں کی رہائی کے لئے حکومت سے مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک درخواست بھی گئی، ادیبوں، شاعروں، یونیورسٹی اور کالج کے استادوں نے اس پر دستخط کئے اور وہ حکومت کو بھیجی گئی خدا جانے اس کا کوئی اثر ہوا یا نہیں کیونکہ مقدمہ عدالت میں تھا۔ لیکن مقصد کی کاروائی عمل ہونے کے بعد فیض کا کردیہ گئے۔ ان کے رہا ہونے سے جو خوشی ادیبوں اور شاعروں کو ہوئی اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

لاہور میں نئے مکان پر آنے والوں کا تاجا بندھ گیا اور کئی ہفتہ تک میلہ لگا رہا۔

میں بھی بعض احباب کے ساتھ ان کی خیریت معلوم کرنے مزاج پوچھے اور مبارک باد دینے کے لئے ایک شام ان کی جائے قیام پر پہنچا عرصہ کے بعد فیض سے ملاقات ہوئی دیکھ کر دل بھڑکا۔ ممانہ کیا۔ حال احوال پوچھا۔ چائے اچھی پاش ہو رہی ہیں۔

جیل کی زندگی کے بارے میں میں نے جان کر کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا دریافت کیا "جیل میں آپ کو پڑھنے لکھنے کی آسانیاں تو ہونگی؟"

کہنے لگے جی ہاں! پڑھنے لکھنے کی کوئی دشواری نہیں ہے۔

میں نے پوچھا۔ "آپ نے جیل میں پچھلے دنوں کون کون سی کتابیں پڑھیں؟"

کہنے لگے "سودا کے کلام کا مطالعہ کیا۔ اور اس کو پڑھ کر بہت لطف آیا۔ چنانچہ سودا کی زمینوں میں کچھ غزلیں لکھیں۔ میں نے کہا کہ وہی غزلیں جو نذر سودا کے عنوان سے آپ کے لئے مجرم سے منشاخ ہوئی ہیں۔"

ہوئے جی ہاں؟

اس کے بعد وہ پوچھنے لگے "کہئے اور تیل کا کچا کیا حال ہے وہاں کے ارباب۔ اختیار کیسے ہیں؟"

میں نے کہا "سب ٹھیک ہے۔ کام چل رہا ہے۔"
 اور اس کے بعد دیر تک ہم لوگ سودا کی شاعری اور ادب و ادبیات کے بارے میں معاملات پر باتیں کرتے رہے کوئی ایک گھنٹہ کی گفتگو
 کے بعد میں نے رخصت ہوتے ہوئے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟"
 کہنے لگے "مکوئی ارادہ نہیں۔ آرام کروں گا تنگ لگی ہوں۔"
 اور واقعی فیض کی آواز میں غم کے آثار تھے۔ بظاہر تو صحت اچھی معلوم ہو رہی تھی لیکن کچھ کچھ سے نظر آ رہے تھے جیسے
 گزشتہ چند سال کے قید و بند نے انہیں ہلکا کر دیا ہو۔
 کئی سال گزر گئے۔

اور پھر مجھے ۶۵۴ میں فیض کے ساتھ ایک سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔
 دہلی میں ایسا ہی ادیبوں کی کانفرنس تھی اس میں شرکت کے لئے پاکستانی ادیبوں کا ایک وفد بھی گیا تھا۔ وہندیس مرزا صاحب
 صاحب مرحوم، شرکت خاویں مرحوم، اعجاز بلالوی اور قلیل شخصیات بھی شامل تھے۔
 ہم سب لوگ صبح کو فیض کی جلے قیام پر جمع ہوئے اور دو انگہ کے راستے سے امرتسر پہنچے۔ دن امرتسر میں گزارا۔ میں نے
 اس سے قبل امرتسر نہیں دیکھا تھا۔ فیض مجھے امرتسر کے تنگ اور تاریک بازاروں میں لے گئے۔ جہان والا باغ دکھایا۔ دربار صاحب
 اور ہال بازار کی سیر کرائی۔ مرحوم۔ ام لے اوکھن کی عمارت بھی لے گئے اور یہ بتایا کہ وہ اس کمرے میں بیٹھتے تھے۔ یہاں تانیر صاحب
 پکچر دیتے تھے۔ پھر سول لائبریری مختلف مکانوں کی حوت اشارہ کر کے یہ جاتے رہے کہیں یہاں رہتا تھا۔ اس مکان میں ہمارا
 خادی ہوئی تھی۔ اس جگہ ہم نے اپنی زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔
 اس طرح دن بھر فیض مجھے امرتسر کی سیر کراتے رہے۔ شام کو سول لائبریری میں ایک ہندو دوست کے یہاں کھانا
 کھایا۔ اور رات کو ہم لوگ فرنیچر میل سے دلی روانہ ہوئے۔

صبح کو دلی پہنچے۔ اسٹیشن پر ایسا ہی ادیبوں کی کانفرنس کے والیٹر اور کچھ ادیب موجود تھے۔ ان لوگوں نے ہمارا
 استقبال کیا۔ ہارپناے اور نئی دلی میں ہماری جے ٹیم پر پہنچایا۔
 پانچ چھ روز ہم لوگ دلی میں رہے۔ ایسا ہی ادیبوں کی کانفرنس کے کئی اجلاس ہوئے۔ ان سب میں ہم لوگوں نے شرکت کی
 فیض نے ان جلسوں میں دو تقریریں کیں۔ ایک تو پاکستان میں ادیب کی حیثیت کے بارے میں۔ اور دوسری پاکستان کے جدید ادب
 کے متعلق۔ ان تقریروں سے یہ اندازہ ہوا کہ انھوں نے پاکستانی ادیبوں کے مسائل اور پاکستانی ادب کے جدید رجحانات کا تجزیہ
 زاویہ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور وہ ان کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔
 کانفرنس کے بعد ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ اس میں فیض نے بھی اپنی تینیں سنائی اور انہیں پسند آئی کہ بیشتر شاعروں کی ما
 پر رشک آیا۔ ہر طرف بس فیض ہی فیض نظر آتے تھے۔

پاکستان سے باہر فیض کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ مجھے اس سفر میں ہوا۔ میں تو سمجھا تھا کہ پاکستان ہی میں لوگ
 فیض کے شہیدائی ہیں لیکن اب یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پاکستان سے باہر بھی انہوں نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی ہے۔ اور
 ہر تہہ کسی شاعر کو دراصل مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

اس مقبولیت کا سبب انسانیت اور انسان دوستی کا وہ پیام ہے جس کے گرد ان کی شاعری گھومتی ہے۔ اور اسی پیام نے انھیں کئی سال بعد لندن پرائز دلایا جو بلاشبہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

فیض نغمہ پرائز لینے کے لئے روس گئے۔ اور وہاں سے واپس آکر کوئی دہائیوں سال لندن ہی رہے۔ میں بھی کم و بیش اسی زمانہ میں اردو کے استاد کی حیثیت سے لندن آیا۔ اور یہاں ان سے براہِ ملاقات ہوئی رہیں۔

بلی سی میں صلائے عام کے کئی پروگرام ایسے سوئے۔ جس میں ہم نے پاکستان کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کیا کئی شاعری بھی ترتیب دی گئی۔ جس میں فیض نے اپنا کلام سنایا اور بعض ادبی جلسے بھی ایسے ہوئے جن میں کبھی کبھی فیض نے تقریریں کیں۔ اور اس طرح مجھے لندن میں فیض کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات و نظریات سے آشنا ہونے کے مواقع ملے۔

فیض کبھی کبھی اسکول آجاتے اور میرے ساتھ سینیر کراسن روم میں بیٹھ کر باتیں کر سکتے۔ میرے دوست اور رفیق کاروانت رسل بھی ان باتوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتے تھے۔ دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے۔ ہونا مختلف ممالک میں ان کے سفر کی روداد سنائی جاتی اور اردو زبان اور ادب کو پھیلانے کے منصوبے بناتے جاتے۔

لندن کے دوران قیام میں فیض نے پاکستان کی ثقافت پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ میرے ساتھ وہ برٹش میوزیم بھی گئے لیکن ان کے پاؤں میں پھر رہا اس لئے وہ دل جمعی اور نیکوئی کے ساتھ کام نہ کر سکے۔

اور پھر ایک دن فیض اسکول آئے میرے ساتھ یہ نیکوٹی میں رات کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ نیکیا کراسن روم میں کافی پیئے۔ پھر وہاں انھوں نے یہ خبر سنائی کہ وہ بلند پاکستان جا رہے ہیں

میں نے پوچھا "اچانک آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔"

کہنے لگے "دس سال پہلے ہی نہیں گئے۔ طبیعت کٹا گئی ہے"

میں نے کہا عجیب بات ہے کہ لندن میں آپ کا جی توں لگتا۔

کہنے لگے "اپنا وطن یاد آتا ہے۔ ایک ایک چیز کی یاد سنا آتی ہے۔ یہاں کس سے ملوں؟ کس سے باتیں کروں؟ کس کے لئے شعر کہوں؟ کس کو شعر سنائوں؟"

میں خاموش سن رہا۔

رسل کہنے لگے "لیکن یہاں آپ کو آزادی زیادہ ہے اور کام کرنے کے مواقع بہت ہیں۔"

فیض نے کہا۔ "پانچویں تو مجھ پر اپنے وطن میں ہی نہیں ہے۔ بلکہ زبان بھی آزاد ہوں۔ کام الٹا بیان مختلف مسئلے ہو سکتے ہیں لیکن یہاں انہیں اتنی زیادہ ہے کہ کچھ کرنے کو بھی نہیں چاہتا۔ پھر سب سے خراب بات یہ ہے کہ یہاں کی زندگی تمام برصغیر کی ہے اس میں نقص بہت ہے۔ یہاں کسی سے ملنے جائیں تو پیسے (APPOINTMENT) کرنا پڑتا ہے۔ دوست سے ملنے کے لئے بھی یہاں پر فون پر وقت مقرر کرنا ضروری ہے۔ یہ کیا زندگی ہے؟ اپنے یہاں تو جس وقت بھی جانا چاہئے اردو و ستر کی یہاں ملے گئے۔ مل گئے تو بچ شپ ہوئی تو ڈراما وقت اچھا گزر گیا۔ نہیں ملے تو واپس چلے آئے۔ یہاں اس کا کوئی تصور نہیں سائی لے اس فضا میں میرا قدم گھٹکتا ہے۔"

میں خاموش سنتا رہا۔

فیض نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

رائع کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ”صاحب، آپ لوگوں نے بہت ترقی کا ہے۔ لیکن آپ وہی ابھی تک ہیں باوا آدم کے زمانے میں یہاں ہر شخص کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے۔ مہذب تو ہم لوگ ہیں کہ ہم نے تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا ہے۔ ہر شخص کے لئے وہاں کام مقرر ہے۔ اس طرح ہر شخص کو سالانہ ہوتی ہے اور یہی زندگی کی زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے“

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مجھے ہنسی آئی۔ فیض بھی ہنسنے لگے۔ رائع نے بھی حسب معمول تہقیر لگا کر اس دن دیر تک ہم زوجی اس مسئلہ کی دلچسپ باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن فیض نے فون پر یہ اطلاع دی کہ وہ ۲۴ جنوری کو جا رہے ہیں۔ جہاز نیپلز سے جلتے گا۔ لندن سے نیپلز تک وہ ریل میں سفر کیا گئے اور راستے میں دو دن پیرس میں ان کا قیام رہے گا۔ اس زمانے میں میں نے اسکول کے شعبہ اربو کے لئے اڈیوں اور شاعروں کی آوازوں کو ریکارڈ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور خامی تعداد میں چیزیں ریکارڈ کی تھیں۔

جب فیض نے جانے کی تاریخ طے کر لی تو خیال ہوا کہ ان کا بھی ایک انٹرویو ریکارڈ کر لیا جائے۔ چنانچہ جلتے سے ایک روز قبل خاص طور پر انہیں اس کام کے لئے اسکول میں دعوت دی گئی اور انہوں نے اس دعوت کو خوشی قبول کیا۔ وہ آئے۔ میں نے ان سے ان کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے بارے میں مختلف سوالات کئے جس کے انہوں نے نہایت جواب دیئے۔ اور اس طرح ایک دلچسپ اور مفید چیز تیار ہو گئی جو اسکول آف آرٹس میں اسٹڈینٹس لنڈن یونیورسٹی کے شعبہ اربو میں محفوظ رہے گی۔

۳۱ جنوری کو ان سے لندن میں میرا آخری ملاقات ہوئی تھی ۲۶ مئی کو وہ لندن سے میلز روڈ پر چلے گئے اور پھر یہ خبر ملی کہ ذوری کی ۳۱ مارچ کو وہ پاکستان پہنچے۔ اڈیوں نے یہ کھانا نہارا مستحق کیا ان کے احوال اڈیوں نے بے شمار محنتیں منہ قد ہوئیں اور وطن عزیز میں کراچی سے پشاور تک ایک دھوم مچ گئی۔

لندن میں انہوں نے رحمت ہونے سے قبل مجھے اپنی آخری غزل سنائی تھی اسکے یہ دو شعر مجھے بہت پسند آئے تھے۔ اور میں نے انہیں اصرار کر کے بار بار اشتہار پڑھ کر سنانے کی زحمت دی تھی۔ پھر بھی میرا دل نہیں بھرا تھا۔ کیسے عجیب شعر تھے۔

سحرِ فراق، بہت سبب مشک بو کر ہیں

عزبت کہہ میں کس سے تری گفتگو کر میں

یاد آشتا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام

کس دہرے نام یہ خان سبو کر ہیں

مجھے یقین ہے کہ وہ سب تم کے شعر ہیں کہتے ہوئے، اور ان کے نزدیک ان اشعار کی اہمیت بھی نہیں ہوگی۔

(لندن سے)

سردار جعفری

یکھو کی ایکے تر

فیض کے ساتھ

دیکھ کر کو چہ پاک گریباں کی بہار

وہ رات بڑی طوفانی تھی۔ دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء کا دھندہ تھا۔ سردیوں کا جھکڑ چل رہا تھا۔ قندھاری لہریں میں ہمارے گھر کے سامنے کھڑا ہوا اعلیٰ کاہرا آتاناؤ۔ وحشت کسی تعلیم نو، قد آور دیوانے جھوم رہا تھا۔ اس کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں۔ اور سائیں سائیں کی مسلسل آوازوں کے ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی پتیاں برسنے لگی تھیں۔ ہوا بڑوں پرلوں سے پیدا کر رہی تھی سڑکوں کی بجلی کی بعض روشنیاں جو کھیموں کے بجائے تاروں سے لٹکی ہوئی تھیں، لمبی لمبی پینگیں لے رہی تھیں اور مائے دیوانہ ناخ ریہے تھے، خود ہمارے سامنے بھی کبھی پیچھے اور کبھی آگے آکر ناچنے لگتے۔ رات اپنے شباب پر تھی۔ اور ہمارے دلوں میں ایک احساس فتح مندی تھا۔ ہم آل انڈیا ریڈیو سے نوار دشوار کا مشاعرہ پڑھ کر دل پر آ رہے تھے۔

نوار دشوار کا مشاعرہ ہنسنے لگا، اندھا دیکھ کر نہ سہیش ڈاؤن کر سوتا تھا۔ جب معشوق عاشق پریشہ، ممدارست کے فرائض شاعر انقلاب جوش یلہ بادی نے انجام دیئے۔ آج خوابوں کے نظم منانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ نغمہ قری پسند شاعروں کا کلام سننے آئے تھے۔ وہ جیم اور سرخ و سپید رنگ، دل نواز اور مصوم تہم، آنکھوں میں شفقت، محبت اور غم، باقی سارے انداز میں ایک باوقار زندگی۔

جوش کی بحث ممدارست میں پس و پیش کر

جوش تو قبلہ زبان جہاں ہے ساقی

مشاعرہ سننے والے کھٹکے صاحبان فوق، وہ بھی جوئی شاعری کے پرستار تھے، اور وہ بھی جن کے ماستے پر پل پڑے بہتے تھے، آج وہ بھی دیکھنے آئے تھے کہ نوار دشوار پر کیا جیتی ہے۔ انہیں کہ جہم میں سجا و غلبہ قری پسند کٹر یکے کے بان اور کھڑاں، ابھی تو عمر میں، انھیں ان سے تعلیم ختم کر کے واپس آئے ہیں۔ میں میں بچے ہیں۔ یہاں کی وجہ سے ربا کر دیتے گئے ہیں۔ لیکن چہرے پر غالب علی کی معصومیت باقی ہے۔ بھاری بھر کم جسم ہے، بہت تازہ باغ میں، شخصیت میں

محسوس ہے، رھینہ ان کی بیوی ہیں، گندی رنگ، پھر ریاجسم، اللہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ مایا سرکار مہیلا ورڈیلے میں انگریزی پڑھاتی ہیں، بنگالی ہیں، لیکن نکھنوں کی نفیس اردو بولتی ہیں۔

پروفیسر ڈی بی مکرجی بنگالی زبان کے مستند ادیب اور نقاد، موسیقی کے پرمسناور، سفر و شاعری کے دلدادہ، انتہائی مرقیانیہ نکھنوں یونیورسٹی میں معاشیات اور سماجیات کی تعلیم دیتے ہیں، بولتے ہیں تو منہ سے پھول پھولتے ہیں۔ نفیس بنگالی دھولکی ادا کرتا بہن رکھا ہے، کندھوں پر ایک نشیری شال ہے، موہنا رطاب غلوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور انہیں اپنے ٹھہر پر بل کر چائے پلاتے ہیں، اپنی باتوں سے محفوظ کرتے ہیں اور کتا ہیں پڑھنے کے لئے دیتے ہیں، اردو کم سمجھتے ہیں لیکن بلانکی ڈباختہ ہے، بچے اور بڑے سفر میں تیز کر لیتے ہیں، انہیں خوشی ہے کہ نوادر مشعر ان کی یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی ہے۔ احمد علی، جو ابھی ابھی انگلستان سے واپس آئے ہیں، اردو میں چند افسانے لکھے ہیں اور انگریزی میں ایک ناول اس میں پرفاسٹر کا دیباچہ ہے، بڑے ادیب سمجھے جاتے ہیں۔

گوہر سلطان جس کے ننگے کی دھوم ہے۔ حیات انفرادی اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ہندوستان جعفری کے ایڈیٹر، نئے شاعروں کے طرف دار لیکن ناقہ انداز لے لے ہوئے۔ اور جمال قدوائی اپنے مخصوص بیہکے ہوئے انداز کے ساتھ سماجیات میں عملی دلچسپی نہیں لیتے، ادب کی تخلیق نہیں کرتے لیکن نظریاتی اور جذباتی طور سے دونوں کے معانی میں انتہائی انقلابی، اور سبیل حسن، سرسے پاؤں تک عشق کا تجربہ کسی افسانوی سرزمین کے شہزادہ کی طرح بوجاد کے عہدوں اور پارہ دیوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جنگلات لائے ہیں۔ حسین چہرہ، چاند زیب جسم، نفیس ترنٹے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں، اور نہایت مہذب اور دلچسپی ہوئی زبان، شاعرانہ دوست نہیں دریا کی ہیں۔

ان سب کے علاوہ یونیورسٹی کے اور بھی اساتذہ اور طالب علم، اور لکھنؤ کے قدیم اساتذہ جامد وار کی مشیر و انیس بہن کر آئے ہیں اور روزانہ بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے اردو ادیب کی تاریخ میں کبھی بزرگ اور معر مشعر، نو عمر شاعروں کا کلام سننے نہیں آئے تھے۔

سب ہمتی اختلاف میں کہ نوادر مشعر سو نہایت چپ کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں، یہ اس عہد کے باغی ہیں، سر بیہوش عیش و نشاط کے دلدادہ مگر کفن بردوش، یہ ابھی غلیم نہیں ہیں، لیکن ان کے نام افسانے بن چکے ہیں، اردو شعر و ادب کے نئے دھارے اب ان کے نام پر بہیں گے۔ یہ نیا جذبہ، نیا لباس، نئی زبان نے کرائے ہیں۔ مافی کا سارا ورڈ ان کے پاس ہے جدید تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ اس لئے قدیم اور جدید کا امتزاج ان کے یہاں خود بخود چپا ہو گیا ہے۔ یہ پڑنے پھول کوئی طرح تراش رہے ہیں، ہجو و وصال کی داستانیں ان کو آتی ہیں، محبوب کے وعدہ فردا کی لذت سے واقف ہیں، لیکن ہندوستان کی آزادی ان کی سب سے بڑی محبوبہ ہے اور اس محبوبہ کے سامنے نئی شاعری پر اعتراض کرنے والوں کو گردن بھی جھک جاتی ہے۔

نوادر مشعر کی طرف بے شمار رنگا ہیں اٹھتی ہیں۔ لگا ہیں جن میں مبت کی گڑی ہے۔ لگا ہیں جن میں سرد مہری ہے۔ عاشقانہ لگا ہیں، رقیبانہ لگا ہیں، لیکن ہر نگاہ میں ایک سوال ہے، کون کون ہے؟

یہ عجیب ہے۔ خوش پوش سگر چاک گرمیاں، آنکھوں کی گہری اداسی میں شوخی کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ اس کے بلیک ہونٹوں کی نرم سگر سٹریٹسکاٹ کو نکھو میں کون نہیں جانتا۔ اُس کے نگے اور شعریں بقول فیض کے منی کے نغے کا دوسرے۔ جوش نے اُس کی شخصیت کو ایک نعرے میں سمیٹ لیا ہے۔ ”وہ ایک نگاہ میں دنیا کے سارے حُسن کو اور ایک گھونٹ میں دنیا کی ساری شراب کو پی جاتا جانتا ہے۔“

اس مغل کیفِ دستی میں اس انجن عرفانی میں

سب کا بھگت بیٹھے ہی ہے، اپنی بھی گے کھلا کھینچ

اور یہ فیض احمد فیض ہے۔ لاہور کے نگے کو چوں کی تینیت، چہرے کی سکاٹ اُداس ہے، لیکن آنکھیں نرم اور محبت بھری۔ آواز میں ہلکا سا گداز اور شعروں میں دل کی دھیمی دھیمی آہنج جو غفلوں کے سنگیت کو بچھلا کر رنگ بنا دیتی ہے اور ہر مصرعے ایک پینٹنگ بن جاتا ہے۔ ایک حسین و جمل تصویرِ جودل میں آؤنزاں ہو جاتی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے نرم و شعروں کے اندر بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور آنکھیں چمک چمک ہونہ ہو جاتی ہیں، مگر یہ وہ بجلیاں ہیں جو صرف فیض نغے نغے شزاروں سے بنا سکتا ہے

دل کے ایوان میں لے گئی شدہ نمنوں کی قندار

نورِ غورِ مشید سے ہے ہوئے، اکتائے ہوئے

حُسنِ محبوب کے سستیاں تصور کی طرح

اپنی تاریکی کو بھیجے ہوئے لپٹائے ہوئے

اور یہ جذبہ ہے۔ سب سے بے نیاز اور سب سے اٹھتا ہوا، حساس چہرے پر ہر بھر کے مصائب اور مغلی کی تکی، آنکھوں میں محبت کی بے پناہ بھوک اور عینِ ترمیم میں ایک دلِ دوز کیفیت جس کو اُس کی آواز کی رچی ہوئی سرشاری ہمیں چپا سکتی کسی کا احسان اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ زندگی کو بھی دھتکارتا ہے اور موت کو بھی سہ

نہ آئے موت خدا یا شبہِ حالی میں

یہ نام ہوگا عشمِ روزگار بہ نہ سکا

اور یہ مخدوم محی الدین ہے، حیدر آباد کا القلوبی، سنگِ اسود سے تراشا ہوا؟ بنوسی چہرہ، بلند پیشانی، شگفتہ آنکھیں، سکاٹ میں گرم جوشی اور باتوں میں بے انتہا یقین اور اعتماد، ترنہ بے پناہ ہے جس میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ انقلاب اور دھماکے کے دوراے پر کھڑا ہوا انتظار کر رہا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ دکن کی کسی سانولی سلونی جمودی کا انتظار کر رہا ہے یا ہندوستان کی آزادی کا

سات بھر دیدہ کمنٹاک میں ہر اسے رہے

مائن کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

پتیاں کھڑکیں توں سمجھا کہ آپ آئی گئے

سجود سرود کہ سجود کو وہ پا ہی گئے

آگئی تھی دلِ مضطرب میں مشکِ بانی سی

نچ رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی

اور یہ جاں نثار اختر ہے، دوارد شعراء کے ہجوم میں تنہا ہے شاعری اپنے والد مضطر خیابادی سے ورثہ میں ملی ہے اپنے آپ
سے الجھا ہوا، خود ہی سنجیدہ ہوجاتا ہے اور غریب مسکراتا ہے۔

آسمان جیسے چلے لاشے کی دھول

جانڈ جیسے ایک بے امت رسول

دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اور یہ سرور جعفری ہے۔ کرشن چندر کا یہ کہنا ہے کہ اس کے چہرے پر بسنے جھوٹے کاشان ہے: ہر وہ فرد محمد مصطفیٰ کی رائے
ہے کہ وہ رنگین تصویریں نہیں بناتا، بلکہ پتھروں سے محبت تراشتا ہے۔

سرملنے کے سنے ہوئے ہونٹوں کا تہم

مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے

وہ زیر افق صبح کی ہلکی سی سپیدی

ڈھلے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے

پیشانیِ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے

اُٹھتے ہوئے سڑک والی کرن ہے کہ نہیں ہے

نوراد شعراء کے اس مشاعرے میں ن۔م۔راشد کے بھی آنے کی خبر تھی جس کے سرور و شاعری میں اتنا نظم کا سہرا ہے،
پطرس کے نزدیک وہ ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان راشد کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جب ہم آدھی رات کو گھر واپس پہنچے تو آدھی اور طوفان کا اندکھ اہد بڑھ گیا تھا۔ سردی بھی
ہلائی تھی۔

گھر میں فرنیچر کے نام پر ایک میز: بید کی چند کرسیاں اور موزک کے تین پلنگ تھے۔ انہیں کتا بے سر کا گز میں پریشانوں
کا فرض بھیا دیا گیا تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اُس کے اوپر کاش تھی، اور کاش کے اوپر دیوار پر اسپین کی ایک جادہ خاتون
کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ اُس کی مٹھیاں بچنی ہوئی تھیں، سینہ ابھرا ہوا تھا جس کی دو سیزنگی کو فوجی لباس بھی نہیں بچا سکتا تھا چہرہ
آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ہونٹ شدت جذبات سے ایٹھے ہوئے تھے اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا، "TO DEATH"
دواؤ ندھی بالیو بپہر ملتی ہوئی مردم بیہوش کی دوشنی میں وہ تصویر اور بھی زیادہ مروعہ اور دل آوز معلوم ہو رہی تھی۔ کاش کا سایہ
تصویر کے ابھرے ہوئے سینے تک پہنچتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پُر جوش شکل موت کے اندہ چہرے سے زندگی کا پیغام
لے کر ابھر رہی ہے۔ ایک طرح وہ تصویر ہمارے رومانی اور انقلابی جذبات کی ترجمانی تھی۔ ہم بھی موت سے ہرما آزما ہونا چاہتے
تھے۔ اسپین ہمیں اچھا ملک معلوم ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ فاشیزم کے خلاف آزادی اور انسانیت کے حسین خوابوں کے لئے لڑا تھا
اپس کی آزادی اپنی آزادی تھی، اور وہ عابد خاتون آگ کی رات ہماری مغل میں شریک تھی، اور ہندوستان کی انقلابی کے مقلدوں
کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

”کے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ مانیت“

کمرے پر، سکون تھا، آگ اور لوں کی حرارت تھی۔ کبھی کبھی باہر چلنے والی طوفانی ہوائیں اپنے بڑاڑوں ہاتھوں سے ہمارے دروازے کو جھنجھوڑ دیتی تھیں، اور کچھ گھڑا ہٹنے کی آواز کے ساتھ باغیچوں پر چلتی ہوئی شعلوں کی لہریں بھر بھرا جاتی تھیں۔ ہم بالیوں کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے، اور چلتی ہوئی سوم بیٹوں کی نرم مدھنسی میں ایک دوسرے کے جذبات اور محبت سے بھرے پیروں کو دیکھ رہے تھے جوشِ آبادی زیادہ دیر تک قبلِ رندانِ جہاں کے فراتسِ اہتمامِ نردسے کے۔ لڑکے جاگنے کے مسائل میں وہ ہمیشہ کچے ہیں۔ ابس لئے جب جہاں میں نے انہیں زیادہ مستایا تو وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ رات کو جاگنا، نوکی خاصیت ہے۔

مغل کی گڑی بڑھتی گئی۔ دونوں کا سرور بڑھتا گیا، چہرے زیادہ روشن ہوتے گئے۔ اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ یہ شاعری کا دودھ ہے یا جاموں کی گردش۔ سب ہم عصر تھے، سب نو وارد تھے، سب ایک حلقے میں بیٹھے تھے، سب کا الگ الگ انداز تھا، انفرادیت پہچانی جاتی تھی کہ کسی جس کے رشک، حسد یا معاشرت پر شک کا پتہ نہیں تھا۔ ایک دوسرے کی تعریفیں اس طرح ہو رہی تھیں جیسے عاشق مشوق سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

فیض نے کہا، ابھی لاہور میں ایک بہت اچھا شعر سنا تھا، معلوم نہیں کس کا ہے۔
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمت کس کو کبھی
اب ایسی شگفتہ کشتی پر ساحل کی تماں کون کرے

جذبی کا اداس چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ جذبی کا شعر تھا جو اس سے پہلے لاہور پہنچ کر شہور ہو چکا تھا۔ فیض اور جذبی نکلے۔

ابھی فیض کو بیٹھے کی بھی جہالت نہیں تھی کہ جذبی نے بغیر کسی ہمت کے فیض کی نظم "موضوع سخن" کو اپنے بے پناہ اور انتہائی دلگذاڑ

ترک کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، جو ہم نے چند ماہ قبل "نیا ادب" میں شائع کی تھی۔

گل ہوئی جاتی ہے اسرہ سٹھتی ہوئی شام

دھن کے نکلے گی ابھی حیرت مہتاب سے رات

اور مشتاق نگاہوں کی سسنی جاسے گی،

اور ان ہاتھوں سے سس ہوں گے یہ ترے ہونے ہاتھ

باہر ہوائیں مچھلاڑ رہی تھیں، اور اندر جذبی کا ترنم طوفان برپا کر رہا تھا۔ فیض کے چہرے پر ایک معصوم اور شگرا نیز مسکراہٹ تھی، ایک شاعر کے لئے اس سے بہتر دوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

جذبی نے پہنچ بند پڑھا تھا کہ مجھ نے دوسرا بند اٹھالیا اور اپنا رنگ چھڑا دیا۔

اُن کا آچل ہے کہ رخسار کہ پیرا ہن ہے

کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلن رنگیں

جانے اس زلف کی موہوم گھٹی چھاؤں میں

ٹوٹتا ہے وہ آدیزہ ابھی تک کہ نہیں

اب دونوں نے باری باری ایک ایک بند کا کرشمہ مکمل کی۔

جذبی کے زخم کا مار ڈالتے ہیں پاپا تھا کہ عہدِ کم کا رگڑا ہند ہوا۔ اُس کے ہاتھیں دیوانِ حافظ تھا جس کی ایک عشرت وہ گشتِ گناہ اٹھا۔

شاد و شاد دھن - سنو و شیریں دہن
کہ برتر گاہ شگند قلب ہر صدف شکلا
برجبات تیکہ مکن تکر تقدیر سے داری
شادی زہرہ جبیناں خور و ناک بدناں

اس غزل نے محض کو اوری رنگ دے دیا۔ زہرہ جبین اور نازک پاروں کے نام کا جام کون نہیں پینا چاہے گا، اور اب عہدِ کم کی آواز تہا نہیں تھی۔ سُر کی اور بے سُر سی سب آوازیں مل گئیں۔ حافظ کی غزل کا کورس دیر تک جاری رہا۔ دیوار پر اسپین کی مجاہد خان موت کی دعوت دیتی رہی۔ باہر ہوائیں دیوانہ وار دور و زمرے کو کھٹکھٹاتی رہیں۔ مگر کم لوگ سب سے بے نیاز حافظ شیرانی کے لفظوں میں حسینوں کے جامِ صحت پیتے رہے۔ نہ جانے کس کے دل میں کون سا حسین بھانک رہا تھا۔

یہ طوفان بھڑاہی تھا کہ جذبی پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اور اب آج تاجِ کرم جو عہدِ سخن کو گانے لگا۔
آج پھر حسینِ دل آرا کی بے کسج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجلی کی لیکر
رنگِ رخسار پر ملکا سا وہ غائب کا خمبہ
مندیں ہاتھوں پہ لگی سی حسرت کی سریر

اس کی آواز میں مستی، جلد ہو گئی تھی، اس نے اور بھی دل دودھ ہوئی تھی۔ اب وہ ایک ایک لہذا کو اترا کھینچ کر گاتا تھا کہ سانس کا بارڈن ٹوٹ جاتا تھا۔

جسم نے بدشکلی پر اُتر سے بھٹایا، لیکن وہ ڈرپ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ فیض کی "موضع سخن" پھر محض پر چھا گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جلد کی آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر بھی وہ فلم ٹائٹل "اور زکر رہا تھا۔"

اب تک فیض کی ایک ہی نظم "اور وہ بھی" جذبی کی زبان سے اتنی بار سننی چاکی تھی کہ سب لوگ تھک گئے تھے، اس نے نئی نے خیال کو دوسری طرف موڑنے کے لیے جذبی سے اتنی ہی نئی نظم "موت" کی فرمائش کر دی۔ اور جذبی کی ٹوٹی ہوئی آواز اگلے ہونے پر م نے اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جھکا لولا تو چلوں
اپنے تم خانے میں ایک دھوم مچاؤں تو چلوں
اور آگاہی کے تندہی سے حیرتوں تو چلوں
ابھی چلتے ہوں ذرا موش میں آگواں تو چلوں

ایسا لگ رہا تھا جیسے گزرتی ہوئی رات کے ساتھ جو آندھروں کی ریتا سے سج کی طرف جا رہی تھی۔ جذبی سفر کو رہا ہے۔ بچنے لگتا، باراس نے یہ فنم سسٹما۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب بھی ہوئے ہوئے آندھیاں تھمت گئیں اور یا شیوں پر چڑھی ہوئی موم ہتھیلیاں

بھولے چھوٹے سکون میں تبدیل ہو گئیں۔ اور ان کی نظر عورت کی ہوئی تو یوں دم توڑنے لگیں، اور کھانے کے لئے دسترخوان بچپہا، تو جہزی
بچ دسترخوان پر کھڑا ہوا گاربا تھا خط

اپنے بھیکے ہوئے دامن کو شکھا لوں تو چلوں
آدھی سے زیادہ مغل سوری سی تھی، اور جہزی کی ڈوبتی ہوئی آواز کے ساتھ عہدِ دم کا اُداس قرنم سنائی دے رہا تھا، جو
موت اپنے لئے گھٹننا رہا تھا

خلیتِ نکس میں بھی ڈرتا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیٹے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال
ایک اور رات ختم ہو گئی، جو بھر کبھی نہیں آئے گی۔ ایک اور دن شروع ہو گیا، اور دیوار پر لگی ہوئی اسپین کی مجاہدات کی تصویر
ہیں زندگی کی مبدعہ کی طرف چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔

” — نہیں، بڑے خوش فکر شاعر ہیں۔ سیر اور لٹمنٹ کے
خطابات اُن کی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ بے ادبی
کا درجہ رکھتے ہیں۔ شاعری کا مسلک اشتراکِ پے اور کلام نے
کبھی شوخ حسینہ کی چشمِ غزالاں سے بہت سے اشارے پُرا کر
رکھ لئے ہیں۔ دل سے رومانی اور آنکھوں سے انقیاتی معلوم
ہوتے ہیں۔ احساس کی شدت بیک بیک لطیف انگڑائیاں لیتی چلتی
ہے۔ زندگی کی تلخیوں کا ذکر اس طرح سکرا سکرا کر کرتے ہیں جیسے
کوئی نیا بیابا دہن شوہر کی نیا دیتوں کا شکوہ بڑی بہن سے کر لی
ہے۔ بکراور وزن دونوں کے قافس ہیں۔ بعض سببِ نفلوں میں تافے
پابند نفلوں سے ناخوش ہو کر ہر تان کے نفل آتے ہیں۔ مگر نفلوں کے
چہروں پر روی شادابی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو ہر کون کے
چہروں پر ہر تنخواہ والے دن نظر آتی ہے۔ پورا ملامہ ”نور عمر الفاظ“
اور ”دوشیزہ بندشوں“ کے چہروں میں سُندھا ہوا بار معلوم ہوتا ہے
عقاد میں چٹکی اور ”بوزھا پن“ پایا جاتا ہے۔ اسید کا دامن کٹ کر
دانت سے پکڑے رہتے ہیں۔ جب آزادِ نعمت کھتے ہیں تو اُس کے بول
فیضِ اوقاتِ کبوتر کی غلغلوں کا سا ترنم پیدا کر دیتے ہیں۔ پابند
شعر بڑے سلیقے سے کہتے ہیں۔

_____ غلام احمد فرقہ سے

حمید اختر

فیض شخصیت کی قید جھلکی

فیض کے متعلق گفتگو کے دوران، ایک ادکار ایک اور شخص نے مجھے کہا تھا کہ میں فیض پر مبنی ہوں۔ لیکن یہ فیض نہیں کر سکتی کہ وہ میرے کیا لگے ہیں، میں انہیں اپنا معنوی سمجھوں یا عاشقی، ہاں بقول گردن یا بیٹا و شیر۔ یہ فیض کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ بہر حال میں فیض کو ماننا چاہتی ہوں اتنا چاہتی ہوں کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے؟

فیض کی شخصیت (یکسوویت) پر اس سے بہتر تبصرہ شاید ممکن نہیں ہے، ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا میرا کام نہیں ہے مگر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ فیض کی زندگی اور شخصیت بے شمار اور محبت کی ہر معصوم شکل کا مجموعہ ہے۔ ہمارے ایک مرحوم دوست نے میں کا تقاضا ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ میں ہر شام فیض کو فخر کو ان کے گھر لے جاؤں، ایک دفعہ بھی مجلس میں یہ اعلان کر کے، پردہ بھل کو حیرت میں ڈال دیا کہ فیض کا کام ان کی سجدہ میں نہیں آتا مگر وہ فیض کے عاشق ہیں۔ ہر دوست زیادہ پیسے کھینچتے مگر یادوں کے واسطے۔ فیض کو مزیم کی کہا ادا پسند، سچی، اسی وجہ سے کہ جب ایک دفعہ ہم فیض نے ان سے گھر جانے کے لئے اس لئے انکار کیا کہ ان کی نظرس میں یہ دوست بڑے بڑے توفیق حاصل لائے، یہاں پر وہ ان کے ہاتھ میں موصوف کے اس مقدمے کا ذکر بھی بے جا نہ ہو گا کہ کوئی پورہ گزرا قابل بڑا منت نہیں ہے، اس واسطے اس بڑے خواب کا دست ہے۔

دو سنی محبت اور غم و غم کا بھی مزید اگر نامور فن کاروں، دانشوروں اور ان چھوٹوں کی محبت کا مرکز ہے تو اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ فیض کے دوستوں میں: اہل علم، کم علم، بڑے علم و نگہ کی بڑی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ وہ نگہ کی جن کا کام ایسے لوگوں کی نثرانی گزرا ہے دوستوں اور ہمدردوں سے بڑے ہے، ان کے دوستوں میں فلم آرٹسٹ، گائے والے، ارب، شاعر، طلباء سرکاری محفلوں کے قلم، قلم، اور پریس بلکہ خیر پریس کے انشورڈ مین کو ہر طبقے اور تمام سے قربت شامل ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے لوگوں نے فیض کو ہر طبقہ میں، اس سے محبت و زیادہ کی ہے۔ وہ بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے شہزاد کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور جدید شاعری کو اگر نیا اسلوب دیکھیں لیکن کیفیت انسان کے وہ اس شاعر سے بھی بڑے بہتر ہوتے تو صرف اس کے کلام سے واسطے سے ملتے ہیں۔ وہ اگر شہزاد کہتے تھے تب بھی اتنے ہی ہنسے آدمی جوتے دوستوں کی کرداروں کو انکسار انداز کرنے میں ان کا اتنی مشکل ہی سے ملے گا۔

لوگوں کو دھوکہ دینے والے پیٹہ دروں کے لئے صلے نام ہے کہ وہ فیض کے پاس پہنچیں کیوں کہ وہ ان کو پہچان نہ سکیں۔ دھوکہ کھا جائے گا اور بعد میں معاف کریں گے لیکن اگر آپ ان کے پاس جتنا تاخیر آپسہ اور کھولنا ہوا خون لے کر جائیں گے اور کسی بدھینت اور ذلیل نہیں گئے

مکررہ کا زاناموں کا ذکر کرنے کے بعد جسدوردی نے طالب ہوں کے تھاپ کو مابو لوسی ہوگی جمیوں کہ آپ کی الم نگ داستان میں کرب سے پہلے تودہ سگریٹ کا ایک بانٹ لٹکا جسے چھریا کی لمبی سی ہوں کی دانہ آئے گی اور اگر آپ کے بعد بھی اس بارے میں ان کی رہنے تلیم کہنے پھر ہوں گے تو آپ کو 'جیلو چورڈ' کے سانچے سے نکھیں گے گا۔

[illegible]

ایسے بیمار لوگ برعوضے میں مروجہ دہشت میں گرفتار ہوا مشہور ایسے لوگوں کو یہ اجازت نہیں دینا کہ وہ مشرفا کی تجویز اٹھا لیں۔ بیمار باقی ہنستی سے سرکاردار بدامین دسویں حاصل کرنے کے لئے کئی طرحی مبینہ نیکیوں کو حتمہ مشق بنانا شروع کر دیتے ہیں سالانہ اگر یہ لوگ امن میں فیض نہ شہود حاصل کریں اور ان سے صاف کہہ دیں کہ آپ کی ذات پر حملہ کرنے سے ہمیں ذاتی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے تو فیض اٹھیں خود اپنے خلاف نہیں اور مظاہرین لکھنؤ یا کسی دیگر لیکن جب یہ لوگ پہنچ رہے ہیں حملہ کرنے ہیں تو اس کا کوئی نقص تو کبھی کوئی نہ ہوگا ماس کا اہتمام دیکھنے کی ضروری ہے۔

دوستوں اور چاہنے والوں کی حد تک فیضِ برکت غرضی قسمتِ واقع ہوئے ہیں۔ ان کے دشمنوں کی بغیر بھی چاہنے والوں سے بھری ہوئی ہیں اس کا ایک وجہ دوستی کے شعور اور اس کے سلسلے میں ان کی روایت پرستی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے بہنِ قرآن (رے) کو تیار رہتے ہیں۔ چند برس پہلے ان کے ایک پرانے دوست بہت بڑے قلعے میں ان کے لئے کھانا کھانے کی تحریروں میں غلطیاں دیکھاں تھیں۔ انہیں جو کام ان کی کوششوں سے طوع و مسلک تھا چاہئے ان سے بعض قریبی دوستوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ کام آپ کے دوست کے لئے کا نہیں ہے۔ دودھ مار رہے اپنے فرائض کو نبی انجام نہ دے سکے تو آپ کی پوزیشن خراب ہوگی۔

فہمیں نے حسب معمول عریف کا ایک لباس گمشدہ کیا اور مونہ کہنے پر اتفاق کیا۔ کوئی بات نہیں ہے بے چارے کو روٹی تو ملنے لگی ہے، بعد میں کچھ نہیں کئے کیا ہوتا ہے۔

کسی اور سے یہ یونہی ہاتھ سے نکل گیا۔ تو فیض نے دو تین مہینے کی باقاعدہ جدوجہد کے بعد ان کے لئے ایک نیا ادارہ قائم کر لیا اور یہ دوست کئی برس تک سب کا اتخاڑ ادارہ کے ساتھ منسلک رہے۔ اس ادارے کا قیام برطانوی سپاہیوں اور یہ کہ یہ ہندوستانی آرائش ہی میں لٹھک کئے اور فیض کے دشمنوں کی طرف سے شہرِ مری کی حالتِ انارکلی میں باقاعدہ شامل ہو گئے۔ اس وجہ سے فیض کے اکثر دوست ان سے ناواقف ہیں۔ مگر

حضرت فیض کے بارے میں ان سے ویسے ہی ملازمین اس لئے کہ انھوں نے "چلو چھوڑ دو" کی بات نہیں۔ "کہہ کر انھیں معاف کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی جب یہ دوست فیض کی مدد طلب کر بیٹھے، انھیں ناپوسی نہ ہوگی۔

انسان اتنی کمزور مخلوق ہے اور حالات نے اسے اس حد تک بے بسی کر رکھا ہے کہ اس معاف کرنے کی ضرورت چارہ نہیں ہے لیکن معاف کرنے والے انسان ہی ہوا اور اسے اپنے آپ پر اتنا قابو ہو تو اس کے حوصلے کی وادریابی ہوتی ہے۔ فیض تو ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ ان کے پاس بیوی کبھی ہمیشہ سمندر کے قریب کا احساس ہوتا ہے بلکہ پایاں وسعت اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سمندر قلاطم اور صانع سمندر نہیں ہے۔ اس کی سطح پر سکون اور مہا آواز اور روشنی اور زندگی کے نئے نشان ملتے ہیں۔ اس ناپید آئنا رسمندری گہرائی میں کون سے اسرار پوشیدہ ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ بات بڑی عجیب معلوم ہو تی ہے کہ ایسا شخص جسے درد سسپتہ اور اس کا بوجھ ایشام کا اس حد تک ملکہ حاصل ہے کہ اس کی پوری شاعری اس کے آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے البتہ اس تو پر سکون اور مطمئن منہر آتا ہے۔ فیض کو کسی سے مل کر تے کسی پر ناراض ہوتے یا کسی کی مخالفت کر تے بہت بہت کم لوگوں نے دیکھا ہو گا، اصل میں وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کا ہر آدمی مطمئن و مسرور نہ آئے۔ اس کو کشش میں وہ اکثر پناہ سکون بھی ہر آدمی دیتے ہیں لیکن اس سے واپس آتے ہوئے انھیں ہشک جلا چھہ ماہ ہوئے ہیں مگر ان کے شناسا اور شناساؤں کے جاملتے اور ان سے ذرا فطرت رکھنے والے اکثر اصحاب جن میں ہر قسم اور ہر شے کے لوگ شامل ہیں ان کے پاس روزگار اور کام حاصل کرنے کے لئے پہنچے ہیں اور فیض کے دوستوں کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کیسے کہے کہ اس سے یہ ان کی سفارشی چھٹیاں لے کر بیٹھتے ہیں سب سے روزگاری ہمارے ہاں اس حد تک عام ہے کہ اس کے متعلق تو کون سے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ بیشتر پرگاؤں اور مگر میں بے روزگار موجود ہیں۔ ہمارے آپ کے لئے لیکن نہیں ہے کہ تمام تنگ خدا شہادت کے باوجود ان کے لئے کام نہیں کریں مگر فیض ساری دنیا کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور حجب الیسا نہیں ہوتا تو اس ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں فیض نے اردو کی جاری طرح سمجھنے کی عادی نہ ہوئی۔ باقی سب کچھ طبیعت کی وجہ سے وہ بیگم کی ہر بات مان لینے کی عادت نہ ڈال لینے تو ان کے فطریں دنیا بھر کے ہیں، بے روزگار اور دلگاہ رنگت قسم کے بے فکر لوگ جمع ہوتے۔ بڑے کہتے ہیں کہ جب درد و دھول کا طلب ہوتا ہے۔

تو قدرت اچھا دھرم سے لے کر بوری کہہ کر چوروں میں توازن پیدا کرنے کا خود اہتمام کرتی ہے، میان اگر بے فکر یا بغفلت حق ہے تو یہی جزو رہا ہوگی۔ ایک کی ناخوارت اندیشی دوسرے کی دوسرے نکا ہوں کی وجہ سے اپنا اثر کو کر بیٹھے گی، فیض اور بیگم فیض کی حد تک یہ مقدمہ معجزانہ طور پر منجھ معلوم ہوتا ہے۔ فیض کی بیگم اگر ایسی ہی جیسے کوئی اور خاتون ہوتیں تو معلوم نہیں اوصوف کا کیا حشر ہوتا۔

جو لوگ عام زندگی میں فیض سے ملنے میں یا انھیں اٹھایا بیٹھا دیکھتے ہیں، انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ فیض اعلیٰ درجے کی فطرت بھی ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ انسانی امور کے متعلق ان کا اندازہ دوسروں سے یکسر مختلف ہوتا ہے اور وہ اپنے انھوں یا ساتھ کام کرنے والوں پر حکم چھلنے کے بجائے پیادہ محبت اور شفقت سے گونام لیتے ہیں۔ یوں تو ہمارے ہاں عام طور پر شاہدوں کو بوجھا کا کا اور کسی ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ فیض تو عام زندگی میں ظاہر اسست اور کمالی نظر آتے ہیں اور بات کو سننے میں بھی جی اوسن بکل سے کام لیتے ہیں۔ جس آگاہی کے گہمی اپنے ہاتھ سے اپنے ناخن تک دکلائے ہوں اس کے بارے میں تعلیمی صلاحیت کے قدران کا فیصلہ کر لینا غلط نہ ہوگا جس زمانے میں وہ جیل میں تھے جب وہ بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ ان کی چھٹی لڑکی میرہ کو کسی پریشانی ہی کہہ ہاں ان کے ناموں کو کتا ہوگا، جیل میں تو خیر شقی ل جاتے ہیں مگر جب وہ واپس آئے تو ان کے ناموں سے ہوئے تھے

اس کے باوجود ان کی تنظیمی صلاحیت کا اندازہ آرٹ کوٹھل لاہور کی حالت سے کیا جاسکتا ہے جن لوگوں نے اس ادارے کی زبوں حالی کا شاہد فیض کے چاروں لینے سے پہلے کیا ہے۔ دوجانے ہیں کہ اس عمارت پر اصطبل کا گمان ہوتا تھا۔ نیشنل آرٹس کونسل کی تصویریں پٹی کی موٹی جھبکی ہوئی تھیں عمارت کے احاطے میں کئے ہوئے تھے، تہذیبی سرگرمیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن فیض کے سہی یہ عمارت لاہور میں تہذیبی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔ دو سال کی مدت میں فیض نے اس کی بنیادوں کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اب اس کے زوال کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

زندگی کے متعلق فیض کا نظریہ انتہائی محنت مندانہ ہے مگر دیکھنے والوں کو وہ ہمیشہ بڑے شوخی نظر آتے ہیں، جب تک دنیا سے دھمکی اور غمناکوں اور کمزوروں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا وہ روتے مڑے رہیں گے۔ مشکل یہ نہ کہ وہ ادب و علم اور منافقت کے خاتمے کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہمسے آپ نے اور ہاں جیسے لاکھوں کروڑوں دوسرے انسانوں نے ان عقیدتوں کو قبول کر لیا ہے جو فیض اندر ہی اندر سنگت ہے۔ دیکھتے ہیں وہ انتہائی "ڈلی" بندے بننے والوں کو تو "بورا" نظر آتے ہیں۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے وہ اکثر مجلس سے باہر نظر آتے ہیں مگر شام کو محفل ہوا کرنے کی انھیں پیشکش دہتی ہے۔ دوستوں سے مل جیتنے اور باز ہو کرنے کے لئے وہ شام کو ہر کام چھوڑنے پر تیار ہوں گے۔ سہی زمانے میں وہ پاکستان کی ناکھڑا لہر کے مہر تھے، ادارے، انجمن، شاہکی محنتوں کے اعتقاد پر، پریس میں کچھ بڑے بڑے موضوعات پر لکھتے تھے، موضوعات کا انتخاب تو ہمیشہ صبح کو ہو جاتا تھا لیکن پریس والوں کو ادارہ رات کے دس گیارہ بجے سے قبل کبھی نہیں ملتا تھا۔ پاکستان "بازرگے" علی کا خیال تھا کہ وہ کام کو آخر وقت تک ملتے ہیں۔ اور جب قرار کے تمام راستے سدھد ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس بوجھ کو اتارنے میں جبر خیال ہیں، رات درست نہیں ہے۔ اصل میں وہ دن بھر اپنے موضوعات کے متعلق سوچتے رہتے تھے اور اس دوران میں غائب، دھمکی کے خلاف ہر سہی کرتے رہتے، دن بھر یا شام کو کھنے والے اور غمناک ہیں ان کے ساتھ بیٹھنے والے انھیں غریب قرار دیتے تو شام کو کچھ کر کے حقیتاً وہ آخر وقت تک اپنے ادارے کے متعلق سوچتے رہتے تھے اور اس کے کچھ کہتے تھے۔

مجلسی زندگی کی محبت اور اس فیض کو لاہور اور امرتسر کے دوستوں کی صحبتوں سے ملی ہے۔ زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے، انھیں دھمکی میں گزارا ہے۔ چنانچہ ان کی روایات ان کے ذہن میں بقیہ میں ہیں میں نے کچھ برس پہلے یہ پیش گوئی کی تھی کہ فیض وطن سے باہر نہیں رہ سکتے، ان کے قریبی دوست جاتے ہیں گو گذشتہ دو تین برس میں لوگوں نے کس طرح انھیں ملک سے باہر کھنک کی کوشش کی، ملک سے باہر انھیں کتنی بڑی تکی پیش کشیں ہوئی، کام اور دولت اور اطمینان و آس و سہی عزت کا پاکستان سے باہر وہ کرا انھیں زندگی کی ہر آسائش میں ہر ہوسکتی تھی۔ ان کے دوستوں نے ہمدردی میں ان کے دوستوں نے اپنی مخصوص معروضات پر بحث ان کو دھمکی سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جس شخص کی روت میں، وطن کی مٹی کی باس ہو چکی ہو اور جسے اس کے بچوں، بہادروں، نگاروں اور اس کے بہتر بہت سے وابہاء عشق سے، وہ وطن کی محفلوں، ہواؤں، دباؤں، خوشیوں اور سہی سے بڑھ کر محفلوں سے کہیے دورہ سکھاتے۔ فیض نے پریس میں حب الوطنی کا جڑی کوٹ کوٹ کر کھرا ہوا ہے اس لئے وہ ملک سے باہر کبھی نہیں رہ سکتے۔ وہ لندن اور ماسکو اور کراچی اور انجمن انجمن میں گھومتے ہوئے بھی، اپنے وطن، اپنے شہر اور اپنے دوستوں، کو فراموش نہیں کر سکے ملک سے دیکھ دو برس کی عزیز حاضری کے دوران انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کچھ کے یہ دن رات انھوں نے کیا کیا ہے اور غریب الوطنی کے احساس نے انھیں کیا کیا کام کئے ہیں۔

عوام دوستی، شہر واد صلاحیت اور تنظیمی استعداد کے باوجود فیض نے بڑا شاندار مزاج پایا ہے چیز انھیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کے

والدین کے پاس بہت آسانی تھی لیکن وہ بھی کیے کو، دوستوں کو اور بیٹے والوں کو گھر بھر پالتے رہے کسی کو لایرٹ بھیج رہے ہیں کسی کو تعلیم دلادے بھی کسی کی شادی کرانے میں لگے ہیں۔ لہذا والد کی وفات کے بعد ناندانی ملکیت کا خاں ماہڑا احمد بیچ کر رقمہ اتار لیا، فیض کو اپنی دراشی جاگیر سے عملہ شاہانہ مزاج کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اس کے باوجود مزید مصیبتوں کی مدد کرنے میں ان کو بڑی سرت مٹی ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ ان کے دوست ہیں اور جس لڑکی سے عشق کر رہے ہیں اس کے والدین شادی کے لئے رضامند نہیں ہوتے تو فیض رشتہ طے کرانے کی خاطر خود ساتھ چلنے کی پیشکش کر دیں گے، ایسے دوستوں کو کلامت بھی کریں گے جو ناکام عاشقوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں۔ غالباً وہ ان کے دکھ درد کو ذاتی طور پر محسوس کرنے میں اور اس کرب میں خود کو مبتلا پاتے ہیں۔ جو قبیلہ عاشقان کے لئے مخصوص ہے ان سے اور کچھ نہیں بن پڑتا تو نامراد عاشقوں کو ایک آپ کر کے اندر و بارہ قسمت آزمائی کرنے کا مشورہ ضرور دیتے ہیں۔

ان کے شاہانہ مزاج کا ایک دلچسپ قصہ اور سن لیتا۔

ایسے کرنے کے بعد جب انھیں ایم اے میں داخلے کے لئے ٹھہرے چنے میں تو لاہور پہنچ کر انھوں نے کل قسم جن میں نوشہی اور 'ہاؤ ہو' کی تذکرہ گوی جو کچھ بچا وہاں پہنچ کر یہ جھلک بہت کم ہے اور اگلے کے لئے مزید دوسروں پر درکار ہیں۔ ان کے پاس صرف نو روپے بچے تھے۔ معلوم ہوا کہ عربی ایم اے کلاس میں داخلے کی فیس نو روپے ہے چنانچہ انھوں نے سو روپے بیک کر کے انگریزی کے کلاس عربی ایم اے میں داخلہ لے لیا اور دو ہال بورس کے اسے بعد تھرا انگریزی میں ماسٹری ڈگری حاصل کی۔

فیض کو کوئی کام: برادر انھیں گھر ہی پر بدبنا ہو تو وہ بڑے محتاط سے دن گزار دے، شفا دیر تک ستر میں بیٹھ کر چائے پیتے رہیں گے، اخبار پڑھتے رہیں گے۔ اور مرنے کو کرتے رہیں گے، فرصت میں ہی ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ نہانے سے بصورت حتیٰ الامکان گریز کرتے ہیں۔ بلکہ کے اصرار پر بادل ناخواسہ عسلی ذکاوت کرتے ہوئے بھی حذر و پرہیزیں لگے کہ کیا نہانا ضروری ہے۔ البتہ شام کو وہ اکیسے نہیں بیٹھ سکتے جب دوزخ و شب شہ ہیں اور شفقت کی سرنی آسان پر چھا جاتی ہے اور رات تاریک کی سیراز دہیز پردہ لے کر لپکتی ہے تو وہ اس کی تہ کی ادھماٹے اور خاموشی اور ویرانی سے بچ لگنے کے لئے زخری کے کھوں کو تھیلنے کی خاطر اور پرانے جنسوں کو ڈھانپنے کے لئے رندوں کی محفل سے تلاشی ہوتی ہے، ایسی محفل جہاں ان کے جیسے لوگ ہوں جہاں سن کی عشق کی محبت اور مسرت کی باتیں ہوں اور جہاں ٹیٹھے پیٹھے رات کی گراں باری کے ختم ہونے اور صبح کے سخیلے تدموں کے پہنچنے کا ہراس سبب تیز تر ہو سکے۔

۔ کیا تم اپنے شوہر کی شاعری سمجھ لیتی ہو؟۔ یہ سوال مجھ سے

اکثر کیا گیا ہے، اور میں نے کافی غور و خوض کے بعد اس کا ایک ایسا جواب ڈھونڈ دیا ہے جو میرے خیال میں صداقت پر مبنی ہے اور حریف آئندہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ میں ان کی شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کرتی، لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں شاعر کو سمجھتی ہوں۔ اور کسی شاعر کی شخصیت ہی اُس کی شاعری کا سرچشمہ اور اس کے وجدان کی قوتِ محرکہ ہوتی ہے۔

۔ ایسے فیض

شیر محمد حمید

فیض۔ اسی نے ملک بھر

’دست در پہلو‘ کا شاعر کسی رسمی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی شاعری اس مقام سے بہت آگے بڑھ چکی ہے جہاں شاعر فقط دہشورہ کا عالم نہ رہتا ہے، فیض بقدرت کو بہت بلند سطح پر پہنچا تھا۔ اس کی شہرت پاک و ہند کے نیم براعظم سے نکل کر دور دورا جنوبی ایشیوں کی، برصغیر کو پھیل چکی ہے۔ اس کی آواز کی گونجیں اس کا منفرد اسلوب، نرم و رواں لہجہ، میک و شیریں، استعارے، قبول عام کی سادہ سہل سرچھپی ہیں، لیکن ان سطروں کی تحریر کا متعین فیض کی شاعری کے خاص و معائنہ کا بیان اس کی شاعروں عظمت یا جمہور میں اس کے مقام کا قیاس کرنا نہیں ہے۔ یہ ہم کو رہا باب نقد و نظر کا ہے۔ اگر تم کو یہ محکمہ یا مواد زیرِ ملاحظہ نہیں ہے اور میں اس کا اہل بھی نہیں ہوں، میری غرض غایت صرف یہ ہے کہ فیض کی زندگی کے چند چیدہ چیدہ سکرے ایسے اہم واقعات سرسری طور پر بیان کروں جو میرے خیال میں اس کی زندگی اور اس کی حیاتِ شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں جن کے باعث فیض کے خیالات اس کے طرزِ زندگی اور اس کے مطلق نظریاتی انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان واقعات کی اہمیت سمجھ لینے سے اس کی شخصیت اس کے مقاصد اس کے نقطہ نگاہ کے تغیرات اور شاعری کے موڑ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

فیض کی پبلک زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز کے اجراء پر اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے صحافت اور سیاست کو دینا، ان کا نام خاص و عام کے سامنے آیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند چلا اہل نظر کے سامنے ہے۔ اس کے شب و روز اس کا رہن سہن اس کے طور طریق کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ وہ جو کچھ ہوتا ہے اخبار کے ایڈیٹر ریل گاڑیوں میں، عوامی مجالس یا نجی مجالس میں پیش کرتا رہا ہے اس کے محسوسات شعور کی قلاب میں دھل کر غماص و دعام کے حق پرستی، ان لوگوں میں پہنچنے رہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے حقیقت بڑا نکاہوں کے سامنے ہے۔ لیکن فیض کی اتنا ہی زندگی کے بعض اوقات ایسے ہیں جو ملک عام نکاہوں کی رسائی نہیں۔ اس کے آغازِ بلوغت کے اکثر حادثات نفوس سے اوجھل رہے ہیں ان کی اہمیت عام دلچسپی کا زبانی ہو لیکن فیض کی شخصیت اس کے مزاج کی ساخت اس کی طبیعت کی اتنا اس کے سوچنے کا انداز، اس سب سے بڑھ کر اس کی شاعری کا رنگ روپ سمجھنے کے لئے ان کا علم بہت ضروری ہے۔ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اس کی شاعری اس کی دلی زندگی کا عکس اور اس کے گرد و پیش کا آئینہ ہوتی ہے۔ راقم الحروف کو فیض کے اس دورِ حیات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے

اس کی سروسوں میں شریک: دینے والے اس کے غلوں میں غماں کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ پردوں کو ہٹا کر اس کو دیکھ کر خوشیوں کو دیکھنے میں لانا میری واقعی بات ہے اور شرف بھی اور میری اس بڑھ سرائی کا مزہ بھی جمانے ہے۔

۱۹۶۹ء میں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تھوڑا سا علم تھا۔ چونکہ فرسٹ ایئر میں ہی اس کالج میں داخلہ لیا تھا اس لئے دو تین برس کی مدت میں دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ ان میں چند شخص اور ہم خیال دوست ایسے بھی میسر آئے تھے جن کی دوستی اور ملاقات پر اب تک فخر ہے۔ ہماری رہائش ان دنوں نیو ہوسٹل میں تھی۔ اور آخر کو تو یہ ایک شام کا ذکر ہے کہ ہم سیر کے ارادے سے نکلے، چونکہ قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک لڑکا جیلے کا سہارا لے دیا دھاڑتا ہوا ہے بے خبر، حکومت کے عالم میں ملکی لٹائے کھڑا کہیں دور دھندلوں میں دیکھ رہا ہے۔ ہم اس کے بہت قریب آئے، مگر اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے دوستوں کو بتایا کہ کئی روز سے میں اس نوجوان کو ہر شام اسی جگہ پر نہیں دیکھتا تھا تو اس نے کہا کہ وہ اب یہاں نہیں۔ نئی اگلی نے معاہدہ آؤ آج ہم اسے دوست بنائیں۔ ہم نے پاس جا کر سلام کیا مہاسین نوجوان بدستور خود فراموشی کے عالم میں کالج ٹاور سے بھی پرے نظر جائے کھڑا رہا۔ نئی اگلی نے بلند آواز سے دُہرایا جناب اسلام علیکم! وہ دیکھنے سے اس کی شدت کی کیفیت سے بیدار ہوا۔ نیم باز آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور خفیف سی مسکراہٹ سے۔ دُعا علیکم اسلام کہا۔ میں نے کہا: ”گستاخی معاف ہم نے آپ کی نوعیت میں غل ہونے کا تصور کیا ہے“ اسے ہماری مجبوری سمجھنے، ہم آپ کی تعریف جانتے کے مشتاق ہیں۔“

”میر نام فیض ہے پہلے مرے کالج سیالکوٹ سے آئے اسے پاس کیا ہے اب یہاں گورنمنٹ کالج میں تھوڑا سا دھندلا رہا ہے۔ اور نیو ہوسٹل میں جا رہا ہے۔“

”میں بھی تھوڑا سا رہا ہوں۔ میرا نام شیر محمد ہے۔ یہ نئی اگلی اور فوڈنگ آئی میں ہیں۔ یہ آغا حمید ہیں ہم سب اسی ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ مگر آپ یوں تو تنہا کیوں کھڑے رہتے ہیں؟“

”میں نووارد ہوں۔ یہاں میرا کوئی دوست نہیں۔ شناسا بھی نہیں۔ میں سیالکوٹ سے آگیا ہوں۔“ نئی اگلی نے بات بڑھاتے ہوئے کہا: ”تو آئیے آج سے ہم باہم دوست بن جاتے ہیں۔“

تو دن اور آج کا دن، تیس سے اوپر برس ہو چکے وہ دوستی اب تک برقرار ہے۔

تھوڑے دنوں میں ہم آپس میں گھس مل گئے، اجنبیت اور غیرت کا احساس بہت جلد مٹ گیا، کم گو، کم آمر فیض کی مجاہد شخصیت ہماری غفلت کا ایک قیمتی سرمایہ بن گئی۔ وہ اب بھی تنہائی پسند تھا۔ اس کے کھوئے کھوئے رہنے کی کیفیت اب بھی موجود تھی۔ سرگرمیوں کے درمیان ہوتا تو تھوڑی سی چھٹی بھڑ سے بے تکلف جینے لگتا۔ اس کی بڑی بڑی ٹھونڈا آنکھیں جو عموماً کھنی دلدل پلوں میں چھپی تھیں وہ حالات میں رہنے کی عادی تھیں، یوں چمک اٹھتیں تو کیا قدمیں روشن ہو گئیں، یوں پر مسکراہٹ کہنے لگتی، رنگ رنگ سے سرور و محبت کی کرنیں پھوٹ پھوٹ پڑتیں، مسرت کے فوڈ سے چہرہ نکھر جاتا، رخسار نکھر رہا جاتا۔ یہ فیض اس فیض سے قطعی مختلف تھا جو عام طور پر اس آداس نظر سے لے پہلو میں دیکھا جاتا، بسائے چپ چاپ بیٹھا نظر آتا تھا۔

فیض کے مزاج کا غیر صاف منظر سے ترکیب پایا ہے ان میں اجزائے غالب، طاقت، ملائمت، مٹھاس اور بے نیادی کے ہیں

ان میں پہلا 'سحر پرستی' اور دوسرا ان کے رنگا رنگ پھیلوں کا اس اس جو بصورت تناسب یہ ملا دیا گیا ہے کہ اس کا حاصل وہ لطیف و شری آئینہ ہے جس سے فیض کا دل عبارت ہے۔ لطافت و رنگینی کی ان دیزیتوں کے نیچے کہیں دھند ایک چنگاری ایسی بھی دہی ہوئی ہے جس کی دھیمی دھیمی آواز ہے اس کا سینہ گرم رہتا ہے۔ بیشتر یہ چنگاری اپنی ہی راکھ میں دہی سلگتی رہتی ہے۔ دیکھنے والوں کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی یہ بھڑک اٹھتی ہے تو اس سروراکھ سے وہ تند و تیز شعلہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی جلت اور تمازت سے فیض کا سینہ شدت تک آتشزدہ ہوتا ہے۔ اس آتش سوزاں کے سروراکھ کے لئے طویل عرصہ دھکا دھکا ہوتا ہے۔ یہ چنگاری عشق کا وہ جذبہ ہے جس سے فیض کی فطرت میں حرارت اور ہوس ملامت ہے۔

فیض شدت سے چاہنے والے ہیں۔ اور اسی شدت سے چاہے جانے کے مستحق بھی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ ان کے دوست بھی اسی دواہانہ انداز میں انہیں چاہتے تھے۔ محبت کا جذبہ فیض کی زندگی میں مرکزی ٹوک کا دھجہ رکھتا ہے اپنی عمر میں اس نے کئی بھر پور عشق کیے ہیں مختلف حالات و ادوار میں ان معاشقوں کی نوعیت بدلتی رہی ہے لیکن اس کی دسعت اس کی گہرائی اور گہرائی کی شدت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ اس کے تمام فیض کی شاعری میں اس کی نجی زندگی میں اور اس کے چہلک گدھا میں جا بجا تا بندہ ہیں۔

حسن اتفاق سے ہم سے اکثر دوستوں کو شعر و سخن اور علم و ادب سے کچھ نہ کچھ لگاؤ تھا۔ چنانچہ کالج کی علمی ادبی مجالس میں بھی شریک ہوتے اند کئی بحثوں میں بھی شعر و سخن کا چہ چار تھا۔ ہمارے ذوق و شوق نے ایک نئی راہ یہ نکالی کہ ہر توار کی شام کسی ایک دوست کے گھر میں ادبی محفل جہتی، پہلے سے دینے ہوئے شعر و طرح پر ہر شخص انفراداً شریک کرتا۔ جن دوستوں کو شعر گوئی سے چنداں نہ تھا وہ بھی ملک ہندی اور قافیہ پائی پر مجبور تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ سب لوگ باری باری اپنے شعر پڑھ چکے تو ان میں سے انتخاب کیا جاتا۔ کسی ایک کسی کے دو شعر چن لئے جاتے اور پندرہ سولہ اشعار کی ایک دوہلی برداشت غزل مرکب تیار ہو جاتی جو احباب کے نام سے کالج میگزین رادی میں چھپنے کو بھیج دی جاتی تھا ہرے کہ اس غزل مرکب میں دو تین شعور جان غزل بھرانے کے مستحق ہوتے فیض کے غنچے کی پیداوار ہوتے تھے۔

دن اس بچہ پر گزر رہے تھے۔ فیض کا نام احباب کی محفل سے نکلا کہ ہر سال کالج کی مجالس میں بھی چکے لگا۔ ہم فوراً تھائیں میں تھے۔ کالج میں انھوں کی ادبی مجلس بنم سخن کے نام سے قائم تھی۔ قاضی فضل الحق مرحوم اس کے صدر میں سرگٹری اور آغا محمد معاون سرگٹری تھے، مہینہ میں ایک دو اجلاس ہو جاتے۔ فیض ہمارے دسمت راست تھے، کئی ہنگامہ خیز جلسے اور محفلے کشتا کو بولتے۔ لیکن ظاہر ہے ان کی نوعیت عوامی اور پنجابی ہی تھی۔ مقالہ نویس نے مقالہ پڑھا وہ دبا ہوئی اور اجلاس شور و غوغا میں ختم ہو گیا۔ غرض کہ اس طرح کی ہنگامہ آرائی پسند نہ تھی۔ باذوق طلباء بھی مطمئن نہ تھے۔ پروفیسر بخاری مرحوم در بان ہمارا خیال یہ کہس کا نام آیا؟ بالخصوص اس قسم کی ہٹ بازئی کے سبب خاطر تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس قسم کی غوغا آرائی سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ مگر اس محسوس کرنے کو سوچنے اور عمل کرنے میں زیادہ قید نہ تھا۔ کالج کے ہونہار باذوق طلباء سے رابطہ پیدا کیا۔ انہی کی تمام اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی اور مجلس کا قیام مل گیا۔ مجلس کے اہدائی ارکان میں فیض۔ راشدہ آغا محمد، سید رشید احمد، نبی احمد، عمر فاروق اور انجم انور ذوق کے علاوہ چند طالب علم اور تھے۔ مجلس کی نشست باعوم بخاری صاحب کے دو سنگمہ پر ہوتی۔ ہفتہ کی شام اس کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ بخاری صاحب کے ایما پر ان کے چند نامور دوست مجلس کے ہر اجلاس

میں حضور مدعو ہوتے۔ ان میں جناب عبدالحمید سادک مرحوم، جناب امین الدین تاج، ڈاکٹر تاثیر مرحوم، صوفی تہتم، مولانا چاند صاحب حضرت اور حضرت حفیظ صاحب اندھری کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ اجلاس خاص غیر رسمی نظام میں منعقد ہوتے۔ جو پہلے آیا مونیہ پر بیٹھ گیا جو بعد میں پینچافرش پر چم گیا۔ اس میں استاد و شاگرد اور صحبے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ ایک طالب علم کو صدارت سونپی گئی۔ دوسرے نے اپنے پسندیدہ موضوع پر مقالہ پڑھا، سامعین نے بعض امور کی وضاحت طلب کی سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نفیس موضوع پر کوئی اپنے اپنے خیال اور نقطہ نظر سے روشنی ڈال رہا ہے۔ نکتے اٹھائے جاتے ہیں، گڑبہیں کھل رہی ہیں، مشرق و مغرب قدیم و جدید کا ہر نظریہ پر کھجا جا رہا ہے۔ ہر تہذیب و تمدن پر منظر زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ شاگرد پوچھ رہے ہیں، استاد نکھٹاں سلجھا رہے ہیں، صدر مجلس، فاضل بزرگوں میں سے ہر ایک داد و تحسین دے رہا ہے۔ لیکن بخاری کی روش سے کہ ہر سمت جاری و ساری ہے، جب چاہا اور جہر چاہا بحث کا رخ موڑ دیا، کوئی پہلو، جھل اور بڑی روش نہیں چھوڑتے۔ ڈیرہ دو گھنٹہ کی اس گفتگو میں موضوع ہر رخ سے احاطہ کر لیا جاتا۔ اس کے بعد شرع کو طالب علموں سے ناز کا کام سنائے، کامیاب لہو پوتا، نظم یا غزل ایک ایک، نند ایک ایک، شعر ایک شعر، دادی دی جاتی اور اصلاح بھی کی جاتی۔ آخر میں معزز زبان، نظم یا غزل سناتے اور دو اور دعائی گھنٹہ کی نشست کے بعد مجلس ختم ہو جاتی۔ بخاری صاحب کے دو گھنٹہ سے نکتے تو ہم لوگ انشراح قلب کی کیفیت محسوس کرتے، وہ دولت جو بزرگوں کی مشقت سے بھی حاصل نہ ہو سکتی، ہم ان دو گھنٹوں میں جھولیوں سے بھر لاتے۔

یہ کہنا فدا بھی مبالغہ آفرین نہیں کہ فیض دوسرے روش کی طرح، نفیس کے دل و دماغ کی مساحتیں ہیں، اٹھارہ سوئیں فکر کے گوشے ہیں، منہ سوئے، تخیل کا نورخام اسی میں بھی کند ہوتا۔ جذبات اور احساسات نمودار ہوتے۔ ان میں بوج، الجھک و صحت و گہرائی اس پیر معاش کے فیضان نظر سے پیدا ہوئی، فکر و تخیل کے مرنے، نواز، نواز نے روانہ کے رنگ و ڈھنگ، فنک پیا پیا کے انداز اسی چابکدست استاد سے سیکھے۔ بخاری کی نظر میں یہ خاص مسئلہ تھا کہ جو سر قابل جہاں کہیں جی چھپا ہو وہ غنہ دینی تھی، میرا جو بھر کو جلا دینے اور آب و تاب غنہ میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے، منتخب شاگردوں میں سے بخاری کی محبت و شفقت نے فیض کو ایک خاص مقام بخش رکھا تھا۔ فیض جو سدا کے لادے میں بخاری کے، لادے رہے۔ استاد و شاگرد میں جو تعلق خاطر مجلس کے زمانہ میں پیدا ہوا عمر جہر قائم رہا اور نیا زمانہ کی درد دہی کے مراحل سے گزر کر بے کھٹکی کی مددیک بڑھا۔ بخاری کی موت نے اسے ایک مقدس مدفن کا درجہ دے دیا ہے۔ صوفی تہتم اور نفیس کی دوستی بھی اسی قبیل کی ہے بلکہ اسی منہ کی زنجیر کی ایک پائیدار کڑی ہے فیض نے ایک کھاتے پیچہ ستر اور خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی، بچپن ناز و نعمت میں گزرا، آدم و آدما کشاکش کا کوئی نازہ ایسا نہ تھا تو مینا نہ ہو۔ نوکر چاکر خدمت کو موجود، شفیق ماں باپ کا درت محبت سر پر، چھائی بہنوئی کا پیرا دستہ سبز وہ ماحول تھا جس میں نفیس بڑھا، پلا اور جوان ہوا۔ اپنے اچھے کام کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی، کسی خواہش کے رد ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت میں ایک طرح کا ناز، ایک جذبہ پندار، ایک حس، اس غرور و فخر پر پیدا ہو گیا۔ تن آسانی اور سہل انگاری کی خواہش کا جذبہ نہ گئی

گدگدنت کا لہجہ آئے تو کابلی، تن آسانی کی عادت اور بے نیاز کی ادب اور موجود تھی۔ انہی خصوصیات سے بے نیاز انہی چیزیں اور اپنے کپڑے یک سہاں کر رکھنے سے لاپرواہی۔ ان کا کمرہ کبار خانہ، خانہ، خانہ، شیش کرتا۔ لباس کچھ ڈھنگ سے سر پہنتے، تیتی سوٹ سوٹوں سے بھر پور، جملے پالش سے بہرہ، ہتھیوں حجامت نہیں بنی، اور کئی کو دن بھر شید کے گزار دیے۔ ماں باپ

بھائی بہن کو جو نہیں تھے کہ ان کے کام وہ کر دیتے، پرانے خدمت کار بھی ساتھ نہ تھے کہ ان کے بکھرے ہوئے سامان کو سلیقے سے لکھ دیا کرتے اس پریشان حالی پر کوئی سرزنش کرنے والا بھی نہ تھا، چنانچہ فیض کے روزمرہ میں کوئی سلیقہ کوئی تحریر اور سفار کی کوئی صودہ پیدا نہ ہو سکی۔ اس پر مزید یہ کہ دل میں کسی انجانے درد کی کسک لے، کوئی پوشیدہ درد چھپائے کسی گہری سوچ کی تھکان سے متعلق، کم سے کم اور چپ چاپ پڑے رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادا ہری لکھ رکھا ڈھب سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ میں سمٹ گئے، تنہا، کھوئے کھوئے اپنے سوچ کی گہرائیوں میں غرق رہتے۔ ان کی اس کیفیت سے ہم لوگ اکثر گھبرا جاتے۔ ان کو چھپتے بھلاتے کہیں دیر میں جا کر وہ خفیہ سی مخصوص سکڑا ہٹ ہون پر نمودار ہوتی، آنکھوں میں دہیے سے جھلکتے اور فیض اپنے نول سے ہاتھ نکالتے۔

ساہلی اور تنہا آسانی فیض کی طبیعت میں یوں پس گئی تھی کہ اس کے ہاتھوں اس نے غریبوں کو ناگوار نقصان اور پریشانیوں اٹھائی ہیں۔ شادی کے بعد ان کی بیگم کی ان حالات کے باعث کافی پریشانی رہی ہیں۔ یہ صرف بیگم کی انتھک سرائی اور بے مثال صبر و حوصلہ کا ثمر ہے کہ اس خفیہ کی زندگی میں کچھ باقاعادگی اور قدر سے ترتیب نظر آتی ہے۔ ورنہ ان کے دوست تو ان کو بالعموم سے سمجھ کر چلے گئے۔ بلکہ ان کے احباب اور استاد ان کو رویوں کو فیض کی طبیعت کا ایک نرم و شیریں پہلو سمجھ کر اس سے پیار کرنا سیکھ گئے تھے۔

فیض اس حد تک کم گو ہیں کہ دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کر نہیں کہا جاتے، سب سے زیادہ کھنڈر پر پاہوں اب بند رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ دکھ میں آنکھیں ہلکے، جہان میں خوشی میں ہونٹوں پر خفیت ہی مسکراہٹ آجائے گی۔ دوستی کے ابتدائی مہینوں میں یہ صودہ حال مجھے سخت کھنچ رہی۔ میں محسوس کرتا کہ اتنے قریب ہو کر بھی فیض مجھ سے بہت دور ہیں۔ بات چیت میں جب بھی اس چیز کا ذکر کیا، فیض مسکرا کر چپ ہو رہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرے مہر و خواہش کی فتح تھی کہ فیض نے آخر کار اپنے رازوں میں مجھے شریک کر لیا۔ اور میں ان کی خاموشی کا مفید انداز ان کے دکھ درد کے سرسبز اسوار سے واقف ہوا۔ یہ راز ایک ٹھنڈا خون سے فیض کے جذباتی بگاڑ سے وابستہ تھا۔ زندگی کے آغاز و غمت کی سحر تھی۔ جو حسن کی دیوی ہزار ہند ہزار۔ رعنائیوں میں مٹنے، عمل دیا میں بکھرے تھیں، اور عشق کا دیوتا لڑکپن کے معصوم کھیلوں سے گزر کر شادی اور بے انکساریاں لے رہا تھا۔ بیداری کے پہلے ہی۔ حریف، اس سے پہلے پیر کھایا کہ دل دیگر کو برساتا، جس پاؤں میں ترازو ہو گی، وزن اتنا کاری تھا کہ رنگ سے ہو چکا۔ درد کی کسک اتنی تیز تھیں کہ اندلہلہ تھی کہ شہیدانہ نے اس کو نہ مایہ نیات جزیلا لیکن انصاف چاہا، اس حد پر سمجھ کر دیا کہ نظر بھر کر محبوب کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ بس وہ خساں اور کھٹا بہرہ کی بناوٹ میں سے بے نیاز رہا۔ کہ وہ منہ کے نشیب و فراز اور دم کے دلاؤ و زرخیز پر نگاہ نہ کی۔ محبوب اس بناؤ بیان کرنے بیٹھا ہے تو رگد دیو کے طوفان اور فرد و حکمت کے سیلاب میں راستہ بھول بھول جاتا ہے۔ نہاب کے پھولوں کی رنگینی، یا سین کی نکبت، ریشم و مخمل کی نرمی، امر و مہر کی سپیدی، بجلی کی بے قرار چمک، در نہاب کا، غصہ اب کچھ ایسے ہاتھ افراٹ کا دلاؤ و زرخیز مادہ ہے جو فیض کے حواس پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے تصور میں جس کی کامنات اسی بہشت رنگ ہو کا نام ہے۔ محبوب کا پیکر اسی فرزند سے مہنت ہے کہ وہ مرغوب و دلہندہ زلفا ہے جس میں فیض کو کھلنا چاہتا ہے اسی کا ذکر محبوب کا ذکر ہے۔

اپنے انکار کی اشد عمار کی دینا ہے یہی

جان مضمون ہے یہی شاہد مضمون ہے یہی

رنگینی دنیا سے
 دھتکا ہمداد لے کر
 ترسی ہوئی نظروں کو
 فریاد کے گلزدوں کو
 راتوں کی خموشی میں
 بخور جلائی گئی

بایکس سا ہو چانا
 تنہائی میں کھو جانا
 حسرت سے جھکا لینا
 آہوں میں چھپا لینا
 چپکے کمرے میں رو لینا
 ملبوس خود گھول لینا

جسے غزدر ہندوستان پر پڑے ہی تھیں، تو دوسری سمت شاطراں لکھنے کی گہری چالیں بل کی ہا۔ سیاست میں رہنے والے رہا تھیں، ان دو بھائیوں کی پے در پے شہر سے بچتا شواہا بل کے لئے آسان تھیں نہ تھا۔ جین سکریٹری کی ہر وقت مدد اور ہر عمل مشورہ سے ہر نادک مرحلے پر امیر کے آڑے آتے رہے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ لندن میں سفارت کے عہدہ کے لئے ایسے مستعد اور قابل شخص کی ضرورت پڑی جو لندن اور کابل کی سیاسی گتیاں بطریق احسن سلجھا سکے گا، بل ہو، چنانچہ نظیر انتخاب پھر سلطان محمد خان پر پڑی۔ بڑا ٹھیکوٹینسی سلطان محمد خان حکومت کابل کے سینئر کیرئیر کر ملک و کٹورہ کے دیار میں پچھپچھاتین سال تک عہدہ جلیلہ کے فرائض کمال خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ اپنے قیام لندن کے دوران، سفارتی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ انگریزی زبان میں امیر عبدالرحمن خان کا سوا، انگریزی کی بگڑتائی نہیں تھی بلکہ ان کی زبان کی۔ لندن کی سفارت سے سبکدوش ہو کر واپس لوٹے تو کابل دربار کی سیاست میں بھی نئے عنصر ابھرتے تھے۔ آپ کی ماہر انگلیاں انہیں اچھے ہوئے مٹاؤں کو سنبھالنے میں لگ گئیں، انہی دنوں افغانستان کے ایک دلدرا قزاقہ سرحدی علاقہ میں بغاوت ہو گئی۔ سپہ سالار کی سبکدوشی قوت کا نام ثابت ہوئی تو اس بغاوت کو سلطان محمد خان کی حکمت عملی نے فرو کیا، بلکہ سردار غلام محمد کی لڑائی بھی ان کے ذہان میں آگئی۔ سپہ سالار کو کسی دو گونہ شکست کا شدید احساس ہوا، محمد علی آگ سے جل جھٹ گیا۔ ابھی یہ واقعہ تازہ تھا کہ بیرسٹری اور جلاؤں اور احمدی سازشوں نے زیادہ شدت اختیار کر لی۔ اس افراطی اور اندھے گردی کے عالم میں سلطان محمد خان کی جان سخت خطرے میں پڑ گئی، بھرا بھرا کھڑا کھڑا رات کے اندھیرے میں پہلے لکھے اور پڑ کر جان چھوڑ دی۔

سیالکوٹ پہنچ کر اس مرحلے پر جتنے جہد و کوشش تھیں، پھر پڑی ہا، بھی، کامرائے کے سمار شدہ محلات کی یاد کو بھلا دیا اور نئے ایٹ کار سے نئے زندگی کی قیمرہ آغا کر لیا۔ بیرسٹری پاس تھے، مکان کرایہ پر لیا اور ولایت کا بورڈ ورک کر بیٹھ گئے۔ بہت دھن دھن کے سہارے دیکھتے دیکھتے ایجنٹ بیوروں میں ممتاز جگہ حاصل کر لی۔ دولت کی دیو بھی پھر امیر ہو گئی۔ عزت و اعتبار کی دولت سے پھر مالا مال ہو گئے، بچے لکھ، بگڑت، ریشا دیاں کیں اور اولاد کی نعمت فراوانی سے ملی۔ سیالکوٹ میں ان کا کام اور دام خوب خوب چمکا، روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ گھر کا ٹھانڈا امیر نہ رکھا۔ جتنا کاتے اس سے بڑھ کر خرچ کرتے، عزیزوں، رشتہ داروں، عزیزوں اور محنتیوں، سب کی ریشتری کی، سب کے آڑے وقت پر کام آئے، بچوں کی تعلیم و تربیت کا انداز شہزادوں سے کسی طور کم نہ تھا۔ ان کی دیکھ بھال، ان کا آرام و آسائش، ان کے چاؤ پھلے سب ریشا نہ تھے، دنیاوی دجا بہت کے ہول میں بھی کوئی کسر نہ رہی۔ ان کا بہادر ہوئے، ڈسٹرکٹ بورڈ کے پیسے غیر سرکاری چیر میں بنے، سرگودھا میں پانچ مرتبہ آرمی حاصل کی اور کابل عیاشان کی تیکہ کر لیا۔ فوراً فوراً ان کا دار ہار، سونے و ریشتری، کمر، جینز اور نگرانی، سب سے بڑے سرمایوں دھڑ دھڑانکا، کافر کے بھاری بوجھ ملے آئے۔ ریشتری ایسے تھے، ریشتری کی چند ماہ کی آمدنی سے سارا قرض چکا دیا جاتے تھا۔ غیب کا علم کسے ہے؟ ناگہانی موت نے سارے منصوبے ختم کر دیئے۔ باغبان کے اٹھ جانے سے ہر ایسا باغ و دیوان ہو گیا۔ جگہ جگہ محل زمین پر آ رہے۔ چوت آقا ناگہانی اور اتنی ہی تار کی تھوکر سنبھالنے کی کوئی آس نہ رہی۔

کچھ وقت گزرنے پر اہل خاندان کے جو اس محکمہ ہوئے تو عزیز و اقارب اور بی خواہ سروکار کر بیٹھے، مرحوم کے ترکے کا جاننا دیا گیا، مختلف دھندوں میں شکات گئے بھاری سرمایہ کچھ کوئی دستاویز اور کوئی تحریر کی بیوت دستیاب نہ ہو سکا، ہر طرف سے صاف

بلشے پاس کر لینے کے بعد ہم لوگوں نے ایم اے کے ستر میں داخلہ لے لیا۔ فیض انگریزی اور میں تاریخ پڑھ رہا تھا۔ لیکن مایہ کے اوقات کے بعد جلد ہی وہ اوقات گزرا کرتا صرف شب خالی کے لئے فیض اپنے مکان پر سے ہاتھ۔ یہ علم مجھے بہت بعد میں ہوا کہ ان دنوں رات کے چند گھنٹے وہ کسی پٹائی پر لیٹا رہتا تھا اور اس میں گھٹے پڑھتا تھا کام کرتے رہے ہیں جس سے جیب خراب اور سڑنہ مزہ ضروریات کے لئے کچھ رقم کماتے تھے۔ صورت سمرانی کے رنگ میں گویا

سہ مشق سخن جاری اچلی کی مشقت بھی

فیض کی حیات معاشقہ کے یہ دو سال بظاہر سپاٹ اور بے رنگ تھے۔ میان و تلام کے کھابری ٹٹا نہ تا پید تھے۔ مگر دل کی گہرائیوں میں یاد باقی تھی بے کسی کی دلیاں، ہمدی یہ کوشش کہ فیض عشق و محبت کے اس عازر سے نصیب کیوں نہ کر اس کا اعجاب نوش آئند نظر نہیں آتا تھا بظاہر کامیاب معلوم ہوا رہی تھی مگر حقیقت میں انہوں نے اپنے جذبات کو بقول سیر محمد اسلمی کہ فریاد (CANOUFLAGE) کر لیا تھا اور کسی مواقع وقت کے انتظار میں تھے۔ دن کو یہ سمجھا کر خاموش کر لیا تھا

سابقہ روزگار۔ پاک اٹھ گئی محفل

اور کچھ روز اٹھا رکھتے ہیں پٹا اپنا

ایم اے کر لینے کے بعد میں تو کافی پتہ آیا سرکاری ملازمت کی ہوس اور شہر کی زندگی کی دلچسپیوں سے ہندو کرنا چنے چھوٹے سے شعبہ اراضی سے دہلی کے ٹیکس میں ٹیکس کی ذمہ داری بہت بڑھ چکی ہے۔ اور میں اس کا نمک سے باہر نہیں نکلا۔ فیض نے انگریزوں میں ایم اے کر لینے کے بعد دہلی کی ایم اے کلاس میں داخلہ لے لیا اور ایک سال میں حرفی ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ میرے گاؤں آجائے کے بعد فیض کے دن رات باغیادہ جھگڑا مونی تسم کے ذمہ دار روڑوں کے مکان پر گرلا۔ ہر شام وہاں پارک میں محفل جمع ہو جی ڈاکٹر تاشیر خلیفہ جالندھری، اچانک حسن حسرت، حفیظ ہوشیار پوری، انجم اور سید فیروز بخاری مرحوم اکثر شریک رہتے۔ ان محفلوں کی نوعیت جہاں آفریقی اور شریک پید کی تھی، جہاں مادی و ادبی گفتگو تھی یہ بھی تھی۔ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں بھی چھوٹی تھیں۔ اور شعروں کے جھگڑے بھی نہ ہوتے۔ کیا وہ دور ہے صبیحہ " نیاز مندان لا حولہ " کے نام سے ان یاروں نے دہلی اور لکھنؤ والوں سے یادگار حرکتیں کیں۔

تسم سے فراغت پاچنے کے بعد فیض کو روڈ کار کی تلاش ہوئی۔ انہی دنوں اتریں دہلی کی انجمن اسلامیہ کا ایم اے ایم اے ہو جائی اسکول ایم اے اور کالج گیا۔ نئے استاد کی ضرورت تھی۔ مورخہ بی بی کے تارخ القیہم نوجوانوں کی ایک کمیٹی بن کر دہلی گئی، ان میں فیض بھی شامل تھے۔

میں اس فیض کی کتاب "نئی نیا دق" اشتہار ہے۔ اب وہ خود کی کرکھانے کے قائل تھے۔ ان کے بڑے بھائی، طفیل احمد صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے ایس سی کے طالب علم تھے کہ باپ کی ناگہانی موت نے نب و حیات الٹ دی۔ ازد خانہ ان کے ہمراہ لاہور پہنچ کر انہوں نے لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ذکاوت کا امتحان پاس کرتے ہی سب کچھ کے امتحان مقابلہ میں بیٹھے۔ اور فیض پر دوسرے نمبر پر فیض احمد سب کچھ بن گئے۔ گھر کے لوگوں نے امین کا سانس لیا کہ اوپر ذکاوت کے بدلے چھٹے اور فراغت کی سحر نوا ہوئی۔ قدرے آسودگی کے محبت سیر ہوئے تو فیض کے دل کی گہرائیوں میں دہلی ہوئی کنگ پیر کویش پینے لگی۔ دوبارہ دیار مارا چریا آٹھو عین خردی کے انکس چھلانے واپس اتر سڑ گئے۔ کئی پینے سو گوار رہے ان

روں ہر پانچویں چھ روز فیض لافظ مجھے ملتا۔ اس ذریعہ سے کبھی شعروں کے اداک آہستہ میں اور کبھی شکر کے جام سفائیں میں فیض اپنا افشردہ دل بیکار رہا۔ اس دنگلا دھلا کا خاتمہ اس وقت ہوا جب فیض نے 'مرگ سوز محبت' لکھ کر داستان عشق کے قلم ہو جانے کی خبر مجھے لکھ بھیجی۔

بہت بعد میں جب راولپنڈی ساشی گھیس میں ساخو ہو کر فیض گزدار ہوئے تو میں ان کے بیوی بچوں کی خبر کو لاہور گیا ان کے مکان پر پہنچا اور حالات دریافت کئے۔ بیگم ام داگہانی افساد سے کافی پریشان تھیں میں نے تسلی کے کلمات کہے اور واپس آگیا ان دنوں فیض کے مکان پر کسی آئی ڈی کی سخت نگرانی تھی۔ میرے یوں بے ہمایا دباں چلے جانے پر انہیں نہ جانے کیا خشوک گزرے چند دن بعد چانک میرے گھر کی ملاشی ہوئی پولیس والوں کو غائب میرے اور فیض کے اصل تعلقات کی نوعیت معلوم نہ تھی یہاں انہیں کیا دستیاب ہوتا۔ فیض کی سیاسی زندگی سے مجھے کبھی سروکار نہیں رہا۔ البتہ فیض کے ان ناخوشگوار مجموعہ اٹھالے مجھے من کے فیماں کا دکھ مجھے غم بھر رہے گا۔ یہی نہیں راخدا اور آغا حمید کے خطوط بھی پولیس کی دراز دستی کی نذر ہو گئے۔ مگر کبھی سی آئی ڈی کا راپ اختیار کا بھی پسپا تو شاید بے ضرر خطوط کا یہ گنج گزرا۔ مجھے واپس مل جائے۔ ان کی ادبی تدوا اہمیت مستحق ہے کہ انہیں ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

عاشقی کا انسان تو ختم ہو گیا۔ مگر سوز عشق فیض کے خون دل میں سرایت کر چکا تھا۔ لذت درد فہم جان میں بس چکی تھی روئے یار کی رنگینیاں آنکھوں میں جذب تھیں اور غنہ میں زلفوں کی نکبت ہو میں سما ہی ہوئی تھی۔ اس پیکر جمال سے رشتہ ٹوٹنا رخصت محبوب کی جگہ صحنہ ملا جوڑ لیا۔ قامت یار اور عارفین حبیب کے بجائے سرو دھن دھن دھن میں کھو گیا اور فیض نے صحنہ اس مرکز محدود سے نکل کر کائنات کی دستوں میں کھوے ہوئے لادراں صحن کو محبوب نظر اور معبود نگاہ بنایا۔ اپنے درد کو دنیا میں پھیلے ہوئے بیکراں درد کا جزو بنا دیا۔ انہی محرومی کی کک کو مخلوق کی وسیع تر محرومیوں کی ٹپ میں سمونگ برنظر کی آہ فیض کے دل کی آہ بن گئی۔ ہر قسم امیدہ کا دکھ فیض کا اپنا دکھ ہو گیا۔ رقیب سے محال ہو کر جو عہدہ آفرین نظم بھی ہے نہ کے اس انقلابی ذہنی کا شاہکار نظر ہے۔ یہاں سے فیض کی زندگی اور شاعری ایک نئے موڑ سے گزرتی ہے۔

پہرہ نمبر تیار شدہ دوسرے انگشتان میں گزار کر انگریزی لکھنے لپی لپی ڈی کی امتیازی ڈگری حاصل کر کے انہی دنوں وطن مو۔ اور ایم اے والا کالج کے پرنسپل بن کر رتھرمنجے پھوٹے دنوں بعد عاجز و عودہ انظوائی تاؤں ہیدر شدہ جہاں کی سمیت میں پرنسپل مقرر ہو کر اس کالج میں گئے، بقول فیض ولایت سے تاثیر باطل مستعلیق ہو کر آئے۔ ان کا دماغ جہ پیلے ہی علم و ادب کا ایک تھا اپنہ عجز و خوار ہو چکا تھا جس کی تہہ میں بیش بہا اور نگارنگ گہرائے فیاہ کے دھیرے دمک رہے تھے فیض نے حیرت از سے اس عجیب و غریب ماہاں سے کسب زندگیا۔ عاجزانہ محمود کی جانفروشانہ دھن دوستی اور حب الوطنی کی زندگی ایک رہنما کھوشی ستارہ بن سمیت راہ کا پتہ دے رہی تھی۔ پھر محترمہ رشیدہ جہاں کی تاجان داستان کا ایک ایک ورق فیض کی پر تجسس نگاہوں کے لئے مفت صیفہ کے ہم تھا۔ اس قراون السعدین میں فیض کے لئے تہی منزلوں کی نیشات اور تہی شاہراہوں پر گامزن ہونے کی نوید تھی، کے دل و دماغ کے منقلب ہونے والے سلسلہ منور کا صاف ہوا مضبوط ٹری ہو گئے، ہدایت و اساسات کے پیش قیمت مگر شہیدہ ۴

مڑی میں نہایت خوبصورتی سے مک ٹی، فیض کے جذبہ درد کو ایک راہ، احساں کو ایک سمت میں سرگئی، اس کی زندگی اور اس کی شاعری کی راہ و منزلتیں ہو گئی۔ اسی زمانہ میں منک کے دو خواہ ادیبوں اور فنکاروں نے قرتی پسند معنیٰ کی انجمن کی بنیاد رکھی فیض اس کے اساسی اداویں، ممداروں میں تھے، فیض نے ایک خط میں انجمن کی تاسیس کی نوید دیتے ہوئے بھی شمولیت کی دعوت دی تھی۔ مگر میں تو قرتی پسندی کی راہ سے بہت دور ہاتھ پاؤں توڑے پڑا تھا۔ اس جذبہ جہد میں شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ ڈاکٹر تاثیر ولایت سے معلم و دانش کے خزانے ہی لوٹ کر نہ لائے تھے۔ ایک نہایت سلیجے ہوئے اٹوار کی رفیق حیات بنی تھی جو نہ لگتے تھے، تاہم توانہ کو چارے ہو چکے، مگر تھکنا اثر آئی، ہمارے نامور شوہر کی یاد کا قیمتی سرمایہ دل میں لے آئے، بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنے دل کی تعمیر، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دن رات شریک ہو رہا تھا۔

اگر تفسیر میں ڈاکٹر اور معلم کے اثر کے ان پہلوؤں پر کی ولادت ہوئی تو یہ کم تاثیر کی فوجوں میں چھوٹی بہن نور محمد متی کو دیکھنے اور انہما سے ملنے ولایت سے امرتسرائی، اس مہنہ نژاد سینہ کو بیان فیض سے ملنے، اس کی مقدس طبیعت سے متاثر ہونے، اس کی روانہ دیریت کا مٹا لو کرنے، اور اس کے خوابوں کے سمجھنے کے ان محنت مواقع ملے۔ بات یہی ملاقاتوں اور دھوکہ دکھاؤ کی نذر سے بہت اگے نکل گئی۔ جس میں ہمارے جس کا بچپن اور لڑکپن لندن کے تنگ پازروں اور گلیوں میں گزرتا تھا، پھر وہاں چڑھا تھا، جس کی نو جوانی کے دن رات مغرب کے عروس اہلاد کی تہذیب و ثقافتی نگاہ میں بسر ہوئے تھے، جس نے آغازِ بلوغت کے شام و صبح اس انداز میں گزارے تھے کہ تھانہ، فرنگ سے معلم و فن کا ایک ایک جام سیر ہو کر نوش جان کیا، رشرق کے اس فوجوں کا مٹا لو پر مت مٹی۔ فیض جس کے دل کے طوفان سمٹ گئے تھے، جس کے دماغ کی شور و شین مدھم چمک رہی تھی، اس میں انہما دمساز کی رفاقت میں پھرے جاگ اٹھا، امیدوں کے عمل ابھریے اور تمناؤں کے چمن آباد ہونے لگے۔ دو دل قریب ترسب دھڑک رہے تھے۔ بہنوں تنہائی میں بیٹھے ایک دوسرے کو سمجھنے، ایک دوسرے کی آرزو میں شریک ہونے، ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے اور باہمی مٹا لو کو پالنے کے امکانات پر سوچ بچار کرتے رہے۔ آخر کار پیمانہ وفا باندھ لیا اور عہد رفاقت استوار ہو گیا۔ ان کے اس فیصلے کی تیرہ میں صرف پیار و محبت کا جذبہ ہی کارفرما نہ تھا۔ باہمی اقبام تعلیم کا احساس مشترک خوابوں کی کشش اور دائمی رفاقت کی آرزو بھی شامل تھی۔ اس میں شوق کی گرمی اور جذباتی بیجان سے نہایا وہ گہرے ذہنی دھواؤ اور ذہنی تعلیٰ مماثلت کے پائیدار تعلق کا اثر تھا۔

اس سمجھوتے کے عہد میں سے پیشتر اس کا چرچا فیض کی والدہ محترمہ اور بڑے بھائی کے قانون تک پہنچ گیا تھا۔ وہ سب لوگ حدودِ پریشانی ہو گئے۔ غم آشتا بوڑھی ماں نے سمجھا کہ ولایت کی کوئی شوق و خشک مہم اس کے بھوتے بھالے بچے کو دام فریب میں الجھا کر ہمیشہ کے لئے ماں کے پیوے میں چھین کر لے جا رہی ہے۔ بھائی کے سوچنے کا انداز مختلف تھا، ان کا خیال تھا کہ مغرب نژاد آدمیوں کی لڑکی کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو، ہمارے معاشرے میں کسی ضرورت پر نہیں سکتی، جس تمدن کی وہ پیدا ہے اس کی نوعیت ہمارے تمدن اور طرز معاشرت سے قطعی مختلف ہے۔ ان کی تہذیب، ان کی روایات، ان کا کلچر کمر بلیکد اور جہاد کا ہے۔ ان کے کھانے پینے کے اداب، اٹھنے بیٹھنے کے اسلوب اور لباس وستر پوشی کے تصورات ہمارے بود و باش کے رنگ و رنگ سے کوئی مماثلت نہیں رکھتے۔ یہ امکان ہے کہ لندن کی دفعا میں ملی ہوئی یہ لڑکی جناب کے ایک متوسط درجے کے گھرانے سے ماحول میں پنپ سکے۔ یہ فیض کی تہذیب متغایہ جو اس کی انجمن و حیثیات کی کیفیات نہیں ہو سکتی، ایک انگریز سوئی کے روزمرہ کے لوازمات

کس طور پر لے کر نکلی گی؟۔ اُسے تو خائف سا ہوا، میرے اور اردو کی بھی دلدار ہو گئے، ہم میں تو اتنی بھی سکت نہیں کہ اس کے غارتہ اور بچہ نڈ کا خرچہ بھی اٹھ سکیں۔

یہ تھے وہ اندیشے جو فیض کے اہل خاندان کو لاحق تھے۔ طفیل احمد ان دنوں لائل پور میں سب بیچ تھے۔ گرمی کی تعطیلات میں فیض وہاں آئے تو طفیل احمد نے مجھے بھی بلا بھیجا کہ فیض کے علاوہ است پر لانے کا کوئی ڈھنگ سوچا جائے۔ انہوں نے اپنے خدشات مجھے بتائے اور تاکید کی کہ میں فیض کو اس ہلکے اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ میں نے علیحدگی میں بیٹھ کر انتہائی سنجیدگی سے فیض کو ایک طویل و مفصل دیا۔ طفیل احمد صاحب کے بتائے ہوئے نکات، تھریک اور دفاعت سے ان کے ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی۔ وہ حسب معمول مسکراتے رہے اور سنتے رہے، میرا زور خطابت ختم ہو گیا تو سنیں کر بیٹھ گئے اور زندگی میں پہلی بار پوری شریح دہشت سے اپنی زندگی کے اس اہم ترین سلسلہ کے ہر سپور پر روشنی ڈالی، میں نے سمجھ دیا کہ یہ خالی عشق کا حسن مدہ نہیں کر انجام و ثواب سے بے خبر ہو کر قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ تو ایسا فیصلہ ہے جو مسئلہ تلخ و شیرین لطف و شگن جزئیات پر پورا غور و خوض کرنے کے بعد کیا گیا ہے۔ میں نے پوری ذمہ داری کے احساس سے فیض کے فیصلہ پر مداخلت کیا۔ طفیل صاحب اعلان کی دساعت سے والدہ محترمہ کو بھی راضی کیا کہ فیض کے انتخاب کو بخوشی منظور کر لیں، کیونکہ فیض کی زندگی اس کے خیالات اور اس کے ارادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے بہتر و فضیلتیات کا ملنا ممکن نہیں خوش قسمتی سے بات سب کی سمجھ میں آگئی۔ جن کے دل میں کوئی خدشہ باقی تھا وہ ہمراہ فائدہ ہو گئے۔ کیونکہ فیض جو ہر ایک کا محبوب تھا اس کی خوشی میں سردارہ ہوا کسی کو بھی ملوایا نہ تھا۔

شکنتی کار می طور پر اعلان کر دیا گیا۔ دونوں اپنے اپنے طور پر تیاریوں میں لگ گئے شادی کی رسوم اگلے سال لاہور میں منائی گئیں۔ صبح اسلامی طرز میں نکاح ہوا۔ دس گھنٹہ اکثر تیار کے گھر سے زحمت ہو کر سسرال آگئی۔ خوشدہ اس نے خوش آمدید کہا اور بیٹی کو شکوہ کہہ کر محلے لٹکایا مس اٹیس جارج بیگ اٹیس فیض بن کر نئے گھر میں آگئیں۔

اٹیس کی حیرت انگیز تبدیلی کا اندازہ ان لوگوں کو ہو جی نہیں سکتا۔ جنہوں نے شادی سے پہلے انہیں نہیں دیکھا یہ صرف دس اور عرصے کی تبدیلی زبانی، قلب و دماغ کا انقلاب تھا۔ صرف نام نہیں بدلا گیا روح تک بدل گئی۔ طفیل احمد صاحب کے اندیشے ایک ایک کر کے غلط ثابت ہوئے۔ اٹیس نے جس عزم آہنی کے ساتھ مغرب سے رشتہ توڑا اور شرق کو اپنایا ہے جس بے مثال جرات اور گرجوئی سے نئے وطن کی ذمہ داریوں کو قبول کیا ہے اس کی نظیر ملنا محال ہے۔ اس نے صرف فیض کے نام اور وطن کو بھی نہیں اپنایا۔ اس نے تو فیض کے اہل خاندان اس کے دوستوں اور ساتھیوں تک کو اپنایا وہ تو فیض کے ارادوں اس کی آرزوؤں بلکہ اس کے خوابوں میں بھی شریک ہو گئی۔ اس لائق من فیض کی زندگی اور اس کے محبوب سپنوں کی نذر ہو گیا۔ جس رفاقت کا بلند دونوں نے ہر قسم میں باندھا تھا۔ آج تک ان کی زندگی کا مقصد کس عقیدہ، ادراہ عمل کا منزل تھا ہے۔ اٹیس کے حوصلے اور تخیل کا کمال ہے کہ اس نے فیض کی باہمی سستی اور تنہا آسانی سے بھی پیار کیا ہے۔ انتہائی کشادہ دلی اور محبت سے اس کی کمزوریوں، لوہو اطمینوں کو سینہ سے لٹایا ہے۔ جس جہاں شادی اور بردباری سے بیوی نے فیکار غاوند کے لئے جسم اور روح کی آسودگیاں اور بہرہ و قلب کی آسائشیں مہیا کی ہیں فیض نے بھی پیادگی بیوی کی پر خلوص رفاقت کا اس طرح پورا پورا راجت ادا کیا ہے اس کی دلجوئی اور دلداری میں ذمہ بھری نہیں

نے دی سب سے بھی اس کے نازک دیکھنے دل کو میس نہیں گئے دی۔ اس کی خواہشوں کا احترام اور اس کے جذبات کی پاسداری اس طور سے کی ہے کہ ازدواجی زندگی کے چند ہی برسوں میں فیض کی کاہلی اور سبھل انکاری کی ساری علامتیں چھوٹ گئیں۔ اس کی زندگی میں باقاعدگی، روزمرہ میں ترتیب اور قرینہ پیدا ہو گیا۔

شادی کے چند ماہ بعد فیض امرتسر سے لاہور آئے اور پہلی سالانہ امتحان کامرس میں اعزازی کے پروفیسر مقدمہ ہو گئے دوسری عالمگیر جنگ کو شروع ہوئے دوسرا سال تھا، برلن ٹوکیو ٹولڈ قائم ہو چکا تھا۔ جنگ کے ہونا ک شعلوں نے ساری دنیا کو پیٹ میں لے لیا تھا۔ ہمارے ملک کے جوان وحشی دزدوں سے لڑے مشرق و مغرب کے محاذوں پر پہنچ گئے تھے اندرونی ملک کی سیاست، کانگریس کے منفی کردار اور مسلم لیگ کے مرمیاء زردیوں کے باعث بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی۔ دہلی کے فوجی ہیڈ کوارٹر کے شعبہ تعلیمات عام میں ایسے وسیع اخیال بیدار مغز اہل قلم کی فردت تھی جو اس قومی انتشار کے دنوں میں فوج کے جواؤں کے واسطے بلند اور مورال پروردہ درست رکھنے میں مددگار ہو سکیں فیض کو ایک عہدے کی پیشکش کی گئی۔ فاشی رجعت پسندی اور جہوریت کے اس تصادم میں ہر صحیح اندماغ انسان کی مرض فیض کی ذہنی اور عملی ہمدردیاں جہوریت کے ساتھ تھیں۔ بلا تامل یہ پیشکش منظور کر لی گئی اور کپتان کی ددی پہن آری ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ مجید ملک صاحب پہلے سے موجود تھے، چراغ حسن مسرت بعد میں آ گئے۔ ان لوگوں نے اپنا کام اس سوچو جو پوچھ اندوشن اسلوب سے سرانجام دیا کہ بائی کمان حیران رہ گئی۔ کپتان فیض پہلے سیمپر اور پھر عہدہ ہی کرمل بنادے گئے۔ جنگ کامیابی سے ختم ہوئی تو کامیڈ رائیجف جنرل آفٹک نے فیض کو بلا بھیجا، ان کی کارکردگی کو سراہا اور خواہش ظاہر کی کہ فوجی ملازمت سے تعلقات کا سلسلہ متقطع نہ کریں اور کسی موزوں آسامی پر تینائی کی پیشکش کی۔ فیض کامیشن پورا ہو چکا تھا۔ انکار کر دیا اور لاہور لوٹ آئے۔

اس زمانے میں دہلی میں پروفیسر بخاری، ڈاکٹر تائیر، چراغ حسن مسرت، حفیظ جالندھری، آغا حمید اور راشد مختلف حیثیتوں میں جمع ہو گئے تھے پرانے یا راکھٹا ہوئے تو لاہور کی محفلوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ دی بھراپنے اچے دوستوں میں کام کرتے اور ہر شام کسی دیکسی ملکہ اجتماع ہو جاتا۔ نشست جم جاتی تو رات گئے تک شعور شاعری اور خوش گپوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ حسب معمول بخاری اور تائیر ان محفلوں کی روح رواں تھے۔ قیام دہلی کے دوران فیض کے ادبی اور دوستانہ مراسم کا دائرہ اور وسیع ہو گیا تھا۔ ملک کے مرمو خدمت کے علمی و ادبی مشاہیر دہلی آتے رہتے اور پنجاب کے ان نامور شہاد مندان سے تعلقات استوار کر لینے کی سادت سے بہرہ یاب ہوتے رہتے۔

دہلی میں فیض اور بکے فیض کے ہاں پہلی بچی سید کی ولادت ہوئی تو میں بھی مبارک ہادی کے لئے دہاں گیا فیض سے اس کے دفتر میں ملا اور دونوں اکٹھے گھر آئے۔ بچہ جاننے میں ایس فیض کو مائل نہ پہچان سکا۔ گھسکی بھولہ پرنت کی قمیص، سفید لٹھے کا پاجامہ، سٹل کا دوپٹہ اور پشادری مپل پہنے ایک فورٹ ڈرائنگ روم میں صوفے اور کرسیاں چھاؤں پھر رہی تھی۔ فیض نے اس کے کان میں کچھ کہا اور برآمدے میں میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہی عورت کافی کی ٹرے اٹھائے آ گئی۔ اور اسلام علیکم کہہ کر ٹرے ہمارے سامنے میز پر رکھا دی۔ میں نے نظر اٹھا

کر دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ ایسے عین۔ اس قلبِ ماہیت اور بیتِ کزائی کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا، محبت کا بول بالا، فیض! وہ صاحب کے اندیشوں کا بطلان اس کمالِ خوبصورتی سے ہوتا دیکھ کر میں عشقِ پکار اٹھا۔

نوجوان کی ملازمت سے فراغت پائی تو تلاشِ روزگار کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا۔ فیض ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ، پھر گریس پیپرڈ لیمیٹڈ کے نام سے ایک فرم قائم ہوئی۔ میانِ افتخار الدین اس کے کرتا دھرتا تھے۔ انہوں نے ایک انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمرز کے نام سے لاہور سے نکالنے کا اعلان کیا۔ ایک اچھے انگریز کا اخبار کے لئے مستحق سرمایہ، کافی سالا و سامان، ڈیسک، دفتر، چھاپ خانہ اور ایڈیٹر، ریل اسٹاف درکار ہوتا ہے۔ ان عواملِ ممت کے علاوہ ایک ایسا ایڈیٹر جو صحافت کا وسیع تجربہ، انگریزی زبان پر کامل دسترس، ملکی اور عالمی سیاست پر پورا عبور رکھتا ہو اور ساتھ ہی انتظامی صلاحیتوں کا مالک ہو۔ فرم نے بڑی کوششوں کی مگر ملکی یا غیر ملکی، ہندوستان یا انگریز کوئی ماہر ادا و ادب اپنے پاس کا ایڈیٹر دستیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار فیض صاحب کی طرف رجوع کیا گیا۔ یہ ان کی تربیت اور اسیرت کا کھٹا اثر تھا۔ فیض نے اتنی بھاری ذمہ داری اٹھانے پر کچھ تامل کیا۔ انہیں اس قسم کے کام ہا کوئی تجربہ نہ تھا مگر خود اعتمادی کی دولت حاصل تھی۔ جو ہندوئی سے یہ ذمہ داری قبول کرنی۔

اجزائے اعلیٰ سے لے کر اشاعت تک جو ذمہ داریاں ملنے لگی تھیں ان کا علم تو اخبار کے مالکوں اور ایڈیٹروں کو بھی ہوتا تھا ہے۔ فیض نے درمیان میں کس طرح سرگرمی، ابتدائی شک و شبہات پر کس طرح قابو پایا یہ تو فیض ہی جانتے ہیں، لیکن ان کی مشہور روزنامہ کی تالیف و تہہ تھا کہ اخبار منقرض تاریخ کی بیخ کو پوری آب و تاب سے شائع ہوئے۔ اخبار کی زبان دیکھ کر کہہ نہ سکتے تھے ان کی تجربہ کار اخبار نویس بھی حیران رہ گئے۔ فیض نے اس نوجوان شہر پر دے کی خونِ بکر سے آبپاری کی ادویہ پودا دنوں میں جو ان ہو کر ایک تنہا دورِ حیات ہو گئے۔ اس کی شامیں ملک کی سرحدوں کو پار کر کے دور دور تک پہنچ گئیں۔ اہل نظر فیض اور پاکستان ٹائمرز کو لازم و ملزوم سمجھ رہے ہیں۔ اخبار کے ادارتی کاموں میں فیض کے قلم نے حق و باطل کے سیکڑوں سحر کے رٹے ہیں۔ بیاکار سیاست دانوں کیلئے رقم سرمایہ والوں اور سیہ کار جاگیر دانوں کی ستم رانیوں کے قصے عجاہرِ ادب سے بے نقاب کئے ہیں۔ برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور ہندو امپریزم کی سازشوں کی گہری جانوں کو پوری ہمت اور دیاننداری سے عیاں کرتے رہے ہیں۔ جنگِ آزادی میں اس دورِ طوفانی اور چھوٹے پھراؤ کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ بہت کم لوگ تھے جن کو مسلمان کی نزاکت اور اعدا کی مہلک سازشوں کا صحیح مفہم تھا۔ فیض کی فراست ان جانوں کی سمیت دیکھ رہی تھی، اس لئے ان کے خوفناک نتائج کے تصور سے پریشان تھے آزاد می ملک کا اعلان ہوا، وطن کی تقسیم معرضِ وجود میں آئی۔ آٹھ کروڑ مسلمانوں کے خواب کی تعبیر پاکستان کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی قتل و غارتگری، ایسا بولناک طوفان اٹھا کہ پنجاب کی سرزمین یکسر لہزار بن گئی۔ آج اور خون کے اس کھیل میں ملک کے سوسہ بیروں اور قریب بھارتوں نے انسیت کی گتہ زیل کے ایسے کارنامے کئے کہ شرم و حیا کو منہ چھپانے کی جگہ نہ رہی پوروں اور بچوں کی سرپرستہ نشستوں کے اجارہ معصوم بچے مسلمانوں کی عصمت اور آہدے کے جاسد دیکھ دیکھ کر چاند اور سورج کی آنکھیں جھپٹ گئیں۔ گھر گھر سے دھواں اٹھا اور دل دلی سے فریاد نکلی۔ آزادی کا آفتاب طلوع ہوا تو ایک طرف مسرت و انبساط کے شادیاں بے پروا دوسری طرف آہ و فغان کے دردِ سیاہ لے وطن کی فضا کو تاریک کر دیا۔ فیض کے درد مند دل سے بے اختیار صدا بلند ہوئی کہ۔

یہ داغ داغ اُبل لائے شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں !

فیض کو اپنے وطن سے دیوانگی کی حد تک پیار ہے۔ دیس کے رنگ زیا پر کسیں خدا کی خراش آئے ہو اسان ہو تو فیض پہ قور ہو جاتا ہے۔ پیکر وطن کے کسی عضو میں کانٹے کی چھین ہو تو اس کا دل درد سے تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ رات دن اس عرویس محبوب کو جانے سنوارنے کے خواب دیکھتا رہتا ہے وطن کا عشق فیض کی زندگی کا قطب ستارہ ہے۔ اپنی محبوبہ کی آراکشی و زیبائش اور ترمیم و تخیل کی طاقت سمندر کی تہ سے تا ہمار کوئی اور آسمان سے تارے نوچا لانے پر آمادہ ہے۔ وہ اس کے بال بال میں موتی پرانے اور ننگ انگ پر ستارے جھلکاتے دیکھنے کا آرزو مند ہے۔ فیض عشق کرتا ہے تو اس کے جسد و روح کی ساری قوتیں مشتوق کی ذات پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں فیض راولپنڈی ساڑھن کسین میں مانوڈ ہو کر گرفتار ہوئے۔ فوجی انہروں اور جیلوں کی دھڑا دھڑ کرتی دیواروں اور کئی غیر فوجی شہریوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کچھ اس قدر محنت اور تیزی سے عمل میں آیا کہ سرارے مسک میں خوف و دہشت کی فضا چھا گئی۔ اخبارات نے اس واقعہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ سر جانت گھوڑاٹھ اور مارا گیا پھیل گئی۔ ہر شخص مشتوش اور ہراساں تھا۔ کہ نہ جانے کیا ہوا ہے والا لاٹہ اور خوراک کچھ کب نہ ملے والا ہے !!

مجھے فیض کی گرفتاری کی خبر اور اخبارات میں دیئے گئے سبب اور دشمن کے بیان کیا نقشہ نے سرا سید کر دیا۔ کچھ عجیب بے بسی اور غموگئی کی حالت تھی۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اور مصوبائی اسمبلی کے انتخاب شروع ہوا ہے تھے اور اگلے دن میرے کاؤ کا پورنگ تھا یہ مسلم لیگ پارٹی میں شامی تھا اور ایک مسلم لیگی امیدواری حمایت کر رہا تھا سوچا کہ پورنگ کا جھینڈ ٹھاکر لا پور جاؤں گا اور فیض کے گھر جا کر دریاغیت احوال کروں گا۔ چار پانچ دن میں ادھر سے ذرا غفلت ملتا تو لا پور پہنچا۔ در بچ فیض سے حالات پوچھے۔ وہ بے چاری بالکل بے خبر اور اس چھانک اقتلا سے سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس معاصرہ کا اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ بلکہ اس شخص میں ایک عجیب لطیفہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ رات کے دس بجے کا وقت ہو چکا کہ چاک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے کمر کی کھڑکی کے شیشوں پر مار چا کی روشنی پڑ رہی ہے جو کبھی بجھ جاتی ہے اور کبھی آگیاں حرکت کرتی معلوم ہوتی ہے۔ میں ستر سے اٹھی اور کھڑکی کھول کر پیچے دیکھا۔ نیم تاریکی میں مجھے متعدد آدمی کھڑے اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے معلوم ہوئے۔ ان میں سے اکثر انڈین ہندوؤں اور سپوتوں سے سنا تھا۔ مار چا کی روشنی چمکی تو پولیس کی دریاغیت نمایاں طور پر نظر آئیں۔ میں نے کھڑکی بند کی اور فیض کو بچایا اور صورت حال واضح کی۔ ان سے پولیس کی اس بے وقت آمد کا باعث پوچھا، مسکرا کر کہنے لگے ہم اخبار نویسوں کے گھروں کی آئے دن تلاشتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ اب ہی قلعہ ہو گا پتلا شخی کے ذکر سے مجھے یاد آئی کہ ہماری الماری میں ایک دو بیر کی بوتلیں رکھی ہیں، یہ سب پورک تلاشی کے دوران پکڑی گئی ہیں اور وہاں خواہ ایکاری احباب کی تو مانع کے لئے کسی تلافیہ کے تحت دھرئے ہائیں، اور جب ہنسائی کا موجب نہیں۔ میں نے دونوں بوتلیں نکالیں اور مکان کے پشت کی جانب نیچے دیوار پر دے مار دیں۔ بوتلیوں کے ٹوٹنے سے جو دھماکہ ہوا تو پولیس کے جو افراد گھبراہٹ میں پیچھے ہٹ گئے۔ نہ جانے انہیں اس دھماکہ سے کیا شبہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد اس جمع کر کے بیٹھیاں پڑے اور دوازہ کھٹکھٹایا۔ فیض نے جاکر دوازہ کھولا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ پولیس کے چند اعلیٰ افسر موجود تھے۔ انہوں نے فیض کی گرفتاری اور مکان کی تلاشی کے وارنٹ دکھائے۔ تلاشی شروع ہو گئی۔ گھر کا کونہ کود دیکھا گیا۔ کچھڑوں کے کسب استیلاؤں کی، عاریاں، اخبارات اور رسائل کے فائل، غرض ہر چیز زیر و زبر کر کے دکھادی۔ بڑی دیر کے بعد اس تمام سے فارغ ہوئے تو فیض سے تیار ہونے کو کہا۔ انہوں نے ہاتھ ہنہ دھو کر کپڑے بدلے اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ میری پریشانی دیکھ کر کہنے لگے بھرائے کی کوئی بات نہیں، کسی سلسلہ میں پوچھ کچھ کے لئے کوتاہی طلب کیا ہے۔ ڈیڑھ نہ گھنٹہ میں لوٹ آؤں گا۔ سوئی ہوئی پیمپوں پر ایک نظر ڈالی، بھتے یہ کہہ کر میز پر اساتر گئے کرتا نشتر پر واپس آجاؤں گا۔ اور نیچے پولیس کی گاڑی میں جا بیٹھے، آخر مشرق میں صبح کی سپیدی خود بخود برپا تھی اور پولیس کی گاڑی چل پڑی۔

فیض کی گرفتاری سے ایک سہا سبک کچھ اوپر چار برس کی داستان مجھ پر مسماق نے دودا تو فیض کے نام سے زنداں نامہ کے ابتدائے میں لکھ دی ہے۔ میرا صاحب فیض کے ساتھ اسیر زنداں رہے ہیں، اس لئے ان سے بڑھ کر کوئی بھی اس وعدا سے واقف نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے آیام اسیری کا قصہ اس عجاہیت اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر ذکرہ قصہ میں نہیں آسکتا۔ میں نے چند بار اور سنسنری کی چیزوں میں فیض سے ملاقات کی تھی۔ فیض کی حالت وہی تھی جو میرا صاحب نے بیان کی ہے اب ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے خیال میں ان کے بغیر داستان اسیری اور حواری رہ جائیگی۔ وہ ہے دوران اسیری کی بیگم فیض کا کردار۔

فیض گرفتار ہوئے اور حیات سنسنی الزامات میں نافذ کئے گئے، ایسے الزامات کے درست ثابت ہو جانے کی صورت میں موت کی سزا یعنی تھی۔ حالات، اتنے بیکار اور مایوس کن تھے کہ اس کے تصور سے بھی جی بچتا تھا۔ فیض کے بدصورت دو شخص تھے جن پر گھبراہٹ میں لائے اور مقدمہ کی پیروی کا سامرا بوجھ آپٹا تھا۔ ایک بڑے جھائی فیصل احمد تھے اور دوسری بیگم فیض۔ بھائی سرکاری ملازمت میں تھے، تنخواہ محدود اور کمزور کے اخراجات کا سامنا بار۔ کچھ بھی پس انداز نہ کر پاتے تھے۔ اور فیض کی گرفتاری کے ساتھ ہی ان کی تنخواہ بند ہو گئی تو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا اور اخراجات بدستور موجود ان حوصلہ شکن حالات میں مقدمہ کی پیروی کے لئے روپیہ کہاں سے آئے۔ ہر مزم کے لواحقین بھاری رقم کے عوض ملک کے چوٹی کے وکلاء کی خدمات حاصل کر رہے تھے۔ فیصل احمد اور بیگم فیض کی پریشانی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ان کی پرخصوص مسماق اور انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ مقدمہ کے معامری اخراجات کا انتظام بھی ہوتا رہا۔ اور گھر کے روزمرہ میں بھی فرق نہ آنے دیا۔ فیصل احمد نے عزیز بھائی کی رہائی کے لئے انتہائی زور و محنت میں جس جانفشانی اور تہمتی سے کوشش کی ہے اس کا بیان آسانی نہیں۔ فیض ان کو بے حد عزت تھے فیض کی اسیری کا دکھ، مقدمہ کی مشکلی نوعیت کا احساس، شبانہ روز مہاجر دور کا احوال، ان کے ذہن و قلب پر وہ فشار پڑا فیض کی ملاقات کو حیدر آباد آئے اور مدد واپس نہ لوٹے۔

لیکن بیگم فیض کی ذات سیر و تحمل اور بہت دور عمل مند کی شکیبہ چٹان ثابت ہوئی کہ غلطی نہ کے طرفان، یاس دانا امید کی آندھیاں، جنگی رطوبت کے جھکڑ اور دکھ درد کے پلے دم چھیرے اس کے پائے ثبات، میں ذرا سی لڑ شریک پیدا کر سکے، اس کے انجی عزم و استقلال کی مثال پیدا کرنا محال ہے۔ پیارا خاندان میں کے لئے ماں باپ بھائی بہن چھوڑ سات سمندر پار

اجنبی دلیں کو وطن بنایا، سیرت و جذبہ، انعام و آغا شعلیں جس کی سزا موت یا کم از کم برقیہ، انفا، اسقند شوم کو کسی طرف سے ہمدردی کا بھوکا نہ آئے۔ تنہائی اور بے بسی کا یہ عالم کہ خون کے رشتہ دار کالے گوشوں دور اور نزدیک کے دوست احباب قریب تک آنے سے ہراساں، ضرورت کی یہ صورت کہ ہزاروں کی احتیاج اور مستند سچی کی یہ کیفیت کہ بچپن کی اچھل اور خردک دباس کا انتقام محال۔ ایسے جانی و امالات میں ہی ہار و تباہی کی بات نہیں۔ مگر ثبات و عزیمت کی اس دلیوی پھر ہزاروں سلام ہوں کہ ایک لمحہ کے لئے مال و بس نہیں ہوئی مٹری بھر کو کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔

پاکستان مانگنا، انجاریں نوکری کر لی۔ نوکریاں کا رخصت کر دیئے صرف ایک تھراؤ ہی سمیٹ لی، تنخواہ پر رکھ دیا، کفر موجودگی میں مکان پر موجود ہے۔ ہندو اندھیرے اٹھ کر رمان کی صفائی کرتی، ادا شدہ تیار کر کے بچپن کو اٹھاتی۔ ہندو دھندلا، ادا شدہ کھانا کو اسکوٹ رواد کرتی اور آپ بائیسکس پر سوار ہو کر انبار کے دفتر پہنچ جاتی۔ دن بھر وہاں جان سادتی اور بچپن کی اسکوٹ سے واپسی سے پہلے کھرپے موجود ہوتی، پستوں کے سمول میں فرق آنے دیا نہ دفتر کے اوقات اندازے دیگر فرائض کی انجام دہی میں کمی آئے دی۔ کیوں کے دفتر کے محکمہ قانونی مشیروں کے پاس بھال ڈوڑ اس پر ستراد۔ رات کے چہرہ لکھنے آرام کے سنے ٹرڈی وقت تقاضا ہر کے دھندوں کا بہت بستی، خطوط کے جواب لکھتی اور فیض کو حوصلہ افزا پیغام بھیجتی۔

ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ لکھی ادا کرتی اور دوسرے تیرے مینے کبھی تنہا کبھی بچپن کے ہمراہ جیل میں فیض کی ملاقات کو پہنچتی۔ کسی پاکستانی خاتون کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو شاید رونے دھونے یا شکوہ و فریاد سے ہی ان کو فرصت دہلتی چہ جائیکہ وہ روح فرسا آزمائشوں میں ثابت قدم رہ سکتی۔ میرا مقصد انجی بہنوں کی تحقیر تو یہی نہیں ہے۔ حال حال مثال ہمارے معاشرہ کی خواتین میں بھی ایسی دستیاب ہو جائے سکیں، اس سے بڑے چراغے کہ دھونڈنا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں بیگم حسرت موہانی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کی ہمت دھو صدمہ جان بزاری اور مستقل مزاجی کے محاسن لائق تحسین تھے مگر ان کو بھی ایسے ہالکمان اور صبر آزمایا مصائب کا سامنا کرنا نہیں پڑا جن سے بیگم فیض کو واسطہ پڑا۔ پھر۔ تو مولانا کی نسبت علم الیوم لکھتے اور کہنے کے افراد اور ہمدردوں کی اعتراف کی بھی نہ تھی۔

فیض ابھی حیدر آباد جیل میں تھے اور سندھ کی سیاست ختم نہ ہوئی تھی کہ نئے لاہور۔ جانے کا اتفاق ہوا۔ ملاقات کے دوران میں نے بھیجے۔ بھیجے بیگم فیض سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ "فیض کے لئے تو میں کچھ نہیں کر سکا، ایک دوست کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے بال بچوں سے ہمدردی اور فکری کریں اور پریشانیوں میں آپ کا تھوڑا بہت بوجھ اٹھائیں، میں چاہتا ہوں کہ کچھ اتار دے، اگلا شکوہ اور وال وغیرہ کاؤں سے سمجھا رہوں آپ کو ان چیزوں کی ضرورت بھی ہے۔ اور میرا اس پر کچھ خرچ نہیں آئے گا، میرے لئے یہ خوشی کا باعث ہو گا آپ اس کی اجازت دے دیجئے۔"

ایس فیض ہالک چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آنکھیں بھیگ گئیں، پر سنیل کے ثباتِ ممانت سے کہنے لگیں "حمید! اس میں شک نہیں کہ گھر میں ان چیزوں کی ضرورت ہے اور اخراجات سے عہدہ برتاؤ باجی حال ہو رہا ہے، مجھے آپ کے اور فیض کے تعلقات کا بھی پورا علم ہے، اگر منشیں میں کسی دوست کو پکارنا پڑے تو غائب آپ کا نام پہلے ہی آئے گا لیکن برا زمانہ میں چاہتی ہوں کہ فیض کی غیر حاضری میں سارا بار میں خود ہی اٹھاؤں میرے لئے یہ صرف فرائض کا نہیں نجات کا بوجھ ہے۔ اس میں دوسرے کی شرکت مجھے گوارا نہیں۔ اس سے میری خودداری مجروح ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے آپ کو غلط فہمی نہیں ہوگی۔"

نہی رہی تھی دکھوں اور غموں کا بوجھ تو دوسرا ہی پڑتا ہے اسے حمزہ پیشانی سے ہنستے کھینٹے اٹھانا ہر کسی کا کام نہیں۔ لیکن اس کو محبت نامقدس اور پیرا اور بوجھ سمجھنا بیگم فیض جیسی ادب، عزم اور جاننا زچہ بی ہستیوں کا عقیدہ ہو سکتا ہے۔ تیرہ میں فیض نے ہزاروں دکھ اٹھائے ہوئے۔ کب وہ عفویت کے اور محنت کے سزا سے ہوں گے۔ بیوی اور بچوں کی جدا کی شاق گزری ہوگی۔ نگر چار برس میں ایس کے گھر کی طرف سے پریشانی کا ایک بھی گرم تھوڑا فیض تک نہیں پہنچے دیا۔ فیض کا حوصلہ بلند رکھنے اور پائے ثبات میں نفوذ نہ کرنے دینے میں جہاں اس کی انجی بلالوشن طبیعت کے صبر و صہمت کا اعجاز ہے وہاں اس میں ایس کی جہاں سپاری جہاں نشاری کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

نقدش فریادی فیض کے ابتداء کی دور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ درست صوب اور زنداں نامہ، آلام امیری کی یادگار ہیں۔ درست نہ صرف میں رہائی سے لے کر اب تک کی شعری تخلیقات شامل ہیں۔ آخری دور خاص طویل ہے مگر زمانہ امیری کے متناہ میں انشور کی پیداوار بہت کم ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قید کا زمانہ بہت پر آشوب تھا۔ جذبات میں متوقع اور ذہن میں ہر وقت بھگان کی کیفیت تھی۔ ایسا وقت تخلیق شکر کے لئے مناسب ہوتا ہے۔ شاعر اپنی ہر ملاقات قلب کو شکر کے طالب میں دھنسا چلا جاتا ہے۔

رہائی کے بعد سمیت میں ایک طرح کا تھوڑا پیدا ہو گیا۔ جذبات میں وہ شدت اور ذہن میں خلیان کی وہ طبعی کیفیت نہیں رہی کبھی کبھار کوئی غیر متوقع حادثہ گزر جائے جو خیالات میں لرزش اور ذہن میں جھنجھٹ پیدا کر دے تو کسی نظم یا غزل کا موزون سو جھ جاتا ہے۔ مواد اندر ہی اندر پتا رہتا ہے اور کسی موزون ساعت میں نظم مکمل ہو جاتی ہے۔ تخلیق کی رفتار کو بہت مدد ہے مگر خیالات کی گھٹاوت میں کچھ اور الفاظ کے انتخاب میں تنگدستی بہت بڑھ گئی ہے۔ سنی دبیان میں تناسب اور خیالی و فنیش میں موزونیت کا مہنہ کمال پر پہنچ گیا ہے۔

فیض کا شعری فن اب مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ ساری دنیا اس کے تخیل کی آماجگاہ ہے اور اس کا شات اس کی فوجی پرواز کا میدان۔ جہاں کے کسی بھی کونے میں دکھ درد کی آواز اٹھے، فیض کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور شعرا کا موضوع ہا تھا آجاتا ہے۔

دوست نہ سوگ۔ غرض ایک علامتی استعارہ ہی نہیں ہے۔ شاعر کی ذہنی کیفیت کا ایک واضح نشانہ اور اس کی قلبی واردات کے بیان کا محاورہ ہے۔ انداز ادبی، بھوک اور غم کے سنگ گراں بار تھک سہی ہوئی ہے کسی مخلوق کی کراہ ہمت کش موزونوں کے زخمی دلوں کی آہ۔ سادہ سادہ قراوتوں کی لوٹ کھسوٹ سے تباہ حال قوموں کی فریاد، اجنبی ہاتھوں کے گراں بار، ظلم جہتی ہوئی دنیا کی پکار، عزت و ناموس کے ڈاکو، عفت و آبرو کے بٹرسے، یہ ہمارے مریہ وادوں کے فونی منہ میں سرنجی، ہمارے سینوں کی کسکیں، درد کرب کی جہاں سوتلے بیجوں کو فیض کے دل میں اتر گئی ہے جو ان کے ہر سہم رسیدوں کی تڑپ شمر کے دل کی دھڑکی جاتی ہے وہ شدت و کرب سے ملتا ہے چھینا چاہے کبھی نہیں ملتا، نار و فغاں کی اجازت نہیں کہ کوئی ساعت پر گراں گزرتی ہے۔ بچارے کی کیفیت اس کے شاہ ہے جس کا ہر کسی بھی رے پتھر کے نیچے آجی ہو۔ اور دور کے مارے اونچی آواز سے نہ بھی نہیں سکتا۔ دنی فونی آجی رکے رکے آسوسہی آجی فریادیں شاعر کا روز و رات کا شاہدہ ہی نہیں تجرے بھی تہہ تھا یہ غم کے ہی وہ گھوٹل جوتہ تر نہ رنگ کے شعری آئینوں میں پیش کیا ہے۔

فیضی و حیدالدین

فیضی ایک سے دو، ایک سے نشور

فیضی فطرتاً بہت اچھے دوست، بہت اچھے انسان اور بہت اچھے دانشور کی حیثیت سے ہم کہیں جانے پہچانے ہیں۔ ان کی پر خلوص دوستی کے متعلق میرے احساسات اور فطریات آج بھی وہی ہیں جو کم و بیش بیس سال پہلے تھے۔ جب ہم لوگ دہلی میں فوجی ملازمت کے سلسلہ میں اکٹھے رہے۔ اس زمانے کی دلچسپ ملاقاتوں کی یاد ذہن پر اب بھی ہمیشہ نقش ہے۔

فیضی اس وقت بھی شعر کہتے تھے لیکن اب تو انھیں بحیثیت ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی آزادی شہرت حاصل ہے۔ ان کی شہرت اور کمال فن میں ان کے جوہر طبع کو زیادہ دخل ہے یا مشق و جستجو کو؟ یہ سوال اگرچہ کئی بار ذہن میں اٹھرا لیکن اس کا صحیح جواب پر فیضی محمد سیاحی صاحب کی ایک ملاقات میں خود بخود مل گیا۔ سیاحی صاحب علامہ اقبال کے ہم عصر اور فضل اقبال کے خوشہ چین ہونے کے علاوہ ۱۹۳۵ء میں سرے کا لچہ سیانکوٹ میں لیکچرار بھی رہے ہیں۔ ان دنوں وہ الین لے کلاس کو انگریزی اور بی۔ اے کے طلباء کو اردو پڑھاتے تھے۔ فیضی ای ایک مہینہ دو مہینہ لڑکا بھی فرسٹ ایئر میں ان کا شاگرد تھا۔ جیسی صاحب کا بیان ہے کہ

”یہ لڑکا اپنا شرافت سنجیدگی، بُرا باری، کم ایمیزی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے پوری ساری کلاس میں متاثر تھا“

اکتوبر میں جب کارڈ میں Tutorial & Home بنے تو حسن اتفاق سے یہ لڑکا جیسی صاحب کے گروپ میں شامل ہو گیا۔ جیسی صاحب نے اپنے فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے اس گروپ کا نام ”انوان العفواء رکھا۔ بے پایاں گروپ کے زیراہتمام ہر ماہ کا لچہ میں ایک محفل مشاعرہ بھی منعقد کی جگہ انہوں نے پہلے مشاعرہ کے لئے یہ مصرعہ طرح تجویز کیا ہے

منزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا

نومبر ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں سرے کا لچہ میں پہلی مرتبہ محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اس مشاعرہ میں مذکورہ بالا جوہران نے بھی جس کی عمر ۱۶ سال سے کچھ زیادہ تھی ایک غزل پڑھی اور جب یہ شعر سنایا ہے

لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو بٹا دے

دو جام جو منت کش صبا نہیں ہوتا !

تو جیسی صاحب فیضی کی عمر کے پیش نظر شعروں کو کہنے کی اس استعداد سے نہایت متاثر ہوئے اور ان کے ایک ہم چہانت رحمت اللہ

بیدار سے کہا۔

”اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور اسی طرح شوقِ سخن کرتا رہا تو آج کل اس کا شمار ہندوستان کی سبھی صنف کے شعراء میں ہوگا۔“

جسٹس صاحب کی اس پیش گوئی کو اب ۳۶ سال گزر چکے ہیں اور آج واقعی فیض کا شمار ہندو پاک کے مشہور دانشوروں میں ہے۔
جگہ اپریل ۱۹۲۳ء میں انھیں روس کا سب سے بڑا اعزاز ”لینن پرائز“ بھی حاصل ہو چکا ہے۔ یہ پرائز اس سے قبل ہندوستان میں ڈاکٹر سیف الدین
کیلو کو ملا تھا۔ اور اس عالم کے قیام کی کوششوں کے سلسلے میں انڈونیشیا کے صدر سونے کارنوا اور گھانا کے صدر نکر دمہ کو بھی مل چکا ہے۔ پہلے اس
اعزاز کو انٹرنیشنل پرائز کہا جاتا تھا۔ لیکن خروشیف کے زمانے میں اسے لینن پرائز کا نام دیا گیا۔ یورپ میں طویل عرصے قیام کے بعد فیض گذشتہ سال
اپنے وطن واپس آئے ہیں۔ اور ان کا نام علی صافیت، قوی ثقافت، آرٹ، ادب اور شعری کی زینت بنا ہوا ہے وہ ثقافتی سرگرمیوں کی مجلسوں
اور شعری مغللوں کی روح رواں ہیں۔

ان کی نئی زندگی پر متعلق بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نامی دلچسپ تو ہیں لیکن عام نہیں ہیں

فیض ۱۹۱۹ء میں سیکورٹ، حبیبیہ مردم نیر، سرزمین میں پیدا ہوئے جسے شاعر مشرق علامہ اقبال حبیبی باغیخت ہستی کی پیدائش کا فخر حاصل
ہے۔ ان کے اکثر بزرگ زراعت چیتہ تھے۔ لیکن فیض کے والد سلطان بخشاوی حیثیت ہونے کے علاوہ اہل علم اور صاحبِ تعقیف بھی تھے کئی سال
امیر عبدالرحمن کے ہمراہ افغانستان میں رہے۔ اردو انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کیں، افغانستان کے دستور و قوانین اور ”تورک امیر“

انگریزی میں ایک ناول (THE WAZIR DAUGHTER) جس کا اردو ترجمہ ”خزیرہ“

کے نام سے شائع ہوا۔ فیض کو بچپن میں مسجد شیخ حسام الدین میں بھیجا گیا جہاں انھوں نے مولوی محمد ابراہیم سا لکھنوی سے قرآن شریف پڑھا۔ اور کتب
میں مولوی میر حسن کے شاگرد رہے۔ ۱۹۲۶ء میں اسکول میں اسکول سے میٹرک ۱۹۲۹ء میں سرے کا لچے سیال کوٹ سے ایف، اے پاس کیا فیض
کو ان دنوں پھر مولوی میر حسن سے علمی پڑھنے کا موقع ملا، چونکہ کوئی ان کے منتوب مقام میں شامل تھی۔ جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوتے گئے۔

تو اس موقع پر انھیں علامہ اقبال کی تائید و مساندت حاصل تھی۔ علامہ کا خط لکھ کر وہ کالج گئے، داخل ہوئے۔ اور ۱۹۳۱ء میں اعزاز کے ساتھ پی ایس
کیا اور وہی میں آکر لکھا۔ ۱۹۳۳ء میں انگریزی میں اور ۱۹۳۵ء میں عربی میں ایم اے پاس کر کے اہلے کے ادا کالج امرتسر میں لیکچرار بن کر چلے گئے۔ وہاں
۱۹۳۹ء تک انگریزی، اردو اور عربی پڑھاتے رہے تاہم ۱۹۳۹ء میں سیال کالج لاہور میں آئے۔ اور ۱۹۴۲ء تک انگریزی کے لیکچرار رہے پھر اپنے محسن اور

استاد جید ملک صاحب کی تحریک پر ۱۹۴۳ء میں فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں بطور کچپٹان ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۵ء میں میجر
اور ۱۹۴۷ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر ترقی پاب ہوئے۔ قیام پاکستان سے ذرا قبل قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر سرپرستی لاہور سے انگریزی روزنامہ
پاکستان نامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ذرا بے افتخار حسین ممدوٹ اور سردار شوکت جات کی تجویز اور تحریکِ پریض احسنہ فیض کو اس نے انگریزی

روزنامے کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ فیض دسمبر ۱۹۴۷ء میں فوج سے استعفیٰ ہو کر لاہور آچکے تھے چنانچہ فروری ۱۹۴۸ء سے پاکستان نامہ کی انگریزی ابانڈ
اشاعت شروع ہو گئی۔ پاکستان نامہ جیسا انگریزی روزنامہ نکالنا اس زمانے میں مسلمانوں کی تباہی کے لئے اہل نفاق تھے۔ لیکن فیض کی خدا داد ذہانت
اور شہد درو ز جدوجہد نے اسے کامیابی کی راہ پر ڈال دیا کہ پھر وہ اکثریتی فتر کے دواؤں، حکمرانوں کی سخت گیری اور ناموافق حالات کے

رو کے نرک سکا۔

شروع میں پاکستان نامہ رسول ملہری گزٹ پریس میں چھپتا تھا لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد اخبار ”ٹریبون“ بند ہو گیا۔ اور ملہری
مع پریس پاکستان ٹائمر کے لئے ترقی پزیر گئی! جہاں سے وہ اب تک شائع ہوتا ہے۔ اردو روزنامہ ”امروز“ بھی انہیں کی ادارت میں جاری
ہوا۔ مولانا جبرار حسن حسرت اور ایوب کرمانی ان کے معاون اور رفیقِ ادارت تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت کے لئے جو جدید راہیں اور

نئی منزلیں تلاش کیں۔ آج ملک کی پوری اردو صحافت ان میں رہی ہے۔ اور کئی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی پہلی ہے۔ خبریں، ادارتی مقالات و قانع نگاری، تدوین کے نئے زاویہ نگاہ اور کتابت و طباعت سے لیکر تصاویر تک گفتی ہی ایسی ہیں، جن کا تجربہ پہلی بار ’امروز‘ میں کیا تھا لیکن فیضی کی ادارت میں ان اخبارات کے نادر بارہ صفحات سے زیادہ علوم کی ذہنی نشوونما اور احساسات کی مہمانی و بیداری کا کام کیا۔

جہاں تک میرے علم میں ہے فیضی نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ نہ کبھی محض منور نمائش اور داد و ستائش کے لئے شکر کیا۔ انھوں نے شاعرانہ تخلص کی رسم بھی نہیں اپنائی۔ بلکہ ان کا موجودہ نام فیض احمد فیض فوجی لازمیت کے آغاز پر محض اتفاقاً طور پر کسی نے کاغذات میں درج کر دیا۔ جسے بعد میں انھوں نے تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اولوں آہستہ آہستہ وہ ملک بھر تک ساری دنیا میں فیض احمد فیض مشہور ہوئے۔ ان کا پہلا مجموعہ ’کلام ۱۹۳۱ء میں ’فیض فریادی‘ کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ’دستِ نسا‘ ۱۹۵۳ء کے دوران سیر کی یادگار ہے اور اس کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ’کلام‘ جس کا نام ’زندانِ نامہ‘ اور سہ ماہی ’میرا کاغذ‘ ہے۔

اسے ساکنانِ کینہِ فیض! صبح کو صبا

سنی ہی جائے گی سوئے کلزار، کیر کھو!

کہاں اور کون حالات میں مرتب ہوا۔ بہت بات بالکل نئے ہے۔ پہلا یہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ ایک بار تینوں مجموعوں کے لئے فیضی شائع کرنے کا ذکر ہوا۔ تو فیض نے بتایا کہ وہ ان تینوں مجموعوں کو بھی اگر یکے بعد دیگرے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا نام ہوگا، ’دستِ ترنگ‘۔ نیز میں فیضی کی ایک تصدیق ’میزان‘ کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی ہے جو دراصل تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

فیضی سے بزرگ پہلی دہائی میں۔ ان کی کم آئری سے غلامی میں مبتلا ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ فیضی اور کبر و نخوت و دستار دہائی میں۔ ان کی کسرتی اور بے نیازی کا رنگ کچھ قریبی دوستوں سے پوچھئے۔ وہ خاموش لیکن جہاں دیدہ اور جہاں میں انسان ہیں۔ حب و محبت ان کے ہونے سے مسائی کا تجربہ یہ وہ یوں کرتے ہیں۔ جیسے وہ بائبل روایت اور محمول کے مطابق تھے۔ ان کی اہمیت ماضی اور ان کا من فیضی ہے زندگی میں آزمائشوں اور مصائب و آلام کو انھوں نے اس سے زائد شاید ہی سمجھا ہو، کہ ہوا کا ایک جھونکا زوے آیا اور گزر گیا۔ لیکن دوسروں کا وہ درد و دکھنا اور برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ گفتگو کے دوران ایک دفعہ میں نے بڑی تجلی کی سے پوچھا۔

”فیضی جیل جتنی بڑے ہو؟“

بڑی جیسے نیازی سے جواب دیا۔ ”بس کوئی تین دفعہ!“

مزید تحقیق کی، تو اسی نے پڑائی اور متغیر انداز میں کہا۔ پہلی دفعہ ایک دن کے لئے، دوسری دفعہ چار سال، اور تیسری دفعہ چار ماہ۔ آج کل فیضی سر عبداللہ ہارون کا لکڑی کے پریشانی ہیں۔ لیکن انھوں نے جتنے دن اپنا قلم صحافت سے رکھا، اخلاقی حیثیت، بینائی، بے خوفی اور دینی ایمان بن کر یہ عمل کوئی، چاہے سس، اور فصدہ ونسی کو انھوں نے انسانی فطرت، اور ان کے اخلاق و کردار کے لئے ہمیشہ گھن سمجھا، جو پہلے فرک و تگ ہے پھر جناسی زندگی کی اہمیت کو کھا جاتا ہے۔ فیضی نے واقعی نفسِ انسانی، یعنی اعتبار سے ہر ایک کے رتے پر ہوا بان بھولنے کی رسم بھی قبول کی نہ بسے نہ دہا دیا۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہی سے خالی نہ ہو۔

۱۹۶۱ء میں ’امروز‘ کی ایک خبر یہ لاہور کے ایک پولیس انسپکٹر کو بہت غصہ آیا۔ بات دارنٹ اور مقدمہ۔ ایک بیوی، فیضی گرفتار ہو کر اپنی کمرش نظر الحسن کی عدالت میں ہو چکے، انھوں نے کچھ شخصیات داخل کر کے آپ رہا ہو سکتے ہیں۔ فیضی نے کہا، اس کی ضرورت

نہیں ہے، ملک کے متاثرہ اقلاق اور معمولی تصور کی تعلیم پر اوقاف و افضلی کی سیر دی کے لئے عدالت سپریم کے فیصلے کی تعمیل کے لئے بھی روک دیا۔ کومغای کی مینا مطلوب ہے، ہمیں ہے، عدالت اور سپریم کی کسی عیب کشی نہ تھی، بالآخر عدالت نے سرکاری وکیل مقرر کر کے کی ہدایت کی جس نے ان کی حق تلفی میں دلائل دیئے۔ عدالت نے یہ دلائل قبول کرتے ہوئے انھیں باعزت بری کر دیا۔

ضعیفہ واپس آئے اور امرود میں ایک ایسا مقالہ اقتباس کر دیا جس کے نتیجے میں ان کے پیرو بھی شائع ہوئے۔ پاکستان انٹرنیٹ اور امرود کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ ایڈیٹر کے دستخط کے ساتھ ایڈیٹوریل شائع ہوا ہو۔

فیض کے پاس بیٹھ کر ان کی گفتگو سنا، اور مطالعہ کرنا ایک ہی جیسی بات ہے، موزوں ہوں تو آہستہ آہستہ کتنے ہی مشکل مسائل و انکا کو گروہوں کو کھولے چلے جاتے ہیں۔ سیاق و سباق کلام، لیکن جرمیگیت ہے۔ بہت خود اعتمادی اور پختہ یقین کے ساتھ جیسے تے امانا زمین۔ گویا اپنی الجھاڑ سے وہ آگاہ تھا ہیں۔ الکی یہ سب مفید و قیمتی باتیں قومی سربراہ ادب کا قصہ ہے۔ جسے بدستی کے محض سبب نہیں کیا جا رہا ہے۔ اشعار کی صورت میں اب تک ان کے مجاہد پارے شائع ہوئے ہیں، وہ بہت کم ہیں۔ ان کا زیادہ تر قصہ فیض کی بے نیازی اور فناء و اندھنیت کی بدولت ضائع ہو گیا ہے۔ مشرقی اور مغرب کے ادب، نوع انسانی کی تاریخ و ساج و ثقافتی تدریس و قدیم و جدید و علم کے گہرے اثرات پر ان کی نظر بہت وسیع ہے، اور بحیثیت انسان، بحیثیت دوست و الکیثیت انسان و اللہ انسان کی لگائی ہوئی۔ وہ ہمیں تعلق خاطر کی بنا پر مجھے ان کی صحبت میں وقت گزارنے کا موقع اکثرت ملتا ہے جس وہ گرم و دلکش ہیں کبھی میں جاتا ہوں، بعض ملاقاتوں کی یادداشتیں زمین میں اس طرح محفوظ رہ جاتی ہیں جنہیں فراہم کرنا بھی جیسا ہوں تو نہیں کر سکتا۔

ایک سو قات کے دوران کوئی صاحبِ نسبت مرد، دہائی قریبی اور چوبیس گھنٹہ کے بیچ فیض کے کیا، اس اور دوا دہائی کی ترقی کی فضا میں
 نے وطن نہیں ہوں دراصل ایسوں کا ایمان کہ گزشتہ سو گھنٹہ ہے ہرگز "شاعری کی جو حد نہیں ہے، جب پہنچوں کہ ہوتا ہے۔
 گاڑی رک جاتی ہے لیکن عارضی طور پر بھر جاتی ہے :

ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ نظم آزاد کو کچھ لوگ شاعری ہی نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے عروض سے باہر شاعری کا تصور خود دہریہ ہے۔

فہم نے کہا: "کسی بات کو صرف اس لئے شعر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عروض میں ہے۔"

اصل بات یہ ہے کہ شاعر نے پاس کچھ کہنے کے لئے بے کھیا یا نہیں۔ اسے کہنا آتا ہے یا کہنے کے لئے اس کے پاس سببوں کا غلط اور سلیقہ ہے۔ اگر اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے، اور اس کے باوجود وہ کہہ رہا ہے تو وہ شعرِ بغیرِ مانی نہیں ہے۔

بحث کچھ آگے بڑھی تو فیض نے مزید کہا: ہمارے ادوار منزل کے غنیمت اعلیٰ کا کوئی مستقبل نہیں ہے، شاعر، ادیب، اور دانشور کی بنیادی طور پر آگاہ ہونا چاہیئے۔ کس طرح کیا، پھر کیا ہے، و عارضی کیا ہے، مسئلہ کیا ہے، تعبیر کیا ہے، حقیقت کیا ہے۔"

فیض کو گفتگو کے سوز میں دیکھ کر میں نے دریافت کیا۔ کفرارسی اور اردو شاعری نے ان کے ذہن اور خیالات کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ جواب میں کہا، فارسی میں ایک شاعر حافظ کو ٹھیک سے پڑھ لے گا اور اردو میں بیترواقف کو خوب غور اور دلچسپی سے پڑھنا ہے۔ اقبال اے پہلے کہ اُسے پڑھتے وقت کوئی اور فلسفہ نہیں سمجھتا۔ محسوس ہوتا ہے جیسے اس شاعری وہ ہیں بلکہ اور ستریت دونوں میر ہر سہ را در آفاق۔

فیض نے اردو شاعری پہلے اثر انداز ہونے والے تاریخی حوالہ کا تجزیہ بھی کیا۔ اور ان محرمات کا ذکر بھی جو مہ ترقی۔ ادب کا نشان بنے اور کبھی نبود کا بیغام۔ انھوں نے کہا۔ اردو شاعری کا بارہا حصہ اس مجبور یا س کی زندگی رہے جو کنوینین دور کے برطانوی اخلاق نے پیدا کی۔ دراصل یہ ایک مصلحت آمیز منافقت تھی۔ جو سنجیدگی کے دھپ میں ادب کی تہ در تہ پرسلٹ ہوئی۔ اور اس کی ساری شوخی اور بڑبڑت عین کمزوری تھی۔

عزیز حب الوطنی کا ذکر بھی تو فیض نے کہا: یہ ایک آفاقی جذبہ ہے جو ہم کہیں اور ہر دور میں فطرتِ انسانی کے عین مطابق غنیر خافی رہے گا۔

نظامِ تعلیم کا جب کبھی ذکر ہوتا ہے حصولِ علم کے جدید نظریات اور مقاصد کے بارے میں توجہ کروہ کعبہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-
 علم کا مطلب، کتاب پڑھنا اور امتحان پاس کر لینا نہیں ہے۔

علم کا مطلب تو اور اک ہے اور ادراک ہی سے احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات صرف ان ذرائع سے حاصل ہو سکتی ہے۔
 (۱) علم کے حصول کی یہ سچی لگن ہو۔

(۲) حقیقتوں کو دریافت کرنے کی آہی ہو۔

(۳) حقیقت تلاش کرنے کی جستجو کو عرصہ افزائی حاصل ہو۔

غالب کی مصنفانہ لکھی زیر بحث فیض کے ہر نثری پرست پر بہت بھگتی چڑھ گئی تھا۔ غالب اپنی مثال آپ ہے۔ میرے اصرار پر اپنی پسند کے دو شعر لکھے۔

دردوں کیوں بے تک نہ جاؤں ان کو دکھ لاؤں،

انگلیاں نیکا راہی، خامرہ خوب نکال اپن

دوائے دلیراں ہے انقباضی ورنہ اسے بس

اثر خسر یاد نہا ہے حریف کا کسب نہ دیکھا ہے

غالب کے بعد میر کا ذکر بھی۔ فیض میر سے بھی بہت متاثر ہیں۔ میر کے دو شعر انھوں نے جیہ پسند دیئے تھے سنا لئے۔

دمل دجراں سی جو دو منزل ہیں راہ عشق کی

دل عزیز ان میں قدا جئے کہاں مالا گیا

اداسیاں عقیس مری خالفتہ میں تابل سیر

صنم کہتے ہیں تو، تمک آ کے دل لگا بھی ہے

فیض علامہ اقبال کے بڑے مداح ہیں۔ انھیں علامہ کے شفیق و محترم استاد مولوی سید حسن سے درس لینے پر بھی فخر ہے۔

علامہ کی شاعری اور افکار پر ان کے جو خیالات مجھے شن کا اتفاق ہوئے۔ ان کی تعریف کا یہ توجہ نہیں بس ایک ہی وسیع نکتہ پر غور کیجئے کہ علامہ کی وہ نظمیں فیض کو سب سے زیادہ پسند ہیں جہاں وہ واضح و مستقیم انداز میں بات کرتے ہیں۔ اور اپنی ذات سے خود مخاطب ہوتے ہیں۔
 مثل کے طور پر

ہویدا آج اپنے رزمِ ہنساں کے جھوڑوں کا

ہو دور کے محفل کو گستاں کر کے جھوڑوں کا

پردہ ایک ہی تیسرے میں ان بھمکے داؤں کو

جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے جھوڑوں کا

حال ہی میں ایک صاحب نے ان سے ان کے اس شعر کا پس منظر دریافت کرنا چاہا

مقام فیض کوئی راہ میں چپا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دارِ حیلے

فیض زیر لب سکھائے ادب و اب دیا

’بس آپ بیٹی ہے‘

فیض کی گھر یلو زندگی بڑی سادہ اور پرسکون ہے۔ بیگم فیض نہ صرف ان کے گھمبیر و معاملات اور تمام خانگی امور کی نگران ہیں، بلکہ انہیں فیض کی کذابت اور شاعرانہ مزاج کی مناسبت سے اپنے گھر میں ایسا ماحول برقرار رکھنے کی بھی بڑی کوشش کرتی ہیں جس سے فیض کی علمی و فنی صلاحیتوں کو فروغ ملے، نقصان اور ٹھنسن نہ پہنچے، وہ ان کے زیرِ ترتیب مسودات میں بڑی دل چسپی لیتی ہیں لیکن حالات میں ان سے بھی خاموشی بحث کرتی ہیں۔ فیض اس سے کہ فیض جو کچھ صبح بے ہے ہیں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں فنی یا علمی اعتبار سے کوئی قسم، کوئی نچک اور کوئی غیلول تو نہیں ہے۔ وہ فیض کے انگریزی مسودات کو بڑی احتیاطاً خود ڈاٹاپ کرتی ہیں ان کی محنت و نصیحتوں میں بالکل باقی ہیں۔ انگریزی لغتوں کی سہاقت اور انگریزی کی بندش یہ ان کے شعور سے اتنے مفید ہوتے ہیں کہ فیض بھی غیلولوں میں بیگم فیض کی اور خوبوں کا بیلہ حضرت نے کرنے میں ذرا تامل و دھنیں رکھتے۔ بیگم فیض جویر سے مرحوم دوست ڈاکٹر تاخیر کی بیگم کی بیگم ہیں اور انگریز ناکوں ہیں۔ خدا سے ان کو دو ذہن اور چارچہ ازمیوں کی نعمت سے نوازا ہے لیکن وہ بیوں کی نگہداشت اور امور خانہ داری کو اتنا وقت دیتی ہیں جو ان کا مومن کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے نامہ شہر کے لئے گھر میں آرام و سکون اور لکھنے پڑھنے کے جوتھوں بنائے ہیں۔ ان میں ذرہ بھر کی یا رقی نہیں آئے ہیں۔ فیض کا یہ مختصر قلم، ذہین خاندان کی اور بڑی محنت و دانش اور مصیبت میں گھوٹکا ہے۔ لیکن فیض اور بیگم فیض نے جینے، سادہ حالات، و ایک ہی خیر و خوش آسودہ کہا ہے اور کبھی حرفِ شکرانہ نہ لے سہ پر نہیں لائے ہیں۔

فیض شاعر لیکن اچھے کہتے ہیں۔ اور دو انگریزی معنائیں اور مسودات پر ان کا قلم بہت تیز چلتا ہے۔ ان کی حد بڑواؤ، اور تجربہ، الفاظ کا اندازہ ان مسودات سے ہوتا ہے جس کی صفحہ پر خال خال ہی کوئی نقد کاٹ کر دربارہ لکھا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں جب روزگار فقیر کا نقش اول مسودہ کی صورت میں ان کے سامنے آیا۔ ان دنوں تجویز کرنے کا ذکر کر رہا تھا اور انھوں نے ایک نمونہ کے بغیر ملاقات کے مشہور سرائے ملکر روزگار سے اپنی فقرے کی مناسبت سے اس کتاب کا نام روزگار فقیر تجویز کیا۔ انام سن کر سب حیران ہوئے کہ اگرچہ علامہ کا یہ قطعہ بار بار پڑھا، لیکن ذہن اس طرف نہیں گئی۔ اسی طرح انھوں نے عاتق نامہ کے کم و بیش وہ صفحات اہتمام انٹرنیٹ کے دفتر میں بیٹھ کر صرف آدھے گھنٹہ میں سب رد قلم کر دیئے، ناقدین اور مبعین نے بعد میں اس تعارفی مقالہ کو اردو ادب کا شاہکار قرار دیا۔ اس پر سے مقالہ کے مسودہ میں فیض نے ایک غلط فہمی قلم زد نہیں کیا ہے۔ یہ شائیں اور مشاہدات ظاہر کرتے ہیں کہ فیض کی ذہانت عداد اسے، شاعری، مصوری، ادب، آئٹم، بڑوں محترم ہونے کے کیا تو یہ سب خوبیاں فیض میں جذب ہوئی ہیں، یا فیض ان سب میں ذوق کر گئے ہیں اور کچھ لکھتے ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال سے اپنی دیرینہ نیاز مندی اور عقیدت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے "روزگارِ فقیسہ" میں اس ندامت ابد پوچھائی کہ انبیا و کبرا کیوں کہ شاعر مشرق کی محبت کے جو واقعہ میرے ان کا استفادہ صمیم طور پر کر کے جو فیض اور حاصل کر سکتا تھا وہ نہیں کر سکا۔ اپنے اس خبر گیری بنا پر کہتا ہوں کہ جس دور میں فقیہ عیسیٰ شفیقیت ہمارے درمیان موجود ہوں اس دور کی قیمتی ہونے کو نہ جانوں علماء اور فکر و نظر رکھنے والے صحاب اس حیرت انگیز علم و فیض سے محروم ہیں۔ اور ان میں خود نے خود ذاتی و علمی خوبیاں جمع کی ہیں ان سے فائدہ نہ اٹھائیں دیکھ کر کچھ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ عرصے ہیں۔ ملک اُن کے علم و دانش، اور کھوپڑی سے نڈھال یعنی دورانِ بلا فیض کی طرح کی طرح ہائی طبیعی زندگی اور ادبی مخلوق میں جھکتا ہے۔

حمیدین

کچھ فیض صاحب کے بارے میں

صہبہ صاحب آپ مصر میں کہ میں فیض صاحب کے بارے میں کچھ لکھوں۔ آپ کو فیض بھر کی جامعیت کی فکر دامن کیے۔ اس نے آپ کا امر اسے محل بھی نہیں۔ یہاں میں اسی الجھن میں ہوں کہ کہاں لکھوں۔ فیض صاحب اس دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ ایسے فنکار کے کلام کا جائزہ کوئی صاحب امرائے نقاد دے سکتا ہے۔ اور میں نقاد تو کیا اس فن کا مہندی بھی نہیں۔ ویسے یہ عجیب بات ہے کہ آج کل ہر مہندی فیض صاحب کے کلام کو تختہ مشق بنا رہا ہے۔ ادبی محفلیں ہوں کہ اخبار رسالے ڈوبانے اور لڑتے شاعر اور ادیب فیض صاحب کی شاعری پر اس اعتماد اور جوش سے کچھ بحثی کرتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ جب سے فیض صاحب کو لین پرائز ملا ہے۔ فیض صاحب کا ”جادو توڑنے کی ہم اونیز سرگئی ہے۔ اور اس ہم میں پیش پیش وہ نوجوان ہیں۔ جو نہ دنیا کے ادب سے واقف ہیں نہ اپنی زبان اور شعری روایت سے آگاہ۔ نیزہ افتاد تو ہر صبح شاعر پر پڑی ہے۔ غالب کے اکثر ہم عمر شاعر غمزدہ لگتے تھے۔ بال جبریل بھی تھی تو کئی نئی قسم کے بزرگوں نے زبان اور عا ورسے کی اغلاط کی طویل فہرستیں تیار کی تھیں۔ ایک بزرگ نے تو یہاں تک کہدیا تھا کہ کتاب کا نام ہی غلط ہے کیونکہ ”بال جبریل کی ترکیب درست نہیں۔ ایک غالب کے چچا اقبال کو اک بال کہہ کر خوش ہوتے تھے۔ ایسی باتیں کہیں جو آج کل کچھ لوگ فیض صاحب کے ہانچے میں کرتے ہیں، ہمیشہ ہوتی آتی ہیں۔ لیکن ان باتوں کا ادبی و عا ورسے پر اثر نہیں پڑتا اور شاعر شاعر ہی رہتا ہے۔ کیونکہ وقت خود اس کا محافظ ہوتا ہے۔

معافی چاہتا ہوں بات کہاں سے چلی تھی کہاں آپ پہنچی۔ عرض میں یہ کرنا چاہتا تھا کہ اس دور میں جن لوگوں کو فیض پر لکھنے کا حق ہے اور جنہیں لکھنا چاہیے۔ ان میں فراق گوبکھ کا اور محسن عسکری صاحب کے نام میرے ذہن میں بار بار آتے ہیں۔ فراق صاحب نے تو ایک زمانے میں فیض صاحب پر گچھ لکھا بھی تھا۔ امید ہے آپ انہیں دوبارہ لکھنے پر آمادہ کر سکیں گے۔ عسکری صاحب اپنی کمال نقاد ہیں لیکن وہ نقاد وہ ادیبان ہیں فراق صاحب ہی کے ہر کورہ گئے ہیں۔ ان سے کہیں کہ سستا روں سے آگے کہاں اور بھی ہیں فیض صاحب بھی ان کے التفات کے حقدار ہیں۔

میں فیض صاحب کی شاعری کے متعلق کچھ عرض نہیں کروں گا۔ بجز اس کے کہ میں انہیں اس دور کا سب سے اہم شاعر سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ باتیں عرض کئے دیتا ہوں۔ چند واقعات جن سے شاید انہیں جاننے اور سمجھانے میں مدد مل سکے۔

فیض صاحب سے میری ملاقات ۱۹۳۳ء میں لاہور میں ہوئی تھی بیرون میں میری قادیان پرانی کے آغاز کا زمانہ قلعہ نمبر یا کتبہ کا مہینہ تھا لاہور

انوار کی صحن میں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ میرے پڑے بھائی کے سامنے ایک نہایت خوش شکل نوجوان بیٹھا ہے۔ بھائی نے مجھے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا "ان سے ملو یہ ہیں فیض احمد فیض۔ بہت بڑے شاعر ہیں" فیض صاحب آخری فقرے پر کچھ شرعے لگے۔ ان کی عجب مسکراہٹ مجھے ایک تک یاد ہے۔ میں چار پائی پر فیض صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ رشید بھائی نے فیض صاحب سے شرعے سنانے کی درخواست کی۔ انھوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور اپنی نظم سرد و شبانہ سنائی شروع کی ان کا لہجہ ایسا نرم اور ایسا شیریں تھا کہ نظم کے مصرعے میرے دل میں اترتے چلے گئے۔ جب انھوں نے نظم ختم کی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ ساری نظم مجھے زبان یاد ہو گئی ہو۔ فیض صاحب رحمت ہوئے تو میں نے رشید بھائی سے ان کے بارے میں دریافت کیا معلوم ہوا کہ رمنٹ کا لٹریچر میں ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں اور ملاقات میں مقیم ایک لڑکی سے عشق کرتے ہیں۔ فیض صاحب کی اس درد کی تمام نظموں کی ٹرک اور محبوب بی بی خاتون تھی۔ جو اپنے نیم شب ہب مشغول ہیں فیض صاحب کا انتظار کرتی تھی۔ محنتی باہوں والی عیوب۔

۱۹۳۲ء میں ہم لاہور سے امرتسر گئے ۱۹۳۵ء میں میں میٹرک پاس کر کے ایم۔ اے ادکا لے میں داخل ہوا جہاں فیض صاحب کے دو پیچے لکچر راقم کے پاس تھے۔ چند مہینے گزرے تو میرے استاد ڈاکٹر تاثیر مرحوم پرنسپل ہو کر آئے۔ ان کے کہنے سے ایم۔ اے ادکا لے ادبی اور سیاسی شعور کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں وہاں بڑے بڑے اہل علم اور اہل نظر جمع تھے۔ صاحبزادہ محمود الطفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں پرنسپل محب الحسن اور خود فیض صاحب بھی کبھی کبھار حضرت حفیظ جانہ بھری۔ صوفی تقیم اور پنڈت بری جی۔ اختر حرم تاثیر صاحب سے ملنے لاہور سے تشریف لے آتے تھے۔ تاثیر صاحب کے پاں اور ہمارے گھر میں محفل جمع ہوا تھا۔ شعر خوانی ہوتی تھی۔ نئے شعری رجحانات پر اظہار خیال ہوتا تھا۔ لطیفہ بازی بھی ہوتی تھی۔ تاثیر صاحب کی جیسٹہ گوتی اور فقرے بازی ان محفلوں کی جان تھی۔ امرتسر میں قیام کا نسانہ فیض صاحب کی شخصیت کی تربیت اور ہلکا کام ترین دور تھا۔ صاحبزادہ محمود الطفر اور رشید جہاں نے فیض صاحب کے سیاسی شعور کو چمکایا اور تاثیر کی صحبت نے ان کی شاعری کو نکھارا کہ میں ان کی تخلیقات تاثیر صاحب سے متاثر ہیں میں گزارتے تھے۔ لیکن ان کے مشفقانہ مشورے جاری رہتے تھے۔ اپنے خطوں میں وہ میری غزلوں پر اصلاح اور فیض صاحب کی نظموں پر اپنی دلے باقاعدگی سے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کثیر سے ان کی واپسی پر فیض صاحب اور میں ان سے ملے گئے۔ تاثیر صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

یہ بے گور و کفن لاشوں کا اتار ————— نشانِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اس شخصیت میں فیض صاحب نے اپنی نظم "تہنائی سانی" تاثیر صاحب بڑے انہماک سے ہتھکے رہے۔ اور کئی مصرعوں پر مباحثہ وادوی نظم ختم ہوئی تو تاثیر صاحب نے فرمایا "فیض تم نے دڈی کے گھر کی بے مثال تصویر کھینچی ہے۔ میں نے فیض صاحب کو برہم ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن یہ فقرہ سن کر فیض صاحب کے کان شرخ ہو گئے۔ بولے کچھ نہیں۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ تاثیر صاحب کے فقرے سے انھیں دکھ پہنچا ہے۔

ایس لندن سے امرتسر آئیں تو ان سے تعارف کے لئے تاثیر صاحب نے کچھ لوگوں کو چاہئے پر بلایا۔ اس دعوت میں فیض صاحب میرے بھائی رشید اور میں بھی شریک تھا۔ مجھے ایس بہت خوش و صورت لگی۔ اور از قدیم سرت و ستیور رنگ حاد ہب چہرہ

اور مناسب بانٹنا کو جب ہم تیار صاحب کے ہاں سے واپس ہوئے تو راستے میں میں نے فیض صاحب سے ایسے کے بارے میں پوچھا کہنے لگے اچھی لڑکی ہے۔ میں نے کہا آپ کی سوری بن جائے تو کیا ہو۔ فیض صاحب نہیں دیتے اور صرف یہ کہا "تم تو بگل ہو پھر سب لوگ ایسے سے گھل گئے۔ میں پوچھ رہا تھا اس کے ہاتھ لگی جی ہوئی جائے پتا تھا۔ ایک تمام ہم سب تیار صاحب کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایسے نیلے ایلس کی شکل اور مقبص پیتے کرتے ہیں داخل ہوتی۔ آنکھوں میں ہلکا۔ لکڑی لگا رکھا تھا۔ اور کانوں میں بیٹے بڑے نگوں دس بندے جمار کی تھے۔ تیار صاحب تکی بند کر کے کے باڑوں میں سے تھے۔ اور اس وقت ترقی پسند مصنفوں کا ادب سنش بیان کر رہے تھے۔ فیض صاحب یہ کیا نہ جانے کس خیال میں کہہ گئے تھے مجھے یقین ہے تیار صاحب کی کوئی بات ان تک نہیں پہنچتی۔ ایسے کی آہ کا یہ تار کچھ دنوں بعد "مونیو راع صفحہ ۶" میں کاروبار ہوا۔

۱۹۳۷ء میں تیار صاحب نے "بزمِ مخمورانِ خیاب" کے نام سے ایک مضمون ادبی فصل کی دہائی اور "مینیو" ایک شاعر کے کٹر طرحی مشاعرہ ہونے لگا۔ پہلا مضمون ماڈل ناؤن لاہور میں حفیظ جانا بدھ ری صاحب کے ہاں ہوا۔ اس مشاعرے کے لئے فیض صاحب نے بھی غزل کہی تھی۔ دو روز پہاں تیری محبت میں ہار کے" باقی شاعروں کی غزلیں تو فوراً کہہ گئیں۔ لیکن فیض صاحب کی غزل بکلی کی طرح ہمارے ملک میں پھیل گئی۔ دوسرا مشاعرہ اور ستر میں فیض صاحب کے، لیکن ہر ہوا۔ طرح کی زمین تھی نظریں ہے۔ خبریں ہے۔ اثریں ہے۔ فیض صاحب کا مطلع حاصل مشاعرہ رہا

کچھ دن سے انتظار رسوائی و گریں ہے

وہ محفل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

دونوں مشاعروں میں فیض صاحب کی غزلیں دوسرے شاعروں کی غزلوں سے میدوں آگے تھیں جتنا پہلے بزمِ مخمورانِ خیاب جلد ہی ختم ہو گئی۔

پھر متحد ہو گئی تیار صاحب رچ پڑنے کے پہلے ہو کر چلے گئے۔ فیض لاہور میں پہلی کالج آف کامرس میں انگریزی پڑھانے لگے۔ ہمارا خاندان عصرت یہ گرفتار ہو کر گورداس پور منتقل ہو گیا۔ اور وہ پیشیاں بزمِ پڑ گئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک میں فیض صاحب سے قریب قریب ملاقات ملا رہا۔ فیض صاحب کے لاہور جانے سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ۱۹۶۱ء کے بعد صرف مشاعروں یا ادبی محفلوں میں کبھی کبھار فیض صاحب سے ملاقات نصیب ہوتی تھابت ایسی ملاقاتوں میں وہی وقت کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔

۱۹۶۳ء میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے لندن طرہ اتھیں صاحب سے ایک بار پھر طویل ملاقات کا موقع ملا۔ میں فیض صاحب کے دوستوں کے پر حاضر ہوا اور وقت شب تک ان کی خدمت میں رہا۔ انھوں نے اپنا راز نظیں سنائیں۔ باتیں باتوں میں میں نے فیض صاحب سے کہا کہ پاکستان ان کا دستخط ہے ان کی زبان روت پاکستان کا ہے۔ اور صرف وہیں ان کو رہنا مشاہل سمجھتے ہیں۔ فیض صاحب کی آنکھوں میں یادیاں ران وٹن سے بھئی کی کیرا میر آئی تھی۔ کہنے لگے یہ بہت جلد پاکستان آ رہا ہوں دنیا دیکھتی تھی سو دیکھ لی۔ اب اپنے وطن میں رہوں گا۔

میں نے کہا میں فیض صاحب سے اجیری پڑی۔ اس اعتبار سے میں ان کا شکر گردی ہوں۔ لیکن وہ اتنا سے زیادہ میرے دوست تھے۔ ادب میں ایک خالص ادب مروت دوست ان کی شخصیت میں ان کی شاعری کی طرح شہسری نرم اور دلآویز ہے۔ وہ دلآویز گوئی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سے ملنے تو ان کی کم گوئی کے باوجود وہ سنگتہ ہوتا ہے۔ ادبوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہت سی باتیں کہوں۔ ویسے میں نے عوم دوستوں کی محفل میں فیض صاحب کو کچھ سے بڑی دیکھا ہے۔ اب بچپن برس پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ مہر تھی صوفی تہم صاحب کے ہاں بہت سے دوست

جمع تھے۔ اور حسب دستور شعر و ادب کی انیس سو سو تھیں۔ ایک مذاکرہ صوفی صاحب نے اپنے نہایت ہی مہرمانہ انداز سے شکایت کی کہ لاہور کی کاشتکار ہوسٹل ہے۔ سونے تا جو کہ حسب آبادی مشہور لاہور کی وسالت سے ایک خاص گروہ کو ادب پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ باقی لوگ بھی اس روٹس چل پارتے ہیں۔ صوفی صاحب کو اس پر ایسی ہی وقت بھی کھل پڑا سی چھانے لگی۔ فیض صاحب جو اب تک فرائض تھے۔ ایک ایک بول اٹھے۔ صوفی بھی لڑا لڑا کر رہے۔ آپ بھی اب آکر، اگرچہ ان کے ہاتھ دے لیتے۔ ان کے اس فقرے سے عقل و عیزان زور پکڑ لگی۔ صوفی صاحب بھی یہ ساختہ نہیں پڑے۔

میں نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ فیض صاحب بڑے ساروت انسان ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جو کام وہ کر سکتے ہوں اس سے بچنے کا نہیں کرتے۔ چنانچہ بہت سے فوجیوں نے ان کے شعر و ادب کے شری مجروحوں کے دیباچے اور پیش لفظ فیض صاحب سے لکھوا لئے ہیں۔ فیض صاحب نے طبعی ساروت ہے۔ جو عبور ان شاعروں کی ایسی تعریف کرتے ہیں اور ان کے کلام میں ایسے ایسے محاسن پیدا کرتے ہیں جن کا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ میں نے ایک مرتبہ فیض صاحب سے اس بات کا ذکر کیا۔ پہلے تو ہنس کر بات ٹال گئے۔ میں نے بات دہرائی اور کہا فیض صاحب یہ بات آپ کے لئے مناسب نہیں، اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور صاحب فہم لوگوں کے دلوں میں بیگانگی پیدا ہوتی ہے۔ اس پر فیض صاحب نے فرمایا: ”بھئی تو جو ان کی خواہش ان کی ہمتی بات نہیں، اگر میں غالب میر۔ ادیبان جیسے شاعروں کی کچھ میں کوئی نامی کر دو تو آہ بہ کشتہ بیت کا حتم ہو گا۔“

جو چند فقرات تو یہی تو یہ یاد آئے۔ یہاں تک کہ وہ کہہ دیتے ہیں۔ دو چاروں یادوں کا ذکر کروائی کروں تو اور بیت سی دلچسپ باتیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کو نہ بولت ہے نہ تو فیضی بہر حال حکم کی تعمیل ہوگی بختیت ہے۔

ایک شعر کی پسیر وڈی

فیض صاحب کا شعریت سے

وہ تو رہے تھیں ہو جائے گی اعلیت میر سے

اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

(زمانا نامہ)

زمانا نامہ کی اشاعت سے پہلے کا ذکر ہے۔ ایک صاحب لاہور سے آئے

کہنے لگے: ”بھئی آج کل تو لاہور والے اس شعر کو یوں پڑھتے ہیں۔

وہ تو وہ ہے ہمیں ہو جائے گی نفرت میر سے

اک نظر تم مرا۔ ”فیض صاحب نے تو دیکھو

ایک دن ابوالخیر گشتی نے فیض صاحب کو ان کے شعر کی یہ پیر وڈی

سنائی۔ فیض صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ ”مگر صاحب! یہ خوب

ہے۔ کراچی والے اپنی پیر وڈی بھی لاہور والوں سے منسوب کر دیتے

ہیں۔“

چودھویں کا چاند آسمان کی چٹپٹائیوں میں روکشیں تر بو تاجار باغ تھا۔ جن کی ماہیں چاندنی کے سرور سے تھکے کانہیں ہیرا
رستہاں بوچی تھمتیں۔ بہار کی کشتی لڑائی و فضا میں آہستہ آہستہ رواں تھی۔ ہم سب چچرا آلودستی میں رہتی تھی۔
الزور گئے تھے عین غلبہ کے سونو خیا، وہ کیسے تھے جاو و جٹکا تھا، اب آہ سرد کے لہو و دم مقرر ہو گیا تھا

تیار ہو گئے۔ میری والدہ سے، بوائوں اور مہن سے ملے اور آغا سحر خوش جو اس وقت دلی سے، اپنا مہینہ تان نکالتے تھے، ان کی فرمائش پر اپنے تازہ اشعار لکھوا کر دستخط کر کے دیئے۔

دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے سے جہاں جاپانیوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے، سنے کا خطہ دلی والوں کو اکثر ہار کا نشانہ بنا دیا۔ دلی کی آبادی میں بھی بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ امریکی اور برطانوی فوجی بولٹوں، چائے خانوں اور بازاروں میں ہندو کے جھنڈے لٹکاتے تھے جنکی حکمے دھڑا دھڑا کھل رہے تھے اور دلی میں باہر سے لوگ آچکے تھے۔

کرنل محمد ملک بیک، ریجنل ڈائریکٹر میں براجمان تھے اور غالباً انھیں گے ایما پر سپرٹس من حسرت بدر الدین بابر اور فیض احمد فیض فوجی ملازمتوں میں داخل ہو چکے تھے۔

یاد رکھیں بزم پر وہ فیاض احمد شاہ کھاری (پطرس)، اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر اعلیٰ تھے، ڈاکٹر محمد دیون، تاج فیض موجود تھے اور فردوسی اسلام حضرت حفیظہ جالبہری سانگ پلیٹی کے انچارج تھے۔ یا ہرے شعرا اور ادیب دور دور سے دلی آتے جاتے رہتے تھے ریڈیو اور دارفرنش کے مشاعروں میں بوائے جاتے تھے۔ اس جیل میں سے ادبی مہینوں میں چار چاند لگ گئے تھے۔

رتی پسند مسندین کے نمائندے، بعد از شعرا مثلاً جاز، حبیبی، جاں نثار، داسق، نرائن کور کیسوری اور ان سب کے پیر مغل جوش ملیح آبادی سب کے سب اکوڑو بیشتر دلی آتے رہتے تھے۔ اور کئی کئی دن مسلسل قیام رہتا تھا۔ کسور، ہندو سنگھ، میدی خواجہ محمد شفیع دہلوی صدر اردو مجلس دلی کے ساتھ مشاعرے قریب مہن میں رات دن مشغول رہتے تھے۔ پرائیوٹ میسجیں بھی مہن میں جیسے مثلاً پطرس بخاری مرحوم کے گھر پر دفعتاً چاندھری، فیضی، جاز، پنڈت بری چندرا نتر، مولانا علی الجلیل سالک، ذوالفقار علی بخاری، رفیع پیر اور ڈاکٹر شمس تاثیر جیسے ہیں رات گئے تک لپٹتے، حقیقے، شاعری اور ذہانت آمیز فقرے بازی جاری ہے خواجہ محمد شفیع کے پاس اردو مجلس کی جانب سے بھی اچھا اجتماع ہوجاتے تھے۔ دلی کے جدید شاعروں میں تابش دہلوی، جمیل الدین علانی، ڈاکٹر یو در عباس اور شان الحق حسنی شاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ جوش اور جگر حبیب دلی آجاتے ادبی بیگانے زور و زور پر جاتے۔ دعوتیں پاریاں مشاعرے برابر ہوتے تھے جگہ لکھنا اور دو ایک ماسٹم آج کل شائع کرتا تھا۔ اس کے مدبر آغا یعقوب دہلوی، علم دوست ہونے کے علاوہ عمدہ کھانے کھلانے کے لیے خوشہم رہتے۔ دلی میں روز ہنگامے کو رہتے اور آقا و دانشی اس کے متقاضی اور مہینے رہتے کہ ان کے ہاں گھر پر رنگا رنگ لکھنا لکھوانے کے دس سرخو کو فوڈ اور مہمان ضرور اعزاز بخشیں۔۔۔

آغا و دانشی میرے ساتھ فیض صاحب کو مدعو کرنے گئے۔ فیض اس قسم کی دعوتوں میں گزرتا رہا جو جلتے ہیں مگر انھیں یہ مغرب سنیں ہے کچھ فیض نے عزت لگائی اور دعوت میں شریک ہوئے۔ بے چارے آغا و دانشی تو کیا اگلا کو خوش ہو گئے مگر مرلیان بادہ بیابانہ جام سخن کا درد چلا دیا۔ فیض بچ لکھنے کے لیے مجھ کو بھیجتے تھے مگر آخر اپنی باری پر فیض صاحب نے اپنے غزل سنانی اور خوب اداس لکھنے کی سہ

پھر لوٹا ہے خود شید جہاں تاب سفر سے

پھر تو رسم و رسم دگر باں ہے سحر سے

وہ رنگ ہے اس سالکستان کی فضا کا

ادھل ہوئی دلی ارقس حد نظر سے

میں فیض صاحب کو پہنچانے کے لیے انہیں محل سے اٹھایا ہم اور وہ سوا ہو کر دلی اشی صاحب سے رخصت ہو گئے۔

سلاونی سلونی شام میری ہر جی تھی اور ہم لوگ، لمبی نشست سے بالکل خستہ ہو گئے تھے۔ پرانی دلی کی سبز پوش درختوں کی قدانی، دھبہ انجمی تھیں۔ ڈاکٹر شریک اللہ الفارسی کی کوکھی سے رات کی دلی کی تیز خوشبو اڑ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش چلے جا رہے تھے میں اپنے بخت کی یادری پر نازاں خاک مرید سلیم، ایک عظیم انسان فروکش ہے جس کے شاداب چہرے کو کسی خوشگوار خیال نے رنگ میں دوب کرنا بندہ درویشانہ کر دیا تھا۔

میں نے معافی مانگی، بھائی جان! میری دہرے سے آئے آپ کو بہت زحمت ہوئی، فیضی کے چہرے پر فرشتوں ایسی مسکراہٹ دمک اٹھی۔ بولے ”رحمت و رحمت کیا ہے۔ زحمت اچھا لگتا دیکھا، میں ان کے احسان سے جھوم گیا اور ایک شعر بے ساختہ پڑھ دیا ہے

و زحمت غنیمت بر آورد و دیباہاں مستند

جہاں حوائی شد و یاراں بعیش نشنند

روزنامہ تاج دلی سے، ایڈیٹر لارڈ وجرمان کی لکھنے والی کے ایک دوست نے اپنے ہاں مخصوص نشست کا انتظام کیا، ابن کسین فکر نے جوش صاحب کو وہاں جانے کے لئے راضی کر لیا۔ فیض صاحب کے لئے مجھے متین کیا گیا۔

کنوہند رسنگہ اپنے ساتھ خوش چار چوڑی، دھات پر لہری ایسے خوشگو شعرا کو ساتھ لے گئے تھے۔ حضرت ابن لکھنوی پیلے سے جلو تھے۔ خوب خوب رنگ چہرہ، اچھا اچھا شعر کہنے اور خوب لطف رہا۔

جوش صاحب اقدیم و نامیر کے تالیف میں ہیں دوسرے خوب رنگ میں آئے، انھوں نے خود ہی چڑھا شروع کیا۔ جوش صاحب سبب پڑھتے ہیں وہ تو کت میں کمان کے دوست مصرعہ خدو را تھا شیں، مجاز بیچ بیچ کر مصرعہ اٹھا رہے تھے، الکاروی وہ اٹھ کر کہیں باہر چلے گئے۔ جوش صاحب نے فیض صاحب سے کہا ”مصرع اٹھاؤ میری جان“، فیض صاحب سنت امتحان سے پڑ گئے کہ فرور اباں نہ اندازے کو کہ مصرعہ اٹھا یا فیض مسکرائے کے دھوپ سے شغل کرتے رہے۔ جاں نثار اور آغا صاحب پڑھ چکے تو جوش صاحب نے کہا ”مساو! میرے پاس ایک تازی کا توس اور بہت بھرپور صاحب سے فریادیں کی، فیض صاحب نے مجھے سچی سی محبت میرے مصیبت نہ مانگ والی نظم شعر شعر کر اور ہم کر پڑھی۔ یہ حد وادداشت کا شور ہوا، مجاز چلائے صاحب، آپ کا آخری ہار توس خوب چلا سونگھائی کر گیا“

جوش صاحب جب دلی آئے تو ریوسے اسٹیٹس کے رہا ترک دوم میں اقبیر سے مخصوص دستوں کو جب ہر میں عزوب ہو جاتا وہیں جہاں تے۔

ایک بے درد مرد رات کو ریوسے ڈانرنگ دوم میں داخل ہوئے تھے۔ مولانا جسران حسن حسرت تماشہ دہلی، مجاز، حکیم اشرف دہلی اور ڈے تین اور صاحبان موجود تھے، فیض صاحب جوش صاحب کے لئے انگریزی شرب کا تھڑ ساٹھ لائے۔ جوش صاحب فیض کی اس اداسے میں خوش ہوئے، خوب خوب سلوی ہوئی پھر لیٹنے میں پڑے اور جب غل غل ختم ہوئی تو بول فیض

دھن کی دوات، بکھرنے لگا تاروں کا عیار ۴ (لکھنؤ) لے ایوان میں خواہیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذار

گرم گرم سے نکلے تو زمستان کی رات دھوپ ہوئی تھی۔ فیض صاحب زحمت ہو چکے تھے۔ جوش صاحب کو باہر آدیا کہ ان کا چودہ گرمی میں رہ گیا ہے۔ وہ اپنا سوچا جانے کے لئے دوڑ رہے تھے۔ ایک زینے سے ہرچہ کر، ہرچہ پتہ تو چکر گھپ اندر جہاں اٹھا اپس جلا کے دیکھنی کی گئی۔ جوش صاحب نے دیکھ کر ان کے کمرے کا دروازہ کئی صاحب کو لے رہے ہیں۔ حبیب، جوش صاحب، کوسا کے پاس پہنچے تو ان صاحب

سے جو پہلے سے ان کے گریٹ کے قریب کھڑے تھے پلوچھا۔ کون صاحب ہیں، ان صاحب نے کہا، "اچھا جوش صاحب ہیں، جو کوشش صاحب ہوئے اسے، آپ فیض صاحب ہیں، دونوں نے گرم جوش سے ہاتھ ملانے والا کھولا لیا۔ فیض صاحب نے اپنا اور گوتا لیا جسے وہ بھول گئے تھے۔ اور جوش صاحب نے اپنا ہتھوڑہ۔ یوں یہ سرورات کی ملاقات ختم ہوئی۔

ذیعنی آفسیر، سیس اندر جا کر گئے تھے۔ ایک دن جب چاہا کہ اتنی صبح میں میں سچوہا کہ فیض صاحب کو کو خود صاحب پاؤں۔ صبح کا ذب اس وقت صبح صادق میں گھل کر بجلی مارا ہوا چاہتی تھی کہ رہے۔

اکٹھا اور اٹھ کے قدم ہیں نے یا سبائ کے لئے

پردہ ان اجازت لئے ہی میں فیض کے کمرے میں موجود تھا۔ دو پلنگ پاس پاس پٹختے تھے۔ مجھ جالین کے اندر ملنے کے کرتوں میں بلووس فیض اور ان کے دوست کرمل جان وغالباً یہی نام تھا، خواب راحت میں آسودہ تھے لیکن جی بھر کے ٹرنے تا باں کی ریاریت کی اور عالم کین میں سدھری ہوئے غمگناہ لگاے۔

مکڑنیم سم لوسے، ایرسن دارد

کروا صحت دل اسب روا من دارد

فیض سید رہا ہوئے تو مجھ سے کسے سیرا خیر، پڑھنے دیکھ کر سوائی سے بولے اسے ہم کہہ آتے جاتیں نے تم آپ کو کو خواب دیکھنے کو چاہا تھا، مخصوص کسی سے تو اڑتے ہوئے تھے اور جہاز ملہر تیار کی ہو سرور ہوتے تھے۔ کرمل جان فیض صاحب، جہاز رازات رکھتے تھے اس میں سے کمرے اور کھڑے کے پورا میں رکھ کر کھینچے ایک سالانہ پڑ۔ کرمل صاحب کو آداب کیا، اٹھوئی سے مسکرا کر، "اب کیا، بیوہ بولتے تو جی خاصا اردو بولیں رہتے ہیں کہ کرا کرمل صاحب آپ تو ایسا محروم اردو بولتے ہیں کہہ گئے۔" یہ

کمال بسم نشیدہ اور من اڑتہ کرد

آنا دواشی۔ ایک دن کہا کہ ہم جوش پر مضمون چھاپنا چاہتے ہیں لیکن مضمون پیش سے لکھا، اچھا ہے۔ اسٹریٹ علی مرحوم جی سے ملے تھے کہنے لگے جیو میری فیض صاحب سے، یوں کا تم بھی مہنا مضمون ہم لکھو الیں گے۔ کڑا آئی دیا، اسٹریٹ علی اور تم فیض صاحب کے ہاں پہنچے تھے اور محو دھڑائی باتوں کے بد اخوت نے غرض مرعاجیا، ایک رپہ نہ تھی، فیض کو بحر ایکاں کہا کہہ گئے تھے، چنانچہ فیض نے اندر گیا، "ہاں بات تو نیک ہے، مضمون تو ہونا چاہیے مگر جیسی فرصت دو کہ آج وہ بیہوشی دو سکے پڑھا ہی پڑے گا۔ میرے پاس بیاں ہوش صاحب کا کلام بھی موجود نہیں ہے!" ہم لوگ اڑے رہے اور جب فیض یہاں پہنچے تو آؤ اس پر راضی ہوئے کہ جی جوش کا سیٹ لارڈیا جائے اور گاہے کا یہ یاد دہانی بھی ہوتی رہے۔

اس وقت ترقی پسند مصنفین کی تحریک زوروں پہنچی، اسٹریٹ علی بھی ترقی پسند ادب کے اچھے نقاد اور تحریک سے دلی مدد دی رکھتے تھے، اسٹریٹ نے ایسے گروپ کا آرگنائزیشن کیا کہ جس نے جہاد شاعری کو سیرہ روی پڑھائی، نکتہ چینی کی حق، کہنے لگے یہ لوگ کوئی نئی بات تو کہ نہیں سکتے، ان میں آج ہے دنیا بن کر جدید ادب اور شاعری پر پرس رسب، اسٹریٹ لکھنے لکھنے بعض مقامات پر تو اقبال نے بھی سامانہ سلفی کو دہرایا ہے، یہ سب کہا گیا اگر دہرایا ہی ہے تو اچھے اچھے سمجھنے والے اس سے نہیں بڑھ کر اور بالکل نیا کہا ہے۔ فرمائے گئے مثال تو دیکھئے، میرے ذہن میں اس وقت عربی کا شعرا کھرا آیا ہے

گماں میر کہ جوں تو بگذری چنان بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن با فیدت

میں نے کہا اب اقبال کو دیجئے کہ

کھان صبر کہ ہا یاں رسبہ کار معان

میزاد یادہ ناخوردہ درگس تاگ است

اسٹریٹ بولے کہ میں تو الفاظ اور پیرایہ نگاری کا لیا گیا ہوں۔ فیض صاحب نے فیصلہ صادر کر دیا "صاحب یہ تو آپ جاسوسی کرتے ہیں۔"

اسٹریٹ نے حلفے ہوئے کہا، منکرہ چیز میں کوئی اسامی نہائی ہوئی ہے۔ فلان صاحب سے کہہ دیں "فیض نے اسی وقت ان صاحب سے اسٹریٹنگ سنار سنس، گزری اور اسٹریٹ دوسری میز سے ہر سر روز گزار ہو گئے۔

ماہنامہ آجکل پریس میں چھپنے کے لئے چلا گیا صرف فیض کا مضمون ابھی تک باقی تھا میں نے نیت کی شام اٹھیں فون کیا بھائی جان ! بے چارے آغا وہ اٹھی صبریت میں تھیں جانے لگے اگر آپ نے سنسنیز نہ لکھا، آپ مزید تاخیر کی بجائے نقش نگاری میں ہی اس لئے براہ کرم آپ کی اتوار کے سارے پیر گرام سٹوئی کر دیجئے میں کل علی الصبا آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا آپ بولتے تھے کہ میں لکھ دوں گا "فیض صاحب کا کرم ہے کہ ہمیشہ میری بات ان لیتے ہیں۔ کہتے تھے اچھا کل آجائے مضمون ہو جائے گا۔ دوسری صبح میں علی الصباح سلاط ہو گیا۔ جوش صاحب کی طرح انہوں نے لٹائی دکا کین لگا لی تھیں دکھائیں کچھ بڑی نظر پر لٹائی، لٹکا دیئے۔ انھوں نے پہلی ایک مجموعہ لٹ پٹ کر دیکھا، بیچوڑی نقاب دیکھی وہ بھی رکھ دی، پھر کوئی اور مجموعہ اٹھایا۔ کاغذ لٹے مہے آخر کہنے لگے کاغذ پھسلے لیجئے اور بولنے لگے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ذہن میں مضمون ترتیب پا چکا ہے

اب صرف تین ڈول ہو رہا ہے جن اشعار پر لٹائی تھیں، یہ سب وہ بعد میں چسپان کر دیئے، کوئی تین گھنٹے کے بعد مضمون تیار ہوا ان کے حلقہ حلقہ اور لٹائی کے لئے میں مسودہ ان کے پاس رکھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن مضمون تیار ہو گیا، جو آج کل دلی میں شائع ہوا، اور اب ان کے مجموعہ مضمون میں موجود ہے۔

ایک دن میں جوش صاحب کے ہمراہ فیض کے ہاں گیا، فیض مجھ پر نہیں تھے۔ بیگم انیس فیض ملیں۔ جوش صاحب نے کہا یہ بتائیے کہیں آپ کی اور فیض کی لڑائی بھی ہوتی ہے وہ بولیں "خواب ہماری لڑائی کیوں چاہتے ہیں؟"

جوش صاحب نے منکر جواب دیا، اصل میں لڑائی برائے محبت ہوتی ہے اگر آپ لوگوں کی لڑائی نہیں ہوتی تو آپ لوگوں کی محبت خالص نہیں ہے۔ "بیگم فیض یہ الزام عطا اپنے سر کیوں لیتیں کہنے لگیں جوش صاحب وہ ہم درازوں میں اختلاف رائے تو اکثر ہو جاتا ہے لیکن لڑائی کبھی نہیں ہوتی۔ جوش صاحب چلے ہوئے کہنے لگے اچھا اب کے جواب ہم آپ کو کسی خاص لڑائی کا قصہ سنائیے گا تاکہ میں آپ لوگوں کی محبت کا یقین آجائے۔"

ایس فیض کہتے انتہا چاہتی ہیں اور جیسی اچھا اور شوہر پرست بیبیاں ہماری قدیم معاشرے میں دیکھی اور سنی جاتی تھیں، ایس ان سے بھی بڑھ کر ہیں بلکہ انھوں نے فیض کی جی کی طرح مدت میں جس پاروی سے تنہا مصائب کا مقابلہ کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ایس پر تو ایسا شدید استغناء کا وقت آیا تھا کہ بڑے ترین قری و دوستوں نے ان سے طعنا جھگڑا اور کٹار ڈسکے مارے خط و کتابت اور فونی فون پر بھی یہی ملے۔ ترک کرنے کی سعی کر کہیں یہ لوگ بھی متاثر نہیں نہ آجائیں۔ ایسے کس پر سنی کے عالم میں بیگم فیض پاکستان نامائز کے جی متعلق تھیں اور دیال سنگھ کا گھر جس پر دعائی بھی تھیں اور اپنی معصوم بچوں کی ہر خوش و بد بخت

اسی انداز میں کرتی رہیں کہ انہیں باہر کی عدم موجودگی اور شفقت سے کوئی بڑا حسرت نہ ہو۔ اس کی ذمہ داری
میں ہر زمانہ کی فیض کے لیے کیے قریبی اور محبت کے دعوے اور دوست ان سے وقیع کے ساتھ کی طرح کنوارے کشت ہو گئے تھے۔
حکومت اور ناسازگار حالات کا انھوں نے جسم کو مقابلہ کیا۔ غالباً انھیں مافوق کے اس شعری محنت معلوم تھی۔

رسید مرزا کہ عالمِ علم نہ خواہد ماند

چنانچہ نہ ماند جنہیں نیزم نہ خواہد ماند

جنگ ختم ہوئی، فیض نور سے سب کو روشنی ہو گئی اور آگے اور پاکستان، انھوں نے ان کی لوارت میں شائع ہونے لگا۔
افتخار الدین خدا انہیں کروٹ کر دے، جنت نصیب کرے کیسے قدردانِ علم، ادب، محنت، انھوں نے پاکستان پر دگر سو پیر کے
نام سے ایک بڑا ادارہ اپنے ذمہ لے لیا، قائم کیا اور امر دہ اور پاکستان، انھوں نے دوسرے شروع کیے، فیض اور حسرت
ادارے کے بڑے سہرا ہوا۔

قدیم لکھنوی، تہذیب اور شرافت کے محسوس سیرافق حسین بیکر شری رائے میں لکھنؤ سے لاہور چلے آئے اور
میں نے سر سے پہنچنے سے شروع کر دی، حب، وہ دلی سے لاہور آئے ہیں، میں نے ان کے ہمراہ چلا آیا۔ مجھے لاہور سے
بھی عقیدت ہے، کیونکہ وہاں مراپہ سپین گذار، گول باغ میں مرزا ادیب اور اسلام خاں کے ہمراہ قدرت کے زمانے کی گزشتہ
تھا، علامہ محمد اقبال سن لاہور، نرالی کش خانان، سید واجد علی شاہ غرض بہت سی دیکھیں، لاہور جاتی رہتی تھیں۔
برسوں کے بعد لاہور آتا ہوا تو اب وہاں کا فضا بھی بدل چکا تھا۔

ہوئی میں سا ان رنگہ میں فیض صاحب کے پاس جانے لگا تو اخلاق صاحب نے پوچھا کہاں چلے؟ میں نے انھیں بتایا
بلکہ اصرار کیا کہ آپ بھی جلیں چنا چنا جسم دوڑوں پاکستان، انھوں نے دفتر میں فیض کے کمرے میں جا بیٹھے، فیض صاحب کے کمرے پر
دوبی حکیمانہ جسم جو میں مارنے لگا جس میں انہیں بہت سی شاعری تھی، فیض صاحب نے اخلاق صاحب کو مجبور
کر دیا کہ فوراً ہوئی چھوڑ دیں اور ان کی قیام گاہ پر نہیں رہنا منظور کر لیں۔ میں تو خود اسے چاہتا تھا، انھوں نے اخلاق صاحب کو
منالیا اور اپنے نوکر کو بھیج کر ہمارا سامان، بیگ شاہ نواز کے مکان پر وہاں وہ خود مقیم تھے، بھجوا دیا۔

اس وقت فیض کے کمرے میں حسرت، میان محمد شعیب و جواس وقت پاکستان کے ان کے چیلر رہتے
تھے۔ اور مفارقات ہو چکے تھے۔ مسلمان دوست اور ملندہ ہنگی سے وفاب اللہ تھے۔ اتنے میں میان افتخار الدین کھدو کی
سلیپر رائی میں بوس، برقی چکا چور، کاکٹر کسے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے معافی مانگی کی وہ ملاعت بے جا کرتے ہیں،
فالو کر سکی کرے اور نہ تھی۔ میں میان صاحب کو کچھ کر لکھتا تھا، ابویا۔ اور اپنی کرسی انھیں پیش کرنی چاہی۔ میان صاحب
نے پوری قوت سے کرسی میں بیٹھا دیا اور خود فیض کی میز پر بیٹھ گئے، حسرت دو تین منٹ تک اخباری اشاعتی امور پڑھتے
کی اور شہرہ گردن میں گرے سے نکل گئے، بھٹوئی دیر میں میان صاحب بھر آدھ کے اور اخلاق صاحب سے بہ ارادہ دوسرے
دن دوبیسرے کے کھانے کے لئے فرانس کی اور فیض کی سفارش، پر اخلاق حیدر صاحب کی منظوری لے کر لے۔

رات کو ہرسم لوگ فیض صاحب کے مہمان رہے اور رات گئے تک جانے کی رائی میں کھلے آسمان کے نیچے ہنگ
پر لے لے باتیں کرتے رہے۔ فیض صاحب تو ظاہر ہے بقول ڈاکٹر رشید جیانا، بولتے ہیں۔ اخلاق صاحب کیسے

گھٹ کر رہے۔ لہذا بود و بکاشت در اندر نکستم۔

آخر میں یہ قیامت خیز شکامہ گرم ہو گیا۔ قتل و خون، لوٹ مار اور غارت گری کی کڑی دھوپ میں مسکتی اور کراہتی آبادیاں بیکر بکریوں کی طرح اڑھتے اڑھتے قتل ہو گئیں۔ دلی حواداد اور فضلا کا مسکن اور امن بھی مسم لوگوں سے اپنا دامن عاقبت سمیٹ چکی تھی اور زار غمی برائے قلیے کا عریض و بسط اساطیر بھی پناہ گزینوں پر تنگ ہو چکا تھا۔ قسمت نے بھی کبھی وہاں دھکیل دیا تھا، عجیب عالم بے بسی اور کس پیر کسی میں دن کش رہے تھے۔ مجازتے ایک دوست سے بتایا کہ دلی کی تباہی میں آنکھیں گھٹی ختم ہو گیا وہ صاحبِ جہاں پر پہنچے تو اخلاق صاحب کو بھی مجازی خیر سنائی اور وہ تسلیم و رضا کے پابند میر کر پٹھے۔ فیض سے بھی تذکرہ آگیا اور بات پرانی ہو گئی۔

میں جب مر کھپ کر صبح سلامت لاہور پہنچا تو فیض نے بے جد غمازت سے مجھے گھایا اس وقت، ہونے لگا کہ مجازتے کسی سے کہلا بھیجا تھا۔ اخلاق صاحب بے چارے بھی بے حد ہر چند کہتے، رسم نے تو امر نسر اور جالندھر کے ولغوی کیہوں میں تھیں ڈھونڈ دیا تھا جہاں تم میریت آگئے تھیک ہے؟

فیض کی انسان دوستی، عالمی برادری کا خوش آئند تصور اور ان کی آفاقی مینڈ فکری ان کی شاعری کے ذریعے ملک کے دھین اور ساس دماخوں میں تھوڑے بڑے پیدائشی بھی برائے قسم ہندو پاک تو جہاں کا دھن ہڑا۔ ان کی شہرت کا پرچم ملکوں کی سرحدوں سے گزرتا رہا اور ان کے دور دراز گوشوں تک جلا رہا۔ دنیا کے مجبور و محکم، کبھی اور ناچار سار لکھوں، انسانوں کی شدید تنقید سے ان کے دل میں لاوا دھینے لگا اور دل میں چھپا ہوا عوام کا درد ان کی نظموں میں حسین و جمیل ترکیبوں اور خوب صورت الفاظ کی شکل میں گڑھنے لگا۔ انھوں نے اپنی محسوسوں کو آفاقیت میں سمجھا دیا جس کا ذکر جا بجا ان کی نظم شاعری میں پایا جاتا ہے۔

نفسِ صحت یاراں نہیں تو کیا کہنے یہ رقص سار سرد و چنار کا موسم
بلے رسم نے نہ بچھا تو اور دیکھئے فروغ گلشن و صورت ہزار کا موسم

میں جب لاہور پہنچا تو بہتے کے لئے ماڈل ٹاؤن میں مکان الاٹ ہو گیا تھا۔ جس دن میں اس مکان میں پہنچا اسی رات کو فیض صاحب اور انیس بھائی میرے بارے میں لائے۔ میں اپنی بے سرو سامانی کو دیکھتا تھا اور کبھی فیض اور بھائی کے کرم تو۔ امی جان (بیگم آغا شاعر) نے اپنے ہاتھ سے کھانا لایا جیسے بھائی نے بے حد تشریفیں کر کے بتول لی۔ امی جان کو کسی تشفی دے کر دونوں رات کو کافی دیر کے بعد سہارے۔ مجھے لاہور سے کراچی آنا پڑ گیا۔ ایک صاحب جو تاکہ میں تھے فوراً "جسٹس دوٹے، مری پورھی، اں جو اپنی عزت لئے اس مکان میں بیٹھی تھیں انھیں وہاں سے نکال بھیجتے کے سامان کر دئے۔ امی جان نے مجھے تار دے کر لہوا اور فیض صاحب کو اطلاع کرائی۔ جو لوگ فیض کو قریب سے جانتے ہیں موت دی اندازہ کر سکتے ہیں کھلا اب سے جھیلے ان کے بس کے کہاں ہیں۔ فیض صاحب نہ صرف خود امی جان کے پاس پہنچے بلکہ اپنے پاس سے ایک معقول قسم کیائیائے دفتر میں میرے نام سے بطور کرانے کے جمع کرادی۔ انھوں نے کثیر تحایات کو ایک خط بھی لکھا، کہ مرحوم آغا شاعر دیوی کا درد ادب میں کیا مقام تھا، ان کی بڑھ اس مکان میں جائز طور پر بیٹھی تھیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔ لاہور پہنچا تو امی جان سے فیض کی عزت اور شرافت کا ذکر سن کر ان کی ان دوستی اور عظمت کا نقش کچھ اوکھڑا ہوا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد سید اخلاق حسین صاحب پیرسٹر جو بعد میں مغربی پاکستان کی کورٹ کے جج بھی ہو گئے تھے ان سے اد خاندان کے ساتھ لاہور میں ہی مقیم ہو چکے تھے۔ محرم شروع ہوا تو یکم اخلاق جو کھنڈی مجالس اور محافل دیکھے ہوئے تھے خواہشمند ہویش کو لاہور کی بھی کوئی مجلس سنی جانے۔ میں لاہور کا پرانا نیا دمندر ہا ہوں مجھ سے رہنمائی کے لئے کہا گیا۔ مجھے صرت پتہ نام تھا کہ موچی دروازے میں لڑا بیٹے ظفر علی خان قرظ لہا ش کی حویلی میں مجلس ہوتی ہے۔ چنانچہ سبھی طے ہوا کہ وہاں چلا جائے۔

شب عاشورہ میں یکم اخلاق اور دوسری مستورات کو لے کر موچی دروازے پہنچا۔ تنگ گلیوں میں بے حد بھرپور تھی۔ بازار میں سیلیں برقی جھنگا ہٹ سے روشن تھیں۔ ہسم لوگ ریلے میں چلے جا رہے تھے، ایک بان والے کی دوکان پر کالی شیر دان کی اور سفید شلو اوریں ہوس فیض صاحب سٹریٹ خرید رہے تھے۔ میں نے ایک کر باز دکھا لیا! بھائی جان! آپ کہاں ہ گئے تھے تم کہاں جا رہے ہو۔ میں نے کہا مستورات کو مجلس میں لے جا رہا ہوں کہنے لگے چلئے ہسم بھی آ رہے ہیں۔ آج کی رات ہسم بھی مجلس میں گئے ہیں نہ کہو ہاں ایسی بھر بھرا ڈیں بھلا آپ سے کہاں ملاقات ہوگی کہنے لگے نہیں کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گے۔

میری جنوں سلمانیوں سے پریشان ہو کر فیض مجھے روکھ نہیں جانے پکے حشوت نرود شہر کا ہنگام ہوا اس وقت کی میری واجب اور نامنا سب زیادتیوں کی لہیر جیسے سے پرشکن ڈالے برداشت کر لیتے ہیں۔ ایک مرتہ وہ ملکابی آئے ہیں اسٹیشن سے ان کی قیام کا حکم ان کے ساتھ رہا۔ اٹھیں خوب ہی بور کیا دوسرے دن ان کا پر دگرام تھا کہ صبح کی گاڑی سے وہ لاہور واپس ہو جائیں گے۔ مجھے اسی رات بجا دل بدھانا پر گیا میں ٹھیک حساب لگا کر شام کو وقت سے پہلے رتبہ ہا ہاں پہنچ گیا۔ جب کراچی کی گاڑی حسیم یا رضا اسٹیشن پر آ کر روکی میری نظروں نے دور سے انھیں دیکھ لیا۔

۱۔ میرا کہنے نظر آملہ مجھ کو لاکھ منزل سے

فیض کھڑکی میں ہاتھ دھکا دیکھی پوری جگہ میں بیٹھے خلاؤں میں گھور رہے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچ کر ان کے بازو سے لپٹ گیا۔ وہ چونک پڑے اور حیران ہو کر بولے۔ ہم یہاں کہاں ہ تم تو کراچی میں تھے۔ میں نے کہا جی چا کہ آپ کو ریتے میں گھروں۔۔۔ قدرت نے موسم بہار کو جڑی نیامنی سے زندگی بخشش تاثیر عطا کی ہے۔ اترج کا مہینہ آئے ہیں آسمان وزمین سے گویا رنگ و لہر کی بارش ہونے لگتی ہے۔ نسیم سحر نکھتوں کے تانلے اڑا کر فضاؤں پرستی ہی مستی محیط کر دیتی ہے۔

اور اترج سہاڑی صبح طلوع ہوتی محرفضاؤں سے دیرانی ٹپک رہی تھی۔ نیلگوں آسمان کی پہنیاہوں میں ہوائی موجیں دیتے سڑوں میں المیہ ساز بجا رہی تھیں۔ موسم کی دیوانہ گری یہ کئی اور بے لطفی میں تبدیل ہونے لگی۔ دہرائی بریں نے محسوس کیا۔

ایک موزج ہوا بیجاں اے میرے نظر آئی

شاہد کہیر آئی زنجیر نظر آئی

زنجیر نظر آئی میں نے دہرایا۔ دل بکھ گیا اور ہسم ناک موڑ ماری ہو گیا۔ سہ پیر کو مقامی روزناموں کے ضمیمے شائع ہو گئے جن میں اسیران سازش کے نام علی حروف میں چھپے تھے۔ ان میں کرنل فیض احمد فیض اور سید سجاد ظہیر بھی تھے۔ ان کی اسیری سے ان کے احباب کو بے حد رنج ہوا۔ ارباب سلوک نے ان کی محرفتاری کو سہرا بنا کر خود فیض نے

اسیری کو محض زندان کی چار دیواری نہ جانا بلکہ محض نے وہاں غلوت اور جلوت میں سوچا سمجھا اور نئی آنے والی نسل کے لئے بڑی غولہوت اور نادرتشیہات کی حریر و پریناں میں لازوال آئینہ کی دیوی کو آراستہ کیا جس کے حسن کی تائینا کی آفتابِ آفاقِ آئینہ بھر جی ہے۔ فیضِ ابد سجاد نظیر کی اسیری پر سب سے اچھی نظم جذبِ قی نے لکھی ہے۔

اے زنداں یہ خالقِ فن ہیں ان کا فن خود ایک سیلاب
اور اے سیلاب کے آگے تیسری بستی جیسے جبابہ !
ان کی غمگینی ایک افسانہ، ان کا تبسم ایک حسن
ان کے بھول سے عطر آگس ہیں فریے، دشت و دمن
اے زنداں اپنی آج سے رکے گی ان کی نگہی ان کی دمک
ہے مانا دیواریں تیسری اتنی ادب کی جیسے فلک
جتنے گئے ہوں گے اندھیارے چاند تارے نکھرے
چاند تارے جب نکھرے گئے یا اندھیارے بکھرے گئے

فیضِ اسیری کے دوران تنہا بھی رہے اور ساتھیوں کے ہمراہ بھی، ان کے ساتھ کی انھیں سر آنکھوں پر بٹھائے تھے۔ انہیں زنداں میں لکھنے پڑھنے اور غور و خوض کرنے کا خوب موقع ملے لیکن زنداں بھر زنداں سے خود کہتے ہیں سے
”تسہرے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں“

بجھا جو روزِ زندان تو دل سے سمجھا ہے گو تیسری بانگ ستاروں سے بکھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہسم نے جبا تھا ہے کاب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی !
دل اندوہ نہیں ہو جاتا تھا لیکن اے عالم بھی اپنے سبب زندوں کو آزمائش نہیں کرتے میرے ہاں پہلی بچی
پیدا ہوئی تو آغا سہروردی نے انھیں جیل میں داخلہ بھیجی۔ فیض نے لکھا کہ اپنی کتابوں یا نوید رکھ دیکھنے چاہئے بچی اسی دن سے
نزدیک لگاری جائے گی۔ سالہ نورنگ کراچی میں عزیز ہمسایہ قزلباش کا مضمون میرا تھی پر شائع ہوا۔ اور ان کی نظر
سے گزرا تو انھوں نے جیل سے یہ لکھ کر دل بڑھایا۔ ”مضمون پسند آیا۔ ایسا مضمون لکھوانے کے لئے مرلے کو جی چاہتا ہے۔“
اسیران سازش کی سپردی عروج شہید سہروردی نے کی تھی۔ فیض نے اسے نظر استحسان دیکھا۔ اسی زمانے
میں سہروردی صاحب سے فیض کے خاص مراسم ہو گئے تھے۔ جب فیض رہا ہوئے تو کراچی کے ہوائی منظر پر ایک دن سرکاری
ادارے سرکاری عمارت میں دیکھا کہ اس وقت کے وزیر اعظم شہید سہروردی کے ساتھ فیض بھی ہوائی جہاز سے برآمد
ہوئے۔ کل تک جو اسیر محض تھا پاکستان کا وزیر اعظم اسے قدر و منزلت سے نوازا رہا تھا۔ جہاز سے برآمد ہونے اور
سہروردی صاحب کے ہمراہ اتر کر بیٹھے تھے، اس کے چہرے پر وہی حکیمانہ تبسم کھاتا کی طرح کھل اٹھا تھا۔
مجھے فیض کی غلوت اور جلوت، ان کے ساتھ کھلنے میں شریک ہونے، ان کی خواب گاہ میں بیٹھ کر انھیں بول کر سنے، اور
ایلس بھائی اددیکھوں کے ساتھ فیض کی صحبت میں اپنی زندگی کے بہترین لمحات گزارنے کی عزت اور سعادت حاصل ہوتی رہی
ہے میں نے کبھی انھیں بد مزاجی یا خستگی کے موڈ میں نہیں دیکھا۔ جب بھی ملے تو سے

سخن اندر دہان درد سنا گھر
ولیکن گفتہ حافظ ازاں

ورنہ غموش ہے اور ان کی غموشیوں میں بھی کتنی بزمِ آفرینیاں، اور کتنی فنِ کر کے جلوہ سانا بیاں ان کے
ذہین دماغ میں حسین و جمیل تصورات ڈھالتی رہتی ہیں۔ ایسے بھابی اپنے ذکی اور ذہین شوہر پر جتنا بھی ناز و افتخار
کریں کم ہے، وہ غمزدہ بات سے بچنے کی نہیں سماں اور ہر گرم دسر سر دین اور زندگی کے نقیب و نسر از میں پرا پریش کی مددگار
اور شریک ہیں۔

ایک دن علی الصبح چائے کی میز پر فیض، بیگم فیض اور بچیوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ فیض بہت پیار سے سلیمہ کو دیکھ رہے
تھے۔ میں نے بھابی سے کہا: خدا کرے آپ کے ہاں کڑا پید ہو اور وہ فیض صاحب کی طرح شاعر بن جائے تو کیا اچھا ہو گا۔ ایسے
بھابی خراسنجیدہ ہو گئیں ”نہیں نہیں آفتاب! خدا کے لئے ایسا نہ کہئے۔ میری بھبی اور دوسری بچی کی طرف اشارہ کر کے بولیں یہی مری
بڑی دولت ہیں۔ شاعری کے لئے فیض ہی کافی ہیں۔“

فیض اپنی والدہ صاحبہ کی بھی بڑی عزت کرتے ہیں۔ لہذا وہ اپنے مسپوت پر کیا فخر محسوس کرتی ہوں گی۔ فیض کی ان کی
دوستی اور عالمگیر انسانی برادری کے نقیب ہونے کی حقیقت۔ یہ انھیں کچھ عرصہ ہو ایسے پراثر لگتا تھا۔ وطن واپس آنے پر کئی جگہ
فیض کی استقبالیہ دعوتیں رہیں۔ پریس کلاب کراچی نے بھی ان کے اعزاز میں استقبالیہ کا اہتمام کیا تھا۔ فیض صاحب نے وہاں اپنے
برفانی مالک کے دو سہ اور اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کئے جب نہ ہمارے ہو گئے تو میں فیض صاحب کو انگ لے گیا اور ان سے کہا،
”آپ کو معلوم ہے کہ مجھے شعر سے کوئی نا سبت نہیں ہے لیکن اسی وقت نذرِ عقیدت کے طور پر چند مصرعے سوروں ہوئے ہیں اور
وہ یہ ہیں:۔“

”نہیں پراثر لے کر وطن واپس آنے پر“

نورِ آسِ فضل بہار لائے ہیں

وطن کے نام پر عزت و وقار لائے ہیں

تری نوا سے جوانی کو بچپن ہے نقیب

وطن میں آنا ایک ہو مگر تو کے نقیب

تجلی سے ملک دار و کسین کی زینت ہے

ترے ہی فیض سے دنیا میں اپنی عزت ہے

مہربا صاحب نے جب مجھے فرمائش کی کہ فن پر تو بہت سے صاحبان لکھیں گے تم مختصر قسم کا مضمون لکھ دو

تو میں ہنسا ہنسا، ہنسا ہنسا و اختتامے گفتگو لگا۔

گھرائے میکہ ام لیک وقت بستی ہیں

کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کمن

افروز عظیم

ماسکو کی ایک رات

برف گر رہی تھی اور ماسکو کی رات کو پراسرار بنا رہی تھی۔ ہماری کاریگروں کو سٹائل سے متاثرہ گھر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ سڑک پر تازہ تازہ سفید برف چھٹی ہوئی تھی۔

نشاٹا اور فیض کچلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نشاٹا کے کپڑے بال گٹھنیرے تھے اور گردن پر بھول رہے تھے۔ وہ فیض کی شخصیت اور شاعری دونوں کو نہیں کھوئی تھی۔ فیض چند دن میں اپنے وطن واپس جانے والے تھے اور اب نشاٹا انھیں اور ان کے دوستوں کو کھانا کھلائے دیے گھر پر جاری تھی جہاں اس کا توہرا دماں جھانوں کا انتظار کر رہے تھے۔

نشاٹا کے شوہر نے بڑی فراخ دلی سے جھانوں کا استقبال کیا۔ کھانا پلٹنے میں اس نے روسی روایت کی پوری لالچ رکھی۔ محفل رات گئے تک گرم رہی۔ نشاٹا کا شوہر فیض سے جھانوں کی تصویریں لیتا رہا اور کہتا رہا "یہ تصویریں اچھے ہندوستانی اور پاکستانی جھانوں کی یاد تازہ کریں گی۔" ہم نشاٹا کے شوہر کی خوش اخلاقی اور شگفتگی پر حیران تھے۔ اس کی آنکھوں سے بڑی ذہانت اور شجاعت فٹک رہی تھی۔ نشاٹا کا حسین چہرہ دکھنا تھا اور مسرت حسین چہرے کو اور بھی حسین بنا دیتی ہے۔

جب ہم کافی پی کی بوتلیں کی طرف متوجہ ہوئے تو ہم سب نشاٹا کو پھر مڑ رہے تھے۔

"برف گر رہی ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور تمہیں پہنچانے جا رہی ہو۔ تمہارا شوہر شاعر شریف ہے۔"

"میں تم لوگوں کو بوتلیں اتار کر سیدھی گھر واپس چلی جاؤں گی۔ اتنا انتظار تو وہ کر ہی لے گا۔" نشاٹا نے شرارت سے اپنے شوہر کے پار سے میں کہا۔

فیض نے بات کاٹ دی اور اپنے نرم لہجے میں کہہ

"نشاٹا دیکھنا۔ تمہارا شوہر تمہیں قتل کر دے گا۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے۔"

فیض کی یہ بات بھی مذاق میں اٹھی اور ہم سب کا رے اُڑ گئے۔

چند من بعد فیض پاکستان آہٹس چلے گئے۔ میں ماسکو ہی میں تھا۔ اس نے نشاٹا مجھے حیران کرتی رہی۔ "مجھے فیض کی کچھ خبر ہے۔ روسی میں

فیض کی نئی نظم کا ترجمہ ہوا ہے۔ بڑی خوبصورت ہے۔"

ٹیلی فون کے غلام بھی جب کبھی ملاقات ہوتی تو فیض کا ذکر ضرور کرتی اور کہتی — "میں نے آنا اچھا آدمی نہیں دیکھا۔ اس نے تو

نصیر احمد زیری

ہیکو سلاو ایکسپریمنٹ فیض کی مقبولیت

میں ایک دلی بدلتی سلاوا میں یونیورسٹی کے قریب ایک ریسٹورانٹ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ایک سلاو شاعر میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں ان کو چند اردو کی نظموں وغیرہ کا سلاو زبان میں ترجمہ کر کے دیدوں تاکہ وہ اپنی سلاو زبان میں ان کو ڈھال سکیں۔ ان کی یہ فرمائش دیری کرنا میرے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ایک تو میرے پاس فیض صاحب کی "دست صبا" اور "نقش فریادی" کی کتابوں کے علاوہ اور کسی شاعر کی کوئی کتاب نہ تھی۔ اور دوسرے پاس رسالے وغیرہ تھے۔ اور دوسرے یہ خیال ہوا کہ وہاں کی شاعری ہماری شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ یہاں والوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ وہاں کی شاعری ردیف اور قافیہ سے بھی آزاد ہے۔ پھر بھی ان کے بہت اہم ارکان نے فیض صاحب کی "تہنائی"، "چند روز ناؤ میری جان" ... لکھے۔ اور رات یوں دل میں تڑی کھنی ہوئی یاد آئی "کارِ جبر کے انھیں دیدیا اور تادم ردیف اور قافیہ انھیں بچھا دیئے۔ اس کے بعد بات آتی گئی ہو گئی چند دنوں میں ان چاروں نظموں کو انہوں نے نظم کی شکل میں ڈھال دیا اور دہچھے دھالنے کے لئے لائے۔ انہوں نے کافی محنت سے کام کیا تھا اور انھیں ان نظموں کو سلاو زبان میں ڈھالنے میں کافی کامیابی بھی ہوئی۔ سلاو کی شکل میں مجھے بھی یہ نظموں کافی پسند آئیں اور میں نے انھیں اس بات کی اجازت دیدی کہ وہ ان نظموں کو کسی ادبی رسالے میں اگر ممکن ہو تو چھپوا سکے ہیں۔ چند سطور میں نے فیض صاحب کی تعریف میں بھی لکھ دیں اور اس طرح سے چند ماہ بعد وہ نظموں وہاں کے ایک ادبی رسالے "SLOVAK POHLADY" میں شائع ہو گئیں۔

اس طرح شروعات ہوئی۔ ان نظموں کے چھپنے کے چند ہی دنوں کے بعد سلاو مصنفین کے پریس کے سکرٹری کا ایک پتہ مجھے ملا کہ اگر میرے پاس وقت ہو تو میں ان سے ایک بہت فوری کام کے سلسلہ میں آکر ملوں۔ ملاقات ہوئے پراہوں نے بتایا کہ فیض صاحب کی جو نظموں چھپ چکی تھیں وہ لوگوں کو بہت پسند آئیں۔ ان کے پریس کے لئے اردو غزل اور نظموں کا مجموعہ اور مختلف شاعروں کا ایک ہزار شعروں کا ترجمہ کروں تو انھیں بہت خوشی ہوگی۔ کتاب حاصل کرنے کے سلسلہ میں تمام ہندوستانیوں کو جو وہاں موجود تھے خط لکھے اور ٹیلی ٹیویٹ ہندوستانی سفارت خانہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اور جتنی کتابیں اور رسالے کم سے کم وقت میں دستیاب ہو سکتے تھے حاصل کر لئے۔ اور دو سال کے اندر اردو کی مختلف ہندوستانی اور پاکستانی نظموں کا ایک مجموعہ تجار کی ایک نظم خواہ مخواہ کے نام سے شائع ہو گیا چونکہ فیض صاحب کی دو کتابیں میرے پاس موجود تھیں اس وجہ سے فیض صاحب ہی کی ایک ایسی شاعر تھے جن کی نظم خواہ مخواہ اس کتاب میں شامل ہوئیں جبکہ دوسرے شاعروں کی تین چار نظموں سے زیادہ نہیں تھیں (سوچ، مات یوں دلیاں چند روز میری جان یوں، تہنائی، مجھ سے پہلی سی جبت، آخری قطار، قریب سے کئے، بھائی کے نام خط، ہم لوگ، تمہارے حن کے نام، موضوع سخن، زندان کی ایک شام، زندان کی صبح) صرف برائی سلاوا میں ۱۹۹۵ء سے یکبر ۱۹۹۶ء تک چار سلاو ادبی رسالوں میں ان کی ۱۷ نظموں اور غزلوں

چھپ چکی ہیں۔

اسی دوران سجاد ظہیر صاحب پراگ تشریف لائے اور انہوں نے فیض صاحب کے ادب پر ایک بہت ہی طویل مقالہ لکھا جو وہاں کے ایک رسالے "نیائے اب" پراگ میں ان کی چند نظموں وغیرہ کے ساتھ شائع ہوا۔ ان نظموں کا ترجمہ ژان ماریک صاحب نے کیا جو پاکستان کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ اس طرح فیض صاحب اردو کے پہلے شاعر تھے جن کا تعارف وہاں والوں سے پوری طرح ہوا اور وہ وہاں پرکا فی مقبول ہوئے۔ ان کی بہت سی نظمیں وغیرہ پراگ اور براتی سلاوا کے ریڈیو اسٹیشن سے بھی نشر ہوئیں۔ اور براتی سلاوا کے شیلی ویشن سے ایک مرتبہ ان کے بارے میں ایک خاص پروگرام بھی نشر کیا گیا اس کے علاوہ ان کی نظمیں:۔ وہاں کے تقریباً تمام ہی ادبی رسالوں میں چھپیں اور چند ہی دنوں میں چیکو سلواکیہ میں وہ اردو کے سب سے مشہور شاعر ہو گئے۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کی "وہ بات سارے فسانہ میں کس کا ذکر نہ تھا" بھی بہت مقبول ہوئی اور بہت سے اخباروں میں چھپی اور ریڈیو اسٹیشن سے بھی نشر کی گئی۔ اس کے بعد سے جیسے ہی ان کی کوئی نظم یا غزل چیکو سلواکیہ پہنچتی، کسی اخبار یا رسالے میں تبصرہ ہو کر چھپ جاتی تھی۔ "خواب سحر" کے اوپر جتنے بھی تبصرے لکھے گئے ان میں فیض صاحب کو خاص طور پر پسند کیا گیا۔ لوگوں کے اصرار پر ۱۹۶۱ء میں ان کی تینوں کتابیں "دست صبا"، "نقش فریادی"، "اردو زنداں نامہ" کا ترجمہ کتابی شکل میں چیک نیاں میں پراگ سے "نقش فریادی" کے نام سے چھپا۔ ۵۰ (کاپیاں) پر ترجمہ ژان ماریک صاحب نے ایک چیک شاعر (K. BEDNAR) کے ساتھ مل کر کیا۔

فیض کی چیکو سلواکیہ میں مقبولیت کا پتہ ان دو باتوں سے چل سکتا ہے کہ چیک زبان میں "نقش فریادی" دو بیٹے میں یک گئی (چیکو سلواکیہ میں دو قومی اردو زبان میں ہیں۔ اس کی کل آبادی ۱۱ ملین کے قریب ہے۔ ان میں سے ۳ ملین سلواکیہ ہیں اور سلواکیہ کا صوبائی دار الحکومت شہر براتی سلاوا) اور اب اس سال ان کی تینوں کتابیں کا ترجمہ "دست صبا" کے نام سے براتی سلاوا میں شائع ہو رہا ہے۔

فیض صاحب چیکو سلواکیہ کے تمام ادبی حلقوں میں مقبول اور مشہور ہیں۔ ان کی مقبولیت ان کو "لیٹن انعام" جتنے کے بعد سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی جو شاید ہی کوئی ادب سے دل چسپی رکھنے والا ہو جو چیکو سلواکیہ میں ان کے نام اور کلام سے واقف نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہے کہ فیض صاحب ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں میں پہلے شاعر ہیں جو ٹیگور کے بعد وہاں مشہور اور مقبول ہوئے۔ اس بات میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کی ذات کا اردو زبان کو مشہور اور پادور کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ہے چیکو سلواکیہ میں اردو ادب میں ان کی حیثیت اس سنگ میل کی سی ہے جسے بغیر دیکھے اور سامنے آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔

(براتی سلاوا "سے)

ماسکو کے ایک رات

(صفحہ ۲۴۱ سے آگے)

اتنا اچھا شاعر ہے۔

لیکن کچھ دنوں بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو تاشا کی ایک دوست نے عجیب خبر سنائی۔

"بہن! نہیں میں یقین نہیں کر سکتا۔" میرے منہ سے نکلا

رات، رات، آواز! کیا ایک فیض کی بات یاد آئی۔

"جی ہاں! دیکھنا تمہارا خوب تر تمہیں قتل کر دے گا۔"

اور واقعی تاشا کے شوہر نے اپنی حسین بیوی کو قتل کر دیا تھا۔

شمیم حنفی

فیض احمد فیض - چند تراویح

مئی ۱۹۶۰ء کی اس رات کو اللہ باریس کیسے شاعر مختلف اطراف و اکناف سے سورت کی شاعروں کی طرح ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے۔ اردو سماج کی جانب سے فراق صاحب کے زیر اہتمام انڈیا پک شاعرہ بورا تھا۔ اس شاعرہ میں ساحر گئے تھے جن کی طویل نظم پر چائیاں اس سے کبھی عرصہ قبل شایع ہوئی تھی اداس کے آستانہ صیغے متر فرمودے نے جانے کتنے زمیوں میں سوئی ہوئی تصورات کی پرھائیاں اُجھائی دی تھیں۔ حیدر آباد کا کافی شاعر قدوم بی الدین تھا جس کا لائونگی کی طرح بھجپا ہوا چہرہ وارہ۔ ریخ نوبت کی طرح تہی ہوئی آواز میں کے سوز و سانس میں آنکھوں سے غنٹ کشوں کے آنسو غم ہو کر اُسے خلسہ شمیم کا شہم تھاتھتے ہیں اداس کے ہونٹوں سے نکلنے والے گیت ایوان انتظار کے دروازوں پر بادلوں کی ٹھن گرتے سے زیادہ مہیب آواز میں منتقل ہو کر دھنک جیتے ہیں۔ جان شاعر تھے جن کی بڑی بڑی سی بے پردہ آواز نے نظریات والی شخصیت میں دیا ہوا نزل کو زندہ میں دس محول رہا تھا۔ اور۔۔۔ اداسیت سے شاعر تھے مگر جس شاعر کو دیکھنے کے لئے سنگھیں تیس اداس بے قرار تھا۔ وہ فیض تھے جو اس سیر کو محدود کر کے ہندوستان کہتے تھے جس کے سامنے نے پانچ دہائیوں کے علاوہ ہر کے ایک چھٹے دہائی کا اباں بھی دکھایا تھا۔ جنوں سے معقول آواز کی منزل گراچی آئیں منزلیں نہیں سمجھا تھا۔ اداس اپنی شہری ہوئی آواز، رومی کے لیکن پرانہ لہجے میں "واع داغ اجاے، اور شب گزردہ سو کی طشت دیکھ کر اپنی آنسو دگی کا اظہار کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔

ابھی گزری شب میں کی نہیں آئی

فات دیدہ دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے پہلو کوہ منزل ابھی نہیں آئی

ساحر نے اپنی نظم پر چائیاں سنائی پھر لوگوں کے اصرار سے فیض نے بیکراں قل اداس کے بعد غزل کی سب سے سادی لیکن توانا اور پُر اثر آواز نے سادی فضائیہ پر ترنم کی جلا بھیلا دتی ہے

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی چھفتا ہی نہیں

موم بن جاؤ گھس جاؤ کہ کچھ رات گئے

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اٹکا ہے گچل کر رات کی رنگ رنگ میں سرایت کر گئے ہوں۔ بڑی شدید گرتی تھی۔ مشاعرہ پڑاں میں ہر طرز لوگوں نے اپنے ردائل کمال لئے تھے۔ اور فوری گہری سانسیں جیتے ہوئے اپنے دامن یاد دہانی جلاتے ہیں۔ وہ ہر کس اخبار یا سامنے کو نپکھنے کی طرح ہارے تھے لیکن

کتابیں بار بار دلائل پر ایک کے ساتھ کھڑے ہوتے شرع سے ہٹ کر سد و شافع و کرب سفید نش خرق اور تپلن میں لمبوس، میدھے ساتھ ادب و عزم کے اس شاعر پر لڑ ہی نہیں جولا ہادی گرنی سے۔ متنازع کے شوق و غل سے۔ وہ حسین کے جنگاؤں سے اور شاہ کرب اپنے جد سے نے نیا زونو میں مگر یہ دبا سے غور سے اشعار پڑھتے ہوتے شاعر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بٹانی پر نیک نفسی اور مادہ مزاج کی چمک تھی، اے ام صی فسدگی میں لٹی ہوئی آنکھیں پڑھیں اور ان میں کمی بھی مگر یہ کہ دھوئیں سے پکھنے کے لئے ایک ذرا سا سبز جاتی تھیں اور انش سبیل کی آج کا میر سکتے ہوئے، وقت میرا دی طور پر کچھ ایسا اور ادب افکار کر لیتے تھے۔ یہ بہتر ہو۔

یہ بغیر تھے۔

مذہبی، یہ بعد از حق تعالیٰ نے اپنی گیسو کے شب کھنٹی ہوئی کدو میں بڑی دہشت کے ساتھ فیض کا تعارف کرایا اور عہدہ امتہ نے ہوا کو سر سے زائض انجام دے رہے تھے۔ فیض کا کام چلا رہا، ان کی باز آؤں نے جد ہات سے کانپ رہی تھی اور پستل پر ایک ایسے سرخی عود کو کئی تھی، ہوا خلی مرت کا رد عمل ہوئی ہے۔

فیض نے مگر یہ کامیاب ہوا اور اس کے پیچھے پیچیدگی دیا۔ ناموشی سے اٹھے اور مرکز سے ہٹے، انک کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگ اچانک اپنی لمبوں پر ایک کے کھڑے ہو گئے، کچھ لوگ جینے لگے، کچھ تالیاں بجانے لگے، کچھ پیسے سے بھی بیاہ خاموش ہو گئے اور مشاعرے بڑاں کی صورت سے نکل کر بی بی اور ان کے پیچھے بیلاب نے سامنے لٹکا کر بی بی پیٹ لے رہے ہیں۔

مذہب دیا ہی بھی ہے، یہاں ستر کا انڈر کمر دوانگی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میں ایک ملک فیض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی جس میں نہ تو ناخوشگاری، نہ غور یا پتھر جیسی کڑواہٹ تھی، اور نہ خرد خد کا کج دوسرا۔ خدا خدا کر کے خود تھم ہوا۔ پھر رگ اس طرح ہر بہ لب اور مالک دہا ہو کر مینہ لگے گویا چند لمحوں پہلے تو سب نے شرمے ان سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔

فیض نے کوئی تکرار نہیں کی۔ بس اسی کے طور پر چند لمحوں میں لوگوں کے اظہار و عہدہ کے شاعر کا ادراک اور اپنے شاعرانے لگے۔ اب لوگ بھڑکے نہیں کروا دوسرے تھے۔ فیض کے اشعار میں نہ تو رہن و رہبان کی قربت، نہ پاؤں نہیں ہن کے نظارے، کچھ کر کسی زمانے میں لوگ اس قدر چھینے تھے کہ چھینیں اور نہ ہی ان میں جذبات کا طوفان تھا جو سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے احساس کے سروں میں اٹھ پیدا کرتا تھا۔ ایک سیدھی، سادہ، گہری، مینن اور سوچا میں ٹوٹی ہوئی آواز تھی، جو درد و کرب کا کثرتی پرک، وہ کہنے کے بجائے سوچ میں داخل دیتی تھی۔ اور لوگ کھوئے کھوئے تھے، اس کو دیکھ کر ہم میں اچھے ہوتے اور اس آواز میں کچھ بھی ہوئے سروں کی باہر میں ہا میں دھلے اس کے ساتھ ساتھ ایک ٹکڑی سبز پر بل کھڑے ہوتے تھے، ہر نفس کی دیا، جیسی زندگی میں لگے ہوتے۔ درد کی پوزیٹو کی طرف خاموش اشارے کرتی ہوئی، اب بہتوں غزل لے اور دل میں غموں کی قندیل جلائے آئے، بڑھتی جا رہی تھی۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ فیض کی آواز اور این کے خیال میں کیا گہرا اور اڑت رشتہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کس قدر ہم آہنگ ہیں۔ وہ شاعر جو سامتی نظام کے سرخ و سبز ہوتے ہوتے دھانچے کو کچھ کر ستر یا قتیابی کے ہڈ ہات سے منسوب ہو کر فلک شگاہت توجہ لگانے کے بجائے بڑی صبری اور فکر انجین اور این نظام کے ناخون سے میں اٹا کہتا ہے۔

مشیشوں کا سیمیا کرنی نہیں
گیا اس لئے سے بیٹھے ہو

جاننا چاہتا تھا۔

استقام صاحب چند منٹ باؤ کر کے سے باہر گئے۔ منیڈر گئے اور پانچ بجے میں سب سمن کمرے کمرے سے، پیر سے سادہ، منیر، سیدہ، اور باوقار!

چائے کے کپے کپے چائے کے سائے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بد میں اپنے مطلب پر لگی۔

”آپ کے نزدیک فیض کی مقبولیت کا بنیادی سبب کیا ہے؟“ یہ پیرا پہلا سوال تھا۔

ایک لمحے کے لئے استقام صاحب کی بیشاپی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ”فیض کی مقبولیت کے بنیادی سبب کی تلاش میں چند اور اسباب پر بھی غور کروں، غور کروں، غور کروں۔ سب کو لفظی سبب کو لفظی سبب کہتے ہیں۔ مثلاً ترقی پسند تحریک اور اس سے ان کی گہری وابستگی، ایسی علامتوں کا استعمال جو نئی ہونے کے باوجود کلاسیکی روایات سے بھی اپنا گہرا رشتہ رکھتی ہیں، تیسرے گہرے فلسفیانہ مبہم خیالات کے بجائے عامۃ الورد و جڑات اور خیالات کا اظہار، جو نئے انداز بیان میں وہ انبیاء کی رشتہ جڑوں کے تخلیق، استقام سے پیرا ہونے کے لئے۔ لیکن مجھے سب سے اہم چیز ان کی شاعری کی وہ متنوع و کیفیت نظر آتی ہے جو ان کے تباہی نہیں خیالات اور جذبات میں بھی جاری و ساری ہے۔ یوں تو یہ ایک حقیقت ہے کہ نثر کی کلاسیکی روایت پر غور کر کے دیکھنے والے سے قریب تر ترقی پسند فیض نے نثر کی ترقی کے سبب کی ایک بنیادی عنصر کی طرح استعمال کیا ہے۔ اگر اس کی نثر کی حیات سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فیض کے یہاں وہ خارجی اثرات جن سے ذہن اور جذبہ میں تحریک برپا ہوئی تھی، وقت تک شوکا یکراہ اختیار نہیں کرتے۔ سبب ان کی داخلی دنیا میں بھی ان سے عجیب نہیں پیدا ہوتا، اور سبب کا شعور فن کا رکن حیثیت سے ان کا کمالی اس میں ظاہر ہوتا ہے کہ خارجی اثرات کے نمایاں پہلوؤں اور داخلی کیفیات کے عجیب کو وہ ذہم اور طبیعت، ان کا اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سبب پر سبب کی ایک اندرونی لہریں تند تیز ہوتی ہیں ان کا ایک عنصر یا آواز ہے۔“

انکے کمرے کے چوڑائی میں، بیٹھنا چاہی

سین کی گوان کے فن کی بنیادی صفت قرار دیتا ہوں۔ یعنی ”سبب“ ”گروہ“ ”حیثیت“ میں نہ ڈھکنے ان کی شاعری میں جگہ نہیں پاتا۔ اس طرح ان کے فن کی بنیادی خوبی یہی قرار دے سکتے ہیں کہ وہ متنوع اور متنوع کا سارا جو شہ و ترش نشہ و رنگ بن جاتا ہے اور قدر احساس ہر دل کو جیتا ہے۔ اس کو علامات کافی استعمال بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ علامتیں سبب ایک شخص اور اجتماعی دلوں کو نہیں مانتیں ایک ہم نواز سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر میں فیض کی مقبولیت کا بنیادی سبب خیالات اور جذبات کے مخصوص اور شخصی یا انفرادی پہلوؤں کو ان علامتوں میں دھکا دینے کی کامیاب کوشش نہیں کہ جو ہر سطح کے ذہن کو بھی قبول اور جذبہ کے اندرونی وصف کی بنا پر عمومی ہوت کی حیثیت سے کبھی انہما کی قدرت کے سبب اور کبھی بعض اس لئے ابہام کی وجہ سے جو ذہن کو فضا میں تیرنے کے لئے لگا سکا تھا، متاثر کرتی ہے اس طرح شاعر کے نقطہ نظر سے خود فن کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور اس کے قاری یا سامنے نقطہ نظر سے اثر پذیری کے۔“

انسانیت کے بعد استقام صاحب فراموش ہو گئے تو میں نے پھر عرض کیا: ”آپ فرماتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کی قبولیت، دوسرے تحریک سے فیض کی گہری وابستگی بھی ان کی مقبولیت کا ایک بنیادی سبب ہے۔ فیض سے قطع نظر میرے منہ و شمار سے اپنے آپ کو اس تحریک سے اور زیادہ شدت کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ پھر بھی انہیں فیض کی ایسی مقبولیت نہیں مل سکی اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟“

استقام صاحب نے فرمایا: ”مجھے، ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اس کے سہارے طویل ہرمان، یہ تو فیض کی ایک ضمنی سبب تھا۔ اس لئے میں نے اس کو بنیادی سبب نہیں دی۔ اس سے بڑا سبب وہ تھا جو ان کے اس طرز فکر سے تعلق رکھتا ہے جس کا سبب استقامت و ثابتیت یا قدیم

ادب عالیہ کی عظمت، اور جدید ادب کی بے چین ادبہ قرار میں مل گئی ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات اس دور کے بعض دوسرے شعرا کے یہاں بھی لکھی جاسکتی ہے۔ میں اس کا منکر نہیں ہوں۔ لیکن مسیہ خیالی میں کسی دوسرے شاعر نے اتنے جیسے شعور کے ساتھ روایت اور کلاسیکیت کو ایک کرنے کی کوشش نہیں کی جتنی فیض نے۔ اور یہ سب کچھ ایک مصنوعی انداز میں نہیں بلکہ اپنی ادبی عداوت اور جہتی انداز کے بیچ احساس اور اپنے جذبہ کے تقاضوں کے بھیج اور ان کے نتیجے کے طور پر۔ یہ شعور اساتذہ فن اور انہماک میں بے شک ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ غزل اپنی معنوی، نفسیاتی، موقی، اور جذباتی تہیں رکھنے کی وجہ سے اپنے استغناء کرنے والے شعور کا پائلہ ہوتا ہے۔ یہیں وہ فرق ظاہر ہوتا ہے جس کی وضاحت میں نے اشارہ کیا ہے۔

”انوارِ دغزل کے دوسرے سرباز کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ کسی صنعت میں فیض کے انوار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ فیض غزل گو کی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہیں۔ یا انھوں کی حیثیت سے؟“ یہ میرا سب سے سواں تھا۔

اشتہار صاحب دھستے سے بولے: ”آپ کے پندرہ سو سال کے جواب میں میں نے فیض کی شاعری کی جیسا ہی مختصر تعریف وہ منزل لاندہ کیفیت بتائی تھی جو ان کی شخصیت اور دہریں جاری و راری سب اس لئے تھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں کی نظموں کے فرق میں اتنی کیفیت کے دوسرے ایک طرے کی یک رنگی پیدا کر دی ہے۔ بس چونکہ نظم و غزل کے تقاضے جدا جدا ہیں اس لئے نئے نئے حیثیت سے وہ دونوں کی حیثیت الگ ہو رہی ہے مگر ایک ہی فن کی عداوتوں کے استعمال اور ایک ہی طرح کے جذبات اور خیالات کے انہماک میں ایک دوسرے سے قریب تر کر رہا ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ شعرِ غزل میں فرق نہیں کرسکتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی فن کے ایک ہی فن کی کیفیت، ایک ہی دل کا کرب، ایک ہی شخصیت کی شورش انہماک، کچھ مربوط اور کچھ غیر مربوط و متعلق میں غما، بھری ہے۔ نظموں میں بھی رعبی، ایماز، استعداد اور انھماک کے ایک جگہ کیا ہو کر پیش پایا جا رہا ہے۔ جو غزل کے انفرادی شعاری جذبے، اس لحاظ سے کچھ بھی دونوں میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ میں فانی طور پر ان کی دستبرد میں اور چند نظموں پسند کرتا ہوں اور یہ غرض کہ شائد یہ خود میرے مزاج کی عادت اسے مدنظر رکھ کر ان کی شخصیت سے ان کی نظموں میں اتنی ہی توجہ دیتا اور ہر اثر میں جتنی ان کی غزلیں ہیں۔

اشتہار صاحب کے فاشوش ہرستہ ہی اچانک مجھے چند روز قبل کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کسی زمانے کی دورانی کرتے وقت میری نظموں کے چند نمونے پڑھ کر تھی جن میں انھوں نے اپنے اس خیال کا اخبار کیا تھا کہ سودا کے کام کی عام سطح انھیں میرے زیادہ بلند معلوم ہو رہی ہے اور یہاں تک مجھے یاد آ رہا ہے۔ فیض نے شاید یہ بھی لکھا تھا کہ انھیں ”سودا کا کھانا“ یاد دہانی خیال انگیز اور پورا پورا بھی غصہ ہوا۔

میں نے اس واقعے کی مختصر اشارہ کیا تو اشتہار صاحب نے فرمے: ”اے۔۔۔ یہ تو انفرادی پسند کا معاملہ ہے، اداس کی ذمہ داری تمام فیض پر ہے۔ میں نے فیض کے یہ سب نہیں دیکھے اس لئے اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا۔ ہاں اگر فیض کی بددستی میں فیض کے اس خیال کا جائزہ لیا جائے تو یہ جہاں جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں جو غم، گیزی اور مری کی سی دہری رعبی، کیفیت فنی ہے، زندگی کا بے حساس ہونا ہے، ہر کلمہ شاعر کے کام کے مطابق ہے، انھیں اس کی اہمیت ملتا ہے اور وہ خود اس کے یہاں نشاط کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس میں فیض شاعر اپنی تمام خواہشوں کی غزل یا لطیفے ہوں۔ انہوں نے اپنی قید کے زمانے میں سودا کا کھانا لکھا تھا اور ترقی نامہ کی کئی غزلیں سودا کی غزلوں پر کہی تھیں۔ لیکن خود اسے ان کی شاعری نے کوئی نمایاں اثر قبول نہیں کیا۔ البتہ مزید کہ انہوں نے کہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔“

”آپ کے خیال میں فیض کا مستقبل کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”مستقبل کا فیصلہ تو مستقبل ہی کرے گا۔“ اشتہار صاحب نے جواب دیا۔ ”میرا کہ بہت سے قديم شعراء ہیں جن کا ان کے عہد میں کوئی مستقبل نہ تھا۔“

مٹا لینے کے واسطے ہیں اور بہت سے ادیب جو پہلے عہد کی ادبی زندگی کے سن سنا تھے کچھ زمین پر سے نہ بھڑے ہوئے ہیں اس سے مستقبل کے مستقبل وطن کی پیشہ گوئی ایک طرک کیس سے مزید کچھ نہیں ہے۔ تاہم ہمیں یہ حقیقت صاف ہے کہ ہم کو کچھ نہیں چاہیے وہ ہمیں غلط ہی کہوں نہ کہے۔ اس دنیا پر نہیں سمجھتا ہوں کہ فیض اپنے اس جیادوں وصف کی وجہ سے جسے میں نے متغزلانہ کیف کہا ہے مستقبل میں ایک اونچے مقام پر رکھے جائیں گے کیونکہ انسانی شعور کتنا ہی بڑے غالب ہے ان کی ان دھڑکنوں کو کہیں بدل کے گاؤں جس اور محبت کی کشمکش سے، جذبات کی ناسروگی سے، خوب سے خوب تر یعنی خواہش سے، لغتور جان کے ہوئے کے ٹاپٹیٹے رہنے سے اور سن کا مارا اس بچوں پیشگی بے پناہ خواہش سے لقمہ رکھتی ہیں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ ان کی یہ مادی خواہشیں مر جائیں تو نہ میر زندہ رہیں گے نہ غالب، نہ شکیبہ، نہ کالیداس۔

اب میں یہ فیض کی شانوں سے بڑے کر فیض کے اس کچھ کچھ ناکوں، ڈالہروں، بیاجوں اور ترقیاتی منہ میں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں تو تیسری نظر سے گذرے تھے۔ میر اس سرائی پر کہ "فیض کی تہذیبی یا دوسری شرقی تہذیب کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے؟"

انتظام مصائب نے فرمایا ہے۔ میں تھمری طور پر فیض کے نام میں کا مجموعہ میں ان دیکھا تھا۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرے کے ہاتھ وار ادب کے مطالعے سے وقت شخص کے خیالات میں جو ارتقار کے ساتھ ساتھ آتے ان کے مطالعے سے یہ انداز ضرور ہوتا ہے کہ وہ خود ادب میں فن کی تہذیب کو کیا اور اپنا مقام دینا چاہتے ہیں اور اس ادب کو ادب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں تو محض کوئی اہل علم ہی ہو جائے گا۔ فیض نے ان خیالات پر گفتگو کرنا ہے۔ ان کے ابتدائی مضامین میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ "وہ جس نے اس میں جس ترقی پسند ترقی کے تخیلی طور سے کوئی نہ مل نظر انداز کرے۔ تھم اس وقت بھی ترقی کے انجیل ہے۔ دو۔ چنانچہ ادب تعلیم کا ادارہ۔ اس کے ہاتھ میں وہ سماجی ترقی کے اعتبار سے نقطہ نظر کا ترجمان بننے کے بجائے اپنے بڑے ادب کا نامزد بن رہا۔ ان کی تہذیبی ترقی کے مستقبل میں وہ ایک کچھ کچھ سماجی ہو گا مگر ایک ملک میں کی مادی تہذیب کے لئے اسے سامنے نہیں ہے۔"

اب کا وہ وقت گذر چکا تھا۔ دھوپ بھی اچھی چھڑ گئی تھی۔ انتظام مصائب اسی دن صبح کو کھڑے ہوئے تھے اس نے اس نے غنیمت کا سانس اڑائے تھوڑے کے بچانے میں یہ تم کو یہ انسان سے اس وقت کے کرشت ہو گیا۔

— "فیض کا لائٹا ہوا آٹا فیضی ذرا آج ملی اور بے نیازی کی غمازی

کر رہا ہے۔ اور ابھی کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پروا نہیں ہے۔

اس سے صرف ان کی کتابیں ضرور مستثنیٰ ہیں جنہیں وہ بڑی حریفانہ نظروں

سے دیکھتے ہیں۔ اور ابھی اس طرح اپنے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ جیسے

کوئی سدا زر اور بیکل اپنے مال و دولت پر اپنی جان نچھاور کر رہا ہو،

لیکن کوئی شخص ان سے کتاب مانگتا ہے تو ان سے انکار بھی بن نہیں پڑتا۔

جب میں ان سے پوچھتی ہوں کہ تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب بیچوں دے دی؟

معلوم نہیں اب وہ واپس بھی ملے گی یا نہیں؟ تو وہ بڑی شرافت اور ہوشیاری سے

جواب دیتے ہیں۔ "بے شک کوئی اس کتاب کو پڑھتا ہے اسے دینے کا خطرہ مول

لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

میں غور سے اس دور میں سے رشتہ قلب استوار کرتے رہے۔

آرتھوڈوکس، یونیورسٹی، جیو، ایم ایل، سائنس میں میدان صاف نہیں تھا، صاف میں حریفوں کے ساتھ کھڑے ہو کر کھیلنا پڑا۔
خوشامتی ہو کر گھر کا فخر بن سکا۔ یہ وہ وقت تھا کہ پچھلے صبح ہوگا کہ چھ پر سوانہ ہے نہ جہاںوں کے کھیل کی مثال زیادہ عادی آگئی۔ ایک سال بعد
عادت جواب پاکستان ٹائمز میں اپنی زبان میں سامنے ہو گئے، عادت نے وابستگی اس لیے پیدا کر دی کہ انہیں فیض کا ترجمہ حاصل کرنا چاہی
اس زمانہ میں دلی میں مقیم تھے۔ عارف فیض کا یہ کہہ اکثر روایت کرتے اور میں بوسے یاد سے شام جان تازہ کرنا دہرایا

کھینچو تو ہر خدا آج ذکر یا پھلے

اکتوبر ۱۹۶۷ء میں کئی بار ہمدرد ہوا، فیض پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ مجھے کوئی علم تھا کہ فیض کچھ
کماؤ پر مبنی تھے وہیں، جو میرے عزیز کارکن ہیں ان کے سامنے ان کا معترف ہے، رشتہ میں تو شراب دار بننا ہے، اسی قدر جبکہ پاکستان فیض
سے زیادہ شرمناک شہرتوں ہوگا؟ میدان صاف، میدان ادب میں پیچھے ہٹنے والے عیسیت کے مضمون ہے، ہر اٹھا، اصناف، شاعر، سیاست دان
کو کہہ کر خود کو نادمہ اس وقت کہتے ہیں، اس کے برعکس فیض حقیقت ایک عظیم شاعر، ایک سٹوڈنٹ، ایک پندرہ سالہ بچہ تھا، ان دنوں اس وقت سے
بڑھ کر ایک عظیم انسان ہیں۔ ان کا حسن اطلاق، ان کی سادگی اور ان کی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

لاہور کے دوران قیام میں اپنے شفیق استاد اور بزرگ صحافی عبدالحیہ ملک سے، میر تقی میر سے اور ایک نہایت ہی دلکش سنی ڈانر
تاہیر سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اکثر پاکستان ٹائمز کے دفتر گیا اور فیض سے فیضان حاصل کرنے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی، لیکن ان سے ملنے کا جلیبت
کی جھک مائل رہی، وہ جبکہ برطانوی کی تلاش پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اس جھک پر تباہی کے لیے ہر ممکن سہ کی اپنے آپ میں فیض سے
ملاقات کا وعدہ پیدا کیا، کچھ دنوں بعد فیض کو کراچی آئے اور میر تقی میر سے ملنے کے لیے لاہور میں سب دستر تھے۔ علم کرنے پر
میں نے خوف سے ملاقات کا وقت مل گیا اور اگلے روز صبح ہوئی کون جیڈ ملک بنگلہ پر موجود تھے۔ صبح فیض تھے، میں وہ گینت کس طرح
بیان کر دیں جس میں دھڑکتے دل، رزت دھڑکتے سر سے کمرے میں داخل ہوا، فیض بڑے تپاکی سے ملے، ان کے لیے کھانسی اور دھیمی چلنے
ان کی جلی جلی مکرر مٹ نے مجھے حیرت انگیز کیا، فیض کو میں نے دھان پان لڑنا یا سیکھنا، ان کا تپاکی میں ہر روز عذاب ملی سے سیر زمین سے تھیر
کیا تھا وہ اب ایک مکمل پڑھناؤں اور پڑھناؤں کے دھڑ میں میرے سامنے تھا، یہی آکھوں نہ کھیں کہ فیض متاثر ہوئے ہیں وہ شگفتگی جو، دیم کی رنگ
فرما، آہٹ سے پیدا ہوئی ہے۔

میں نے بات کی اور پھر دوبارہ دیکھا، آہٹ سے اس دور میں گیا وہ سال کا فرق تھا۔ مرمال کے اس قید سے فیض نے میر تقی میر
میں کچھ اضافہ ہی کیا تھا۔ کئی دن کی تھی۔

فیض نے جامعہ کی پیالی سے ایک اینٹی کی ڈائننگ کی جس میں شکر قرعے زیادہ تھی۔ دل چاہتا تھا کہ زیادہ وقت گزاروں، مگر گھر کو بار بار
بانا اور فیض کا زیادہ وقت لینا میں سے مناسب سمجھا، آخر میں کون تھا کہ زیادہ وقت کا حقدار ہوتا؟ اجازت لی، واپس ہوا اور افغان مغارت خانہ
ملک دارالعلوم کو بار بار رٹ کر دیکھتا رہا۔

کچھ دنوں بعد وقت شام پانچ بجی ساڑھے گیس میں فیض کا نام آیا، فیض اور وطن سے بندت اور نہایت ہی ان ایام مصیبت میں، ان کے اہل
نصایک بت تڑا تھا، برسوں اس پر رنگا رنگ نقش کار کی تھی، عقیدت کے جھولے چلے تھے۔ وابستگی کی جوت ملانی تھی، آج ایک
تریب سے کس زری وطن ٹوٹ گیا، اب اس ٹوٹے ہوئے بیت کے طرف جتنا کرتے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ دل کو مجھ پر جھلکا ہوا تھا، اور ملک کو دل بڑھ

پیراغر، شیشے، اصل دگر ۛ سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
 یل ٹکٹ، ٹکٹ ہوں تو فقط ۛ بچتے ہیں بھروسہ راتے ہیں
 قہا حق شیشے چن چن کر ۛ دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
 خدیشوں کا مسیحا کوئی نہیں ۛ کیا اس لگائے بیٹھے ہو

بات یہ تھی کہ وقتی صافحی جذباتیت نے مجھے بڑی طرح متاثر کر رکھا تھا۔ سماجی شعور، لاشعور کے بہ تدریج پرورد میں کہیں
 جا کر چھپ گیا تھا۔ فسادات کی ہول کی برسرِ اقتدار ربط کی شقاوت اور کثیر کی سہیلی، اوسے چاہنگ نے دل کو بڑی طرح جبرج کر رکھا تھا۔ اس
 وقت اگر کوئی مسلح قہا نہ کرے گا کہ موثر اور واضح تصور پیش کرنا تو میں بخوشی اسے قبول کر لیتا۔

در اصل کبھی کبھی مجھ پر بدینی ناچنگ کا دورہ چلتا ہے اپنی زندگی کی کٹکٹش، اسی تضاد میں گذری ہے کبھی دل اپنا کبھی دل پر کیا۔
 فیض مریم سے زیادہ نشتر کے قائل ہیں میرے لئے وقت سے زیادہ خود فیض نے مریم کے چہانے کا کام کیا۔ میرے دیکھ میرا مت کہیں سے
 ٹوٹا نہ تھا، شائد خواب میں اسے ٹوٹا ہوا دیکھا تھا۔ اس کا رشتہ، اک خواب خدا، دروغ کیا تو پتہ چلا

مریم سوار گر کے خاک ہوئی ۛ رونق خاک آستہاں ہے دی
 اک بلک بیٹا، فیض نید سے رہا ہوں، انھیں یمن انعام ۛ ان کے ترک وطن کی انواہر سنیں، لیکن شکستہ میں وہ وطن لوٹ آئے
 پیراگر، سنا کہ فیض ہمدان کا بیٹا ہیں پریل ہو گئے۔ اتفاق سے مسیحا نام کا بیٹا کی سالانہ تقریب میں شریک کا دعوت نامہ آیا۔ وہاں اک مذاکرہ کا
 پروگرام تھا۔ مذاکرہ فیض صاحب کے زیرِ اہتمام تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور دور کا بدو، عزت گزشتی کے سبب دعوت نامے جتنے زیادہ ملے
 ہیں تقاریب میں اسی قدر کم شریک ہوتا ہوں۔ یاں فیض کا معاملہ تھا، پوچھا اور عرض پوچھا اور کہیں نہ پوچھا
 وہ تو، ہے نہیں ہو جندہ کی اللہ ۛ ایسا نظر میرا محبوب نظر تو دیکھو

مذاکرہ ختم ہوا دس بارہ اصحاب باقی رہ گئے۔ ان میں میں بھی تھا، پریل کے کمرے میں ہم سب داخل ہوئے۔ میں پھر دی شرف شرف
 سامنے تھا جس کی ایک جھلک سہمہ میں دلا سہمہ میں کچھ تھی۔ آج ہمدان کا میں مسیری اترتی۔ جتنا دامن کشاں رہا فیض نے اسی قدر دامن
 دل کہیں۔

مذاکرہ کا موضوع تعلیم تھا، دی شاہد گفتگو کا موضوع بنا کچھ شرفش پڑی ہوئی، چاہیے تو یہ تھا کہ میں فیض کے خیالات کا گفتگو کا حاصل محفوظ کر لیتا
 مگر سید دل میں تو اس سے تڑپ گیا کہ ہمدان کا مجرم تھا، یہ کہوں کہ عالم غیبت میں بُت بنا ہوا تھا تو کچھ تہمانہ ہو گا۔
 اس طرح اپنی خاموشی گوئی ۛ گویا ہر صحت سے جواب آئے

میری نگاہ کتابی سے آفتاباں پیر سے تھی نہ تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں نے اجازت چاہی۔ فیض صاحب نے چاہے کیلئے
 روک لیا پندرہ بیس منٹ اور رکنا ہوا۔ واپس میں فیض صاحب مہمانوں کو آنس وانس رخصت کرنے آئے۔ بیسے عاوہ قرب ختم ہوا۔
 آپ نہ پائیں گے تو اپنا قصیدہ زیادہ ہوا اور فیض کا سو کرہ کم، کیا کہیں مجبور ہوں، مجھے فیض عزیز فیض کی یادیں بھی جوتے کرے وہ
 ہم کے ساتھ ہیں۔ ان یادوں نے ہی مریم میں فیض کی گن لگائی اور فیض کی موت جلائی ہے۔ کتنا انیت پسند ہوں، اپنے نہیں
 کے لئے، سب تانا بانا ہے۔

آخروہ کیا کٹکٹش ہے جس نے عقیدے کا تابان بن دیا وہ عم زندگی، غم جہاں تو بہت بگڑل جاتے، فیض کی شاعری میں زندگی کی ایک ٹک

کیا۔ دوست مہیا۔ "برسمیڈر کے نام اور صفت مکتل" افزائی، جیسی نظموں کا تحمل ہے؟ یقیناً ان کے لئے کوئی دوسرا مقام ہے۔
صاف زبوں پاس سے گزرتی ہے۔۔۔

جیسے کہدی کسی نے پیاد کی بابت

فیض کی زبان میں بھی ہوا زبیر کی جاکھ کھلتی ہے۔

لب پر تپتے تپتے قیام و رہنمائی

ہم تکی کلام پر مائل درادستے

مکن ہے مائل پر تیلیغ حضرت کویر نکستہ ناگوار گزری۔ ان سے کیا کہا جاسکے۔ مرغ

کیسے مائیں حرم کے سہل پسند

رمح جو عاشقوں کے دیں کی ہے

فیض کے فن کا ایک اندر مصر جس کی جانب اشارہ ضروری ہے۔ رہے الفاظ کی مکرار۔ مثلاً داغ داغ اجملا، سبک بگمتن، دبی دبی

مٹکن وغیرہ۔ فیض کے یوں سخن نگار زمانے خود ایک دناوری رکھتا ہے۔ لگژری کی زیادتی بھی تلخ ہو جاتی ہے یہ نگار اس طرح خرواک روایت سی
فیض تبارق ہے۔ پوش فیض سے یوں یہ نگار لفظ برنگی رہے۔ کہیں زبان و محاورہ میں دل میں کھلتا ہے۔ جیسے بجا و زن زندان۔

بہر حال فیض فیتس ہیں۔ فیض خرواک روایت بن گئے ہیں۔ یہ فیض کچھ ہے! لیکن تو فیض عزیز ہیں گے اپنے قاصدوں کے دم سے

ان قاصدوں کے میں نیم شبی تنہا یوں ہیں، ہم کلام ہوا ہوں۔ کیسے ایچے نہ صبریں! نمونے کے طور پر عزیز قاصد پر ضرورتیں ہیں۔ ان سے بہتر ہی
شعر میں! راہ قید تابیہ اشعار حاصل کلام نہیں لیکن کچھ پسند ہیں

نوں پر پہن گئی ہے تو کیا کر رکھ دی ہے

بڑیک حلقہ زنجیر میں زبان میں نے

جلوہ نگاہ وصال کی شمعیں

وہ انجھا بھی بچکے اگر تو کیا

چاند کو تم کریم تو ہم جا میں!

چٹک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم سے ہما ہے

ماب سحر سے سنے پر جگر تپتی ہوگی

دل میں اب یوں سے معوسے ہوئے غم آتے ہیں

جیسے پچھرت ہوئے کعبہ میں صہم آتے ہیں

وہ بات سارے قصہ میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

حبیب اللہ محبت

فیض اللہ آبادی

مثل تو کچھ اسی طرح ہے۔۔۔۔۔ یہ نسبت خاکہ۔ یا باعام پاک۔۔۔۔۔ مگر حقیقت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ کہاں ان آباد اور کہاں فیض صاحب؟۔۔۔۔۔ ہم تو کتنے بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی فیض صاحب یہاں ہی تشریف لائیں گے؛ مگر وہ خواب حقیقت بن گیا اور فیض صاحب یہاں تشریف لائے۔

مئی ۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ ان آباد کے کچھ بچے، لڑکے، لڑکیاں، اور چند بزرگوں نے ایک مشاعرہ کرنے کی فضا بنائی اور حضرت فراق گورکھ پوری کے حضور کارپس سیم بنائی۔ ان سیم بنانے والوں میں صدر شاہکار، محمد انور، محبت صاحب، ان سے فیض کار، اختر سہیلوی، اور عشرت صاحب وغیرہ تھے۔

فراق صاحب نے ان کی باتیں، بے غور سے سنیں اور متعلق دینے کا وعدہ فرمایا۔ فراق صاحب سے ان دنوں کا وعدہ بے کرب یہ تھا کہ واپس ہونے پر وہ اپنے کام کو اس کی عملی سطح پر رکھنے لگے۔ اب کام کرنے والے درکار تھے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو شعور و حضور سے اس باوگران کو اپنے کار سے پریشان نہ کر سکتے۔ چنانچہ یہ مرحلہ سر کرنے کے لیے بھی دوستوں پر نگاہ کی اور وہ آئے وقت میں کام آئے۔ انوراثر خاں اور سائبر بھی (میں نے ان آباد کا پویشن، افواہ، الحسن، آصف، انصاری، انیم، صدیقی، میٹھی چند، دہی، اور تیش چندر، شرانے، سارو، کے علاوہ دیگر نام لکھے ہیں) ان کا یہ کام تھا کہ ان آباد کی تاریخ میں یہ مشاعرہ امر ہو گیا۔

فراق صاحب نے اس مشاعرے میں پیرایہ بڑی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے ذاتی طور سے فیض صاحب، ساحر، صیغی، اور مخدوم علی الدین کو اس مشاعرے میں آنے کی دعوت دی۔ فراق صاحب کے ہاتھوں ان شعراء کے نام میں جاری ہوا تھا تو آپ ہی بتائیے کہ اس نئی تیس کیسے نہ ہوئی!

فیض صاحب کا خط آیا: ضرور آئیں گے۔ ساحر اور مخدوم کے ٹیلیگرام موصول ہوئے، مشاعرے میں شرکت کون کا۔ اب حال یہ تھا کہ ہم لوگوں کا سینہ گڑبگڑ کا ہو گیا تھا۔ ہماری کہ مشاعرے کو ایک صدمہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے ہم نے ایک صدمہ تلاش کیا اور وہ بھی ایسا صدمہ جس کے

خاندان کا اردو شاعری پر بڑا احسان ہے۔ ہمارے شاعر کے یہ صدر جناب سریش شائن مملابا باریٹ لکھے، جوارو کے مشہور و معروف شاعر آندھرا شائن مملک کے خاندان سے دعا کرتے ہیں۔

جب صدر لیگ تو مشاعرے کے لئے جگہ کارنامی ہوئی۔ لیکن یہ مرحلہ بھی جلد سر ہو گیا۔ اچھا صدر بھی ملا، اور شاعرے کے لئے اچھی جگہ بھی۔ اللہ آباد میں سول لائبریری اور چوک کے بیچوں بیچ ایک جگہ ہے جسے میڈیٹل کہتے ہیں۔ میرال سے ملتی تو کرن کھیلنے کی ایک بڑی زمین ہے، اسی جگہ کہم لوگوں نے مشاعرہ گاہ بنایا۔ مشاعرے کے اس پینڈل اور ارا حائے میں، میں ہزار آدمیوں کے بیٹھے کا استقامت تھا، مشاعرے کے لئے دریاں اور صفہ سیٹ فرلیم کرنے کے علاوہ ایک اونٹنی ڈانس بھی تیار کیا تھا۔

۴ بی کو سنا اور غمزدہ کے مٹی گرام آئے۔ ہم اللہ آبادہ کی بچہ کو پہنچ رہے ہیں۔ مگر تھوڑی سی بات کی بجائی کہ فیض صاحب کا کیا ہوگا؟۔۔۔ دوبارہ ان کا کوئی خط نہیں آیا۔۔۔ وہ آئیں گے یا نہیں آئیں گے؟۔۔۔ بہت سے سوال ایک ساتھ اُپسنا جواب مانگ رہے تھے۔ ہم نوک دیوانوں کی طرح خرقہ صاحب کے مکان کا پتھر کاٹتے۔ حضور اب کیا ہوگا؟ فیض صاحب پر غصہ کرتے عجیب شاعر ہیں۔ نہ دوسرا خط اور نہ کوئی ٹیلی گرام۔ شہر جہن میں پڑے۔ رستے پوسٹروں پر فیض صاحب کا نام جھلکا باجھتا۔ لوگ فیض کے بارے میں اٹھارہویں گز رہے تھے۔ کیا گیا جائے؟۔۔۔ لوگوں کو سنہ کس طرح دکھایا جائے؟۔۔۔ جن کے پاس جائیں گے وہ کیا کہیں گے؟۔۔۔ عجیب لوگ ہیں۔ کس دم خیر نہیں کا اعلان کیا تھا۔۔۔ بہر حال۔۔۔ ہر سمت شہن بات بھٹی اور غنیمت سادات خطرے میں تھتی۔

صدر موصوف نے ہم لوگوں کو کھٹا کیا۔ دلائے دیئے۔ فیض صاحب نے خط لکھا ہے تو فرماؤ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی عادت سے واقف ہوں۔ سر فیض صاحب کی بات سے ہم وقتی طور پر ہمیں گئے لیکن اندر ہی اندر پریشان رہے۔ اگر فیض صاحب نہ آتے تو — ؟

اب دیکھئے۔ یہ بھی کتنی مساحلہ دھانی، مخدوم بی الدین، اور جان نثار اختر کے علاوہ بہت سارے شعرا و طبیبانہ میں تھے۔ تین بجے تک فیض صاحب کا وہی پتہ نہ نکلا۔ چار بجے اور فرادی صاحب کے مکان پر تار والا وارد ہوا یہاں تا فیض صاحب کو کھٹا بھی تھا۔

سات بجے شام کو ان آباد پھر رخ رہا ہوں :

اب کیا تھا۔ دل : باغ باغ ہو گئے۔ کیجئے ہوئے چہرے مکرر اٹھتے۔ "شیش صاحب کو فیض کے کہنے کی اطلاع دی۔" بنوں نے مکرراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں گمراہ تھا۔" !

اب سارے شہر میں پھر ایک بار فیض کی حمد کا اعلان ہوا۔ لوگوں کو کچھ یقین نہیں آیا کہ فیض یہاں کب آئے ہوں گے، لیکن حوالہ حقیقت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ لوگ شاعرہ سننے کے لئے ٹکٹ خریدنے لگے۔

دی ۵ مئی سنہ ۱۹۷۰ء کو رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ مشاعرہ گاہ لوگوں سے کھینچا کچھ جبراً ہوا تھا۔ بے شمار مرد، عورتیں اور بچے سب کی نگاہیں ڈالیں پر بھیتیں ————— فیض آئے ہیں! ————— دل کو کوگر گردانے والے شاعر آئے ہیں۔ ————— اُن کی صورت دیکھیں گے۔ ————— ان کا کلام سنیں گے اور اُن سے آئو گرافیں لیں گے۔

ان منتظر نگاہوں کے پہنچنا شروع کی پہلی کھپ مشاعرے میں داخل ہوئی۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سٹون اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ کچھ گناہ شاعروں نے لوگوں کے دل ہلکائے۔ پھر حمزہ جی پریم فراق صاحب کے کچھ عجیبے ساحر لکھیا نومی، جاں نثار اختر

مقدم می الدین، اور تو معظم آئے۔ مجھ باطل ساکت تھا۔ سارے شعراء اس پر آگے۔ کم عمر کے اور نوکیلاں آؤ گراف لینے لگے۔ پینٹی کے خوف سے کارکنانِ شاہ نے نہیں رکھا۔ مصوم صورت اپنی اپنی تنہا بیٹھے واپس چلے گئے۔

نوبے اور لیش ٹرائن ملا صاحب صدر کی جگہ بیٹھ گئے۔ مدیر "شاہکار" محمود مہر صاحب نے انڈسٹر کے فرائض انجام دیے۔ فراق صاحب سے گزارش کی گئی کہ وہ تقریر کریں۔ فراق صاحب اٹھتے۔ لوگ خوش ہو گئے۔ تحسین سلی تالیاں بھیں۔ اب مقامی شعراء اپنا کلام سن رہے تھے۔ اسی بیچ فیض صاحب اپنے دیرینہ رفیق شیکھر ترن بارایٹ لا اور ان کی بیوی صادقہ سرن کے ساتھ تشریف لائے۔ لوگ اچھے کرانہیں دیکھنے لگے۔ شایان کو اب بھی یقین نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے فیض کا "ڈی" تیار کر لیا ہو۔ یہ دیکھ کر کم لوگوں نے فیض صاحب کو گودیں اٹھایا اور دس پر بھیلا دیا۔ گوشت پوست کے فیض جن کے سامنے تھے۔ مجھ کو اطمینان ہو گیا تھا، یہ فیض ہی ہیں۔ سوتی صری فیض۔

اس وقت میں صاحب کا تارفت فراق صاحب سے بہتر اور کون کر سکتا تھا۔ انڈسٹر نے فراق صاحب سے درخواست کی وہ سامنے آئے اور فیض صاحب کی تنصیحت اور شعری پرزوں پر غور کرنے سے انہوں نے دعویٰ ڈالی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج یہ سمنوں لکھتے وقت مجھے انہوں پر رہا ہے کہ کاش فراق صاحب کی وہ تقریر ٹیپ کر لی گئی ہوتی تو میں ان کے خیالات بھی من و عن پیش کر دیتا۔

اس مشاعرے کی شان ہی کچھ خالی تھی۔ پرستے والے بڑے ملوس سے بڑھ رہے تھے اور سننے والے دل لگا کر سن رہے تھے۔ فراق صاحب نے آج تم کر پڑھا تھا۔ ہر شاعر پر دادی۔ ان کا انداز ان کے تنور، اور ان کے اشعار سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی عظیم شاعر آئندہ سرا ہے۔

اور جی اس کی بولیں ہیں کہ تاروں بھری رات
کسی ٹھوٹھٹ ہی کو سر کاؤ کہ کچھ رات کٹے
یہ ایام کی پُر وایو دے دیے دیے
مستیر کی کوئی حسرت لگاؤ کہ کچھ رات کٹے

اب سا حیدر حیا نوی مانگ کے سامنے تھے۔ مجھ اپنی اپنی فرمائشوں کی بھرمار کر رہا تھا۔ ساگر گھڑا رہے تھے۔ آخر میں نور اس بات پر ہوا کہ وہ اپنی پسند کی کوئی نظم سنائے کے بعد مجھ کی پسند کی چیزیں بھی سنائیں گے۔ اب وہ اپنی نظم "امطار" پڑھ رہے تھے۔

چاند مہم ہے آسمان چپ ہے
میں زندگی گودیں جہاں چپ ہے
دور دادی میں دو دھیا یا دل
تھک کے پریت کو پیا رکھتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں سے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

جس اندر مدد ہے آسماں چپ ہے
 نیند کی گود میں جہاں چپ ہے
 سآ رہا یہ نور کے بدرِ مخدوم می اندین آئے۔ لوگوں نے فرما شوق سے تا بیاں بیاں۔ انہوں نے ہبک ہبک کر پڑھا اور مجھ نے
 تجھ کو مجھ کو مراد دی۔ اُن کی نظم، جانِ غزل، سے شاعرے میں ایک کیفیت پیدا ہو گئی۔ لوگ گنگنا رہے تھے کہ
 ارے دل مار سا آج آتا ہے۔

مست آنکھوں کی چھیاؤں میں بھٹکے لگیں آنسوؤں کے نول
 مل گیا راہ میں، اجنبی موڑ پر، کوئی جانِ غزل
 آج نوآبادی میں، نہ دنیا کے غم،
 آج دل کھول کر مسکرا، چشمِ بزم۔

مجھ سے اب فیض کا دامن چھوٹ گیا تھا۔ لوگ آوازیں لگ رہے تھے۔ فیض صاحب کو بلایے۔ ناؤ سر نے مجھ سے ہار مان کر
 فیض صاحب کو بلایا۔ فیض صاحب مسکرائے۔ اسے اسٹے اور اپنی دیھی اور کوئل آوازیں شور مٹائے۔ انہوں نے اس شاعرے میں جو غزل
 سنائی، وہ بالکل تازہ تھی۔ اس غزل کو میں نے سنو سنو کر کے، اس پر اُن کے دستخط بھی لے لے۔ اُن کی اس غزل کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ
 جا رہی ہے کہ اس کے پہلی بار انہوں نے ہمارے شاعرے میں پڑھا۔ اس کے بعد یہ رسالوں میں شائع ہوئی کہ

ترے غم کو جان کی تلاش تھی، نیسے جان نہا چلے گئے
 تری رہ میں کرتے تھے تمہیں طلب، سر رہ گذار چلے گئے
 تری کج ادوائے سے ہمارے شبِ انتظار چلی گئی
 مے ضبطِ حال سے رو بھو کر مے غم کسار چلے گئے
 نہ سواں وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں، نہ شکایتیں،
 ترے ہمہ دلِ دار کے بسھی اخست میاں چلے گئے
 یہ تہیں تھے جن کے نیاس پر پرہہ سیاہی بھی گئی
 یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سسب بزمِ یار چلے گئے
 نہ رہا جنوں نہ وفا، یہ رسن یہ دار کو گئے کیا
 جنہیں چرمِ عشق پہ نہا تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

اس کے بعد فیض صاحب سے لگاتار فرمائشیں ہوئیں اور انہوں نے اپنے سننے والوں کو یاد اس نہیں کیا۔ فرمائش کا نام نہ لیا اور جواب دہ نہیں
 مل سکی۔ الہ آباد کا یہ شاعرہ بلی کامیابی سے مات گئے ختم ہوا۔ دوسرے دن فراق صاحب کے وقت لکے پر فیض صاحب اور دیگر شاعر کو چلے پر
 مدعو کیا گیا۔ فیض صاحب لے وہاں جو بات کہی تھی وہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ الہ آباد کا یہ شاعرہ مجھے زندگی بھر یاد رہے گا۔ انہوں نے
 بڑے خلوص کے ساتھ فرمایا تھا۔ ہر سکت ہے فیض کو الہ آباد کا یہ شاعرہ زندگی بھر یاد رہے لیکن ہم لوگوں کو یہ مٹا رہے یقیناً زندگی بھر یاد رہے گا
 کیونکہ اُن کا یہاں اور تاریخ ساز مشاعرہ الہ آباد کی اپنی تاریخ میں اس سے پہلے بھی نہیں ہوا۔



اس میں راز کی کیا بات ہے؟

مناسب دیکھ بھال کی جائے تو جلد کی تازگی اور سلامت برقرار رہتی ہے۔
اپنے چہرے کی آپ دھاب قائم رکھنے کیلئے ہمیشہ بہت سنو
استعمال کیجئے۔ اس سے رنگ روپ میں نکھار اور حسن میں
دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔



بہت سنو
ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی میم

کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ - کراچی - ڈھک

افکار - فیض نمبر

بہترین کارکردگی، مضبوطی، قوت اور آرام دہ سواری
انہی خصوصیات کی بنا پر لمبرٹا اسکوٹر کا جواب نہیں
اس کے فاضل پرزوں کی دستیابی اور سروس
کا ملک بھر میں معقول انتظام ہے۔

Lambretta

لمبرٹا اسکوٹر
سب سے اعلیٰ



وزیر عالی انجینئرنگ لمیٹڈ

المركز بندہ روڈ - کراچی
فون: ۴۳۵۹۹ / ۴۳۹۴۳

۵۶ مال روڈ
لاہور - فون: ۶۳۵۰۸

PRESTIGE - ۳۳۳۳۷۲

جَان

اور
سی

مَال

- سلامتی
- حفاظت
- اطمینان

نہایت ضروری ہے

سینٹرل لائف

ایشورنس کمپنی لمیٹڈ

سینٹرل

انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہیڈ آفس

نیشنل اینڈ گرنیڈ لیزنک بلڈنگ میکوڈ روڈ کراچی

اور شاخیں پاکستان میں ہر جگہ

یکے از داؤد گروپ انسٹریڈرائز

اب
سیلوفین

میں پیک کیا جاتا ہے



کیونڈا رز

میگنم سگریٹ

بڑے - اچھے اور تازہ

ذکرِ نایہ

خیالِ یارِ کبھی ذکرِ یار کو تے رہے

فیض میر اسامی	★	نشان مستقبل
رنیق منزل	○	فیض ایک چراغ فکر
آہوئے رعنا	★	شاہِ عصر
نقش فراہی	○	فیض
فیض ڈھاکے میں	★	سفیرِ ورد
فیض احمد فیض	○	اک دیدہ بیدار
روشنیوں کی آواز	★	شاہِ خواباں
اے نذر کار	○	انتظار
شاہِ بزرگس نوا	★	ابیلان کار
بشارت	○	فیض تنویر حیات
فیض بڑا فن کار	★	حرمِ جذبِ دروں
پرستہ، رامن	○	اندھیری رات کا چراغ
فیض	★	دہ شملہ یوں وہ شوالہ نفس
نذر فیض	○	فیض پارے

مسعود اختر جٹا لے

نشان منزل

اچھے صہبا! کلام فیض اس عہد کی اعانت ہے۔ انہوں نے سب سے زیادہ عوام و خواص کو متحرک کیا ہے جس زمانے میں فیض جیل میں تھے یہاں ان کے چند اشعار سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی جاتی
و د حاضر ہے۔
(مسعود اختر جٹا لے)

ٹھیکے کا خاک یہ بہ قہر آسمان اک دن
ہمارے زیر قدم ہوئی کھینچاں اک دن
بڑھے گا چاند منزل یہ کاروں اک دن
فضائے ارض و سما ہوگی ہم غزاں اک دن
حیاتِ مختصر ٹپٹگی ہر ایک زور سے کو
ہمارا نقش قدم ہوگا نیا وراں اک دن
ابھی جو حسنِ اہل وقت پہ مگر تھی
چراغِ راہ بتیں گی وہ کب لیں اک دن
سحر کے فورے تپٹ جائے گی یہ تیروشی
افق پہ مہر میں ہوگا شوقاں اک دن
فضائیں گونج اٹھیں گی ہمارے نغموں سے
زعفرانِ پست پر درہ مکان اک دن
ہماری ماہیں ہمارے ہی گیت گائیں گی
انہیں سے دیں گی وہ بچوں کو لوریاں اک دن
انہیں کی لے سے جوانانِ یزم چاہیں گے
انہیں سے ذوق جنوں ہوگا کامراں اک دن
انہیں سے منزل لڑکا میرے کا ہسم کو سراغ
انہیں سے "وہ آئے گا کاروں اک دن"
یہ "خونِ دل" جو ابھی صرف داہنِ عم ہے
اسی سے رنگ سے نکھرے گا کھتاں اک دن
جہوت دے گی ہماری دکاشناسی کا
"ہر ایک حلقہ زنجیر کی زباں اک دن"
"وہ بات جس کا نہیں ذکر داستان میں ابھی
جمال ہوگی وہی زیب داستان اک دن"

الطافۃ مشہدی

فیض میراساقتی

ایک کوی نے من آتنگن میں کو مل گیت بجھیرے
 کالی رین کی کوکھ سے جھانکے سندر روپ سویرے
 سوج کی انھی تاپ رہے ہیں بیٹھ کے سانپ سپرے
 ٹوٹ رہے ہیں چھن چھن کرتی زنجیروں کے تھیرے
 جیون کی پلکوں پر رکھ دے سورج، ساتھی میرے
 کلبیاؤں کی بھیت سے اُبھرے ہر جیون اُجبارا
 اندھیرے کی مٹھی میں ہو سورج، چاند استرا
 نکلی گلی میں کوک لگائے جیون کا خجرا
 اپنی ندی کا بیٹا ہو اپنا کھیون بارا
 ڈگر ڈگر پر ہم سب دیں گے ساتھی ساتھ تہارا
 بینا کا سر دیکھ بن کر بند یا روگ گنوائے
 دھرتی کے پاتال میں اترے سونا اورانیے
 تپھاتی کو تپھاتی پر رکھ دیں مٹی ماتا جائے
 اکٹا کا من بیت پھر یرا کام کام لہرائے
 آتشوں کی پھولاری پر ساتھی آہنچ نہ آئے
 گیت کی سندر پھولاری میں پیت کے پھول کھلائے
 مسکاتے ہونٹوں کی خوشبو سے دھرتی مہکا دے
 جیج کو اپنی سرکاری سے اک مسکان بنا دے
 پگڈنڈی کے ماتھے پر تاروں کے دیپ جلا دے
 کرو دمہ کپٹ کے کھلیاؤں میں رانگی ہر لگ لگائے

سلامِ مچھلی شہری

فیض اک چراغِ فکر

صہبا! میں روشنی کا پجاری ہوں اور مجھے
ہر اک چراغِ فکر و تخیل سے پیار ہے
یہ شمع جس جگہ ہو جہاں بھی ہوں فوٹ لیتی
میری نگاہ صدقے، مرادل، نشا رہے

دور از قیود و وقت ہے شعر و ادب کی راہ
جس دل میں بھی غلوں ہے منزل اُسی کی ہے
طوفان سے بھی لڑے گا جو آدرش کے لئے
ناہید بنم جلوۂ ساحل اُسی کی ہے

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بے محبہ کو ربطِ قاص
ہم عصر دوست "فیض" سے ان کے کلام سے
ہم ایک مے کرے ہی کے ہیں رندِ تشنہ کام
ممکن ہے میں نے پی بھی ہو کچھ ان کے جام سے

کہتا ہوں ان کو "دوست" مگر واقعہ یہ ہے
رہ کر بہت قریب بھی دیکھا ہے دُور سے
وہ اک چراغِ فکر ہیں جن محفلوں میں ہوں
اسے دوست واسطہ ہے مجھے صرف نور سے

اُن کا حیاں ، اُن کا بیاں ، اُن کا تذکرہ
ہر بزمِ شاعری میں ہے اک مہرِ رنگ و بو
یہ ماننا پڑے گا کہ ہیں فیض بے مثال
اکثر ذلی زبان سے کہتے ہیں خود وعدہ!

انسان دوستی کا وہ عالم کہ جیسے بھول
جو چاہے رنگ مانگ لے ، نہ کہت سمیٹ لے
ہے اُن کے دل میں خون کے بدلے شہیم گل
جو آئے زندگی کی لطفِ الفت سمیٹ لے!

سمبرہ نثارِ معیہ لیتی ہیں وہ مگر....
اُن کی نگاہِ انجسم و متاب دیدہ ہے
خوشتر ہوئی رُوحِ غالبِ نشت کہ لے ندیم
اب ایک سبیلِ یمن آفسرِ ید ہے!

صہبا! میں اُن سے دور ہوں لیکن غدا کو
وہ نفرتِ غری ہیں مجھے اُن پہ ناز ہے
وہ صبحِ اتریں جو ہے اُن کی نگاہ میں
میرے سے تو شامِ غنیمت کا گداز ہے!

اشکوں کے گیت ، گیت کے سنو ، انکوں کا درد
فکر و خیالِ فیض کے دامن میں کیا نہیں
— زخمِ ماہِ اُن کے ہے زخمِ زندگی
اُن کی نفرت کوئی مگر دیکھت نہیں

صہبا! یہ خطا تمہارے لئے ہے ، قبول ہو
تم اور تمہاری ”محفل افکار“ زندہ باد!
زخموں کے بھول اب تو کھلانے چلا ہوں میں
کہتی ہے شام ”فیض“ کے اشعار زندہ باد!

رفعت سے سروس

رفیقِ منزل

تجھے رفیق کہوں، ہم سفر، کہ راہ نما
مری نوا میں ترا سوز و ساز شاہل ہے
بچل رہی ہے جو منزل ترے تصور میں
وہی مرے بھی شعورِ جنوں کی منزل ہے

جہاں درد میں ہم سب ہیں "نقشِ فریادی"
جہاں کا درد ترے نغمہ و کلام میں ہے
عجب اداسے تو اس دور میں رہے نغمہ سرا
نوا کی گونج تری بزمِ خاصِ دعام میں ہے

یہ دارغ دارغ اُجالا، یہ شبِ گزیدہ سحر
کہ جس کی تاب نہ لائے شعورِ اہلِ نظر
ترے جنوں کو نسیا عزمِ اُسی نے بخشا ہے
تری عنزل ہے کہ اک نغمہ عسجدِ بشر

فرانہ دار و درسن پر ہوا تو نغمہ سرا
حیات تیرے لئے بے قرار گزری ہے
نشا نہ سنگِ ملامت کا کیوں نہ بن پایا
"یہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے"

فاسخِ بھارت

شاعرِ عمر

آسانِ وطن کے رخشاں چاند
تو بہر طور جگمگاتا رہا

موجِ دردِ فراقِ یار میں بھی
شانہٴ بامِ پیر دمکتا رہا
مشعلِ نورِ بن کے تیرا قلم
ظلمتِ یاس میں چمکتا رہا

کبھی چھلکا کے جامِ محفل میں
گرمیاں بھونک دیں نال کی طن
کبھی اپنے ہوسے کا سہِ درخ
پُرکینِ جامِ ارغواں کی طر

اشکِ ٹپکا کے نکلتاں میں کبھی
رنگِ کمِ ظہنی بہار کیا
کبھی اپنی نوائےِ خونیں سے
دامنِ گل کو لالہ زار کیا

تیرے ہی دم سے گلستاں میں سدا
گرمِ الفت کا کارو بار رہا
تیرے ہی فیض سے زمانے میں
پرچمِ امن کا دثار رہا

بیری یا توں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز
شاعرِ عصرِ تیرے نغموں میں
ڈھل گئی ہے اس عہد کی آواز

نبیؐ جہور پر ہے ہاتھ تڑا
تیرے افکار کی اساس ہے یہ
چاندنی، رقص، روشنی، خوشبو
تیرے اشعار کا لباس ہے یہ

تو نے کتنی ہی دکھ بھری راتیں
دل بیدار ہیں سولی میں
تجسّس گئے جب جی بھڑ سے لوحِ قلم
انگلیاں خون میں ڈبول ہیں

کبھی یکسر ہے - نعتِشِ فردوسی
کبھی شہرِ صبا تیری منزل
درد کا رشتہ استوار رہا
کبھی پاؤں نگار ہیں کبھی دل

کوئے دار و رسن کیا آباد
مہنِ زنداں کبھی بساتا رہا

فضا اپنے فیضی

آہوئے رعنا

یہ ترے اسلوب کی قوسِ قزح یہ پاندنی
یہ تری تمکیل کی پیکر تراشی کا منو
یہ ترے جذبات کی سنبھل ہوئی سیمابیت
یہ ترے احساسِ عزم کی دل ریا سنجیدگی
یہ ترے ذوق و نظر کی خلوت پاکیزہ میں
آئینہ جھپکاتا ہوا لمس اور لذت کا سرور
یہ ترے بھجے کی شوش و منفرد شاہِ شکی
شہدیں ڈوبی، شرابِ ناب میں، بھگی ہوئی
کھینچ رکھا ہے تری پرکارِ شخصیت کے گرد
ایک ہالہ تیرے فن کے "جسٹہ صدرنگ" نے
غیر سے ہیں مشکِ آشنہ، فکر و تخیل کے فن
"دادی شرومن" کا "آہوئے رعنا" ہے تو
آج تو یہ ہے تیری "رووا و جنوں" کے سامنے
پاکستان کی بات رشتیں ہے تیرے خانے کا نام
"پھر نظر میں پھول جھکے، دل میں پھر شعیں جلیں
"پھر لیا میں نے کسی کی بزم میں جانے کا نام"
حسن کی دہرا نظر دوں کی تنگ شعبے نے جب
تیرے دل کے لالہ شاہِ داب کو بوسہ دیا
تیری محفل میں قباؤں کی شفق لہرا گئی
بس گئی سانسوں میں تیرے، پیر میں کی خوشبوئیں
خال و خط کی موج صبا میں، دھلی سی صبح نے

تیرے احساسات پر تجھ کا ہے اپنا آب و رنگ
 سوچتا ہے اپنے دل میں یہ ہو بھر کے گلاب
 کتنے دل کش ہیں تیرے رنگِ طبیعت کے نول
 دود کے بے خواب تاروں کو بھی جھپکی آگئی
 تو نے جب ڈالی ہیں باہیں گردن مہتاب میں
 اور بھی ہیں اہل دل، لیکن مجھے معلوم ہے
 دہریں بچھ سے ہوئی "تندیب رسم عاشقی
 اپنے دل کے خون تازہ میں ڈبو کر انگلیاں
 تو نے کبھی داستانِ آرزو نہ آجھی"
 کی تیرے ذوقِ لطیف و شوخیِ رندانہ نے
 سُرخِ مہتاب سے "تزیینِ درو باہم حرم"
 تیرے فن کا ماحصل، لوحِ قلم کی پرورش
 تیرے دل کا مہتاب، عفت و جنوں کی تربیت
 کچھ سے باقی "آہروئے مشیوہ اہل فنز
 کچھ سے زندہ، حرف و الفاظ و معانی کا حلیم
 تیرے خائے کو ملیں، دستِ صبا کی جنبشیں
 فکر کو تیسروں ملا آہوئے صحرا کا حشرام
 سر سے پائیک میں مرقع "شوخی افکار" کا
 وہ تری نظموں کے سپیکر ہوں کہ غزلوں کے صنم
 یہ تیرے پیرایہِ انہار کی گئی کھلیاں
 پھول بن جاتی ہے "خار و تیشہ و اسن" کی بات
 آج جب کہ فن کی قدروں کا نہیں کچھ احترام
 یہ غنیمت ہے کہ تیرے "پیکرانِ فنکار" میں
 کچھ نہ کچھ باقی ہے "وضیعہ امتیازِ فن" کی بات
 اتنے دل کش کب تھے تیری "فکر کے رخسار و لب"
 پردنوں کب تھی تری چشمِ کرشمہ فن کی بات
 میرے اظہارِ محبت کی شفق میں ڈوب کر
 اور رنگیں ہو گئی کچھ تیرے "پیراہن" کی بات

نرہ سے کہنا ارشاد

فیض

افضیۃ احمد فیض نے کئی نثر فضا دیتے کے خبر پڑھ کر

نغمہ آتش و آہن پہ مسکراتی ہے
تری نوا کی لطافت ترے خیال کی تاب
ترے جنوں میں وہ خوشبوئے سوز ہے جس سے
ہمک رہے ہیں شرارے دہک رہے ہیں کلاب
ترے ضمیر کی معصومیت کا کیا کہنا
رنگ ہکا و نغیر کو بھی آ رہا ہے حجاب

ترے عمل نے بیثبات کیا کہ اہل و فسا
کبھی ہوس کے اشاروں پہ چل نہیں سکتے
ہزار طوق و سلاسل ہوں ملامت میں عامل
وہ اپنی راہ گذر کو بدل نہیں سکتے
مسافروں پہ اندھیرے جھپٹ تو سکتے ہیں
مسافروں کو اندھیرے بھگ نہیں سکتے

صوبتوں کے انہیں سنگدل اندھیروں میں
کیا ہے عظمت آدم کو صوفشاں تو نے
"زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں تو نے"
"مبارک لوح و قلم چھن گئی تو کیا علم ہے
کہ خون دل میں ڈوبی ہیں انگلیاں تو نے"

کہاں یہ غم ہے زنداں کے گھپ اندھیروں کو
کہ ان کی چھاؤں میں تیرے چراغ جلے ہیں
تری نظر میں جو نقصاں ہے الہاب کے ساتھ
اس ایک بو میں کئی آفتاب جلتے ہیں
جنہیں شعور کی تابانیوں نے سینہ پہ
وہ دلوں سے بھی کہیں تیرگی میں ڈھلتے ہیں

نسیم صبح کے نہایت بدوش چھوٹوں کو
نہ کوئی روک سکا ہے نہ روک سکتا ہے
ستم گروں کے ستم جس قدر مسئلے ہیں
ترے خلوص کا پھول اور بھی مہکتا ہے
بہارین کے کئی داغدار سینوں میں
تری جوان اُمنسگوں کا دل دھڑکتا ہے

بگھل رہی ہیں ترے غم کی حرارت سے
جھا و جبریں ڈھالی ہوئی یہ زنجیریں
نئی حیات کی لگی ریشا ہراہوں میں
بکھر رہی ہیں ترے دلوں کی تنویریں
ترے ہی تاپتے خوابوں کو چومنے کے لئے
ابھر رہی ہیں اُفق سے حین تعبیریں

سید فیضی

نقشِ فریادی

مجھے یاد ہے !

میری دنیا کے اندر سے اُجالوں میں اک روشنی سی ہوئی تھی

اسی روشنی سے، کئی ٹہلے، چراغِ تنہا

فضاؤں کو پر نور کر کے تھے

اُجالا اندھیروں میں بھرتے لگے تھے

تھے دروں نے تھے غائب نازوں کی دنیا سا کمر

اُداس ورنیں چین کی وہ رونق بڑھائی

کہ اندرونی کی فضا، پھول بن کر شکستہ ہوئی، بلبلی

کہیں دور سے ایک آواز آئی

نہایت کے رعبِ محبت کا کیف و جنوں چاہتے ہیں

نہ دولت نہ ثروت نہ عزت نہ رتبہ

دیکھی دل فقط ایک سکون چاہتے ہیں

— یہ آواز تھی یا کوئی حرم تھا۔

فیضِ سن کر جسے تو ربابِ تمنا پہ گاتا رہا ہے

تری آرزو کے، ترے عشق کے، تیری بیباک مشکوں کے پُرسونے

جگر دوڑتے — جو روتہ ازل کے منور کی تابندگی ہیں

وہ نئے نہ جو حاصل زندگی ہیں

غمِ عشق کی تلخ سی یاد بن کر پریشاں ہوئے نقشِ فریاد بن کر

انہیں بڑھ کے دستِ مہیا نے سہارا دیا تھا

پریشانیوں کا سب الزامِ زنداں نے خود اپنے سر پہ لیا تھا

زما نے کی ششوک آنکھوں سے کچھ بھی جیسے پچ کے رہنا نہ آیا

محبت کی پیاسی نکا ہوں پہا تک جی تو رہتا ہے دشت کا سایا

شبِ نیمِ رومانی

سفیرِ درد

بھائی مہتاب! سلامِ شوق دینا ز!

یادِ جو دیکھ بے فکرو، تجھ کو اپنے دیرے کا پاس ہے لئے دوست!

فیض پر نظمِ خام، حاضر ہے! کی کہوں تُو اُوں ہے لئے دوست!

یاد رکھے مجھے دعاؤں میں! بس یہی التماس ہے اے دوست!

آپ کا دوست! آپ کا دُور! شبِ نیمِ رومانی

فیض! وہ اک نقاش کہ جس کا نقش ہے فراموشی
فیض! وہ اک عکاس کہ جس کا عکس ہے آناؤں

”دوستِ صبا“ جس کے درِ دل پر دستک دیتا ہے
شبِ نیم کو شعلہ، شعلہ کو ٹھنڈک دیتا ہے

جس کا شعرِ دبیقِ سن، اک ”زندانِ نامہ“ ہے
نظمِ وقت کی قیامی، جس کی جنبشِ خامہ ہے

جس کا لہر، لہرِ مستی، مستوں سے جگ اور
اور مظالم اے دلِ نادان! ”دستِ تہِ رنگ“ اور

تم بھی شبِ نیمِ رسوا شاعر! وہ بھی ہے مشہور!
فیض تمہارے شہر میں رہ کر تم سے کیوں ہے دُور!

فیض! چراغِ طاقِ زنداں، داغِ دلِ مہتاب
فیض! ندیمِ حالِ پریشاں، مستِ بیل کا خواب

فیض! جوانوں کی سرستی، بوڑھوں کے نزدیک
فیض! نئی آواز — نئی آوازوں کی تحریک

فیض! وہ کافر! جس کو بُری دنیا سے ہے پیر
فیض! وہ گوتم، جس کا قدم ہے ایک اپنی تلوار

فیض! کہ ہے محبوبِ حسیات، فیض کہ ہے گھبر
فیض! کہ جس کے سینے میں ہیں سودا، غالب، میر

فیض! ”امیرِ قافلہ“ غم — فیضِ سفیرِ درد
فیض! کہ جس کے چہرے پر ہے احساسات کی گرد

ادبیے سہیلے

فیض طہساکے میں

آج بھر کوئی ہوا ہے یہاں
آج بھر ہے آئینِ رشکِ حین
آج لیکن ہے جدا اُس کی بھین
جمع ہیں سب آتشِ ز آتشِ گردِ دیدگی کے پھول چیرے پر کھلائے
ناچتی ہے سرخوشی ہر میز کے گلداں میں
منفرد ہے بزم کا انداز اپنی شان میں
ہر طرف صوفوں پہ آیا ہے نکھار
جیسے یہ صوف ہوں گئے خوش نما
جیسے سارے میز مائل۔ یہ شاعرِ دانش نہ گو، نغمہ گردِ تصویر کا
غیر مقدم کی خوشی کے پھول سے آراستہ ہوں شانساں
اور گئے خوش نما ہیں یہ وردِ میہاں۔ جیسے ہوائے نوبہار

جوہر ستیدی

اک دیدہ بیدار

فیض، اک فکر ہے غیرت کو جگانے والی
 فیض، اک ذہن ہے برکت ہوا دل کی طرف
 فیض اک طغی اس س ہے میٹھی..... میٹھی
 فیض اک نغمہ افکار ہے . نا آسودہ
 فیض کے نام سے ہوتے ہیں جواں سال جواں
 فیض اک شعبہ فکر و نظر ہے شاید
 فیض یوں "پرورش لوح و قلم" کرتا ہے
 دیکھنے والی نگاہوں پہ منوں طاری ہے
 فیض تصویر تصور کو چمک دیتا ہے
 فیض کی فکر کا سحر ابھی چمن ہے یارو
 فیض اک بزم ہے الجھی ہوئی قبیروں میں
 فیض ارمان زدہ سایہ دیوار بھی ہے
 فیض کے کرب کا مفہوم بہت سادہ ہے
 فیض اخلاص کا شعلہ ہے بھڑکنے والا
 فیض انسان کو حقائق کا وطن کہتا ہے
 فیض دل کو غلش نام و نشان دیتا ہے
 فیض کی جسراتِ اظہار میں دارائی ہے
 فیض عذرائے مہ و سال کی انگڑائی ہے

حزبِ لدھیانوی

فیض احمد فیض

مردہ شاخروں کو گل افشان کر دیا تو نے چمن کے پتے پتے کو غزل خواں کر دیا تو نے
فضائے زلیت پر جیہ ظلمتوں نے دام پھیلائے تو اپنی مشعلِ جان کو فروزاں کر دیا تو نے
وہ تارے جو غموں کے ابر میں پہنا رہے برسوں بنا کر آفتاب اُن کو نمایاں کر دیا تو نے
وہ صحرا جس کے سینے پر شرارے قص کرتے تھے اُسے آنسو گرا کر شنبستاں کر دیا تو نے
گلوں میں رنگ بیکر کر، برو رکھ لی گلستاں کی خزاں کی شام کو صبح بہاراں کر دیا تو نے
جلے دل کے پھپھولوں سے تپاں سینے کے داغوں فضائے رشتِ ہستی میں چراغاں کر دیا تو نے

ترے دم سے معطر ہے لگاؤ نظم کا گیسو

مرے شاعر، شبتانِ غزل کی روشنی ہے تو

بہی نے، نقشب فرمادی "کو نجفی تابِ گویائی" بہرِ سومت کی وادی میں جھینے کی صدا آئی
بہاروں کی قسم "دستِ صبا" کے فیض سے آئز چمن کے پتے پتے، بوٹے بوٹے پر بہا ر آئی
ترے ہی "زنداںِ نامہ" سے یہ آزادی کا شہر ہے اسی نے ذہنِ انسان کی کڑی زنجیر کھٹلائی
شہرِ نگ آگیا جب ہاتھ انسان کا اُسے تھاما تری آنکھوں میں اشک آئے ہنسے میں دم تاشائی
فنا سے ننگی برسی، ہوائے راگنی چھیڑی سکوتِ بیکراں میں جب تری آواز لہرائی
اسے سن کر رگوں میں برق کی رود وڑ جاتی ہے ترے دم سروں میں ہے کچا ایسا جوشِ برنائی

تری تخلیقِ سورج بن کے پکی ہے اندھیر میں

ترے لفظوں کی افشاں جگمگاتی ہے سویر میں

فتوہ کاشمی

شاعرِ خوابان

ابھی ہے جبر و ستم کی جہاں سے بھی آواز
ہوا ہے غورِ سلاسل، کسے ہیں طوق و رسن
جہاں بھی ظلم ہوا بچا لیبوں کے سائے میں
ہر ایک حلفتِ زنجیرتِ زباں کھولی

قریبِ جنت ستمارا جو کوئی ٹوٹ گیا
تو یہ سنت کہ اسیروں کی کٹ گئی زنجیر
کھلا جو روزِ زنداں تو فیض کی آواز
نویں عشرتِ فردا سنا گئی آ کر

بہارِ لالہ و گل پر جو آج آئی ہے
وطن کے ستِ عرخیوں نے یہ کیا محسوس
جلا ہے اپنا ہی دامن کھٹے ہیں اپنے ہی دُغ

وطن کی آگ بھڑکتی رہی ہے جس دل میں
مُتعارفِ روشنی سمجھا ترے قلم نے اُسے
ترے قلم نے جو لفظوں کے پھول مہکائے
ترے خیال نے جو گیتِ پیار کے نکائے
وہ آبرو ہیں وطن کی وہ دھڑائیں دل کی

سنی گئی ہے جہاں بھی ترے قدم کی چاپ
دھڑک اٹھا ہے مثبت سے اُس زمین کا دل
ترے وطن کے خیالوں کو پیار ہے تجھ سے
کہ تو نے اُن کو سنا ہے ہیں انقلاب کے گیت

عبد الرؤف عروج

روشنیوں کی آواز

شب کی مائیں بکری مدھن کی ہوئی حقوں کے نام
ماہت یوں کے ستاروں کے سند یہ بھیجے

فیض صاحب نے دیں جو مہل زبیرت جہن
صورت دست نہ سنگ نہیں ہو سکتے
خلعت غم کی سحر پہرہ غمگیں کا نکھار
جہن غم تو ہے افق شعر سے قمر کی بہار
جو بیکٹے ہیں کہ سب میرے زبان میں ہے
جو بیکٹے ہیں کہ سب میرے زبان میں ہے
وہ کم آواز و کم آہنگ نہیں ہو سکتے

فیض صاحب کا جو کچھ ہے وہی سب کا کچھ ہے
مک تو کتے میں انہیں روشنیوں کی آواز
دیو سے جس کے لئے ہونے سے جاتے تھے
وہ وقت نہ بھی نکلا ہوں نے یہاں کوئی ال
پس دیوار قفس قفس زلفاں کی ایجاد
اور اسے سارے کھلتی ہیں زبان کر ڈالنا
لہو کی کے دور کے زبیر کے ہر موسم میں
ہوئی آواز ہے یہی زخم کھد کرتے ہیں
کو چہ شمع سے تھا نہ شمع بلا پہرہ تو
فیض صاحب ہی سے کہہ لو کہ ملا کرتے ہیں
فیض صاحب سے ملو مل کے ساتھ ہنگ
ورن اس کش کش دہریں رکھ گیا ہے
ایک میوہ کیلے نام کی چاہت کے سوا
بھر کے دکھ کے سوا، وصل کی راحت کے سوا

پھر ملے یا نہ ملے فکر معیشت سے نجات
فیض صاحب سے ملو مل کے مسرت ہوگی
ہم نے بڑھ کر انہیں مقہوم وقا کچھا ہے
ہم نے بڑھ کر انہیں آداب جنوں کیجے ہیں
غم کے اعجاز محبت کے قسوں کیجے ہیں
منزل میں قرب دور نہیں۔ دور نہیں
یہی قلمت کہ دنیا کیجی سہیت ہوگی
فیض صاحب سے ملو مل کے مسرت ہوگی

فیض صاحب نے نئی فکر نیا ذہن دیا
ان سے بیدار نظر اہل بیوں کم ہوں گے
انہیں اپنی ڈولی ہیں ہو میں اپنے
تاکہ جو دل یہ گذرتی ہے رقم ہو جائے
گر نہ ہو معسر کہ لفظ و بیان کا پیرا
یوں ہیں، پرورش لومہ و قلم ہو جائے
جب بھی زخم زمانہ کا خیال آئے سما
ان کے اشعار دل آویزی سر ہم ہوں گے

فیض صاحب نے محبت کے تین رشتے سے
درد مندوں کی عزیز ہوں کی محبت کی ہے
علم و دریاں کو بھی پیا ہا علم جاناں کی طرقت
اور پھر اپنے رفیقوں سے محبت کی ہے
وقت کے ٹوٹنے شیشوں کا میاں بن کر
بند ہوئی ہوئی کھیلوں کو حیا کے ہاتھوں
عبد صرصر میں بہا روں کے سند یہ بھیجے

حسین بھوپالہ

انتظار

جس نے آزادی فکر و تقدیس لوح و قلم کے ترانے لکھے
 جس نے اہل وفا، اہل دل، اہل حق کے فسانے لکھے
 جس نے عصمت کو جس تجارت بنانے پر دلوں کو سونپ لکھے
 جس نے سرکش جیلے جوانوں کے زنجیں قصیدے لکھے
 جس نے زنداں میں بھی زندگانی سے بھر پور نغمے لکھے
 جس نے تاریک راہوں کو قندیلِ غم سے فردزاں کیا
 جس نے یادوں کے زخموں سے دشتِ وفا میں چراغاں کیا
 جس نے ناموسِ ارض و وطن کے لئے خود کو رسوا کیا
 ہم اسی فیض کے معتقد ہیں — !

جو پھر خونِ دل میں ستم آسٹنا انگلیوں کو ڈبو کر
 رنجِ اہرمین پر چھڑک دے
 اندمیرے کی زنجیر کے گنگ حلقوں کو پھر سے زباں بخش دے
 ہم اسی فیض کے منتظر ہیں — !

معجزۂ اصوات

اے نغمہ کار!

موسیقیوں کو درد کے ساپنے میں ڈھال کر
تاریکیوں سے سوج کا سورج اُتھال کر
بے دردیوں کی رات میں صبحوں کو پال کر
اے نغمہ کار، اہل وطن سے سوال کر

”کیا مل گیا ہے اپنا ہو چاٹ کو مجھے
تخلیق و آگہی کا سفر کاٹ کر مجھے

سینہ سدا اُٹکتا رہا غم کی آہ سے
گھلتا رہا ہوں آتش پیہم کی آہ سے
شعلے اُٹھے ہیں دیدہ پرکھ کی آہ سے
چٹو لوں کو آگ لگ گئی شبنم کی آہ سے

دامانِ مون سے میں نشہ ہے کہ زہر ہے
کیا آئینہ دکھاؤں کہ اندھوں کا شہر ہے

ہر ہونٹ پر بے کرب کی پیٹری جی ہوئی
ہر ہنکدہ میں بے نور کی مشعل بھی ہوئی
ہر صبح میں ہے شب کی سیاہی گھلی ہوئی
احساس آگہی نہ ہوا، جہاں کنی ہوئی

کو رانِ شہر دید کے شیدائی ہی نہیں
شرم کے لگاؤں کہ بنیائی ہی نہیں

منظر ایٹوپے

البیلا فن کار

فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار
جس کی تحریروں میں رقصاں خونِ جگر کی دھار
راہیں روشن روشن جس کی منزل منزل نور
جس کے ہونٹوں پر بکھرے ہیں نغماتِ جمہور
انساں کی آزادی جس کا بنیادی دستور
ادنیٰ، اعلیٰ کی تفریق سے ہے جو کوسوں دُور
کاہکِ شانی جہلوں سے جس کا سینہ معمور
سُورج کی مانند ہے تابندہ جس کا کردار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار

جس کا خام سازِ ادب کے واسطے اک مضراب
جس نے سکھائے دل والوں کو صیغے کے آداب
انسانوں کی عظمت ہے جس کا جسنو ایمان
جس کی نظر میں سب ہی یکساں میر ہو یا دمقان
اپنے وطن کی نگلیوں پر ہوتا ہے جو قربان
پاک زمیں کی سوندی مٹی سے ہے جس کو پیار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار

کوئے نگاراں کے چرپے یا دارورسن کی بات
قص ہوا نگاروں کا یا ہر نعمتوں کی برسات
سنگ و خشت کی بارش ہو یا دریاؤں کا شور

خوشیوں کا سایہ ہو یا ہو غم کی گمٹ گھٹ گھوڑ
نور کا اک چشمہ کچھوٹے یا اندھیاروں کا زور
کھیل چکا جوہر طوفاں کی موجوں سے سویا
فیض ہے عصر حاضر کا وہ البیلا فن کار

دیوانوں اور فرزانوں کے لب بہر جس کا نام
لبتی بستی، فترت، فترت، جس کا چرچا عام
نگری نگری، صحرا صحرا، جس کے نقشے میں چور
جس کا سینہ حب وطن کے جذبے سے معمور
زنداں کی تاریک فضا کو جس نے کیا پُر نور
جس نے توڑا دیوانوں کی خاموشی کا تار
فیض ہے عصر حاضر کا وہ البیلا فن کار

اُونچے خواب دکھائی گھڑیاں، گاتے ماہ و سال
اُڑتے آجیل، بکھری زلفیں، بہکی بہکی چال
رنگین لٹے، ہلکی راتیں، اُجلی صبح و شام
شان و شوکت، جاہ و حشمت، راحت یا آرام
عزت، شہرت، دولت، عظمت، دنیا کے انعام
ان تھوٹے سکون کا جس نے سر دیکھا بازار
فیض ہے عصر حاضر کا وہ البیلا فن کار

جس کی نظریں موتی میرے سب ہیں پتھر مول
سوئے چاندی سے یڑھ کر اس جس کے میٹھے بول
بھر کی بھری موجوں سے جو کھیل چکا سویا
جس کی ایک نظر سے بدلی طوفاں کی رفتار
جس کے تیور دیکھ کے لڑائی ظلم کی ہر دیوار
فیض ہے عصر حاضر کا وہ البیلا فن کار
ملکوں ملکوں جس کے فن کی دھوم مچی ہے دھوم
پاک وطن کی جنت! تو بھی اس کا ماحول جو

تاجِ اسلام

شاعرِ رنگینِ نوا

اے مرے پیارے وطن کے شاعرِ رنگینِ نوا
 تیرے اسلوبِ بیاں پر میرے جان و دلِ فدا
 تیرے شعروں میں لگا رانِ غزل کی شوخیاں
 تیری آوازوں میں خوابوں کی میس سرگوشیاں
 مودہ بھری آنکھوں کا جادو رسِ ہنسِ ہنوں کے جام
 عارفی گلگوں کی جہیں، غزلِ زلفوں کی شام
 روشنی کے چاندِ لے کر آ رہی ہے چاندنی
 ذہن پر اکب کیفِ بن کر چھا رہی ہے چاندنی
 شمس کے نبوت کے رُشقی کی بے تابیاں
 شوق میں ڈوبے ہوئے جذبات کی انگڑائیاں
 کہتے انسانے لب و رخسار کی تختِ زیر میں
 کہتے موقرِ دل نشیں الفاظ کی زنجیر میں
 دل کی دادی میں پہنتے ہیں تیرے گیتوں کے پھول
 نور و نبوت کے شگفتے اجیتی، بگوں کے پھول
 توستہ بہ شمشیں فروزاں کہیں سُرِ بزمِ سخن
 بن کو مودہ ہم کر نہیں سکتی ہوائے شعلہ زن
 تیرے گیتوں، تیرے خوابوں، تیرے رومانوں کی خیر
 ظلمتوں میں چاندنی کے آئینہ حسانوں کی خیر!

وقار خلیلے

فیض تنویر حیات

فیض شعر و نغمہ و تہذیب و مے خانے کا نام
 علم و دانش کا، اُجالوں کے سمن خانے کا نام
 فیض، رقیں نکھت گئی، فیض، بادِ نوبہت ر
 کفر و ایمان کی حدوں سے ماورا جانے کا نام
 فیض ذہن و فکر کے دنیائے فوق طیبت
 فیض، بامِ وقت پر: لغوں کے ہر آنے کا نام
 فیض، ملکِ صبح کی تحسیر، تنویرِ حیات
 شاعرِ شہرِ رنگاراں بھی ہے دیوانے کا نام
 فیض کے اشعار اوراقِ شہرِ زندگی
 فیض، بزمِ ہمیشاں میں صبح کے آنے کا نام
 فیض کا فکر رسا چہرہ سماحِ لاس کا
 غمِ حاضر کی غزل کے آئینہ خانے کا نام
 فیض اقلیمِ سخن میں طرحِ نو اندازِ حسن
 مقتلِ شہرِ ستم میں جامِ بھلکھلنے کا نام
 فیض، غالب کی غزل کی آبرو و حافظ کا بام
 دشتِ میرو مومن و آتش کے خم خانے کا نام
 مُسکراتی، گنگنائی زندگی فن کا وقار
 فیض اک گلی رنگِ شخصیت کہ افسانے کا نام

امندِ رُسینے بشارت

ہزاروں برس تک	مہکتی ہوئی واہلیں سے
زمانہ	گزرتے رہیں گے
تری رنگد میں	خراماں، خراماں
بجھائے گا پتلیں	کئی منچلے ہرواں بہاراں
تراہر نشانِ قدمِ جوئے کو	
زمینِ پستاروں کی بارات اُترا کرے گی	ہزاروں تبشُم
تری پستیوائی میں تقسیم میں	ہزاروں دعائیں
چاند سورج بھی گریزوں کی افشاں لٹتے رہیں گے	ہزاروں نگاہیں
ترے ہم سفر، ہم سفر —	ترے صوفشاں جاوداں جسمِ وجاں پر
امیرِ پارسے رہیں گے	جیس پھول بن کر
شفق، آج بھو، چاندنی،	بکھرتی رہیں گی
کھمکشاں	
نیلگوں، آسماں	ہزاروں برس تک
موت و دموت بجتے ہوئے تیز دھارے رہیں گے	ہراک لب پہ تیرے ترانے رہیں گے
	ہزاروں برس تک
تیرے مکروہن کی	ہراک گھر میں تیرے دسانے رہیں گے

طلعتے اشارتے

محرمِ جذبِ رمل

شوق! تو دستِ تہہ سب "جفا کو تمام لے
تیری خاطر مل رہے ہیں چاک دامنِ چین

عظمتِ انسان کا حامل داعیِ امن و سکون
"نجرم" شہر و سخن، آکاہِ رمزِ زندگی
فیضِ بیدارے وطن کو نازِ محبوبی ہے آج
اور زنجیرِ جنوں کی دائرِ بانی بڑھ گئی

ہر ذمے میں زباں کو طوق پہنائے گئے
اور انا الحق ہر جگہ منصور چلاتے رہے
جراتِ زندانِ زندہ ہی رہی ہر حال میں
دار پر کھینچے ہوئے منشور چلاتے رہے

محرمِ جذبِ درونِ جلوہ ساماں تو کبھی ہے
فیضِ پندارِ دل و جاں کا غزلِ خواں تو کبھی ہے
تو علامت ہے شکستِ اہلِ استہدا و کی
اور ہجومِ خار و خش میں گلِ یاماں تو کبھی ہے

ان گنت صدیوں کے نیچے آج انسان کا ضمیر
زیست کی پامال قدروں کی طرح پامند ہے
ہے شہم گر آج بھی پرویز کا احساسِ ملک
کوہن کا بڑے شیریں ابھی تابندہ ہے
اہلِ سلطوت اب بھی فردوسی کو دیتے ہیں فریب
جراتِ سقراط اندازِ جنوں میں زندہ ہے

مورِ سیداد ہے بے ہرئی تمیاد ہے
پر فغانہ عشق کا دنیا کو اب تک یاد ہے

- نقشِ فریادی "ہوئی ہے عظمتِ شانِ طن
کیا صدائے در رہے کہ کوئے اُٹھے کوہ و دمن
کر چکی دستِ صبا خوشبوئے گل کو مندر
لاکھ کلکیں نے کئے پامال پتوں کے بدن
فیضِ زنداںِ نامہ "دل ہے کہ روشن ہوگی
ماہِ جانان سے زیادہ منزلِ دار و رسن

اجمل اجمل

اندھیری رات کا چراغ

ترے وجود نے بخشا ہے یہ یقین مجھے
کہ تیرگی میں بھی کچھ آفتاب پلتے ہیں
خیموں کی گود میں جھلکتے ہیں ہمدرد کا چین
اندھیری رات کے دل میں چراغ جلتے ہیں

ہمارے دور کی اس بے کراں سیاہی میں
ترا وجود نئے دور کا استعارہ ہے
ترے وجود نے کتنی ہے زندگی کی انگلی
ترا وجود ہمارے لئے سہارا ہے

کچھ تجربہ بھی نہیں جب اکٹھی ہماری نظر
تو قافلے کے ہزاروں میں تو نظر آیا
اٹھائے غم تو تری شکلوں سے آنکھ لڑی
سجائے دار تو تیرا کلو نظر آیا
لگے جو زخم تو زخموں کو تیرے یاد کیا
بہا جو خون تو تیرا بہو نظر آیا

ترے خلوص کی سوگند کھائے کہتا ہوں
ترے وجود نے بخشا ہے یہ یقین مجھے
کہ تیرگی میں بھی کچھ آفتاب پلتے ہیں
اندھیری رات کے دل میں چراغ جلتے ہیں

۲۰۰۰ قافے صدیعت

فیض بڑا فنکار

فیض ہمارے پیارے پاکت ن کا اک فن کار
فیض ہماری اردو کے دلداروں کا دلدار
فیض ہے ایسا شاعر جس کے اہل بیت اشعار
شعر و ادب کے شہکاروں میں لافانی شہکار

فیض کے پیارے دل میں سارے دل والوں کا پیار
فیض ہمارے لاکھ غموں کا سنجیدہ غم خوار
فیض کو سب سے ہمدردی ہے فیض ہے سب کا یار
فیض کے سندرپنوں میں ہے ایک نیا سنہار

دستِ مہیا، نقشِ فریادی، جیسے دو گنگرہار
زندانِ نامہ، فنکارِ نظر کی چاہت کا میثار
فیض کے فن میں کچی ہوئی ہیں تہذیبی اقدار
فیض ہے سچی آزادی کا ایک علم بردار

فیض کے فن سے وابستہ ہیں شائستہ افکار
فیض بڑا انسان ہے یارو فیض بڑا فن کار

مثالِ رضوی

سنتِ سخیہ

وہ شعلہ بیاں، وہ شعلہ نقش پرستارِ امن

میر و غالب کی روایات ہیں زندہ کتبہ سے
حسن کا امن و محبت کا پرستار ہے تو
کسی حکمت سے ترسے سر کو ٹھیکایا نہ گیا
نفرت و عدم سے آمادہ پہلا رہے تو

ترا اسلوبِ نگارش ہے زمانے سے جدا
خنیچہ و گلی کو ہیں بنے بنے معنی تو نے
تیرا ہر نقش حقیقت میں ہے اک نقشِ جیل
محض مانی و بہزادِ سبالی تو نے

تیرے اشعار میں یوں امن و محبت ہے رواں
اہلِ دل سننے ہیں دلِ تمام کے رہ جلتے ہیں
ترسے ہر لفظ میں وہ رنگِ معانی ہیں نہاں
ذہن میں قوسِ قزح بن کے جو ہر اسے ہیں

تیرا غم صرفِ تلخ غم ہی نہیں ہے اس میں
قصہ درِ وطن بھی، غمِ احوال بھی ہے
ہے تری فکر میں وہ بات تو دینا جس میں
دل کی دھڑکن بھی ہے روادِ مددِ سال بھی ہے

غنچوں کا دہن!

پھولوں کی زباں

ہستی کا سخن

فطرت کا بیان

گلشن کی خزاں پر صبح و صند

شبِ نیم کی طرح جواستادِ فن

جو پادشاہِ سل رو کر بھی

خدا مومن نہیں رہتا ہے کبھی

نئے جس کے شعلے بن کر

بن جاتے ہیں اک آزادی

وہ شعلہ ہیں وہ شعلہ نقش

وہ دشمنِ جانِ اہلِ ہوس

ہے میرے وطن کی آنکھوں میں جیسے تارا!

کہتا ہے زمانہ فیضِ اسے

وہ شاعر ہے حساسِ محبت کا متوالا

شیخِ وطن کا پیروانہ

اک دیوانہ!

رکھتا ہے نظریہ اپنی جیسے

اس شمشیرِ زرد کا

قرزانا !!

سلیم خواجہ

فیض

کچھ دن ترے افکار کی دنیا میں رہا میں
کچھ روز ترے شعر کے گلشن میں گزارے
اس پھول کو چھیڑا، کبھی اس خار کو چوما
آنکھوں پہ سجائے کبھی اشکوں کے ستارے

شائخوں کو ہمبند یا کبھی مستانہ آواہے
راحت کبھی پیڑوں کے گھنے سائے میں پائی
پین آیا کبھی سبزۂ نورِ ستارہ پہ مجھ کو
بلبل کے ترانوں نے کبھی فیضِ اڑائی

اور آہن ترے نکالین معنی سے بہت دور
میسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر چاپ میں تو ہے
ہر رُوح ترے انتمہُ السنۃ کی بے گھمیل
ہر چاپ گریباں ترے نغموں سے رفو ہے

لے غالب و اقبال کی محفل کے منقہ
اے عظمتِ انساں کا جنوں پالنے والے!
ہے راہِ ہر و منزل تقدیرِ لبشر تو
ہیں مطربِ فردا کا ترکم ترے نالے

نغمات کا رس گھول رہا ہے مرے دل میں
لگتا ہے کہ تو بول رہا ہے مرے دل میں

فیض پائے

سالک لہارشی

نفق فریادی " نہ ہو بے فیض تاثیر نوا
ہر دل بیدار کا جبریل ہے "دست صبا"
"نامہ زندہ ان" میں ہو جس کے ہو کی زندگی
اہل زندان کو پسندئے نہ کیوں اُس کی ادا
علم کی صنو سے ترا "دست ہمد سنگ آج چم
شاہکار عصر کی صورت گزی کرتا رہا
اہل فن کے درد کی تفسیر ہے تیرا کلام
گو جنتی ہے قبرا سبدا میں تیری صدا

شوکت عابدی

جو اہتمام بہا ر دوام کرتے ہیں
بعد حنلوص انہیں ہم سلام کرتے ہیں
ہیں ارتقا کے فنانوں کی سرجیاں جن سے
وہ نوگ دیدہ و دل میں قیام کرتے ہیں
فسرارِ دار انہیں کو نصیب ہوتا ہے
جو کائناتِ نسبت میں نام کرتے ہیں

شمسی جہرانی

ذروں میں تابشِ مہ و انجم تجھی سے ہے
قطروں کے دل میں دولتِ قلم تجھی سے ہے
موجوں میں آرزوئے تلاطم تجھی سے ہے
ممنت کشوں کے لب پہ ترنم تجھی سے ہے
یرے جنوں سے عظمتِ فعل بہا رہے
ہاں تو جہانِ شعر کا پروردگار ہے

رشید احمد لاشاری

لے نگاہِ فیض! اس لطف و کرم کا شکریہ
دُم نہ تھا کچھ اپنے دُم میں تیرے دم کا شکریہ
شہرِ یادِ علم و فن، لوح و قلم کا شکریہ

نذرِ فیض

رعنا اکبر آبادی

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف بہرنے کا نام

مردوانی ہے وفا میں جیل کے مرجانے کا نام
ربطِ غم کی حدائے مستحق ہے زندگی
شیخ آغوش میں روشن ہے پروانے کا نام
موت ہے اس ساز کے خاموش ہو جانے کا نام
دیکھئے آپ کی نذرِ یوں پر الزام آئے گا
آپ کیوں شرم رہے ہیں سن کے دیوانے کا نام
عجب کو دیوانہ بنائے اک زمانہ ہو گیا
یاد ہی اب تو نہ ہو گا ان کو دیوانے کا نام
میں کسے سمجھاؤں رعنا اپنے ویرانے کی قدر
بستیاں اُڑیں تو کھیر ملتا ہے ویرانے کا نام

رفتِ ہمدانی

بیزارِ فضا، درپے آزاہیا ہے

معمورہ انکار میں اک شرمِ پیا ہے
ہونٹوں پہ ہنسی سینوں میں کہام پیہ ہے
اور اک بھی انسان کے لئے طرہِ بلا ہے
دیوانوں نے بھینے کا چین سیکھ لیا ہے
اب دشتِ جنوں بھی جو عساکر کے عجیب کیا
دیوانہ کوئی سے کے ترانہ ام آکھا ہے
ہم ذوقِ سماعت سے ہیں سرور و گوہر
ہر قطرہ شبنم میں دھڑکنے کی صدا ہے
دھڑکا یہ لگا ہے کہ سحر آئے نہ آئے
اس غم سے سرشام ہی دل ڈوب رہا ہے
اندازِ کچھ ایسا ہے رعنا اپنی غزل کا
مست ہے جو بے ساختہ کہتا ہے رہا ہے

مرتضیٰ برلاس

جلے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے

اک باری جی جگر کے سزا کیوں نہیں دیتے
اچھے ہی اگر مونس و غم خوار ہو میرے
گر دُش غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے
یارو! مجھے مرنے کی دوا کیوں نہیں دیتے
خردا کے جگر دلوں میں مجھے ڈھونڈنے والو
ماضی کے درجوں سے صدا کیوں نہیں دیتے
موت کیوں تو پھر سوزِ مژگاں سے پرولو
آنسو ہوں تو دامن بگڑا کیوں نہیں دیتے
صاہیہ ہوں تو پھر ساتھ نہ رکھنے کا سبب کیا
پتھر ہوں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے

خلیل رامپوری

نہ گمزاؤں تا کہ نیم کش، دلی، ریزہ ریزہ گمنا دیا

دلِ داغِ داغِ مٹا دیا، تن ریزہ ریزہ گمنا دیا
وہ لباسِ جاں کہ جو رہ گیا تھا، ہوا میں آج اُڑا دیا

لہ منہ بکے ساتھ تھرتھرت کر رہا ہوں - ع

افکار فیض نیر

کوئی کونے جانان کے یام و در پہ بجائے کلمہ دل
کہیں کیا کہ پیٹے جھٹائے غم کو خیال تیرا جگا گیا
یہ ترے خیال کا فیض ہے کہ مہک رہے ہنس نغمہ
یہ ہمارا دم تھا کہ داں پر بھی "کہا" تو خود کو چٹھا دیا
جو چراغِ اہم نے بجھا دیا تھا ہوائے اُس کو جلا دیا
یہ تڑپاؤ نور ہے، خاک کو گل آفتاب بنا دیا

ابوالخیر کشفی

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں

اربابِ ہوش منزلِ آسودگی میں ہیں
جس دل سے زندگی کو ملے نغمہ سمرمدی
ہم تو تری تلاش میں منزل سے آئے ہیں
نغمہ مرے خیال کے اُس دل سے آئے ہیں
صہرا کی رنگِ چشمہ بہتاب بن گئی
تینج جہا بھی عشق کے قدموں پہ تھک گئی
میاوس ہو کے کوچہ قتل سے آئے ہیں
جو آئینہ ہے اُس کے مقابل سے آئے ہیں
کشفی ادائے دوست کے سانچے میں پھول گئے

عبید اللہ علیم

گر مے شوق نظر کا اثر تو دیکھو!

دوستو! خونِ شہیداں کا اثر دیکھو
درہ کی دولت کیا بمرے پاس بہت
کاسہ سرے آئی ہے سحر تو دیکھو
ظرف کی داد تو دو میرا جسگر تو دیکھو
نزلِ شوق گریزاں ہے گریزاں ہی سہی
کون بے دیاڑا ہے بیمار ولی کا مذاق
عجبہ کو الزام نہ دو اپنی نظر تو دیکھو
دباغ ہم پیشگی تنگ نہ ہو سحر تو دیکھو

منظر مفتحی

دونوں جہان تیری محبت میں ہمارے

سرو و سین نہ جانے کہاں اس دیا ر کے
سشبنم کی بوند بوند کو ترسی کلی کل
گم ہو گئے ہیں موع میں کانٹے اتار کے
دریا بکھٹتے قافلے ابر بہار کے
برقِ خیال و شعلہ احساس و سوزِ دل
سب ہو گئے چراغ تری رہگذار کے

احمد وحید اختر

کچھ دن سے انتظار سوالِ دگر میں ہے

سازِ حیات لذتِ سوزِ جگر میں ہے
کیس تک عجابِ لالہ و گل میں چھو گئے تم
سوزِ جگر کا راز تمہاری نظر میں ہے
کس کا جمال دیدہ صورتِ گلزمین میں ہے

عنوانِ بدل بدل کے سناتے ہو بیاد

افسانہ حیات تمہاری نظر میں ہے

آدم چائے

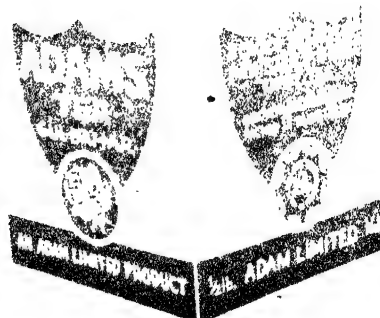
ایک پیالہ



بیکریٹ

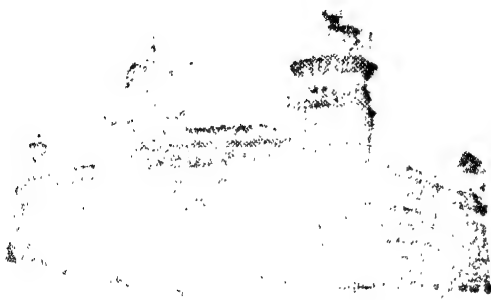
بیکریٹ

آدم لیٹ



مشرق کا سنگ میل

ZEALPAK

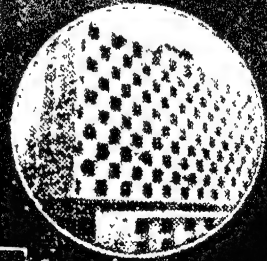


Cement

پاکستان سیمنٹ کی صنعتوں سے وابستہ عمارت تعمیراتی ہے

زیر پاک و میپس ایف سیمنٹ

دنیائے کسی بھی ملک کے در آمد شدہ سیمنٹ کا مقابلہ کر سکتے ہیں



مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

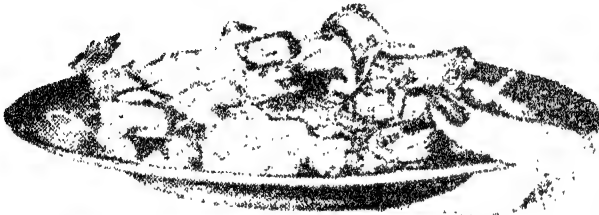
ORIENT

خوشخبری

آج اور مَئے
کے لئے

مشہور و زمانہ
منگمری بسکٹ
بنائے والے

بڑی مسرت کے ساتھ اعلیٰ قسم کی خوش ذائقہ



منگمری



سوئیٹ اور ٹافیاں

پیش کرتے ہیں!

جرمن ماہرین کی نگرانی میں خود کار مشینوں پر تیار شدہ!

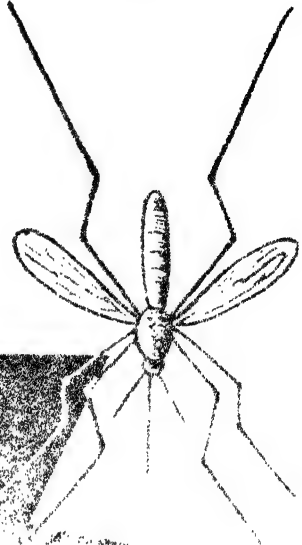
تیار کردہ

منگمری منسورا اینڈ جنرل ملز لمیٹڈ، منگمری

فکر - فکر - فکر

ملیریا سے نجات

اگر آپ مریض ہو



کی جس نوعیت کے مریضوں کو
جس میں مریضوں کو
نہایت ہی کم ہوتے ہیں
نکال دئے گئے ہیں۔

مگرمیوں کی چھان ۵۰ پیسے پر
ہر روز وافر دوا سے مل سکتی ہیں۔

ہر روز ویکم اینڈ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ
ہنگو روڈ، کراچی



بارش سنگ

تھیں کیا شور مچول ختم ہوئی بارش سنگ

- ★ فیض کی انفرادیت
- فیض نقش فریادی سے زنداں نامرنگ
- ★ دلی پریزوں کا ہنر تو دیکھو
- فیض کا فن شاعری
- ★ کچھ فیض کے ہائے میں اور بہت کچھ اپنے ہائے میں
- شاعر محبت، شاعرانیت
- ★ شاعر حیات و کائنات
- شاعرِ باعمل
- ★ زنداں نامہ پر ایک نظر
- تارِ حریر و رنگ
- ★ فیض، ایک تقابلی مطالعہ
- وقت، نقش فریادی، ہم اور میں
- ★ فیض کی غزل
- فیض کی شخصیت پسندی
- ★ فیض میری نظریں
- فیض، ایک سحان
- ★ فیض کا اسلوب شاعری
- مرکزِ داستان ہے فیض
- ★ فیض کی شاعری، چند فنی پہلو
- فیض، ایک نثر نگار
- ★ فیض کے دو عشق
- فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور
- ★ فیض کی شاعری اور زبان و بیان
- فیض کی شاعری۔ پس منظر و پیش منظر
- ★ فیض، غم جاناں سے غم دوراں تک

پروفیسر سید احتشام حسین

فیض کی انفرادیت

بعض مخلص اور دایہ انداز لوگوں کے اظہار عقائد میں بھی ایک ایسی منزل آتی ہے جہاں ’’واحد رنگ لفظ‘‘ کفر کا فتویٰ لگاتا ہے اور کافر ’’مسلمان‘‘ قرار دے کر ان سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ یا پھر وہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کچھ دل موہ لینے والی باتیں ایسا کام کر جاتی ہیں اور کفر و اسلام کی جہان بین کرنے کے بجائے گمراہی اور سمان دونوں ان کا ہاتھ جوڑنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جب مسلمان دوسروں سے اپنی علانہ گئی ظاہر کرنے کے لئے ان میں صرف کفر نکال سکتے ہیں تو کافر ’’ساری انسانی خصوصیات کو نظر انداز کر کے‘‘ اپنی بیزاری کے جواز کے لئے دوسروں میں صرف اسلام کی جستجو کرتے تو چاہے غیبت کا خون پیئیں : ہو جائے، اندھے جذبہ منافرت کی تسکین ضرور ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں صرف چند شرک پہلوؤں پر نظر رکھ کر کفر میں اسلام اور اسلام میں کفر کا جلوہ دیکھ لینے کی آسودگی حاصل ہو جاتی ہے۔ دونوں نقطہ نظر جذبہ باقی میں لیکن پہلے سے منافرت اور دوسرے سے رواداری کے موئے بھونکتے ہیں۔ شعر و ادب سے اظہار انداز ہونے میں غالباً دوسری شکل زیادہ مفید ہے کیونکہ اس میں کہتے کم نا انصافی اور بیزاری کی صورت نہیں پیدا ہوتی بلکہ مختلف اندوزی اور ہم دروازہ تنقید کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔

فیض کی شاعری پر اظہار خیال کرتے وقت تمہید کے طور پر یہ چند شرطیں بے اختصار لہجے نکل گئیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی شاعری پر تنقید کے لئے قلم اٹھانے والوں میں سے اکثر کافر لڑتا ہے اور ترقی پسندی کو آنکھ بند کر کے کوسنے والے بھی کسی کی حیثیت سے ان کو مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ ان لوگوں کا ذکر نہیں جن میں صرف تذکرہ اور تائید، واحد اور صبح، روزمرہ اور محاورہ وغیرہ کی چند غلطیاں دھوئے دکھانے کے بعد فیض کے اشعار کی ساری معنوی سحر کاری اور اپنی گرامی پیچہ نظر آتی ہے کیونکہ ایسے لوگ قافیہ معافی ہیں، ان میں سے بعض زبان کے تخلیقی استعمال اور اظہار کے پرمیج آبنگ سے واقف نہ ہیں جن میں لیکن غور و طلب بات ہے کہ اکثر ناقدوں نے بہت سے عیوب گناہ لینے کے بعد بھی فیض کے ہندسیہ کاوی کی داد دی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ہٹھنے والے کسی بات سے متاثر ہوتے ہیں اور فیض کی غزلوں یا نظمیں میں انہیں کیا شائبے و کچھ خاص خیالات و خاص طرز اظہار و خاص نسیم کے اشارات اور علامات و کوئی ایسا ناپن جو متوجہ کرتا ہے کہ کوئی ایسی جز باقی فضا جو ہم آہنگی کے دائرے میں داخل کرتی ہے وہ کوئی ذہنی یکانگی جو ہم خیالی اور ہم سفری کا احساس پیدا کرتی ہے و باتیں بھی ہوسکتی ہیں ادبی ایسی ادبی اور فنی و سحر بھی جو احساس مسرت

پیدا کر کے آسودگی بخشتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ سادی باتیں نہ کر کیف اذوق کا سامان نہ رہس کر قی ہیں۔ لیکن کوئی انہیں سکوئی ایکسپی بات پارکمل نہیں ہو جاتا ہے کیونکہ شاعری کا اصل مقصد اس لئے دی ہوتا ہے۔ اور دوسرا دوسری بات دیکھ کر خوش ہوتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں شاعری کا بنیادی کام اسی بات کی تکمیل ہے جو اسے پسند ہے۔ اس طرح ذوق کی انفرادیت، شاعری کے اصل مقصد کے مطابق ادبی اور تخلیقی نقطہ نظر سے شاعری ذات سے تعلق کی بنیادوں پر پسندیدگی اور عدم پسندیدگی کا معیار قائم ہو جاتا ہے۔ اسے محض ذوق کے ابتدائی نقوش سمجھنا درست نہیں کیونکہ اکثر متغیر فن کے اعلیٰ اصول بھی انھیں تعصبات کی پشت پناہی کے لئے جوہر اور مادہ کی کام دیتے ہیں۔ بہت اعلیٰ پایہ پر۔ تنقیدی شعور سے پس یہ ہو جاتا ہے کہ نگاہ میں تھوڑی سی معروضیت اور فلسفیانہ برکھ اور اصول و روایات فن کی روشنی میں اظہار اور ترمیم کی صلاحیت کو جاننے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی سے تعصبات اور تاویلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ فیض کے مطالعہ کے سلسلہ میں بھی بات دی ہے فنی صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو اتنی جہات سے قائل کرے کہ اس نے تعصبات کا دائرہ بالکل تنگ کر دیا ہے۔ اور نہ وہ ان کی ایک بات کو اپنے گناہ ہے تو دوسری بات کو اپنے گناہ ہے، اگر ایک خیانت، اختلاف ہو تا ہے تو دوسرا اپنے ذہن اور دل کی آواز معلوم ہونے لگتا ہے، اگر کہیں ایک ادبی یا سانی نقطہ نظر سے تو دوسری خوب صورت تر کہیں، اور معہ یہ جانائی ہیں۔ جس سے پہلی غلطی کا وزن بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح فیض کی پسندیدگی کا دوسرا حصہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی شعور سے شعور و ادب سے مختلف قسم کے تعصبات کہنے والوں کو ایک وقت متوجہ اور مست نرا کرتا ہے۔

دیکھئے، تو کس شاعر کو عام طور سے پسند کرتے ہیں متعدد ملکی اور مثبت اثرات کی کار فرمائی ہوتی ہے اور ذوق کی انفرادیت پسندیدگی کے انداز میں قائم رہتی ہے لیکن کچھ باقی ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا ذوق اور فن مختلف ملکوں کو یکساں طور پر نہیں چھوڑی۔ ہوا کرتا ہے اور کچھ ادبی فنمندی پر مشرک ہونے لگا کر دیتا ہے جن سے حساب و جمال اور احساس سود و زیار، دلائل کی تسکین ہوتی ہے۔ میرے خیال میں فیض کی شاعری پر اس صورت فراہم کرتی ہے۔ اس لئے مختلف خیال و انداز و ادبی فنمندی اور فنمندی کے لوگوں میں سے کہیں اپنے سے قریبی پاتے ہیں۔ انفرادیت سے جنہیں پسند ہے۔ اور جو یہ وہ احساس غم کی آفاقیت اور سادگی جیسے جو فن اور زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے سے وجود میں آتی ہے۔ فن کے تقاضے روایت اور روایات، کلیت اور ردائیت، طرز اظہار کی انفرادیت اور فنمندی اور فنمندی کی آمیز جاتے ہیں۔ اور زندگی کے تقاضے انفرادیت اور جماعتیت، انسانی ارتقاء و معاشرت اور خواب، آزادی اور ضبط و نظم کے درمیان ایسا توازن چاہتے ہیں جو انسانی اور تہذیبی اقدار کو درہم برہم نہ کرے۔ اور اگر کہیں بھی تو اس حدود جہد کا مظہر نہ کر جو ہر تہذیب اور تہذیب کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ فیض کی سادگی کے ساتھ ساتھ ان کی انفرادیت کے یہی عناصر ہیں اور یہی مضامین انھیں کی نشاندہی کر رہا ہے۔

فیض کی کائناتیں ہر شے کا مطالعہ کرتے والا سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ وہ جب شعر پڑھے۔ یا ہر تو اسے شے ہی ملیں۔ ایسے شعور و محسن الفاظ کو ذخیرہ ہوں، محض غرض کی رات کاروی سے وجود میں نہ آگئے ہوں، محض مترنم مصرعے یا باعنی بول نہ ہوں بلکہ کس احساس اور ادراک کی ترسیل کرتے ہوں جو شاعر اور قاری کے درمیان کوئی داخلی اور خارجی کے اندر سے ہر ضرر و رشتہ اور رابطہ قائم کرے۔ یہ رشتہ جتنا قوی اور جتنا زیادہ لوگوں سے ہوگا۔ شاعر آسانی پر مدعا ہوگا۔ فیض کی شاعری انھیں جیشوں سے نشاندہ ہے۔ بالکل ابتدائی تخلیقات کو سمجھ کر جو جن میں کثرت بہتر پر یا تو انگریزی رومانی۔ شاعری کا اثر نمایاں ہے یا رومی غزل

سرائی کا انداز پیدا ہو گیا ہے، اُن کا مختصر سراسر شاعری خیال اور انجسار، جذبہ اور ذہن، خارجیت اور داخلیت کے توازن کی جبریت ایگز مثال ہمیش کرتا ہے۔ یہ ریاض، ہفتی سخن سے نہیں، تہذیب نفس سے پیدا ہوتا ہے اس کا سراسر اچھے نقش فرادی کے دیا چہ میں لا۔ اس کے بعض حصے اس نے نقل کر دیا ہوں کہ فیض کی بعد کی شاعری اسی اجمال کی نفی، اور اسی خیال کی تکمیل ہے۔

• آج سے کچھ برس پہلے وہ اتفاقاً آخر ۱۹۳۲ء کا شروع ۱۹۳۳ء میں لکھے گئے

ہوں گے، ایک معین جذبے کے زیر اثر اسٹوڈنٹ پر خود وار دہونے لگے لیکن اب مفاہین کے لئے تجسس کرنا پڑتا ہے، علاوہ ازیں ان لڑکھائی کے تجربات کی حشر میں بہت گہری نہیں ہوتیں ہر تجزیہ زندگی کے بقیہ نطفہ سے الگ کیا جاسکتا ہے اور ایک کیسادی مرکب کی طرح اس کی ہر بہت مطالعہ کی جاسکتی ہے۔ اس سفر اور معین تجربے کے لئے کوئی سوزوں سیرا بیان وضع یا اختیار کر لینا بھی آسان ہے لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بے کار بھی۔ اول تو تجربات ایسے غلط ہو گئے ہیں کہ انھیں علیحدہ علیحدہ محضروں میں تقسیم کرنا مشکل ہے پھر ان کی پیسیدگی کو بابت داری سے ادا کرنے کے لئے کوئی تسلی بخش میرا بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا تصور نہیں، شاعری کے ذہن کا عجیبہ، ایک کامل اور قادر الکلام شاعری طبیعت ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتی ہے: اسے ان اظہار کے لئے اسالیب ہاتھ آ جاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ کر پان کر لیتے طالب پر سوزوں کلپتی ہے۔ لیکن ایسے شعراء کی تعداد بہت محدود ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دست نگر ہوتی ہے اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے تو ان کے اظہار کے لئے کوئی سہل راستہ پیش نظر نہ ہو تو یا تجربات کو سن کر ناچڑتا ہے یا طعن اظہار کو، ذوق اور مصلحت کا اتنا مفاہمی ہے کہ ایسی صورت حالات پیدا ہونے سے پہلے شاعری کو کچھ کہنا ہو کہجے، اپنی محض کا شکر یہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔

..... پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نفیس ہیں، انھیں حذف نہ کرنے کی۔

..... نفیاتی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی تجانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے، ایک خاص عمر میں ہر کوئی کچھ محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے سوچتا ہے لیکن عام طور سے ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکز و دعاء سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے عالمگیر تسلیم اور بے انتہائی کے پیش نظر اپنی ذرا ذرا سی کامیابیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اسے تجربات کی نئی تراکیب اور اظہار کے نئے ناموں سے تلاش کرنے پڑتے ہیں اور یہ وہ وقت ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں ان نظموں میں میں نے اسلامی اسالیب سے عزم و زوری انحراف مناسب نہیں سمجھا، محور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا انحراف ہے۔ اور قرآنی میں دو ایک جگہ صوفی مناسبت کو نقلی صحت پر ترجیح دی گئی ہے۔

اور بس ۔۔۔۔۔

میں نے تقریباً پورا دیا چار نقل کر دیا لیکن فیض کی انفرادیت کو سمجھنے کے لئے پھر دہری تھا، شاید یہ اردو کے کسی اور شاعر نے اتنی جگہ نہیں اور اتنی سادگی سے اپنے نظریہ شاعری کو ایسے خوب صورت و عزت کی شکل میں پیش کیا۔ اس میں فیض کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ بھی ل جاتا ہے۔ اور خیال و بیان کی ان پیچیدہ باتوں کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے جو زندگی کا شعور حاصل ہو جانے والا نہیں فن کے سائیکل میں پیش کرنے سے وجود میں آتی ہیں۔

دوست صبا کے پہلے میں یہ شعور اور گہرا، اور واضح اور زیادہ توانا ہو گیا ہے لیکن اس کی بنیاد نقش فریادی کی اشاعت ہی کے وقت پڑ چکی تھی۔ یہ بات فطری تھی کہ بدلنے ہوئے حالات سے ان کے مشاہدہ، انفعالات اور عقائد میں زیادہ توانائی ہو گئی، قوت اور بصیرت پیدا ہوئی چنانچہ اس کا مظاہرہ درست اعتبار زمانہ نامریخی اور فکری تخی سے ہوتا ہے لیکن چونکہ حالات بدلنے کے باوجود بنیادی طور پر ان کے خیالوں کی تعبیر نہیں ہو سکتی اس لئے ان کا مجاہدہ جاری رہا۔ اور امید یہ تھی کہ ان سب زبوں سے گزرتا رہا جو ان کی اور ان کے نصیب المیوں کی راہ میں آئیں۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

موجودہ دور کے قاری کے لئے شاعری یہ یک وقت جذباتی اور ذہنی عمل بن گئی ہے۔ اردو دہرے شاعر کے یہاں اپنے جذبات، اپنے انفعالات، اپنے خیالات اور اپنی دنیا تلاش کرتے نکلتا ہے۔ ایک ایسے سماج میں جو کوسماسی، تہذیبی اور جذباتی وحدت نصیب نہیں جس کے افراد بنیادی مسائل حیات سے ناواقف اور انتخاب، اقدام کے معاملہ میں کورانہ تعلبات کے عادی ہیں، جن کے ماضی اور حال میں دبا ہوا لوٹ مار ہے اور مستقبل کی تصویر بھی یک طرفہ ہے۔ ایسے سماج میں شاعر اور قاری کی اندر کی اندر میری دنیا میں مسہم بنی کا پیدا ہونا معجزہ ہے کہ نہیں تاہم فیض نے زندگی اور فن کی طرف جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اس ہم آہنگی کو ڈھونڈ نکالنے کی ایک مخلصانہ کوشش معلوم ہوتی ہے، یہی بات انھوں نے اپنے دو فنوں میں جوں اور معنی نشری معنائیں میں ظاہر کی ہے۔ انھوں نے اپنے انداز اور باہر کی دنیا کو حالات اور انقلابات کے گہرے شعور کی وساطت سے فطری طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کے لئے سچھوڑ دیا ہے اور قلب و دماغ کی اس درمی کو ڈھالنے کی سعی کی ہے جو عجب فطری مطالبے کرتی ہے۔ انسان کے اندر جو جذباتی کائنات آباد ہے نہ تو وہ غیر جمعی ہے اور نہ وہ نظم عقل جو بے متعبد اخلاقت اور طفلانہ جذباتیت سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ فیض نے ادبی زندگی کے پروجی روابط پر نظر رکھ کر اپنے شعور کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ فن کے دائرے میں موضوع اور معروض کا فرق کم سے کم رہ گیا ہے، فرد کے جذبات سماج کے سمت مندر جذبات بن گئے ہیں۔ اور فرد کا شعور سماج کا شعور بننے لگا ہے۔ یہاں نہ تو کسی کو یہ شکایت ہو سکتی ہے کہ انفرادی جذبات اور تجسرات کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نہ یہ کہ شعور کے دروازے بند کر کے رت، اعصاب کی نیکار پرکان لگا دیئے گئے ہیں۔ فیض کی اتنی محنت نے امتداد، متوازن اور عقل پسند ہوں اور دونوں کی دھڑکنوں اور کردار کو فن کے بالوس لیکن خلوص، فکر کی وجہ سے تازہ اور مست گفتہ اسالیب میں قید کر لیا ہے۔ اس سے ناگہا یہ ہوا ہے کہ بہت سی ذہنی اور جذباتی الجھنوں میں گزرتا ہونے کے باوجود نہ تو وہ خود کسی قسم کے اختلال کا شکار ہوئے ہیں نہ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والا کسی ایسے معاملے سے دو جا رہا ہو جو فطری ہو۔

فیض نے موجودہ عہد کے بعض دوسرے شعراء کی طرح ہیئت اور اسلوب میں غیر معمولی تجربے کیے کہ وہ انوکھا نہیں پیدا کیا ہے جس سے اکثر شعریات کے فقدان یا نقص کی ٹہنی کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان سے خیالات اور انداز بیان دونوں میں اتنی شہرت موجود ہوئی ہے کہ انھیں تجربوں کے درجہ سے اپنے موضوع یا ہیئت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسا نہیں کہ وہ تجربے کی ہیئت یا اس کے فنکارانہ معنی کے منکر ہیں بلکہ جن نظموں میں انھوں نے مردہ اسالیب سے انحراف کیا ہے وہاں بھی اکثر پھنسنے والے کی توجہ اس تجربے

انحراف یا اسلوب بر نہیں ہوتی بلکہ موضوع اور اسلوب کی ہسم آہنی سے پیدا ہونے والے نازک جادو اپنا کام کرتے رہتا ہے اور فاری غیر محسوس طور پر اس تجربہ یا انحراف کو اظہار کا ناگزیر جز سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ ان کے کام کو وہی شخص غیر متاثرہ سکتا ہے جو شاعری کو بڑے محدود دائرہ مفروضہ انداز میں دیکھتا ہے، جو ہیئت اور اسلوب کے تجزیوں کو محض تجربہ ہونے کی کیفیت سے اولیت دیتا ہے، حمان نما، ذہنی اور جذباتی موضوعات سے نفرت کرتا ہے جنہیں بالعموم محنت مند انسان پسند کرتے رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زندگی بڑی پیچیدہ ہو گئی ہے اور کتنا ہی بڑا شعور کیوں نہ ہو وہ زندگی کے تمام مظاہر کو اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ یکساں سن لاری سے پیش نہیں کر سکتا۔ شاعر کا یہ کام بھی نہیں ہے، اسے تو انہیں باتوں کو بیش کرنا چاہیے جو انفرادی طور پر اس کے تصور حیات میں کسی قدر ملکی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اپنی ذات، اپنے جذبات، اپنے ذہن، اپنے غمیرے سچائی برتنے اور اپنے قارئین کو ان راہوں میں بھیکنے سے بچانے کے لئے جنہیں وہ ٹھیک نہیں سمجھتا، اس کو کہ مظاہر حیات میں سے انفرادی اور سماجی پہلوؤں کا انتخاب کرنا چاہتا ہے۔ فیض نے دیانت داری سے یہی کیا ہے اپنی غلی زندگی اور اپنی ادبی اور شاعری کا دوشوں میں انھوں نے تہذیب اور زندگی کی جن قدروں کو اپنایا ہے، وہ ان کے شاعری انتخاب کا نتیجہ ہے۔ اور انھیں فیض نے اپنی بدول کی دھڑکنوں سے ہسم آہنی کر لیا ہے۔ جہاں یہ صورت پیدا ہوئی ہے وہاں فن اور زندگی ایک موجد نے ہیں۔ اور شاعری تبلیغ کی منزل سے بہت آگے نکل جاتی ہے اور اسے تبلیغ کہنے والا دور سے دیکھا رہ جاتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں میں نے فیض کی شاعری کے بعض بنیادی پہلوؤں کی طرف اشارہ متوجہ کر دیا ہے۔ اس لئے شامل نہیں دی ہیں۔ لیکن اب مطلب واضح کر کے کہنے میں ان کی دو مختصر نظمیں مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کی انفرادیت کا وہ پہلو نمایاں ہو سکے جس پر میں زور دے رہا ہوں۔ ایک نظم یاد ہے اور دوسری ایک غزل ناظم جو کسی مجموعہ میں نہیں ہے کہیں بغیر عیدان کے شائع ہوئی تھی، میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہے۔

(۱) دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں

تیری رفتار کے سائے تیرے قدموں کے سراپ

دشتِ تنہائی میں یادوں کے جس دھاک تلے

کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور کلاب

(۲) آری ہے کہیں قریب سے تری سانس کی آہنچ

اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دُور اُنق پارس چمکتی ہوئی، قطرہ قطرہ

گر رہی ہے تیری دلدار نظر کی شبہم

(۳) اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں دکھا ہے

دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد سے بات

یوں گمان ہوتا ہے، مگر چہ ہے ابھی صبح سراق

دھل گیا جبر کا دن، آج بھی گئی وصل کی رات

(یاد)

دوسری نظم جسے شاید کچھ لوگ غزل سلسل کہیں یہ ہے۔

یک بیک شور و شش فغاں کی طرح فصل محل آئی امتحان کی طرح

صحن گلشن میں بہر مشتاقاں ہر روشن کچھ گئی کہاں کی طرح
پھر ہوسے ہر ایک کا سہہ داغ بد ہوا جسم ارغواں کی طرح
یاد آما جنوں گم گشتہ بے طلب قرض و دستاں کی طرح

جانے کس پر ہر ہمدرداں قاتل بے سبب مرگ ناگہاں کی طرح
ہر مہمدا پر نگے ہیں کان پہاں دل بھالے رہو زبان کی طرح

جو شخص اردو شاعری کی روایات، اشاریت اور بلیغ ایمائیت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ بڑی آسانی سے یہ سمجھ لے گا کہ پہلی نظم دوسری نظم سے مختلف ہے۔ وضاحت کے طور پر پہلی کو عشقہ اور دوسری کو سیاہی کہا جاسکتا ہے، دونوں کے تفاوت بالکل مختلف ہیں، دونوں کی دنیا میں الگ الگ ہیں۔ سی ہونے لگی چاہئے تھا، ایک کام شروع حال تھا، داخل ہے، دوسرے کا قطعاً خارجی۔ لیکن فیض نے کیا کیا بات۔ پہلی نظم کے لئے حال کراہی اور مستقبل میں اس طرح پھیلا یا ہے کہ جس کی کچھ بھی ہوئی کڑیاں خیال کے ایک لمحہ میں مرکوز ہو گئی ہیں۔ ایک ایسے لمحے میں جو ابھی دو دین نہیں آیا ہے لیکن جسے شاعری قوت تخیل نے موجود کر دیا ہے شاید یہ ہر محبت کرنے والے کی داستان ہے جس میں واقعات کے خارجی عمل سے وہ داخلیت جنم لیتی ہے جو پورے وجود کا احاطہ کرتی ہے۔ علامات اور استعارات کی بلاغت نے ایک دنیا کی تخلیق کی ہے جس میں گزرے ہوئے وصل اور قرین کے مناظر بھی ہیں اور وقفے بھی جن میں کھو کر یہ مناظر سائے اور سراب کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ فیض کا ذاتی تجربہ محبت کا آفاقی تجربہ ہے۔ اور جی ہونے کے باوجود وسیع المعنی اشعاروں میں بیان ہوا ہے اس لئے اظہار کی انفرادیت میں بھی جامعیت اور آفاقیت ہے۔ دوسری نظم وقت کی شاہراہ پر صرف دو منزلوں یعنی ماضی اور حال کا سفر کرتی ہے۔ دیکھنے میں مختصر ہے لیکن حقیقت اسی کے اندر کئی جگہ بیت جاتے ہیں جن میں تجسروں کے بہت سے نقش بنے اور مٹے ہیں۔ یہ بھی انفرادی تجسروں ہی کی کہانی ہے۔ داخلی کم اور خارجی زیادہ، لیکن سب سے خود اردن کی مٹی میں گچھل کر ایک عظیم الشان نقش میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس کہانی کو پیچایا جائے تو ایک داستان بن سکتی ہے جس کا نتیجہ ابھی مستقبل میں ہے مجتہدا کچھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک دلوانہ شوق میں نے اسی میں بڑی آشفتمندی دکھائی تھی، بہت سے زخم کھائے اور بہت سے دھڑوں کا سودا کیا تھا۔

آج بھر اچانک فصل گل کی آمد محسوس کر رہا ہے۔ گزرے زمانے میں اس کے بہت سے ساتھی تھے اور سب لڑکھنوں کی شراب پی لیا کرتے تھے۔ آج وہ اچھی خاصی تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ فصل گل کا ہوا دم بچھا یا جا رہا ہے جس کا وہ مشتاق ہے اس کے معاملہ کرنے کے لئے پھرا سی جہنم کی گشتہ کی مزدور ہے۔ طریقہ کار کیا ہو، ہمسار کے قانون اور معرفت ایک قاتل کی سے کس طرح متا جانے، یہ بات واضح نہیں ہے کیوں کہ قاتل مطلق العنان اور خود مختار ہے اس کی محبت اور مہربانی بھی جان لیوا ہو سکتی ہے

(باقی صفحہ ۳۱۴ پر)

ببر و فیروز آل احمد سرور

فیض

”نقشِ فریادی سے زندانی کا نام، تک“

راہٹ فراسٹ نے اپنی ایک نظم میں بڑے پتے کی بات بھی ہے : ”میرا اور دنیا کا جھگڑا ۱۰۰ برسوں کا جھگڑا ہے“ شاعر زندگی سے نہت کرتا ہے اور کبھی کبھی زندگی کے ایک بلند تصور کی خاطر اس کے سب سے اوجدار و بھری تصور سے رشتہ بے مضامین کے خواب معنی نیلی نیا کی پرچھائیاں نہیں ہوتے ان میں ایک لکڑیا اور تاجہ حقیقت کی کون ہوتی ہے اس کون کی خاطر وہ نجات سے ہی نہیں سوزے سے بھی لڑنے کو تیار ہوتا ہے۔ زندگی کی بعیرت ایک درد مند دل بھی شوقی دولت ہیں۔ یہ بعیرت طغوت سے معنی ہے گراس پر حلا زندگی کے سوز و ما ز اور درد و داغ غلت ہوتی ہے۔ میرے خوب کہا ہے سے
اسے آسمان کہہ نہ ایندو حرم کے گرد
گھاؤ کسی کا تیسر کسی کا مست کا ہو

جیسے کی فضیلت آہر ان کعبے نہیں بلکہ ان سے ہے جو اس کے زخم خوردہ ہیں۔ جنہیں زندگی اور اس کے جن سے محبت ہے۔ وہ ہر بد صورتی تاریخی، سسنگلی، سبقتی اور بے انصافی سے بڑے پر پیکار ہوتے ہیں۔ ایک لڑسن کے تانے کا کردہ کم جیوں کو نظر پیکر کو مل اور دل کو گناہ عطا کرتے ہیں۔ ان میں ذوقِ جمال بیدار کرتے ہیں۔ ان کو تاجہ سب آموز و نصیحت اور ترتیب و تہذیب سے آشنا کرتے ہیں۔ ان کی روحانی پیاس بجھاتے ہیں۔ وہ سرے ان کے سب سے انہیں خود غرضی، جنگ جوی، نفرت، حسد بے بسی اور جہالت کے خلاف ہر دم زما کرتے ہیں۔ شاعر کے لئے سے ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر سرور نے میں نالہ کرنے، نشے میں مٹی اور تبسم میں زہن کی کاغذات پر لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک یونانی یوتاکے ناسور سے سب عاجز تھے، مگر اس کی قادر اندازی کی وجہ سے اس سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس نے شاعر کے نفوں پر سرور دھنے والوں کو اس کے دل کے داغوں کی بھی متجو کرنی چاہئے۔ اس کے بیرونہ زمان داغوں کے چراغوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور اس چراغوں کی سیر کا یہ معنی میں انہیں حق پہنچتا ہے۔ اپنے زخموں سے دوسروں کے دلوں میں پھول کھلانا اور اپنے داغوں سے عالم میں چراغوں کو نشانہ کا زندگی پر بہت بڑا احسان ہے۔

فیض ہمارے ایسے ہی شاعر ہیں جنہیں زندگی اور اس کے ہزار کشیدہ حسن سے محبت ہے اور اس محبت کی وجہ سے ان کو اور زندگی کا جھگڑا بھی چلا جاتا ہے۔ فیض کو آتش خانوں کی مقدس آہنی ہے جس نے انہیں جھپٹا یا نہیں بلکہ

ان کی شخصیت کو تو انانی اور ان کی شاعری کو تب وقاب عطا کی ہے۔ بیغ: زہنی چنگاری پر اکتفا نہیں کیا۔ اسے ہوائے رہ گزرتے
 و جگیا اور اس سے ایک شعر کا کام لیا ہے۔ انہوں نے ایک حرف مشرقی اور مغربی ادب کے خزانوں سے بیغ اٹھایا، اور اس کاری کے
 کتے ہی، سلوب اور عبارت، اشارت اور ادراک کے کتے ہی ڈھنگ جذب کے، دوسری طرف انہوں نے ہر وادی خیال کو مستان ط
 کرینے اور جگر کی روح پر یکے ہر تفریخت نہیں کی۔

منکر منزل ہے نہ ہوش جاؤۃ فتنوں سے

جار رہا ہوں۔ میں طرٹ سے جا رہا ہوں۔ دل مجھے

بلکہ آگہی سے عشق کیا اور منزل اور جادہ منزل کے عرفان کی ہی سہی۔ دوسرے الفاظ میں فیض رضی اللہ عنہ وارداتِ قلب کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ زندگی کے ایک تہیہ و خسو کی توانائی میں وارداتِ قلب کی غری اور گداز پیدا کرتے ہیں۔ اُمی، اے تجھ کو کے نزدیک شاعر از لطافتِ مادی تعقیت سے الگ رہنا ایک وجودِ روح ہے۔ اقبال نے یہ ثابت کر دیا کہ جب شاعر مادی حقائق سے غذا حاصل کرے تو اس کی توانائی کم دینے کی ہوتی ہے۔ فیض کے یہاں یہ توانائی من بن کر آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ضرب کسی سے بچر کے بیٹے سے طرفان جاری ہو جاتا تھا۔ فیض نے زندگی کی صد قوتوں سے ہونٹنی حاص کی ہے وہ جدید شاعری میں ایسی مثال آپ ہے۔ معیاری طرح اور معیار سے بہتر طور پر لغت و ادب کے نفع فیض نے لگائے ہیں۔

یہ نیلگی فیض میں گرس سے آجی، زندگی کے خوفان سے، ارتقا، وراثتیت پر ایمان سے، ایک بہتر زندگی کے جہاد میں
 حق میں جنس سے حصہ لینے سے، اپنے خوابوں کی خاطر سستے و تفریق سے نبڑنا، دُعا، سونے، صبح کے ادا شناس ہونے کی وجہ سے،
 جہاد ایک تجسس کی طرح اپنے علم کی دولت کی حفاظت کے بجائے اسے لٹانے اور مفلحانے لگانے کی آرزو کی وجہ سے، اچھے مقاصد
 کی لگن، ورس کی پیروی کی حرارت سے، مستعان اور تحکم کر چیتے جانے کے بجائے گرم قلب رہنے سے،

اس سے ان کی شاعری میں رجائیت، زندگی پر اعتماد اور قوتِ شفا آئی، جس شاعری کی بصیرت کو ماننا ہوں۔ مگر فراموشی کی طرح اس شاعری کا قابلِ ہول جیسے مسرت اور ہر بصیرت عطا کرے، محض بصیرت کی دعوت میں کشف نہیں ملتی۔ ہاں مسرت کی تلاش عام ہے۔ جو مسرت کو بصیرت بھی عطا کر دے وہی سچی شاعر ہے۔ آگ دو دھو دھوے واواں کو پیمبری بھی مل جائے تو کیا کہن جین کی حق کا ریم، اس کی شریعتی، اس کی نمٹکی میں سلتا نہیں، جھنجھوڑتی بھی نہیں، یہ بڑی سادہ و سادہ ہے۔ یہ پچھلے پچھلے ہمیں ایک خاموش غم عطا کرتی ہے۔ یہ ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے، اور اس نسبت کو، ایک غنیمت اور اس کی خاطر ہر ایک کو ایک عبادت سمجھنا کا ولولہ دیتی ہے۔

پھر فیض کی ہے میں بڑی کشش ہے۔ اس میں ہماری بڑی شاعری کی رچ ہوئی کینیت نہیں مگر ایک نیا رچاؤ ہے جس میں انگریزی ادب کے ایک خوش نوا اثر جیو پر انسان کے ذہن اور ایشیائی ہندو مت کے قابل قدر عناصر کی ایک خوش فہم سرسبز جلوہ گر ہے۔ فیض کی شاعری DIRECT کہم OBLIQUE زیادہ ہے۔ وہ مراحت کے نہیں، مرض کے شاعر ہیں، مگر اس کے باوجود ان کا ذہن اتنا مرتب اور فنی شعور اس قدر تربیت یافتہ ہے کہ وہ نہایت واضح و سلیس پانی بات کہہ دیتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض اپنا اندک الگ اسلوب رکھتے ہیں جب یہ کہتے ہیں اور اور انگریزی شعرا کی گوج سناؤ دیتی ہے مگر آواز ان کی اپنی ہے۔

”نقیض فرما دیں۔ میں نہیں ایک نام تو کی حیثیت سے سامنے آئے، موضوع سخن، چند روز اور میری جان نقد چندی نہ رقیب ہے، کچھ، یہ نفیس اس مجموعے کی شکل اور انداز کی ترقی ہیں، مگر، دستِ صفا، میں نصرتِ دونوں کا ایک پابندہ اور قابلِ قدر مہیا رہا ہوں۔ صبحِ آزادی کے موضوع پر ہمارے کسی نہ عرب نے نفیس کیں مگر نفیس کی یہ خوب صورت نظم اپنی بھرپور اور شریا لے کی وہ۔۔۔ سے سب سے مشغول ہے پھر وطنِ شمشون کا تیسرا، انداز کی ایک صبح، یاد کے علاوہ اس مجموعے میں کئی ایسی غزلیں بھی ہیں جو حدیثِ حبیب، کو حقیقت کا ناسخ بنا رہی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت اور بھی آئینہ ہو جاتی ہے کہ غزل اور نظم کا حیزِ لب کا رہنے اشارے اور داستانِ زلی دونوں میں حسن ہے۔“

تلاش کا نتیجہ ہے مگر یہاں تک چاہیے

زندگی نامہ بھی پہنچے دونوں پڑھو، کی طرف منتہر رہے جیسا کہ نامہ ظاہر ہو رہے۔ اس مجموعے کی تفصیل اور غرضیں سب فیض کی اس سرزمین کا دیکار ہیں۔ اس اسیر کو یہ فیض کہہ کر یوں کیا نہ چھوڑا۔ اس غم خطنے میں فیض نے انتہیت اور تعذیب سے دور کش کی شہر روشن کی۔ دو دن سے زندگی کی بسن فستوں، لہجے یا دل پر کیفیت لذتوں کو دھندلا اور کمزور نہیں کیا۔ انہیں داب و خیال کا ایک ہاتھ لے کر اوپر میں اور دل سے تر بنا دیا۔

ملاقات کا دور وادرا اس دور کی لذت دیجئے

یہ رہتا اس زر کا تجربہ ہے

بزرگوار سے بچنے سے عظیم تر ہے

سکڑا کر رات کے شہرے

یہ جہنم لوں کے زردیشے

گرے ہیں اور ترے گیسوؤں میں

الچس کے ٹھکانے ہو گئے ہیں

یہی مشہور خامشی کے

۴۰۰ جلد قسط ۱ تری جیس پر

برس کے 'مہرے' پڑو گئے، اس

اسے روشنیوں کے شہزادے میں زنداں کے گھر کی دیوار میں اس طرح اُکائی ہے۔

شہید خوں سے منہ پھیرنے جیسے ارمانوں کی رو

خیر ہوتیری لیٹاؤں کی ۔ ان مسیحا سے کہہ دو

آج کی شب جب دیئے جلایں اُونچی رکھیں تو

مگر اس شوٹ کی مان دو ٹوکس ہیں۔ ایک ”درجہ“ اور دوسری ”بہم جزا ریک“ راہوں میں مارے گئے۔ (درجہ) تھوٹی

نظمت اس لئے یہاں نشن کی جا سکتی ہے۔

گر کھڑی ہیں کتنی عیالیں مرے درمیانے میں

ہر ایک اپنے میا کے خون کا رنگ لے لے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمت لگے لے
کسی پر کستہ ہیں، ہر بہار کو مستہ بان
کسی پر منتیں ہو، نابینا ک کستہ بین
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شامِ اردو نیم
کسی پہ یادِ صیب کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوند گناہ ہر و جمال
ہو میں غرق، مرے غم کدے میں آتے ہیں
در آئے دن مری، نظروں کے رملے ان کے
شہیدِ جسمِ سلامت اٹھائے جاتے ہیں

زندانی کی سلاخوں سے صلیب کا استعارہ اخذ کرنا، سن سبکی، تہذیب، انسانیت کا دورِ حاضر کی بحرِ مانہ ذہنیت کے
باکھنڈوں سے صلیب پر چڑھایا جانا اور تمام انسانیت کا ان زخموں کے باوجود زندہ و تابندہ رہنا، اس نظم میں بڑی خوب صورتی اور
بلاغت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ نظم فیض کی تازہ کاری اور لالہ گری کا بہت اچھا ثبوت ہے۔

”ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے“، دراصل ایتھنز اور جویس روڈز کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ ساری دنیا میں
اس المیہ کا تذکرہ ہوا اور تمام انصاف پسند دل نے امریکہ کے برسرِ اقتدار بیٹے کی انتقامانہ ذہنیت، درستہ دہشت گردی کو موسس
کیا۔ فیض نے اس المیہ کو زندگی کی پیاس اور دلوں کا ایک رجز بنا دیا ہے، اور نظم پر طومر کر کے ساختہ منظرِ جانِ جاناں کا یہ شاعر
یاد آجاتا ہے۔

بنا کردہ خوش رہے بخاک و خون غنچیدن
خدا رحمت کن دایں عاشقانِ پاک طینت را

نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک پہنی پہ دارے گئے
تیرے ہاتھ کی شموں کی حسرت میں ہم
نہیں تار یک راہوں میں مارے گئے
ان عاشقانِ پاک طینت کا عزم دیکھئے

جب گلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں متہیل غم

اپنا غم محبت، گواہی ترسے جس کی
دیکھتے تھے رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض کی اس نظم میں دو تین باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ اول تو ان عشاق کے منصب کی بلندی کا احساس دوسرے ان کے
کارنامے کا حسن کا زائد تجزیہ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہنگامی واقعات سے شعر نہیں بنتا، اُن کے لئے یہ نظم بہت اچھا جواب ہے ہاں
ہنگامی واقعات میں ابدی صداقت دیکھنے والی نظر درکار ہے۔

”زنداں نامہ“ کی فراموشی، دستِ صبا کی طرح بھرپور فائدہ نہیں ہیں لیکن ان میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں۔
خسب الیاء، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے

اسی متاع پہ ہم رو دکا کرتے رہے
ابنیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
بچہ گاہ گاہ جنوں استیاء کرتے رہے

دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی سٹام گروشام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو تھیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

کچھ محبتوں کی غلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم یادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کم تر جاتی ہے
ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر ردہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

شوق والوں کی نہیں محض شبیہ اب بھی
آئینہ صبح کی صورت تر نام آتا ہے

وہ جواب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی اُن کا جسگر تو دیکھو
دامنِ درد کو گھزادہ پشا رکھتا ہے
آؤ ایک دن دل پر خوں کا ہنر تو دیکھو

بُش نغز، خیال کے ابھم جگر کے داغ
جتنے چارغ ہیں تری مغل سے اُٹے ہیں
انکڑا کر آئے تھے، ہیں ہنر بزم سے مگر
کچھ دہلی ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

تیرے دستِ ستم کا جبر نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

”زنداں نامہ“ ہمارے اس باشعور اور صاحبِ طرز شاعر کی رودادِ اسیسی سی ہیں، عہدِ حاضر کی اس زخمی روح کی پرسوز اور پُرکار نے بھی بے جس کے اثر سے زندگی کا سن کچھ اور بکھر جاتا ہے اور اُن نیت اور تہذیب پر ایمان کچھ اور تازہ ہو جاتا ہے۔

فیض کے انفرادیت

(صفحہ ۳۰۸ سے آگے)

اس کی آواز دُلی بے سبب وقت اور انصاف کی پابند نہیں، نہ جانے اس کے جاسوس اسے کیا خبر ہوگا اور کس طرح دیں۔ ایسی کزن نگرانی نہ کہ زبان تو زبان دل کے دھڑکنے کی صدا بھی وہاں تک پہنچا دی جاتی ہے، بڑی ہو شکاری، بڑی سوچا بوجھا اور بُرے مضامینے کام لینے کی ضرورت ہے۔۔۔ یہ کہ کی داستان ہے اور کس عہد کی یہ تہانے کی ضرورت نہیں ہے نفس کے در پر کئی بار آہٹ ہوئی مگر در نہیں کھلا سحر کی روشنی کن، برد کھائی دی لیکن اُجلا داغ داغ تھا، چھوٹا وہ وارنٹ شوقِ فضل گل کا منتظر ہے۔ فیض نے یہی کہانی بارہ معرعوں میں کہی ہے اور کئی ملیخ اشعاریت کے ساتھ، کبھی ایمانی ندرت کے ساتھ۔ لفظوں میں وہ توانائی ہے جسے چوہرنی کہہ سکتے ہیں، اظہار میں وہ انفرادیت ہے جس کے اندر سے فیض کا شعور بول رہا ہے۔ باہر کی دنیا اور دل کی دنیا میں مکمل ہم آہنگی ہے اور تغزل نے اس میں ایسی نشتریت پیدا کر دی ہے کہ صرف گل کا تہنائی اس کی جھین محسوس کر سکتا ہے۔ یہی فیض کا فن ہے اور یہی ان کا شعور۔ یہی ان کے کلام کی انفرادیت ہے اور یہی آفاقیت۔ یہ شاعری کمالِ فن ہے، یہ شعور حیات و شعور ذات کا نتیجہ ہے۔ یہ طرزِ اظہار کائناتی قرب سے وجود میں آیا ہے۔ یہاں اظہار کو خیال سے الگ کرنا بھول سے اس کی خوش ہوا اور دُور کو الگ کرنا ہو گا۔

فیض نے اپنے شان و دستِ خیالات، زندگی میں نا انصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردِ عمل اور انفرادی تجربات کو ایسے شعری پیر میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ ان کے ذہنِ بے چین کے خالِ غف میں دیکھی آسانی سے اس کے اثر اور جادو کی محرت سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔

ممتاز حسین

دل بچوں کا ہنر تو دکھو

شبنم بدیع دلالہ نہ تختی ترا دے
داغ دل ہے درو نظر گاہ حیات

فیض حبیبی محسن ہیں آئے لوگوں کی ایک چھوٹی سی کتاب، ایک قصہ، ایسی نامکمل غزل کے چہرہ اشعار کی پختہ سن اور کم عمری کی بات لے کر آئے ہیں ہر پیر کا باب۔ آئے۔۔۔ دیر سے دشمن نے سر ہڈیاں یا دوستوں میں پیر چاہو، کچھ لوگوں نے کتاب چسک بھی دی۔ اس میں لکھا ہی کیا ہے۔ ایسی ہلکے دھندلاوے قدموں کے سرائے اُن گنت صدیوں کے تاریکے پر یاد علم، مین جب کسی نازک سی کتاب نے چٹکی اور دل شہیں دیں ہوں۔ تو پھر وہی فیض کو گنگن لگے۔ پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوڑا نہیں آؤں۔ ایک سو چھت منایں ہم اپنے اجداؤں میراث سے معذور ہیں ہم بچہ چلے کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی باب۔ شہر جذبات میں کبھی ایسی چٹختی اور سادگی ہو سوز کو بھی نہ ملے ہو کبھی ایسی آندروں کی کہ غالب کو بھی اس پر غصہ آئے۔ تسن پرانی کا یہ عالم سید حسن، راکہ یا نہ ہی منور ہو لہو۔ ان ساری چیزوں کو گھس کر وہ کیونکر اپنے کلاسن میں پیش کر رہے ہیں اس کے چھٹکے، آئے، ان کے ہر انحراف میں۔۔۔ مانع و رت ہے۔

غالب نے کہا ہے: غایت کج ہے یہ میر۔۔۔ یہ نہ سوز بند ہو گیا ہے میں نے شہر بنا بند کر دیا۔۔۔ تاہم کلاسز میں جس جگہ ہے، شاعر آؤں، نہ جو اچھا خاصہ نمونہ ہے، لیکن اسے کیا کیا جاتے کہ اس کے لئے کسی نہ کسی ناسور کا ہونا ضروری ہے ورنہ خون جگر کی ترازو کہاں سے ہوئی، کسی بڑے شاعر کے یہاں وہ ناسور صرف اپنی حرماں میں کان نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں وہ ناسور اپنی ایکائی کے خوں سے کھل کر وہ سبوں کے دکھ، دکھ کو اپنانے یا پھر کسی ایسی آسودگی کا ہوتا ہے جسے انگریزی زبان میں ہی آسودگی کہتے ہیں۔ فیض کے یہاں اس پر دست نہ ہو، ناسور ابتدا ہی سے تھا کچھ، تو کچھ کم، نہ سنا رہا میں حالات کے بدلنے کے۔۔۔ کتاب کچھ زیادہ رس رہا ہے، مین نہ ہی ایک شہر فیض کے فوک و مشاحٹ میں کرتی، فیض کی شہریت میں لذت ہے اس اور غالب لذت و دنوں ہی قوت میں، اگر مہرے کی شکل میں کچھ روز کچھ سارے کچھ پراڈٹی رنگت و بلو۔۔۔ تو وہ نہ سنا فیض

کے جی کو نہیں لگتا ہے۔ یوں تو یہ جو صلابہ پیش کرتا ہے، لیکن کچھ لوگ اس کو سٹیل اس قدر آدرو سے کام لیتے ہیں کہ جذبہ معدوم اور صرف صفت رہ جاتی ہے۔ رئیس کا کلام اس قسم کے آدرو سے پاک ہے، وہ باوقافت شہید سے زیادہ استقامت سے اور استقامت سے زیادہ کسی ایک سمت پر اٹھنے سے اپنا کلمہ نکال لیتے ہیں۔ ہمیں پر وہ غالباً کے فن سے زیادہ قریب ہیں۔ بلے خواب کو اردوں کے خواب ستارے ترسی ہوئی عیسے سود سے۔ ان کے اور بعض اوقات تو وہ صفت متغلب یعنی مدھم مدھم سے **مدھم مدھم** سے بھی گراؤں ورت (ستارے) کرتے ہیں۔ وہ دل سے مدھم دھم کا امیر کا منہ نکالتے ہیں۔ وہ کچھ بھی جھٹکتے ایجنز یعنی احساساتی تصویریں کو کسی ایک ایجنز میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ خوابات (و خیالات) میں کچھ جلتے کی ہوتی ہے وہ ایک ہی عرصے یا ادا ہو جاتی ہے۔

چہرہ زخم میں پھیل چکے، لی میں چہرہ میں

چہرہ تصویر نے کیا اس بزم میں جانے کا

ان جویوں کے ساتھ ساتھ خفیہ کے انداز بیان اور ذرا دوری کا وہ خصوصیت کچھ بھی ہے جس کی پروازت دلی کے شہزادے کی تھی

تہ تیو گرم کو بہتر سے تیرا نام

مکمل آج سے رکوئے انداز غور پر

زبان کا یہ بھٹ دست بہرہ یار، یا کچھ آگے۔ شہزادے کے دو پاسیری رئیس نے، ساتھ کے کلام سے خوب دل بہلا با ہے۔ لفظوں کے ساتھ ساتھ اب اور عام۔ فی تصویروں کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں ایک حسن غنایت یا الیریزم کا ہے۔

شاعری اور نثر کا ساتھ جوئی و امن کا ہے۔ کیونکہ شعر کے چہرے کی ایک شہزادہ بھی ہے ظاہر ہے کہ بھروں کا

تعمین اور حریف و قافیہ کی پابندی۔ یہ ساری باتیں شعر کے آہنگ ہی سے اخذ کی گئی ہیں۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لازمی طور سے یہ سامان

موسیقی کسی کلام کو نغمہ کی لذت سے آہنگ نہیں کرتے۔ وہ ارت و بناوی حیثیت سے احساسات کی ارتش پرنگناتے سے پیدا ہوتی ہے

اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی شہزادہ کی احساسات کے تلازمات سے کرتے ہیں نہ کہ آواز

محض سے۔ ان کے انداز میں غنایت اسی نسبت سے ہے کہ اس لذت سے کہ وہ لفظوں کے احوال کو ان کی معنویت پر ترجیح

دیتے ہیں۔ ان کا کلام نہ تو یہ ہے کہ انہیں جذبہ کی ضرورت کے تحت وہ اپنی ایک ہی نظم میں موسیقی کا پیرن بدلے رہتے ہیں۔

انہوں نے اپنی اپنی اس نظم میں انہوں نے اس کے مختلف بندوں میں موسیقی کا مختلف پیرن استعمال کیا ہے کہیں

روایت و قافیہ دونوں کا پابند ہے تو کیا صرف روایت کی پابندی ہے اور کہیں ان دونوں سے غوغلا بھی ہے۔ آہنگ کے اس

تنوع کا وجود ہے ایک ہی نظم میں ارت و بناوی میں سمجھا جاتا۔ اس نظم کی نمونگی میں کوئی عیب پیدا نہیں ہو پایا ہے فیض

کے کلام میں موسیقیت اس انداز کی ہے کہیں تہ و تیرا کہیں۔ ہم اور ایک سر۔ (صفحہ ۱۰)

حافظ کی غزلیں کہیں کہیں حسن نے ایک عالم کو روٹ لیا اور اہل عرب کو تھم کر دیا وہ اس بات میں پوشیدہ ہے کہ حافظ

کے یہاں شہزادہ قافیہ کا شہزادہ قافیہ سے متعلق ہے۔ جن خلق میں ہے نہ کہ حسن سے باہر۔ صفت حق کا خدائی بھی ہے۔ اور حق خلق کی اندرونی

تبدلت۔ حق ذاتی ماحول ہے اور شہزادہ قافیہ حق جتنا کہ حق۔ ادبی نقطہ نظر سے یہ نقطہ قدر نگاہ کی تمام کیفیتوں کو طہارت

اور تقدس کا درجہ دیتا ہے۔ اس طرح شاعر پرست و بالا معریش و فرشِ حق و خلق کی دہائی سے آزاد ہو کر اپنے تمام محسوسات اور مشاہدات کو ایک ہی رشتہ وحدت میں پروتا ہے اور انہیں کسی معقولیت کے تابع کرتا ہے اس فلسفے کے تحت وہی حقیقت سے قریب تر ہے جو غریقِ زندگی ہے نہ کہ وہ جو حقیقت کی جستجو میں ترکِ زندگی کو راہ دیتا ہے۔

ہماری شاعری میں انسان دوستی کی روایت اسی فلسفہ نیات سے مستحکم ہوئی ہے جو اپنے ساتھ بہت سی جمہوری قدوں کو بھی لائی ہے۔ مگر گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے زمانے میں خبیث سے انسان نے اپنی تقدیر کے بدلنے کا اگر کچھ ہے اس انسان دوستی نے مجاہد انسان دوست کا سبب اختیار کیا ہے اور اس کی جمہوری اقدار میں بھی مٹری و معنی پیدا ہو گئی ہیں پہلے چونکہ ظالم کے گریبان تک پہنچنے کی کوئی اجتماعی صورت نہ تھی اس لئے مظلوم کا ہاتھ اپنے ہی گریبان پر پڑتا۔ چہرہ رویشہ سجان درویش تھا۔ لیکن آج وہ صورت حال نہیں۔ آج ظالم کے اقدام کو این الا قوامی سطح پر بھی روکا جا رہا ہے۔ یہی نہیں اس سے تاوان ظلم بھی ڈھل گیا جا رہا ہے یہ جو تبدیلی زمانے میں آئی ہے۔ اس سے دردمندی اور انسان دوستی کی راہ بھی بدل گئی ہے۔ کل کی انسان دوستی میں منہجور انسانوں کی خود فراموشی اور سیاسی خوشنویسی تھی۔ آج کی انسان دوستی میں مقبور انسانوں کی خود نمائی۔ ناز فرمائی اور سیاسی حکم ہے۔ اس سے زندگی کی اخلاقیات کا محور بدل گیا ہے۔ با دوستان تملطف باد شمنال مدارا کے بجائے دوستوں کے ساتھ نرمی در دشمنوں کے ساتھ سختی کا اخلاقی محمد پیدا ہو گیا ہے۔ فیض کی دردمندی عہدِ حاضر کی اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ کل تک جس راہِ عشق میں صورت مجاہدہ نفس حکم ان تھا۔ آج اس راہ میں مجاہدہ دھڑ ہے۔ کل تک جو سیاست امور جہان بینی کی چالوں تک محدود تھی۔ آج وہ ایک اخلاقی قدر ہے اور غالباً زندگی کی سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے۔ یہ جو تبدیلی زندگی کے اخلاقی محو ن پیدا ہوئی ہے اس نے زندگی اور حقائقِ عالم کی طرف نئے اندازِ نظر پیدا کئے ہیں۔ زندہ رہنے کی آرزو آرزوئے مرگ پر غالب آئی ہے۔ عملِ عزلت انیشی پر غالب آ گیا ہے۔ یہ نقطہ نظر آج ہمارے جذبہ عشق پر بھی اثر انداز رہا ہے۔ جذبہ عشق آج بھی کار رہا ہے اور غالباً اتنے ہی کڑے درد کے ساتھ کمر آن وہ نکمیل شخصیت کے بہت سے دوسرے قاضیوں کے ساتھ مل کر اظہار پار رہا ہے چونکہ نکمیل شخصیت کی راہ میں سیاست ہر قدم پر حائل ہے اس لئے جذبہ عشق آج سیاسی جذبے کے ساتھ متحد ہو گیا ہے عشق، نیا سیاست آج بے معنی ہے۔ غیر معنوں میں فیض کے یہاں جذبہ عشق اس کے سیاسی جذبے سے متحد ہو گیا ہے اور وہ اس تک متحد ہو گیا ہے کہ انہوں نے اس کی ساری کیفیات کو سیاسی جذبے کی کیفیات میں منتقل کر دی ہیں۔

دکھ سکھ کے لغتے خواہ وہ اندہ ادی ہوں یا اجتماعی کب اور کس نے نہیں گائے ہیں۔ پھر بھی وہ نئے سے نئے معلوم ہوتے ہیں لیکہا کی تخلیق میں اس عہد کے دکھ سکھ کی انفرادیت کا بھی اظہار ہے۔ فیض کی شاعری نے جو ہمیں اس قدر زیادہ مسحور کر رکھا ہے اس میں جہاں اس مفہوم کو دخل ہے وہاں اس بات کو بھی دخل ہے کہ اس کے انہماجِ نظم، اذیت کشی، چشم گوش، انسا طریدہ دول شوب آگہی میں جدید بین اور جدید کچھ کر جلوہ آگیاں بھی ہیں۔ فیض کی شاعری لطافتِ نظم سے کچھ کم کہنا نہیں پر کام، ہر قدم پر غم ہے مگر بحرِ غم کی بد کی صورت میں نہیں بلکہ ناکام عمل کی صورت سے۔

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں

دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

مرنے گردِ فتنِ تقدیر کو گراں بیش ایام کے مخالف ہیں رکھ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ حسنِ روئے سحر یا یا بخوش خصال کے

دیدار کی بشارت دیتا ہے سہ

آخر تو ایک روز کرے ٹی نظروں کا

وہ یا خوش خصال مبرا ہی تو ہے

اس کا دیدار صرف گردش ایام ہی کا رہن منت نہیں ہوگا بلکہ ہمارے اپنے عمل کا بھی ۔

فیض کی یہ وجاہت جہول نہیں کہ رع

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا ۔

بلکہ حرکت اور انقلابی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ کبھی کبھی جب وہ اپنے ہم سفر کی سست رفتاری سے اکتا سا جاتا ہے اور سیاسی

شب کا دامن اسے چاک ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ہے تو وہ ان کا جزو خواں بھی بن جاتا ہے ۔

لاؤ سلاؤ کوئی جوش غضب کا انکار

مگر چونکہ ان کا یہ عمل اضطراری ہوتا ہے اسلئے ایسی نظروں میں وہ حسن نہیں لگتا ہے جو ان کے اپنے رنگ کی نظموں اور غزلوں میں ملتا ہے

اس رنگ میں تولن کا کوئی بھی حریف اس وقت نہیں ہے سہ

ٹہنی شرفِ نفاہ کا اثر تو دیکھو

گل کھلے جاتے ہیں وہ سایہ در تو دیکھو

ایسے نادان بھی نہ تھے جاؤں سے گزرنے والے

نا صواب پر گرد ، راہ گزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھے

ایک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

دائیں درو کو گلزار بسنا دکھا ہے

آؤ آک دن دل پر غلوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طہر جھمکتا ہے شب غم کا افق

فیض تابندگی دیدہ نر تو دیکھو

فیض کی یہ ولارام وجاہت جو اس کے دیدہ تر سے جھانکتی ہے اور شب بیکری مانگ ستاروں سے بھرتی ہے

اس کے سیاسی شعور کی غمازی ہے نہ کہ کوئی داہمہ یا فوجِ خوبصورتی آرزو ہے ۔ مگر پھر اس یقین کی آواز ہے جس کی بنیاد مشرق کے

انقلابات نے چنی ہے ۔ صبح تو اس کا یہ دعویٰ ہے ۔ چاند کو گل کریں تو ہم جاہل

اور وہ اپنے اس یقین کو غم سے کریم تر جانتا ہے کیونکہ سحرِ حالِ شب سے عظیم تر ہے ۔ فیض کی یہ وجاہت اگر ایک

طرفِ شبِ غم کی سنگینیاں اٹھائے ہوئے ہے تو دوسری طرف دلیلِ سحر سے روشن بھی ہے ۔ فیض کی اس حقیقت نگاری کے

آستانے پر رومان اور حقیقت دونوں ہی کے بجا رہوں نے سچے کئے ہیں کیونکہ اس کے یہاں حق اور حقیقت متحد ہیں ۔ اس کی

صنِ شناس نگاہیں حقیقت نگاہیں اور ایسی حقیقت نگاہیں کہ وہ اس بات کو بھی محسوس کرتا ہے کہ دروازہ جنگ ہی کھل نہیں ہے لئے دوت

وہ جنہیں یہ شک تھا کہ حسنِ دلدار کی بیج دج ہی فیض کی نشست آرزو ہے وہ اگر دیکھیں یہ سر بلند مجاہدِ حیات کیونکر مقامات وار دوسرے سے گزرا ہے۔ (۱۹۵۵ء)

فیض نے اپنی شاعری کا آغاز دغاب غالب علی کے زمانے میں (سنہ ۱۹۲۷ء) اس ہالکیر اقتصادِ بحرِ ان کے جہوں کیا جس نے پورے یورپ میں بائیں بازو کی ادبی تحریک کو جنم دیا۔ اس ادبی تحریک کا اثر یہاں سے یہاں کے ادبوں نے بھی قبول کیا لیکن صرف اس اثر کی بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۷ء کی ترقی پسند تحریک تمام تر یورپی اثرات کی زمینِ منت ہے اس تحریک کو جنم دینے میں جہاں تک کہ اس کے ادبی روپ کا تعلق ہے حالی اور اقبال کی شعری روایات کو بھی دخل ہے یہاں اس کا موقع نہیں کہ اس سلسلے کی تاریخ بیان کروں۔ لیکن فیض کی شاعری کے ادبی پس منظر کو سمجھنے کے لئے کچھ ذکر ضروری ہے

حالی کی جدید شاعری کا بیان (گلشنِ خیال) کی براہ راست نمائندگی یعنی صحت معنی اور اس خوش مذاق پرستی تھا جسے انگریزی میں لڈرنس کہتے ہیں۔ کبھی انہوں نے اپنے اخلاقی تصورات کی ترسیل میں اس شوخ طبعِ فنیسی کو بھی جگہ دی ہے جو تشبیہات سے کھلتی ہے اور اس طرح گرائی پند و عطف کو لطیف بنا چکا ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں اس کا استعمال اس قدر کم ہے کہ اس کا ذکر ان کی جدید شاعری کی تعلیم میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ عمومی حیثیت سے ان کی جدید شاعری معقولانی تہذیب اور اخلاقی تعلیم کی ہے۔ اس میں احساسات اور تخیل کی زبان نہیں ہے۔ برج تو یہ ہے کہ انہوں نے واقعیت اور اخلاقیات کی تصوراتی تعلیم پر اس قدر زیادہ زور دیا کہ ان کی جدید شاعری سے شعری اثر زائل ہو گیا۔

حالی کی یہ جدید شاعری اس عقلِ مصلحت اندیش اور مہذبہ جو کی پروردہ تھی جو حقائق سے سمجھوتہ کرنے ہی میں زندگی کی راہ صواب دیکھتی۔ لیکن جب آزادی کی جدوجہد ہندو پاک کی تاریخ میں آگے بڑھی اور اس نے انیسویں صدی کے اس سمجھوتے کو رد کر دیا اور اس کی جگہ ایک باغیانہ جذبہ لوگوں کے دلوں کو ڈرمانے لگا تو شاعری جو جذبے ہی سے پروان چڑھتی ہے پھر لوٹ آئی اور اب کی بار اس نے اس رومانی بغاوت کا آغاز کیا جس کا مذہبی روپ اقبال کی شاعری میں ابجائز ہوا تو غیر مذہبی پیدائش اور آخرت شیرانی کی شاعری میں۔

اس رومانی بغاوت کے ادب میں محبت کے جذبے نے ایک انقلابی اہمیت اختیار کر لی۔ اس دور میں محبت کا جذبہ تمام تر جنسی جذبہ نہ رہا بلکہ حسن پرستی یا اورش پرستی کا بھی ایک جذبہ بن گیا۔

اسی رومانی شاعری کے پس منظر میں فیض نے اپنے ابتدائی دور کی عشیقہ نظمیں لکھیں اور وہ انہیں محبت ان میں اس قدر زیادہ رچ بس گیا تھا کہ اگر بائیں بازو کی تحریک نے انہیں متاثر نہ کیا ہوتا تو وہ اس کے پوکرہ جاتے۔ بہر حال فیض کو یہ دریافت کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یہیں سے فیض کی شاعری حقیقت نگاری کا موڑ اختیار کرتی ہے، لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے۔ لیکن فیض کی حقیقت نگاری اشتراکی تحریک کی پروردہ ہے، یہ محنت کش طبقہ کی جانب دار اور اشتراکی نقطہ نظر کی حامل ہے۔ فیض نے اسی اشتراکی انسان دوستی کے درد کو اپنا وجود وطن کی آزادی کو اس کے حصول کا ایک لازمی ذریعہ سمجھ کر ہی یہاں اس کے اظہار میں انہیں

نے نہ تو محال کے اندازہ بیان کو اپنایا جو راست گفتاری کا ہے اور نہ روٹاؤی شعرانکے اس انداز بیان کو جس میں دفور جذبہ، کثرت الفاظ اور بلاغت ہے۔ اس کے برعکس ہر دہے نے نظم و ضبط کا مہیکر اپنے اظہار اور بیان میں گہرائی اور تہ داری پیدا کی اور تعجب حقیقت کو تخیل اور احساس کی مدد سے داخلی حقیقت میں تبدیل کر کے پیش کیا۔ فیض کی شاعری میں ان تر خواہ کم کہ ہے، بسا اوقات وہ بیداری ہے لیکن کہیں بھی کوئی مجر و خیال نہیں ملتا ہے ان کا ہر خیال جیسے میں تحلیل ہو کر کسی نہ کسی محسوس صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری کے ادب میں ان کا یہ اسلوب جو سماجک ریٹرم کا ہے بالکل منفرد ہے۔ فیض کی یہ سماجی نظم خراس کے انحطاطی شعرا کی سماجی نظم سے مختلف ہے۔ زمین سمبل کے لئے علامت کا لفظ اس لئے استعمال نہیں کرتا ہوں کہ علامت دو صورتوں کا ترجمہ ہے ذمہ سمبل کا، فیض کے سمبلیں نئی نوعیت کے نہیں ہیں اور نہ وہ اس قدیم طرز کے جیسے کا استعمال تشریحی نگارشات میں مجر و تصورات کی نمائندگی کے لئے کیا جاتا۔ اس کے برعکس وہ محسوس (کلمہ در کلمہ) کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور اپنی جگہ پختہ ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ استعاروں سے زیادہ قریب ہیں۔

فیض کی شاعری کا حسن اسی ایک شے پر ختم نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند شعرا کا کلام عمل کی تعلیم اور ترغیب سے بھر پور ہے لیکن ان میں سے بجز فیض کوئی بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا ہے جس نے اپنے تہذیبی عمل کو اس اندرونی کرب کے ساتھ پیش کیا جو عمل سے پہلے کسی دہن کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ ہر وہ فنکار جو باہر لڑی جاتی ہے اس کا ایک ری ہر س دل و دماغ کی دنیا میں ہوجاتا ہے، ہم درجہ خوف و دہشت حسرت و ارمان کے خون کی کٹی لڑائیاں دہن کی دنیا میں لڑی جا چکی ہیں تب کہیں جا کر کوئی قدم انسان اٹھاتا ہے۔ شاعر دیتی ہے جو عمل کو اس کے اس اندرونی کرب کے ساتھ پیش کرے ورنہ تصورات دیگر وہ صرف نعرہ لگا کر رہ جاتا ہے۔

فیض کی کوئی بھی ایسی نظم لے لیجئے جس میں کوئی تہذیبی عمل ہے۔ مثلاً چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی، اس میں وہ اندرونی کرب ضرور ملے گا۔ چلے جو یا تو دامن پر کھٹے ہاتھ پڑے۔

لیکن جب بحیثیت مجموعی ان کے کلام پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی شاعری سیاسی دکھ کی ہے کہ سیاسی اقدام کی۔ اس سلسلے میں ان کی تکنیک معلوم کو کسی عدالت میں پیش کر کے اس کی وکالت کرنیکی نہیں ہے بلکہ خود ہی قریادی بن جانے کی ہے۔ مثیلی اور کنٹیس دونوں ہی اس خیال کے حامی تھے کہ شاعر میں اپنے کو کائنات کی اشار کے ساتھ متحد کرنے کی ایسی بے پناہ قوت ہوتی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی کوئی اپنی شخصیت ہوتی ہی نہیں تو یہ کچھ عجیب نہ ہوگا۔ فیض میں یہ صلاحیت بھرپور طور پر چھوڑ دی۔ اسی منفی صلاحیت کا فیض نے کہ وہ ایک ایسی نظم لکھ گئے جس پر ہمارے زبان پر ہر فقر کرتی رہے گی۔

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" یہ نظم ان کی اس صلاحیت کی شایعہ کار تخلیق ہے اور اپنے حسن بیان میں اُسے۔ لیکن فیض اپنے اس قریادی کے روپ میں نہ زور دے دھوٹے ہیں اور نہ دوسروں کے احساس پر رحم کو ابھارتے ہیں اس کے برعکس نہایت ثابت قدمی کے ساتھ سنگینوں کی چھاؤں میں یہ نگناتے ہوئے رہ دھڑکتے جلتے ہیں

ظلم کا زہر کھولنے والے

کاراں ہوئیں گے آج دن

(باقی ۲۹ ص ۲۹ پر)

ڈاکٹر ابو الیث صدیقی

فیض کا فن شاعری

دست صبا کے نزوع میں فیض نے ابتدائی کے عنوان سے ایک نہایت مختصر دیباچہ لکھا ہے۔ جس میں شاعر اور شاعری کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت یوں کی ہے۔

”بودہ کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، بلکہ وہ بھی اس پر غور ہے کہ وہ پیش
کے مضمرات و قیود میں زندگی کے اجزا کا مشاہدہ اس کی بنیاد پر ہے اسے دوسروں
کو دکھانا، اس کی فنی دسترس پر اس کے بہادری میں داخل انداز ہونا اس کے شوق کی
صلاحت اور ہونے کی حرارت پر“

آگے چل کر اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے ”نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا ایک بستہ مقید پانی نہیں ہے۔ جسے
تماشا کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے، اور وارادہ اصل و شواہد گزار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چٹھے ایلے ہیں، ہندی نالے
پتھروں کو چیر کر چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار پونے ہیں۔ اور چھریہ بانی کشا بڑھتا گھاتوں وادیوں جنگلوں اور میدانوں میں سمٹناؤ
پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیرینہ بینائے ہم زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے اس نے جڑ کا کیا دیکھا ہے۔ پھر شاعر کی نگاہ
ان گذشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچے بھی گئی، لیکن اس کی منظر کشی میں نطق و لب نے یاد دہانی کی یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے جسم
و جان بہتو طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں ہے“

اپنے اس نقطہ نظر کا خلاصہ فیض ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا
ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن ایسی زندگی کا ایک جزو و رفتی جدوجہد یا جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔“
اس نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے فیض کے کلام کا جائزہ لینے سے پہلے میں فیض کی ایک اور سخن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں
”شاعر کی قدریں“ کے عنوان سے ”سویرا“ میں فیض نے جو مضمون لکھا ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہیں؟

”جہاں فی فرحت آپ جب ہی محسوس کریں گے جب حسن کا کوئی مظہر آپ کو متاثر کرے، جہاں فی تاثر بھی ہر متاثر کی ایک
صورت ہے، ظاہر ہے کہ اس تاثر میں ایک جذباتی عنصر لازمی ہے۔ لیکن یہ تاثر جامع اور کلی بخش جب ہی ہوتا ہے جب اس سے دل اد

بعد اس نقطہ نظر میں جو تبدیلیاں یا ارتقا ہوا ہے اور اس کی تشریح و تفصیل میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے اس کے لئے ایک کیا کچھ دفتر کا رہیں
میں یہاں نہایت اختصار کے ساتھ اس بحث کے صرف چند پہلو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

فن کیا ہے؟ فن دراصل اور بنیادی طور پر اظہار کا نام ہے اس اظہار کا موضوع زندگی اور کائنات ہے اور اس کے ذرائع بے شمار
ہیں، کہیں حرف و صوت، کہیں رنگ و عطر، کہیں رقص و حرکت، اسی اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ شاعر اور موسیقار اور مصور اور مجسم ساز و نحات
اور اداکار ان ہی مختلف ذرائع اور وسائیل سے زندگی اور کائنات کا اظہار کرتے ہیں۔ زندگی اور کائنات خود انہیں ذرائع سے اپنے آپ
کھلا کر رہتی ہے اور اس اعتبار سے زندگی خود برسی فنکار ہے اور قدرت سب سے بڑی ماہر فن، یوں نڈکی مونا لیزا بلاشبہ مقصود کا اظہار
ہے لیکن خود مونا لیزا قدرت کا حسین شاہکار ہے جس کے ذریعہ قدرت نے اپنے حسن و جمال کا اظہار کیا ہے، اس اظہار یا فن کا سر
چشمہ احساس یا جذبہ ہے۔ جتنا احساس یا جذبہ شدید ہوگا، اتنا ہی یہ اظہار یا فن زیادہ واضح اور موثر ہوگا اور اس اظہار یا فن کا مقصد
دیکھنے والے کو جانیاتی فرحت ہے جو خود فن کار محسوس کرتا ہے اور دوسری طرف وہ ناخوش ہے جو اس اظہار کے ذریعے سے فنکار کو دوسروں میں
پیدا کرتا ہے، اور انہیں بھی اس جانیاتی فرحت میں حصہ لینے کا موقع دیتا ہے۔ جو اسے اپنے احساس جذبہ یا تجربے سے حاصل
ہوتا ہے، اس منزل پر پہنچنے کے فن کی دنیا میں موضوع فن اور فنکار کے علاوہ ایک تیسری ذات بھی شامل ہو جاتی ہے فن کے مخاطب
کی ذات ہے، فانی سامع، انما ظریفی تخلیق فن میں ایک تعاوضہ بن کر داخل ہوتے ہیں اور یہیں سے فن محض اظہار کی جگہ اپنی اعلیٰ بلاط
کا مجموعہ بن جاتا ہے احساس یا جذبہ اور جانیاتی فرحت اپنی پہلی منزل میں انفرادی یا ذاتی ہوتی ہے لیکن یہاں پہنچنے کے لئے بعض اجتماعی
تعاوضہ کو بھی بردہ کرنا پڑتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ذاتی اور انفرادی احساس یا جذبہ اور جانیاتی فرحت خود فنکار کی شخصیت اور زندگی
کی طرح ایک اجتماعی سرچشمے سے پیدا ہوتی ہے، فنکار کا شعور اس کا احساس، اس کی جانیاتی اقدار اور تعصبات وہ سارے ذرائع اور وسائل
جمعہ اس احساس یا جذبہ کے لئے اختیار کرتا ہے، صدیوں کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس کے ہر نئے تجربے اور خیال کا
سلسلہ و رامنہ کے وحدت کو تک پہنچا ہوا ہوتا ہے جس طرح اس کا جسم اس کا لباس و وضع قطع و رات کے سر پہن منت ہوتے
میں اس کا شعور اور احساس بھی ماضی کی روایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہوتے ہیں۔ لیکن انفرادی یا اجتماعی زندگی سیدھی سادی ہندی
اکائی نہیں اور کوئی جذبہ یا احساس اکیلا اور تنہا پیدا نہیں ہوتا، شعور اور تحت شعور میں جذبات، احساسات، کیفیات، تعصبات
اقدار اور مفاسد کی ایک رُو ہر وقت رواں دواں رہتی ہے خاص حالات خاص محاسن اور خاص اسباب کی بنا پر ان میں سے کوئی
جذبہ یا احساس یا کیفیت زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے اور دیکھائی دیتا ہے کہ طبع سے بلند ہو جاتا ہے، اس بلندی کا انحصار
اور اس کا قیام اور ثبات جذبہ کی شدت پر منحصر ہے، اور اس کی اہمیت کا دار و مدار اس سلسلے پر ہے جسکی یہ صرف ایک کڑی ہے
اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی جو فن کا موضوع ہے اپنی تمام کمیتوں کے ساتھ اس موضوع میں شامل ہے اگر فن میں زندگی
کی محض سطحی معرقلہ یا قوتی لہر میں شوقین ہیں تو فن بھی سطحی اور معمولی ہوگا، لیکن یہ موجدین زندگی کی لہریں سے انہیں امداد ملیں، اسی
طوفان کی کچھ جھلک ہو جو زندگی کے سمندر میں سطح سے نیچے سینے میں موج زن ہیں تو فن کی اہمیت شدت اور انٹرٹینمنٹ میں اضافہ
ہو جائے گا۔ لیکن زندگی جو کائنات کائنات محض اظہار نہیں چاہتی آگے بڑھنا اور ترقی کرنا بھی چاہتی ہے اس لئے فن اور فنکار کا
کام محض تغیر حیات نہیں تغیر حیات بھی ہے، یہ تغیر ایک مکمل مسلسل اور ایک جہاد پیچیدہ زندگی کے اچھے برے گیسروں کا سنوارنا
کائنات کی پیشانی پر ہے رنج و دلم افسروگی اور پاپائی کی شکنوں کو دور کر کے مسرت اور شادمانی کے نور سے چکا ناخن اور فنکار

کا مقصد ہے۔ جسے دوسرے لفظوں میں فن کی افادیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ جہاد بڑی ہمت اور حوصلہ چاہتا ہے اسے فنکار کے خونِ جگر کی تلاش ہوتی ہے، اور اس بے بدل کی طرح جسے ایک نوخیز لڑکے کے فیصلہ ایک کانٹے کو اپنے سینے میں پیوست کر لیا تھا، اور مات بھر ہر لمحہ وہ اس کانٹے کو اپنے دل سے فریب اور فریب نگر کرتی رہتا کہ جسے کو کھینے والے گلاب کا سرخ پھول پوکا طرح شاداب ہو جائے، یہاں تک کہ صبح کی پہلی کرن ایک شاداب گلاب پر پڑتی ہے جس کی سرخی اور رنگنگی ذرا دوس بدامن ہوتی ہے اور جس کے قریب بیگل کا مردہ جسم پڑا ہوتا ہے۔ جس کا سارا خون گلاب میں منتقل ہو چکا ہے۔ بالکل اسی طرح فنکار اپنے رشتہ کار کی تخلیق کرنا ہے۔ لوحِ قلم کے عنوان سے فیض نے اسے یوں ادا کیا ہے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

جو دل پر گدگداتی ہے رنم کرتے رہیں گے

سے خانہ سلامت ہے تو ہم شرفی سے

تزیین دروہام حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا

لنگ لب و رخسار ہم کرتے رہیں گے

"دستِ صبا میں اس انداز کے اشعار بار بار آتے ہیں۔

ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے

ہمیں سے باقی ہے گلِ دامنی و کج کجلی،

اور وہ چوہی غزل جو تندر سودا ہے جس میں یہ اشعار بھی ہیں۔

یوں ہمارا آتی ہے سالِ گلشن میں صبا

پوچھتی ہے گزرا اس بار کروں یا نہ کروں

گویا اس سرچ میں ہے دل میں لہو بیکر گلاب

دامن و جبیب کو گلستا رکروں یا نہ کروں

اسی مثالیں دستِ صبا میں بکثرت اور نقشِ فریادی میں بھی جایا ملتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں

کہ عینِ فن شاعری کا مقصد جسم اور روح دونوں کی آزادی ہے اور یہاں آزادی کا مفہوم محض آزادی کا اعلان یا آزادی کا

منشور و دستور نہیں، ایسی حقیقی آزادی جہاں انفرادی اور اجتماعی طور پر نگاروں کو خود بخود جمالیاتی فرحت کے حصول اور دوسروں

تک اس کا پالانہ کا احولہ دروازے میسر ہوں ہی وجہ نہ کہ بظانوی سراسر دستور کی طور پر شتم ہوا لیکن حقیقی آزادی کی منزل فیض

کو اب بھی بہت دور معلوم ہوتی ہے۔

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

صرف ایک مصرع نہیں فیض کی جناس شاعری کی آواز ہے۔ لیکن انقلاب کے لئے نعرہ لگانا اور بات ہے اور اس

کے لئے دار و رسن قبول کرنا اور بات، اور نعرہ لگانے والے خود اپنے نعروں کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے، اور فنکار یہ جانتا

ہے کہ اس انقلاب کے لئے خلوص اور عمل دونوں کی ضرورت ہے ہمارا کام تھا انقلابی شاعری کا بڑا حصہ انقلاب کا نعرہ ہے انقلاب نہیں — اس میں ہمیں اور طریقہ شاعری کے خلوص کی شدت اور اثر فروغ نہیں یہاں میں شاعری کے محکمہ کے ان بڑے بڑے فنکاروں کا نام لینا نہیں چاہتا جنہیں انقلابی شاعری کا نقیب اور پیغمبر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جو خلوص اور عمل سے محروم ہیں، فیض کی آواز ان سے مختلف ہے وہ صرف ایک نعرہ نہیں ایک دعوت ہے اس میں ہمارے ہی کی جگہ ٹھہراؤ اور دھمیاں ہیں ہے الفاظ کی گھن گرج کی جگہ اس کی سادگی میں ایک مشکوہ اور عظمت ہے کسی مقصد کے حصول کے لئے فن کو آکار بنانے میں دو پہلو قابل غور ہوتے ہیں۔ ایک فن کا موضوع دوسرے اس کا اسلوب بیان و قصہ کا فن جو خود فن کے موضوع کا تعین کر دیتا ہے۔ لیکن اگر اس مقصد سے انکار اپنا ارشاد کر دے تو پھر ایک مرتبہ اس کا فن خلوص سے محروم رہ جاتا ہے یہاں پہلے کہ مقصد وہ فنکار کی زندگی میں مکمل اور بے مشروط ہم آہنگی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ مقصد اس کے ظاہر و باطن اس کے قول و عمل اس کے فکری اور جذباتی شعور سب پر عادی ہو جائے جب ہی فنکار تخلیق فن کے تعاون سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ فیض کے ہاں میں یہ یقین ہے کہ تخلیق فن کے تعاون سے پوری طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے لیکن محض کسی اعلیٰ مقصد کا تعین اس کے حصول کے لئے خلوص اور جدوجہد اور اسے اپنی پوری زندگی پر عہدہ کر لینا ہی تخلیق فن کے لئے کافی نہیں، فن ابھار بھی اس کے لئے ضروری ہے اسی سے فنکار کی اندرونی حیثیت اور اہمیت کا تعین ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ شاعر کے لئے اس اظہار کا وسیعہ اس کی شاعری ہے اور شاعری کے انہی سائیکوں کے ذریعے سے وہ اپنے افکار و خیالات احساسات و جذبات و دوسروں تک منتقل کر سکتا ہے۔ دراصل چونکہ زندگی و واقعہ اور کچھ ہوگا اور اس کی ظاہری حیثیت اسلوب اور تکنیک سے جس حد تک مفید کے حصول کے ساتھ ہمیشہ اپنی قسمت حاصل ہوگی انہی اعلیٰ فن کاروں اور فنکاروں کا شاعری کا یہ سائیک کچھ ناہمیت و لائق میں ملا ہے جس میں وزن و بے وزن قافیہ و تہمتی آہنگ و تشبیہ و استعارہ اور نمائندہ شامل ہیں اور انہی ان سائیکوں میں نئے تجربے اور اضافہ ہوتے ہیں۔ سائنس سے ہماری فن و فن کار کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہے جب شاعر میں روایت اور تجربہ کے اس تسلسل کا احساس ہو۔ اس لئے کلاسیکل اساتذہ اور حاضرین کے کلام کا مطالعہ کیا ہو جو روایت کی عظمت کا بھی ذائقہ ہو اور تجربہ کے اہمیت کا بھی۔ اور ان دونوں میں ایک مناسب اتزان ہے ہی ایک اچھا سائیک تیار ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر آپ فیض کا مطالعہ معاصرین سے کریں تو عیسویوں کی طرح پست و بربادوں کے مغلجہ میں دیکھیں کہ روایت کا حال اور روایت پرستوں میں فن کی پست و برباد ہے۔ اس کے یہاں پرانی شاعری کی مختلف حیثیتیں اپنے تمام لوازم کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کی غزل میں وہی نمائندہ اس اور رجز و ہے جو میر اور دوسروں کے دور سے ملے بلکہ اس کے پہلے روح تغزل ہمارے ہی کلاسیکی فارم آہستہ آہستہ فیض کے ہاں بھی نمایاں نظر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے ہر دور ہے کہ اب فیض کی اہمیت میر و دوسروں سے مختلف ہے اور ہم لوگ جو فیض کے زمانے میں ہیں ان کی اس اہمیت اور اثر کو نوپوری حیرت سے سمجھ سکتے ہیں۔ کلاسیکی اساتذہ کی اس اہمیت پر زمانے کی ہر نئی نئی غلاب ہے جسے شاعر کو دیکھنے سے ہی ان کی حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ غزل دیکھئے جو نذر غالب ہے اور جس کا مطلع ہے یہ

کسی گانہ تو فتح زیادہ رکھتے ہیں پھر آج کوئے تباہ کا ارادہ رکھتے ہیں

اور یہ اشعار دیکھئے مضامین وہی ہیں جو پہلے بھی ادا ہوئے ہیں سائیک (PATTERN) بھی اسی ہے لیکن فیض کے یہاں

ان میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی ہے

دگر و درخشان، جان و خور و تصور بات گویا میں کہیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لاندے کے
کیسے مانیں حرم کے ہسل پند
خوں سے تر آج استین کی ہے
دسم جزع اشتوں کے دین کی ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ شیک لڑی تھی
دست میاں بھی ہا جو ہے کھٹ گلابیں بھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں بٹھری ہے
بوئے گل بٹھری نہ بگیل کی زبان بٹھری ہے

روشن کہیں ہوا کے امکاں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
ان میں ہو بلا ہو ہوا کہ خون دل
سہ دشت اب بھی وشت گزرنے پائے فیض
گلشن میں چاک چند گریہ میں ہوئے تو ہیں
گوشتے چمن میں بن غزل خوں ہوئے تو ہیں
محض میں کچھ چراغ دیا ہوئے تو ہیں
سیلاب چند کا رخصیلاں ہوئے تو ہیں

نیفین کے فن کے سلسلے میں اور بہت سی باتیں کہنے کے قابل ہیں لیکن وقت کی تنگی کے خیال سے میں فی الحال اس بیان کو پس منظر کرنا ہوں۔ حال ہی میں یہ ہے کہ فیض کے نزدیک فن کی اقدار میں افادیت اور جمالیاتی مزحت دونوں شامل ہیں جو فیض کی شاعر میں افادیت کا تین ایک مقصد کے تئیں سے ہر مسئلے پر یہ مقصد افراد کی اور جمالیاتی آزادی ہے جسم اور روح دونوں کی آزادی۔ فکری کام کا کام اسی مقصد کے حصول کے لئے مخصوص اور عمل سے راستہ نیا کرنا ہے۔ اس کا اتمام تاج شہی نہیں اور رس ہے اور یہی دنیا کے فن کی منزل ہے کہ بوجہ دشت کو گلشن نہ بنا سکے لیکن ہوں بات کم از کم چند فارغ دنیاں سیلاب کر سکے اس نے فیض کے فن میں انقلاب محض ایک فرقہ نہیں حقیقت ہے اور اس کا انبار محض نعرے کی طرح نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا ایک شاعرانہ اسلوب اور انداز ہے جسے فیض کی شاعری کا سچا یا PATTERN کہہ سکتے ہیں۔ اس سانچے میں دیوبند کے سلسل اور عظمت کا نشان اور تجربہ لوہ کی اہمیت کا احساس ایک متوازن نتجہ سانچہ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کی غزلوں میں کلاسیکی رس اور چاروں احوال کی نظروں میں صحت مند ترقی پسند رہی۔ آزاد و خلیل جگتی ہے۔

ایزالہ

قیض کے فن اور شاعری کے بارے میں یہ مضمون آج سے دس سال پہلے لکھا گیا تھا۔ بیوس سال ہادی قوی اور تہذیبی زندگی کے ایک نہایت اہم دور سے تعلق رکھتے ہیں اس دور میں فیض کے دوا و جھوٹے زندان نامہ اور دست نہ سنگ شائع ہوئے ہیں سوست نہ سنگ میں فیض نے قیض کے عنوان سے فیض صاحب لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ تجربہ میں انہیں ذہنی محوسات اور معلومات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ مجھے سے پہلی عمری محبت کے مشورع ہوا تھا لیکن جیل خانہ شامی کی طرح خود کا ایک بنیادی تجربہ ہے جس میں فکر و نظر کا ایک آہن بنیادیکہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا آہن ہے اور یہ کون سا ہے اور اس سے فیض نے کیا کیا کیا۔

نقش خراہ کے پڑنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ ان دونوں مجموعوں میں بھی فرق ہے۔ زندان نامہ کچھ حصہ نقش فریادی

لے یہ مقالہ فیض کے ساتھ ایک شام منفقہ ہلاہیر (نومبر ۱۹۵۵ء) میں پڑھا گیا تھا۔ (دادار)

کے آخری دور کا حقہ معلوم ہوتا ہے اور فیض کی شاعری کے شباب کا دور معلوم ہوتا ہے لیکن دست در سنگت کہیں پہنچے فیض کی آواز میں کچھ تھکن کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ جیل کی مدت چار سال کی ٹھہر مدت تھی لیکن چار سال کا یہ قریب بھی ایک فیضی عرصہ تھا لیکن جو بات حیرت مولیٰ یا مولانا محمد علی کے یہاں نظر آتی ہے وہ فیض کے یہاں ذرا بھی ملتی ہے! اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے کہ جس اور مولانا محمد علی کے یہاں زندگی اور نظریہ میں کوئی فرق نہیں اور فیض کے یہاں نظریہ زندگی پر چاہا جاتا ہے! اور دونوں میں جتنا فرق امتیاز ہے مثلاً فیض نے دست در سنگت کے آغاز میں اپنی ایک تقریر اور ایک نثر پیش کر رکھی ہے۔ یہ دونوں اسکو میں فیض کو لین انعام ملنے کی تقریب سے متعلق ہیں اس پوری تقریر میں وہی باتیں ہیں جو آپ روانہ احباب و عوام میں بھی پڑھتے ہیں اپنی امن کی تلاش اور سویت فضل اور کا تازہ کا نام لیکن پھر اس تقریر میں فیض صاحب سے کچھ زیادہ فرق ملتا ہے۔

مجھے اعتراض ہے کہ میں نے دس سے بارے میں یا دوسری اردوں کے بارے میں یا ادب کے اس نقطہ نظر کے سلسلے میں جسے اشتراک کہا جاتا ہے بہت زیادہ نہیں پڑھا ہے لیکن جو پڑھا ہے اس میں اس تقریر سے اس میں کچھ کمی اضافہ نہیں ہوا شاید اس لئے کہ اس میں نظریہ فن پر غالب آ گیا ہے کسی فنکار کے ساتھ اس نے ہر حادثہ اور ناہمواری کو کٹا کر دے دینے فن کو براہ راست یا بالواسطہ نظریہ کے لئے قربان کر دے بغیر سب کچھ سہی ایک فنکار کی حیثیت سے اپنے ادب سے توقعات کو مشکل سے بڑا کر سکتا ہے میں نے آج سے کوئی بیس بائیس سال پہلے نثری پسند شاعری پر تنبیہ کرتے ہوئے فیض صاحب کے بارے میں کچھ لکھا تھا کہ ہم سرسراہٹوں میں فیض صاحب میرا بھائی ہیں اور بہتی زبانی اعتبار سے شاید اس نے سے حلقہ میں اپنی کے کلام میں زندگی کے آثار زیادہ ملتے ہیں یہ دیکھ کر آج بھی رکھتا ہوں اور اسی لئے جب فیض کے کلام میں مجھے ان کی آواز گونجنے لگتی معلوم ہوتی ہے تو مجھ کو دکھ ہوتا ہے۔

شاعری محض خود یا بعض جذبات بعض الفاظ کی بازیگری نہیں۔ ابھی پچھلے عرصہ پہلے ایک شاعر نے جس کے مذہب میں ان اقوال و اجتماع کی حیثیت رکھنا تھا فیض صاحب نے افریقہ والی نظم سنائی۔ افریقہ کی بیڈی ایشیا کی میداں کی ایک عظیم نشان ہے مجھے چین کی بیلہ ہے۔ اور بلاشبہ ایشیا اور افریقہ کی عظمت اور جلال کی ایک اعلیٰ علامت تھی ہے لیکن میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ پوری نظم فیض صاحب کے شاعرانہ مرتبہ کی نہیں۔ اب بھی فیض صاحب بڑے اچھے شعر کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ افریقہ اور ایشیا کی بیداری پر اس سے جاندار نظم لکھنا چاہیے تھی کہ فیض صاحب تھک گئے۔ کیا زندگی کے سنے ہوئے میں ان کی مصروفیات کی نوعیت اب ایسی بدل چکی ہے کہ وہ خون و جگر جو فن کا تقاضا ہے وہ فیض کو کہیں اور صرف کرنا پڑتا ہے یا کہیں ایسا تو نہیں کہ بقول فیض۔ جیسے کبھی انھیں فراغت حیران میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عریس سخن کے ظاہری بناؤں کے گہرے پر قدم دینے کی زیادہ ہدایت ملتی تھی۔ اب ان کو اس قسم کی فراغت نصیب نہیں اور جس طرح کی فراغت اب انھیں نصیب ہے وہ فتنش فراہمی کے دور کے بجائے دست در سنگت کی نظروں کے لئے ہی سازگار ہے۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے فیض کی نظروں کے بارے میں میرا عام تاثر ہے۔ ان کی بعض نظریں اس مجرے میں بھی اچھی ہیں اور مغربین تو خاص طور پر اب بھی پرکھتے ہیں۔

میرے خیال میں فیض صاحب کو ابھی غزل کے گہرے نوسٹورانے کا اور موقع ملے گا اور ان کی اب حدود کی غزلیں بھی غزل کے ایک نئے دور کی ترجیحاً ثابت ہوں گی

فجّتی حسین

کچھ فیض کے بالے میں اور بہت کچھ اپنے بالے میں

منتظر میں ایک غریب مضمون میں جس میں مختلف شعرا اور ادباء سے بحث کی گئی تھی، میں نے فیض کی شاعری سے بھی بحث کی تھی جس کے لیے اس نے کتاب لکھی ہے۔

”ہمارے جدید شاعری میں فیض کی آواز بالکل نئی تھی اور اس آواز سے اردو شاعری پہلی بار مغربی شاعرانہ عسری کی غنائیت کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ اس شاعر کی اب کے اثرات، اردو شاعری فیض سے بہت پہلے ہی قبول کر چکی تھی مگر اردو شاعری پر ان کے اثرات اور بہت سی تجربات کے باوجود اس کا کلاسیکی مزاج غالب تھا۔ فیض کی شاعری ان تمام روایات، تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے مٹی ہوئی تھی جو ہماری شاعری میں تھی معنویت یا قدیم شاعریوں کے ساتھ متعلق تھیں۔ فیض کے لیے کائنات اور خوبائیاں اردو فارسی شاعری کی نگاہ سے مختلف تھیں۔“

اس کے بعد میں نے کوئٹہ کی تھی کہ فیض کے لیے میں جو ”پراسراریت“ اور خوبائیاں کی تھیں ہیں ان کی توضیح کے لئے فارسی اور اردو کے ایسے اشعار پیش کروں جو موضوع کے لحاظ سے تو ضرور ”پراسراریت“ اور ”مادائیت“ رکھتے ہیں مگر اپنے انہماک میں کوئی ابہام نہیں رکھتے۔ میں نے لکھا تھا:

”ہماری شاعری موضوع سے براہ راست (Direct) گفتگو کرتی رہی ہے۔ اس کے بعد فیض کی لہجہ کی توضیح میں لکھا تھا: اس میں وہی خوبائیاں، وہی نمکی ادبی رمزیت ہے جو ہمیں *‘Ciel et Terre’* اور *‘Dard-e-Muhabbat’* مغربی شعرا کے بیان کی طرح ہے۔ اردو شاعری کہیں رہا ہے۔ ہندوستان میں نیگرو کے یہاں، البتہ جانا ہے۔“

اس کے بعد میں نے *‘Dard-e-Muhabbat’* اور *‘Dard-e-Muhabbat’* کے تمام سے مثالیں پیش کر کے فیض کے لہجہ کی اس نوعیت کو بھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد فیض کی شاعری کی ایک اور خصوصیت کو سمجھاتے ہوئے لکھا تھا:

”ان کی شاعری میں موضوع سے زیادہ وہ فضا اہم ہے جو انہوں نے تصانیف سے پیدا ہوتی ہے فیض کے یہاں ایک چھایا

اور حین تصور (Imagery of imagination) پایا جاتا ہے انہوں نے تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا بہت کم لیا ہے۔ ان کے لیے کئی جذباتی کشش ہمارے سامنے مختلف ذہنی تصویریں پیش کرتی جاتی ہے۔

چاندنی راتوں کے لیے کار و بکلا ہوا در

ایک کڑا درد کو جو گیت میں دھلتا ہی نہیں دل کے تاریک شفاؤں سے نکلتا ہی نہیں

صفت تاثیر سے جو ذہنی تصویریں (Images) پیدا ہوتی ہیں وہ شاعری نقادوں کے ماتحت از خود ابھرتی ہیں۔ ان میں پیوند اور جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔ وہ جدید شاعری میں جدید ترین آواز کے گرائے گئے اس آواز کو ہماری شاعری کی روائیوں نے اٹسا نہیں سمجھا تھا سہمی چھپ چھپ گئی اور خرابی ادب کے اچھے ہوئے تاثیرات نے — نئی شاعری میں اس نئے پن کی بنا راسخ نہیں جنس کے باغوں میں۔ راسخ کے روایات سے صرف ہٹتی اور ٹکلی کی آواز کیا ہے مغرب سے۔ انہوں نے اتنا حاصل کیا تھا۔ اور اس دھماچھو پر انہوں نے ہماری بھر کم اٹھاؤ کو منہ ضا شروع کیا۔ ذہنی تصویر بدل کے بدلے ہی انہوں نے مغربی ادب کی پیروی کی ہے مگر یہ پیروی سبوتاؤ اور ناکام ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کی ذہنی تصویریں جذبات میں دھلنے کے بجائے خیال بندی سے مل گئی ہیں۔

مگر پس کو لکھا تھا ایک طرف مجازی شاعری ہے جہاں روایتی تسلسل اور ارتقائے مناسبات اور متعلقات کے ساتھ حین اور زندہ انداز میں لکھا ہے۔ دوسری طرف فیض کی شاعری ہے جس نے اشد کے برعکس اپنے جدید ترین ہونے کا کوئی اعلان نہیں کیا ہے۔ فیض کی شاعری میں اراؤں اور خواہش کا خون ملتا ہے۔ یہ شکست کا حسین ترین گیت ہے لیکن اس شکست میں قنوطیت اور نرا نہیں ہے۔ اس میں انسانی تاریخ کا المیہ پوشیدہ ہے۔ تاریخی قوتوں کے ادراک اور دکھ درد کے کٹ جانے کے احساس نے اسے نفس اور بیمار (Morbidity) نہیں ہونے دیا ہے۔ پھر بھی ان کی شاعری آگے بڑھے کہ اپنی شدید داخلیت کی وجہ سے زمانے کے سنگین مطالبات کو پورا نہیں کر سکی۔ اس شبستان میں میلے کپیتے لوگوں کا گذر شکل ہی سے ہو پاتا ہے۔

۱۹۵۲ء — ایک مضمون میں *Images* کی بات لکھ آئی تھی۔ فیض کا ذکر بھی ضمنی طور پر آگیا تھا، ایک اقتباس اس کا بھی دیکھتے چلیے۔

فیض کے یہاں جذبات اور *Images* میں ہم آہنگی ہے جذبات قاری کو *Images* کی طرف بٹھاتے

ہیں اور *Images* جذبات کی طرف — ان میں کوئی فصل نہیں ہے۔

۱۹۶۷ء — نقش فریادی، دست مہا، زندان نامہ، دست تہ سنگ، اتنے مجموعے فیض کے اب تک چھپ چکے ہیں۔ اب میں دوبارہ سوچتا ہوں کہ فیض کے بارے میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ — اپنی تحریروں کو دوبارہ پڑھتے اور ”حبیب مارنے“ میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ پھر ان کے اقتباسات دنیا اس سے بھی زیادہ ”کار فغول“ ہے بالخصوص قاری کے لئے۔ مگر مجھے فیض پر لکھنا ہے۔ افکار فیض کا مخصوص نمر نکال رہا ہے۔ شاعر اور ادیبوں پر ان کی زندگی ہی میں مخصوص نمر نکالنا یقیناً صحت مند روایت ہے اور ان کی تخلیقات کی اہمیت کے اعتراف کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ مگر میرا اس طرح مضمون لکھنا (دور دور کے بارے میں) کچھ کہہ نہیں سکتا یقیناً اس صحت مند روایت کے حق میں مضرب اس کے

علامہ طرحی غزلوں کی طرح یہ مخصوص غیر طری مضامین کے گلدستے بنتے جا رہے ہیں طری غزلوں کے ذہنی بلے آزمائی کے لئے وسیع میدان فراہم کر دیتے تھے مختلف تالیفیں مختلف شعرا کے یہاں اچھے بندھنے تھے بعض تافہیل پر تمام شعرا مشترک طور پر زور لگاتے تھے۔ اور فیصلہ سامعین پر چھوڑ دیا جاتا۔ اگر کسی نے اس قافیہ کو اچھا باندھا ہے بعض کا فیض چھوٹ بھی جاتے تھے۔

فینس پر نقش فریادی — اور دست تو رنگ کی، رسیاں نہ تھیں جو خاص طریل سے نفع دے مضامین لکھے جا چکے ہیں اور بعض مضامین بہت اچھے ہیں جن میں فیض کی شاعری کا تقریباً ہر پہلو سے جائزہ لیا جا چکا ہے نفس موضوع کے لحاظ سے ہم قافیہ مضامین کی ترتیب کچھ لیبل دی جاسکتی ہے۔

- ۱۔ ۳۶ کے بعد کے نئے شعرا میں فیض کا کلام۔
- ۲۔ فیض کا سماجی شعور اور ان کی شاعری کا لہجہ۔
- ۳۔ فیض کی کدما نیت۔
- ۴۔ فیض کی ایجوری۔
- ۵۔ فیض کی عنزلیں۔
- ۶۔ نئی نسل اور فیض۔

ادھر کچھ ایسے مضامین بھی رکھے گئے ہیں جو فیض کی نظموں کے تکنیکی تجزیے سے متعلق ہیں۔ یہ نئے انداز کی تقریباً ایسی ہی کوشش ہے جو ہمارے بزرگوں کے یہاں اشعار کی تعریف و توصیف میں مل جاتی تھی۔ قوانی اور دلیف کے رشتوں، الفاظ کی مناسبت، تشبیہوں استعاروں اور صنموں کے استعمال کے سلسلے میں قدیم ناقدین نے جن کا بدوش سے کام لیا ہے اس سے طبعی ملنے پر کوشش بھی ہے۔ ایک طرح کا فنی جائزہ یہ بھی ہے۔ ایک ایچ جے جے کو کس طرح دوسری ایچ جے پر ڈھل جاتی ہے۔ ایک دلچپ تکنیکی تجزیہ ہے اور شاعر کے لئے شاید ایک دلچسپ تجربہ۔ فیض کی نظموں کا جائزہ اس نوعیت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ ایک مونیٹ اور وہ جاتا ہے — وہ فیض کی بین الاقوامی شہرت ہے۔ ممکن ہے اس پر بھی لکھا جا چکا ہو، مگر میری نظر سے نہیں گزرا مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ اتنے بہت سے مضامین کے ہوتے ہوئے جو فیض کے تقریباً تمام پہلوؤں سے بحث کر چکے ہیں ان پر مضمون لکھنے کی کتنی گنجائش رہ جاتی ہے۔ کون کون سے قافیے نہیں باندھ گئے ہیں۔ یادہ کون سے قافی ہیں جو بہتر طریق پر باندھے جاسکتے ہیں — یا خود ہیں جو مضمون لکھا ہے اس میں بھی کون سا قافیہ رہ گیا ہے۔ فیض کی شاعری کا وہ کون سا پہلو تلاش کیا جائے جس پر اب تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے یا کم لکھا گیا ہے — لکھنے کا یہ عمل بڑا مصوری ہے۔ مگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سوچنے کا عمل بھی مصنوعی ہو جاتا ہے۔ لکھا ہر صورت ایک سنت ہے خواہ نظم میں ہو یا غزل میں۔ — مگر یہ بات کچھ دل کو لگتی نہیں — ادراک میں چند سوالات خود اپنے آپ سے گزرتا ہوں پسلا دی سوال ہے جو میں ادھر لکھ آیا ہوں۔

- ۱۔ آیا جو کچھ میں فیض پر لکھ چکا ہوں اس میں کچھ ترمیم کرنا چاہیوں گا — غالباً نہیں۔
 - ۲۔ فیض اپنے جدید دل و لہجہ، ایجوری اور محنت کے جذباتی ایہام کے باوصف بڑے مقبول شاعر ہیں وہ ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ایسا کہوں ہے؟ یا ان کی شاعری کا حسن ہے یا نقص؟
- بہت زیادہ مقبول شاعر ہے بعض ناقدین کو بدگمانی ہو جاتی ہے۔ مگر بہت مقبول شاعر تھے، ان کی دانشمندی، ان کا ترجمہ اور ان کی شاعری

کا نوجوان مزاج ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔ مگر اب ان کی شاعری زرد پڑتی جا رہی ہے۔

ساحر لدھیانوی بھی بڑے مقبول شاعر ہیں۔ سنا گیا ہے کہ ”تمغیاں“ انکی ہزاروں اشعار تک پہنچ گئی ہے اس مقبولیت کا راوی بھی سمجھیں آجائے، ساحر کا لہجہ فیض کے لہجے سے متاثر ہے اور زیادہ سنجیدگی سے اس نے ہونے والے نوجوانوں کے لئے ایک دلکشی رکھنا ہے اس کے علاوہ فلم کے گیتوں نے بھی اس کو چمکایا ہے۔

مگر فیض کی شاعری اس نوع کی شاعری نہیں ہے، بعض نظموں میں لہجہ انصاف و شباب کی تصدیق اور عشق و ناتجربہ کاری کا کہی بہاؤ پسندی ملتی ہے مگر بالعموم ان کا لہجہ آسان نہیں ہے نہ کہ نوجوانوں کو سمجھانے کے لہجے میں بڑی بات ہے کہ اس کی لئے، جس میں کک، خواب اور انگریز ملا ہوا ہے، نقش فریادی سے لے کر دست تیرنگ تک اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے ہوئے ہے، اس میں کہیں کوئی تندی نہیں ہوتی ہے۔ بعض دفعہ البتہ فیض نے کوشش کی ہے کہ اس لہجے کو دل کو اس میں ڈرا ”گرو اپن“ پیرا کرین“ کہتے، ان شریضوں پر بڑھنے میں اس بات کی کوشش ملتی ہے مگر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظمیں اپنے مزاج، آہنگ اور بیان تک کو غریبی دے جانے کے لئے اسے فیض کی نظمیں ہوتے ہوئے بھی دوسرے شاعروں کی کچھ نقلیں ہی بن گئیں، فیض کے مزاج میں تلخی، تندہی اور طنز کی کوئی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی، کسی نے کبھی جب کوئی نونہل کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے۔۔۔ یا طبع جس طرح تیزی کے ساتھ پہلے بلخا کرے۔۔۔ قسم کے مسرت سے مسکھ کر خیز ہو کر رہ جاتے ہیں اور اپنی مجوزہ تلخی یا تندہی کو بھیتے ہیں۔

خیریت گذری کہ فیض نے اس قسم کے تجربات بہت کم کئے ہیں۔ اور ہر البتہ انہوں نے امیر جی کی تئیر کے سلسلے میں کچھ تجربات کئے ہیں ان کی نظم منظر سے، مگر سائے، مشعر، منزل و در حلقہ، بام۔۔۔ علامت نگاری کے بہار، ایک سے تجربے کی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ تجربہ بھی انہوں نے بہت ڈرتے ڈرتے اور اپنے لہجے کے ڈھب سے ہی کیا ہے۔ ممکن ہے وہ اس طرح جدید دور کے جدید ترقیاتی تقاضوں سے اپنی نظموں کو ربط دینا چاہتے ہوں اور اپنے لہجے سے ان کا عشق کچھ کمزور ہو گیا ہو، یا وہ اس لہجے کو جو ترقی یافتہ دنیا کے اس انتہائی تیز رفتار دور میں، ”تئیر منظر“ سمجھ سکتے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ بڑا سناخ ہو گا، فیض کا سارا سرمایہ فیض کا لہجہ ہے اس لہجہ کی شہرہ و خلیفت بعض اوقات اتنا دینے والی ہو سکتی ہے مگر یہ تمام باتیں اس لیے نہ دست بردار ہونے کا جواز ہے ہی نہیں سکتی ہیں جب فیض اپنی شاعری سے دست بردار ہونا چاہیں، علامت نگاری کے تجربات ان کے لہجے کو زیادہ وسیع اور متنوع شاید ذکر پاؤں بلکہ اس کا اندیشہ ہے کہ ان کی شاعری میں علامت پیدا ہو جائے، ہر حال بات ان کے لہجے کی ہو رہی تھی، یہ لہجہ ایسی اہمیت لئے ہوئے ہے کہ شائستہ مزاجی کے بغیر اس سے لطف نہیں لیا جاسکتا ہے، سچ ان کی شاعری اتنی مقبول کیوں ہے؟۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اپنے کو یا چند آدمیوں کو شائستہ مزاج اور دوسرے تمام لوگوں کو غیر شائستہ سمجھ لینا۔ شائستہ ہونے کی کوئی ایسی قوی دلیل نہیں ہے اور مقبولیت کی بنا پر کسی شاعر سے بلاوجہ بدگمانی ہونے کی ضرورت ہے، اگر کچھ چڑھے مانتوں کی یہ بات ہم مان لیں کہ ادیب و شاعر کی مقبولیت ان کی تخلیقات کے ناقص اور سخی ہونے کا ثبوت ہے تو پھر یہ بات سچی مان لینی چاہئے کہ غیر متعینیت ہی شاعر اور ادیب کے بلند ہونے کی سب سے بڑی پہچان ہے، اس سے بدش مانتوں اور بدیوں اور شاعروں اور ادیب کے پڑھنے والوں کے لئے شاید کوئی تسکین کا پہلو نکال سکے، لیکن اچھا ادیب چند محسوسات آدمیوں کی پسند کے تنگ دائرے میں محدود ہو کر نہ رہے، اس کا کام حدیں قائم کرنا نہیں حدود کو توڑنا جو اسی لئے وہ حدود کو طے کرتا ہوا ہے ہمارے ہمارے والوں تک پہنچا رہتا ہے، فردوسی کا شاپنا ہر شاعری کے بلند ترین معیار کو قائم کرتا ہے مگر اس کے پسند کرنے والے اور تحقیر کے طر پر پڑھنے والے کچھ کم لوگ نہیں رہے ہیں فیض کی شاعری اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے

یہ شاعر کے اپنے تجربے کے لحاظ سے بھی محدود ہے۔ اور اچے کلامات کے لحاظ سے بھی۔ لیکن فیض کی شاعری نے ایک کام ضرور انجام دیا ہے۔ اس نے درمیان کی طبقہ کی انسانیت کو خواب کی مٹھاس دے دی ہے اور یہ طبقہ ہوش اتر کر انسانی سسٹیم (کراچی کا سب سے فیشن میبل ہوئی) میں پہنچ جانے کے باوجود متوسط طبقہ کی خوب سے دامن نہیں چھوڑ سکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس شاعری کو مقبول بنانے میں شاعر کی ذاتی زندگی کا گلیمر (Glamour) بھی ایک حد تک شامل ہے یہ گلیمر ان کے لفظتے کرنے میں بھی تھا اور قیروند کی صورتیں جھیلے میں بھی، اور بسن انعام حاصل کرنے میں بھی۔۔۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے فیض اچھے شاعر ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ اور اچھی شاعری اتنی مدت تک مقبول رہنے سے تو اس میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دور میں جب نئے شاعر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں اپنی انفرادیت اور شہرت کو بیچتے ہیں فیض کی شاعری کا بدستور مقبول رہنا عام لوگوں کی خوش مذاقی کی ذلیل ہے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فیض کی نظموں کی فضا اپنے اہام میں سب کو شریک کر سکتی ہے۔ یہ تو سنجی شاعری نہیں ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ یہ نثری بے مرز (Snooffensive) شاعر ہے۔ وہ کسی کا دل دکھانے کی ناکل نہیں ہے۔

۳۔ کیا فیض کی شاعری اپنی پہلو دار انداز سے کہ میرا غالب، نظیر، انیس، اقبال، اور جو شخص کی طرح اسی اس کے مختلف پسوؤں پر بہت کچھ دکھایا جاسکتا ہے۔

غالباً ایسا نہیں ہے۔ لیکن اس سے فیض کی شاعری کی اہمیت یا قدر و قیمت کم نہیں ہوتی۔ فیض کی شاعری غم کی شاعری ہے۔ یہ سماجی غم ہو یا عشقیہ غم۔ فیض کے یہاں ہر چیز غم بن جاتی ہے۔ یہ غم تاریخی مطالعہ کا نتیجہ ہو یا معاشرتی نا انصافی کا نتیجہ ہو، یا بالبدن الطبعیاتی طور پر تقدیر آدم بن کر آیا ہو۔ ان کی شاعری میں خستہ دہن کے مزاج کو گلیا ہے۔ اور فیض نے اسے اپنے لوگ استفادہ مند سے خوشگوار بنا دیا۔ یہ ایک محبوبہ کی تصویر کی طرح ان کے نرم و مضر عرصے سے دھیرے دھیرے اچھڑتا ہے اور اس زندگی کے دھندلے میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی کوئی تعریف (Define) نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک غم ناک تصویر کی شاعری ہے جس میں مشارکے ذاتی تجربات کا دخل کم ہے وہ اندیشہ اور فیض کی شاعری کے ارد گرد پایا جاتا ہے محبوب کی قربت اور دوری دونوں کو یکساں بنا دیتا ہے۔ ان کا لہجہ کئی رنگ کی تصویر کشی کرتے سے فاصلہ وہ صرف ایک رنگ کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اور وہ اپنے سیاہ یا سیاہی مائل رنگ جس میں کہیں کہیں مارے ٹھٹھاتے ہوئے نظر جاتے ہیں۔ نقش فریادی سے دست بردار رنگ کی منزل تک پہنچنے میں لفظی فیض ماحول اور عمر کی کئی تبدیلیوں سے گزر رہے ہوں گے مگر یہ تبدیلی ان کے شہری تجربے کو بنیادی طور پر وسیع کرنے میں کوئی نمایاں حصہ نہیں آتی ہے۔ ہم تقریباً ایک ہی فضا میں رہیں گے۔ ایک ہی سماجیکیت ہو، ایک ہی دلاس ویتا رہے۔ اور شب و صبح کا سوا بدستور دور ہو جاتا ہے۔

یوں کہنے کو ہم فیض کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تقسیم سے قبل (نقش فریادی) تقسیم کے بعد (دست صبا) انداز نامہ اور فیض کے بیرونی ممالک کے سفر کی شاعری (دست ترنگ) لیکن ان تمام ادوار میں۔ جو سماجی طور پر بھی بڑے تغیرات کے دور رہے ہیں اور انفرادی طور پر بھی شاعر کی اندہانی کے دور تھے ہیں۔ فیض کی شاعری جذباتی و دست لکوں سے باہر نہیں آسکی۔ ان کے لہجے میں کمر و تپ نہیں ہیں۔ یہ سیر کی شاعری بھی غم کی شاعری ہے۔ مگر اس غم میں بڑا متوے، بڑی وسعتیں اور تنہائی اور کائناتی شعور پایا جاتا ہے۔ میرا لہجہ میں کبھی صرف دھن دھن معلوم ہوتے ہیں، کبھی صوفی، کبھی جوگی، کبھی سماجی ناقد، کبھی مہوڑا چکے باز۔ ان کا لہجہ غزل، مثنوی، وارسخت تمام مندرجہ طے کرتا ہو، غم کو امرت بنا جاتا ہے۔ فیض نے بھی بعض اشعار کو دوسخت کا نام دے دیا ہے۔ بعض اشعار کو قافی بنا دیے بعض غزلوں میں، کلاسیکی قطعیت اور صفائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ سب کوششیں ان کے لہجہ

کو بدل نہیں سکیں۔ اور جہاں ان کا لہجہ بدل گیا ہے وہ فیض کی شاعری نہیں رہی ہے۔ عنوان بدل دینے سے بچ نہیں بدل جایا کرتا۔ یہ چیز جہاں فیض کی شاعری کے مہذبہ کردار کو ظاہر کرتی ہے، وہاں ان کی شاعری کے محدود ہونے کی بھی غماز ہے۔ ان کی شاعری کچھ مردوں کی شاعری ہے۔ ذرا کے ادنیٰ ہوتی یہ بے سری ہو جی۔ جہاں تک غالب، اقبال اور جوش کے اسالیب کی بات ہے۔ یہ ہزار سفیر و زندگی کو سمیٹ لینے کے صلاحیت رکھتے ہیں۔ فیض کی شاعری اسی توانا اور وسیع نہیں ہے اور نہ ان کی شاعری سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطالعہ اس کی اپنی فضا میں کیا جانا چاہیے۔ فیض کی شاعری کا سارا حسن اسی فضا سے جھلکتا ہے ان کے یہاں مصرعوں کی معنویت اتنی اہم نہیں ہے جتنی وہ فضا جو ان کی نظم و دل کی اکائی سے ترتیب پاتی ہے۔ اس فضا میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے ان کی نظموں میں تنوع کی تلاش بے سود ہے۔ اصل میں اس فضا کو تلاش کرنا چاہیے جو ردی کی طرح بے جہت ہے اور تاریکی کی چمک رکھتی ہے۔ فیض کے یہاں اتنا بھی تنوع نہیں جتنا انہیں مجازی شاعری میں ملتا ہے۔ مگر مجازی شاعری فکری بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جی۔ اس کے علاوہ مجازی شاعری کے بعض حصے *معتدلات* بھی تھے۔ ردی میں سوچے اور محسوس کیے ہوئے موضوعات میں زیادہ وزن ملتا تھا جہاں نہیں رہتی۔ فیض کی شاعری *معتدلات* نہیں ہے۔ اس میں تمام ایک مثبت کردار کی حیثیت رکھتا ہے جو ہنگامی موضوعات کو بھی اپنی انگلیں فضا میں دفن کر پائیدار بنا دیتا ہے۔ فیض اپنے لہجے اور اپنے لہجہ کی تعبیر کردہ فضا سے باہر نہیں آتے۔ اسی لئے ان کے سارے تجربات محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنی تمام خوبصورتی کے باوجود ابھی تک پیلو وار نہیں ہو پائی ہے۔

ان سوالات کے بعد اب یہ سوچنا ہوگا کہ فیض کے بارے میں مزید کیا کھجا جاسکتا ہے۔ یا ان کے ارد گرد پیلوڈل کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ غالباً اس کا جواب فیض، نمبر ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳

میں نے پہلی مزید فیض کی نظم پڑھی، میں ایک عجیب تاثر میں ڈوب گیا جس کو بیان نہیں کر سکتا۔ گل ہوئی جاتی ہے، افسردہ سلگتی ہوئی شام، میں اس نظم کے پہلے مصرعے کی اس تصویر کو پوری طرح گرفت میں نہیں لے سکا جو اس مصرعے سے پیدا ہوتی ہے، ہر لفظ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر گھل کر جس طرح ایک ذہنی اور جذباتی تاثر پیدا کرتا ہے اس کی باریکیوں تک اس وقت میری نظر نہیں پہنچ سکی، مگر میں نے اس میں ایک ایسی کیفیت پائی جو مجھے اس دوسرے کسی نئے شاعر میں نہیں ملی۔ اس میں افسردگی تھی، ٹھنک تھی، تنہائی تھی، ہمدردی کے بے سوچے ہوئے کا احساس۔ پھر ان مصرعوں نے مجھے ایک خواب کی دنیا میں پہنچا دیا۔

جانے اس زلف کی مڑھم گھنی چھپاؤں میں
ٹٹٹا تا ہے وہ آئینہ ابھی تک کہ ہمیں۔

یہ بے یقینی کی فضا جس میں قربت اور دوری دونوں کا شدید احساس ہے۔ دل میں اتر گئی۔ پھر میں نے ان کی اور نظمیں پڑھیں، تنہائی نے مجھے وہ چیز دے دی جسے میں محسوس کرنا چاہتا تھا، مگر محسوس نہیں کر پاتا تھا۔ تنہائی میں مجھے ایک اور چیز بھی مل چکی تھی۔ آدی۔ یا شاید اس عمو کا آدی سمجھنا چاہتا ہے، مگر سمجھ نہیں پاتا۔ جس کو Frustration ناکامی کا پر لڑتے، احساس کہہ لیجئے۔ میں فیض کی نظمیں پڑھتا گیا اور ہر نظم ایک ایسے لہجے سے مجھے پکارتی رہی جس میں بڑی سرگوشی ہوتی ہے، بڑی قربت ہوتی ہے اور بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اور میں ایک ایسی فضا میں پہنچتا گیا جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کی تنہائی، بے یقینی، جانباری، اور بے جہتی بھی کچھ تھا۔ چھٹی غمگسار فضا تھی، اس میں بڑی ہی غمگساری ہے، مگر کچھ اس قسم کی ہے۔

مرے ضبط حال سے دورے غمگسار چلے گئے

آج جب میں فیض کی نظمیں پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض کی ہر نظم مجھے ایسی فضا کی یاد دلاتی ہے جس میں میں تھا، جو مجھے بہت عزیز تھی، مگر اب وہ صرف ایک یاد بن کر رہ گئی ہے۔ اور اسی لحاظ سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فیض کی ہر تازہ نظم ان کی پرانی نظم کی یاد دلاتی ہے۔ یہ فیض کے کلام کی بڑی خوبی بھی ہے۔ ان کا کلام ایک وحدت میں سرچا جا سکتا ہے۔ الگ الگ کر کے یا انداز میں تقسیم کر کے شاید اس کا دیکھنا محال ہے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ فیض کے یہاں جو فضا ہے وہ کن عناصر سے مل کر ترتیب پاتی ہے۔ میرا خیال ہے وہ درنگوں سے مل کر بنی ہے۔ سیاہ اور سرخ۔

نقش و سرمدی

از گنت صدیوں کے تاریک بیجاہ طلسم
ریشم و لٹ، و خواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکھتے ہوئے کوہ و بازار میں جسم،
خاک میں تھڑے ہوئے خون میں نہاں ہوئے

آج تک سرخ و سپر مدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کبیا گزری ہے

دیکھ کر آہنگری دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے تن

(آہنگر سیاہی کا بدل ہے)

دستے صبا
رات کا گرم ہوا درسی پہ جانے دو
جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے
اور اپ رات کے سنگین و سبیر سینے میں
انٹے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے

(پر اسرار — اندھیرا لٹے ہوئے ہے)

(گھاؤ — سرخ لہو کا بدل ہے)

ان ہیں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
مغفل میں کچھ چسراغِ فرداں ہوئے تو ہیں

شوق کی راکھ میں جل بچھ گیا ستارہ شام

جتنا لہو تنہا صرف تبا کر چکے ہیں ہم (دنیا یقینی طور پر نہیں لیکن سیاہی کا تصور بھی رکھ سکتی ہے)

زندہ دے ناکہ

اسی سیاہی میں رد و نما ہے

وہ نہ رخنوں جو مری صدا ہے

ہم جوتا رکیں راہوں میں مارے گئے (خون کی سرخی چھپی ہوئی ہے)

لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں (غمکدہ — ظلمت کدہ)

دشمن جاں پہی سبھی سارے کے سارے قاتل

یہ کوئی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی

شام گلزار ہوئی باقی ہے دیکھو تو سہی

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آگینوں میں

دستِ تہِ سنگ
اب کوئی جنگ نہ ہوگی، نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھا نا ہوگا

زرد شبنم بھیراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلی وحشی کا مصلہ کیوں نہیں دیتے

ساری دلیوار سپہ ہو گئی نا ملقہ بام

اک تھیلی پہ جزا، ایک تھیلی پہ لہو

خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ دردِ سپہرِ ناک پر آگئی، سپہرِ شب آرزو پر نکھار آگیا
اور ہر کشتہ و اماندگی آخِرِ شب

بھیر لہو سے ہر ایک کا سر سر
پہ ہوا حسبِ ارغوان کی طرح
(داغِ ادر لہو)

اس شام کا سورج دھپے گا
(شفق کی سبخی)

بہر کا رنگ، لہو رنگ، شب، ار کا رنگ

آسمانوں کا لہو پی کے سیرِ رات چلے

یہ اشارہ اور سرسبز بڑی رواروی میں منتخب کئے گئے ہیں مگر شکل ہی سے فیض کی کوئی سیو نظر باغ و گلہاں میں یہ دورنگ۔ ایک
 ساتھ یا الگ الگ نہ ملیں۔ ان دو رنگوں کے درمیان سے کبھی کبھی چمکی۔ اسی جوں ہی روشنی جھانکنے لگتی ہے۔
 اور آپ رات کے سنگین و سبب سینے میں
 اتنے گماڑ ہیں کہ جس سے منت نظر جاتی ہے
 جا بجا نرنے ایک جال سا بن رکھا ہے

یہ دارغ دارغ اچھا، یہ تنب گزیدہ سحر۔

یہ سپیکر روشنی مختلف پیرائے سے فیض کی شاعری میں ملتی ہے۔ کبھی یہ جانور بن کر آتی ہے۔ کبھی یہ عارضہ مجرب کی حساب سے بن کر آتی ہے۔
 کبھی سائوں سے گفتگو کرتی نظر آتی ہے۔ کبھی رات کا یہ پہرہ پہن جاتی ہے اور کبھی امید کی ہلکی سی کرن۔ لیکن فیض کے یہاں مرکزی رنگ۔
 سیاہی اور سرخی کا ہے۔ اس میں سیاہی کا حصر غالب ہے۔ یہ دورنگ فیض کے جہاں ٹھکانے، علاقوں کا مظہر بن جاتے ہیں۔ ان
 میں تاریخ کا ظلم اور سیر، برائی کی سبب سے اور جوانی کی ماکھی۔ گنتی رنگوں کی پر سسرا جھلکی، سنگی سرخی، چیروں کا حسن، پہاڑوں کی زندگی
 کی تہ پر تہ خاموشی، خواب اور شکست خواب سب کچھ ہے۔ فیض باہم انہیں دو علاقہ مثلاً کہہ دے جس سے سب سے ہیں۔ جیادے گناہ دو عالموں
 سے باہر ان کی شاعری لازم دھرتے ہوئے بڑھتی ہے۔ اسے رات سے پیار ہے۔ صاف کلمہ وہ رات سے حفاظت بھی ہے۔

فیض کے لہجہ کی خواہش کہ امر منہ اچانکہ رہی۔ سب اس امر سے ہی ہے۔ اب آئیے اور یہاں سوال میرے ذہن میں پیدا
 ہوتا ہے۔ کیا اندھیر بھی شاعر کے لئے نفع ان (*Inspirational*) بن سکتا ہے۔ گوئے نے مرنے مرنے روشنی کو پکارا تھا
 اور اقبال نے لکھا تھا۔

کوئی آنکھ زہیں دیکھ دیکھ دیکھ دیکھ

مشرق سے ابھرتے ہوتے سونے کو ذرا دیکھ

جوشہ کی شاعری میں انجزل افاقہ کو کچھ ہی۔ ان لفظ ہوا ہے آدمی سو نہیں سکتا۔ اور ہمارے ایک غزل گو نے کیا خوب مطلع کہا ہے۔

نہا بہت نہیں چہرہ آفتاب نہیں

وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

مگر فیض کی یہاں اندھیرا ہے جہازم بھی ہے اور ہم بھی۔ اس اندھیرے میں آدمی سائے کی طرز اُبھرتے ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر دیر
 کے لئے چمکتی ہیں۔ اور وہ پھر اندھیرے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ آخر شب کے ہم سفر ہیں نہ جلتے کیا ہوئے۔ زندگی کے اس
 انجان اور بے پایاں اندھیرے سے فیض کی شاعری کی نصفا ترتیب پاتی ہے۔ یہ نصفا لشکن بھی ہے اور دلکش بھی۔ اس میں لوگ عاشقی بھی پوچھ
 ہیں اور قتل بھی کئے جاتے ہیں۔ فیض نے اس نصفا کو اپنے دور کی بے رنگی اور بے غایتی سے ربط دے کر ایک جدید معنویت دے رکھی ہے
 فیض کی نظموں کو پڑھتے وقت کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم *Camas* کی *fulder* سے گزر رہے ہیں جہاں
 ہر چیز پر لوط بھی ہے اور غیر لوط بھی۔ جہاں ہر نفس امتلا ری بھی ہے اور اختیار ہی بھی۔ جس کی سپیکر بے معنی روشنی میں آدمی جیتے اور
 مرنے پر مجبور ہے۔

میں اگر فیض کی نظروں کی فضا کا تصور کر دوں تو وہ کچھ یوں ہوگا۔ شام کا وقت، لاؤنج میں کرسیاں اور میز پر قاعدے سے لگی ہوئی جن پر سبز میز پوش ہیں اور نیپے شہد کے شیل لیپ رکھے ہوئے ہیں سے سبز گوشوں میں نیلگوں سلے۔ شام دھل چکی ہے اور چاند بھر رہا ہے۔ وہیں گھل گیا ہے غرض کا نیل۔ کہ سیر پر عورتیں اور مرد آہستہ آہستہ گنگو کر رہے ہیں مرگوشیوں میں۔ اندر بڑے سے ہال میں بیانو مدھم مہروں میں بیج رہا ہے۔

منہجی لے رہا ہے ہستی کی ہلکے ہلکے سروں میں فوج کنال

یہ عورتیں اور مرد جو آپس میں گنگو کر رہے ہیں خواب کے رنڈا دمرد معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ یہ گنگو کرنے کرتے چپ ہو جاتے ہیں ان کے سونے چہروں پر ایک کرب سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یاد ماضی سے عین بہشت فرات نہ حال۔ فیض کی شاعری اسی فضا میں گومتی رہتی ہے۔ اس فضا سے باہر نکل کر وہ شاید جی نہیں سکتی۔ تیز روشنی میں اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں گی جو کئی دین ہلال ہوا چہرہ پسینہ تر تیر ہو جائے گا۔ اور اس کا پانڈیو ہو جائیگا اس کے خدائی پیر زخمی ہو جائیں گے۔ زندگی کی کوئی دھوپ میں اس کا حسن کھلا جائے گا۔ میں جب اس فضا کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہوں تو ماضی اپنے ننھے ہوئے قدموں سے میرے قریب پہنچ جاتا ہے اور بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھنے لگتا ہے۔ درد کا چاند بچھ گیا، ہجر کی ات دھل گئی۔ مجھے اس فضا سے عشق ہو جاتا ہے اور غالبانین کو بھی جتنا مشق اس فضا سے اتنا کسی اور سے نہیں۔۔۔ فیض نے اس فضا کو جس حرف قائم کیا ہے، وہ ان کا کارنامہ ہے۔ ان کی شاعری دوسری جگہ خلیفہ سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس نے آزادی کی جدوجہد کی، دوسری جگہ غنیم دیکھی۔ تقسیم سے گذر کر میان تک پہنچی۔ اور اب وہ جوہری گوانائی کے درزیں داخل ہو چکی ہے۔ کتنے بڑے تغیرات سے ہم گذر کر میان تک آئے ہیں اور کتنے بڑے تغیرات ہمارے سر پر منڈلا رہے ہیں اور زندگی کس قدر محنت پسند، متلون مزاج اور بے مزت ہو چلی ہے۔ لیکن فیض کی شاعری نے اپنے ضبط و وفادار کو ہاتھ سے جلتے نہیں دیا۔ وہ اس سخت سینائی درد میں بھی اپنے کو کیلے دیتے رہی اور حسن کے خواب دیکھتی رہی۔ یہ بڑی بات ہے۔ فیض کی مربوط شاعری شخصیت و سن دور میں ہمارے جدید شاعری کو سمجھانے کی تہی ہے۔

فیض کی یہ شاعری میرے لئے آج بھی کچھ نئی ذلہ تہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اسے پڑھ کر یہ احساس قدرے کم ہو جاتا ہے کہ اتنے بڑے شہر میں آدمی تنہا ہے۔

۔ غزل گوئی یا ریک کام ہے اور جو عیوب اور کمزوریاں دوسری اصنافِ سخن میں دلِ دفتر گوارا کر لیتے ہیں، غزل میں بہت زیادہ کھٹکتی ہیں۔ اسی سبب سے کامیاب غزل کے لئے اور اصنافِ سخن کے مقابلے میں عاشقی اور ہنرمندی کی زیادہ ہی مقدار چاہئے۔ اور دورِ حاضر میں ان اجناس کی کچھ ایسی افراط نہیں ہے۔

فیض

پروفیسر سلامت اللہ خاں

شاعر محمد شمس عیسیٰ

یہ مضمون جو سنہ ۱۹۷۴ء میں لکھا گیا تھا، ایک متاع نایاب ہے جو چکا تھا۔ افکار نے اسے 'اچھ کی خاطر اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ پروفیسر سلامت اللہ خان صاحب نے اسے مضمون کے سلسلہ میں میرے لکھا۔ "فینے صاحب پر میرے جن مضمون کا ۲۰۰ سے زائد ذکر کیا ہے وہ اب اسے انیسویں یا بیسویں سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس زمانے تک صرف "نقشہ فریاد" شائع ہوئی تھی، اور وہ مضامین صرف اس مجموعہ تک محدود تھے۔ خود میرے پاس وہ مضمون نہیں ہے لیکن یاد پڑتا ہے کہ ان کے کچھ نظموں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔" اچھے تنقید اچھے شاعری کی طرح ماہ و سال کی گردشوں سے محفوظ رہتی ہے۔ پروفیسر سلامت اللہ خان کا یہ مقالہ اسے خیال کی صداقت کا آئینہ دار ہے۔ (ادارہ)

انگریزی شاعری پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں کتنے بہت سارے واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد کی شاعری کی کچھ مشترک خصوصیات ہیں اور ہر شاعر کی کسی گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لئے جب بھی وہ ایک سرسری نظر بھی دہرا نا چاہتا ہے تو اسے ہر دور اور شعراء کے ہر گروپ کا ایک نام مل جاتا ہے۔ کلاسیک، نیم کلاسیک، قبل رومانی، رومانی، نیم رومانی، جدید، باغی وغیرہ۔ ہمارے قاری اس ایلوٹ تک کا یہ طویل سفر نظروں کے سامنے نہیں جاتا ہے، اور اس کے تخیل کے دھندلکے میں وہ تمام شاعراں میں جھلکتی جگمگاتی رہتی ہیں۔

میں کتنی کثرت اور حسین اور بعض کتنی سنگدلاخ اور دشوار گزار، بعض کتنی الجھی ہوئی اور چھپیدہ۔ لیکن ہر راہ کی پہچان الگ ہے اور میں فرسودہ اور پامال راہیں، گلی قاری کے ذہن میں محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے برعکس جب وہ اردو شاعری پڑھتا ہے تو اسے ایک عرصہ تک شاید یہ کیف یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ کتنے دُستِ اچھے ہیں اور وہ مکمل بھی نہیں ہونے پلنے کے دوسرے دائرے آتے ہیں۔ ایک دائرے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا اسی طرح ملتا

رہتا ہے یہاں تک کہ ہر چیز نکلے ہو کر بے مدبہ اور غیر واضح ہو جاتی ہے۔ جس میں آپ خصوصیات شاعری کی بنیاد پر نہ کسی دور کو متین کر سکتے ہیں اور نہ غرضاً لاگو ہو پ۔ اور اگر اس کی کوشش کریں بھی تو محض انداز بیانی کے سہارے کچھ خاکے شایر تیار کر سکیں، لیکن ان میں رنگ آمیزی نہ صرف قارئین کے ذہن، نقادوں کے لئے بھی مشکل ہے۔

عذر سے پہلے کی شاعری تک کی مدت آپ اس طرح طے کر کے عذر کے بعد کی شاعری میں بھی بہت دور تک انہیں روکھی پکی پامال ماحول سے گزرنے ہیں، یہاں تک کہ آپ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور جیویں صدی کی ابتدا میں کچھ نئے نئے اور نئے دائرے بننے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہاں آپ کی دشواری کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اگر انگریزی شاعری میں شعراء کا ایک گروپ ایک دور کے دائرے کی تشکیل کر سکتے تھے تو اردو میں ہنگامہ عظیم کے پہلے اور بعد کی شاعری میں بہت سے دائرے مل کر ایک شاعر کی تشکیل کرتے ہیں، مثال کے طور پر جوش کو لے لیجئے، نقش و رنگ، مسے، صرف آؤ تک کہتے، دائرے بنتے ہیں۔ جوش، جمالیاتی شاعر۔ جوش، شاعر قدرت۔ جوش، رومانی شاعر۔ جوش، انقلابی شاعر۔ جوش، باغی شاعر۔ جوش، آپ کو عروس ہونے کے جوش بھی کچھ ہیں۔ اسی طرح اقبال اگر ایک طرف بے امن سرد اور ٹھٹھے ہونے کی طرف ہیں تو دوسری طرف دنیا کے غریبوں کو جگانے کا عزم بھی رکھتے ہیں۔ تجا ز اصرار منشی کی پرستش کیے ہیں۔ اپنے محبوب کی سانچہ پر خوشیاں مناتے ہیں، اور دعائیں دیتے ہیں۔ اور پھر وہی جاز انقلابی بن کر دہر آوارہ بھی پھرتے ہیں۔ راضی اگر اپنے سادہ و مہموم محبوب کو واقعت الفت کہنے سے گجراتے ہیں تو ایک۔ یہ منہ جسم سے اپنے ارباب وطن کی بے بسی کا اہتمام بھی لیتے ہیں۔

آخر یہ سب کچھ خیز و زکوبوں؟

قاری! سمجھتا ہے کہ آخر یہ کیوں؟

ان وجوہات کو بیان کرنے کے لئے کافی جگہ، رودت کی ضرورت ہے۔ مختصراً تو سمجھ لیجئے کہ انیسویں صدی کے آخر میں ادب و ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش بہت کامیاب ہوئی۔ ہمارے ادیبوں میں خصوصاً شعراء میں ایک طرف اس کا احساس تھا کہ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی لپٹی کے علاوہ ہمارا ادب بھی دوسری زبانوں سے صدیوں پیچھے ہے۔ زمانہ قدیم کے شعراء کو ہونے کے میل کی طرح صدیوں تک ایک ہی دائرے پر چکر کاٹتے رہے تھے۔ ان کی تنگ نظری اور مقلدیت پرستی نے اردو شاعری کو اس کی موجودہ وسعتوں سے محروم رکھا تھا۔ اسی لئے وہ اس کوشش میں تھے کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو اپنائیں جو اردو شاعری کے لئے ابھی تھیں۔ ان حالات میں اردو شاعری کا انگریزی ادب سے اثر پذیر ہونا تو بے انکیز نہیں ہے۔ اس اثر سے مل جل کر ایسے اور فنڈ کے وہ خیالات بھی آئے جو ہمارے بہت سے معاشرتی مسئلوں کا حل سمجھے جاتے ہیں۔

دوسری طرف ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش نے وہ بہت سے موضوعات جن سے پہلے جواب تک اردو شاعری میں نالما دس تھے۔ وہ موضوعات جواب تک نا شائستہ سمجھے جاتے تھے انہیں شعراء نے نوازا۔ لوران کے سہارے عوام کی زندگی کے کئی پیچیدہ مرحلوں سے روشناس گرایا۔ نئے موضوعات جن کے ساتھ نئے اسباب بیان کی تلاش ہوئی۔ بعض ادنان میں نئی، پیش میں مفید اور مضبوط دہرید ہوئی اور اس طرح صدیوں کی مسافت چند سالوں میں طے ہو گئی۔ مختلف قلم کے لئے ایک ہی شاعر کے دامن میں آگئے اور اردو شاعری کا یہ مرجھایا ہوا پودا دیکھتے ہی دیکھتے ایک تادم دھرت بن گیا اور مختلف صحت مند شاخیں پھوٹ نکلیں۔

انہیں شاعری میں ایک شاعر نیم رومانی شاعر کی بھی ہے۔ جس میں فیض، جذبی اور اخترا لایمان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ فیض اور جذبی جیسا کہ میں نے اپنے اردو کے جذباتی شعراء میں لکھا ہے۔ رومان اور حقیقت کے ملاپ ہیں۔ ان میں نہ جوش اور مجازی گھن گھٹ ہے اور نہ ان پر غوی اور انتقشی انقلاب کا جنوں سوار ہے۔ ان کے یہاں ایک دلی دلی سی کراہ — ایک گھٹی ہوئی سی کسک اور ایک خاموش الم ہے — ان کے دلوں کے ایوان ویلان اور تاریک ہیں جن میں کج شدہ عشق کی نظارہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ اپنی رومانی فطرت کے باوجود اپنے ملک اور قوم کی پکار سننے میں۔ اور حقیقتاً زندگی ان کے لئے ایک کڑا درد ہے جو کثرت میں ڈھلتا ہی نہیں اور یہ صرف اشکوں کی زبان میں کہتے ہیں اور انہوں میں اشرار کرتے ہیں۔ لیکن فیض، جذبی، اختر الایمان کو پڑتے ہوئے بھی ایسی ہنگامہ خیز دور کا احساس ہوتا ہے۔ جس کا ذکر دیر ہو چکا ہے۔ انگریزی شاعری میں نیم رومانی شاعری کے پیشوا سوتھ بکن (Somerset Maugham) ہیں جو بطور کٹورین دور کی شاعری کے لطیف پہلو سے منسلک ہیں۔ لیکن دراصل سوتھ بکن کی شاعری اور ان کے موضوعات شیعے، بائبل، کیمیش، اور لینڈ کے موضوعات کی باز آشت ہیں۔ وہی آزادی کا وجد و انبساط، وہی مظلوم قوموں کی جدوجہد، وہی باقاعدہ مستند مذہب سے بغاوت، وہی اذعانیت سے جنگ، وہی وحدت الوجود کے رجحانات، وہی سیاحی یا عوامی حس سے محبت، سب کچھ وہی ہے۔ اسی طرح فیض، جذبی اور اختر الایمان کی شاعری میں اگر وہ دوسروں کے ادراک اور تخیل کا ملاپ اور خیمیلی بیسرت ہے تو کٹورین شاعری کی طرح ان کی شاعری میں مرکزی مقصد، رومرک عقلی یا ذہنی بھی ہے۔ ان میں اگر عقل کا انکسار اور اعتدال ہے۔ اور اگر عقل کی طرف یہ اپنی آواز میں متناسب تبدیلی بھی پیدا کر سکے ہیں۔ اگر نئی طرح ان شخصیتوں میں بھی دو متضاد قوتوں کی پیکار ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و محبت کی دل گلاز داستانیں بھی ہیں، اور سیراننگا، حمل کی تخی بھی۔ ان میں حسن کی رنگین میں کھوجا نے کی جرأت بھی ہے اور اجنبی ہو جانے کی تمنائیں بھی۔ یہ شعلے کرتے ہیں لیکن نئے تاب میں تلخی رہ رہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ عہد حاضر سے مایوس ہیں لیکن شکست خیز وہ نہیں۔ ان کی شاعری میں ایک فکر مند جیس ہے۔ یہ جانتے کئے کے غلامی کا دور چند روز، فقط چند ہی روز ہے۔ یہ پاپ کٹ جائے گا، اور وہ دن دور نہیں جس کے لئے وہ کیا کچھ گوارا نہیں کرتے۔ انہیں خصوصیات نے انہیں نیم رومانی کا لقب دیا۔

فیض کی شاعری میں جو چیز ابتداء سے کھلچکی ہے وہ ان کی روح کی تنہائی ہے خواہ وہ ایک نظم ہو یا پورا مجموعہ لیکن پڑھتے ہوئے قاری ان کی روح کی تنہائی بھی نرا انداز نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ شیعے کی طرح ان کی اکثائی اکثائی سی نظریں اپنے گرد و پیش پڑتی ہیں۔ اپنے دور کی زوال پذیر فضاؤں سے مایوس ہوتی ہیں اور پھر وہ اُس نئے وعدہ کی منتظر رہتی ہیں جب یہ تاریک فضا رکھٹ جائے گا۔ اور وہ بھی چٹائی کی طرح ہمالہ کے تنگ گاتے کلس دیکھ سکیں گے۔ یہ انتظار جو کئی مدتوں میں جمائی بھی ہے اور روحانی بھی، بہت کچھ رومانی ہے۔ اور اسی لئے فیض کی شاعری میں ایسا حزن و ملال، ایسا درد و الم، ایسی عشم انگیزی ہے جس میں ہارڈی یا فانی کی تخلیقیت کی خشکی نہیں بلکہ جو حسیں ہے۔ جو پراسرار ہے۔ جو خواب آور ہے۔ جو جالبائی لذت سے چور ہے۔ فیض کی آنکھیں فکر مند بھی ہیں اور درد مند بھی۔ لیکن جس حسیہ کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کی آنکھیں منتظر بھی ہیں۔ آنے والے محبوب کی۔ کئی رنگین آنچلی کی۔ کچھ خوشی پر منتظر ہوئی، سوئی ہوئی چاندنی کی۔ سرگوشیوں کی۔ ایک اُبھے ہوئے مہربم سے دماغ کی۔ اور اس عہد نو کی جس پر انہیں یقین ہے۔ یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوتا۔ دل میں کھوئی ہوئی یاد سے لے کر سوختہ اشکوں کی کہانی تک یہ انتظار قائم رہتا ہے۔ ان کی تنہائی ہر لمحہ پورے دل میں جاتی ہے لیکن استغفار کی آخری امیدوں

کے وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔

کماؤ تہہ کہ شیعہ کی زندگی جمالیاتی و فنی اعتبار سے ایک سین دانت ہے اور اس کی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ و خبر ہر سندر جھیل اور پانی کا پیرامبر پر لوتے۔ جھیل میں کاغذ کی ناؤ ڈالنا، سمندر کا سفر کرنا، ہیرٹ کا پانی میں ڈوب کر خود کشتی کرنا، سمندر کے جھاگوں میں اپنے مرحوم بچے کی شبیہ دیکھنا، پانی میں ڈوب نرنے کی دہائیوں مانگنا اور بالآخر خود پانی میں ڈوب مرنا یہ سب ایک ہی بار کی منفعت کریا ہیں، جو بنظر مختلف ہیں اور یکساں بھی (۴۱)، طرح فیض کی ابتدائی شاعری کا مرکزی محرک تہی اور استفادہ ہے۔ ایک خیال سے دوسرے خیال تک، ایک شعر سے دوسرے شعر تک، ایک نظم سے دوسری نظم تک یہی وہاگا پرویا ہوا نظر آتا ہے۔ مئی کے اعداد و افسوں کی طرح ان کی ہر نظم انفرادی طور پر اپنا دم و رنگی ہے لیکن مجموعی طور پر وہ سب یک ہی مالاہیں۔ ان کی پہلی نظم مضارہ وقت نہ لائے، نیز مئی کے اس استفادہ کا اظہار ہے۔

وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہیں اور اس وقت سے ڈرتے ہیں جب ۔۔

ملوئل راتوں میں تو بھی حصار کو ترستے

جری ننگدکی غم گسار کو ترے

خزاں رسیدہ تہا رگو تر سے

اور

مُتْرَاوہ دقت نہ لاسے کہ منچر کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے

وہ آنکھ میں کو ترا انتظار رہا اب بھی ہے

اس نظم کو پڑھتے ہی گھٹکتا ہے کہ فیض کے یہاں وصل کی سرسبزی اور گرماں باری نہیں۔ ہندی شاعر کے محبوب کی طسرت

شاید فیض کا محبوب بھی پروسی ہے امیران کی شاعری میں فراق اور جدائی کا سوز، گھٹا دھڑ اور لذت ہے، لیکن یہ فراق اردو غزل

کے فراق کی طرح نہیں جو چند بندھے ہوئے فکروں کے علاوہ ^{۱۱} اور لطیف احساسات سے عاری ہے۔ فیض کے فراق میں دھوپ چھاؤں

جے، دیکھنی ہے، رو کی کسک ہے، امید کی ٹلیں ہیں۔ نیز تمارے گئے ہیں تو اس لئے نہیں کہ یہ فرقہ کی ایک علامت ہے۔

بلکہ اس لئے کہ تاروں میں ان کی بے خوابی کا اضماع لال ہے۔ فرشتہ کی پاندلی فیض کے لئے بے کیف نہیں، بلکہ مثلی ہوئی، کھوئی ہوئی،

سوئی ہوئی، سرگوشیاں مرقی ہے، اور اسی لئے فیض کی جہاں یا فراق میں ہے

فیض کی شاعری میں تنہائی اور اُتارنے اور مختلف شکلوں میں اُٹھا کر ہوتے ہیں۔ آپ بھی یہ دھوپ چھاؤں دیکھئے۔

میں دل فگار نہیں تو ستم شعاریں

بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں

ترا ہی عکس ہے ان اجنبی پہلوؤں میں

خوتہ سے لب ، ترے بازو ترا کنار نہیں

۵۱

میری تنہائیوں پہ شام رہے ؟
 صبر دید نامتو رہے ؟
 دل میں بے تاب ہے مولے حیات
 آنکھ کو گھسہ بشار کرتی ہے
 آسمان پر اُداس ہیں تارے
 چاندنی انتظار کرتی ہے
 آگ بھٹکے ڈاڑھ پیار کر میں ہم
 زندگی زرد نگار کر میں ہم

یا

مری رُوح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
 ہر اک تار نفس میں آرزو پیار ہے اب بھی
 ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
 لگا ہی بچھ رہی ہیں راستہ زر کا رہے اب بھی

وہ ناصبور نگاہیں وہ منتظر راہیں
 وہ پاس ضبط سے دل میں دلی ہوئی آہیں
 وہ انتظار کی سرائیں طویل تیرہ و تار

انتظار و تنہائی کے یہ سائے ایک لمحے کے قاری کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ بالآخر انتظار اور تنہائی دو بقاعدہ نظریں بن کر آتی ہیں۔ نظم "انتظار" میں شاعر بہت عذراں روایتی ہے اور جذبات کا اظہار سیدھا اور سادہ ہے، شاعر نے کوئی لطیف فن ہی استعمال کیا ہے، اور نہ الفاظ کے انتخاب میں ہی کوئی خاص رعایت کرتا ہے۔ اسی لئے اس نظم کی اپیل بہت حد تک محدود ہے اور اس انتظار میں جو بظاہر ہر شاعر کو اپنی محبوبہ کا ہے، کوئی گہرا معنی، خیر پہلو نظر نہیں آتا۔ شاعر صرف عام احساسات کا ترجمان ہے۔ ریاض زبیرت یہ ہے کہ ہونا چاہئے آئندہ بہار ہے۔ شاعر کے خیال کی دنیا سو گوار ہے وغیرہ۔ اور یہ

جو حسرتیں ترے غم کی کھیل ہیں پیاری
 ابھی ملک مری تنہائیوں میں بنی ہیں
 طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
 اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

نظم کا خاتمہ بھی اگر مایوس کن نہیں تو کچھ زیادہ خوش گوار بھی نہیں۔ فیض ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح نڈھال ہو کر سہارا چاہتے ہیں۔

تم تہا ری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں

غلطت و غصہ صبر و شکیب آ جاؤ

تسراہ خاطر بے تاب تھک گیا ہوں میں

لیکن اس نظم کے برعکس، تنہائی، منہوی اور فنی اعتبار سے فیض کی شاعری کی معراج ہے۔ تنہائی، اور انتظار جیسا میں نے اوپر کہا ہے فیض کی شاعری کی مرکزی و بنیادی خصوصیت ہے اسی لئے ان کی ساری غزلیں اس ایک نظم کے گرد گھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نظم بظاہر داخلی دلدل کی داستان ہے لیکن بے مددنی خیر ہے۔ نظم کی ابتداء اس لمحے سے ہوتی ہے جب شاعر کا سارا وجود سمٹ کر صرف انتظار کے ایک نقطے پر مرکوز ہے۔ خنیف سے خنیف آہٹ سے وہ چونک اٹھتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے قدموں کی آہٹ کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں امید و مایوسی کی حدیں ملت ہیں۔ جہاں امید کی لوٹکائی ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتی اور آخری لمحہ میں جیسے اس کی تدریل بھرک اٹھتی ہے۔ اور اس کے بعد ڈوبتی جاتی ہے، مدغم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بجھ جاتی ہے۔

۱۔ پھر کوئی آیا دلِ ناز نہیں کوئی نہیں

۲۔ راہرو ہوگا کیس اور چلا جائے گا

۳۔ ڈھل چنڑا بہت پکھرنے لگا تاروں کا غبار

۴۔ دوکھنے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

۵۔ گلی کرو شمعیں بڑھا دوئے و مینا و ایان

۶۔ اپنے بے خواب کوڑوں کو مقفل کرلو

۷۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

نظم کے پہلے مصرعے میں شاعر کا وجود ساری دنیا سے بے خبر ہے۔ وہ صرف ایک کیفیت، ایک جذبے میں مدغوش ہے۔ دوسرے مصرعے میں مایوسی کے ساتھ انتظار کی شدت کم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے طہرہ کا خیال آتا ہے جس کی منزل کوئی اور ہے پھر انتظار کی شدت گھٹتی ہے اور مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ راہرو سے دھندلائے ہوئے تاروں تک، تاروں سے ایوانوں میں لٹکھڑکتے ہوئے چراغوں تک یہ مایوسی تاریک تر ہوتی جاتی ہے۔ اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب کوئی بھی نہیں آئے گا۔ اور اسی لئے غمیں عمل کرنے، دے دینا و ایان، بڑھا دینے اور بے خواب کوڑوں کو مقفل کرنے کی التجا ہے۔ آخری مصرعے میں کوئی نہیں، کوئی نہیں کی تکرار سے شاعر اپنی بے حد بوجھل ہوتی ہوئی مایوسی اور تنہائی کا ذکر کرتا ہے۔ ڈوبتی ہوئی، لٹکھڑکتی ہوئی شمع امید آخر تک جاتی ہے اور ریت کے عمل جماعتی آرزوؤں سے بنائے تھے، بے آواز سمار ہو جاتے ہیں۔

نظم کے پہلے اور دوسرے مصرعے میں شاعر کو اپنے گرد و پیش ماحول کی غراں کا احساس نہیں۔ اس لئے کہ اس کے وجود کا ذہن ذہن ہرجن انتظار ہے۔ لیکن تیسرے، چوتھے اور پانچویں مصرعوں میں شاعر کی روح پر گرد و پیش کی غراں باریک ملاحظہ ہوتی ہے۔ اسی خاصیت سے شاعر شعلہ قافیہ اور فنی اعتبار سے اس غراں باریک اظہار کرتا ہے یہاں تک کہ آخری دو مصرعوں میں شاعر کو محبوب کے نہ آنے کا یقین ہو جاتا ہے اور الفاظ سہل ہو جاتے ہیں۔ قافیہ کی پابندی بھی ہٹ جاتی ہے۔

’فیضیہ نظم کو پھر پڑھے۔ تیسرے مصرعے سے ساتویں مصرعے تک ایک زنگھڑا کی ہوئی، نھری ہوئی، گہرا لودی کیفیت ہے۔ اودان کے رکن میں حرکت، بھینسی، رکتی، جھلکی اور بھٹکتی ہوئی سی ہے۔ ڈوبتی ہوئی غنڈیل کی طرح۔ لوثی ہوئی ہرول کی طرح۔ دراصل یہ شاعر کی دھندلائی ہوئی اسیدوں کا پر تو ہے۔ شاعر مایوس ضرور ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں آتا کہ حقیقتاً اب کوئی نہیں آئے گا۔ اس تذبذب میں اس کی روح بھٹکتی ہے، اور کسی جیسز پر یقین کرنے سے کتراتا ہے۔ فن کی یہ لطیف اور نازک ترکیبیں نظم کی مجموعی تاثیر کو دور گہرا اودو پر پا کر دیتی ہیں، اور شاید فیض کی یہ نظم نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ تمام اردو شاعری میں ایک نمایاں نشان رہا ہے۔

فیض کی اس نظم ’تمنا‘ کو اگر صرف داخل اور انفرادی واردات قلب سمجھا جائے جب بھی اس نظم کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن حقیقتاً یہ نظم محض انفرادی نہیں۔ یہ تمناؤں اور استغاثوں کا انظار اس فن کا رانہ انداز سے فیض کرتے ہیں وہ صرف شاعر کا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری ہندوستانی قوم کا ہے۔ میں نے کہیں کہا ہے کہ فیض اپنے گردہ پریش کی چھائی ہوئی تاریکی میں شاعر امید سے محروم نہیں ہوتے۔ وہ لوگ اک جہاں نویں پست یقین رکھتے ہیں۔ اور شاید یہ یقین انہیں شکست خوردہ ہونے سے بچا لیتا ہے، اور ان کی تلخ سے تلخ اور محسوس سے محسوس حقیقت بھی خواب کے دھندلکے میں پختی ہوئی نظر آتی ہے۔ حساس شاعر کے لطیف اور اک پر جن تاثرات نے گھل جمل کر اس نظم کی تخلیق کی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن ایسا مسلم ہوتا ہے کہ شاید شاعر اپنے محبوب کے ساتھ اس جہاں نو کا بھی منتظر ہے جس میں اسے یقین ہے۔ اگر محبوب کی آمد ایک جہاں نو کی تیز کر سکتی ہے تو چھلکے و محبوب کی طرح محبوب بھی ہو سکتا ہے۔ اس نظم کی بیشتر علامتیں اس کے انفرادی ہونے کی دلیل ہیں۔ اور سب سے بڑی دلیل اس کے سیاسی ہونے کی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر یہ نظم محض انفرادی ہوتی تو فیض اسے اپنے دور کی نظموں میں بھی نہ رکھتے۔ اس کے علاوہ نظم کا چھٹا مصرعہ اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ

بے دھمکنی خیز ہے۔ راستہ نے اجنبی خاک کا جو مطلب مقدمے میں بیان کیا ہے وہ قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ اسی لفظ اجنبی کا ایک اور استعمال سنئے سے

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم

آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اور شاید انہیں سنوں میں اس لفظ کا استعمال۔ تمناؤں میں ہوتا ہے۔ تاروں کے بکھرے ہوئے غبار اور ایوانوں کے زنگھڑاتے چراغ کا مطلب راستہ تہذیب کا بکھرتا ہوا شیرازہ بتلاتے ہیں، لیکن یہ بھی بہت دوراں کا ہے۔ فیض کی شاعری میں رمزیت کہیں نہیں ہے۔ اور تمناؤں میں اس کا استعمال تو نظم کے سن کو بے طرح فروغ کر سکتا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ شاعر کے ادراک میں ’محبوب‘ اور ’محبود‘ گھل جمل گئے ہیں اور یہ نظم انہیں سٹے چلے تاثرات کی تخلیق ہے۔

فیض کی محبت کی نظموں میں اس مرکزی خصوصیت کی دھوپ چھاؤں کے بعد اور بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ فیض کے ہاں وصل کی سرشاری نہیں، ان کی شاعری میں جدائی کی خاموش تڑپ ہے، اس کے علاوہ کچھ روایتی محبت کے پہلو سننے ہیں جن میں تفاعل، ستم اور وفا کا مضمون دہرایا گیا ہے۔ جس میں محبوب ’قاتل‘ ہے۔ ’اُن کی نظم‘ ’انجیم‘ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے

سب پوش ہیں زندگی کی فضا میں
تفاقی کے آغوش میں سو رہے ہیں
مہارے ستم اور میری وفا میں
مگر پھر بھی اسے میرے منسوم قاتل
مہتیں پیب رکھتی ہیں میری وعائیں
”مہر و مرشبانہ“ میں اس تفاقی کے خلاص فیض کی ترنیں بھی سننے سے
پھول لاکھوں برکس نہیں رہنے
دو گھڑی اودھے بہارِ شباب
آخری خط کی محو حکماں بچو! دلچسپی سے خالی نہیں ہے

وہ وقت مری حبان بہت دُور نہیں ہے
جب دروے مرگ جائیں گی سبیت کی رہیں
اور فیض اس ساحل کے انجام کے دونوں پہلو بھی واضح کرتے ہیں
شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دلی ”مہر و مرشبانہ“ کو ناستاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ کسم اشک بہانے
نویز بہاروں کے سین پھول چڑھانے

یا

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود و فائدہ پہ سہنو گی
”مری حال اب بھی اپنا حسن واپس پھر دے مجھ کو“ اور ”جہ نجوم“ میں ”نجوم شوق کی دانتان ہے۔ جہ نجوم کے خاکے
اور بہت سی خوبوں کے علاوہ بے حدود و قیود ہیں
منا و خواب سے بیزاریاں نہیں
سفید رخ پہ پریشان غمیں آئیں
”تین منظر“ یہ عکاسی مصوری کا رنگ اختیار کرتی ہے اور ”تصویر“ ”منا“ اور ”رضت“ کی جوتصویریں پیش کی گئی
ہیں وہ جذبات کی مصوری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

نظموں کے اس گروہ میں ”میرے ندیم“ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یوں یہ ”نہنگ“ ”یاس“ اور ”آج کی رات“ میں بھی موجود
ہے لیکن ”میرے ندیم“ میں محبت اور رومان کے ورواں بندہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ محبت اور رعنائیاں جس میں شاعر
انجمن ہوا تھا، اب اسے پہلی بار ان میں شاعرانہ وعبادان کے ختم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ”میرے ندیم“ پوری نظم ایک سوا لہر نشان

ہے۔ شاعرانہ ہے کہ وہ احساسات وہ آرزوئیں کہاں ہیں جن سے شری دنیا میں جان کھتی، جن سے فضا سے فکر و عمل رنگین ہوتی۔ جن کے فورے۔ دائرہ شہ و آب تھے اور جن سے عشق کی محبت جوان ہوتی۔ یہ تبس بند ہوتے ہوتے اور کھلے ہوئے دماؤں کا راز دار ہے۔ یہی نظم وہ دھڑے جہاں مغیر، شاعر محبت سے بڑھ کر شاعرانہ بن جاتے ہیں۔ ایک آہ کی نگاہوں سے بھولی راشد "صرف فری گلابی ملبوسوں میں پٹی ہوئی۔۔۔ خواب سے چور اور لغت سے سرشار تصویریں" یہی دیکھی محبت لیکن اب وہ ان منظر کی طرت بڑھتا ہوا نظر آتا ہے جتنے بھر جن میں ہوس کی سرسراہٹ اور خواب کی فضا پاستیاں نہیں بلکہ زندگی کی حرارت، زندگی کی تڑپ اور پکار ہے۔ "میرے نزدیک" اسی عجبس پر سترجہ ہوتی ہے۔ بہت کچھ میٹروپولیٹن طرز کی محبتوں کے مزار پر فیض پناہوں کر کے خوشی سے دبے پاؤں نکل جاتے ہیں۔ مشتاق اور بے آواز گواہ بند ہو جاتے ہیں، شاید کبھی نہ کھلے گئے۔ البتہ فیض کے دوسرے دور کی شاعری میں جن میں اکثر ان کا زون پر مٹی دنگ شادی بڑتی ہے: "تو آواز لگی نظم فارسیں مرین" (Formeaken - Mermaen)۔ کی طرت جہاں محبت، سی مایوس اور غم انگیز آوازیں "مارگریت" کو پکارتی اور واپس بلاتی ہیں، لیکن مارگریت تباہی ہے اور لوٹ کر نہیں آسکتی۔ یہ مارگریت سوئڈن کے ایک ہوٹل میں ملازمہ یا گارسن ہوتی تھی جس سے آملڈ نے پہلی بار محبت کی، اور اسے انسانیت کی جرات نہ کر سکے۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں اور تمام صدی قربان گاہ پر آملڈ نے محبت سے بڑے عزم اور استقامت سے دو، لیکن وہ کبھی دوئی مارگریت کی یاد کبھی فراموش نہ کر سکے۔ البتہ زندگی میں مارگریت نہ صرف ایک لڑکی اور ان کی کھوی ہوئی محبوبہ تھی بلکہ آملڈ کے لئے رومان اور محبت کا سبل (Symbol) تھی، فیض کی رومانی فطرت کی آہیں اکڑاؤ، بار بار واپس بلاتی ہے۔ لیکن یہ بند گواہ نہیں کھتا، ف و دنگ کی آواز دیتی ہے۔ گواہوں سے اس حشر معقل ہو جانے کے بعد اور شہ و رواں نہ دہری شاہراہوں پر پھلتے ہیں۔ وہ شاہراہیں جہاں رنگین و حریر ملبوسات ہیں نہ کبھی غریب نہ خوار خواب سے لبریز ہوتیں۔ نہ ریختہ روں کے عتبات کو رخا رہے۔ نہ سرت ہونٹوں پر تبس کی فضا۔ نہ مر مر میں ہاتھوں کی لرزشیں۔ نہ جنمیں باہیں اور نہ پھیلے ہوئے آئینے۔ یہ شاہراہیں بدشاہیں، کھٹوس ہیں اور ان میں حقیقت کی جھلک ہے۔ جہاں خاک و خون میں پھرتے اور بہتے ہوئے سہم، بازاروں میں مزدوروں کا کھتا ہو جو شہت بھوک لگنے والے کھیت، ناتوانوں کے نواہوں پر چھپے ہوئے عقاب، اگر زون کی مقلد کا بن، یعنی باغیوں کا بن نامہ سہم، دلوں کی سوسو تڑپ اور جہاں مایوس پکارا ہے۔

اس نئے دور کی پہلی نظم جس سے پہلی سی محبت سرے لب لب نہ لگے۔ ہے اور اس میں شاعری اس نام بھی کا ذکر ہے جیل میں نے محبت کو اپنی زندگی کا مقصد اور ماسل سمجھا تھا اور اس نام بھی پر ندامت کھی ہے۔ اور ماتم بھی ہے، لیکن شاعر نے انسانیت کی پکار سن لی ہے، اور اسے یہ احساس سکڑاؤ پر جو چلا ہے کہ ہے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت۔ کمر سوا

راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا

حسن و عشق کی رعنائی اسے، اس حد تک پہنچ نہیں کرتی کہ وہ زندگی کی اور سب سے اہم حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لے۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بیہوش

ریشم واطلس و کھواب میں بتا کے ہوئے

جا بکب کیجئے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لٹرے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

اب بھی دل کش ہے ترّا سن بکھڑ کیا کیجئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے

”چند روز درمیری جان فقط چند سو“ زندان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اس میں انہیں اس ظلم و ستم کا شعور بھی ہے، جو
ہندوستان کی سیاسی تحریکوں پر روا رکھا گیا، اور اس کے ساتھ اس کا یقین بھی ہے کہ شہنشاہی کی سفاک مبین چند روز میں
نوٹ کر کھج جانے والی ہے۔

لیکن اب ظلم کی میا د کے دن ٹھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فرط د کے دن ٹھوڑے ہیں

اس زنجیر کی دوسری کڑی ان کی نظم ”سیاسی سیدر کے نام ہے۔“ ساہا سال کی جدوجہد کچھ ایسی ہی تھی کہ جیسے تنکا
سمندر سے نور آگئی ہے۔ لیکن ان ناکامیوں اور بے شمار خون کے باوجود فیض ”طہور ذہن کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ انہیں
دور سے صبح کی آواز آتی ہے۔“ اسے دل بے تاب بکھڑ میں عہد نو کی امیدیں اور قوی ہوجاتی ہیں۔

یہی تار کی توبہ عشا زہ رحن بر سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اسے دل بے تاب بکھڑ

اور

جلد یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی

یہ گراں یاری آداب بھی اٹھ جائے گی

خواہ زنجیر چمکتی ہی چمکتی ہی رہے

چمکتی سیاسی نظم ”کتنے“ میں عوام کی خفیہ قوتوں کا اظہار ہے۔ ان ممکنات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ عوام متحد ہو کر
بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو حکومت کی مضبوطی مضبوط بنیا د کو ہلا سکے ہیں۔ لیکن

کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے

کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

اس آخری دور کی نظموں کو پڑھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ فیض اقتصادی برابری یا معاشرتی الجھاؤ کو اپنا موضوع نہیں
نہیں بناتے۔ شاید ان تمام مسائل کا حل وہ سیاسی آزادی سمجھتے ہیں۔ اس لئے جہاں کہیں بھی مزدور یا سرمایہ کار کا ذکر آتا
ہے وہ معنی طور پر۔ جس چیز کا احساس فیض کو تمام جدید شعراء سے زیادہ ہے وہ سیاسی غلامی ہے جو اجداد کی میراث بھی
ہے اور ذلت اور برابری کا باعث بھی۔ اس سیاسی غلامی کے مہلک اثرات کا مکمل اظہار ہمیں ان کی نظم
”ہم لوگ میں لٹا ہے“

دل کے یواں میں لے گل شدہ شمعوں کی تعداد

نور غور و شد سے بہتے ہوئے اکٹائے ہوئے

نوجوان طبقہ نہ صرف ہندو مت کی زلتوں سے افسردہ تھا بلکہ اپنے زمانے میں کئی سیاسی تحریکوں کی شکست بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے وہ مستقبل سے بھی بے یاس و محقق۔ اس کے نزدیک مستقبل میں ایک طویل اذیت تھی اور یہ محرومیاں مل جل کر اس کے ادراک پر بے حد علم انگیز طریقے سے اثرات ڈال رہی تھیں۔

مضمحل ساعتِ امر و زکی بے رنگی سے

بادِ ماضی سے عین دہشتِ فردا سے طحال

شخصہ اشکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں

سوختہ اشکِ بڑا آنکھوں میں نہیں آتے ہیں

اک کراہ رہا کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں

دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں

اور اچھے ہوئے موہوم سے درماں کی تلاش

دشت و حرماں کی ہوس چہ لگ کر گیاں کی تلاش

زندگی کے ان ٹکڑے اور سنگین حقائق سے دوچار ہو کر یہ بھی ممکن تھا کہ فیض، راشد کی طرہ ہر گیت خوردہ ہو کر شراب اور عورت میں پناہ دیتے یا ان تمام مسائل کا انہی م راشد کی طرح اجتماعی خود کشی میں دیکھتے مگر فیض کی شاعری میں ایسے رجحانات نہیں ملتے۔ انہیں طلوعِ نو پر یقین ہے۔ جسے ہم ایک قسم کی رہبانیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں فیض کے موضوعات سنسن مورت و زینت کی صفت لائی، شہر کی خزاواں مخلوق، پر اسرار نرسی دیواریں، اور خولوں کی مقتل گاہیں ہیں وہاں وہ کسی شورخ کے آہستہ سے کھیلے ہوئے ہونٹ یا کسی جسم کے کمیزات و لائبریل خط و خیر نہیں بھولتے۔ دراصل یہ وہی دنگ ہے جو ہمیں رومان اور محبت کے منقفل دروازوں پر کھڑائی پڑتی ہے۔ فراہم کی سہجی ہوائی ادا میں وہ چہرہ مہتاب سے ڈھلی ہوئی رات کا حسن فراموش نہیں کرتے۔ اور یہ

کج پھر جن دل آرا کی درجہ درجہ ہو گی

وہی خواہید دس آنکھیں دی کا بل کی میکر

دنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غارے کا غبار

صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی صفت کی تحریر

یاد

جانے کس ذلت کی موہوم تھی چھاؤں میں

نکلتا تھا وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

احساس کی اس شدت کے باوجود انگریزی رومانی شاعرانہ کی طرح اپنے جذبات کی رو میں نہیں بہتے۔ ان کے رہنماں

پینچ پکا نہیں ملتی۔ صرف ایک دلی سی آہ ہے۔ ان کے عم کے شعلوں میں جلتی ہوئی چٹاؤں کی ایک نہیں ہے۔ صرف ایک۔ بھی بھی سی آہ اور دمک ہے۔ یہی خود قبلی یا بھڑاوان کو دکھائیں دور کی انگریزی شاعری کے توازن سے ملاتی ہے۔ ان کی شاعری کی اپنی زیادہ تر ذہنی ہے اور توازن اور بھڑاوان کو دوسرے جو فیض اور جذبات کی نمایاں خصوصیت ہے ان کی شاعری میں آرنلڈ کی شاعری کی طرح غفلت اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے شب و روز میں چکا چوند کرنے والی روشنی نہیں بلکہ ان کی غم انگیز دنیا جانور کی مدہم روشنی میں جھللاتی نظر آتی ہے۔

فیض کے کلام کے مجوسے میں نغموں کا ایک گروپ ایسا بھی ہے جو شاعری فن کا نئے اور مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ”سرو شاہ“ ”مہم نجوم“ ”یاس“ اور ”ایک منظر“ میں ایک پراسرار افسانوی اور معنی خیز سرگوشی ہے۔ پرسکون اور خواب آور مناظر شاعری روح کی طرح بوجھل اور نڈھالی ہیں، لیکن ان شاعر کی اندرونی اور اسٹھلا میں سرگوشیاں سنائی پڑتی ہیں۔ ان نغموں میں ہی شاہراہوں کا تیس ہے اور دھماکے بھی نغموں میں اس عسکری دور کی نشانی ہیں، جہاں شاعر محبت سے شاعر انسان بنتا ہے۔ ان نغموں کا سن و سون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ”سرو شاہ“ خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ اس نظم میں شاعر نہ صرف عالم خود فراموشی میں ہے بلکہ اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اپنے گرد و پیش کے منظر سے ہم آہنگ ہے۔

سوہی ہے گئے درختوں پر

چاندنی کی بھٹی ہوئی آواز

بکشتاں نیم دانگا ہوں سے

کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز

ساز دل کے خوش تاروں سے

تپیں رہا ہے خمار کیف و گیس

آرزو، خواب، تیرا دے حسین

ان نغموں میں منظر نگاری کے باوجود اس اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے حدیث ہے، اور بعض مدرسے بذات خود ایک نظم ہیں۔ اس کے علاوہ ان نغموں میں جہاں زمانہ استعمال کے گئے ہیں، ان کے رکن میں ”روان دواں کیفیت نہیں ہے بلکہ بھڑی ہوئی حرکت ہے جو نظم کی کیفیت کی مناسبت سے نہ صرف موزوں ہے بلکہ جس سے شاعر کو اظہار میں بڑی مدد ملتی ہے۔

فیض کی شاعری میں راشد یا میراجی کی اشاریت یا رمزیت نہیں ہے کیونکہ زندگی کے جن مسائل پر ان کی نظر پڑتی ہے وہ غم گیز ہونے کے باوجود سادہ ہیں۔ ان میں وہ چمپیدگی نہیں جو راشد یا میراجی میں ہے۔ اس نے فیض کا بیان سمجھا ہوا اور صاف ہے۔ چند ترکیبوں اور نغموں میں قوافی کے رد و بدل کے علاوہ ہمیں ان کے اسلوب بیان میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ لیکن دیگر جدید شعراء کی طرح فیض نے بھی اردو شاعری کو بہت سے نئے الفاظ اور تشبیہوں سے روشناس کرایا۔ راشد نے ”نقش فرودی کے معقدے میں بکھلے“، ”فیض ہمارے زمانے کے بعض دوسرے شاعروں کی طرح تشبیہات کا دلدادہ نہیں۔ آپ اس کی نغموں کو

غور سے دیکھیں تو شاید ہی کوئی تشبیہ آپ کو مل سکے۔ عجیب ہے۔ لاشد جیسے شاعر کو فیض کی تشبیہات کا حسن نظر نہیں آتا۔ یہ صحیح ہے کہ فیض کی شاعری میں تشبیہات کی بہتات نہیں لیکن جو تشبیہیں ہیں ملتی ہیں وہ بڑی انوکھی اور بے حد حسین ہیں۔ ان تشبیہات کی کچھ مثالیں آپ بھی سنئے،

مُرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیا میں جس طرح
یا سمن کے پھول ڈوبے ہوں بے گلزار میں

جس محبوب کے سستیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بجھنے ہوئے لپٹا ہے ہوسے

سیاسی ہمد جہ کے متعلق سے

جس طرح تنکا سمندر سے ہوسرگرم ستیز
جس طرح تیزی کسار پہ یلغار کرے

تیری ہے کہ اُمنڈی ہی جھلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے ہونٹوں کا ہوجیسے

یا سمن

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یا آئی
جیسے ویرانے میں پتے سے بہا رہا آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیار کو بہ وجہ قرار آ جائے

ایک افسردہ شاہراہ دراز
دور افق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
ٹھہریں جس کو بچھائے ہوئے

جس طرح کوئی عسکر وہ عورت
اپنے ویران کدے میں محو خیال
دھلے محبوب کے تصور میں
مُبو پُچور، عضو عضو نڈھال

ڈاکٹر شوکت سہنوار سی

شَاعِرِ حَمِیَا وَكَائِنَاتِ

فیضی اردو کے جدید شاعر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جدید شعراء اردو میں ان کا کیا مقام ہے؟ میر تقی میر کا مدغم جید شعراء جن میں نظم نگار اور غزل گو دونوں ہی شامل ہیں، دو بڑے طبقے میں پہلا ممتاز ان شاعروں کا ہے جو جدید ہونے کے ساتھ ساتھ صافی سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں مادہ قدیم کلاسیکی اردو شعرا کی نہ کسی سلسلے سے ان کا کوئی اندیشہ باقی قلمبند ہے۔ یہ ادبیات ہے کہ یہ فن ۔۔۔ جاہلوں میں متحرک اور آج جاری کی طرح ترقی پذیر ہے۔ نئے نئے تجربوں کی مدد سے اس نے شری روایت کو رد نہیں کر دیا بلکہ برعکس پایا ہے۔

طہر بنیں موسم گل کے قدمِ حجام ہے جانِ شمسِ دہقر کی سی کینیت ہے
فیض اسی سلسلے کے شاعر ہیں۔ ان کا قلمِ قدیم اور شواہدِ ہر سے خصوصیت کے ساتھ غالب سے ہے۔ انہوں نے دیکھے
سے غالب تک پہنچنے۔ غائب و اقبال دونوں کی روایت کو انہوں نے آگے بڑھایا۔ وہ اس سلسلے کی تیسری کڑی ہیں جس کا آغاز غالب
سے ہوا۔ فیض کی شاعری، اقبال کی شاعری کا پہلا قدم ہے۔ لیکن رستہ کی قدر دلا ہوا ہے۔

اس اجمال کی تعمیل یہ ہے کہ غالب ٹکڑوں دونوں اعتبار سے اردو کا انقلابی شاعر ہے۔ اس کے فکری جیاد "تویدہ مینا پر ہے" جیسے قطرے میں دہل نظر آیا اور اس کا فن دل گرفتہ کار میں منت ہے جس نے فونے شے سخن کو حسن کی کرن میں جگمگایا۔ غالب کے فکر و فن کے اس ازگے ترانے نے غالب کے لئے حیات و کائنات کا کوئی جہاں جہاں پر وہ مکا پر وہ ساز بنا دیا۔ غالب نے قعرے میں دہل کو جہاں گرد دیکھا اقبال نے قعرے میں دہل کا مشاہدہ کر دیا۔ غالب نے ذوق نظر سے کام لیا۔ اقبال نے ذوق نظر کے ساتھ ساتھ وقت و نگر کو بھی کار فرما رکھا۔ غالب کا فن حسن کا رخا ہے۔ اقبال کا فن جہاں بیخ اوکلا کا بھی۔ غالب کی آواز میں لوح اور شریح ہے اقبال نے ذوق فیض تر کرنے کے لئے لے لکھی قدر کو کرت اور سلجھ کر دیا ہے۔ غالب کے سلسلے میں مشاہدہ کی سمیت بھی ہے اور مجاہدہ کی بھی۔ غالب کے یہاں مشاہدہ کے نیے برسی ہوئی ہے۔ اور اقبال کے یہاں مجاہدہ کی اور یہ مقام ہے جہاں اقبال غالب سے کچھ بڑھ کر مزید کبھی سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ غالب اول اقبال کا قابل اس وقت پیش نظر نہیں۔ ان دو بڑے فن کاروں کے ذہنی اور فنی ارتقا کے ان تقیض اور منزلوں کو جاگ کر کا مقصد ہے جن سے بزرگ شہین علیؒ سیر جوہ مقام تک پہنچے۔

غالب اور تپاس کی طرح فیروز کا شاعری کے مزاج کی تمیز بھی دیدہ و بینا اور دل گذشتہ کے عناصر سے ہوئی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں

سمن گارنی کے پہلو پہ پہلو جہاں بیٹی بھی ہے۔ اور کارا لگی بھی، شیریں بیانی بھی ہے۔ اور سخن لڑائی بھی۔ غالب و اقبال کی طرح ہر چند فیض نے مشاہدہ و معاہدہ دونوں سے یکساں کام کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی نظر کرمیات و کائنات یا انفس و اوقات کے مناظر و مناظر نگہ نمود نہیں رکھا۔ اس سے پہلے انسانی زندگی کی انجمن آرائی بھی دیکھی اور اس کے ہنگاموں میں شرکت بھی کی غالب نے تماشائی کی طرح قطرے میں دجلہ کا شہرہ کیا تھا۔ اقبال نے اہل نظر کو خود سے دل میں غور شبید کا ہوا اور پھول کی پیکٹریوں میں سمن حقیقی کے جلوے ترپتے دکھائے۔ ہر چند اقبال نے کہا تھا ہے

میاں بزم بر سائل کہ آسنا
لڑائے زندگانی نرم خیزست
ہر دیا غلط و بامویش در آویز
حیات جادواں اندر سترت

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے ساحل زندگی پر بزم آرائی کی اور رویا کی محروم سے گفتہ جانے کی انہیں بھی بہت نہ ہوئی انسانی ابتلا یا ماضی کے اجتماعی جلوہ بہت سے آخر تک رہے۔

فیض نے اس جدوجہد میں علماء و علماء لیا اور اپنی اس زندگی کے تجربات کو شاعری میں ڈھال کر پیش کیا۔ فیض کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۵ء کی لگ بھگ ہوا۔ اس زمانے میں سیاسی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ملک سیاسی اور معاشی بحران سے گزر رہا تھا۔ فیض جیسا حساس شاعر اپنے زمانے کے سیاسی انتشار اور معاشرے کے بحران سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن سیاسی اور باقی فضا سے زیادہ فیض نے اردو شاعرانہ اثرات اور جو کئی نے کہا ہے گستاخ شاعری کو کہہ سے جنم لیتا ہے فیض نے سترت، جوش، اختر اور حفیظ کی تقلید کی اور اہل سمن سے لو لگائی اور عشق و محبت کے گئے عکاس گئے۔ وہ ابھی عشق کی اولین منزل ہی میں تھے اور جیسا کہ انہوں نے کہا ہے: اس دور کی ایک جہلک بھی اچھی طرح دیکھ نہ پاتے تھے کہ صحبت یا ر آخرت۔

فیض کی شاعری کا یہ پہلا ردائی دور ہے جو اس کی شاعری کے لئے ایک نقش پا کی حیثیت رکھتا ہے۔ فیض کی شاعری کا اگلا نیا ورغاباً ۱۹۳۵ء کے بعد اس وقت آیا جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی۔ اس سے پہلے مزور تحریکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ صاحبزادہ محمد انور انسان کی میم رشید جیوں کی رفاقت نے فیض کو ترقی پسند تحریک سے قریب کر لیا۔ اور ترقی پسند تحریک نے فیض کو شدت کے ساتھ ہی احساس دلایا کہ وہ انسانی معاشرے کے ایک زوردار دجلہ کے ان گنت قطروں میں سے ایک قطرہ ہیں۔ اس احساس نے فیض کی دنیا پالا دی۔ اب نہ ایک ناظر کی حیثیت سے قطرے میں دریا کا مشہدہ کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد قطرہ بن کر۔ اقبال کے نظموں میں دریا میں ڈوب کر۔ انہوں نے دریا کی اور اس کی بے چین ہروں کی سیر کی اس وقت تک انہوں نے محبت کے گیت گائے تھے۔ خواب اور بھان کی اپنی الگ دنیا بسا کر محبوب سے کہا تھا ہے

پھل لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب
اک گچھ دل کی سن سنائیں ہم
ہم محبت کے گیت گائیں ہم

آسمان پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
۲۰ حضور! سہا پیر کر میں ہم
زندگی زرخیز کر لیں جسم
اتوار بندہ کے بیدار ہوتے ہی نیند کو محبوب سے یہ کہہ کر منہ دت کرتی پڑی ہے
اور بھی دکھ میں زمانے میں غبت کا کوا
راحتیں اور بھی ہیں دھل کی راحت کے کوا
آن لگت صدیوں کے تاریک پہیادہ طعم
میں داخل ہو کر کجواب میں بڑا ہے ہوس
جہ تیلے جوشہ امرا حق کے قوروں سے
پیپ بہتی ہوئی تھکتے ہوئے "سورج سے
لوٹ باقی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترانہ مگر کیا کیجیے
اور بھی دکھ ہے زمانے میں محبت کے کوا
راحتیں اور بھی ہے دس کی راحت کے کوا
غیر سے پہلی نہ محبت سے محبت نہ لگ

اسو انتم کا صبر و صبر

اب بھی دلکش ہے ترانہ مگر کیا کیجیے

فیض کی شاعری کے مزاج کی غمازی کرتا ہے فیض کی شاعری سن و سماعت کے متعلق اور ایک ماحول کا دلکش منظر ہے
ہمیں سن کی دل نشی ہے۔ اور حقیقت کی سنیں روح فرماتے بھی۔ کائنات کی سبب و سبب ماحول دیکھتے دیکھتے فیض کی شاعری ایک
ماحول کے دلکش اور بھیاں تک متاثر کی طرف لڑھکاتی ہے۔ وہ ان کی تصویر کشی کے لیے اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری ان سے گھٹیا اور ان
کی اصلاح کی فکر نہ لگتا ہے۔ درجہ اور شاعری کا مزاج تھا تو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا "غم جاناں اردو کے کلاسیکی شاعر کے لئے
درد و دریاں کا گویا ایک درد کا مقام ہے

مشق سے طبیعت نے زلیست کا مزا پایا

درد کی نڈیاں درد ملا دوا پایا

اردو کی جدید انقلابی شاعری کا مزاج ہے "یوں" جہاں کا غم اپنا لیں "فیض" نے یہاں غم جاناں اور غم دوراں، جیسا کہ انھوں
نے لکھا بھی ہے، ایک تجربے کے وسیع پیمانے پر۔ ان کی شاعری میں دردوں کی بھلک ہے۔ انھوں نے زندگی کے دردوں پہلوؤں کی ترجمانی
کی ہے لیکن گھٹا لگا کر ایک جانچیکو مقابلہ بنا کر۔

فیض کی شاعری میں توس و ترغ کی ہی رنگینی ہے۔ اس میں کوئی رنگ گھل مل کر ایک ہونگے میں فیض کے لیے ہیں، دھپا پن غالباً ان کو ناؤں رنگوں کی آکھ بچلی کی وجہ سے جس نے ایک گہری لطیف، نازک، پائیدار یا اخار مت کو جنم دیا ہے۔ فیض کو کہنا چاہتے ہیں۔ مراعتاً اس کا ذکر نہیں کرتے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیض کے اندام بیان کو، دلکشی، فشریت، رچاؤ، ادا لیتھ، نینبہ ہے ان کے تجسس، نزہت کے مابین، لکڑی روشنی، منظر کی بے باکی، خیالات کی پختگی اور فنی ریاضی کا، فیض نے محبت کر کے اول اول اپنے دل کو مرقا، انبیالات کو پختہ، جذبات کو حسن، حصول کی طرح پاک اور لطیف بنایا اور آخر فقر وطن و وطن کا دکھ دوا پنا کر دوسرا راند ہونے، فکر و فن کے ریاض و رجا ہند کی یہ داستان فیض کی صہبہ نغمہ نشینوں کا صہبا کوئی نہیں، جہن تفسیل سے بیان ہوئی ہے۔ اس کے تین بڑے ذکر کے قابل ہوں۔ اولاً وہ بی بی کی محبت کی شے روشن ہوتی ہے۔

شاؤ کہ انھیں ہنرہ دوں میں مجھیں

وہ سا غزل ہے جس میں کبھی

صد ناز سے اترا کرتی تھی

صہبہ نے غم جاناں کی پیری

دنیا والے سا غزل لے کر تو دیتے ہیں اور صہبہ نے غم جاناں ہی میں مل جاتی ہے توں کو یاد دہار سے جھٹکایا جاتا ہے۔

یہ بچپن دیر سے ہیں شاؤ

ان شوق بلوریں سپند کے

تم مست جہانی میں جن سے

فدوت کو حجاب کرتے تھے

میسرے موز میں سنگین معانی کا شیشہ دل پر پتھر لڑکنا ہے

دارای دفتر مہک اور دم

ان سپنوں سے لکھتے ہے

بے رقم متاچہ کچھ بچہ سزاؤ

پکا تیج کے ڈھالنے کی لکھتہ

ریاض کن تین دنوں سے گزرنے میں گھن میں، رچاؤ کو کبھی نہیں، جذبے میں پھرانی احساس میں قدرت اور خیالات میں استواری کی فیض کی کہ درالکافی اور صنعت کاروں کے نمونے ان کے کلام میں آج آدمی کی طرح بکھرے ہوئے ہیں جس ایک نظم کے صرٹ و صبر و فنی سے کہ جس سے پائیدار گزرتا ہے۔

یہ کون تھی ہیں

جن کے ہونکے اخرفیاں، چھن چھن، چھن چھن

دھرتی کی پیہم پیاسی

کنکڑوں میں ڈھلکی جاتی ہیں
کنکڑوں کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جہاں! ہیں ارضِ عجم
یہ کھڑ لٹ

جن کے تہوں کی
بھر پور جوانی کا گندن
اسے ارضِ عجم اسے ارضِ عجم!
کیوں توجہ کے بہن میں چھوٹے
ان آنکھوں سے پہلے نیلم
ان ہونٹوں سے پہلے مہمان
ان باتوں کی بے کل پانڈی

کس کام آئی کس بات تھ گئی؟
ان بندوں کی موسیقی اور لفظوں کی ترنگ شعری روح یعنی خیال سے کس مدد ہم آگے ہے،
نیقین کی شاعری، ثبت کی شاعری ہے۔ اس کا فن سوز محبت کا فن ہے۔ "جان جہاں" یعنی وطن سے بھی اسے ایسی ہی محبت
ہے۔ جیسے کہی جاتی ہیں "جان جہاں" سے تھی۔ لیلیا نے وطن پر اس نے اپنا حق من و دھن سب کچھ نثار کر دیا ہے۔

چاہا ہے اسی رنگ میں سیلا سے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھنڈھسی ہے یونہی غرق نئے آسائش منزل
رمشا کے خم میں کبھی کال کی شکن میں
اس جان جہاں کو بھی یہ بھی قلب و نظریے
ہنس ہنس کے صفا دی کبھی کبھی رو رو کے پکارا
پورے کئے سب حرف تنہا کئے تقاضے
ہر دور کو اجیلا ہر اک غم کو سسوارا

درد کو، جانے اور غم کو سوار سے کا اثر ہے کہ نیقین کے لیے میں نہ غم و فتنہ کی لہر ہے۔ اس کی شاعری میں اداسی، غمی اور دنیا سے تڑپ
کا احساس ملتا ہے۔ فیض کی شاعری ایمان و عرفان کی شاعری ہے۔ عرفان حیات و کائنات کا ہے۔ اور ایمان انسان کے روشن مستقبل پر۔
نیقین یا اس کا شاعر نہیں اس کا شاعر ہے۔ وہ دوتا بھیت گنا، منہ سورا نہیں جانتا۔ حقیقتوں میں سکونا ہر حال میں خوش نظر آتا، اور حال
کو سدھار کر مستقبل کا خواب دکھانا اس کی قدرت ہے۔ وہ گھم کی یاد سے تلخی ایام کو شیریں بناتا ہے۔
اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں، ایام قہاری یاد سے شیریں ہیں تلخی ایام (دہائی صفحہ ۳۹ پر)

علی عباس حسینی

شاعر با عمل

قدیم جدید کی آویزش بڑی پرانی ہے۔ قدامت نے ہمیشہ جدت کو ٹوکا نئے سے سدا پرانے کی ہنسی اتراتی کیس حال برابر، نئی کی جگہ سے قبل پر بارگاہ ہیں جمائے رہا۔ وجہ ظاہر ہے۔ انسانی فطرت یکسانیت سے گھرا آتی ہے۔ وہ ہمیشہ جدید سے جدید ترکی تلاش میں رہتی ہے۔ اسی جستجو نے علوم کی نئی پھیلا دی ہے، فنون کی نئی افادیت اور ایجادات کی بانی بنی۔ آرٹ اور ادب کی دنیا بھی اس کلیتہ سے برو نہیں اس لیے۔ فنون و نظم و نثر کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ سہیت بھی بدلتی ہے۔ مواد بھی۔ اردو شاعری پر بھی اس ڈھنگ سے تجدید کا رنگ چڑھا۔ بھاشا، لکھڑی، بونی اور کوئی نئے ڈھانچے کو ترک کر کے وہ فارسی کے ڈھانچے میں ڈھلے۔ آزاد و حالی نے اسے ایک نئی راہ دکھائی، مضموعات میں بھی تبدیلی ہوئی۔ اقبال نے اس حیلہ علمی تفکرات کا اضافہ کیا۔ چلبست نے اسے حب الوطنی سے لانا لیا کیا۔ ایک مقدم آئے چرنا۔ سیاست بھی داخل ہوئی۔ حسرت کی غزل میں جنگی کی نیسبت بھی برابر کی تھی۔ یہ سبھی جوش تھے انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ نظم میں منہدی اور انگریزی بہتوں نے بھی اپنی جھلک دکھائی ترقی پسند نوجوانوں نے اسے قافیہ و ردیف کی باگ ڈور ہاتھ سے چھوڑ کر آدیا اور آزاد نظم و جڑوں سے آئی۔

نوش قدیم شعور از ما چہ حکایت مہر و وفا میرسن کہہ کر اپنے دائرہ بیان کو تنگ کر لیا کرتے تھے۔ نئی نسل کے شعرا نے قطع ادب کی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سرا کہہ کر زندگی کے ہر پہلو کو موضوع سخن بنایا۔ وہ معاش کی حکایات بھی سناتے گئے اور معاشرت کے نکات بھی بیان کر سکتے گئے۔ انھوں نے سیاست، مدن سے بھی بحث کی، بین الاقوامی تعلقات سے بھی نجی اور ذاتی احساسات و جذبات اور شعوری و غیر شعوری کیفیت کو بھی انھوں نے بے باکی سے بے نقاب کیا اور جماعتی میلانات اور رجحانات و اقتصادیات و افادیات کو بھی۔ اردو شاعری نے مزبور و کسان، سرمایہ دار اور پونجی پیکی کی آویزش میں بھی سناٹی دینے لگیں اور فلا میں پرواز کی تحکیم اور سادوں سے آگے کے جہاز کی باتیں بھی۔ غرض ہر طرح کا خیال اندر با احساس، احتساب، کیفیت، مشاہدہ، تجربہ، انکشاف و ایاد ہمارے شاعری کا موضوع بن گیا۔

ظاہر ہے کہ کئی سو سے بڑے ہونے سے سہیت اخبار میں تبدیلیاں ہوئیں، قافیہ و ردیف کی پابندیاں ٹوٹیں، ایمانی، الفاظ کثرت اور وسیع تر معنی دیئے گئے، زبان و محاورے سے حیرت و متہیاں کی گئیں اور ترمیم و ترمیم نئی شاعری سے تقریباً غائب ہونے لگی۔ بعض ترقی پسند شاعری کو پروردہ گنڈہ اور نعرہ کا مترادف بنایا، بعض نے ایسا کلام پیش کیا کہ نظم و نثر میں فرق کو نہ خیال ہو گیا۔ اور بعض نے ایسی زبان اور انداز بیان اختیار کیا کہ وہ نہ خود مفہوم سمجھے اور نہ ناظر سامع ہی کے کچھ سمجھ میں آیا۔

سحر و کے اذیت اور قافیہ و ردیف شعر کے تالی و سم ہیں۔ یہ کلام موزون کی غنائیت کو بڑھاتے ہیں اور اس میں سامع نوازی کا کیف پیدا کرتے ہیں۔ پرانا شاعری کے انہی کھٹکوں نے اپنی نغمگی کی وجہ سے ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ اس کے فخر و شاعر اور اس کی غزلیں سراب و سیکنے والے کے لیے نغمی زندگی اور حقیقت حیات بن گئی تھیں۔ عام زندگی کی تنظیم کا ایک ضروری اور وسیع جز نئی نظمیں اور خاص طور سے آزاد نظمیں صرف کتابوں اور رسالوں میں پڑھی جاسکتی ہیں، لیکن وہ زبان و، چہ چڑھتی ہیں اور نہ دلوں میں اترتی ہیں۔ اسی لئے وہ مجمع معنوں میں قدیم شاعری کی طرح زندگی کا سماجی نہیں بن سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اب تک منہ بھری غروب عام ہیں اور ہر ایک غزل ہی کے شعر گلستا پھر تاپے۔ اور نئی شاعری نے بجائے قبولیت عام حاصل کرنے کے جدت کی لذت بھی کھوئی اور عام پسند ہی ہوئی۔

لیکن ان جدید شاعروں میں فیض کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کا ہر جملے اور ہر گروہ میں احترام ہے۔ ان کے کلام نے قبول کی سند حاصل کر لی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ قدیم و جدید کا سنگم ہے فیض غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ انھوں نے قدیم روایات کا دبا بھی قائم رکھا ہے اور جدید خیالات کو ان کا ہم آہنگ بھی بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی وسعت بیان کو گلستا غزل تک محدود نہیں رکھا ہے۔ انھوں نے موضوع کے لیے سبب کو تلاش کیا ہے بہتیت کی خاطر موضوع کی قطع و برباد نہیں کی ہے۔ ان کی غزلوں میں گیت اور ادراک آواز و ساز کی ہم آہنگی میں کوئی خراش نہیں آئی ہے۔ نہ لے کر ہی ہے اور نہ بے سرائی پیدا ہو ہے۔ گفتار میں کتنی ہی گرمی ہوتی ہے کی تری اور شہیوخی میں بال نہیں پڑا ہے۔ ان کی زبان سے سیاسی نظریات تک شعروندہ کا جامہ پہن کر نکلتے ہیں۔

فیض ایک ایسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس نے افادیت کو شعریت پر ترجیح دینا اپنا وظیفہ بنا لیا ہے اور شعرو اب کو پروپیگنڈہ اور زحمت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا اثر بھی میر کا بھی ہو کر دیا گیا ہے اور اس کا ادب بھی صرف اشتراکیت کا پرچار ہے۔ لیکن کو فیض نے اپنے اصول کے لئے طرح کی قربانیاں دیں، معاش کی غمی برداشت کی قدرت و بند کی بلاؤں کو بار بار اٹھایا بلکہ داسی دھکی بھی چھوڑے۔ مگر اپنے کلام میں بدعتی نہ آنے دیا نہ تو شاعری کو میسر سمع فراتر بننے دیا اور نہ انھوں نے پہلا جام کریں گے کی تمیں کی شاعری کو منہ دیا۔

مواہدہ دیکھا گیا ہے کہ سیاسی شوقین اور عقیدہ بند کے آلام مزاج میں درشتی اور لب و لہجہ میں کتنی پیدا کر دیتے ہیں لیکن فیض کا کلام سارے مصائب خیلنے کے بعد بھی غزل ہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہی شہیوخی، وہی رس، وہی مٹھاس وہی نغمگی وہی موسیقیت، وہی ترنم اور زیرویم کا وہی توازن جو پہلے تھا سو اب بھی ہے۔ ان کے کلام کے تین مجموعے ہیں، نقش فریادی، دست دیا، اور زندان نامہ۔ نقش فریادی سب سے پہلا مجموعہ ہے۔ دست دیا اس کے بعد طبع ہوا اور زندان نامہ سب سے آخر میں۔ نقش فریادی کی غزلیں ہوں یا نظمیں پورا کلام رومانیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ نقش فریادی کا دور فیض کا عہد شباب ہے۔ اس نے ہنسی، تحریں، زینب نظری ہے۔ وہ اس طرح کے شعر بھی کہتے ہیں۔

”پچھول لاکھوں برس نہیں رہتے
و گھڑی اور ہے بہار شباب

یہاں کہ بچہ دل کی سن سنالیں ہم
آنحضرت کے گیت گالیں ہم

اور مجھے دے

ریلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی حسین، آنکھیں
کہ میں ایک بار پھر رنگینوں میں غرق ہو جاؤں

مگر دست مبارک کا مجھ پر اس کا شاہد ہے کہ نظریں زیادہ تنگ
ہے تیسرا دیران زنداں نامہ جو حقیقتاً زنداں میں ہی بیٹھ کر لکھا گیا ہے، یقیناً ترنمِ ترنم اور تیز ترنم انقلاب کا حامل ہے مگر اس میں
بھی فرمودہ غالب کا دامن آٹھ سے نہیں چھوٹتا ہے

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

جھنجھلاہٹ، طعنہ، غیظ و غضب، کدّہ، نفارت اور نفرت جیسے ریک کی شاہیات کا ان کے کلام میں پتہ نہیں پس بیٹھے ہی بیٹھے
بول ہیں کوئین جیسی کڑوایات بھی شکر میں لپٹی ملتی سے ترقی جاتی ہے۔ فیض کے کلام سے ظاہر ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کی
بلبل بھی جھیلی ہے اور وصل وصال کی لذتیں بھی چکھتی ہیں لیکن انھوں نے اپنے کو مجنونِ صحرا اور دواؤں فرماؤ تیشہ بدست نہیں بنے دیا
ہے۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو درختاں ہے حیات
تیرا غم ہے ترغم دہر کا جھگڑا کیا ہے۔

لیکن

ایہ بھی دل کش ہے ترا حسن، ملکر کیا کیجیے
اور جی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سما
راحیتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا

انھوں نے عشق میں جہاں کچھ کھو رہا ہے وہاں کچھ پایا بھی ہے۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھوایا ہے کیا پایا ہے
یزن ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجز کی سیکھی، غریبوں کی حمایت میں کبھی
پاس درحمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
نیر و دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے

اور غالباً اس حد کی صاف گوئی ہو سکتی :-

• تو اگر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم بڑھ ہی جائے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

مگر ان مصرعوں سے پہلے نہ لگانا صحیح نہ ہوگا کہ فیض یا سہیت کے پیام برہیں۔ جی نہیں، فیض نے زندگی کے خاندانوں میں
روکری بھی نہ تو اپنے لب و لہجہ کی شیریں کھوٹی ہے اور نہ اپنی ربانیت اور نہ مستقبل کے درخشندگی میں اپنا تین ہاتھ سے جانے دیا ہے۔

دہ بار بار کہتے ہیں ۹
چند روز اور میری جان، فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہ لیں، تڑپ لیں، رولیں
۔۔۔۔۔ فقط چند ہی روز

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
سب نے پھر در زنداں پہ آکے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبراؤ
یہ ہی تاریکی تو ہے غنا، رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اسے دلایے تا بہ شہر

لب و لہجہ کی نرمی اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب دوسرے فردوں کو سرد دھڑکیاں لگاتے ہوئے دکھاتے ہیں اور زبانیں بند ہیں
علمِ تبدیلی کے باوجود زبان کھولنے اور سچ کو نہ چھپانے کی ترغیب دیتے ہیں ۹

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کو چہ جاننا میں کیا ایسے بھی حالات نہیں ہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شانِ سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آتی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زبان اب تک تیری ہے
بول! یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زبان کی موت سے پہلے
بول! کہ تیغ زندہ ہے اب تک
بول! جو کچھ کہنا ہے کہ لے

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

شاد عارفی

زندانی نامہ ایک نئے تناثر

”شاد عارفی (مرحوم) اپنے رنگ کے منفرد شاعر تھے۔ ’زندانی نامہ‘ کا یہ مطالعہ ان کے ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے جسے ہم جیلے احقر خالص، استاد شعبہ اعداد، جامعہ کراچی کے شکریم کے ساتھ پیش کرنے رہے ہیں۔ شاد عارفی کے تذکرہ مزاج کو سبھی جانتے ہیں، ان کے یہ تصانیف بے بسی، انداز اور نئے لہجے کے ان کی شخصیت کا وہ گوشہ ہے جس سے کہ لوگ واقف ہیں۔“ (درازا)

دلی اور کھنڈ کے شہر کے ایک سب سے پہلی قریبی قریبی کہ وہ اقبال اور پنجاب کے شعراء کو زبان کی کسلی پرکھنے کی نقل مندی فرماتے رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ آج بھی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ فیض احمد فیض کے ادبی کارناموں پر بھی اسی نقطہ نظر سے تنقید کی جا رہی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے۔ ”ان حضرات میں کچھ ترقی پسند ناقد بھی شامل ہیں، کہ فیض احمد فیض کے پہلے دو مجھوتے ”لغزش فریادی“ اور ”دستِ ہوا“ اپنے مواد اور سببیت کے اعتبار سے جن ملحدوں کو چھوچکے ہیں۔ ”زندانی نامہ“ میں ایسی کوئی آواز اور علوئے خیال نہیں پائی جاتی جس سے یہ توقع کی جائے کہ ”زندانی نامہ“ کا شاعر تھک نہیں گیا ہے۔ اور نہ اس کے ہاں افکار و احساسات میں کوئی غلط طرہ پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی اپنے حالیہ مضمون میں جو نقوش ماہ رواں میں شائع ہوئے دے دیے غفلتوں میں یہی بات کہی ہے کہ فیض احمد فیض کا رجحان محض اپنے رستے سے بہک کر کسی نامعلوم منزل کی طرف جارہا ہے۔ جب کہ شاعر کے لئے اس کی منزل روشن اور واضح ہونی چاہئے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹر محمد حسن ہوں یا عبادت بریلوی۔ حتیٰ کہ احتشام صاحب بھی اپنی تنقیدوں میں کسی ترقی پسند رجحان کی نشان دہی نہیں کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی بیشتر تنقیدیں آپس میں یا تنقیز کرتی ہیں یا تاخیر۔ ہر کچھ کو ہی ختمیل وہی مغربی مقررین کے نام وہی نئی نئی عبارت اور وہی الفاظ کی ششست، اگر کچھ ماہ الامتیا ز ہوتا بھی ہے تو عبارت کے الٹ پھیرے ہوئے معنی معنوں سے نہیں۔ جو تنقید تیرے رہتی ہے وہ سودا کے لئے بھی اتنی مناسب ہو سکتی ہے۔ جلی اور غالب پر یہ کچھ لکھے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک تیرے دہریہ زخمی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان حالات میں ان حضرات کا یہ کہنا کہ فیض احمد فیض کا ”زندانی نامہ“ اتنا بلند

ہیں جتنا کہ اس کے دوسرے مجموعے - میرا ذاتی خیال ہے ، اور ممکن ہے کہ میرے اس ذاتی خیال کے ہنر و سلیکوں کی تعداد میں ہوں کہ " زنداں نامہ " سے لکھے جانے کے بعد میں فیض احمد فیض جس ذہنی کشاکش اور کش مکش سے گزرا ہے - اس کی عکاسی کے لئے زنداں نامہ کی تدوین لازمی تھی - اب آپ اس شخص کا تصور کریں جس کے سامنے زندگی اور موت کا سوال نئے نئے رخ اور چالیں بدل رہا ہو اور وہ شخص شاعر بھی ہو - اگر یوں کہہ اٹھے

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں

دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

منبط و محال کا کتنا آہنی آئینہ دار ہے - یہی نہیں بلکہ اسی غزل میں وہ آگے بڑھ کر اپنے کبھی حالات کی ترجمانی اس طرح

کر رہا ہے

کئے شبیب ، بھر کام اور بہت

ہم نے فکرِ دل تنہا نہ کی

" زنداں نامہ " کی پہلی غزل کے یہ دو شعر اگر " زنداں نامہ " کا دیباچہ تصور کر لئے جائیں تو وہ یوں کافر ہوگا جو فیض احمد فیض کی

عظمتِ شہری سے انکار کرے - کیونکہ یہ میرا " زنداں نامہ " پر ایک سرسری مطالعہ ہے - اس لئے میں " زنداں نامہ " کی غزلوں کے چند شعر

چُن کر یہ ثابت کروں گا کہ فیض احمد فیض کا یہ مجموعہ ان کے پہلے دو مجموعوں سے کسی طرح کم وزن اور کم عیار نہیں ہے

شع نظرِ خیال کے انجم ، جگر کے دارغ

بھتے جراثیم تری محفل سے آئے ہیں

ہو سکتا ہے کہ انرمادب سمجھتی یا اور کوئی صاحبِ زبان اس میں زبان کی کوئی کوتاہی تلاش کر لے لیکن میں کہتا ہوں ہمیت

اور مواد کے اعتبار سے " زنداں نامہ " کی دوسری غزل کا یہ دوسرا غمزہ اپنے اندر ایک داستانِ ہوش ربا چھپائے ہوئے ہے - یہاں ہوش ربا

کا مطلب ایسوں کی تنگ نہیں ہے - بلکہ وہ خفی تصور ہے جو ہمارے دین میں ہر شخص کو کھوڑا رہا ہے -

اب تیری غزل کا مطلع یہ ہے

سم کی رسیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجن سے پہلے

منرا خطائے نظر سے پہلے ، عتابِ جرمِ سخن سے پہلے

کیا قانونِ بندہ اور عدمِ قاذر انصاف و عدل کی عکاسی اس سے بہتر صورت میں کی جاسکتی ہے ؟ ماحول کا وہ کون سا

گوشہ جس پر یہ شعر روشنی نہیں ڈالتا - میں وقتی سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیض احمد فیض کے " زنداں نامہ " میں بہت یہ مطلع ہی

شرع کر دیا جاتا تو زنداں نامہ کی قدر و قیمت پر کوئی حرف نہیں آتا ، اور پھر اسی مسئلہ کا یہ دوسرا شعر تو سونے پر شہباز کے کا کا مکہ بنا

ہے - سنئے -

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پردہ پہلی اجارہ داری

گرفتہ کیے تھے ہی کیے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

اس غزل کا آخری شعر بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے

ادھر قفا نے ہیں مصلحت کے ادھر قفا ہمارے دردِ دل ہے

ذباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیرِ ذکرِ طین سے پہلے

اتنا کچھ کہنے کے بعد، زندہاں نامہ، کا ایک ہلکا سا انتخاب پیش کرتا ہوں، تاکہ ناظرین میری تائید میں، زندہاں نامہ، کو وہی درجہ دیں جو میری نظریں ہے۔

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اُبھئی

جب ترا غم جگا لیا، رات چل چل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم

کہتے ہیں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

آنرِ شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے

مہ گئی کب جسکے صبح سب کدھر نہیں گئی

یہاں ایک بات اور عرض کر دوں کہ میں فی الحال، زندہاں نامہ، کی مشنوں پر روشنی ڈال رہا ہوں، نظروں پر تبصرہ کے لئے کبھی فصاحت کا منتظر ہوں۔ اگر ماحول نے اجازت دی تو اس پیراگ سے بات ہوگی۔ اب پھر غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

بات بس سے نہیں چلی ہے

دل کی حالت سرسبز چل ہے

لاکھ معینام ہو گئے ہیں

جب صبا ایک پل چلی ہے

یا یونہی، تجھ رہی ہیں شمعیں

یا شب، ہجرِ مل چلی ہے

اشکِ خونتاب ہو چلے ہیں

عشم کی رنگت بدل چلی ہے

یہ چاروں شعر جس زاویہ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہیں، کو آپ کے اندر وہاں پہنچ کر بند کرو نظر کی عادت ہے تو غالباً آپ میرے ہمراہ ہو کر فیض کو کھلے دل سے داد دیں گے۔ ایک غزل کے یہ دو شعر بھی دیکھئے۔

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی

کو چہ سہ یار مہرباں ہے وہی

چاند تارے ادھر ہیں آتے

دورِ زنداں میں آسماں ہے وہی

بچے کرول میں بیٹھ کر نعتِ دُکھاری کرتے والے ناکثر ان اشعار کی قدر و قیمت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان ناکثرین کی مثلِ جوش کے اُن اشعار سے ملتی ہے جو نئے عیش و آرام کی زندگی گزارتے ہوئے غریب اور محنت کش طبقہ سے متعلق کہے ہیں۔ فیض احمد فیض کی یہ غزل بھی

ان تمام مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جو اُن کے ماحول سے ہم کنار رہے ہیں۔ مطلع ہے کہ

دل نا، امید تو نہیں نا کام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ آیا م ہی تو ہے

سبحان اللہ۔ اس شعر میں جو یہ سائنٹلی اور چیلپن ملتا ہے، اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ کیا ایسا شاعر جو اس قسم کے بھرپور شعر کہتا ہو۔ یا جس مجموعے میں اس قسم کے مکمل اشعار موجود ہوں اُن پر یہ تنقید نگار ڈاکٹر نسیم حکیم نہ جانے کس اعتبار سے اس کہنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے کہ یہ مجموعہ فیض احمد فیض کے دوسرے مجموعوں کے برعکس انفرادی کیفیت کا حامل ہے۔

کچھ ممتبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ گوشوں کے تھے کی اب جام میں کم تر جاتی ہے
ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے مگر کیا کیجے
ہر رہ جواد مہر کو جاتی ہے مقل سے گزر کر جاتی ہے

اس غزل کا آخری اور اوجاب شعر اس طرح ہے کہ

ہم اہل نفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبحِ وطن
یا دوں سے مسطر آتی ہے، شکوں سے منور جاتی ہے

ان اشعار کی پڑبستی پر مقدمہ شعر و شاعری عالی قربان کیا جاسکتا ہے۔ میں چونکہ مضمون، ہم کر رہا ہوں اس لئے دو تین شعر اور سنئے اور اجازت دیجئے کہ

ایسے نادان بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
نا سمو، پسند کرو، راہ گنزد تو دیکھو
وہ تو وہ ہے نہیں ہو جائے گی الفت مجھے سے
ایک نظر مٹ مرا محبوبِ نظر تو دیکھو
وہ جواب چاکہ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو، کبھی اُن کا جسگر تو دیکھو

ان اشعار کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ ادب میں جمو ہے، اغلاط ہے، اور ترقی پسند مصنفین تھک کر بیٹھے جا رہے ہیں

تجاذیب نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ —

”فیض کا ہر شعر اُنے بلند بیوت کو چھو رہا ہے

جس کے اُجرت ترقی پسند ادب کو ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر معوذ حسین چنان

نار حیرتِ دورِ نکستے

مقام فیض کوئی راہ میں بہا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے وار چلے

فیض ہماری محفلِ شہر میں "اعترافِ شکست" اور "ارکابِ گناہ" کی رومانی معذرت کے ساتھ داخل ہوا ہے۔ اس دور میں ان کا تمام تر شائع "کھوئی ہوئی یاد" "انتظارِ بے آغاز" "منون نامہ ملی امیر" "دکھتا ہوا دل" "زیادہ کئے گھر لوں" "مہاجرِ جوانی کے داغ دارِ بوس" پر مشتمل تھی۔ یہ فیضِ الوہیت بابیکِ شاعری تھی لیکن اس میں ہی لذت کی بجائے ایک تقدس ہے۔ وہ تقدس جو جسم کے نرم و گرم احساس اور اس کی جمالیاتی حرمت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جس کا مکمل "سروِ شبانہ" کے اس مصرع میں ہوتا ہے۔

آئندہ خواب، تراروئے حسیں

اس اور محصور! یہ دو لفظ تو جوان فیض کے دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اس خود اور محصور محبوب۔ اسی اور محصوریت سے فیض نے حسن کا وہ خالص رومانی تصور پیدا کیا ہے جو میک وقت اس دنیا کا بھی ہے اور اس دنیا کا بھی جو موت کا محبوبِ نظر ہے۔ فاصلہ، دوری اور انتظار اس کا خیمہ ہے۔ یہ ملازم اس وقت اور سین دکھائی دیتا ہے۔ جب فیض کسی ارضی ہیکل کی کو متصور کرتے ہیں اور دیکھتے ہوئے "احمریں آنکھوں مر مر میں ہانہوں دراز قد اور گداز جسم کے افسانے شبِ برباب میں جیتے ہیں ان افسانوں کا پس منظر وہ بام دور، یہ گزرا اور اجڑا ہیں جو کبھی بھی منظرِ فطرت کے طور پر اس دور کے شاعری میں جھلک اٹھتے ہیں۔

رومان کی اس سرسبز میں انجامِ محبت کی نشان دہی تماؤز کے ان مزاروں سے کی جاتی ہے جن کی خراشیں شاعر کے دل میں محفوظ ہیں لیکن جب یادوں کے ان مقبروں سے بھی ناصبور نکلیں اور غم کی باہیں جھانکتی اور ملائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تو شاعر پلوں چھوٹ پڑتا ہے۔

وہ ناصبور نکلیں، وہ منتظر راہیں

وہ پلاس ضبط سے دلیں دلی ہوئی ہیں

وہ انتظار کی باتیں طویل و تیرہ و تار

وہ نیم خواب شبستان، وہ غمگینی بانہیں

کہانیاں تھیں کہیں کھو گئی ہیں، میرے اندر

فیض نے جب ان کہانیوں کو کھویا تو اپنے آپ کو پایا، خود کو اس طرح پایا کہ بھرتے بازار میں کھڑے تھے جہاں خاک میں
تھڑے ہوئے اور خون میں مہلائے ہوئے جسم جا بجا بک رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے اوب میں نئی سماجی اقدار
ڈھلنا شروع ہو گئی تھیں، زندگی کے نئے تقاضوں کی قربانی ہونے لگی تھی۔ اور بعض سیاسی تحریکیں ادب میں پھیل رہی تھیں۔
فیض نے بھی محسوس کیا:۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیسے

یعنی زمانے کے دھجھک کی طرف!

”فیض سے پہلی سی محبت میری محبوبہ نہ مانگ“ سے فیض کے یہاں دو قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ رومان اور افسانہ
جہابیاتی اقدار کے علاوہ زندگی کی دوسری قدریں بھی ان کے یہاں ابھرنے لگی ہیں۔ دوسری یہ کہ حقیقت پسندی کے نقطہ نظر کی وجہ
سے رنج محبوب کے یہاں افسانہ کی مثالیت ختم ہونے لگتی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان تبدیلیوں اور تجدیدِ اُطیام کا ذکر کریں، فیض
کی ابتدائی نظموں کے بارے میں یہ گہرا ضروری معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنی نگاہ اور رد کی رومانی شاعری کی گہری جھاپ ہے۔ ان
کے تجمل کوئی تشبیہیں اور اشعار سے تراشے کاچے نہیں۔ جذبہ اور تخیل کا حسین توازن ہے جو کہیں کہیں پر محاورے اور
زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بگڑ چکا ہے۔ شاعر مبتلا ہے وادعات بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ دلوں کے درمیان ایک
جہابیاتی بے لعلتی ہے جس سے انوش جہیل تر ہو گئے ہیں۔ اجنبی و بنا ہوا بکاہ اور انتظار کے رومانی تصورات اور گہرا جسم وراز
قد اور طویل راتوں کی خوابیدہ راتوں کے افسانوں نے اس دور کی شاعری کو چاندنی کی سی چمک بخشی ہے اور آخر میں لوہا
اور کھ کے بار بار آنے والے سادہ اور گہرے لفظ ہیں جن میں درد کی کسک اور گڑھی دھٹکاس کا لطف ہے۔

یہ سادہ، دکھ سے بھرا، جملہ کا پرستار، مدھم مدھم جب غم دہر کے جھکڑے میں پڑتا ہے تو محبوب کا رومانی تصور
بھی بدل جاتا ہے۔ نئی سماجی اقدار کا شعور یک لخت اور پہلی بار جب ہمارے سامنے یہ نقشہ لاتا ہے کہ

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

خاک میں تھڑے ہوئے خون میں مہلائے ہوئے

جسم تلے ہوئے اعراض کے خوردوں سے

پہ پہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

تو یہاں جہابیاتی احساس کو ٹھیس سی لگتی ہے۔ اگر یہ اشعار جوش کے غام سے ٹپکتے تو دھچکا نہ لگا کیونکہ ان کی ابتدا تو
اور جراتوں کے ہم عادی رہے ہیں۔ لیکن فیض کے یہاں غانہ و ذرا اور دنیا سے جسم کے ساتھ خون اور پیپ کا تصور بہت
سے شاعر اور نقاد چنچاٹھے! وہ تو خود ہی فیض نے جب نظم کے خاتمہ پر اس کا ازالہ اس طرح کیا کہ:۔
اب بھی دلکش ہے تو افسانہ گر کیا کیسے

تو گورہ تسکن ملی۔

لیکن ہمیں سے فیض کی ایک ریختی شاعری میں دوسرے رنگ کا تار مٹا ہے۔ اس نئے شعور نے فیض کا تصور محبت ہی بلجیا تو گریز بھی ہو جائے

دنیا کے غم یوں ہی رہیں گے

جو کہ فیض نے جاہلیاتی قدر کو افادیت کے سانچے میں ڈھالنا ابھی شروع ہی کیا تھا اس لئے وہ ٹیکنیک میں اس عمل کو مسلسل استعمال کرتے ہیں۔ وہ جن کے پس منظر میں قاری کے ذہن کو بے تکے سماجی استعارات سے دوپچکا پنچا رہے ہیں۔ اس کی بڑی اچھی مثال ان کی نظم ”رفیق“ سے ہے جس کے ابتدائی حصے میں ساحر آنکھوں اور ان کی بے سود عبادت کا ذکر ہے۔ اس طرقات کا ذکر ہے جو ان کے اور رفیق کے درمیان مشترک ہے۔ اور اس کے بعد اس مشترک سبق کا ذکر ہے جس کے سمجھنے کا صرف رفیق اہل ہے، نظم اپنے مضحکہ خیز منتہا کو اس وقت پہنچتی ہے جب شاعر اس شعر پر آتا ہے:

یا کوئی تو نہ کا پڑھتا ہوا سبیلاب لے

خاتمہ مستوں کو ڈبلورنے کے لئے آتا ہے

یہ ہے شاعر کا سوچا ہوا افادہ نگاہ! ساحر آنکھوں سے تو نہ کہ سبیلاب تک اس قسم کے نغز ان کے کلام میں اور بھی ہیں مثلاً اسی لئے ”مست صبا“ میں جا کر فیض نے اس ٹیکنیک کو باؤتیک کر دیا ہے، اس طرح گھلا لایا ہے کہ آتش گل اور آج کا فرق ہی مٹا دیا ہے اس قسم کی ایک اچھی مثال ”تلفیق فریادی“ ہے جس میں موضوع سخن کے اندر مل جاتی ہے جس میں جذبہ کا سفر ”مغن“ دلا لکی دھج سے لے کر آؤم و جاؤم کے تذکرے تک ہے۔ لیکن جس میں سخن کی سی کیفیت نہیں ملتی ”میرے ہدم“ میرے دوست میں یہی جذبہ فیض کے پہنچ کی نرمی اور شلوں رفاقت کی وجہ سے بے نور اور رطلے ہوئے دماغوں کو روشنی بخشتا ہے۔

فیض کی اس زمانہ کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں وہ ”میری جان“ کے سہارے کے بغیر ”مستوان جسم“ تک اٹھتے ہیں میری مراد ان کی نظم ”بول کہ لبازادہ میں تیرے سے ہے جو منکوم و مجبور قوم کے لئے نئے استعاروں میں قلندرانہ لکھ کا حکم رکھتی ہے۔ بول کی لکھاریں۔ بہاری تہذیب کی صدیوں کی حق پرستی اور حق گوئی کی آواز مضمر ہے۔ اس قسم کی ایک اور اہم نظم ”سیاسی ایڈس“ کے نام سے جس میں ملت کا استعارہ اور سیاسی حقائق اس طرح گھل گئے ہیں کہ سیاسی شاعری کا کھل کھراچ بالکل غائب ہو گیا ہے۔ اس میں نور اور صداقت کے اٹھانے کی ظلمت پر مسلسل بلخار معلوم ہوتی ہے۔

فیض کی مشہور نظم ”منہائی“ کو ہم فیض کے سیاسی شعور سے بلا واسطہ منسلک کرنے کے حق میں نہیں ”سیاسی ایڈس“ کے نام میں رات کا استعارہ مسلسل سیاسی پس منظر میں استعمال کیا گیا ہے لیکن ”منہائی“ میں تانوں کے غبار کا جھڑا اور اواندلی میں خوابیدہ چراغوں کا لکھڑانا اس قدر عام علامت ہیں کہ ان کے معنی کو محدود کرنا مستحکم ہوگا۔ یہ انتظار ہے جو زندگی کے ہر گام پر محو اور ہر منزل پر آتا ہے اور اس میں شعور و جدان کے لئے ان گنت تہیں ہیں۔

پچھلی جنگ کے خاتمے سے فیض کے یہاں ’دول بیتاب‘ کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اس زمانے کی نظموں میں وہ غلام تیرگی اور ملت کے الفاظ اور استعاروں سے اس دور کی اس سیاسی اور سماجی فضا کو مرتب کرتے ہیں جس کے لئے شاعر شمع شمع کی ضرورت ہے ظلمت اور تیرگی کو وہ اپنے نور لہجے سے کم کرتے ہیں۔ اور آدھار کے منتظر ہیں جس کے لئے فیض کو اس

صبح لا منتظار ہا اور جب وہ آئی۔ تو اس طرح مہ

یہ داغ داغ ابدالیہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو سیکر
چلتے تھے یا رکھ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

لیکن مہ

ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ دول کی گھٹری نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

صبح آنی پر یہ ایک ایسے شاعر کا رد عمل ہے جسے پارٹی لائن سے نیا دھاپنی بعیرت پر اعتماد تھا۔ اس لئے جہاں بہت سے نرپ آزاد کا گئے فیض کی نظر اجالے کے داغوں پر رہی۔ اور اردو شاعروں کی بھاری اکثریت نے فیض کی بعیرت کی تائید کی۔ اور آخر اہل سیاست نے بھی اس کی صداقت پر گواہی دی۔

فیض کی نظم ”صبح آنی“ کے داخلی اور رمزہ انداز پر بھی اعتراض کئے گئے ہیں۔ یہ اعتراض ان مخصوص نقطہ نظر رکھنے والوں نے کئے ہیں۔ جو بلا واسطہ شاعری کے فائل ہیں۔ اور جن کی شاعری میں سرخ ستارہ، سرخ پرچم اور سرخ ہاتھ اسی طرح شعریت سے عادی استعارے بن چکے ہیں جس طرح کھنوی شاعری میں دو چٹا اور چوٹی، ببل اور سیاہاں پہرے کہندے جاتے ہو گنگ شاعری نہ تو خطابت ہوتی ہے اور نہ سیاسی خطبہ۔ یہ بارود، توپ، ٹینک اور ایٹم بم سب کی متعل ہو سکتی ہے۔ لیکن برہ رنگ میں برہشم کے کیڑے کی سی داخلی کرکھائی لانی طو پر ہوئی چاہیے۔ اس کے دوسرے کسی مخصوص فصلا اور پہا پر بند نہیں ہوتے۔ یہ فصلاے بچن ہر سچ کھل سکتے ہیں اور پر شور و تلاطم ہر بھی، لیکن ہر صورت میں فنی ہم پرچ سے شاعر کو منفرد نہیں۔ اگر کچھ لوگ برہم خود اپنی وقتی شاعری پر مطمئن ہو جاتے ہیں تو یہ ان کا اپنا فعل ہے، لیکن فیض ہر تاریکی اپنی شخصیت، مذہن اور مزاج کے مخصوص پرچ و خیمت گزارتے ہیں۔ اور گزارنے کے عمل میں وہ اسے نئی نہیں حسن و جمال اور اپنی وہ البصیرت اور برہ و طا کرتے ہیں جو جدید شاعری میں ان کا اپنا ہے۔

یہ ”نہج“ ”لوح و قلم“ اور ”دوا و ازیں“ میں قدرے تیز ہو جاتا ہے۔ جہاں زندگی نظر سے زیادہ خون فی حرارت، دل کی صدا اور لظن کی طاقت پر زور پایا جاتا ہے۔ کئے کے فوراً بعد لوح و قلم اور اس کے ناتے سے سماجی تحریکات میں ادیب کے مقام کا احساس فیض کے یہاں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہی زمانہ ہے جب لوح و قلم کی متاع چین لی جاتی ہے اور زبان پر ہر پس لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔ تو ان کے یہاں طوق و دوار، معتقل اور سلاسل کی علامتیں ابھرتی ہیں۔

یہاں سے شاعر نے اوکھل میں سرسے دیا۔ یعنی وہ ہمہ تن مردانہ حرکی صفت میں آگیا۔ اور اب فیض کے ذہن کی تربیت نفس و زمان کے استعاروں میں ہو رہی ہے۔ ان کی زندان کی شاعری کے بارے میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ

وہ غالب و سوسا، یعنی قدیم شعری سر بلے کے ساتھ کافی وقت گزارنے لگے ہیں۔ دوسری یہ کہ نوابی رنج محبوب کا غم، اور یاد کے رنج، بری طرح پھلجھرنے لگے ہیں۔ بہت کے اعتبار سے یہ ان کا غزل گوئی کا دور ہے اور اس بہت کا کثرت سے اظہار کرنا اسانڈہ قدیم کے مطالعے اور حدیثِ یار کے عنوان کھنکھرنے کے لئے ضروری بھی تھا۔ زندان میں فیض کے لطف و لب کی بخیر گری تو نہ ہو سکی، لیکن مقتل اور خون کی حرارت کا وہ ابال جو دیو زندان سے باہر نہ جوتا تھا اب کم ہو گیا ہے۔ ایک اور اہم علامت جس کا ماخذ اسانڈہ قدیم کا کلام ہے اور جس کی ضرورت اس وقت مجبوس فیض کو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے، صبا کا استعمال ہے جس کے ہاتھ صحن چین اور سن دونوں کو سلام بھیجے جا رہے ہیں۔ قید کی تنہائی میں سایہ رخسار و لب کا تصور اور گہرا ہو گیا ہے اور روزِ زندان کی اہمیت اس طرح بڑھ گئی ہے۔

بھاجو روزِ زندان تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک لٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سمجھ کرے سنت پر بھر گئی ہوگی

زندانی میں حسن و حیات کی دورنگی فیض کے یہاں پھر شدت سے ابھری ہے اور شاید ہی کوئی اچھی نظم ہو جہاں غم جہاں کے وقت وہ بے حساب یاد آئے ہوں۔ یہ تاریخ پر درو رنگ غزلوں میں بھی جلوہ گر ہے۔ لیکن غزلوں میں اس دور کے قدیم شعری ادب کے مطالعے کی وجہ سے ان کے یہاں غزل کی محدود زبان اور مخصوص علامتیں نمایاں ہیں شیخ اور ناصح، ہجر اور فراق ستم اور کرم، دیر اور حرم، صبا اور صنم، چمن، تفس، زندان، گلچیں اور بلبل۔ یہ الفاظ فیض نے غزلوں میں بار بار استعمال کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ مثلاً تفس، صبا، ہجر اور فراق ان کے حسب حال ہیں لیکن لبض مثلاً شیخ اور ناصح، بلبل و گلچیں بالکل روایتی طور پر آئے ہیں اور ان سے مرتب دار و رات میں کوئی نیا اشارہ نہیں ملتا۔

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے تو بے ابھی نہیں کی ہے
کیسے مائیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دین کی ہے

اردو غزل، عرصہ ہوا ان سے آگے بھل چکی ہے، اور انہیں دوبارہ زندہ کرنے میں نہ تو فیض کو اپنے اسلوب غزل میں کوئی مدد ملی ہے اور نہ ان سے نئے اشاروں اور نئی تعلیم کا پتہ چلتا ہے۔ فیض کے ماحول سے مربوط کر کے آگے ان کے مفہوم میں کوئی توسیع کر سکتا ہوں تو میری کہ پاکستان کے مخصوص مذہبی ماحول کا شاید فیض کے یہاں یہ نہ تو عمل مرتب ہو گیا ہے۔

یہ بھی فیض کے مذہبی ارتقا کی داستان یا ارتقا مسلسل حال سے افادہ کی طرف ہو رہا ہے۔ میں مقصد کے مقابلے میں افادہ کی نیل و وسیع اصطلاح اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ آگے چل کر مجھے شاعر اور مبلغ شاعر کا فرق بتانا ہے، ترقی پسند شاعری کے ان دو گروہوں کا ذکر کرنا ہے جن میں سے ایک کی قیادت فیض کر رہے ہیں۔ جو شعر میں افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں اور خطابت میں غور کرتے ہیں۔ اور فنی خم و پیچ کو خوش تبلیغ پر قربان کر دیتے ہیں۔ ان کے فنی خم و پیچ اور بھانوات کے پیچے فیض کی وہ

ستھری نظر ہے جہاں جمالیات اور افادیت کی "نظروں کا تناقض" دو درجہ جانا ہے کیونکہ فیض کے خیال میں "معن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں۔ افادی فعل بھی ہے"۔ اور "یہ افادیت محض ایسی تحریروں کا اجارہ نہیں جن میں کسی دوسرے خاص سیاسی یا اقتصادی مسائل کا براہ راست تجزیہ کیا گیا ہو"۔ ان کی یہ رائے بھی بساط شاعری کے تازہ داروں کے لئے قابل غور ہے کہ: "محض ضرور و گمان، امن یا الیاسی کوئی دوسرا عنایت یا مضمون دوسری خوبیوں کی غیر موجودگی میں کسی تحریر کی ترقی پسندی کا دھڑکا نہیں ہو سکتا۔"

فیض نے اپنے ان خفیدی خیالات کا اپنی شاعری میں عملی ثبوت دے کر ترقی پسند ادب کی انتہا پسندی کو کافی حد تک معطل کیا۔ اس کے بدلے میں یہ اعتراضات بھی سچے کہ ان کی شاعری میں شمشیر کی صفائی نہیں جس کی سیاست کے لقیوں کو ضرورت ہوتی ہے۔

اس طرح فیض اور ان کے معرّفین کا اختلاف فلسفہٴ خیالات کی سطح پر نہیں بلکہ جمالیات کی سطح پر ہے اور اس لئے دلوں کا ثبات کا ایک ہی بنیادی تصور رکھتے ہوئے ادب اور سیاست کے رشتوں کی اہمیت کو مانتے ہوئے اپنے طریق شعوریں مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایک بیشتر وقتی موضوعات پر خطیبانہ یا صحافتی انداز میں طویل نظمیں لکھنے کا عادی ہے اور دوسرا اختصار و سباج کے ساتھ سیاسی واقعات پر نہیں بلکہ ان سے مرتب شدہ تاثرات، فنی جمابات کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ ان جمابات فن کے پیچھے فیض کی مکمل شخصیت ہوتی ہے جو متوازی ہے، سبیل ہے اور زندگی کے نرم و گرم اور عزیز و کفریہ فیض محض سیاسی ان ان نہیں۔ ان کا اپنا ایک جمالیاتی وجدان ہے۔ ایک ستھری نظر ہے۔ جو اس عہد کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت ممکن ہے ان کے متبادل اور دم انداز سے سیاسی تحریکوں کو اس قدر مدد دے جتنی کہ اردو کے خطیب شاعروں کی شعلہ افشانیوں سے، لیکن اس عہد کے جمالیاتی وجدان میں ان کی شاعری سے وہ غیر معمولی تبدیلیاں ضرور پیدا ہوں گی جو تہذیبی نقطہ نظر سے زیادہ اہم ہیں۔ کسی عہد کے جمالیاتی تصور کو متاثر کرنے والے شاعر کا کارنامہ سینکڑوں مبلغ شاعروں کے کارناموں پر بھاری ہوتا ہے۔ اس لئے فیض ترقی پسند ادب کے مبلغ شاعروں کے خیال میں کمزور انقلابی ہیں ابوولیس کے درد کے ساتھ "فراق" رخ محبوب کے غم" لے کر چلتے ہیں۔ لیکن کرنے والے مجاہدین کا یہ شیوہ نہیں ہوتا۔ یہ سبیل تندہ کا مقام ہے جہاں جوئے لغز خواں سے بھلا کیا کام چلے گا۔ میں یہاں ادب اور سیاست کے باہمی رشتوں کی طولانی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ چند الفاظ میں صرف اس قدر وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ سیاست کی طرح محبوب بھی اجتماعی زندگی کا ایک مخصوص عمل ہے اور اس کے ادب کسی سیاسی حکم کے خط مستقیم میں نہیں ڈھلے گا۔ اس لئے سیاسی نقطہ نظر سے جو فیض کی کمزوری ہے فنی اور جمالیاتی لحاظ سے وہی ان کی منفرد خصوصیت ہے۔ اور اس میں ان کے ساتھ بہت سے دوسرے بھی شریک ہیں۔ اور ان کا اثر ترقی پسند شاعری پر بھی رہا ہے۔

ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر فیض نے صرف ایک نظم "ایرانی طلباء کے کام" سے لکھی ہے جو بہت زیادہ لائقِ تحسین نہیں۔ درد ان کا موضوع سخن اور ان کی خوش نوائی کا مقام ہنگامی واقعات سے زیادہ اور بلند مجموعی تاثرات و واقعات تک رہتا ہے جس میں وہ عکسِ رخ یا روئے لائے وطن و دنوں کے درد اور غم کو اجمال اور سنوار کر تاریخ و دورنگ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

لیکن فیضِ اچھا اس دورنگی شاعری میں جوش کی طرح شعلہ و شبنم یا سیف و سبوح خالوں میں بیٹ کر کہا سے سامنے نہیں آتے۔ جوش کی طرح ان کی دو شخصیات بھی نہیں۔ ان کا شمار ان ادراکِ تاریخِ رودرنگ کو بیٹ کر اپنے فن میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ صداقت، حسن اور انقلاب کی قدریں ایک دوسرے سے ملتے جاتی ہیں۔ فیض کا تنقیدی شعور بھی ان کی اس شاعری عمل کی گواہی دیتا ہے جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ "ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب کا عقیدہ گمراہ کن ہے۔" اس لئے فیض کے کلام میں ایک داخلی وحدت ملتی ہے جو جوتی پرستی اور حسن پرستی دونوں سے عبارت ہے۔ ان کی حق پرستی انہیں "آدم و حوا کی اولاد" سے قریب تر رکھتی ہے۔ اور ان کی حسن پرستی فنی آداب کے احترام اور اس متوازن لطیف اور معتدل انداز کی طرف انہیں کھینچتی ہے جو کج معرکتہ ان کا ہے اور جس کی وجہ سے ان کی تخلیق میں شاعری، فن، نثر و لفظ اور سہ فرخی حسن پائی جاتی ہے۔ اسی شاعری نظر کی بدولت ان کے یہاں ادب و نثر کی انسانی کماتیں اور نرم و گرم احساس کی صداقتیں ملتی ہیں جہاں ہجر سایہ زار و لب کا تصور بھی ہے۔ اور جسم کی مایوس پکار بھی!

اس طرح فیض کی بنیادی اور تہذیبی سطح میں قدرِ راسخ اور نہ دھن جاتی ہے اس کی مثال کسی دوسرے نوجوان شاعر کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔ ان کے کلام سے مستقبل کا نفاذ اس عہد کی تاریخ کے اندیش بہت ممکن ہے کہ نہ ابھار سکے لیکن ان میں ایک سناس، نازک خیال اور نرم گو شاعر کے دل کی دھڑکن منور لے گی جو عمل یا عیت کے لحاظ سے کسی سے پیچھے نہیں رہا جس نے لوح و قلم کی پرورش اپنا شعار بنایا اور جب وہ جہنم لئے گئے تو جہنم والے ان انگلیں کو گریہ لکھا۔

یہ غم جو اس رات لئے دیا ہے

یہ غم سحر کا لیتا، بنا ہے

یقین جو غم سے کریم تر ہے

سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیض کے نوپن ارتقا سے بحث کرتے وقت میں یہاں ان کی فنی وحدت طرزِ لہجوں کی طرف اشارہ کرتا رہا ہوں۔ یہ فنی اختراع عام طور سے انہی شاعروں سے سرزد ہوتی ہے جو ایک سے زیادہ زبانوں کے شاعری ادب پر عبور رکھتے ہوں۔ جدید شاعری میں فراق کے اسلوب کا سارا اچھوتا پن ان کی اس واقفیت پر مبنی ہے جو انہیں ہندی شعر و ادب سے ہے فیض کا تمام تر اندازِ ادبی عمل اس واقفیت اور شغف پر مبنی ہے جو انہیں انگریزی شاعری سے ہے۔ دوسری قسم کی واقفیت تو انگریزی شاعری سے ہم سب کو ہوتی ہے لیکن اس سے اس حد تک متاثر ہونا کہ اپنے شاعرانہ ادراک کا ایک جزو بنایا جائے بہت کم لوگوں کے بس کی بات ہے۔ فیض کی شاعری میں اس قسم کے اثرات جا بجا نمایاں ہیں۔ یہ اثرات تشبیہات و استعارات تک محدود نہیں بلکہ نظموں میں بندوں کی تربیت، اقوال کی گڑی بندشوں سے ملنے والی آزادی یا ہم وزن مصرعوں کا انگریزی شاعری کے انداز میں چھوٹا بڑا لکھنا (مثلاً ان کی نظم "بول" دیکھئے) ان تمام جہتوں کا ماخذ انگریزی شاعری ہے فیض نے اپنی بہت کم نظموں میں اردو نظم کی مروجہ ہیئتوں کو جو ان کا تو استعمال کیا ہے کہیں قافیہ بدل کر کہیں تشفیہ مصرع کر کے کہیں تلافی کے آہنگ کی کمی کو آلودہ خواب و نیم و تشبیہات سے پورا کر کے۔ انہوں نے روایت پسندوں کے مذاقِ شعری پر نمرائش کا طرح ضرب نہیں لگائی اس لئے یہ انوں نے بھی ذرا مزہ لاکر یہ لڑوا لکھوٹا لیا۔

تیکنیک کے لحاظ سے فیض کا ایک اور قابل قدر اضافہ ایک ہی بند میں دوسرے قوافی کا استعمال ہے جو براہ راست انگریزی شاعری سے لیا گیا ہے۔ مثلاً ”مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ کے پہلے جنگ کی ترتیب ملاحظہ ہو۔“

میں نے سمجھا تھا کہ تو پہ تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھوٹا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاؤ کوئی

تیری آنکھوں کے سرواؤں میں رکھا کیا ہے

اس قسم کا التزام درست نسب کی نظموں تک میں پایا جاتا ہے۔ فیض نے ان جدت طرازیوں سے اپنے پیرایہ اظہار کو حسین بھی بنایا ہے اور سہولتیں بھی پیدا کی ہیں۔ مذکورہ بالا نظم میں اگر شاعر قافیوں کے اسی تانے بٹے کے ساتھ چلتا تو نہ معلوم اس نظم کا بحر سحر جوتہ تنوع کا اندازہ کرتا ہے تو اسی نظم کے قافیوں کو اس فارمولے میں دیکھئے :-

الف - ب - ج - پ - ج - ح - د - و - ر - س - ر - س - ش - ش - ی - ص - ص - ط - ط - الف -

تقریباً اسی انداز کا تنوع بھی ”موضوع سخن“ ”سیاسی ایڈر کے نام“ ”تنہائی“ ”یہ رات اس دور کا شجر ہے“ اور ان کی دوسری تفصیلات ملتا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ جدتیں اردو نظم میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ مگر گون - م راشد، نقشب فریادی کے دیباچہ میں اسے ”کوئی قابل ذکر تبدیلی“ نہیں تسلیم کرتے، اور آزاد نظم کا ”ایک رسیا یہ کرتا بھی کیسے“ لیکن فیض کا یہ اضافہ خود ان کے نثر راز و من کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ ان کے ”عمیق پسے“ اور ”محکمہ تخیل کے عجز و مطلقانہ ہے۔ قدیم اضافہ سخن میں تھوڑی دور چل کر شاعر اپنے آپ کو قوافی کے شکنجے میں پاتا ہے۔ اور یہیں سے وہ اپنے عجز کو چھپانے کے لئے استاد و ادب و خطابت سے کام لیتا ہے۔ فیض خیالات اور جذبات کے کیفیت و کمہ کے ساتھ ساتھ تجربہ تو نہیں لیکن ہیئت کے سانچوں کو بدلتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظمیں وحدت فکر کے لحاظ سے زیادہ مکمل ہیں۔ ان کا حق کہیں ٹھٹھا ہوا نہیں معلوم ہوتا ہے، قدم قدم پر نادر تشبیہات کی شکل میں یا تو تخیل کی اطمینان دہانی ہوتی ہے۔ یا استعاسے کی ٹھٹھک اس طرح کہ ہر چہ مضرع میں چراغ جیل اٹھتے ہیں۔

لیکن فیض کی تاریخ ہنر اس قدر کم ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں ابھی سے ہم ان کا بہت اونچا مقام متعین نہیں کر سکتے۔ ہمارے نئے شاعروں کو اس بارے میں بہت زیادہ عجلت بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ہر نئی آواز کو اپنے دور کے مذاقی شری میں اپنی جگہ خود بنانی پڑتی ہے۔ یہ عمل بڑی کاوش اور جدوجہد کا ہوتا ہے۔ اور جب تک درست صبا کے ویباچے سے معلوم نہ ہو کہ فیض تپسہ کے ان رموز سے واقف ہیں! لکھتے ہیں :-

”حالیہ فن کے مجاہدے کا کوئی نرطون نہیں اس کا“ ”فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش“

اسی کی بدولت فیض کے یہاں وہ انکسار و دھم ملتا ہے جو نقشب فریادی تا درست صبا قائم ہے۔ اور جس کا دوسرا شاعر ان کے یہاں محض فکر و حرکت فقہان پایا جاتا ہے۔

جدید تنقید نے ابتداء سے فیض کی نئی آواز کو پہچانا ہے۔ اور تنقیدی عمل سے رد و قبول میں صرف فیض کا نام ہے، جو پچھلے بیس سال کی تنقیدات میں بار بار دہرایا گیا ہے۔

یہ فیض کی شاعرانہ افراہیت کے لئے کافی ضمانت ہے۔ اور اس بات کی طرف اشارہ بھی کہ ہم ان کی شاعری پر نظر جمائے رکھیں۔

جمیل جالبی

فیض ایک تفاعل مطالعہ

ذیلہ کا شمار ایک مضمون جمیل جالبی کے زیر ترتیب مجموعہ مضامین سے لیا گیا ہے۔ جس کے لئے ہم آپ کے ممنون ہیں۔ یہ مضمون، اساتذہ پہلے لکھا گیا تھا، اس وقت تک فیض کا صرف پہلا مجموعہ کلام۔ 'نقشہ فریادی' شائع ہوا تھا۔ فیض کے فنی اور فکری ارتقا کے سلسلے میں اس مضمون کے اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

(ادارہ)

وہ فیض کا شعری سرمایہ بہت ہموار ہے، جتنا کچھ ہے وہ اپنی محو اس قدر خوش اور روزنی ہے کہ بہت سے ہم عصر شعراء کا ضخیم شعری سرمایہ اس کے سامنے سبک اور کم تر معلوم ہونے لگتا ہے۔ فیض کی اس چھوٹی سی وسیع دنیا میں وہ سب کچھ ہے جو دوسروں کے یہاں ماسے اور وہ سب کچھ بھی ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں ملتا۔

فیض کی شاعری کو ہم دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا: درود ہے جس میں اس نے رومانی نظموں اور عشقیہ اشعار کہے۔ اس دور کو ہم رومانی دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں فیض نے زیادہ تر کھیل ڈراموں دن گزارے، عشق کی گنج گنجائی، بخون کی دہرہ گدازی، لبریز آہوں کی سیہ لپٹی اور ناکام نگاہوں سے دوچار ہوا۔ اور صید خیال کے سیلے ہوئے، محسوسات پیشانی اور سینہ آنکھوں کے سارے، زندگی کے دن گزارے، اس دور کی شاعری میں بھرپور ڈرامائی، یاس و توہمیت زیادہ جھلکتی ہے۔ وہ اب غم اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔ دھولے صبر و شکیب غلط ثابت ہوتا ہے۔ خاطر بے تاب کا قرار فیض سے باہر ہوتا ہے۔ غبارِ خواب سے لبریز احمر آنکھیں، سبز رُخ پر پریشان غریبہ فیض۔ وہ آزاد و لکھلا، مازِ جسم ہونٹوں پر تپتہ کی منیاں، حرمِ محبوب میں بیہوش جنتیں غارِ شب۔ بیاضِ رخِ چمر کی سی صباحت، اور جھلیں باہیں سے لے آئی دنیائے زیادہ قابلِ اتعانت اور بیش بہا ہیں۔ اس دور میں زندگی سے گریزاں نظر آئے۔ وہ دنیا کے ہر ذرے اور ہر چیز

کو محبت کے نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے، اور دنیا کی ہر چیز پر عشق و محبت کے حسین افسانوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس دور میں اس کی محبوبہ فیض نیالی ہے جس کا تصور اس کے لئے جان آفریں اور روح فرزا ہے۔ اس دور میں اس کی شاعری زیادہ تر روایتی شاعری ہے۔ لیکن اس روایتی شاعری میں بھی اس کی انفرادیت الگ جھلکتی ہے۔ وہ بہت سے گزشتہ شعراء کا تاثر قبول کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام تاثرات و احساسات پر اس کا اپنا انفرادی تاثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ اور لاشعوری طور پر ایک جدا و منفرد راستہ خود کو نکال آتا ہے۔ اسی دور میں وہ کہنے پیکر میں نئی طرح آباد کرتا ہے اور اس نئی روح کو عشق و روایات میں نچھیل کر دیتا ہے۔ پہلے دور میں آخری خط - حسینہ خیال سے - مری جاں اب بھی سر و شہناز، انتہائے ر - آج کی رات - اور ایک - گنڈر ہوا - ابھی نکلیں ہیں۔

فیض کی شاعری کا دور سرد اور، وہ دور سے جس میں وہ زندگی کا کافی مشاہدہ و تجربہ کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ فراریت جو پہلے دور میں نمایاں طور پر مرتفع ہوتی ہے۔ دوسرے دور میں قریب اور دائمی میں بدلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ عشق اس دور میں بھی اس کی روح اور جان ہے۔ لیکن محبوب کے گزراہے سے پر سرکٹ ہوئے اس کی نظر ان گنت ہمدیوں کے سپرد اظہار، بہت بڑی پیپ، اور گتے ہوئے، ناسور دہن پر بھی جا پڑتی ہے، اور وہ تڑپا کتاب ہے، محبت کا شدید عجز - ایک دم کم ہو جاتا ہے، اور خفا - میں لٹھرتے ہوئے اور خون میں نہلنے ہوئے جسموں کے خیال سے وہ کانپ جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے رجن کی دل کشی بالکل بھول جاتا ہے۔ اور زمانے کے دکھ اور درد کو محبت پر ترجیح دینے لگتا ہے اور زانیہ کی راحت کی راحتوں سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے۔ باپ کے جھنڈے اذ ظلم کے بھرنے مساعی، ناقولوں کے نوالوں پر چھینے ہوئے عقاب چہرے ہوئے ہماروں طرف منظر لارہے ہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اور شاہراہوں پر طرزیوں، امنیابوں، ہوائوں کے لئے ناقابل برداشت ہوجا لکے جسم کی ایس پکار، دل کی لے سود تڑپ - جوشہ دہر کی مجلسی ہوئی دیوانی - سفاک سجا اور مرقق جوانی دیکھ کر وہ تڑپا کتاب ہے اور ہر تڑپا دیوانی کو نظر انداز کرتے ہوئے مغلوں، سنیوں کو گرتی اور لنگوات پر مادہ کرسٹل کو کشش کرتا ہے۔ س

بلے فکرمے دھن دولت دانے

یہ آخر کینور خوش رہتے ہیں

ان کا سہم آپس میں بانٹیں

یہ بھی آخر ہسم جیسے ہیں

اور اس ذلیل و خوار زندگی پر محنت کو ترجیح دیتا ہے۔ کیوں کہ محنت، علم سے نجات کا سہل ذریعہ ہے۔ س

ہم نے ماہ جنگ کر ڈی ہے

مرچھ نہیں گئے خون بیہ گاہ!

خون میں ہم بھی بہہ جاتیں گے

ہم نہ رہیں۔ ہم بھی نہ رہے گاہ!

یہ دور اس کی شاعری کا بہترین دور ہے۔ تمام مشہور نظمیں جس پر اس کی شہرت کا زیادہ دار و مدار ہے، اسی دور کی پیداوار ہیں، مجھے پہلی ہی محبت میری محبوبہ نامک، سوچ، رقیب سے چند روز اور میری جان، کتے، مومنوع، سخن و غیرہ، اسی دور کی بہترین نظمیں ہیں۔

فیض کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت اس کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا متوازن ہونا، دینی شہرہ اور شعری اعتدال ہے۔ وہ واقعہ سے شدت کے ساتھ منور و متاثر ہوتا ہے اور اسے دل کی گہرائیوں میں گونجتا ہوا مزور و مسوس کرتا ہے اس واقعہ سے اس کے شعرا و مردود کے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں لیکن جب وہ اسے شعر کا جامہ پہناتا ہے تو اس شدید جذبہ میں ہلکی سی زماہٹ اور لچھے میں وہ یاد اپن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جھنجھلاہٹ اور غصہ جس سے دامن اور گریبان کے تاریں فصل ہائی نہیں رہتا اس کی شاعری میں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ ہر حقیقت کو باہر کی پردوں سے جھانکتا ہے اس وقت اس کی تیزی پہلے منور ہوتے ہیں لیکن ہڈیوں پر محسوس سی نرمی بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ زندگی کے کھوس حقائق پر شاعری کا ایسا رنگین پردہ ڈالتا ہے جس سے واقعہ کی شدت ایک حد تک کم ہو جاتی ہے۔ لیکن شعریت کشش اور جاذبیت میں بلا کا مضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے اشعار انجمن قلیوں کی طرح دل و دماغ کے سبزو زار میں ادھر سے ادھر لڑتے پھرتے لگتے ہیں فیض اپنے شدید احساسات کو مدھم اور ہلکا کر کے شعر کا لطیف جامہ پہناتا ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری کی آواز مدھم، مری اور دب دبی کی ہوتی ہے۔ وہ قاری کے ذہن کو گہری کی طرح تھکتا ہے لیکن سوسنے نہیں دیتا۔ پڑھنے والے ہر ایک قسم کی بیدار نیم خوابی طاری رہتی ہے۔ وہ قاری کو شاعرانہ زنجیر اور حقیقت کی شگفتہ جھول جھولتیوں میں گم کر کے کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی شاعری ہر اور است جذبات سے باہر نہیں کرتی بلکہ آہستہ آہستہ دل و دماغ میں اپنا گھر کوئی ہے۔ اور قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور خاموش رہنے پر زور دیتی ہے۔ اس کی شاعری ایک ایسے چور کی طرح ہے جو بات کی بہت آخر اتار کی میں دردناکے پر مٹھے ہوئے خوف ناک کئے کو ایک مجوش کا کھڑا ڈال کر مکان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی روح، اس کی شاعری میں تسلیں ہو کر قاری کی روح میں نہایت گہرائی ہے یہی اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اسی نقطہ نظر سے کہتا ہے اور جو کچھ سوچ کر کہتا ہے وہ اسی نقطہ نظر پر مبنی ہوتا ہے۔ خوشحظی، فیض کی خصوصیت ہے، جو اسے تنقید شاعری میں ایک ممتاز درجہ دلاتی ہے۔ انتہا پسندی کے باعث بہت ترقی پسند شعراء و اچھا شعری سرمایہ تخلیق ذکر کئے فیض انتہا پسندی سے گریز کر کے ہر چیز کو اعتدال میں سمویئے کا عادی ہے۔

فیض کسی خاص مرکزی خیال کا شاعر نہیں۔ وہ کسی پیغام یا فلسفہ کلیتہً غلام میں بار بار نہیں دہراتا۔ اس کا اجتماعی احساس، انوکھا احساس میں مشید و خنجر ہو کر شعری صفات کا جامہ پہنتا ہے۔ اس کی شخصیت سوسائٹی کے خاکے میں بگڑنظر آتی ہے۔ اس کی شاعری اس کی شخصیت ہے بلکہ اس کی شخصیت معاشرہ کا خاکہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے زندگی کا شاعر کہتے پر مجبور ہیں، اور اس فراریت کو کچھ دیر کے لئے بالکل محمول جات میں جو اس کے دور اول کی نظموں میں جسوراً اور دوردوم کی نظموں میں کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ جس خیال اور احساس کو وہ ایک مرتبہ شعر کے لطیف پردوں سے دکھاتا ہے، اسی خیال کے بالکل متضاد و مہلو کو دوسری جگہ نظر کر کے اپنے گزشتہ خیال کی ترویج کر دیتا ہے۔ فیض محض وقت کا شاعر نہیں، وہ سماج کو انسانیت کی صحیح اور جائز فہمی پر پہنچانا چاہتا ہے۔ ان تمام قلم کے نبضوں اور رسم و رواج کی قہروں اور پیماہد ملات سے انسان کو نکالت دینا چاہتا ہے جن کی وجہ سے سماج میں برسوں سے ناسور مہر رہتا ہے۔

جسم پر قید ہے جذبات پر زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پر لغزیریں ہیں
اپنی بہت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں

فیض حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھتا ہے اور اس انقلاب کے ذریعہ دل کی بے سود ضرب اور جسم کی ایوس پکار کو دور کرنا چاہتا ہے کیوں کہ

اپنے ابدال کی میراث ہے معذور ہیں ہم

مگر

اور کچھ دیر ستم سہلیں، توپ لیں، رو لیں
چند روز اور میری جان! قحط چند ہی روز
جن خیالات کی تشریح فیض نے اپنی مشہور نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' میں کی ہے اور محبوب کے حسن کی لکٹی
اندھ دھلی کی راحت پہن مانے کے دکھ درد کو ترجیح دیتے ہوئے منفی لہجہ دہیشت، ناگوار کیا ہے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے
اور کبھی دکھ میں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور کبھی میں دھلی کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اور چند لمحات کے لئے محبوب کے وسیلے ہونٹوں، دل کش حسن اور گندازہ کیلئے جسم کو بالکل بھول گیا ہے۔ اپنی خیالات کی ترویج، موضوع
سخن میں، صاف طور سے کر دی ہے، وہ جانتا ہے کہ سرخ و سیاہ صدیوں کے سایہ تلے آدم دھوا کی اولاد پر کیا کیا گزری ہے۔ جہاں ہر سمت،
پُٹا سدا گوی دیواریں ہیں اور جہاں ہزاروں کی جوانی کے چراغ جل بجھتے ہیں اور جہاں ہر کام پر قتل گاہیں موجود ہیں۔ لیکن سے
یکھی ہیں ایسے کئی اور کبھی معصوم ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بہت درد لآ و بیخظوٹ
آپ ہی کہتے کہیں ایسے بھی انہوں ہوں گے
اداسی لئے

اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں

طبیع شاعر کو دہلیں اس کے سوا اور نہیں

فیض اپنی ساری شاعری میں، ایک بجز ذمہ دار نالائقی کی حیثیت رکھتا ہے اور بغیر ذمہ داری عشق اور تغزل کی شدید تحلیل کا نتیجہ
ہے۔ ایک بات کہہ کر مکر جانا فیض کا خاص حقیقہ ہے۔

فیض کی شاعری میں، خود پرستی اور حقیقت نگاری کا ایسا امتزاج ہے جیسے سچے موتیوں میں آب کی جھلک۔ اس کی شاعری ایک
ایسی دل پذیر قوس و قزح کی طرح ہے جس میں، بارش کے بعد ساتوں رنگ لے لے نکھڑتے ہیں کہ ہر شخص اس کی طرف نگاہ کر دیکھنے اور دکھانے
پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے احساسات کے لطیف پردوں سے ٹکراتی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک خاموش تھپتھاہٹ،
ایک مٹی بیداری۔ گرم جذبات کی شدید فراوانی اور انقلاب کی خفیف لپک رداں و داں نظر آتی ہے۔ تسلسل، ربط، احساسات کی

نزاکت اور سوچا ہوا حزن اس کی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔

فیض نفسیات کا شاعر ہے، نفسیات اور فیض کی شاعری دو جدا چیزیں نہیں ہیں بلکہ شاعری کا تار و پود، اور نظم کے تانے بانے سب اسی سے بنے گئے ہیں۔ انگریزی ادب کے شعرائے نفسیات بھونچن، ایلیٹ، اوڈن اور سپنڈر رو وغیرہ کا تاثر اس کے دل و دماغ میں اس قدر رچ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب میں اس کے لئے خود ایک الگ راستہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے سماجی ماحولوں کو منور کر دیتی ہے لیکن تیزی اور سختی سے نہیں، بلکہ نرمی اور الوصیت سے۔ "ناؤصیت" فیض کی شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔ مرے ہدم! مرے دوست! اسی مائوسیت کی بہترین مثال ہے۔

ہم بار بار کہتے چلے آئے ہیں کہ فیض لطیف پرووں کا شاعر ہے وہ ایک انسان کی حیثیت سے سب کچھ محسوس کرتا ہے۔ بہت کچھ اپنے موضوع اور رسالے کے لئے فراہم کرتا ہے۔ اجتہاد، معاشرت، اقتداریت اور سیاست، غرض کہ سب سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ ان سب چیزوں کو شعریے لطیف پرووں میں ایسا لباس کر دیتا ہے کہ اس کی نظم یا شعر، سیاست یا مفصلہ کے ماسواہ سب سے پہلے شعریت ہے فیض شعری طور پر ان سے گریز نہیں کرتا، چاہتا ہے کہ سیاست اور ملکی زبوں حالی و فحاشی، ذہنی پائیداری اور گراؤ، ملک و قوم دونوں کی ترقی کے راستہ جس رشتہ پیدا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شاعری حیثیت سے وہ ان تمام واقعات اور گرد و پیش کے زبوں ماحول سے فرا کر راجا کرتا ہو، لیکن شاعر ہونے سے پہلے وہ انسان ہے۔ اس لئے اگر شعری عناصر سے گریز کرنے کی تائید کرتے ہیں تو انسانیت آؤٹ آجاتی ہے اور اس طرح سیاسی ملکی اور قومی کیفیات اس کی شاعری میں از خود اثر انداز ہو کر خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ یہاں پر ایک بہت باریک فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ شاعر کے لئے اگر یہ ہے کہ وہ سیاسی اور ملکی و قومی حالات کو ایک انسان کی حیثیت سے سمجھے، لیکن شعری جامہ پہنانے وقت اسے چاہئے کہ وہ یہ بات منور ذہن نشین رکھے کہ جہاں وہ انسان ہے، وہاں وہ شاعر بھی ہے۔ اس لئے اپنے جذبات میں سیاسی، ملکی و قومی تاثرات کو شاعرانہ لہجہ میں لپیٹے۔ تاکہ بیک وقت شعر و سیاست کا بہترین امتزاج اور کوئل، خلتا دکار ابطہ استوار دے سکے۔ یہ خصوصیت فیض کی شاعری میں نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ دلیہ تو قدماء و متاخرین سے ہر ایک کے لئے ماحول سے متاثر ہو کر شریکے لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی سیاسی تشریح کرنا شعر و شعریت کا خون کرنے کے مترادف ہو گا۔ حسرت موہانی، جوش، نیاز، جواد علی سردار، ن، م، راشد، احمد ندیم، ساحر و مخدوم، نے بھی اپنی شاعری میں سیاسی عناصر کو گھلا دیا اور ان میں کامیاب اشعار کہے، فیض اسی داستان کا ایک فرد ہے۔ فیض کے سیاسی اشعار میں شعریت شاعرانہ مہیاؤ، دھنچن لہجہ، لطیف و خوشگوار احساسات، دائمی ارتسامیت، مدہم جذبات کی روانی اور منطقی سلجھاؤ، کامیاب امتزاج کے ساتھ، ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں۔ مجھ سے پہلی سی صحبت مری محبوب نہ مانگ میں شعریت و سیاست کا شریک امتزاج قابل غور ہے۔

دن گنت صدیوں کے اربک مہیا نہ طلسم

اُشیم و اطمس، کچھ اب میں بڑا نے ہوئے

جا بجا جیتے ہوئے کو چہ در بازار میں جسم،

خاک میں تھکے، ہستے خون میں ہنسلے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے

پیپ سہتی ہوئی لگتے ہوئے ماسوروں سے

موضوع دی ہے جس پر متعدد شعرائے طبع آزمائی کی اور اپنی نظریوں کا مرکزی خیال بنایا مگر جویرا نے بیان، فیض نے اختیار کیا، وہ

دوسروں کے یہاں مشکل سے فنا ہے، واقعات کی شدت کو کس طرح سے شعریت کے لطیف پردوں میں جا بٹھا یا ہے کہ شعریت اور سیاست اور فن ایک دوسرے میں بالکل شبر و شکر ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں 'سوتج'، 'رقیب ست'، 'چندر روزا' اور 'مری جان' کتنے 'نیاسی' لیڈر کے نام۔ 'دلے دلے' اب بکھرے، 'مرے ہوم'، 'مرے دوست' قابلِ قدر نظمیں ہیں۔ وہ عشق سے بھی ایک نہا یا سی سبق بکھلتا ہے اور اپنے تمام گزشتہ اسباق بھول جاتا ہے۔ ہم نے اس عشق میں کیا کھو یا ہے کیا پایا ہے۔

عاجزی سی بھی، عزیزوں کی حمایت سی بھی

یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سی بھی

زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سی بھی

مرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سی بھی

وہ سماج کی اس غلط تقسیم، ظلم و تشدد اور ناجائز دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ شعری طیلے اس کے منہ سے نکلنے لگتے ہیں اور وہ چاروں طرف سے مایوس ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

زندگی کیا کسی مفلس کی قبلے جس میں

ہر گھڑی درد کے چوند لگے جاتے ہیں!

یا۔

ان دیکتے ہوئے شیروں کی فزا داں مخلوق

کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

قید و بند پر اسرار کڑی دلوا ریں، بندشوں، پابندیوں، پھینڈوں اور بندھنوں سے وہ بہت گھرا تم ہے اور ان سب کو توڑنا اور کچا ہوتا ہے کائنات کی تسکون کے لئے راستہ صاف کر دے، عرصہ دم کی مجلس ہوئی دیرانی۔ اجنبی ہاتھوں کیلئے نام گراں ہار ستم، جن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد، دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار، یہ سب پیچیدگیاں اور الجھنیں اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہیں اور وہ ان سب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ عزور اس مسئلہ کے حل میں کامیاب ہو سکے گا بھی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اس کا لبجو ر جاتی ہوتا ہے۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں

ایک ذرا صبر کہ فساد کے دن تھوڑے ہیں

ہم کو رہنا ہے یہ یونہی تو نہیں رہنا ہے

آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

چندر روزا اور مری جان فقط چند ہی روز

فیض کی یہ پیشین گوئی ایک حد تک پوری ہوتی جا رہی ہے، ہندوستان غلامی کے چنگلوں سے نجات پا چکا ہے اور لیتیا کپور عرصہ بعد وہ مطلوبہ سلاح کھسکی تلاش فیض اور اس کے رفقاء کے کار کو ہے، مل جائے گی۔

فی زائد اشتر کی شاعر ایک عام لفظ ہو گیا ہے۔ اشتر کی شاعر ہم اس شاعر کو کہتے ہیں جو عزیزوں کی حمایت کر لے، موجودوں

کو سراہتا ہے، سراپہ داروں کی مخالفت کرتا ہے۔ شہنشاہیت اور استبدادیت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں یہ باتیں اس قدر ضروری ہو گئی ہیں کہ کوئی شاعر براہ راست یا بالواسطہ روس کے نظریات سے متاثر ہو یا نہ ہو، یہ خیالات جڑ سے شاعری بناتا ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت، وقت کی سب سے بڑی پکار اور تاریخی تقاضا ہے۔ اس طرح فیض بھی اشتراکی شاعر ہے۔ یہ رجحان ترقی پسند شاعری میں بالخصوص بہت عام ہے۔ علی حوالہ زیدی کی شاعری کا مجموعی دار و مدار ہی اسی نوع کی شاعری پر ہے۔

ایسا بھی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا

مفقود و ناپید ہائیں گے جہل و ظلم : ہستہ کے نوگرہیں
افلاس پچائے گا ان کو جو زرداروں کے یاد رہیں
مزدوروں نے کی ہے صدیوں سے دنیا بھر میں تیار
ہٹ جائے گی یہ سطاہت، شاہنشہی، سراپہ داری

ایسا بھی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا۔

اور فیض مزدوروں کی حمایت یوں کرتا ہے :
نالواؤں کے لڑائیوں پر پھٹتے ہیں بے تاب
بازو تو لے ہوئے منڈلائے تو بے آئے میں
جب کبھی بچتا ہے یا زار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پر بزنہوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی تو نہ کاٹ رہا ہو اسباب لئے
فائدہ مستوں کو ڈولنے کے لئے کھتا ہے،

آگ سی سینہ میں رہ رہ کے اُلتی ہے نہ پوچھ
لپٹے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے۔

دونوں شاعر سراپہ داری کی مخالفت اور مزدوروں کی موافقت کے لئے آواز بلند کرتے ہیں، مگر دونوں کا لہجہ، دونوں کا اسلوب، دونوں کا طریقہ انجاء کس قدر مختلف ہے۔ آج کل انقلاب کے اصل معنی یہ ہیں کہ مزدوروں کی موافقت کی جائے، ان کے لئے اپنی تمام شاعری کو وقف کر دیا جائے۔ ضروری نہیں کہ وہ خیالات عملی جامہ پہنیں۔ محمد جمی الدین کی شاعری میں بھی بہت مخصوص قسم کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جس سے اس کی شاعری میں وزن اور انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بہت معیوض قسم کا اشتراکی شاعر ہے اور اس لئے انقلابی بھی۔ علی سردا و جغریٰ کی شاعری تو محض اشتراکیت ہے۔ وہ تو اشتراکیت کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر سچا اچھا مصطلحیت کے مطابق کوئی شاعر نہیں کرتا۔ اب کچھ اس کی شاعری کا دھارا عشق پر اور روحانی شاعری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھئے اس کے بعد وہ کدھر رجوع ہوتا ہے اس کی نظر مزدوروں کی کیاں کا مقابلہ فیض کی نظم ”کے“ سے کر سکتے ہیں۔ چونکہ تفاوت پر آمادہ ہونے کے بعد انسان اچھا یا برا سوچنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے انتہا پسندی اور نفرت دشواری کی کمی کا احساس نہیں علی سردا و جغریٰ کی شاعری میں اکثر ہونے لگتا ہے۔

بغاوت میرا غریب ہے بغاوت دلیہ تاملیرا

بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا

بہر حال وہ اشتراکی شاعری میں ایک کا۔ یاب شاعر ہے۔ اس کی شاعری اکثر ہنگامی اور وقتی ہے۔ فیض مزدعموں کی ضرورت حمایت کرتا ہے۔ یہ موضوع وقت کی تبدیلی سے ضرور بدل جانے کا۔ مگر فیض کی شاعری میں وہ دہائی جھلکیاں ہیں جو امت اور اس کی شاعری کو ہمیشہ برقرار رکھیں گی۔ وہ اشتراکی شاعری کو بھی ایسے عالمگیر میں بیان کرتا ہے کہ اس کی شاعری اشتراکی و انقلابی ہوتے ہوئے بھی بڑی موثر و دلپذیر ہے۔ ساتھ لہجہ انوی بھی کامیاب انقلابی و اشتراکی شاعر ہے لیکن اس کے بیان میں بھی بعض ایسی گزشتہ موجود ہیں جو اس کی شاعری میں جان ڈال کر اس کو چمک دیتی ہیں۔ وہ تاج محل، گورنمنٹ ہائیڈرو، کمرے، اپنی محبوب کو اس سے گریز کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی لئے 'تاج نسل' جو اصل میں 'منظر الفت' خیال کیا جاتا ہے اور جہاں محبت کی تجدید برکتی ہے وہ عشق کو ذرا محسوس کر کے اس نظر سے کاٹ جاتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ سے کہیں اور ملنے کی التجا کرتا ہے۔

میری محبوب! پس پردہ تشبیہ و تشبیہ

تو آسٹوٹ کے نشانوں کو تو دیکھتا ہر سنا

مردہ شاہوں کے مقابر سے بہ سلیقہ و سلی

اپنے تارک یک مکالوں کو تو دیکھتا ہونا

ان گزشتہ لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے

کوئی کہتا ہے: صادق نہ تھے جنرل ان کے

لیکن ان کے لئے تشبیہ کا سامان نہیں

کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی طرح مفلس تھے

یہ محاربات و مقامات و فضیلتیں یہ جھنڈا

مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون

سینہ دہر کے نامور ہیں۔ بہت نامور

جذب بھان میں ترے اور میرے اجداد کا خون

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی

جن کی ہنسی نے مجھی ہے اسے شکل جیسی

چمن زار یہ جہنم کا کھنڈا ہے محسوس

یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر

ہم غریبوں کی محبت کا آڑا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اندلا کر مجھ سے !

اس نظم میں ساحر، فیض سے بہت نزدیکی پر گہا ہے اور اس وقت متغیر میں اس نے وہ دوا می جملیاں اور عالمگیر شاعری سمجھنے کے لیے نظم کی شاعری پر ایک زندہ جاوید نقش بن گئی ہے۔ فیض کی مجموعی شاعری کو ہم ان لوگوں کے سامنے منسلک کر پیش کر سکتے ہیں۔ جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شاعری مقصد رہنے کے بعد شاعر نہیں رہ سکتی۔ اصل میں شاعر وہی ہے، غلط ہے جو وقت کی اقدار کو دائمی اقدار بنا دے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا ایک حصہ اشتراکی انقلابی کے ذہن میں شریک بنا رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری کی عظمت کا انداز اس کا تغزل اور شعر ہے۔ یہ تغزل اور شعریت ہی ہے جو وقت کی رنگارنگیوں میں جاوید ہو کر، جس دائمی بنا دیتی ہے، مجاز، سماج میں اصلاح کے لئے اندر سے کیا سازد سامان اور کھشن، دست بستہ کی جیسے اور جیسے کا کہ جو قلمی ہے مگر اس بڑی میں وہ آہنگی، وہ وہاں پہنچاؤ ٹھہراؤ ہے کہ اس کی شاعری جیسے دل پر اثر کرتے کے دائرہ پائز کرتی ہے۔ مجاز انقلابی شاعری میں جو شاعری ہے، وہ بھی قریب نہیں۔ اس کی شاعری میں جذبات کا زہریں دھارا، ہر مہر میں اس زمانہ نظر آتا ہے۔ مجاز اپنے دور کی شاعری کا جس نمائندہ ہے، اختر ایماں کو ایک ایسا ایک فیض ہی کے اصول کا شعر ہے۔ وہ براہ راست اور بالواسطہ فیض کی شاعری سے متاثر ہے لیکن اس تاثر پر اس کی اپنی صلیبیت و اخلاقیات حادی ہونے کے باعث نئی شاعری ہو، اس کے لئے ایک اثر جو پیدا ہو گئی ہے۔ جو جس نے ختمی ہوئی والے خطاب کے لئے کی کوشش کی، مگر ان کی انقلابی شاعری قلمی، انتہا پسندی ہے جس میں غلوں کا فقدان اکثر مجریموں کی نسبت وہ بورژوا طبقہ کے اور وہ فن کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ سب سے بڑی وہ یک جہاں ہے کہ لوگوں کو پورا واقعہ سے متفق کر کے انھیں ہونے والی حقیقی طرف متوجہ کرے۔ جو شاعری شاعر نہیں، وہ اس کے نزدیک ہے۔ اس کے خیالات ہی انقلابی ہیں مگر مہیاں، کامیاب معنی میں انقلابی شاعری کا لہجہ ہے وہ جو شاعر پیدا کرے کہ جو شاعر ان معنی میں تو قابلِ قریب نہ کر سکتا ہے۔ نئی انقلابی شاعری، ایک بہت زائرہ انقلاب پسند نوجوان شعراء کا پیدا کر دیا۔ مگر بدلتا ہو کر، بدست انقلابی کا زمانہ بن گیا۔ اس کے دور اب تو اس کی شاعری میں، واضح قسم کا زوال آچکا ہے جو رزورڈ ہو کر شاعری میں اس کے شباب کے بعد آیا تھا۔ انقلابی شاعری پیدا کرنے سے قبل، انقلاب کے معنی کچھ متاثر دہریہ ہیں وہ انقلاب کے پسند ہو جاتا ہے، مگر پھر کہ جو شاعر اپنے فن کی وجہ سے بہت زیادہ قابلِ قدر ہے۔ ہمارے لئے یہی ہے کہ شاعری کو نہیں سمجھا سکتے وہ اردو ادب اور شاعری کا ایک ناقابلِ فراموش موڑ ہے۔

ہاں! تو اگر ہم اس بات پر زور دے کہ اس کی شاعری کا سیاسی کامیابی کا سب سے بڑا اور یہ کہ وہ انہیں اس تجربہ پر پہنچ گئے کہ ان کا اور شاعر کے لئے جہاں تخلیقی صلاحیتیں اور فطری قوتیں رکھتے ہیں وہ ان تنقیدی بالغ نظری بھی لازمی ہے تاہم وہ اپنے باغ میں متوازن ہیں، سنجیدگی اور اعتدال کو اپنا تول کر قرار دے سکتے۔ فیض جو بالکل تخلیقی معاہدوں کا حامل ہے وہ ان خود کو تنقیدی نظر سے بھی تولنے کا ہی ہے وہ تخلیق کو تنقیدی سمجھ سکتی ہے پھر کہ کہ جو دعوں لاتا ہے۔ اور یہی ہیں اس کی شاعری کے زبردست کامیابی کا راز مضمر ہے۔

جدید شاعری کا درد بڑا، انفرادی اور اجتماعی زندگی سے، اہل کرنا ہا ہے۔ ایک طرف تو جدید شاعر غصے، گھبراہٹ سے اور دوسری طرف بیسویں صدی کے سیاسی، اخلاقی نفسیاتی کیفیت، انتہائیں کی خزاہات اور نئی مشینوں کی ایجادات سے متاثر رہا ہے اور اس کے دردوں غماز کے باہم ربط و مضبوطی سے اس کی اندرونی، اور بیرونی، خارجی، اور داخلی، دونوں دنیا میں واضح ہو جاتی ہیں۔ فیض کی شاعری ایسی ہی برونہی و داخلی احوال کے امتزاج سے بنی ہے۔ فیض نام، مادرتی پسند شعراء، اہل شاعری کو دکالت پر توجہ دیتا ہے۔ اس کے کلام میں دکالت کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔

فیض کی اکثر نظمیں خود کلامی کی مثالیں ہیں۔ اس کے اندر شاعر خود سے باتیں کرتا ہے۔ وہ طویل لغو باتوں کے ذہن

ذہریں جسم پر نظر میں گاڑ دو تیل ہے، اور پھر چوری کا یہ نظر محبت، شہو کے پاتال سے گھس گھس کر مختلف کہیں ہیں تو اس کی نظروں میں سہل سل جاتا ہے۔ میرا جی کی نیم شعوری تخلیقات ہمیں آسودگی کی ہے، استغرافی کے سبب حسرتی پیدا، ان کی نظر آب جو نہا ہے اس نوبہ کی بہترین مثال ہے۔

ہاتھ آلودہ ہے ہمارا ہے، دھندلی ہے ہنر

ہاتھ سے آئینہ، اس کے لہو تو نہیں پوچھیں

ن۔ م۔ را۔ شرح حبیب، انہی کو یاد دہا ہے تو، اس کی کت، دیکھتے کا جسم پاتا ہے

گناہ آب و ہوا اب تک کیا، کیوں میں سے

اور اس گناہ ذکر نہ کا ذکر ہے۔

گناہ اب سے لبریز ہے شباب مرا

وہ اس پر سوال کرتا ہے۔

یہ شعر چھپ کے نہیں آئے کہ خرد ہے

معاذوں سے جبرانی کو اپنی بھیجے۔

اس جیسے قرآن شمس کی شہرت کی ہے۔ یہ نوازوں کے گہر سے، اور اس کے چاند سے تو گہر ہے، شہرت کی ہے، گہر است اس کی شاعری میں پیدا ہوئی ہے، وہ ان کی شاعری میں ان راہ میں چلاؤ کہ نہ لگتی ہے اس میں میں تیار پیدا ہے، ہے اور جتنی جوت کو اس قدر راہی، ورنہ اس میں چھوٹا ہے نہ لگتی ہے اس طرح دیکھا، ہے کہ نہ رشتان کی صحن اور جوت رات میں مس گولی کی کے ذریعہ لگتی، اور آلودہ ہو جاتی ہے، اور ادب پر ان کا بنا کر ان کا نام آج سنا ہے، اس کے بہار، شدت کا یہ عالم ہے کہ تمام رات کے بعد سے

نہی جھاس یہ، یہ یہ یہ یہ یہ یہ یہ

اور نہ سے لبریز ہے، ہوجا ہے

مکرم فیض نے کجوا، احسان کی، اپنی انیٹنگ اس میں دن بھر اس، دور کی توجہ سے لے ہو کر دے، ان کے مصرعوں کی کہ میں دو کھٹک یا زمزمہ (T) ہے اور ان کو لفظ کو لفظ (PARAGRAPH) میں جو نازگی اور دو رویت ہے وہ ان کے اسلوب میں ایک خاصہ، قانہ لفظی خصوصیت پیدا ہو چکی ہے۔ انہیں نے ایک ایسا مدرسہ اعلیٰ قائم کر دیا انہوں نے میں اہمیت اور احسان، و خلوص اور فن کا راز چاکر کوئی سے مستقیم اور دت کر دے، سے اہم سماجی مسائل کے متعلق ایک کہہ سکتا ہے، یہ ان کی شہرہ شاعری میں ایک بھلی چیز تھی۔ انی اور قابل ترقی، عذیبہ شاعری پر حبیبی رحمان کر ایک لٹریٹک لٹریٹک علامت، کا خاص حصہ ہے، جسے اردو شاعری میں عمر میں بھلا سکتی۔

فیض حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھنے کا مادی ہے۔ دورِ رادل میں جس کو پہنچنے، روحی دور کے نام سے، اس کا نام رکھا تھا، عشقہ اور راف میں دنیا کی ہر شے سے بلے نیاز وہ محبوب کے سبب پر رکھا، اس کے دل کی خاموشی و شرم و دھڑکنوں کے سبب تو تین لڑ جاتا ہے۔ یہ حبیبی اس کے اس دور کی نظموں کے ہر مصرعے سے متاثر ہے۔ دوسرے وعدہ میں انقلاب اور فن، دمشق، الیہ دور

میں نسبانی طریقہ پر ایسے شیر و شکر پہنکے ہیں کہ دوزخ کو ایک دو سب سے جدا کرنا دشوار اور ناممکن نظر آتا ہے۔ فیض نے حسن و القلوب کو ایسا سمودیا ہے کہ انقلاب میں حسن اور حسن میں انقلاب کا پہلا نظر آنے لگا ہے۔ اور یہ تجسّیل اور دشمنی میں بالکل نئی ہے۔

”شق کی آئندہ نگین و نشاط تنگ آکر وہ آخری خط لکھتا ہے جس میں وہ سوت کی تہن کرتا ہے۔ یاس و حرمالہ اور درد و غم سے تنگ آکر عاشق ہمیشہ آخری خط لکھا کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ خط آخری خط ہو، ممکن پیش کی اصطلاح میں آخری خط وہ خط ہوتا ہے جس میں شاعر اپنی محبوب سے تنگ آکر موت کی خواہش ظاہر کرتا ہے اور ان تمام لاحق جال و بالی زندگی اور تلخ کامیوں سے نجات پلنے کی سعی کرتا ہے۔ فیض کا آخری خط شاید کچھ ایسا ہی آخری موسم ہونے سے

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زلیلت کی راہیں
اور صر سے گزر جائے کچھ آئندہ پہاڑی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام انگلیاں!
چھین جائیں گے بھستے مرے آنسو، مری آہیں
چھین جائے گی مجھ سے رناتے کار جو آہیں

آخری خط

فیض اپنی رومانی نشیمن میں، ماحول بھی، رومانی رکھتا ہے۔ جس سے تاثیر و تاثر، احساس و جذبہ میں بکا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ”سرد و شبانہ“ رومانی ماحول کے لحاظ سے ایک قابل قدر نظم ہے، اس نظم کو کثرت پر ہمت میں زیادہ سلف آئینہ سے

نیم شب، چاند، خرو و فر، موسیقی
محفل بہت و بوز و برائے
پیکر التجا ہے خاموشی
ہریم آنکھم خنجر وہ سامان سے
آبشار سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی ہی ناری ہے
زندگی جز و حجاب ہے کو با!
ساری دنیا سراب ہے گویا
سو رہی سہنے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
مکھنک ان نیم دانگا ہوں سے
کہہ رہی ہے حدیث شوق، نیاز
سازِ دیا کے خوشنما روں سے

مجھ سے رہا ہے خسا کہیں آگین

آرزو، خواب، تیرا دئے حسین!

اس نظم کی شعریات ملاحظہ ہو، تمام منظر نگاہوں کے ساتھ سمجھ جاتا ہے، یہی اس کی روحانی شاعری ہے۔ افسوس کہ اس کی روحانی شاعر کا ایک ایک مصرعہ مانوس شہر معلوم ہوتا ہے۔ جدول میں اتنا چلو جاتا ہے۔ اس کی شاعری کے دھم نبذات کی سطح سے نیچے سلا سلا رہیں وہاں نظر آتی ہیں۔ اس کی روحانی شاعری کے بعد میں وہ گھٹا وٹ ہے کہ قاری اور شاعر کے دلوں کی دھڑکیں ایک ہو جاتی ہیں۔ مختصر، مٹی قدر سے ادھر ہر شخص کو عشق کے نئی رنگی پہنسا اور کسی رنگی منزل سے عبور و واسطہ پڑا ہے۔ اسی سے فیض کی عشقیہ نظمیں، دل کے بھید و تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں۔

جو حسرتیں تے غم کی کھلی ہیں یہ دہری

ابھی تک مری تدا تیرے میں باقی ہیں

خوہی راتیں آگن کما ہوڑے ہیں پیارے

اوس آگنیں ابھی انتظار کی ہیں

گدیر رہتے ہیں غم دور و دم نہیں آتے

۔ انکسار۔

ایک رنگہ راز پر اثر بخوم، اس کی عشقیہ نفسوں میں یہ معمولی توجہ ہے کہ وہ یہ کہ انکسار، انکسار میں اس کی شاعر کی تصویر کے مو قعہ ہے، ایسی دلکش تصویریں بناتی ہیں کہ قاری کے دل میں ایک ہو کر انکسار ہے اور ایک کھلی ہوئی تصویر کے ساتھ آ جاتی ہے اور وہ تہا تھا ہے فاش مجھے بھی ایسی ہی تصویر بنایا ہوئی جو بخوم، کہیں جاننے کے دامن میں ایسا ہے کہ، اظہار جو واقعہ یہ نہیں ہے، منہ دہن، متعارف دہی۔

فیض کی شعری مجموعہ کی چند رائیں اور حیدر نقشر ونگہ راز ملاحظہ ہوں۔

ہزار تیرے تیرے تیرے تیرے خاک نشین

ہزار اک لگا ہوا شباب سے رنگیں

شباب، جس سے تجھ کی پکلیاں برسیں

دو چہرے کی زناقت میں تو میرے برسیں

دو لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے لے

بیاض رخ پر سر سر کی عبات تیرے

وہ آنکھوں کے بناؤ پہ نیا نیا

نہاں شعر کو تو لیت کر نے فرم آگے

وہ سوخت ہوا سے جس کے ہزار لالہ فروش

پیرتے دیکھ کر تو نسیم دیا میں بدوش

نور حیسم، قبا جبریا، سیدنا نازک
 در از قند جیسے سرور، ہی نماز
 غرض وہ شوق جو تاج و صف نام نہیں
 دہش، جیسے بقدر، بشرۃ العالین

ہر رنگ و ہر طرح کی شاعری کے لئے مختص سا ہونگوسے اور اسے رنگ میں جو جس نے متعدد کامیاب نظمیں اور اے ڈیو کے لیکن فیض جو کہ (شاہد) لا شعوری طور پر جو جس نے کبھی متاثر ہے اس لئے اس رنگ کا اس کے قلم میں آجانا ناگزیر ہے۔ مختصر کیا کہ ہر شاعر کی شاعری کا سیب شاعری ہے۔ اور اس میں ہر ایک اور نقطہ ہر طریق ہر شعر کے اندر خاص خاص جزئیات کی تخلیق کی جاسکتی ہے۔

میرے نزدیک 'روانی دور' کی آخری نقطہ میں ہر شعر کے آئینہ پرست کے لئے اور اس کے کفر کے لئے اس کے ناخن میں اٹھنے والے انداز بیان میں ہر حرف معلوم ہوتا ہے یہ وجود و صبر اور ہر شاعر کی زبان ہر حرف کے ہیں۔

زیرِ قلمِ عشق شاعری کے متعلق آخر میں ایک بات کہیں ہے۔ اگر عشق واقعی وقتوں سے بغیر زندگیوں کا وہ نظر آتا ہے۔ وہ ہر چیز کو کافی سمجھتا ہے اس لیے ہر عیش میں گذرنا ہے اچھا ہے۔ وہ ہر چیز کو ایک نیا جانا ہے، وہ گزشتہ دہائیوں کے داغ و لہجہ کو اور نئی قوافی آزاد ہونے کے لیے تیار ہے۔ وہ صحت و ہوش کا شاعر ہے۔ شاعر کا شاعر ہی تھا۔ اپنے آپ سے

تاریخِ احسن سے وہ ظلمات و ابا میں ہم پر آج اس دور کا ہے۔ اس میں ہرگز کوئی قوم نہ رہی جو اس سے بڑی
میں تکالیف و مصائب سے گزر کر کوئی نہیں رہا۔ اس کا ثبوت تاریخ کے کتب

کبھی اس پر غور کیا کرتے ہیں کہ یہ ہرگز

وہ جانتا ہے کہ بچیوں کو کون کون سے مہینے رجتے ہیں اور سبب کیا ہیں اور کون کون سے مہینے اس سے ضرور ہوتے ہیں۔

ہر کچھ دل کی سوسنیت م

انجیت سنگاپور کا ہیں مہرم

نہ معلوم کبھی دل کی صدا سو۔ سنا سکیں یا پھر کبھی محبت سے نسبت گواہیں۔ اس سے نمایاں کی شام کو در کیے اور بعد
حیات کو سکون دینے کے لئے ضروری ہنگامہ

آن حضرت - پیغمبر اکرم

زندگی در تندرستی

اور قبل اس کے کہ اجنبی دنیا کا اندھیرا اور فحاشی غیر مستحکم، ایک مرتبہ نہیں ایک مرتبہ نہ

مری جیسا اب بھی اپنا سن داتا: شہر: نیکو

از غیر ایجاب موقع برسد

اب نہ روئے انسانہ اسے اللہ

اینی نسبت یہ سو فیصد

ایک تشبیہ ہے

زندگی کسی فلسفے کی قبا ہے جس میں

ہر گھڑی درد کے پوند لگے جلتے ہیں

فیض نے زندگی کو فلسفے کی قبا سے تشبیہ دی ہے۔ فلسفے کی قبا کا نام سننے ہی مختلف چیز ہمارے ذہن میں بھرتے لگتے ہیں اور پھر دوسرے مصرعے میں پوندوں کا ذکر کر کے درد کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔ نفس مضمون میں گہرائی اور ناظرین معمولی برص لگتا ہے۔ فیض اپنی شاعری میں تشبیہات، داخلی و خارجی جذبات سے پیدا کرتا ہے، اس کی تشبیہات داخلی و خارجی، نفسیاتی، حوالے کے بہت کم ہوتے ہیں۔

ہم لوگ، کی تشبیہ داخلی کیفیت کی مکمل ترجمان ہے

دل کے ایوانوں کے گل شدہ شمعوں کی قطار

نور خورشید سے سب سے نکلے ہوئے

حسین محبوب کے سیال تصور کی طرح

اپنی تاریکی کو بیچتے ہوئے، لپٹتے ہوئے

تاریکی کو دل کے ایوانوں کے گل شدہ شمعوں کی قطار میں حسین محبوب کے، سیال تصور کی طرح، بھینچے ہوئے کہنا، کس قدر نادر اور اٹھنا ہے، اہل ذوق اس سے بخوبی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

سیاسی لیڈر کے نام، نظم میں، بنو ستانی سیاسی لیڈر کی کم مائی و بیجا رگی کے اظہار کا طریقہ، تشبیہ کے باعث کس قدر موثر ہو گیا ہے

جس طرح تھکے سمندر سے ہر سرگرم ستیز

جس طرح تیسری، کہار پر بیٹھا کرے

تشبیہ سے بنو ستانی کے سیاسی لیڈر کا تصور ہمارے ذہن میں نقشہ کرتا ہے۔ لگتا ہے اور تھکا ہوا، سا ہا سال سے بے آسرا۔ بیچارہ لیڈر اپنی کم مائی اور بے بضاعتی کے ساتھ ہمارے ذہن کے صفحہ قلم پر نقش ہو جاتا ہے۔

فیض کی ایک نظم ہے، 'شامِ ہاد' سے

ایک افسردہ شاہراہ

دور افق پر نظر جمائے ہوئے

سرد مٹی پر اپنے سینے کے

مڑمیں سن کو بچائے ہوئے

جس طرح کوئی غمزدہ خدمت

اپنے دیراں کدے میں موحیال

وصلِ محبوب کے تصور میں

منہو چور - عفو، عضو نڈال

ایک اسٹروہ شام کو ایک ایسے غمزدہ عورت سے تشبیہ دینا، جو اصل محبوب کے تقویر پر ہموں خیار ہے اور اس کے ہاتھ نڈال اور تمام جسم چمڑ چمڑ ہے، کس قدر ناورس۔ اس کی تعریف حیلہ تحریرت باہر ہے۔ تشبیہ کی کئی طرحیں شاعر فیض تشبیہات کو انوس لہر میں سمو کر شاد و شریک لال پینہ اور چھوٹا سارہ، اڑا نا اور گونا گوں قہمی حقے بنا چکا ہے۔ فیض کا نفاذ اسلوب ہے۔

ایک خصوصیت فیض کی شاعری میں اور بھاری مارچ الی جاتی ہے۔ جو دیرینہ عذری کی کہن شعر ہے۔ اس میں ہے اور دیر چمڑا کر اور بھاری مارچ ہے۔ اور اسٹروہ لال پینہ اور چھوٹا سارہ، اڑا نا اور گونا گوں قہمی حقے بنا چکا ہے۔ فیض کا نفاذ اسلوب ہے۔

اعتدال و نامت حبیب وقت اپنی تیز دماغی۔ شاعر میں شوق کی شہرہ کے سرسبز و شاداب درخت کاٹ ڈالے گا لوگوں کی تڑپوں پر ہمت کرے اور ادب میں نئے افغانوں اور تیرسیم کا۔ پ دے گا۔ اور دشاخ میں میر، وردہ، آتش، غائب اور اقبال کو یہ شرف حاصل ہے۔ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر کے اشارہ اور مدد سے اس ضرب انفل ہونے کی صلاحیت اور بھیاؤں سے تودہ خوش اور فیض ہیں۔ فیض کے چند مصرعے اور اشعار سنئے۔۔۔

عجب تیرا دشت ہے سستہ ام آج ہے

کھیل لائوں برسوں سے رہتے

آج تیرا دشت ہے سستہ ام آج ہے

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں کچھ کیا ہے

یوں تھا میں نے فقط جا بجا پورا جو جائے

اور بھی دکھ میں رہا، سنے میر محبت کے دیا

لٹ جاتی ہے اور کونھی افسانہ کیا کیجئے

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے

اپنی ہمت ہے کہ ہم بھی بے ہمت جلتے ہیں

کچھ تو ہے جس سے ہوتی جاتی ہے تیرے جسم میں

زندگی کی کسی غاس کی تباہ جسم میں

ہر گھڑی درد کے بوند لگے جاتے ہیں

چلے جاتے کہ وہ مندر ابھی ہیں آئی

یہی تاریکی تو ہے عسازہ رہا جسم

اور ادب میں غائب، مریم، اقبال کی ترکیب و اشعارات خاص طور سے اوندھ اور سستہ کے راجے کا تذکرہ کرنا اور ان کی زندگی پر دست کی دھج سے اردو ادب میں لڑاں بنا افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں نہایت کی کہانی، شعری و لہجہ بری ترسہ اور رسی، انسانی قیاس، چمن، تفکر، ذہنی وضاحت، تخلیق، اور ستورہ اور دیوتا، اور لسانی کلمات صاف ہوتے رہتے۔ ان میں فیض کے یہاں بھی بہت سی ترکیب و اشعارات اور مضامین ہیں۔ ان کی بانی مریجو، اور دیوتا، اور لسانی کلمات صاف ہوتے رہتے۔ ان میں فیض کے یہاں بھی بہت سی ترکیب و اشعارات اور مضامین ہیں۔ ان کی بانی مریجو، اور دیوتا، اور لسانی کلمات صاف ہوتے رہتے۔

دھل چکی رات، بھرنے لگا تاروں کا غبار
 لڑکھڑائی لگے الوالوں میں خوابیدہ چراغ
 سرنگی راستہ تک تک کہ ہر ایک راہ گزرا
 مجھ کو خاک لے دھندلے سے قدموں کے طرعا
 قل برکت علی برادر سے وصیت دادی
 اپنے بے خواب کو اڈوں کو مقفل کر دی
 اب بیان کوئی نہیں کوئی نہیں لے رہا

دینی کی قسم دیکھتے، اردو ادب میں ایک سوا سا فرق ہے۔ اردو میں بہت کم نظمیں ایسی ہیں جو اس نوعیت اور صنف میں تمام
 اور جو اس وہ اتنی خوش، سلیبی سے نہیں لکھی گئیں۔ کتبہ نظم یا کسی تنہا کے مثال میں۔ جس میں مضمون وصال کے حوالہ سے جو ہے
 ہیں۔ سو برس کی ہندوستانی لکھی گئے، خلق و کردار، تہذیب و تمدن، ذہنی رونق و لپٹی و لذات، ورا حاس تمدن، اس میں ایک شعر
 اور اس قدر مع اہام میں مودا ہے نظم ایک صبرہ یعنی صبر۔ لے لکھی ہے۔ شامت، تاثیر، سادگی، وضاحت، اخلاقی اس نظم کے حوالہ
 یہ شعر میں صبر حرکت سے ہیں۔ اس نظم کو دیکھ کر یہ لکھی گئے، اردو کی، ورنہ پائی جاتے۔ اور یہ صبر معنوں میں صبر و شرم و شرم ہے۔
 جہاں ہی شاعری کے انداز و سبب سے اس میں الفاظ سادہ اور دلکش ہیں۔ اور یہ نیا لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 میں تاثیر و شرم ہے۔ اور اس میں وہ شعر ہے جو لکھی گئے ہیں۔ دل و رمان اس کی لذت متوجہ اور شام شرم ہو جائے۔ اس قسم کی شاعری
 جادو کا اثر رکھتی ہے۔

اس قسم کی دس یا پندرہ نظمیں اردو ادب میں اردو ادب میں وہ شعر ہے جو لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 کی شرم و شرم ہے۔ اور یہ نظم میں اردو ادب میں وہ شعر ہے جو لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 شام شرم و شرم ہے۔ اور یہ نظم میں اردو ادب میں وہ شعر ہے جو لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 نظم میں اردو ادب میں وہ شعر ہے جو لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 معاون ثابت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 پروکینڈا ہو کر رہ جاتی ہے بہت جلدی۔ فی سبب باجنگ و دھارہ ۱۹۷۶ء میں لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 ہے وہ مصنف کا آرت اور اس کا قصہ۔ اور یہ نظم میں اردو ادب میں وہ شعر ہے جو لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 سے خصوص، شرم و شرم ہے۔ اور یہ نظم میں اردو ادب میں وہ شعر ہے جو لکھی گئے ہیں اور جہاں شرم و شرم ہے۔ اور یہ
 عطا کرتے ہیں۔

فیض کا اسلوب بیان پسندیدہ ہے۔ اس کا طرز نگارش اور طریقہ بیان بالکل منفرد ہے اس کا طرز قلم و جہد و رنگ کے تصادم سے
 پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک باغی شاعر ہے، لیکن باغی شاعرانہ مضمون میں نہیں کہ وہ انقلاب و زبردستی، انفرجہ بند کر رہا ہے۔ بلکہ باغی شاعرانہ
 کو اس سے دشمنیوں کی انداز سے بیان کیا ہے۔ باغی ان میں ہیں اس نے باغی جاتر فیض بند کر دیا ہے۔ اور یہ
 باغی انداز میں ہے کہ اس نے ہمیت کو برائی کا توں برقرار رکھا اور شرم و شرم ہے۔ اور یہ

غور میں۔

ایک شعر ہے۔

فریب آرزو کی سہل آنکھیں نہیں جاتا

ہم لہجہ دلی کی دھڑکن کو تیری آواز پر سمجھ

محبوب کی آمد کا انتظار ہے۔ دنیا اور گرد و پیش کی سبھی چیزوں پر غور ہے۔ صرف اس نگاہ پر نظر ہے جس سے محبوب کے آنے کی توقع ہے، طرح طرح کے فریب خیز خیالات آتے ہیں کہ تیری سی دیر کے لئے دل بیل جاتا ہے، لیکن سب نامی مسلسل برق آرا رہتے ہیں اور زیادہ ہو جاتا ہے اور دھڑکن تیرے تیز تر، دھڑکن کے یہ ترجمے کا سبب تو محبوب کے آنے کا خیال تھا۔ لیکن فریب آرزو دیکھئے کہ اس تیز دھڑکن کو محبوب کی آواز پا سمجھا گیا۔ انٹہ سہل آنکھیں نے شعریں اور جان ڈال دی ہے۔ والہا زین اور خود فراموشی کی اس سے بہت مثال فیض کے کام میں آیا ہے۔ یہ شعری غزلوں کا بہترین شعر شمار کیا جاسکتا ہے عاشق کو محبوب سے نگاہیں رہنا۔ گپ تو اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ

ع سب کہنے کی باتیں میں کچھ بکھری نہ کہا جاتا

اور کچھ اس کے غافل پیہم کی وجہ سے گناہیں کرتے مگر فیض کا انداز بیان دیکھئے

تیری چشم الم لازکی خمیر

دل میں کوئی گلا نہیں باقی

چشم الم لازکی ترکیب قابل غور ہے۔ اس کی بورت سے کون انکار کر سکتا ہے اس کا کھڑکے میں بھی شکایت فانی بلکہ ترشح ہوتے لفظ میں اثبات کا پسند لگنا شعر و خصوصیت میں بہت بندہ جیتا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے۔

اک فریبست نگاہی وہ بھی چاروں

دیکھے میں ہم نے جو صلی پروردگار کے

فریبست نگاہ دنیا ہی میں مل سکتی ہے۔ دوسری دنیا میں اس کا وجود تو وجود ذلت کی نہیں ہوتا۔ اس لئے نگاہ کے واسطے کچھ زیادہ وقت درکار ہے۔ تاکہ خوب دل لہوں کہ نگاہ کے جاسکتے۔ اور حوصلہ پروردگار کی فراخ بینی کی دائری جاسکتی۔ چاروں کبنا کس قدر فصیح ہے۔ اور یہ دیکھے میں ہم نے جو صلی پروردگار کے۔ کہنا جس میں لفظی اور بلاغی کا پہلو لگتا ہے بلاغت کے نہیں مطالعہ۔ اگر اس کو دوسرے طریقے سے کہا جاتا تو شعور سے دل کو اتنا پسندی کا احساس ہوتا تو بکری فیض اس نظم اور دوسرے لہجہ پر کونیاں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی دوسرا پہلو اختیار نہیں کرتا۔

فیض کا ایک شعر ہے جس میں اس نے نگاہِ فانی اور میں ہے رویت پاؤں ہے

سیکھی ہیں مے دل کا فریب بندگی

رب کریم ہے تو تیری نگاہ میں ہے

دل کا فریب پہلے بندگی کے کام آئے۔ مگر یہاں تھا اسے تیری نگاہ کے ہم سمجھو بندگی کا احساس ہوا اور میں سے بنوئی کا

پیلو اور غری سب سے سیکھا۔ اگر تیری رگھو میں نہ جایا، تو دل کا فریاد فریاد رہتا۔ اس کا معلوم ہوا کہ رب کریم تیری رگھو میں رہتا ہے، کیونکہ بندگی کا شعور احساس ہو جائے اس بات کی دلیل ہے، شعور کی باریکی اور ندرت قابل غور ہے۔ شاعرانہ بیان، تپکائی اور شگفتگی، اثراتی ہے۔ اسی دلیل و قافیہ میں جگر مراد آبادی کا شعر دیکھیں:

سمجھا تھا میں کہ دور نکل جائوں گا کہیں

دیکھا تو ہر مقام تیری رگھو میں ہے

فیض کا شعر، باریکی پیلو (جن نثری پسند ادب کا قصیدہ نقطہ نظر ہے) اپنے دامن میں سمیٹے ہے، اور رب کریم کو اس کے شعور میں لازمی حیثیت دے رہا ہے۔ برطانیہ اس کے جذبہ شعور میں تشویش پیلو ہے اور اس وجہ سے دونوں کے شعور میں معنوی فعل ہو گیا ہے۔ جگر کا شعرا کی رگھو میں لیکن شاعرانہ ندرت، رنگ و لہجہ جو جذبہ شعور میں ہے وہ جگر کے شعور میں کیا ہے، کیونکہ مجاز حقیقت سے زیادہ لطیف آگے ہوتا ہے۔ فیض خود کہتا ہے:

ہر حقیقت مجاز ہو جانے

کا فکروں کی نماز ہو جائے

دراخ کا شعر ہے۔

لامکان میں بھی تو ایک جلوہ نظر ملے

بے کسی میں تو ادھر ہوں کہ جا کر کبھی نہیں

فیض کا شعر دیکھیں۔

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں

اک ایسی رگھو میں جو تیری رگھو بھی نہیں

دراخ کا شعر معنوی اور حقیقی حیثیت سے تو بہت بلند ہے مگر تیری رگھو بھی نہیں۔ رگھو کا لفظ ہے، نہ جانے کس لئے

شاعرانہ، انشائیہ اور احساس کی رنگینوں میں ہوا کا انداز کر رہا ہے اور فیض کے شعر پر بے اختیار وہ دینے کو طبیعت چاہتی ہے۔

عزل کے شعور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شعروں میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان میں زیادہ بعد نہ ہو۔ اس سے شعور میں تشویش پیدا

ہو جاتی ہے۔ اسی لئے پہلے مشرق، شعر قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ مولانا عبد الرحمان بکھری نے کائنات کی کتاب (۱۹۵۷ء)

(PRACTICAL REASON) سے حوالہ دیتے ہوئے، ایک جگہ لکھا ہے کہ بہت سے شعرا لیتے ہوئے ہیں جن میں آزاد حسن ہوتا ہے۔ وہ

پھولوں کی طرح، اپنے اپنے نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے تمام جان کو مصروف کر دیتے ہیں۔ اگر ان کی شکر کرنے اور ان کے مطالب کے

دررفت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پھانے کی خوشبو سے ان کے پتوں

کو توڑ کر پھیلانے کی کوشش کرے۔ فطرت کے اشعار اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ چنانچہ علامہ بے۔

ہو چوہ عشق، اب ہوس ہی سہی

کیا کہیں غرض ہے اور کئے نماز

اپنی تعمیل کر رہا ہوں میرا

دور نہ تجھ سے تو مجھ کو پسند نہیں!
عشق دل تیرا رستہ تو رستا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے!
عجبے سو کوئی رہی ہے فوج
کاش افشا نے راز ہو جائے!
اک تری دید چھین گئی مجھ سے
دور نہ دنیا میں کیا نہیں باقی
چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے
دستِ قدرت کو سبے اثر کرے

یہ وہ خصوصیت ہے جو اسے ترقی پسند ذہن اور خوش مزاج بنی سب سے نمایاں و ممتاز دورہ دہانے سے لے کر کاٹی ہے۔
فیض کی غزلیں ہوتی تو ہیں دو اور دو چار قسم کی۔ اور وہ بات بھی ایسی بن کر ہے کہ ایک مثلث کے تین زاویے برابر، دو زاویے
قائمہ ہوتے ہیں مگر اس کی ان سیدھی سا محسوس نہیں ہوتی وہ المیہ قیامت اور وہ قیامت پر غور آتی ہے کہ کیا اٹھایا اور کیا گویا۔
پہتا ہے۔

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے۔
نہ گئی تب ہی بے رنگی رہ گئی!
ہم سہم تری آرزو بھی کبھی بیٹھے
رازا غارت چھپا ہے دیکھ لیا
دل نہایت کچھ جھلائے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

ایک نام بات اور فیض کی دوسرے دور کی غزلوں میں زندگی سے تربت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور
وہ ہمہ یاد طلسم کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے۔ یاد محبوب پر غم روزگار جاری آجاتے ہیں۔ اندر اس کو محبوب کی یاد سے زیادہ اڑنے
کے دکھیں دھڑکی لگتی آتی ہے۔

دیتا ہے تیری یاد سے بیکار کر دیا!
تجھ سے بھی دلفریب ہم غم روزگار کر

فیض کی غزلیں دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی غزل میں زندہ رہنے کی سکت اور صلاحیت موجود ہے۔
مختصراً فیض کی شاعری نے جہاں نئی شاعری میں ایک نئے اسکول کی بنیاد رکھ کر ہمیں دھوکہ نہ دیا ہے۔ وہاں یہیں خارجی

فرد زادیہ لکھا ہے بھی مانوس کیا ہے۔ وہ قدیم و جدید شاعری کے شکم پر کھڑا ہے۔ فیض جیسا کہ سب کے شاہنشاہ ایک سائنس دان

ہوتا ہے اور یہ فانی جگر شاہوچی زندگی کے تضاد کو محسوس مزور کرتا ہے لیکن یکلے اس نگر وہ تضاد کو منطق کے استدلال سے حل کرے: وہ اسے قوتِ خفیز اور شعریّت کے ذریعے کرتا ہے۔ چونکہ یہی ایک ذریعہ ہے جس کے واسطے سے شاعر زندگی کے متضاد حل سوچتا اور لکھتا ہے۔ فیض، عین تمام کا شاعر ہے۔ وہ دنیا کی ہر چہت نقطہ نظر، شاعری کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ کاش فیض اس بات کی صداقت کو خیر محسوس کرتے سے

فیض ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر لکھتے رہا کر دینے!

دل پر موت کا ہنر تو دیکھو جنم ۳۲۰ سے آج تک

فیض کا نام مختلف ہے لیکن شاعر کی میراث کی بنیاد سے ملتا رہا ہے۔ نہ کہ انیت سے متاثر اس کا لفظ اس کے کلام کی قریباً ہر جگہ ملتا ہے۔ وہ اپنی شعر میں جتنوں اور شعری ہنر ناموں میں اسپین کے شہر رائیڈائی شاعر لوئیک کے ہم پلہ ہیں جس کے ساتھ وہ دل و دماغ کی بہت سی خصوصیات بھی مشترک رکھتے ہیں۔ (۱۹۹۱ء)

یہ اقتباسات لفظی اعتبار سے ملتا ہے۔ ہر ذریعہ فرقہ میں سے فیض کی شاعر سے متعلق لکھیں۔ یہ ابھی صاحب کا اعزاز ہے کہ جہاں کچھ فیض ممبر کے ہیں ان کو یہ جاننے کی شاعری جس راویہ میں کی مستحق ہے اس کا ایک حرت بھی مجھ سے ہے۔ اور وہ ادا بھی کیونکر ہو کہ یہ عامہ شعور کا ہے ہی نہیں جس نے اپنی آنکھوں سے غم کی پیدل چل دی ہو، دل و دماغ کے ٹکڑے پھیل دیے ہیں جس نے آواز ہنروں میں جس نے خون دل میں آنکھیں رپولی ہو، اور یہ جلد و تحریر میں زبان رکھ دی ہو۔ جس کے قائل و لکھوں کے تمثیل سے تاریکی شب میں نور کو نہا ہے جس کے وہ تاریکی میں آئینے کا پیغام لائی ہو جس کی اکام ہانڈے و روکے سے فقر کو دیتے ہیں اور ان کی شاعری کا ذراچہ الفاظ نہیں بدلتا ہے

پونچھتے ہیں وہ جہاں نشر کو
تمہیں حسرت اٹھو سلام کرو

شاعر حیات و کائنات سے

اور ہمہ رشتہ کی ناہمواری کو ناپائیدار تھکرات ان کی موتی ہوئی قوتوں کو بجا ہا اس کی ہمت کو نکالتا ہے۔

یہ انقلاط میں دینا نکلا ہنوں میں حرات ہے ہر ایک
اس دن میں صداقت ہے جب تک اس خلق میں طاقت ہے ہر ایک
اس فنی و مدامل کو ہم تم سکھلائی کے غرض برطیت
وہ ستر سن میں آگے دیں ہنگامہ طبعی قیصر دے
یہ شام و سحر ہے شمس و قمر یہ فقر کو کب اپنے عین
یہ لوح و قلم یہ خلی و علی یہ سال و ختم سب اپنے ہیں

سید ابوالخیر کشفی

وقتِ فتنے کی یادیں اور یہ

یہ مضمون جیل سے صاحبِ دماغ آپ کے دفتر بہتر ہرگز نہیں لکھا گیا۔ شروع ہوئی
ہے۔ ان کی مجلس میں ماضی حال تنہا ہے۔

WHATEVER LIFE MAY BE IT IS AN EXPERIENCE.

Whatever experience may be, it is a
flow through time, a duration, a many-colored
episode in eternity.

IRWIN EDMAN

بکیر کا پہلا شعری مجموعہ انشراحِ بکیر نامی مضمون پاکستان سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ اس وقت میں ابھی اسٹوڈنٹ کی حیثیت پر
جماعتوں کی کمی نہ ہونے پاتا تھا۔ انشراحِ بکیر نامی مضمون پاکستان سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ اس وقت میں ابھی اسٹوڈنٹ کی حیثیت پر
وقت کے کتنے کتنے گزر چکے ہیں۔ سروسوں کی کوششوں سے بچے۔ اور آپ کے کچھ بھائیوں اور کچھ دیکھے نہیں کی شاعری بھی ان
ماہوں سے گزر کر حکیم ادب نے اس مقام تک پہنچی ہے کہ آج فیض بکیر کے کچھ بار ہیں۔
ایک میں نے جو کچھ عرض کیا اس میں وقت نہیں میں اور تم دیر سے ملنے اور آپ سب ہم سے ہیں۔ انشاوارہا ہی اس کے تذکرہ
بم سکا ہو چکا۔

میر کا ایک کالج کے پہلے سال سے لے کر اب تک نہیں رہے۔ ان کے کچھ بھائیوں کے ساتھ زندگی میں بوجھ زن رہی ہے
میں شاید واسطہ طور پر ان کی عزت و محبت کی قیاس کے واسطے میں سب سے بڑی رکاوٹ رہا ہوں۔ آؤ گی خوب بہت بہت
شکلی کرتا ہے اور اپنی انجینئر کے بت کو توڑ نہیں پاتا۔

ہر خند بک دستِ بختِ بکستی میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سب گراں دار

اور ویسے بھی ہر خوش کار راہِ بختِ بک دستِ بختِ بکستی میں — جو خواہش پوری نہیں ہو تیں بد

دل کے زخم اس غلغلی کی طرح رچا ہے۔ کسی کا نام کہتے ہیں۔ میری ایک خواہش تو یہی کہ ہوں ہے، کوئی میرا سال اور ایسی
میں نہیں ہے، معنوں کے رہا ہوں۔ میری بعض دوسری خواہشوں میں سے ایک یہ ہے کہ میں وہی ہوں اور کچھ میری ہیں، مثلاً میں چھوٹی
میں رہی ہوں وہی نہ ہو۔ رشید احمد صدیقی اور راجندر سنگھ بیدی سے ملاقات میرے لئے خواہش کا درجہ رکھتی ہے اور جب
میں کسی یا علی گڑھ گیا تو گیارہ سال کی عمر میں وہی میری طرف سے کسی دوسری طرف ہو گیا۔

بچہ ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے

وہ بد نصیب ہے بخت نارسا نہ ملا

خدا۔۔۔۔۔ اور میری اہم علی المرتضیٰ علیہ السلام کی حدیث بھی تو ہے۔ "وقت کو برا نہ کہو۔ وقت
خدا ہے۔" دیکھئے خدا ارادہ پرستی اور بخت نارسا میں بھی "وقت کا غم موجود ہے۔"

میں نے وہی میں مشکل سے تیار پا دیں کہ اس سنگسار کے اندر لاکے ساتھ ساتھ فتنہ پاکستان زندہ باد کے نعروں سے
گوں رہی تھی۔ دوسری جانب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ پاکستان کی تحریک کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی
اس میں تین تین کا دشمنی۔ ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک سے مل کر لگتا ہے قائم ہو گیا تھا۔ یہ تو بہت دنوں بعد قیام پاکستان کے بعد کی
بات ہے، جب جیتی تھی یہ اصحاب کی ایک نوجوان مشق تھی کہ وہ ترقی پسند تھے۔ اور یہی اعلان اس تحریک کی موت بنا۔

میں نے اسے مشکل سے ایک دور میری اور میرے دو تین عزیز ساتھیوں کی زندگی کا تشکیلی دور رہا۔ ایک طرف ہم
شخصوں میں سوا ہو کر رہے، گھر سے گھر سے ان سے ملنے کے رہیں گے، پاکستان کے نئے نئے نعرے لگتے تھے اور دوسری طرف ادب
کا معاملہ کر رہے تھے۔ مابین اس کے پاس کرنے سے پہلے ہی اقبال اور جوش کو تو جھوٹے، فیض، راشد، میراجی، مخدوم جی، مدین
مجاذ بیدی، جانا شاد اختر، سلیم بھٹی، شہری، اختر الامین، اختر زمر، پوری، احمد علی، کرشن، چندر، ملنگ، عصمت سے ہمارا
ذہنی رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

راتی "اور ادبی دنیا"۔ دور سوائے اس میں نئے ادب کے نشاۃ کی وجہ رکھتے تھے۔ ادب کے ان راستوں پر شمیم
صاحبہ، بیات قانعہ، ماریتھ، ادبی، انیس اور راتی وہ باندھتے تھے اور پھر ہمارے باہمی تعلقات اس بات پر بڑھ جاتے
کہ شمیم صاحبہ کی رسانی یاد آتی دنیا سے کون بڑھے۔

ترقی پسند تحریک اور نئے ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ شاعری کے قدیم اسالیب بھی زندہ تھے۔ غزل کو تو عہد حاضر کے
سب سے زیادہ باقی شاعر میراجی نے سدا بہار بنایا تھا۔ نیا ادب ہمارے گرد و پیش کے لئے کوئی خلا نہ رہا اور نہ تمام باندھ دیا
تھا۔ نوجوان میراجی نے دنیا سے تشنگی کے طور پر شریانی جھڑپوں میں دم لینا سیکھ چکے تھے۔ اب ڈرامہ کی تشریح
ہی نہ تھی کہ تہذیبی مضامین کے علاوہ جوش، غلام علی، احمد حسین غازی اور مظہر الحق اس گروہ میں شامل تھے۔ مظہر، شمیم
صاحبہ کے حلقہ جوش تھے۔ وہ عالم ہندی صاحب کے مقلد تھے۔ اور یوں ان کی دوستی کے وسیع سے اسلم جوش صاحب سے بھی
میں نے بہت کچھ سیکھا۔ شمیم صاحبہ نے کہا کہ ایک بھائی ساڑھن کا آس اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری زندگی کا حصہ بن گیا۔ یہ وہاں
کہ میں پڑھنے آیا تھا۔ سگر نوجوان کے ساتھ نامہ سے فیض کے نقش فریادی لکھا، یہ انہیں ہم نے ایک ساتھ ملے کس بل کا یہ لڑکا آج کا

نہ گنا۔ اپنا کمال فیض کا یہ شعر غمدی نے سنایا۔

نہ جانے کس لئے امیدوار ہیں

اک ایسی راہ یہ جو تیری رہ گزری ہی نہیں

اور میں تیرے جلا کر غزل کی رہ نور کو ایک نیارا کی مل گیا اور اس کا نام نہیں ہے۔

میں نے کسی کو بھی لکھا ہے کہ ”بعد وقت کسی کی حرمت میں آیا ہے جو میری گرفت میں آئے گا۔“ میں میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس دور کو تحریر کے زوال میں مقید کر سکوں۔ بی بیض ہیں۔ کتنے ہی نام ہیں آچکے ہیں اور کتنے ہی باقی ہیں۔ یہاں دو تین باقی دراز تیرے کہنا ہی ہوتا ہوں۔ نمبر ۱ اور نمبر ۲ وغیرہ سے مجھے نفرت ہے۔ مگر یہ بھی ہے۔

۱۔ اس دور میں پندرہ سولہ سال کے لڑکے محض اپنے عہد کے مقبول ادب کو سامنے رکھ کر فیضی نہیں کرتے تھے۔ ہم خوش گوئی کو عظمت قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ دور مشاعروں کا دور تھا۔ ہر سال سر دیو میں مشاعروں کا سیزن آتا تھا۔ جگہ مراد آبادی، حنیفہ، مہاراجہ، احسان، انش، ساغر نظامی، ماہر نظامی، شعری، جوبانی، راز مراد آبادی، مشاعروں کے دو ہل تھے۔ ان کے کچھ بعد شکیل بہاؤی، اور غبار بارہ شکاری چکے۔ جوش صاحب مشاعروں میں زیادہ کم ہی آتے تھے۔ ہماری کتنی ہی راجی مشاعروں میں جا گئے گزرتیں۔ ان لڑکوں کے شعر ہم سننے۔ پسند بھی کرتے مگر اب ہماری توجہ کا مرکز اشد فیضی، عجاز اور جلی بن رہے تھے۔ مشاعروں کے اس عہد کے کتنے ہی شاعر اب تو طاق شب ال کے گھمے تھے بھی نہ رہے، لیکن کل کے وہ نے نام تاریخ ادب کا حصہ بن گئے ہیں۔

۲۔ اچھے اور پھر کچھ ہوسے اشعار پر ہم لوگ کل کر ڈاڑھ دیتے لیکن انہیں اپنے پورے شعری ادب کا حصہ نہ سمجھتے تھے۔ فیض کا پہلا شعر ہم نے سنایا اور اسے اپنے شعری ادب کے پس منظر میں دیکھا اور پورے ادب پر نگہ کیا۔ آج یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ سال بھر ہم جن طالب علموں کو پھر سے فیض تک اپنا بہترین شعری ادب پڑھاتے ہیں۔ مشاعروں کے زمانہ میں وہ مراد آبادی سیار سے بے نیاز ہو کر خوش آوازی کا شکار ہو جاتے ہیں اور مرزا خاں کے آہ و گہاں تک پھیلاتے نظر آتے ہیں (ایسے شاعر بھی کبھی غلبہ کے قلم سے شہرت لے جاتے ہیں اور طالب علم یہاں کچھ نہیں کہتے۔ ہاں ایک دن کراچی یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ٹیپس انجینئر سے فیض صاحب کا قلم اپنی جیب میں لگایا تھا)۔

۳۔ اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے میں یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ کتنے ہی بڑے شاعر ہمارے گھر آتے۔ ہمارا گھر جو خانقاہ کا حصہ تھا وہاں جوش صاحب اور جگر صاحب محض فرط تھے۔ شادانی صاحب کی آواز بھی وہیں پردہ دل، اپنی ماسوائی، اثر کھتری بھی گھر کم فرماتے۔ ساغر نظامی اور روش صدیقی بھی آتے۔ ان آتے جاتے شاعروں کے ہجوم میں فیض مجھ سے قریب نہ رہتے تھے۔ فیض ہمیں بہت سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

۴۔ آپ اپنے عزیز ترین دوست کے بارے میں ذرا یہ تو سوچئے کہ اس تپنی بارک اور کہاں لڑکھاتا ہوئی بھی ہے جہتیں ہے کہ آپ کو یہ بات یاد نہ آئے گی۔ مگر یہ کسی عجیب بات ہے کہ یہ ”بات“ اچھی طرح یاد ہے کہ فیض کا سب سے پہلا شعر ہم کب

۱۵ مضمون کے عنوان کو نہ بھولے۔

جب کبھی ہم نے کیا عشقِ پیشمان ہوئے زندگی سے تو ابھی اور پشیمان ہو گئے
حسرت کی غزل کی طرح حقیقتِ ہوشیار پر ہی کی غزل کا ہجر ہماری عام زندگی کے ہیکر کی یاد دلاتا ہے۔ ہمارا وہ ہجر جس میں ہمارے
محبوب سے یا تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں۔
ہاں صاحبِ ترہیں غزل کی رہ گزر رہا ایک نئے راہی کا نقشِ قدم مل گیا ہمارے لئے پہلا نقشِ
قدم تھا۔

نہ چلنے کس لئے امیدوار.....

نقشبِ فرادی کی اشاعت ہمارے لئے ایک ادبی واقعہ تھی۔ آئی ہوتا یہ ہے کہ کتاب کو ادبی انعام پہلے ملتا ہے اور کتاب بازار
میں بعد میں دھجی جاتی ہے۔ ہمارے رہے ہمارے ادب کے قافلے کی یہ شکرست پائی۔ وہ قافلہ جو کبھی تلاشِ بہاراں میں نکلا تھا شاہِ ایک
ایسے جنگل میں گم ہو گیا ہے، جسے ہم اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے دشت و فاسکے گئے ہیں۔ کبھی تو ہمارے ایک شاعر نے دشت
امکن کو کھن نقشبِ با قرار دیکر شکرست کے دوسرے قدم کا تقاضا کیا تھا اور وہ بھی کس نے، خالقِ کائنات سے اور آج ہم دشت
امکن کے تسوے سے بھی گھبرا کر کسی فلمی منظر کے گھوڑوں کو یا اس سے متعلق شاعری کو سب کچھ مینے ہیں۔

میرا آپ سے یہ عرض کرنا تھا کہ تمام پاکستان سے پہلے اچھی کتابوں کی اشاعت ادبی واقعہ بن جاتی تھی۔ کتاب کا بنور
میں نہ ملتی تھی تو ہم لکھنا چاہتے۔ دانش محل، ایوانِ ادب، پارک، محنت دین ہمارا محبوب تھا نہ تھا۔ ہم صاحبِ گل بھی ویسے ہی شکرست
تھے جیسے آج منکر لے ہیں۔ ان کے "استقبالیہ انداز" میں رتی جھڑکی تھی۔ نہ آیا۔ مولانا آزاد کے طوطا کے مجموعہ "خیارِ خاطر" کی اشاعت
سے پہلے ہی اس کی سینکڑوں کاپیاں اسی طرح غمناک لگی گئیں تھیں آج کل سینما کی نشستیں مغللوں کی جا رہی ہیں۔ نقشبِ فرادی کی اشاعت
ہمارے لئے بنی نہیں بلکہ ہمارے مجید ادب کے لئے ایک واقعہ تھی اور ایسے واقعات ان دنوں بھی جایا کرتے تھے۔ کبھی "ماورا" کے روپ
میں کبھی "شکرست" کی صورت میں یا کوئی ایسا ہی واقعہ "چرخیں" یا "عمر" میں یکے بعد دیگرے شکرست کی ایک رات "جزیرے" "گزیر" کہاں
یک نام بنائیں۔

وقتِ انسا بیت گیا ہے، نقشبِ فرادی کی اشاعت سے اب ایک کتاب اشعار کے ذکر کی جگہ نقشبِ فرادی کا تذکرہ مناسب
ہو گا۔ مگر پہلے فیض کی غزلوں کے دو تین شعروں کی بات تو ہونے۔

و نہ جانے کس لئے کے بعد فیض کے حواشِ عارجم نے برا بھلا سے اور بن بار باجیش ہو کر۔ رٹائیاں جو میں وہ ہیں
اولے حسن کی مصروفیت کو کو کرنا غنا بگوار نظر کو کتاب آتا ہے

اپنی نظریں کچھ دے ساقی میرے نامہ دار نہ سحر نہ نہیں
اپنی تخیل کر رہا ہوں میں ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

فریبِ آرزو کی سہل نگاری نہیں باقی ہم اپنے دل کی طرح کن کرسی آواز کبھی

کے قطعات کی بھی شامل کر لیے۔

میری آپاجان و آپاجان میری حقیقی بہن نہیں، لیکن وہ میری محرموں کا آسمانی جواب ہیں۔ میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہوں۔ جین ہمارے قریب رہتے تھے۔ آپاجان ان کی بڑی بہن ہیں۔ دو بہن دو بھائی آپاجان ہیں۔ برابر کی آپاجان۔ نہ کم نہ زیادہ۔ شہزادہ اس امی کے انتہائی کے بعد آپاجان میرے لئے کچھ اور ضروری ہوئی تھیں، ایک شادی ہو چکی تھی۔ غالباً مسکند میں وہ میری کھٹ کا پورا آئیں۔ ادیب کے امتحان کی تیاری کے لئے ہیں، نویں جماعت میں پڑھتا تھا، عمو جان اور حضرت شہناز کو پڑی نہ ملا، لہذا کے پاس بلالہ کے کچھ طالب علم بھی کھوار اردو پڑھتے آجاتے تھے۔ اگر عمو جان گھر سے نہ ہوتے تو انہیں ہی پڑھانا تھا۔ یہ عمو جان اور میرے استاد مولوی محمد سعید خان، روزی کا بیٹا، غلام، روزی صاحبہ جنہوں نے مجھے فارسی اس مکتب سے پڑھائی تھی، کہ نو دس سال کی عمر میں میں بے مکان فارسی میں تفسیر کر سکتا تھا۔ ہاں تو آپاجان کو بھی ادیب کا نصاب پڑھانے لگا۔ دیوان غلام، اور ہنگ درانی غلام و لہذا کے لکھ کر نقوشِ فریادی اور نروال کی دنیا میں پہنچ جاتے، آہ بھائی، اور جاز سے وہی رشتہ اور ذاتی ملاقات۔ شہزادہ سے شروع ہوئی تھی، سرسراہ میں، انہیں ایک دن مولیٰ سمجھا، شروع ہوئی تھی۔ جبر کے تین باب اب بھی میرے پاس رکھے ہیں، سو، پہلا باب، سہ، اور نام (سنہ، ایک دس سال میں مسٹ لکے ہوا تھا، اس کا ایک، قتب، پیش کرتا ہوں۔

پھر آپاجان ادیب کا امتحان دینے آئیں۔ وہ آج کل غلام کی رہ رہے لکھنے لگا، انہیں وہ قتب لکھتے، دیکھتے اور اس کے سبب لکھنے کا حق اڑاتیں۔۔۔ آپاجان کس قدر روزین تھیں۔ اردو شاعری اور دو تنقید پر وہ جو اعتراض کرتی تھیں، اسے وہ پیر لٹن ہر جانتا تھا۔ دیکھتے، بھارت۔ یہ نقد دیکھی ہر شے کے بارے میں الٹ ہی تھی، ان کے کچھ تیر، کہ ہم میں میری دوست بلالہ۔ بندشیں چست ہیں ادیب میں بڑا اور بجا مقام ہے۔ اور وہ انہوں کے جواب میں خاموش ہو کر دل ہی دل میں اردو لکھنا دوں، ان کا کیا دل دینے لگتا۔۔۔ آج تو آپاجان اسے بڑی طرح یاد آئے تھیں۔ ہر چیز میں ان کی سب سے پر اجرت تھی۔۔۔ اسے فیض بہت پسند تھا اور آپاجان کو جلدی۔ آپاجان بیٹے بیٹے لکھنا لگتے تھے۔

وہ جو خود داری پر خود داری سے غم دل ان سے بہت دور تھیں میں تو نہ جا پہنچا کا کوئی۔۔۔ یا اسے ہونی بلات کوئی زیادہ چار چار لکھتے تھے کچھ کوئی بھی کہیں۔ سارا سے طوائف بہت تھیں ان دنوں آپاجان کو نقوشِ فریادی یاد کر دی۔ فیض کی نقوش۔۔۔ مجھے پہلی ہی محبت میں، میرا نہ مانگ، رتب سے۔ اور سرور شبانہ۔ سنائی، لیکن نہ جنت کیو نہ فیض، جذبات کی جگہ نہ لے لے کہ اور آواز اس نے جل کر آپاجان کی گلابوں میں سے سرور دان، غالب کر دی۔ جب نروال نہ ملی تو آپاجان کس قدر اندر دھیمہ۔۔۔ یہ سوچ کر اسے مر آئے لگا۔

ظاہر ہے کہ اس نا تمام ناول کا وہ "ہیں" ہوں۔ اور آج نا تمام ناول کے تینوں باب جو مجھے سترہ میں شاہ کا مضمون ہوتے تھے۔ ویسے ہی معلوم ہو رہے ہیں۔ جیسے فیض نقوشِ فریادی کی ابتدائی نقوش معلوم ہوئی ہوں گی، فیض تو غیر ان نقوش کے خالق ہیں اور ہر تخلیقی وجود کیا جلتے کے بعد ناول کی نظر سے گر جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس دور میں "آزادی خط" اور "انقلاب" جیسی نقوش کچھ بھی ترسدا بہار ادبی تخلیقات معلوم ہوئی تھیں۔ وقت بھی بجا چیرہ ہے۔ کیسے کیسے نقوش بنانا اور بنانا ہے۔

ہم جنس پرستانہ حیوانات ثانی اسکول کے آخری درجوں میں۔۔۔ ہوتے ہیں اور ان کے خیال کے مطابق زندگی کے کسی دور نہ جان رہے ہیں، بعض دوسے عمل بناتے ہیں، بعض کی شخصیت کی تشکیل میں یہ رجحانات فوجی طور پر اپنا کردار ادا کرتے ہیں، اور یہ سب کچھ لکھے ہوئے نچے اپنے دودوست یاد آتے ہیں یہ دور وہ تھا کہ اگر ان میں سے کسی سے رٹائی ہو جائی تو میں اسے بڑا جاہل یا کسی سا خطا کھٹا اور ان کی اس پیشتر تہذیب کی نظم و خدا و وقت نہ آئے۔۔۔۔۔ کے ان مصرعوں پر ختم ہونے کے
خدا و وقت نہ لے سکے کہ جو گریا آئے وہ دل کہ تیرے لئے ہم قرار پا جائے

دوہ تک جس کو ترا استاد ابھی جا

اس دور کا دیکھنا سے مستعد نہ ہوتا کہ وہ جو بچا ہے۔۔۔ کے اب ذرا آئے جیسے شہدہ ایس غائب نقش فروری کا قیصر ایدین خان شاعر جو بچا تھا۔ اس سے اس دور کے مقبرہ میں کو اندازہ ہو سکتا ہے، یہ مقبرہ بہت طویل ہے بن رہا ابھرتے مجاز و ساحر ارمیا نوی کے جسے یہ آئی ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص فریادی "آئینک" کے خیال "کے" یعنی اس طرح شائع ہوتے رہے تھے، وجہ عام یہ کہ ہماری تہذیب ثانی اور اس کے برعکس نہ جرات کی و بیزیر پر قدم نہیں لگاتا اور انرا نہیں ادا دقت ہوگا تو وہ اخر پشوری، بعض مجاز و ساحر کو اس طبع میں سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے جہلوت کے یہ صاحبان۔۔۔ لیکن ہماری نشوونما میں جیسا کہ میں کہ چکا ہوں دیوان غائب سے نئے سرہ آئے، اور ان کا شمار ان کے انجم میں عبدالحی فیضی کو شاعری کا "ہمسایہ" میں سمجھتے ہیں شاعر ہماری فوجیائی کے جذبات سے تیار نہ ہوئے لیکن ان کے ان جذبات سے ترجمان ہے۔

نفس سے مستعد ایک ایسا جو میں چلی نقش فریادی کا کھٹا۔۔۔۔۔ جوری رہا، محو بہ ہم لوگ پندرہ سو سال کی عمر میں جذباتی اور فریادی اور یہ زمانہ تھا، ہرچیز پر ہم محروم غائب ہیں اس دنیا، تو تلاش کر کے کثرت میں گھر رہے تھے جو غیبت کے پردے میں پیچ کر آتے تھے، ان کے اس احساس میں جیلا تھا کہ نقش فریادی کی شہادت قبل از و دنیا ہوئی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ آنکھوں ہوا کہ اس عمر کے بعض غیبی اور شاعر ہمارے شاعر تھے، ان میں ہمیشہ انداز میں گئے، بے باک فروریں اور آہنگ کے ساتھ یہ دنیا بے سستی ہے، ان میں سمجھتا ہوں کہ ان محروموں کی اشاعت ہر روز کی قابل از وقت بھی، کیونکہ ان کے فیوض شاعرانہ نے اپنی اراقت کے بارے میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ شاعر احمدیہ دور کے اندر گروہ واری کی طرح ایک سلسلہ پر نظر آتے

(۲)

ایک ایک پرستہ، جو کچھ کھائے اس غایت میں نقش فریادی کے، دنیا چھوڑ کر دل کی چند سطریہ پر چلی ہیں (جو سنو اگر بچا ہوں یا اپنے ادھر سے ناول کو تامل کر کے ایک، کتابیں نقل کر کے، کائنات کا دھڑکنا، دل پاہتا ہے کہ دران نقش فریادی کا بستر و آج تو دل اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کروں۔ مگر یہ کام تو "کھارے" یعنی مجھ کے دوسرے نقاد کریں گے اور یقیناً مجھ سے بہتر طریقہ لیکن میں وقت کے عنصر کو سامنے رکھتے ہوں نقش فریادی کے بارے میں کچھ اور باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔
ترکے تکتانوں سے قطع نظر نقش فریادی کا فیضان ہمیں اس سے چند تھا کہ اس نے دہشت نامک طور پر ہماری ادبی روایت اور رمز و علامت سے عمل کی کوشش نہیں کی تھی، جیسے میرزا نے دراشت کی قیادت پر روایت کا سایہ بہت گہرا ہے) پھر فیض کے علاوہ اب ایک تاریخی مانیان اور انفرادیت تو فیض کے اسلوب نے ہمارے شاعروں کو جس حد تک متاثر کیا ہے، اس

عقی دہر کی قید بھی نہ تھی۔ زمستان کی سرودات میں کچ باغ ہوا ہی، ان کی اس نظم میں عورت ایک ریت کی طرح سامنے آتی ہے۔ اس کی ریت کی طرح جسے زندگی کو بدلنے کی تمناؤں نے شاعر سے وابستہ کر دیا تھا۔

کہاں ہیں وہ دنیا کی تزئین کی آرزوئیں

جنہوں نے تجھے مجھ سے وابستہ کر دیا تھا

میں نے ذہنی ناچنگی کہہ دی۔ فنی طور پر نقشِ فریادی کے دوسرے حصے کے آغاز ہی سے الفاظ پر فیض کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے۔ ہم تذکروں کی تنقید کو رکھی کہتے ہیں۔ "ادبہ۔ یہ تذکرہ نگار۔ لغظوں، ترکیبوں اور بناؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ اور تذکروں پر ایسے اعتراض کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ الفاظ تو معنی کی ملفوظی تصویریں ہیں۔ لغظ ثقافت کی تاریخ بیان کرتے ہیں بلکہ ثقافت کی روح من کر ماضی کی اماخیزوں، جذباتوں اور رشتوں کو جان دے مستقبل کے حوالے کرتے ہیں۔ اردو کے دو تین ہی نقطے لیجئے "صاحب" "میاں"۔ "قاتل" الفاظ تو بلاغ کی ایک متحرک اور پرنحلی صورت ہیں۔

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سبھی

جو غلط فکر غالب مرث اشعار میں آد

وہ بھی خوب دن تھے جب لوگ کہتے تھے "سبحان اللہ! کیا زبان کا شعر۔ یہ تو کیا زبان اور لہجہ ابلغ نہ ہوئی فضا میں تنا ہوا سر ہو گئی اور شاعر نے جو اس سے پر چل رہا ہے۔ نقشِ فریادی کے دوسرے حصے میں مینے کے پہاڑ، زبان کی نمود کا کوئی شوق نہیں ہے۔ بہ مشوق شاید انہیں کبھی نہیں رہا، لیکن اس حصے میں معانی، اظہار کا رشتہ قوی تر ہو گیا ہے۔

اجتماعی احساسات نقشِ فریادی کے دوسرے حصے میں بہت نمایاں ہیں، اور اس کو فیصلے غلطی سے "جانے حزمیدم، کہہ کر اپنے ساتھ ساتھ زندگی کے ساتھ بھی زیادتی کی ہے۔ آدمی بھی زندگی کی طرح ایک اکالہ ہے۔ یہاں جان و دل کی تفریق ممکن نہیں بڑی حقیقت شاعری میں بھی تراجمی احساسات ہوتے ہیں۔ اگر نہ ہوں تو میں دوسرے کی چو ما چائی، شب وصل، کچ تہائی، گوشہ پن، وغیرہ وغیرہ دیکھی ہیں۔ سوچ "میں انتہائی سادگی کے باوجود "جان" ہے۔ وہ جان جو معاشرے سے ہم آہنگ ہو کر نصیب ہوتی ہے۔ جب قطر و دیا بجا ہے، جب "میں"، "ہم" "تجارت" جب آہ کی کہہ اٹھتا ہے۔

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا ہے؟

"سوچ" کے لیے وہ "خرا" ہے جس نے میں اور دغوالی کی راؤ کر رہا ہے۔ راہی کی نوید سنائی تھی۔ میں نے سانس کی پس منظر میں بات صرف غائب کی تھی۔ محو یہ غزل پڑھنے۔ "یہ" ہے اور انداز و اسباب پر فراق کو رکھوری کا اثر نظر نہیں آتا۔

وڈائے ویدہ نہیں وعدہ دگر بھی نہیں

وہ مجھ سے۔ وٹے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں

متفاد و کیفیات کا اجتماع فراق کی اولے سے خاص ہے۔ ویسے حسرت بھی ذہن کی اس بات میں فراق سے پہلے پہنچ گئے تھے۔

نہیں آئی جوانی و ان کی ہلینوں تک نہہر آئی

مگر جب یاد آئے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

کی اس غزل کے سلسلہ میں اس وقت میں فراق کی اس غزل کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔
 مریں سودا بھی نہیں دلیں تمنا بھی نہیں شین اس ترکِ محبت کا بھر وسا بھی نہیں
 مدیں گزریں تری یاد بھی آئی یہ نہیں ہم تجھے بھول گئے ہوں مگر ایسا بھی نہیں
 رہ مگر میرے لئے غزل بھی ہے اور زندگی بھی۔ فراق کا شعور ہے۔
 یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھا نیا بھی دیکھ نہ سکتا مسافروں سے کہو اس کی رہ گزرا آئی

رہ گزر زندگی بھی ہے اور غزل بھی یہ رہ گزر کبھی عالمی نہ ہوگی آپ کا اس راہ سے گزرنے ہی نہیں گئے۔
 جہاں تک مجھے علم ہے فیض نے اپنے کسی مضمون میں اپنی شاعری پر اپنے معصروں کے اثرات کا تذکرہ نہیں کیا۔ ویسے فراق
 صاحب شاید پہلے نقاد تھے جنہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ فیض کی نظم ”رقتیست“ پر اردو کی عشقِ شاعری میں تبصرہ کیا
 تھا۔ فراق نے جس کھلے دل اور مہلکا قلم انداز میں فیض کی اس نظم کو سراہا ہے۔ اس پرچم آج لوگ اپنے معاصرین کا تذکرہ نہیں کرتے۔
 اردو شاعری میں رقتیسا کا ایک خاص تصور پیدا ہو چکا تھا۔ رقتیسا دوسرا ہے۔ رقتیست جسے میں مہلکا کا دیاں آئی ہیں سنا۔
 اتنی کمیاں مشرق نے بھی عاشق کو ہماری شاعری میں نہیں دی۔ ”رقتیست“ ایک اہم نظم ہے۔ مگر انگریز ایک تصور کو
 تفصیلات عطا کرنے والی نظم میں اس تصور کو نیا نہیں کہو گا۔ جس طرح اقبال کے تصور عشق کی اولین نمودیں نہایت قریب اور
 ذہنی توانائی کے ساتھ میر کے یہاں آئی ہے اور اقبال نے غفلت آدم کے جس فلسفہ کو نقطہ کمال تک پہنچایا اس کے ابتداء میں نعوش
 میر و غالب اور بعض دوسرے شاعر (ان میں ذوق اور داغ جیسے شاعر بھی شامل ہیں) کے یہاں نظر آتے ہیں اس کی طرح رقتیسا
 یہ انسانی تصور اور رقتیست کے ساتھ تعلقات کی یہ نوعیت بھی ہماری شاعری کے لئے کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ مومن اس راہ میں
 فیض کے پیشرو ہیں۔

غیر کے ہر وہ آتا ہے، میں حیران ہوں کس کے استقبال کو جی تن سے میرا ہے
 خاک میں ابلجے یا رب بے کسی کی آبرو غیر میری نعش کے ہر اور تاجا ہے

ایک اور شعر ہے۔

ماتے اس کے نہ کہتے، مگر کہتے ہیں

لذت عشق گئی غیر کے ہر جہان سے

یارانِ معنہ کہنا ہے کہ یہ شعر بھی مومن کہے۔ مجھے یہ شعر کوکوشش کے باوجود ”کلیات مومن میں نہیں مل سکا، مگر ہے یقیناً کسی پرانے
 شاعر کا۔ یہ شعر مومن کا ہو یا کسی اور کا، اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ رقتیسا کا انسانی تصور اردو شاعری کے لئے فیض کی دین نہیں

۱۔ کلیات مومن۔ مطبوعہ نول کشور ۱۹۶۶ء۔ بہت سے نسخوں میں دوسرا مصرع یوں ہے

کس کے استقبال کو جی تن سے نکلا جئے ہے

کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت ربیلوی میں پہلے مصرع میں ”آ“ کی جگہ ”ہو“ ہے۔ جو درست نہیں۔

قدیم شاعران ہر معلوم سے گزر چکے ہیں، اویس غزل اور نظم کے کیوس میں زرق ہے، فیض نے لذت عشق کی تشریح کی ہے اور یوں کی ہے کہ کسی اور شاعر سے بہن نہ پڑی۔ عشق اس کے اور رقیب کے درمیان مشترک تجربہ ہے۔ ایسا تجربہ ہے کہ سہ

ہم نے اس شہزادی کا کھوپا پہ کیا یا پہن ہے جز ترے اور کو سچاؤں تو سچا نہ سگوں

عاجزی، غزلیوں کی حمایت، یاس و حزن اور دکھ درد کے معنی۔۔۔۔۔ کیا اس مصرع میں بھی ایک دنیا آباد نہیں ہے

لذت عشق بھی غیر کے موانع سے

”رتیبہ سے“ کو میں اردو شاعری کے ہر انتخاب میں عکس پانے کا مستحق سمجھتا ہوں، لیکن آج نقش فریادی پر نظر ڈالنے سے اس نظم کا آخری حصہ، تجھے ان من۔ بے جڑ۔ سست اور اس عہد کے فحش کے مطابق نظر آتا ہے (اتنی بات اور سن لیجئے کہ کایات مرگن کی ورق گردانی کرتے ہوئے غیر بارتیبہ سے متعلق جتنے اشعار میری نظر سے گزرے ان میں سے بیشتر میں انسانیت ہے اور روحانی تفحیک و لذت میں نہیں۔)

ابھی کچھ دیر پہلے ہی نظم اور غزل کے کیوس کی بات کر رہا تھا۔ فیض نے نظم کے کیوس پر سنیٹے سے بین و دل کی تصویریں بنائی ہیں مثلاً ”تہنائی“ ”تہنائی تو مصرعوں کی چھوٹی سی نظم ہے اور اردو کی مختصر نظموں میں خیال کے ارتقا، اظہار، بیان کے ارتقا کا جذبہ کی شہرت اور انہماک کتنی کی ایک نہایت اعلیٰ اور نادر مثال ہیں نظم پر اسٹین نے ”نقش فریادی“ کے ”مقدمہ“ میں جو کچھ لکھا تھا اس پر ہم نے اس دور میں لکھا ہوا بحث کی تھی۔

”مجھے بار بار خیال آیا ہے کہ شاید یہ نظم بھی کسی سیاست میں الجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہو سیکر رہ رہ کر مراد کوئی نیا حقدار ہے، کیا باروں کا ڈھلن ہوا عمار اور ایوانوں میں نہ رکھنے تو ہوئے چراغ ہمارے تہذیب اور مذہب کے کچھ بے ہوئے سیراز سے کی طرت اشارت دیتے ہیں، مبین شاید اس میں سن اور اعتبار ہے کی اثر آفریں نظم پر یہ الزام نہ لگنا، اسے خیر نہ کرنا ہوگا ان نظموں کا خیالی تو اس کی مجرور تہنائی میں معجز ہے۔۔۔۔۔ جس ذوقی احساس شخص کو اپنی زندگی میں کبھی کوئی اداس اور غمناک شام بسر کرنے کا تجربہ ہوا ہو اگر اسے اس نظم کے مطالعہ سے تہنائی کا جوہر ایک سنگ گراں کے مانند اپنے کندھوں، اپنے جسم بلکہ اپنے سادے وجود پر محسوس ہونے لگے تو یہ نظم یقیناً ایک بہت بڑی تخلیق ہے۔“

وہ درسیا کی جگہ مہوں کا دور تھا مگر جو ”خیالی“ بار بار اسے کو آ یا ہم نے اسے کبھی قبول نہیں کیا، اس خیال کو تو اپنی نے خود ہی قبول نہیں کیا۔ اپنے نیاز کو ”الزام لگانے“ سے تعبیر کرنا بڑی جرات کی بات ہے۔ ویسے غم ناک شام کی عکس اگر وہ ”رات“ یا شام سے جتن تک نکھد دیتے تو مناسب تھا۔

انہیں دنوں ”سنگ گراں“ میں ایک کل بند اردو سباحہ ٹورسٹ چرچ کا کچھ کامیوں میں ہوا تھا (آخر اسلام آباد سٹیٹ بک بورڈ سے مقرر کی حیثیت سے آئے تھے اور پہلی بار میں نے اس شاعر کو دیکھا تھا جو شاعری میں ایک نئی آواز کی حیثیت اختیار کرتا تھا۔ آخر الامکان کے علاوہ اس نے پہلے لوگ عزیز حارہ مدنی اور دنیا جانت مصری کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہوئے تھے، مگر غزل اور نظم کے موضوعات سے متعلق تھے۔ میں جنہم سم کا کچھ کی فائدگی کر رہا تھا۔ ان دنوں تہنائی“

علاؤ گزیری کے ایک استاد کا کہنا ہے کہ اس نظم کا فریادی خیال انگریزی سے خود ہے اگر یہ درست ہے تو یہی اس نظم کا نئی درجہ است نہیں ہوگا

فضا میں کونج رہی تھی۔ مجھے غزل کے حق میں تقریر کرنی تھی میرے نزدیک یہ مروجہ سبائے "ذاتی لواقیفہ" کی ایک شان ہیں ہر ادارے کا ایک آدمی موافقت میں ہونے لگا ایک مخالفت میں۔ یہی رسم ہے۔ میں نے فیض کی نظم پڑھنے کے بعد اس کی تقریباً چھٹی سٹی اور غالباً اس نظم کے بارے میں "میں نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا تھا۔

"جہاں میں انفا غزل کے رنگ کر سیکے ہوں۔ یہ محسوس ہوتے ہیں۔ محبت جو سنگین ہیں۔ جو جانتے نہیں جانتے۔ یہ رات جیسے صبح کرنے کے لیے دل دھک کو تھکے فراہم کر رہا ہے۔ فیض اس بارے کے اظہار میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ معرکہ صدر محترم کی ایک "اثر کو فانی" کے اپنے شعر میں زیادہ ارتکا نہ قوت اور شدت کے ساتھ بیان کروا رہے ہیں۔

میرے ایک فانی ہر آواز شکستہ دل کے ساتھ

کیا قیامت، شادانہ میرا جانب در دیکھتا

اور فانی کے شعر میں آواز شکستہ دل کا جواشار دیکھ دینا ہے وہ فیض کی نظم میں نہیں۔"

مفتیانی کے سلسلے میں یہ باتوں میں اس کے شکوکہ و گمان اور غزل کے رعبوں کی بات پہلے ہی چھوٹ گئی تھی۔ رات کے اپنے مقدمے کے آڑ میں فیض کے بارے میں اپنی اس جھوٹی رائے کا اظہار کیا ہے۔ فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں۔ صرف احساسات کا شاعر ہے۔ "میرے فانی" کے شعر میں اسے "فراہم کر دے" دو سبب حسد کی آڑی تصویر اسے پیش نظر داشت نہیں ہے بلکہ نیم سداقت میں اور بڑا جانتے وہ کون تھا جس نے آواز کے ایک جھوٹے زیادہ خطر کی زبان دیا تھا۔ "سوچ" کے پندرہ اور میری بات "میں نے" اور "بول" کے مرحلوں کے پہنچ کر احساسات کا شاعر ایک مرکزی نظریہ کا شاعر ہے۔ وہ جانتے اپنے اچھے وطن یا نہیں کہ نقش فراہم کر دے فیض اولیٰ کی آخری نظم کو سن گئی تھی۔ "دلہا" "موسم سخن" "بے اولیٰ کی آخری نظم تھی" "جم و گم" "شاہراہ" "سیاسی میڈیکل نام" "لے دل بیابان شہر" اور میرے ہمدرد دوست نے ان پانچ نظموں کا اضافہ فیض دہم میں کیا گیا تھا۔ "شاہراہ کے علاوہ یہ نظمیں آج بھی فیض کے "کلام ہندیہ" نامیہ مجموعہ میں۔

"فروزاں" کی دو نظمیں "موت" اور "یوسف" دو غزلیں اور چند اشعار وقت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ آہنگ کی نمایاں ترس نظمیں "آوارہ" اور "اعتنا" ہیں۔ ان کے بعد "خواب سحر" اور "رات اور دل" دو غزلیں اور اشعار کو شامل کر کے دہم کی ممتاز کی بعض اور نظمیں بھی ہیں جنہیں دہم میں نہیں کیا جاسکتا۔ سین آج بھی چھتا ہوں کہ نقش فراہم کر دے "میں نہیں نے اس جہد میں ہیں جو کچھ دیکھ رہے۔ دو مقدار میں مجاز اور مذہبی دونوں سے زیادہ ہے اور ادبی اعتبار سے بھی زیادہ قابل قدر اس معجز کا دائرہ فنی طور پر فیض کی شاعری کے ہر پہلو پر منسلک تنقید نہیں ہے۔ میں وقت کے آگے میں ان کی شاعری اس سے ارتقا اپنی نسل اور دہم کے ہونے اور مذاق اور خود اپنی رائے کو دیکھتا اور دیکھتا جانتا ہوں اس لیے فیض فراہم کر دے کی آخری پانچ نظموں پر شدید خواہش کے باوجود تفصیل سے لکھنا فیض کے لیے ممکن نہیں ہے۔"

موسم سخن کی ابتدا میرے ہماری تہذیب اور اردو غزل کا گرافٹ ہے۔ چہ منظر ہے کہ "سیریا" یا "آہنگی" زخار آواز ہے۔ خوابیدہ سی آنکھیں اور کاجل کی مکیر فیض کے الفاظ کو رنگ بنا رہا ہے۔ نظم کے ابتدا مشرق کے حسن کو موتی اور نعمت بن گئی ہے۔ شاعری میں زبان کی تین حقیقتیں ہیں۔ ذریعہ ابلاغ (اس میں رمز و اشارہ بھی شامل ہے) رنگ اور نغمہ (دھن آواز ہیں)۔ موسم سخن میں میں نے ان کے یہ تینوں پہلو ملے ہیں۔ شاعر رنگ، نغمہ اور آواز کے سنگینوں سے شعر

کے زیور تیار کرتا ہے۔ آتش نے شاعری کو مریع سازی کہا تھا۔

بندش الفاظ جڑھنے بگوں کے کم نہیں

شاعری بھی کام ہے آتش مریع ساز کا

یہ محض شاعری نہیں بلکہ تنقیدی حقیقت ہے اور اس تنقیدی حقیقت کو **SANTAYANA & IRWIN EDMAN** کی مدد سے سمجھا ہے اور ہم آتش سے کچھ نہ سیکھ سکے۔ میرے صرت تک ہمارے شاعروں نے اپنے اشعار میں تخلیقی عمل کی جیسی وضاحت کی ہے، ہمارے سارے نقاد و کراہ تک نہیں کہہ سکے ہیں

The poet is, as Santayana somewhere says, elementally a goldsmith in words. He arrests the attention of the reader as he is himself arrested by the sensuous qualities of the sound of words.

فیض کی نظم ”موزع سخن میں خواب بھی ہے اور ان کا تذکرہ بھی جو خواب ہر شہنائت اور خواب دیکھنے والوں کے آتش بگیا۔ لیکن آتش اٹھا رہا لہ کے اندر جو کائنات کا تصور کتنا بدل گیا ہے۔ جب یہ نظم پڑھتا ہوں تو آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں تو غور کے علاوہ ایک ہی زیور پسند تھا۔ آفرین۔ آفرین۔ جو حسین عورت کے حسن کو خلاصہ یا ضمیمہ معلوم ہوتا تھا۔ اب ایرنگ اور ٹالس کا دوسرا۔ آج کی نسل بی بی اور مونیہ لاریں کو جانتی ہے اس نے تو پری چہ و نسیم کو بھی نہیں دیکھا۔ اور زائد کی ان تخیلوں میں زلفوں کی جھکی چاؤں، پرانے برگ کے درختوں کے سائے کی طرح غائب ہو گئی ہے۔ یہ بونی ٹیل کا عہد ہے میں نے حضرت تالش دہلوی کے مجموعے ”نیم روز“ پر تبصرہ لکھ کر سنے ہوئے عمری کیل ہے کہ انفاذ کے معنی لغت سے نہیں معلوم ہوتے، اچھے شاعروں کے کلام سے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ڈاکٹر مجتہدی مرحوم نے یہ بات کہی تھی کہ بڑے شاعر کی شاعری کا ان حشر ہوتی ہے۔ جس میں انفاذ جلائے جاتے ہیں اور پھر میں نے چند مثالیں پیش کیں تھیں، ان میں سے ایک مثال میں نے موزع سخن سے لفظ ”کم بخت“ کے پہلے میں پیش کی تھی

بے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط

فیض کی زبان پر دوسروا مانے بہت کچھ لکھا ہے اور خاص طور پر ہماری زبان کے مزاج شناس حضرت اثر لکھنوی نے جو مکملہ پنج مجاہدیں اور مصنف مزاج بھی ہیں اس لئے کہ نہیں پھر جانا چاہتا مگر موزع سخن میں ”مقتل کا گنا“ مجھے ہیٹھ ڈرائی رہی ہیں۔ میں فیض صاحب کی طرح مقتول سے نہیں ڈرتا اور میرے سبھی باخیر نظارہ ہے شمشیر کا عیاں ہونا ”مگر مقتول کا گنا؟“ طعنے کے آپ فادائی سے مثال پیش کر دیں گے کہ صاحب دیکھئے یہ آتش افروز شاعر ہے اور مقتول کا گنا کی ترکیب اس کے یہاں ہے لیکن یہ الزامی جواب ہے اور غلطی بھی سستہ نہیں ہوا کرتی۔

”ہم لوگ“ پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ مجاہد کی نظم ”آوارہ“ کا خیال آیا ہے۔ مجاہد کی نظر نے اس کی زندگی ہی میں کلاسیکی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی نظم میں خارجی مظاہر کے پس منظر ہیں اس نسل کی نسل بھی کہ بیچے کے زچوں کی شکستِ حوصلہ، انتشار، مایوسیوں، فرسٹریشن اور پھر کچھ کر گزرنے کی خواہش آوارہ میں زیادہ تعبیر کی نہ ہی سمجھ سکتے تھے۔ اقبال اور جوش نے عہدِ حاضر کے زچوں کو اپنے پیغام کے سانچے میں ڈھانے کی کوشش کی۔ اقبال نے علمی، تحریری اور شاعرانہ لحاظ سے جوش نے جذباتی اور شاعرانہ انداز سے، لیکن زچوں کے جذبات کو اور اس کے محسوسات کو مجاہد نے انتہائی کمالِ فن اور شدتِ تاشک کے ساتھ پیش کیا۔ ”ہم لوگ“ اپنے حدود میں ایک کامیاب اور انجمنی نظم ہے، مگر ”آوارہ“ کے درجہ اور بلندی تک نہیں پہنچتی۔ مجاہد کی نظم ”آوارہ“ کے بند میں نے لڑائی میں اپنے آپ کو بارہا سنا ہے۔ ”آوارہ“ کے بند لڑائی کی جگہ لگتی جاگتی، سردیوں پر راقوں کو آواز مگدی کرتے ہوئے میرزا ساڈے دیتے رہے ہیں۔ جب بھی آسمان پر کوئی ترانہ بٹاتا ہوا دیکھا تو ہمیشہ ذہن میں یہ بات آئی کہ نہ جانے وہ ”آوارہ“ ہمارے نامہ اور معاشرے میں کتنے مفلسوں کی محبوبا بنیں کسی نہ کسی سیٹھ یا سرکاری افسر کی گود میں، ان کے حجبِ عروسی میں مٹی کی لڑی کی طرح بھٹی ہوئی، لیکن نبین کی نظم ”ہم لوگ“ ہمیشہ کسی اداس شام کو اپنے کمرے میں یاد آئی۔

نبین کی نظم میں بڑی شدت ہے مگر داخلی، اس میں داخلیت اور خارجیت (جب معروفیت اور موضوعیت کی جگہ یہ دو اصطلاحیں چلی ہی پڑی ہیں تو قبول کر لیجیے) کی وہ آمیزش نہیں جو مجاہد کے یہاں ہے۔ مجاہد نے دونوں کو یوں ملا دیا ہے کہ سن تو کا فرق مٹ گیا ہے۔ ”ہم لوگ“ ہماری ذہنی تصویر ہے اور ”آوارہ“ سماجی تصویر بھی ہے اور ذہنی بھی

آج نبین کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی انسان دوستی قرار دی جاتی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میری رائے میں ان کی انسان دوستی نے پہلی بار پوری طرح ان کی نظم ”میرے ہمدرد“ میں دوسرے ”میں آنکھیں کھولیں“ میں ایک دن مجاہد کہنے لگے :

”میں نے مفلس سے کہا اپنے نہیں کہا بھی تمہارا نہیں، کہ تم نے جو کچھ کہا ہے میں وہ سب کچھ کہہ سکتا ہوں اور اپنے انداز میں بہت کچھ تم سے اچھا کہا ہے، مگر یہ معرفت میں نہیں کہہ سکتا۔

”مگر مجھے اس کا یقین ہو مرے بجائے مرے دوست“

— (پچھلے صفحے کے حاشیہ لایہ) یا ٹھوڑے پیش کردوں تو تسلسلِ مجروح ہوگا۔ (یہ حرکت اس مضمون میں میں کی جگہ کر چکا ہوں) اس نے عاشقے میں شاعری کے ذریعہ فغلوں کے معافی کی تقسیم کی کم از کم دو میں شامل تو نہ دوں۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹو کو یہی اک شہر میں ”قاتل“ رہا ہے

یوسف کو نہ مجھے کہ حسن بھی ہے جوان بھی
شاید ”نرس“ میڈر سے زینا کے میاں بھی
(اکبر آبادی)
ذرا آہستہ چل کاروانِ کینت و رستی کو
کس طرح ذہن انسان ”سخت“ کا ہمارا ہے ساق
(جوش)

مجھے پتہ نہیں جو رستہ یہ بات بچہ لگے کی تھی یا مٹا کر۔ استاد وہ بھائی کو شاعری کا موضوع نہ سمجھتے ہوں مگر بات ہے سچی۔ محبوب سے جو باتوں سے شاعر و رستہ کیا کچھ نہیں کہا مگر انسان سے آدمی سے جو ہمد ہم گئی ہے دوست بھی ہے اور بھائی بھی ہے اسنے پیار سے شاید ہمارے کہنے سے رفا عورت، بٹا نہیں کی، جیسے فیض نے اس نظم کی ہے۔ یہ نظم ایک جپکار ہے۔ ایک تبسم ہے جو آنکھوں کے مطلع سے شروع ہوا ہے۔ یہ تبسم مجھے تو جاوداں لگتا ہے۔ نظم پڑھتے اس میں سخت الفاظ بھی ہیں "اجڑا ہوا بے نور، مانع" "تذرا" کے دانش، مدتی، جوانی۔ مگر نظم کی فضا میں یہ تنقید اپنے دوست، اپنے ہمد، اپنے بھائی سے ہم کناری بن جاتی ہے۔ یہ ایک درس اقبال ہے۔ پیغمبر کی طرے دیا ہے۔ وہ اپنے علم کے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں ۵۵

یہ آواز بہت بندہ ہنگ ہے۔ ان غنبدان سے ہم تک پہنچ تو جاتی ہے۔ ہم زو چار قدم چلتے ہیں مگر پھر اپنے آپ سے کہتے ملتے ہیں کہ

گوں سنا ہے چھوڑنا ہے۔ راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
مگر فیض نے یہ طوطی، کورس لگے اور کہے وہاں اپنے ہمد اور دوست کو جیسے اپنے بھیت لگا کر۔ ایسے کو شہد بنا کر۔ بات کو سرگوشی ہیں ڈھال کر۔

تیرے آواز کا چارہ نہیں نہشتہ کے سوا
اور یہ سنا کہ سبھی ہمد سے کہتے ہیں
اکوہی کے سوا وہی روز کے چہرے ہیں نہیں

ہر مگر تیرے را، تیرے را، تیرے سوا

اشعار: محبوب

یہ مضمون "رستہ" نقش فریادی ہم اور میں "اور اصل میرے رستہ کے رشتہ، فہم، ہم میں اور وہ "کا ابتدائی حصہ ہے
اختتام میں "میں موت پہنچا پاتا، ہولناکی بھائی شاعری میں نظم کے قافلہ سلا ہے۔ پھر یہ بھائی فیض صاحب کے حصہ میں آئی، لیکن آج کے زمانہ شہر کی جو ذہنی سطح ہے اس کے پیر، تفریحی، فیلٹس کے اب ہمارے شاعری میں دنیاؤں کی تلاش میں نکل نکلی ہوئی ہے ان کی مساکل بہت بدل گئے ہیں انسان اور کائنات کا رشتہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ آخر ایمان کے مجموعہ "یادیں" کی اشاعت کے بعد عزیز ہمدانی کے مجموعہ "دشت ارکان" کی اشاعت اردو شاعری کے نئے سفر کا اشارہ ہے۔ فیض کی غزل کے بارے میں اپنے ایک مضمون "اردو ادب کے برہمن" میں، میں نے یہ فرض کیا ہے کہ فیض نے "ادب و رسا" کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

گوارے عشق کو اور کس پر نہیں

تو نہ تو آئے تیرے ہر ملکہ کیا کرتے

۱۹۵۵ء میں، میں نے جس رائے کا اظہار کیا تھا، وہ سب سے سچی فیکٹ ۱۹۵۵ء میں دانورسن کی روایت نے "گلے سے"

عشق سے ملے گئے پھر کرہ دست کی رو سے دہا دہا ہوتا گیا۔

دست کی دو جو سر دشت، مفاہد غنڈی تھی

کس ذرہ میں سر ڈالو رسن آتی ہے (عزیز ہمدانی)

ڈاکٹر سلام سندیلوی

فیض کی غزل

فیض دو بارہ کی غزل غویٰ جسے ایک نائنہ شاعریں، اگر تیرے لئے کر دیجے، تو کچھ بڑے غزل گو شعرا کا نام لیا جائے، تو اس فہرست میں فیض کا نام ضرور آئے گا۔ فیض کی شاعری کی ابتدا رومان سے ہوئی۔ سر رومان سے حقیقت تک کا فاصلہ انہوں نے چند برسوں میں طے کر لیا۔ فیض کی وہی شاعری جس نے ہمیں جہاں سے جہاں سے متعلق ہے، وہی ہے کہ ساتھ ساتھ مر لوط ہے۔

فیض کی غزل میں گہرائی اور گہرائی دونوں کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فیض غم کی عکاسی بھر پور طریقے سے کرتے ہیں۔ یہ غم ذاتی بھی ہے اور کائناتی بھی۔ فیض کی غزل ان کے ذاتی تجربات کا عکس ہے۔ انہوں نے زندگی کی جن منزلوں کو طے کیا ہے انہیں کاغذ پر لکھ کر اس قدر بیان کیا ہے کہ ان کے دل کے اندر جو کچھ ہے، اس سے وہ محروک اور جاندار ہے۔ دورانِ اسیری فیض نے جو غزلیں کہی ہیں، ان کے دل کے اندر جو کچھ ہے، اس سے وہ محروک اور جاندار ہے۔ دورانِ اسیری فیض نے جو غزلیں کہی ہیں، ان کے دل کے اندر جو کچھ ہے، اس سے وہ محروک اور جاندار ہے۔ دورانِ اسیری فیض نے جو غزلیں کہی ہیں، ان کے دل کے اندر جو کچھ ہے، اس سے وہ محروک اور جاندار ہے۔

اس قسم کے دل خراش نامے فارسی شاعری کی غزل میں بھی کوئے اسے ہیں۔ مسعود سعد سلمان نے اپنی غزل زندگی کے اٹھارہ سال فیضیں گزارے۔ اس اٹھارہ سال کے دوران میں اس کا اظہار دوسرے ذیل کے اشعار میں کیا ہے۔

تو سہ از موت من مستقیمہ نہ بود

پتوں پر نہ تھان مرا نگہ نہ بستاند

ماندیم اندر با کوئے من نہ بود

کہ سیکے موئے من نہ بود نہ ماند

قدیم مسعود سعد سلمان کا دل خون ہو گیا۔ جس کی سزا اس کے ہر غزل، ہر بیت، یہی حال فیض کی شاعری کا بھی ہے۔ فیض کے بھی ہر شعر سے ان کے دل کا خون چپکے چپکے نکلتا رہتا ہے۔

بہر حال فیض نے دورانِ اسیری جو اشعار کہے ہیں ان میں درد و کرب کے تاثرات بدرجہ اتم موجود ہیں، اس سے زیادہ اہمیت کا کہہ سکتا ہے کہ جن میں بہار کے پھر بھی شوق و بار کا اختلاف ہے۔ جب یہ حال ہو تو اُسے حرام ابر مر کو بہار کا لکھنا ہے

روشِ بدوش ہے وہی انتظار کا موسم
 نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
 حدیثِ باقہ دستانی نہیں تو کس مصرف
 سحرِ امِ ابرسیر کو ہمار کا موسم
 بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
 فروغِ گلشنِ دعوتِ ہزار کا موسم

فیض نے اگر فروغِ گلشن اور صوفت ہزار کا موسم بذاتِ خود نہیں دیکھا تو ان کو کوئی غم نہیں۔ انہیں اس بات کو سوچ کر تسکین ہو جاتی ہے کہ دوسرے تو بہا لان چہ بہا وچن سے لطف الملوذ ہوں گے فیض کی یہی شاعری ان کی انسان دوستی کی دلیل ہے۔ دراصل فیض کے یہاں صرف ذاتی غم نہیں پایا جاتا ہے بلکہ کائناتی غم بھی موجود ہے۔ "جی آدم اعطائے یک دیگرانہ" کا اصول ہمیشہ اسکے مد نظر رہتا ہے۔ انہوں نے افسانیت کا در اپنے دل میں محسوس کیا ہے۔ آزادی کے بعد کی پاکستان میں فلسفہ، جہالت، سرمایہ دہی کا دور قرضی طور پر ختم نہیں ہوا۔ اور جن امیدوں کو لوگوں نے اپنے دل میں مدھان چڑھایا تھا وہ اُمیدیں بر نہ آئیں۔ اس لئے پرامیدوں کو مایوسی ہوئی۔ اس یاس کی بھلک ہم کو فیض کے یہاں ملتی ہے۔ دراصل فیض نے اپنی غزلوں میں اپنے دور اور اپنے سماج کی بھرپور شکایت کی ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار دو جہاز کی مکمل ضرورت عکاسی کرتے ہیں۔

ہم سیلابِ غمِ عشقِ ہوسم کرتے رہیں گے
 دیرانیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
 ہاں تلخیِ آیامِ ابھی اور بڑھے گی
 ہاں اہلِ ستمِ مشقِ ستم کرنے رہیں گے

نہ ٹھل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ ملے پی ہے
 عجیب رنگ میں اب کے بہار گزاری ہے
 چمن میں غارت گئی چمن سے جلنے کی گزاری
 قفس سے آج صبا بے مشوار گزاری ہے

دراصل فیض کی غزل اپنے دور کے دوش بدوش چلتی ہے۔ رفتارِ زمانہ کے نقوش فیض کی غزل میں ہم کو نمایاں طور پر مل سکتے ہیں۔ انہوں نے جو غزل اگست ۱۹۵۲ء میں کہی ہے اس کا مبدیہ مذکورہ بالا اشعار سے جُدا ہے۔

روشِ کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو میں
 نکلتی میں چاک چند گریباں ہوئے تو میں
 اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
 گوشتے چمن چمن میں غزلِ خواں ہوئے تو میں

بھڑی ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں
ان میں ہوملا ہوسا را کہ جان و دل
مخمل میں کچھ چراغِ فردزاں ہوئے تو ہیں

ان اشعار میں امید کی کرنیں جگمگا رہی ہیں اور دھوپ بھینتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ فیض کو اس بات کی خوشی ہے کہ اب ان کے ملک میں کچھ آبادی اور ترقی کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

دراصل فیض کو اپنے وطن سے بے محبت ہے۔ وہ اپنے وطن سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح کوئی مرد کوئی عورت سے محبت کرتا ہے۔ انگریزی شاعران بھرتے عورت کی محبت کو خطرات کی محبت میں منتقل کر دیتا تھا۔ مگر فیض نے عورت کی محبت کو وطن کی محبت میں منتقل کر دیا ہے۔ وطن ان کی نظریں ایسا ہی حسین ہے جس طرح کوئی محبوبہ حسین ہو۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں سہ

بُٹھیا جو روزِ بہ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ساندوں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحرِ ترے صُبح پر یکسر گئی ہوگی

بہر حال فیض کی خاموشی مجروح دلوں کے سہ مرہم کا کام کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا افادی پہلو یہی ہے۔ ان کی غزل ہم کو یس میں امید کا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہ ہم کو نئی راہ اور نئی منزل سے آشنا کرتی ہے۔ اور انسانی حیات کے لئے ایک نئے محصل مرتبہ کوئی ہے۔ فیض کا یہ مشترکات حیات کا منظر ہے سہ

بچرے بچہ جا بھی مگی نہیں جو ہوا تیز چل
لاکے دکھو سر مخمل کوئی خورشیدِ باد ہے

ظاہر ہے کہ اجرام فلکی میں سب سے زیادہ تابناک اور توانا خورشید ہے۔ خورشید ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہذا آج کی چھپیدہ زندگی میں جبہ تنازعہ لبقا جاری ہے شیخ ہمارے کام نہیں آ سکتی ہے۔ بلکہ ہم کو خورشید کا سہارا لینا ہوگا۔ اپنے ایک دوپے میں تلسی داس نے بھی خورشید کی عظمت کا اعتراف کیا ہے سہ

را کا پتہ سو ڈس اوہ، تارا نگوں سو راے
سکلِ گر ن دولائے، رو بہ رات نہ جائے

چاہے سوہ چاند اُبھریں، چاہے ستاروں کا ہجوم جلوہ دکھائے چاہے سارے
پہاڑوں میں آگ لگ جائے، سحر رات کی ظلمت بیز سو راج کے نہیں دور ہو سکتی۔

اگرچہ تلسی داس اور فیض کا معنوں بالکل یکساں نہیں ہے۔ مگر تلسی داس اور فیض اس نکتہ پر متفق ہیں کہ خورشید تابش و توانائی میں سب سے عمدہ ہے۔ فیض اسی خورشید کے ذریعے مخمل کا نائٹ میں اُجا لا کر ناچ رہے ہیں جو رات کی ظلمت کو دور کر سکتا ہے اور تیز ہوا کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

فیض کی شاعری موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے اہم ہے۔ فیض کا اسلوب قدیم اردو غزل سے بہت مختلف نہیں ہے۔ فلک ان کے یہاں وہی رسمی اور سادہ انداز بیان ملتا ہے۔ انہوں نے دیگر شرار کی طرح اپنے دل کی بات گنایا تو انداز میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں قدیم استعارات، تصورات اور تراکیب بھی ملتی ہیں۔ اہل ستم، مداوائے اہل طرہ تزلزل، عرض تہا وغیرہ تراکیب اور وہ کے قدیم سرمائے مآخوذ ہیں، محسن و عشق کے بیان میں بھی انہوں نے قدیم روایات کو برستار رکھا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں شیب و حل اور دوز بھر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کی محفل میں حضرت ناصح بھی تشریف لے لے ہیں، اور ان کی اکہن میں خیمہ شہرے بھی چھڑ چھاڑ رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے اس روایتی انداز بیان میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور تازگی ملتی ہے۔ اور یہی خصوصیت ان کی غزل کو دور قدیم کی غزل سے ممتاز کرتی ہے۔

فیض کہتے ہیں سے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکا ر گزری ہے

اگر چہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

جنوں کا لفظ بہت فرسودہ ہے۔ مگر فیض کا جنوں میں دفر ہلکے جنوں سے مختلف ہے۔ یہ حب الوطنی کا جنون ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم چاہیں تو اس سے رسمی جنون بھی مراد لے سکتے ہیں۔ فیض کے شرکاء یہی حس ہے۔ اسی طرح کا ایک اور شرکاء ملاحظہ فرمائیے

وہ بات سارے فلسفے میں جس کا ذکر نہ کھتا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

بات بڑا عام لفظ ہے۔ قدیم شرار کے ہاں بات سے مراد عشق کی بات ہے۔ فیض نے بھی بات کا ذکر کیا ہے، مگر یہاں بات کا مفہوم بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس بات کا تعلق سیاسی بات سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ فیض کے شیع مجازی کی سرحد کہاں پر ختم ہوگی۔ اور جب الوطنی کی سرحد کہاں سے شروع ہوگی۔ محبوب اور وطن ان کے یہاں اس طرح شیر و شکر ہیں کہ دونوں عناصر کو جدا کرنا مشکل کام ہے۔ یہی فیض کی غزل کا طرہ امتیاز ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض نے اردو غزل کو ایک خاص لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کی وجہ سے غزل کافی جاذب اور صحت مند ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود فیض کے اسلوب اور انداز بیان میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آتی ہیں جن کا ذکر اس سے قبل حضرت اثر کشمیری کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو "زنداد نامہ کا سرسری جائزہ" علی گڑھ میگزین) ان خامیوں کو یہاں وہیرانا معقول نہیں ہے۔ تاہم بعض خامیوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ جن کا ذکر اصراراً صبر سے نہیں کیا ہے۔ فیض کے مندرجہ ذیل شرکیں "کہ" "بروزن" کی "نظم ہوا ہے جو درست نہیں ہے

کھٹے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت

بڑھتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

مندرجہ ذیل شرکیہ کا عیب یہ ہے

خیر ہیں اہل دیر جیسے ہیں آپ اہل حرم کی بات کرو

کہیں کہیں تعقیب کا عیب نہ ہے۔ یعنی مولانا آزاد اور مولانا حالی والی لفظی بے ترتیبی موجود ہے۔ مثلاً

بڑا ہے درد کا ششدر یہ دل عزیز ہستی
گمنا ہے نام یہ آئیں گے غم گسار چلے
”آئیں گے چلے“ کے بجائے ”چلے آئیں گے“ زیادہ فطری انما ہے۔

معنی اشعار میں دو مشاعر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفقت

ملتی جھلکتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

ہونٹوں کو شہری کی بنا پر شفقت سے تشبیہ دینا بالکل درست ہے مگر ”آنکھوں کو چاند سے کیا نسبت ہے۔“ آنکھوں کو جام کہا جا سکتا ہے۔ (جام دیکھے تری آنکھوں میں)۔ اور جسے کو چاند کہنا درست ہے۔ چاند دیکھا ترے چہرے پر،۔ بعض جگہ قوائی اضافات کا نقص موجود ہے۔ مثلاً

گرفتگر زخم کی تو خطا کار ہیں کہ ہسم

کیوں جو مصیبت خوبی تیغ ادا نہ کئے

میاں چار اضا فتن مسلسل آئی ہیں۔ دو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہیں۔

سجاد ظہیر صاحب نے اس شعر کی بہت تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اس کی داد تو مضمون مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔“ بزرگ علی خان اشرف الٹ

رہے ۲ (زندہ نامہ دیا بچہ صفحہ ۷۷)

ممکن ہے کہ اگر آپ یاد دلائے مرزا نوشہ اس شعر کی داد دیتے مگر دلی واسطہ مرزا نوشہ اس شعر کی داد کبھی نہ دیتے۔ اثر ٹھکوری نے بھی اس شعر کو پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ کہا ہے کہ اس شعر میں ”خوبی و مشیبت“۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اس شعر کو پسند نہیں سمجھتا۔ دراصل قوائی اضافات نے شعر کو بہت بھونڈا بنا دیا ہے۔ اس شعر کا مرزا نے مضمون رکھنا ہے مگر انداز بیان نے مرکزی مضمون کے حق کو مروج کر دیا ہے۔ شراب حسین اسی ٹھکوری کا یہ ہے کہ وہ جامِ جم میں پیش کی گئی ہے کہ جامِ سقاں میں۔ سجاد ظہیر صاحب کی اس تردید میں صداقت کے بجائے عقیدت کی جھلک ہے۔ اس عقیدت مندی کی بنا پر آج غالب سے وہ فلسفہ منسوب کیا جاتا ہے جس کی خبر غائب کو کبھی نہیں ملتی۔ اس سلسلہ میں ہماری افادی سے یہ صراحت کہ ہے کہ:

”جو رکھ رکھاؤ غالب سے منسوب کیا جاتا ہے، ان میں سے اکثر

’ذکات‘ پیدا تو ہو رہے ہیں۔“

ہم کو بڑی مضمون سے کسی قسم کے رکھ رکھاؤ کو منسوب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مضمون کی شاعری کو یہ دیکھتے وقت ہمارے لیے ضروری نہیں ہے کہ ان کے میاں کہیں کہیں کاٹے جو نظر آتے ہیں۔ ہم ان کو بھی ٹکلی دیکھیں سمجھیں۔ بلکہ ہم کو مضمون کے ان پھولوں سے محفوظ ہونا ہے جس کی جھلک تا ابد قائم رہے گی اور جو آئندہ نسلیں کے مشام کو دائمی طور پر مطلع کرتے رہیں گے۔

انجمن عظمیٰ

فیض کی اخلیت سندی

فیض کا خلعت زندگی کے تجزیے سے آزاد اور اپنے خول میں بند رہتی ہے۔ زندگی کی وسعت بے پایاں سے انھیں چاکرودہ ایک ایسی قدرت کا شکار ہو جاتی ہے جو اندر ہی اندر خود اپنے خالق کا کفن بتی ہے لیکن فیض کی داخلیت پسندی اردو شاعری کا ایک دامن دیر ہے جو اسے شعرا کے ایک خاص گروہ سے منسلک کرتا ہے۔ اس گروہ کے سربراہ میر، غالب اور موسیٰ جیسے شعراء ہیں جن کے یہاں داخلیت زندگی کے جہل کا استعارہ ہے۔

جدید اردو نظم کا جب آغاز ہوا تو اس پر قصیدہ، مرثیہ اور شاعری کا اثر بے حد نمایاں تھا۔ نظر نگاری اور واقعات عالم کی تفصیلات سے نظم کا مواد اکٹھا کیا جاتا جو بے اثر اور غیر ضروری جزئیات کی نظم بندی تک محدود رہ جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس عہد کی مشہور ترین نظم 'مدرس عالی' بھی چمنے اور اغاثات کے جلتے ہیں ان کی بنیاد بھی یہی خامی ہے۔ سب سے پہلے علامہ اقبال نے اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کی اور ایسی نظمیں کہیں محدود داخلی آہنگ سے متحرک اور نوانا ہو کر اختتام تک پہنچتی ہیں۔ اقبال کی حقیقت چونکہ ایک بڑے قومی شاعری سے جن کے پاس ایک پیغام بھی تھا اس لئے شاعری میں خارجی موضوعات اور داخلی صداقت کا جھکڑا مل گیا۔ اور دونوں کے درمیان بھار ہو گیا اور نظر آتا تھا، ایک آہنگ کی شکل میں وسعت ذات کا مفہوم پا کر عرفان ذات اور عرفان حیات کا رجحان بن گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال نے نظم کی ہیئت کو جوں کا توں قبول کر لیا تھا وہ ہیئت کے عناصر ترکیبی کے تجزیے سے غفلت رہنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر وہ لوگ اقبال کی نظموں میں داخلی آہنگ کی تلاش کریں اور اس پہلو پر توجہ دیں، تو انھیں اندازہ ہو گا کہ حالی کی نظم اقبال تک پہنچ کر عکس بدل گئی ہے۔ اس تبدیلی کا سبب اقبال کی دیہی داخلیت بہت جہلی کے یہاں صرف غزل کی آہنگی شاعری تک محدود ہے۔ حالی نے بعض باتوں سے متاثر ہو کر اپنا شعری انداز بدل لیا تھا لیکن جن واقعات و حالات کا تاثر وہ اپنی جسد پر شاعری میں ابھارنا چاہتے تھے انھیں پہلے اپنی داخلی زندگی کا اس سرسبز جز بنالینے کی ضرورت تھی کہ وہ ساری باتیں حالی کی ذات سے اپنا استعارہ پالیں جنہیں وہ قومی شاعری کا موضوع سمجھتے تھے۔ اس اعتراض کے باوجود حالی ہمارے بڑے محسنوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے اندر کم از کم اتنی جرأت ضرور تھی کہ وہ اپنی ناکامی برداشت کرتے ہوئے قومی سمت میں اور وہ شاعری کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ ان کا المیہ یہی دراصل ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس کے بغیر ذات الحسبالی کی کامیابی اس میں مضمر ہے کہ انھوں نے موضوع اور شخصیت کے لگاؤ کو ختم کر کے جدید نظم کو باوقار، متوازن اور کامیابی خیز کرنے کے ہم بدلہ کر دیا۔ اور اس طرح ان لوگوں کے لئے راہ ہموار کر دی جن کا مزاج حسرتوں کے اختصار کے بجائے وسعت و سیال اور جن کی فکر اس کا تقیر کے ساتھ ساتھ بام دور کا تصور بھی رکھتی تھی۔ خوش، فراق، مجاز اور فیض کے یہاں ان کی انفرادیت سے الگ نظم کا جو حسن مناسبت ہے وہ اقبال کی ولایت

ہے اس کے بعد اس میں مشرق و مغرب کے بہت سے دھارے لئے گئے ہیں۔

جوش نے فارسی شاعری سے براہ راست اور بھڑپوٹا رقبہ قبول کیا۔ فراق انجیری، مسکرت اور ہندی شاعری سے بہت کچھ لے کر اردو میں آئے۔ مجاز کا بائکون اپنے اندر زندگی کے نئے مواد و تاثرات چھپائے ہوئے ہے۔ فیض کی شعری گھلاوٹ اور دم بپے میں ان کے انگریزی اور عربی ادب کے مطالعہ کا بڑا اثر ہے۔ جس کا تجزیہ مشکل ہے۔ لیکن احساس اسے قوس قزح کی شکل میں پیش کرتا ہے اور مختلف رنگوں کے باہمی امتزاج سے جنم لینے والی اس دھنک خود کچھ کراس کی تاذی، ندرت اور جن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک نئی صنف سخن کی مختصر داستان بھی ہے اور اس حقیقت کی کاشمیری جوہر عہد کے بالکل شعرا کا جوہر تھی۔ جسے میں نے داخلیت کا نام دے کر ایک نیا جھگڑا کر دیا ہے۔ جہاں لوگوں نے داخلی اور خارجی حقائق کی بحث چھیڑ رکھی ہو وہاں میرا یہ کہنا کہ داخلیت وہ نقطہ انصال ہے، جہاں زندگی کے موضوعات شاعری ذات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں ایک فن کا سد باب بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے مشرط اس بات کی ہے کہ لوگ میری بات بھی ذرا غور سے سنیں مگر میرا تجزیہ صحیح ہو در ذمہ اذکم میری بخت پر حرف نہیں آتا میں نے نہایت ایمان داری سے داخلیت کے مفہوم کی جانب اشارہ کیا ہے جو ہمداری بسینوں میں رہنے والوں میں سے چند کو فن کا خلق بناتا ہے۔ اور شاعر کو الفاظ کے باطنی حسن کی جستجو پر اُن کو رہا ہے الفاظ کے باطنی حسن سے مراد انہار کا وہ بیسیا ہے جو زندگی کے اور اک کی منزل کی نشاندہی کر سکے یا کم از کم اس راہ کا پتہ دے جو اور اک حیات کی جانب لے جاتی ہے جہاں یہ کام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاتا ہے ہم کہتے ہیں کہ ہماری شاعری میں جنت ربی حلاطوں اور چہند نئے استعاروں کا اضافہ ہو گیا جن سے شاعری کے نئے باب دا ہوئے ہیں۔

فیض کی داخلیت کا مطالعہ بھی دراصل ان کے، پیرایہ انہار کو سمجھنے کی ایک کوشش ہوئی کیونکہ فن ہی اپنے خالق کا صحیح پتہ دے سکتا ہے کہ شاعر عرفان ذات کی کس منزل میں ہے۔

یہاں پہنچ کر تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک جاتا ہے۔ کوئی شاعر عرفان ذات کی کس منزل میں ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل کام ہے اسے کچھ دی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں اشیاء کی مابیت پر غور و فکر کی عادت ہو۔ تنقید کو اسی بناء پر برت کر ادب کے تجزیے تک محدود نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ یہ ادب اور زندگی دونوں کے تجزیے سے نئی استداری دریافت کرنی اور ادب کے تناظر کو ابھارنے کے علاوہ فن کا خیال تک اس کی رہنمائی کا کام ہی کرتی ہے۔ تنقید فلسفہ اور ادب کے بین ہیں۔ فلسفہ اور ادب کی وجہ سے حقیقت نے دو نام پائے فلسفہ اسے صداقت کہتا ہے۔ ادب اسے جمال سے تعبیر کرتا ہے۔ تنقید صداقت اور جمال کا سنگم ہے۔ جہاں زندگی کے تاثرات اور تجزیوں کے دو دھارے مل کر گنگا جمنی کا سواں پیش کرتے ہیں۔

فیض کی داخلیت نے اکتساپ جمال کو اور اک حیات کا سیانہ بنایا ہے اس کسب کی مختلف کڑیوں کو ملا کر بچھتا ہے کہ ان کے یہاں احساس و جذباتی نشو و نما میں زندگی کے جمال کا کتنا ہاتھ ہے۔

۱۹۳۶ء میں انجی اقبال زندہ تھے جیگور، نذر الاسلام اور جوش جیسے بالکل شعراء موجود تھے، اس وقت چند ادیبوں اور شاعروں نے ملک میں نئے رجحانات کی دواغ میں ڈالی تھی۔ ان کے پاس کوئی ادبی سرسرایہ نہیں تھا۔ لیکن ان کے ذہنوں میں وہ آگم ٹکرانے لگی تھی جو نئے گشتوں کا اثبات چاہتی تھی۔ وہ لوگ ادب میں باطنی کیفیت سے کہتے تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے بڑے لوگ ان کے رہنا تھے۔ جہاں کی نجات کا منہ کس جانب تھا۔ اور کون لوگ تھے۔ جو اس کی زد میں آئے تھے۔ دراصل سیاسی غلامی اور تحریک آزادی کے جیتے جاگتے فلام پر سب ایک ہی صف میں کھڑے

میں زندگی کا ایک بڑا المیہ منظر بن کر سامنے آ گیا ہے۔ اس کے پس منظر میں نبوی اور نبی انسانی کا بہت بڑا قافلہ ہے۔ ان دو مصرعوں کے استہمام میں نئی زندگی کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے۔ "چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز" میں رجا نہت کے بجائے مستقبل پر یقین اور اعتماد ملتا ہے۔ یہ ایک عہد کی فکر ہے لہذا یہاں سے کوئی مالوس آواز بہت قریب سے سنائی دے۔ لیکن آخری دو مصرعوں میں فیض کے یہاں جو قوت ملتی ہے وہ ان کی شاعری میں خال خال ہے۔ اگر فیض نے سچے کے زندہ ہونے کی بشارت کر اپنی پوری شاعری میں بھیل دیا ہوتا تو ان کے یہاں اقبال سے مختلف لیکن ایک بڑا پیغام ملتا۔ اس کے بجائے وہ زندگی کے غموں کی دلہیز پڑھتے رہ گئے۔ دوسرے غموں نے ان غموں کو اتنا سسپا کر ان کے نام تک انھیں یاد نہ رہے۔ غم جاتا اور غم نہ دگا کے بعد ان کے یہاں وہ جبرِ رواستنا سے نہیں ملنے جو کشاکش حیات سے گہرے طور پر متعارف کر سکیں دار و درسن کی آزمائش غالب کے زمانے میں بھی تھی۔ فیض کے سننے سیاسی احوال میں ان کے مفہوم کی دل کشی کچھ اور بڑھ گئی ہے لیکن جس مادی کے لئے فیض نے سامنے غموں کے زہر کو امت سچھ کر پی لیا تھا وہ مشش جہت میں بھیل ہوا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دو صراف دم یا رب

میں نے دشتِ امکان کو ایک نقش پایا

غالب نے اس آدمی کا سراغ لگایا تھا۔ اسی لئے وہ میر سے بھی بڑا شاعر ہے۔ لیکن فیض کی شاعری آدمی کے روحانی وجود کی اس وسعت سے واقف نہیں ہے۔ اس کے لئے بیشم کو ہر رنگ میں دا ہونا بڑا نا ہے۔ فیض اپنے عہد کا ایک معتبر شاعر ہے جو ہمارے غم میں شریک ہے اس کے یہاں موضوعات کی نوعیت خارجی نہیں ہے اس کی آواز مالوس ہے دل میں ارتعاش ہے وہ ہمارا دوست اور محبوب ہے ہم اپنی محبت دیتا ہے اور بہت کچھ نہیں دے سکتا۔ جس کے لئے ہم دو بلاو میر، اقبال اور غالب کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان غم پر شعراء کے یہاں ہمارے عہد کی وہ فکر نہیں ملتی جو آج کے شاعر سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے اور اک کی اس طرح تک پہنچے جہاں میر اور اقبال نے اپنے آدرش بنائے میر نے آدمی کو ڈھونڈ کر اور اسے کائنات کچھ کر اپنے سینے میں چھپا لیا اقبال نے نئے جہان کی تخلیق کی ذمہ داری اس پر ڈال دی اور غالب نے شش جہت کو اس کی بولاں کچھ بنادیا۔ آج کی دنیا میں آدمی کا قدم کس سمت اٹھے گا وہ تفسیر کے کن مراحل سے گزرے گا اور اپنے آپ کو کس طرح پائے گا۔ اس کی نشاندہی آج کے شاعر کو کرنی ہے فیض اس سطح کا شاعر نہیں ہے وہ ایک خوب صورت لہجہ کا شاعر ہے۔ اس کے یہاں اور اک کے بجائے سیاسی شعور کی منہزل ہے اس نے اپنی شخصیت میں زندگی کے دکھوں کو سمو لیا ہے اور ان کا ترجمان بن گیا ہے، لیکن بڑی حد تک اپنی ذات کے اندر سمٹ گیا ہے۔ اس نے اگر اپنے سیاسی شعور اور محبت کے علم کو خود آگاہی کے درجہ تک پہنچایا ہوتا تو اس کی شاعری گورکش رو نگار کی پہلو پہلو آئینہ دار ہوتی اور آدمی کا چہرہ لہو لہان ہونے کے باوجود ایک مکمل تصویر بن جاتا جو فیض کی عظمت کا گواہ بننا۔ فیض نے آدمی کے درد کو پہچانا ہے لیکن ان کے دم پیچے میں اس درد کو اکر ب نہیں آیا۔ اس کے لئے انھیں گناہ چھوڑنے سے رجوع کرنا تھا۔ پیادہ کاٹنے والے لیں سے ہار گئے زندگی کے جبرے نرڈ آنا پہننے والے انسان کی بے بنیاد قوت فیض کے ہم عصر وہ لہجہ کی نقل ہو ہی نہیں سکتی۔ فیض کی داغ بیل کا یہ ایک بڑا نقص ہے کہ ان کے یہاں صداقت کی

بھولہ آواز کوران کی شاعری کا خواب آلود حسن و باد چاہے۔ البتہ یہ داخلیت اپنا محدود دائرہ اثر رکھتی ہے جہاں خوب کام کرتی ہے۔ لیکن اس آدمی کو اس طرح کی جاتی ہے جیسے بیک وقت زمین کی لہری میں دلتی کاملاً بکھڑا اور ستاروں پر کندھ کی چھتکتی ہے۔

’ زنداں نامہ ‘ اور ’ دستِ صبا ‘ کی نظموں اور غزلوں میں فیض کا سیاسی شعور سبق نکھر گیا ہے۔ لیکن اس شعور کو وہاں بھی عرفان ذات کی منزل پر نہیں لے کر دیا۔ یہ ساری زندگی پر محیط ہے۔

آدمی کی محبت کا ایک پہلو نفرت بھی ہے۔ زندگی کے حسن سے محبت کرنے والے ادبی، ظلم اور تغلبہ سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ فیض نے بھی نفرت کی ہے۔ لیکن انہیں محبت سے ابتدا ہی سے ایک دو ملائی جا رہی ہے ان کی نفرت میں وہ کرب نہیں پیدا کیا جو ان کی نگاہوں میں ہو کر زندگی کے ہر جھٹ سے طلسم توڑ رہا ہے۔ اقبال نے نئی دنیا کا خواب دیکھا تھا لیکن جس آدمی کو نہ جہاں کی تشکیل کرنی تھی نہ فیض اپنی گزشتہ میں نہ لائے۔ اور فیض ہی پر کیا انحصار اس عہد کا کئی سوا بیسہاں اس منزل پر نظر نہیں آتا۔ فیض نے نقشِ فسرانہ کی دوسرے صفیں جو ظہیر شانی کی ہیں ان کا سیاسی اور روحانی انداز ’ زنداں نامہ ‘ اور ’ دستِ صبا ‘ میں بھی ملتا ہے۔ مفاہین یا علامتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ البتہ فیض کی سیاسی فکر ان دونوں مجموعوں میں پہلے سے زیادہ واضح اور گہری ہے۔ اور فیض نظموں میں فیض اپنے نرم و نازک ہجے کی حدیں توڑ کر اپنے عہد کے سیاسی کرب کا احاطہ کر لیتا ہے۔

یہ طفل و جوان

اس آگ کی کچی کلیاں ہیں

جس میں بیٹے نور اور کڑوی آگ

سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا

جس بے بنات کا کلشن

یہ رات اس درد کا شجر ہے

جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے۔

یہ رات جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے۔ فیض کے لہجہ کو بلند آہنگ بنانے کے امکانات سامنے لا رہی تھی لیکن فیض یہاں تک

پھر لوٹ گئے۔ ’ دستِ صبا ‘ کے بعد کی ایک نظم کے دو مصرعے

چاند نے مجھ سے کہا

اور ذرا آہستہ

رومان کی جانب شاعری کی مروجت کا پتہ دیتے ہیں۔ فیض کا بار بار رومان کی جانب لوٹ جانا اس کی داخلی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہے جس کے فن کو لازوال عظمت سے ہم کنار نہیں ہونے دیتی۔ عشق و محبت بھی زندگی کے مستقل موضوعات ہیں اور غری کی منزل میں انہیں کھر نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لیکن عمر کے ساتھ شاعر کے تجربے اور احساس میں گہرائی، وسعت اور وزن پیدا ہوتا ہے اس کی عشق و شاعری ماضی کے تجربوں کو دہرانے لگتی ہے۔ فیض کے ساتھ بھی اب یہی ہو رہا ہے۔ وہ جب محبت کے موضوع سے ہٹتا ہے تو اس کا سیاسی غم اسے آواز دیتا ہے۔

معتام فیض کوئی راہ میں جہاں ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اس شعر میں اُس نے خود اپنا لاکھ فیل پیش کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ نہ ہو رہے اور پھر پہچنے تو فیض کے
خفائی لب و لہجہ کی لذت سے الگ کوئے یار سے فارغ بھی دل کی بڑی وسیتیں ہیں۔ یہ بھی ہر ایک کو کہاں نصیب۔ اس کے نرم
خفائی بہم کی بنیاد پر اسے بھی عوسن کی طرح جمال پرست شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔
گل ہوئی جاتی ہے امروہہ سٹکی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی اسی چشمہ بہتا ہے رات

تھک گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزرا
اجنبی خاک نے دُھندلا دیئے قدموں کے سراغ
مہن زنداں میں رشتیوں کے سہرے چہرے

رات باقی تھی ابھی جب سہرا بایں آکر
چاند نے مجھ سے کہا، جاگ سحر آئی ہے۔

یہ خواب آلود شاعری اس کی جمال پرستی کی عمارت ہے۔ لیکن فیض کی داخلیت کا جب بھی پورا جائزہ لیا جائے گا تو فیض فنی
شہ پاروں کی جلتا ہئی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے

بول کہ لب آئندہ ہیں تیسرے
بول کہ پرچ اب تک زندہ ہے

ہر اک یہ مشاخر کی کماں سے
رجوگیں ٹوٹے ہیں تیسرے
جگ سے نوپے ہیں اور ہر اک
کاہم نے یہ شعر بنا لیا ہے

ان مصرعوں میں فیض کے سوگوار لہجہ کی جگہ ایک طاقتور کائنات نے لی ہے جو سیاسی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ اُن سے اس
بلت کا اعجاز ہوتا ہے کہ اگر فیض کی شاعری میں کوئی اضافہ ہو سکا تو وہ کس سمت میں ہو گا۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ فیض اپنی
رومان پسندی کے معاہدے نکل کماں سے سیاسی بصیرت کماہنی داخل زندگی میں مکمل طور پر چلے جہاں معرعوں میں تھیک رہا ہے۔
یہ بات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے بڑے عظیم تر ہے

دستِ بے بیجِ اسحق محمد

فیضِ شریعی نظر میں

بحیثیت شاعر فیض کے بارے میں جب میں غور کرتا ہوں تو فیض کی انسانیت میرے تصور میں ابھرتی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُس کے پورے قد و خال دکھائی دیتے ہیں اور اسی طرح مجھے فیض میں ایک شاعر اور ایک انسان کی حیثیت سے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک فیض نے شاید اس تفاوت کو قائم رکھا ہے اور اپنے شاہی سامعین کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے بھی، محلات میں رہنے والی سنگدل شہزادیوں، دل چھینک شہزادوں اور نوازہ زیبیگت یا اسی نوع کے دوسرے گرواروں کو پیش کرنے میں اپنے دلی خلوص سے کام نہیں لیا۔ بالآخر کوئی بھی وہ بڑے ٹھانڈی زمیندارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن جب انظارِ خیال کی نوبت آتی تو اسی کے قلم نے جاگیردارانہ نظام پر عیبی بے جی سے ایسے چرکے لگائے جن کا نتیجہ شاید اس نظام کو پختہ بھی نہیں ہوا تھا۔ فیض میں یہ بات نہیں تھی اس میں خلوص تھا۔ دیانت تھی اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس نے کسی تبدیلی کو قبول کیا تو ٹکری و شخصی سرور و لحاظ سے قبول کیا اور ایسے مواقع چونکہ زندگی میں بہت کم آیا کرتے ہیں اس لئے یہ کہنا ہے جانتے ہوگا کہ اپنی نرم مزاجی اور انسان دوستی کے باوجود فیض اپنی جگہ پر چٹان کی طرح مضبوطی سے قائم رہا۔ اس کا یہی وصف ایک حین امتزاج کی طرح نئی خانہ سے بھی اس کی شاعری میں نمایاں ہے اور وہ بھی عصرِ جدید کے فنکار کی مانند نہیں بلکہ مفکر و در کے نقش و سلاخ تھی۔ حق پاروں میں تصویروں کے باریک سے باریک نقوش کی طرح ظاہر ہے۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک وجہ ہے جس سے فیض کے اندازِ خیال میں وضاحت اور نگار پیدا ہو گیا ہے۔ فیض اپنے خیال کو خام اور ناقص خیال میں پیش کرنے کی بجائے بہتر سمجھتا ہے کہ ان خیال ہی کو ترک کر دیا جائے۔ بعض لوگوں کو اس کی شخصیت پر اسرارِ معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ وہ ماضی کو حال کی تازہ جھلکیوں سے بچانے میں ہمارت رکھتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم میں سے بہتوں کی قوتِ متغیہ حال یا ماضی ایک کے ساتھ ضرور وابستہ رہتی ہے۔ لیکن فیض کا یہ کمال فن ہے کہ وہ جدید کو بڑی عمدگی سے کلاسیکی سپرین عطا کر دیتا ہے اور یہ شاید جدید و قدیم دونوں سے اس کی دانشمندی ہی کا نتیجہ ہے جو اسے روایت سے بغاوت اختیار کرنے سے روکتا ہے اور ایک طرح سے ات پابندی کر دیتا ہے۔ میں ۱۹۵۷ء میں پہلی مرتبہ فیض سے تعارف ہوا جبکہ وہ ائم اے۔ او کالج انڈسٹریس انگریزی کا پروفیسر تھا۔ یہ کالج بھی ایک عجیب ادارہ تھا اور عمدہ کے ایک مدد فائدہ کوئے میں واقع تھا۔ یہاں کی اقامت گاہ مسجد اور اس سے ملحقہ میدان تقریباً ایک ایکڑ زمین کے رقبہ میں محدود تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اس مدرس گاہ میں انگریزی اور اردو کے فارغ التحصیل نوجوان گوجوٹ اساتذہ کے عہدوں پر فائز تھے اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر یہاں پرنسپل تھے۔ اس وقت ان مجھے

کچھ نوجوانوں کی حالت جو حصار کے تحریک اشتراکیت کے حامی تھے۔ اس درس گاہ کی انجمن کے مولویوں محلے والوں اور دیہاتی طالب علموں کے ماحول میں قابلِ رحم تھی۔ ان لوگوں نے اپنی ایک علیحدہ انجمن بنا رکھی تھی جس میں کچھ طلبہ بھی شامل تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ میں نے ایک معمولی قسم کے طالب علم کو ایک پروفیسر صاحب کے گھر میں بیٹھے ہوئے اسٹڈی سرکل کی ٹینگ میں بڑے پر جوش طریقے سے کیونرزم کے ابتدائی دور کے شاندار کارناموں کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد جس کے تحت فیض نظامیت کی تاریک قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے فوج میں شامل ہوا تھا۔ وہ انجمن کے گزیر سکھانے والے سبق سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ ہمیں سے نقش فریادی کا اصلی نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ فیض ان دنوں گرفتار قید تھا۔ اور اس حینت سے ہر شخص کو اس سے ایک لگاؤ تھا۔ وہ کچھ بندوں انہی محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور غائبانہ اس کا واحد عمل تھا جس میں کسی قسم کا حجاب مانع کبھی نہ ہوا۔ اس دن وہ کافی غصہ ہاری نگاہوں میں ایک تعلیم یافتہ تین چہرے والا انسان تھا جو محبت کے جوندہ میں گھوٹا ہوا رہتا تھا۔ ہمارے دل خود بخود اس کی طرف مائل ہو جایا کرتے تھے۔ اور ہر شخص اس کے تجربات میں سے کچھ نہ کچھ ضرور اپنانا کرتا تھا۔ ہفتہ وار مشاعروں کا سلسلہ جاری تھا درجہ فیض کے ان میٹھے فنون کو سننے کے منتظر رہا کرتے تھے جن میں خود ہمارے دورِ دل کی حکایتیں سموئی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک محبت کرنے والے دل ہی کا یہ حوصلہ تھا کہ پناہ سب کچھ فراموش کر کے صرف معمولی رچکا طالب تھا۔ وہ اپنے محبوب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا اور اس کی ذات میں وہ تمام وصف کثیفہ کی کوشش کرتا رہتا جو حسن و رعنائی اور تقدس سے عبارت ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ قدرتی ہوں یا مضمونی۔ یہی وہ اشعار ہیں جن سے فیض کی شاعری ملو نظر آتی ہے۔ اکثر ایسے لوگ جو حال کی بہت حقیقتوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے گزرے ہوئے بچپن کی خوشیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ انہیں فیض کی اس عادت کا لوحہ گر پایا ہے کہ فیض اس طرح اپنی طلاء خوشیوں اور منظر نگاریوں کے جذبات کی حدود سے اکثر آگے نکل گیا ہے۔

شاعری کے لحاظ سے فیض کا محبوب وہی اور دواور فارسی شاعری کا محبوب ہے جو بے پناہ تقدس کا حامل ہے اور جسے اپنے اندر گردِ بلی ہوئی دنیا کے درد و غم کا کوئی احساس نہیں۔ اس کا کام محبت اپنے حسن و جمال کو دوبالا اور نمایاں کرنا ہے اور اس کی کلکی صدائیں صرف اسی نقطے پر مرکوز رہتی ہیں کہ وہ اپنے چاہنے والوں کے ہر سوال پر نہیں کہنے کا عادی ہو۔ تاکہ عاشقوں کے دل ہمیشہ رنج و تعب میں گرفتار رہیں اس سے رقیب پیدا کر لینے ہی کوئی عار نہیں ہوتا۔ اور عاشق پر طرح طرح کے ظلم و ستم کے لئے وہ رقیب پر سلفِ درگم کی باتیں کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ فیض انتہا پسند اہل فکر و نوجوانوں کی صف میں ہوتے ہوئے بھی ان غم آگین داستانوں سے ناواقف نہیں تھا جو امیر و غریب کے درمیان جنگ کا سبب بنیں۔ عاشقِ غریب کو اپنے محبوب کا لگن مٹانے کے لئے محرومِ محبت ہی ذہن پڑتا تھا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ خود اور اس جیسے دوست بھلے لوگ کس کس طریقے سے زندگی کے شاندار کام مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

فیض کی اس عاشق مزاج فطرت کو جو اس وقت ایک تجربہ کار لیکن نئی اٹھ نوجوان پروفیسر کے روپ میں جلوہ گر تھی، دوسری عالمی جنگ کے دوران جلد جلد کچھ سستی بھی حاصل کرنا پڑے۔ ان میں سے بعض یہ سمجھنے لگے کہ لاکھوں انسان اپنی مجبوریوں کی بنا پر ہوس اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ فلسفہ جدید جن نے انسان کی ذات کو تصورِ ممالک پر مبنی کر دیا۔ امتحان کی کسوٹی پر کامیاب ثابت ہوا۔ اور یہ کہ جدید زمانہ کی عورت ایسی روجہ اور لیے دور کی مالک ثابت ہوئی کہ

تنبہائی میں میٹھ کر اپنے عاشق کی یاد میں روئے دھوئے کا کام اسے پسند نہ آیا یہی وہ وقت تھا کہ فیض کی شاعری نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا اور سرِ باد کی لے میں گیت الپٹے والا یہ اس کی صورت میں بھی زہرہ پوش فوجی مصاحب نہ بن سکا بلکہ وہ اپنی فطرت میں کا ڈوبیں سے زیادہ شاہ بہنر آگید جو اسپین کی کسی خندق میں اپنی رائفل تھا سے ہٹے کسی کی گھات میں بیٹھا ہو۔ مجوبہ کی یاد زہنی طور پر اور بھی تسکین کا سہارا بن گئی۔ اور وصل و محبہ کے طغات کا تا فرا و گہرا ہوتا گیا ان حالات میں خوش قسمتی سے فیض نے جسمانی لذت اور کیف و استعجاب سے دلچسپی نہ چھوڑی بلکہ اب اس انسانی پیکر میں جو شخصیت جھلکتی نظر آئی وہ ایک سچے دوست! ایک فلاسفر اور ایک رہنما کی شخصیت تھی۔ اب اس کی مجوبہ میدانِ جنگ میں بھی اس کے ساتھ تھی اور اس کے دوش بدوش رہ کر دشمنوں سے مقابلہ کرتی تھی ایسا کرنا ان کے فرائض میں داخل نہ تھا بلکہ ان کی زندگی کا تقاضا ہی یہ تھا۔

عالمی جنگ سیاسی و معاشرتی انقلاب کا ایک طوفان لے کر آئی تھی جس کی وجہ سے اس کے مثبت و منفی پہلو جاکر جو گئے تھے بلکہ نئی فوج انسان ان میں سے کوئی ایک پہلو اپنے لیے مقبوض کر کے۔ اس کا بہترین اندازہ فرائض کی جنگی فوج کے سپاہیوں کے ان گیتوں سے ہوتا ہے۔ جراثیموں نے زندانوں میں اس رات گائے تھے جس کی صیغہ ان کے لیے نازیت کی طرف سے پیغامِ اجل لے کر آئی تھی۔

کیا کہیں اپنا مقدمہ ہے کہ معذوری ہیں ہم
صبح ہوتے ہی نہ ہم ہوں گے نہ جینا ہوگا

یوں تیری قید میں رہنے پہ جو مجبور ہیں ہم
موت کا جام نکالوں میں ہے پینا ہوگا

اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد بھی حساس دلوں کو ایک سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ایک اذیت ناک انتخاب سے دوچار تھے۔ ان کے دھنوں میں یہ سوالات اٹھ رہے تھے کہ شہرِ تنگ مصالحت اور تکلیف و دوا داراں کی میں سے کسے اپنا یا جائے عاقبت کوشی کے مذموم جذبات کو ترجیح دی جائے کہ سکونِ پاشِ شہداء کو؟ جسمانی لذتوں سے حظ اٹھایا جائے کہ روحانی آسائش کو ڈھونڈا جائے؟ صلے کے طور پر ملنے والے ردِ عمل ہی پر تقاضات کی جائے یا ترقی پسندی کے نظریات کو اپنا یا جائے خود غم پر غلبہ آیا جائے کہ حصولِ ثواب کی سعی جاری رہے؟ انتخاب کی اس پرچش ہر نے پورے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ہل کر کرنا ہی گزرتی ہے لے رکھا تھا۔ یہ وہ بڑا عظیم ہیں جنہوں نے عاشقی کے ساتھ نہایت عفریت کو جنگ کے میدانوں میں خاکِ خون میں لپٹ پت ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن آئندہ وہ ان داخلی و خارجی باتوں اور ان انصافیوں کے خلاف نمودِ نوفاکر رہے تھے۔ نیچے ظلم و ظم کا نشانہ وہ مدت سے بنے رہے۔

قیصں ہر کیف اپنے لیے ایک راستہ متعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھلی عالمی جنگ سے اس کی شاعری ان تمام انقلابات کی عکاسی کرتی چلی آ رہی ہے۔ جنہوں نے کرۂ ارض کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اس نے افریقہ میں آنے والے انقلاب کی آدھنی کو محسوس کر لیا تھا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب منگولی میں کی تنگ تار کی گھڑی میں بیٹھ کر اس نے اپنی مشہور نظم 'آجا ڈا بیر تیا' لکھی تھی۔ وہ روزِ برگ گھرانے کی معیت میں بھی رہا۔ اور یہ ایرازمان تھا کہ روزِ برگ نے موت کو تنگ آ میر سنر زنگا پتہ بیج دے رکھی تھی۔ جب وہ ان ایرانی طلباء کی مدد کرتا ہے جنہوں نے اپنے بھائیوں کے یا قوت! اپنی آنکھوں کے زمر اور اپنے خون کی سہری اشرفیوں سے امن و ترقی کی دلیویا کی دیکھیں بخشی تھی تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے فوجیوں کی انگلیوں کا عکاس ہے۔ وہ بار بار اپنے وطن کے ہوائی طرف نوشتا ہے تاکہ وہ اپنی شاعری کے حصے ملک کو صدیوں کی پس ماندگی سے نکلنے کے لیے اپنے ہم وطنوں کی

مسترتوں اور نامردوں کو بیان کر سکے۔ فنی شاہزی اقیانیا ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔ فیض فلاح انسانیت کے لئے جذبہ باقی وادبیت کے عالم میں اپنے آپ کو نہ بھولا۔ اس دور میں اس نے چند عمدہ نظمیں کہیں۔ لیکن یہاں بھی وہی کا احساس فالتپٹ اور بعض اوقات توان دونوں قسم کی ہمتائیں امتیاز کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ متضاد جذبہ بات سے کھیل کر اپنے لئے مزید بھینس پیدا کرنے کا سامان بھی ہمیں کرتا ہے۔

اس جہد کے شاعروں میں غالباً فیض ہی وہ تنہا شاعر ہے جس نے دورِ حاضر کے انسان کی جذباتی زندگی کو بچہ، بچی، صداقت سے پیش کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے عام اردو شعر کی طرح اسے بھی دو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے پہلی یہ کہ اردو زبان نے جدید دور کے انسانی انکشافات اور نئے نئے ادبی رجحانات کا ساتھ نہیں دیا۔ فیض خوش قسمتی سے انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لئے کچھ اردو کی دنیا سے باخبر ہے۔ لیکن شاعرانہ انداز میں ان باتوں کو انگریزی سے اردو میں ڈھان کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اسے اردو زبان ابھی تک بلند فیض کو اپنے سامعین کی ذہنی دستوں کا قیال رکھنا بھی منظور ہے تاکہ شاعروں میں جہاں اشعار داد واصل کرتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ فیض کے اشعار بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ عربی و فارسی میں عوامی حکایتوں کے تیشی رمز و کنے سے جدید ذہن کو ناسخ کرنے میں چنداں کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ چرخِ اخگری اور گنبد نیلوفری کے تمام تصور۔ مناظر۔ راب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب تو آسمان کی انتہائی بلند یوں تک پہنچنے کی کوششیں بھری ہیں۔ اور فرشتوں سے زیادہ مرتبہ کی آہادی کو معلوم کیا جا رہا ہے۔ لامکان کی تیسری گھری ہوئی کسی ہستی کا ادراک کرنے کے لئے اب پانچ ارب سال سے بھی زیادہ زمانی مدت و کرا ہے۔ اس طرح محدود معبود کے درمیان ذاتی رابطہ کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے اور نہ ہی اس کے لئے انسان کے مقدور و مجسم ہونے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اسی لئے کئے جو رسمی یا تشبیہی طرز پر استعمال ہوئے رہتے ہیں جیسے خدا، شیطان، جبریل، جھگت، ورنے، آدم خورا، اسیا کہیں کے دوسرا ستارے آج کی دنیا کے لئے اسی طرے ناقابل فہم ہیں جس طرح ہومر کے زمانے کی لاطینی زبان۔ بھلائیہ کیا ضروری ہے کہ اپنے جذبات کے انہما اور اپنی زندگی کا مقصد معلوم کرنے کے لئے ٹھمر کر انہی راہوں کو نکلتا رہے جہاں گنت صدیوں کی چھلانگ گاہ رہ چکی ہیں۔

آج کی دنیا ماضی سے اچانک اپنا نا توڑ بیٹھی ہے۔ یہ اس کا مائیتی انقلاب ہے۔ جس کی وجہ سے پرانے انداز نگار و اسلوب بیان پر تباہ کن اثرات کا ہونا لازمی ہے۔ موجودہ معاشرہ سے ہی کو یہی شہنشاہیت تو قریب قریب ختم ہو چکی ہے اور اس کے پیچھے آثار اب تو یورپ کی سیرگاہوں اور عجائب گھروں ہی میں نظر آتے ہیں۔ آج ہتھوڑے سے کام کرنے والے مزدور کا زمانہ ہے۔ یہی مزدور ترقی کر کے تجربہ کار یا جینڈر کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔ اور ایک معمولی کسان جو کل تک صرف پیچھے ہٹتا تھا وہیں بیٹے کشادہ بڑی کیا کرتا تھا آج ٹیکسٹائل میں معروف ہے۔ ہمارے سماجی ڈھانچے میں اس قسم کے اضافے بڑی تیز رفتار سے عمل میں آ رہے ہیں اور اب ہیر و کافریم تصور بھی مفکرانہ خیر ساین چکا۔ پرانے زمانے کے بڑے بڑے فانیخ اس ہائیڈروجن بم کے زمانے میں ایک معمولی سپاہی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے فیض نے اپنی ایک انگریزی نظم میں کہا ہے۔

بے زمانی کے بطن سے زمان کی ولادت

عام ولادت کی طرح

ورڈ ایملد خوشی اور ادراک کی حامل ہوتی ہے

اور پاکستان میں اس کی ولادت
ایشیا اور افریقہ کے دو سرگرم آزاد ممالک کی طرح
ابھی تک آزادی کے اس نغمے پر جم کی مانند ہے۔
جو خوف بھوکا، بیست اور موت کی
نبرد آزما صورت میں ہر اویا گیا ہے۔

ان تصورات کی روشنی میں فیض کی شاعری کا مجموعہ ادراک بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ فارسی زبان کی ایک مشہور کہاوت ہے
”شعر مراد ہے کہ وہ فیض کی شاعری معنی آفریں ہوتے ہوئے بھی اتنی نازک اور لطیف و آئینہ دار ہے کہ پوسے
طور پر اس کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے سے سامانطف زائل ہو جاتا ہے۔
اس سے پورا پورا احتیاط و باوقی حضرات اٹھا سکتے ہیں جو عربی فارسی اور اردو شاعری کی خوبیوں اور نواقص سے بخوبی
آشنا ہیں۔ انقلاب پسندوں کے رد عمل سے بھی فیض کی شاعری میں کوئی توتوج پیدا نہیں ہوا جیل کی چار دیواری میں جیلے
اپنے ایک سختی کی موت کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنی شاعری سے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کا کام نہیں لیتا۔ بلکہ اس کے جذبات
سختی کی میت کو دیکھ کر مر آتوں میں دھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاعروں کے لیے فیض اب ختم ہونا چاہیے
اور اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے جذبات میں کھویا رہتا ہے۔ اور وہ بگایا ایسی دنیا میں رہتے ہوئے جہاں
فکری شجہ کے دکھانے کا طریقہ اندھیروں سے نکل کر چالے کی طرف دوڑتی جا رہی ہے۔ اور دیکھا جائے
تو وہی شاعر مشاعرین کی زبان ہوا کرتے ہیں۔ جو ایسی دنیا کا ساتھ دینے والے ہوں۔

بعض اوقات میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ اے کاش فیض اپنے آپ کو فارسی شاعری کے تجربہ کی کتابوں سے آزاد کرے
جو اس کے اسلوب نگارش کو بھاری بھر کم بناتے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے فارسی فیض کو بھی جوئے عجم کے کنارے پر
ہرے بھرے گلستانوں میں پہنچنے کے لیے بڑی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ آخر راوی کنارے کی شام کا ذکر کیوں نہیں
ہوتا؟ مارچ کے مہینے میں پھلنے کے گندم بھرے سنہری کھیتوں کی دل کشی کہاں چلی گئی۔ بسنت پر سروں کی وہ ہم قارک
ابھیلا ہٹ نکلے کے لیے کیوں ہمیشہ ثابت نہیں ہوتی؟ کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارا دیہاتی نوجوان جو گاؤں کی پر مشقت زندگی سے محظوظ کر
بھاگ رہا ہے پھر ان من مریے مٹھ اندوڑ مرنے کی کوشش کرے۔ تاکہ ہم فیض کو دوبارہ حقیقی اور واقعی طور پر اپنے درمیان پاس کریں۔

— جو شعر پڑھنے والے کے دل میں کسی نوع کی جذباتی کیفیت
مرتب کرے، اچھا شعر ہے۔ اور یہ بہت حد تک راجح بھی ہے۔ ہر شعر
عام طور سے ایک جذباتی تجربے کا آئینہ ہوتا ہے اور اگر پڑھنے والا
اس کے جذباتی پہلو سے متاثر نہیں ہوتا تو شاعر کا انہماک کامیاب
نہیں۔ لیکن تاثرات کو انسان میں تقسیم کرنے اور پھر نوع کو بھالے
فلذکہ فوہی تصور کرنا بہت گمراہ کن ہے۔ .. فیض

احمد علی خاں

فیض ایک صحافی

پاکستان کے نامور صحافی احمد علی خاں نے ڈاٹ ویل سے اپنے صحافتی زندگی کا ۴۹ برسوں
اٹھارہ کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی آ گئے اور ۴۹ تک ڈاٹ کراچی میں اسسٹنٹ ایڈیٹر
رہے ۴۹ برسوں وہ پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو گئے اور دس سال تک اسسٹنٹ ایڈیٹر کے
محکمہ سے اور پھر ۱۹۵۹ء سے مئی ۱۹۷۲ء تک ایڈیٹر کی حیثیت سے کراچی میں وہاں کے انجام
وہ سات برسوں میں انہیں فیض صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ چنانچہ فیض کی
صحافتی زندگی پر احمد علی خاں کے ذاتی تجربہ و شہدات کے علاوہ اسٹیمپ - ہمارے
خصوصی درخواستیں - انصاف کے بعد پہلی بار اردو میں یہ اہم مصنف نے لکھا ہے جس
کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اب دفعہ اوپر ڈاٹ کراچی کے ادارہ سے منسلک ہیں اور نیو
کالیم ٹائمز کے مدیر ہیں۔

فیض صاحب کو اخبار نویس بیٹھے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں اور آج کل ان کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ نظامیہ عجیب کی بات
معلوم ہوتی ہے کہ صحافت سے علیحدگی کے باوجود فیض صاحب اخباروں کی کسی شکل میں کبھی اپنی نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ سنجیدہ اخبار میں طبقہ
انہیں اب بھی محافیت کے منسلک سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات کو ثبوت اور اعتراض ہے کہ فیض صاحب کی صحافت سے وابستگی نے جس کا عرصہ
خاص حق پر اچھا ہم ادب یا دیگر اثرات پیدا کیے ہیں۔

فیض صاحب نے صحافت کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب کہ صحافت کی محافیت ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی تقسیم سے سال بھر پہلے
تک برصغیر پاکستان و ہند میں جہاں کئی کئی لاشعات انگریزی روزنامے کا انگریزی کے ہوا تھے وہاں صرف تین قابل ذکر انگریزی روزنامے
تحریر پاکستان کے حامی تھے۔ ڈاٹ دہلی سے نکلتا تھا اور اسٹار آف انڈیا اور مارنگ نیوز۔ کلکتہ سے ان دنوں اس علاقے میں جو
اب مغربی پاکستان کہا جاتا ہے انگریزی کے چار قابل ذکر روزنامے تھے۔ "ٹریبون" اور "سول اینڈ بزنس گزٹ" لاہور سے شائع ہوتے تھے
اور سندھ، راجستھان اور ڈیڑھ گزٹ "کراچی سے یہ چاروں اخبار غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھے اور ان میں سے کوئی بھی تحریک پاکستان کا
حمایتی تھا۔ اس کے آٹھ برسوں کے بعد پنجاب کے مسلم لیگ رہنماؤں نے اس کی کوشش کی جب میان انصار الدین مرحوم نے
پاکستان ٹائمز کی بنیاد ڈالی تو گویا دو کام یک وقت انجام دیے۔ ایک تو پاکستان کی تحریک کو جو نہایت نازک موڑ پر پہنچ چکی تھی،
دوسرا یہ تھا کہ دوسرے روز اشیدہ مملکت کی آئندہ صحافت کی سمت اور معیار کا نشان دیا۔ لفظ پاکستان کے شیعہ کے پہلے تو
پاکستان ٹائمز کے نام ہی پر چھوڑا گئے اور پھر بہت جلد اس اخبار کے صحافتی معیار اور اس کے پروکار اور رشتہ داروں سے متاثر ہونے لگے۔

میاں انجمنہ الدین مرحوم کے ایک سیاسی شخصیت تھے اور ان کے مخالفین کی تعداد ان کے موافقین سے کم نہیں تھی۔ لیکن یہاں ان کی سیاست کا یا ان کی رہنمائی میں پاکستان ٹائمز کے سیاسی رجحانات کا ذکر بے محل ہے۔ البتہ ان کے مخالفین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میاں صاحب مرحوم نے اپنے منبر کی روشنی میں ملکی صحافت کو ہم خدمت انجام دی۔ اخبار کے منتظم اعلیٰ کے طور پر انھوں نے جس اہمیت کا ہوتو دیا وہ اب بھی صحافتی اداروں کے منتظمین کے لئے ایک روشن مثال ہے۔ میاں صاحب بخوبی جانتے تھے کہ کوئی اخبار ایک قابلِ مبادو تجربہ کار اسٹاف کے بغیر اچھے صحافتی معیار پر پورا نہیں اتر سکتا چنانچہ انہوں نے فیض صاحب کو مدیر بننے کی دعوت دی اور ادارتی عملے کے لئے اچھی ٹیم منتخب کرنے کا زور صرف موقع دیا بلکہ اس کام میں ذاتی طور پر ان کی مدد بھی کی۔ سنا رشتوں کو وہ یہ کہہ کرتاں دیا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق ایڈیٹر کو ہے۔ دوسرے اہلکاروں نے اس اصول کو اپنا یا کر اگرچہ اخبار کی انتظامیہ بنیادی پالیسی بنانے کی جگہ نہ مگر اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایڈیٹر کے دفتر کے کام میں مداخلت کرے۔ اخبار نویس میں اس اصول کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر اے رے دیکھا جائے تو ایڈیٹر تجارتی مصالحتوں سے بلند اور مخصوص مفادات اور ایڈیٹر شخصیتوں کے مفادات سے محض نہیں رہتا اور نہ اس کا اہل جو نام ہے کہ غیر جانبداری سے عمومی مفادات کی تجدید و ترمیم کر سکے۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ ہمارے اخبارات کے سامنے ملک اور منتظمین ان اصولوں پر کاربند ہیں۔

فیض صاحب نے جب ادارت کا بوجھ سنبھالا تو وہ اس ذمہ داری کے لئے نئے تھے۔ لیکن ان میں اس کام کی بنیادی صلاحیتیں موجود تھیں۔ علمی بیاخت، سیاسی ادراک، تاریخی کا شعور، معاشرے کے مسائل کا علم، ادب پر گہری نظر اور اچھی انگریزی (یا اردو بہتر لکھنے کی صلاحیت)۔ فیض صاحب نے اپنی صلاحیتوں کا پورا استعمال کیا۔ ان کے ادا دینے اپنی سلاست، مستحکمگی اور اہمیت کے باعث، ابتداء ہی سے مقبول ہوئے۔ ملک کے سیاسی مسائل پر فیض صاحب کے تبصرے وسیع حلقے میں پڑھے اور پسند کیے جاتے تھے۔ قارئین کو یاد دہو گا کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد غلاب مہدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کی ہارچی چٹیک کی وجہ سے بجا پسلم لیگ دو صحابہ گردوں میں بت گئی تھی۔ اس قسم کے جھگڑے مشرقی بنگال اور سندھ میں بھی شروع ہو گئے تھے۔ اس گرد و بند کی تعلق اصولی اختلافات سے نہیں تھا بلکہ اس کی تہہ میں ذاتی مفادات کا رفرافے یہ ابتداء تھی اس بے اصولی اور سیاسی انتشار کی جس نے آگے چل کر جمہوریت کو بہت نقصان پہنچایا۔ چنانچہ اس بے راہ و گاہ پر فیض صاحب نے متعدد ادبیے لکھے جن میں مسائل کا دیا متدارانہ تجزیہ پیش کرنے کے علاوہ طنز کے ہتھیار کا بھی خوب خوب استعمال کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ تعلیمی اور ثقافتی مسائل پر بھی کئی فکر انگیز ادبیے لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔

ہر اخبار و مجلہ اپنے ادارتی عملے کے مزاج، ذہنی ساخت اور اندازہ نظر کا عکاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اخبار ایک ہی پالیسی کے پندا ہوتے ہوئے بھی کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پاکستان ٹائمز کا انداز اور پالیسی متعین کرنے میں فیض صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنا بھی فروری ہے جو اہل علم، ذاتی اور کھٹے کرنے کے لئے اختیار کیا۔ کا شروع ہونے سے پہلے روز مجب ایک میٹنگ ہوتی تھی جس میں اس روز کی اشاعت کا جائزہ لیا جاتا تھا اور دوسرے روز کی اشاعت کے سلسلے میں خامی تفصیل سے بات چیت ہوتی تھی۔ بس میٹنگ میں تمام شرکاء رکن اپنی رائے دیتے تھے۔ اس مجموعی طریقہ کار سے بظاہر تھا کہ اسٹاف کا پرسیسٹنٹ رکن اخبار کی پالیسی اور اس کے معیار کو اپنی ذاتی ذمہ داری تصور کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ ایڈیٹر کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ لیکن آزادانہ بحث اور رد و مستقبل کی باعث کوتاہیوں کو دور کرنے میں آسانی

پیدا ہو جاتی تھی اور اکثر ہنسی کا بیج باجیں کھلتی تھیں۔ فیض صاحب آزاد کی گفتار کے اتنے قابل ہیں کہ کسی کے منہ پر اس کی بات کی تردید نہیں کرتے خواہ بات کتنی ہی دہل ہو چنا چنا پڑے بیٹوریل کا نفرین میں بھی اکثر دس معقول باتوں میں چن چن کر یہ بات قابل عمل خیال لائے پیش ہوتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی صاحب بولے چلے جا رہے ہیں اور اس کا خیال نہیں کرتے کہ سب کا وقت منانے ہو رہا ہے۔ اکثر لوگ چہرہ تھے لیکن فیض صاحب کے چہرے پر ہنسی کی کوئی جھلک نہیں آتی تھی۔ غالباً وہ دیکھتے تھے کہ میڈلنگ کی افادیت کی خاطر یہ چیزیں برداشت کرنا ضروری ہیں۔

فیض صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور اگرچہ جن لوگوں نے انہیں اخبار میں انعام سے کام کرتے دیکھا ہے یہ دعویٰ کریں گے کہ وہ بنیادی طور پر صحافی ہیں، مگر اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ سیاست دان یا فلسفی یا مفکر بھی ہو۔ لیکن جو شعرا اپنی بہت پہلو شخصیت کا مکمل اظہار من شعر کے ذریعے نہیں کر پاتے انھیں اظہار و ابلاغ کے لیے دوسرے راستے بھی ڈھونڈنے پڑتے ہیں صحافت فیض صاحب کے لیے ایسا ہی ایک درست ثابت ہوئی اور اپنی سماجی اور سیاسی فکر کا اظہار انھوں نے پاکستان میں انگریزی تحریروں میں کیا۔

ایک لحاظ سے ان کے شعر کے قد و اذن کو صحافت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے ان کی شاعرانہ صلاحیت، بے ساختگی اور پاکیزگی برقرار رہی۔ دہن ان کے شعر کو اس سائے بوجھ کا متمل ہونا پڑتا۔ بہر حال اس معاملے میں قطع نظر اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ فیض صاحب صحافیوں کے اس چھوٹے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پاکستانی صحافت کا سنہ اوج بیاڑتین کرنے اور اس کی ترقی کے لیے رستہ صاف کرنے میں قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ ان کے وہ پرانے ساتھی جواب بھی صحافت میں ہے ان کے اس رول کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

شاعر کا عمل (صفحہ ۳۰ سے آگے)

کاش! فیض کا یہ پیغام جمہوری نظام کے مؤکدین کے علاوہ آمریت اور اشتراکیت کے پرستاروں کے گوش شنوائی پہنچ جائے اور خورشید خوف جیسے نام نہان عالم کو بھی زبان کھولنے اور لب گفتار بھانے کی جرأت دلا دیتا! مجھے اشتراکی نظام سے اسی مقام پر سب سے بڑا اختلاف ہے۔ اس نے پورے ملک کے ذہن کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی غرض سے اختلاف رائے و اظہار خیالی پر ایسی پابندیاں لگا دی ہیں کہ ان کا کلی کا سب سے بڑا فائدہ اس طرح خاموش ہے کہ جیسے قدیم پیام کی طرح اس کی زبان گڑی سے کھینچ لی گئی ہے۔ بہر حال ہر ملکہ و ہر رسمے اور اپنی اپنی پسند!

فیض قابل قدر اس لیے ہیں کہ وہ شاعر با عمل ہیں۔ ان کی شاعری صداقت پر مبنی ہے۔ ان کے قول و عمل میں مطابقت ہے۔ ان کا کام ان کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کر لینا ہے اور باوجود اشتراکی نظریات کی پرستش کے وہ صحیح و صالح انسانی اقدار کی تبلیغ کر رہے ہیں اس میں اقدار و مساوات، شرافت و حیثیت و قربانی، مروت و غیرت و دلداری و دل دہی و دہری سے ساری خصوصیتیں موجود ہیں نہ تو فیض نے قدیم روایات سے رشتہ توڑنا ہے اور نہ وہ زور دے رہے ہیں کہ ان کی شاعری نئی ہے۔ وہ بات کے دھنی ہیں انسانی حقیقت کے پیام برد ہیں اور ان کی نرم گفتاری میں دلوں کے جیتنے کے رعب ہیں۔ اور باریں اور صلحوں جیسی مٹھاس ہے۔ اس لیے ان کے کام کو جزوے امت اور غیر ہرماننا مناسب نہ ہو گا۔

فیض جعفری

فیض کا اسلوب شاعری

فیض کی شاعری کو عظیم اور اس درجہ مقبول بنانے میں ان کے مضمون و منفرد اسلوب کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر صاحب اسلوب شاعر قطعیت کے ساتھ بڑا شاعر نہیں ہوتا، لیکن یہ بات بھی اتنی ہی سچ ہے کہ ہر بڑا شاعر ایک خاص اسلوب کا حاکم ہوتا ہے، کیونکہ بڑا شاعر ہمیشہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ایک خاص طریقے سے غور و فکر کرتا ہے۔ اس کے کچھ اپنے انتہائی ذاتی لیکن گہرے تجربات و مشاہدات ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے پڑھنے والوں تک منتقل کرتا ہے اور جن پر اس کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔

اسلوب کیا ہے؟ کیا ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شاعری کیا ہے، یا ادب کیا ہے؟۔ لیکن اب تک اسلوب کی جو جامع ترین تعریف کی جا سکی ہے اس کے مطابق اسلوب کسی فن کار کی مجموعی شخصیت کے مکمل اظہار کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری میں اسلوب سے مراد صرف طرز بیان نہیں، بلکہ یہ صرف اسلوب کا ایک عنصر ہے اور جو دوسرے عناصر مثلاً شاعر کے سوچنے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ، لہجہ، الفاظ کا انتخاب و ترتیب، مواد اور موضوع وغیرہ سے کھل مل کر ایک خاص اور مکمل شکل اختیار کرتا ہے۔

مذکورہ بالا کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم فیض کے اسلوب شاعری کی بابت سوچتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب ایک ایسا تخلیقی اسلوب ہے جس میں زندگی کی حرکت اور توانائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہمیں ان کے اسلوب شاعری میں یہی ہونے والی توانائی اور بے لاکھی ملتی ہے اور زلف جانان کی خوشبو بھی۔ یہ شعلوں جو الہ کی طرح تند و تیز بھی ہے اور گلاب کی نیچڑیوں کی طرح نرم و نازک بھی۔ فیض نے عصری زندگی کا بڑی باریکی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ وہ جدید انسانی ذہن کی تمام الجھنوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے واقف ہیں۔ فیض کا اسلوب زندگی کے ہزار شیوہ حسن کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جہم جانان اور غم دوراں، دونوں الگ الگ راستوں پر نہیں، بلکہ پہلو پہلو چلتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور اپنی نغمہ دہن میں اگر غم محبوب میں اس حد تک بے قرار ہوتے ہیں کہ

تنبہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں

آسمانوں سے لگا ہوا ہے کبھی دستِ صبا کو
 ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں یا نہیں
 تو دوسری طرف اتنی ہی شدتِ احساس و صداقتِ جذبات کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ
 چاہے اسی رنگ میں سیلائے وطن کو
 تو چاہے اسی طور سے دل اس کی نگین میں
 دھونڈی ہے یہ نہی شوق نے آسائشِ منزل
 رنار کے خم میں کبھی کالکل کی شکن میں

فیضی کے اس پہلو دار عشق نے ان کے ایسی نظمیں پہلوائی ہیں جن کا موضوع 'پوری' زندگی ہے۔ جیسا کہ انگریزی کے مشہور نقاد
 مریٹھ مرے (Merritt Murre) نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ 'شاعر کے موضوعات
 سخن کا اس کے اسلوب سے گہرا تعلق رہا ہے' ہمیں اردو کے موجودہ نظم گو شعراء میں فیضی ہی ایسے تنہا شاعر دکھائی دیتے ہیں جن کی
 نظمیں موضوعات کی وسعت اور آفاقیت کی بنا پر نفاذِ پہچان لی جاتی ہیں۔ فیضی نے عام انسان کی زندگی کے چہرے ہرے صحرانورد محبوب
 کی سراپا نگار شخصیت دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا ہے۔ وہ اپنی نظم 'موضوع سخن' میں اس حقیقت کی جانب بڑا طبع اشارہ
 کرتے ہیں کہ

آج تک سرخ و سبز صدیوں کے سائے تلے
 آدم و حوا کی اولاد وہ کیسا گذری ہے
 موت اور زلیست کی روزانہ صفِ آرائی میں
 ہم پہ کیا گذرے گی ان بڑو پہ کیا گذری ہے

یہ ہر اک سمت، ہر اسرارِ کبریٰ دیواریں
 ہیں کیجیے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
 یہ ہر اک کام پہ ان خوابوں کی محقق گاہیں
 جن کے پر تو سے چراغی ہیں ہزاروں کے چراغ

اور پھر اسی نظم میں تقویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ

آج پھر سخنِ دلائی دہی درج ہوگی
 مہی خوابیدہ سی آنکھیں دہی کا جن کی نیر
 رنجِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غانے کا غبار
 صندل ہاتھ پہ دھندلی سی صفت کی تحویر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی

جان مضمون ہے یہی، سفاہت ہے یہی

صن اور زندگی کی دوسری قدروں کا یہ خوب صورت امتزاج، فیض کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جو ہمیں دوسرے ہم عصر شعرائے ممتاز کی ہے۔ ان کے اسلوب شاعری کی دوسری بڑی خصوصیت جو ہمیں نہ صرف مندرجہ بالا اعتبارات میں بلکہ ان کی تمام نظموں میں ملتی ہے وہ ہے ان کے کلام کی پہلو دار اور طبع سلاست۔ بڑا شاعر صرف اپنے لئے یا صرف چند ذہین ترین لوگوں کے لئے ہی نہیں لکھتا۔ وہ تو پوری قوم بلکہ دنیا کی تمام قوموں کے لئے لکھتا ہے۔ ہمیں ہر زبان اور ہر ادب میں کثرت سے دوسرے ادیبوں کے درجے کے ایسے شاعروں کا پیش گئے جو تجربات، اداسا، ات کی گہرائی کی کمی پر پردہ ڈالنے کے لئے، اسلوب کی پی پی کی کا سہارا لیتے ہیں۔ فیض کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات اور گہرے سے گہرے تجربہ کو اس سیدھے سادے لیکن لطیف انداز میں قاری تک منتقل کرتے ہیں کہ نہ فحاشی نہ نفاست میں کوئی کمی آئے۔ پالتی سے نہ تڑپیں۔ فیض کی مشہور نظم ہم جوتا ریک راہوں میں مارے گئے، جو ایشعل اور جیس روزن برگ کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ اپنی کئی دوسری اہم خصوصیتوں کے علاوہ، اسلوب کی گہری اور پہلو دار سلاست کا بھی بہترین نمونہ ہے۔ پوری نظم میں کہیں بھی قاری کا ذہن کوئی جھٹکا یا گڑبہ نہیں محسوس کرتا۔ لفظ بہ لفظ اور مصرع بہ مصرع بٹھنے والا اپنے آپ کو اچھا لگتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں حقیقتوں کے چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نظم کا مرکزی خیال نہ صرف قاری کو پوری طرح متوجہ کرتا ہے بلکہ اپنا چراغ وہاں دواں اور موزوں ترین بحر کے سہارے اس کے ہوش کیل ہوا بحر جزو زندگی بن جاتا ہے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم

دار کی خشک ہلنی پہ وارے گئے

تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم

نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

جب گلی تیسری راہوں میں شام ستم

ہم چلے آئے جہاں تک قدم

لب پہ حرفِ دفا دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی تو ہے حسن کی

دیکھتے تم رہے، اس گواہی پہ ہم

ہم جوتا ریک راہوں میں مارے گئے

طوالت کا خوف روک رہا ہے وہ نہ جی تو چاہتا ہے کہ پوری نظم نقل کر دی جائے۔ فیض کے اسلوب شاعری کی یہ بھی ایک بڑی خوبی ہے کہ ان کی بیشتر نظموں میں ایک ایسی خوب صورت اور مٹی خیز وحدت ہوتی ہے کہ نظم کو ٹکڑوں میں بانٹ کر پڑھنے سے بحرعی تاثر محروم ہوتا ہے۔ ان کی اکثر نظمیں ایک اکائی کی طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں جن کا ہر لفظ دوسرے لفظ سے، ہر مصرعہ

دوسرے مصرعے اور ہر خیال دوسرے خیال سے گچھا اس طرح متعلق و مربوط رہتا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خصوصیت نفیس کی 'ذموت حیات و کائنات سے ہم آہنگی بلکہ ان کی شغفیت کی داخلی یکجہتی کا نتیجہ ہے۔ نفیس کی نظم، ملاقات، اپنی دوسری تمام خصوصیتوں کے علاوہ اس سنی خیز وحدت کا بھی بڑا اچھا نمونہ ہے۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو عمو سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے۔ کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشکل بکھت ستاروں
کے کارواں ابھر کے کھو گئے، ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے، ہیں

ہر اک یہ شاخ کی کمان سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگہ سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سر کا لیتیں بنا ہے
لیتیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

مذبحہ بالامصرعوں میں 'ذموت' ہمیں موضوع کی عظمت اور مصرعوں کی اندرونی وحدت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ان میں ہم ایک ایسے نرم و نازک یکن کیلے لہجے سے دوچار ہوتے ہیں جو اردو شاعری میں سب سے الگ تھلک ہی نہیں، متاثر بھی ہے۔ نفیس کے لہجے میں ہلاکی نرمی و ننگی اور کٹ ہے۔ نفیس کا جہت، بڑا کمال یہ ہے کہ وہ انتہائی نرم و لطیف اشعار کی مدد سے گہیرے گہیر موضوعات کو اس طرح قاری تک منتقل کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن ان نرم و لطیف افکار کے پیچھے کام کرتی ہوئی، رتی روؤں کو آسانی سے اخذ کر سکتا ہے۔ برصیرے باہر نفیس کی غیر معمولی حقیت و حقیقت کا ایک سبب ان کے لہجے کی آفاقیت اور آواز کی ہر گہر و صحت بھی ہے۔ نفیس کی آواز ان کے ذہنی توازن و ولعنت کی آئینہ دار ہے۔ وہ کبھی براہ راست قدری کو کوئی اخلاقی یا سیاسی درس نہیں دیتے، بلکہ اپنی بات اور احساسات کا اظہار گچھا اس فن کا رامنہ چاہک دوستی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بغیر شعوری طور پر ان کے لہجے کی متانت، خود اعتمادی اور روشنی کا گزرتا رہتا چلا جاسکے۔ نظم ہوا غزل ہر جگہ نفیس کی یہ آواز، الم نصیبوں اور جگر دکھاؤں کو ایک پیروٹا شان سے ایقان و اعتماد کا نو بخشتی ہے۔ دل و دماغ کو ایک سونا نہما آگ میں مٹا کرتی ہے اور زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے،

ن۔ م۔ لا شے فیض کے اولین مجرّم کلام۔ "نقش فریادی" کے دیباچے میں لکھا تھا اور بالکل سچ لکھا تھا کہ۔۔۔
 "وہ عہد حیدر کی شیطنت کو نور و عریات کرتا ہے
 شیونکہ اسے کاتخیلے مرعے حقیقتوں کے روپروہ و حشرات پر
 طعن کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن وہ اتنے حقیقتوں کو خوابے میں
 منتقل کر کے انہیں حسن کے یوشاکے پہنانا جانتا ہے۔"

فیض کی آواز ادا رمان کے بچے میں گھن گرج نہیں بلکہ ایک ایسی نرمی نغمگی اور جھلاؤ شہ ہے جس نے ان کی شاعری کو گھن گرج والی اور بلند آہنگ شاعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیر پا تاثر عطا کیا ہے۔ فیض کے اس بچے کو کیا یاد بنائے میں ان کے تاریخی شعور کو بھی بڑا دخل ہے۔ اسی تاریخی شعور کی مدد سے انہوں نے اپنی مشہور نظم۔ "تار میں تری لگیوں پہ"..... میں کتنی خوب صورتی سے انسانی زندگی کی طویل و پُر درنا تاریخ نظم کر دی ہے۔

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے نظم سے خلق
 نہ ان کی رسم نئی ہے نہ ان کی ریت نئی
 یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے گم میں پھول
 نہ ان کی باد نئی ہے نہ اپنی جیت۔ نئی

مگر آج کچھ سے جدا ہیں تو کئی ہم میں
 یہ رات بھر کی بُدبائی تو کوئی بات نہیں
 مگر آج اوج پہ ہے طائرِ سقیب تو کیا
 یہ چہار دن کی خدا کی تو کوئی بات نہیں
 جو تجھ سے عبورِ وفا استوار رکھتے ہیں
 علاجِ مگر دہشِ سیل و تہہ دار رکھتے ہیں

فیض کی پوری شاعری میں کہیں بھی مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے نظر نہیں آتے۔ گودش یں وہناؤ ان کے لئے ناقابلِ علاج مرض نہیں۔ زندگی کے سخت ترین لمحوں میں بھی ان کی آواز مضحکہ خیز نہیں ہوتی جاتی۔ اور نہ ان کے بچے کا باپ کو مٹا کر مٹا دینا ہے۔ میں ان کی ہر نظم اور ہر غزل میں یہ پناہ اور سلام ہمارا رجائیت نظر آتی ہے۔ انگریزی کے مشہور اور رومانوی ہر کھانا مشہور اعریشے کی طرح فیض پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ انہوں نے اپنی شاعری میں جن اصولوں کا پرچہ دیا ہے ان کا حقیقی زندگی۔ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ فیض نے عملی طور پر بھی یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ شریعت پر یقین رکھنے والے منزل وادور سن
 یہی اسی باپ کے گودرتے ہیں جیسے کوئے جانان سے فیض کے پرامن چہرے کی ایک واضح مثال دیکھئے۔

ہونہ ہوا اپنے قبیلہ کا بھی کوئی لشکر
 منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر

ان گوشوں کے رجز اپنا پست تو دیں گے

خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے

دور مکتی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

(درد آئے گا وہ پاؤں....)

یہی احساس اور یہی جذبہ ہیں فیض کی غزلوں کے اکثر اشعار میں بھی کارفرمانظر آتا ہے۔ مثلاً ایک غزل کے یہ دو شعر 'شعروں کے رجز' سے کم تر دیکھ چکے ہیں۔

دل نا امید تو نہیں، کام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں

دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

فیض کے اسلوب شاعری کے متعلق بات ادھوری رہ جائے گی، اگر ان کی شاعری میں پاسو چلنے والے مخصوص استعاروں، تشبیہوں اور منفی چکر تراشی کا ذکر نہ کیا جائے۔ انگریزی کے مستند نقاد لوکس (F.L. Lucas) نے اپنی کتاب 'English Poetry' میں بڑے بڑے شاعروں کی بات کی ہے۔ شاعری، بغیر ان تشبیہات و استعارات کے بغیر سوج کا دن، اندھیر چڑیوں کا مرغزار ہونے کے مترادف ہے۔ دیکھ لے ہر بڑے شاعر کی طرح فیض نے بھی نہایت کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے گہرے اور اچھوتے تجزیوں کو دودھوں تک منتقل کر کے لے کر آئے ہیں۔ ان کی صورتِ استعارے تخلیق کئے ہیں۔ زنگان نامہ میں 'درجہ کے عنوان سے ان کی ایک چھوٹی سی نظم ہے جس کا خاکہ سے بے حد کامیاب ہے۔

گھٹی ہیں کتنی صیہیں مرے دریچے میں

ہر ایک اپنے سیمکے خون کا رنگ لے

ہر ایک وصلِ خداوند کی آنگ لے

کسی پہ کرتے ہیں ابر بہار کو ستریاں

کسی پہ قتلِ مہ تابست کب کرتے ہیں

کسی پہ ہوتی ہے سرستِ شاخار و فیم

کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوند گاہِ ہر وصال

ہو میں غمِ سرقِ مرے غم کدے میں آتے ہیں

اور آئے دن مری نظروں کے سلتے ان کے

شہیدِ جسم سلامت اٹھاتے جاتے ہیں

اسی احمد مراد نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ بالکل پر لکھا ہے کہ "زنگان کی سلاخوں سے صلیب کا استعارہ اخذ کرنا، حسن، نیکی، تہذیب، انسانیت کا دودھ حاضر کی مجرمانہ ذہنیت کے ہاتھوں روزِ صلیب پر چھایا جانا، اور تاہم انسانیت کا ان زخموں کے باوجود زہر و تابندہ رہنا اس نظم میں بڑی خوبصورتی اور بلاغت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بحیثیت مجموعی فیض کا اسلوب شاعری ایک نیا تخلیقی اسلوب ہے جس میں حرکت بھی ہے تپانہ بھی اور زندگی بھی، ان کی شاعری اپنے پڑھنے والوں میں بیک وقت روحانی تابلیغی جذباتی آسودگی اور زہر دہنے کی محسوس پیدا کرتی ہے۔ فیض کو شہرہ آفاق بنانے میں ان کے اس تخلیقی اسلوب کا بہت بڑا حصہ ہے جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بریکچیر گلزار احمد

مرکز داستان فیض

بھیک ہے رات فیض منزل استدار کو
وقت سرود درد کا ہمت گام ہی تو ہے

سعدو داغ سے بچنے کی تلقین کرنے والا فیض بھیک راتوں میں غزل کی ابتدا کا قائل ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ رات کا اخیر لمحہ یوں بھی بوجھل معلوم ہو رہا ہو اس وقت غم فائدہ سے تاریک راتوں کو تاریک تر کیا جائے۔ اسے قلب انسانی کے اضطراب و اضطراب کی کیفیت کا علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قلب کی پریشانی کس طرح ذہن کو مائل کر دیتی ہے۔ اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ جب ہجر و فراق کا بوجھ قلب و ذہن پر چھلنے لگے تو اسے غزل کے دشتاؤں سے ہلکایا جائے اور یوں درد میں لذت پیدا کر دی جائے۔

یہ مشورہ دینے والے شاعر یعنی فیض کا جب ذکر ہو رہا ہو تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ذکر کا آغاز بھی بھیک رات کی جوانی کے وقت سے شروع کیا جائے۔ البتہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ داستان کا مرکز فیض کو رکھا جائے یا اس کے کلام کو۔ درست کہ سناو کا کلام اس کی سیرت کا آئینہ ہوا کرتا ہے۔ اور اگر اس کے کلام پر کچھ کہا جائے یا اس کا جائزہ لیا جائے تو شاعر کو لامحالہ موضوع غنیمت ماننا پڑتا ہے۔ مگر یہ مقصد یوں بھی پورا ہو سکتا ہے کہ خود اسی کی ذات کو داستان کا مرکز بنایا جائے۔ جب شعر کہنے والا خود سنے ہو جو خود تو پھر اس کے خدو و قال کو آئینہ دیں۔ دیکھنے سے کیا حاصل۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس کے متعلق کچھ کہا جائے اور وہ داستان کے لئے اس کی تخلیق کو بطور سند پیش کیا جائے۔

جیتا جاگتا فیض لطافت و نفاخت کا مرقع ہے۔ وضعداری پائس خاطر اور مشرقی رکھ رکھاؤ اس کی فطرت ثانیہ ہے۔ وہ اس مشین و دھڑ میں رہتے ہوئے بھی اس کی برق رفتاری سے متاثر نہیں ہو سکا اور اس کی آلودگیوں سے کن نہ کن نہ رہا ہے۔ وہ دنیا کو مسی و مزیں کا ایک وسیع میدان تصور کرتا ہے اور اسے دنیا کی مبین چیزوں سے پیار ہے بلکہ یوں کہنے کے وہ چاہتا ہے کہ ہر مباحثہ میں بدل جائے چنانچہ اس کے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ دنیا کی ہر شے میں کسی نہ کسی پہلو میں دیکھ سکے۔ وہ ہر ایسی شے سے نفرت کرتا ہے جو مصیبت و دلغ لگائے مگر چونکہ نفرت کا جذبہ اس کی طبیعت پر گراں گذرتا ہے اس لئے وہ شکوہ و شکایت بھی دے الفاظ میں کرتا ہے

اب پر ہے ملتی ہے آیا م ورنہ فیض
مستم ملتی کلام پہ مائل ذرا نہ سکتے

حن کا مٹلاشی حن نظر بھی پیدا کر لیتا ہے اور جب حن نظر کو حن ادا کا سہارا بھی میسر آجائے تو جو کلام وجود میں آتا ہے وہ
لا حجاب ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر فیض الفاظ و بیان کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔

رنگ پرلین کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے جہاں بام پر آنے کا نام
دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستان کی بات نہ کیجیے نہ سے غلے کا نام

شعر کی بہت سی تقرینیں کی گئی ہیں۔ ایک تعریف یہ ہے کہ سننے والا ایسے کے وہ خود بھی یہی کہہنا چاہتا تھا۔ انہماکیاں
کے لئے اتنے موزوں الفاظ نہ ڈھونڈ سکا تھا۔ الفاظ و بیان کے ذریعے ہی خیال کو مقید کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی شاو کا کمال۔ وہاں ہے
فیض کو قدرت نے یہ ملکہ عطا فرمایا ہے۔ فیض کی صحبت جہنم میسر آچکی ہے وہ جانتے ہیں کہ فیض کی گفتگو میں دیر بہرہ کی
بوسہ فنی کا سارا لگ جاتا ہے۔ اس کے اشارے بھی بعد میں وہی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اس کی گفتگو کے ہر لفظ میں ناس مانی پہناں ہوتے ہیں۔
اس کی باتیں دوستی نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شمار کیے جاتا ہے اہل سخن و ضاحت سے پیش کرتے ہیں۔ مگر شاعرانہ اختصار بھی
آپ کا نہیں آتی۔

فیض جیسا دوستوں میں مقبلا ہے اور وہی ان دوستوں میں جو اس کی صحبت کے ہر لمحے کو دوا می بنا نا چاہتے ہیں تو دیکھتے
والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جوان محلوں کو طول دینا چاہتا ہے۔ اور اس کی ہر ہر نگاہ انہماک سے لبریز ہے۔ اور وہ اس
محل سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ اپنی اس ادا کو یوں پیش کرتا ہے

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
فصلہ تجھ سے تو مجھ کو پیا رہیں

شرم و حجاب کا یہ چلنا چاہتا ہے کہ جس طرح عشق کو وضع نامی کا پاس چھوڑنا نہ چاہئے اسی طرح حن بھی حجاب کے پرے سے
باہر نہ آئے۔ پر وہ تجاہد خود جس کو چاہتا ہے لگا لگا رہا ہے اور عشق کی توجہ کو مرکز کرنے میں مساوی ثابت ہوتا ہے۔ فیض کے مطابق حجاب
حن حجاب سے باہر آتا ہے تو اس کی جسد و گری حجابات قلب و نظر کو چاک کر کے ایک ہیجان سبب پیدا کرتی ہے اور انجام کار حن جس کا
رہتا۔ کہتا ہے

جلوۂ حسن کو مستور ہی رہنے دیتے
حسرتِ دل کو کھنگار نہ کر دینا تھا
ایک لو جگہ عشق کو اسی طرح کی تلقین کرتا ہے

لگاؤ شوق سحر بزم سب حجاب نہ ہو
وہ بے خبری ہی اتنے بے خبر بھی نہیں

منزلِ غلام پر عبور حاصل کرنے اور عصرِ حاضر کی یوپی تہذیب کو قریب سے دیکھ چکے کے بعد بھی زندگی کے ان بنیادی پسوں
پر فیض کی رائے میں سبب و فرق نہیں آیا۔

فیض نے علوم شرق و غرب سے مستفید ہونے کے بعد زندگی کی کئی راہوں پر سفر کیا۔ زندگی کے متعدد پہلو دیکھے اور ہم پہنچا
 بخور مطہر کیا۔ چشم روشن، ہفت ہفت عین و وسیع اور قدرت بیان کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ غیر مرئی اشیا کا ذکر بھی کرتا ہے تو ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو بھی وجود حاصل ہو گیا ہے اھ وہ بھی جسم و جان کی مالک بنی ہیں۔
 آنکھوں سے لگا یا ہے کبھی دست صبا کو
 ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں باہنیں

یہیں سرفراز الفاظ کا چناؤ اور خیال کا اچھوتا پن ہی شہر کی جان نہیں۔ مہجوم اور غیر برقی اسفات کو وجود مل گیا ہے۔ یوں
 ہوس ہوتا ہے کہ صبا کے نازک نازک کے ہاتھ ہیں جو میرے کو تھپکاتے ہیں تو غنیمت ہی کہنے لگتی ہے اور مہتاب بھیکے خود یونیورسٹی
 اخروہ کائنات کی طرح مجسمہ سن بن گئی ہے جس کی گردن کاٹش خیال ہی میں نہیں بلکہ واقعتاً ممکن ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے انسان دست صبا
 اور گردن مہتاب کو ذہن کے سامنے رکھے تو معلوم کون کون حسین و جمیل مگر ادھورے خواب پر سے ہوتے نظر آئے لگتے ہیں ایسی افکار
 میں بیکہ اور جگہ کہتا ہے۔

اس قدر پیار سے اسے جان جہاں رہا ہے
 دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاوے ہاتھ

یہ سادہ فیض ہی کو خاص ہے کہ وہ سننے والے کو نظیریں دلاتا ہے کہ اس کا دل ایک جتنی جاگتی : سامنے جتنی ہوئی اور میرا سار
 سہی ہے جسے یادوں کے ہاتھوں تسکین و راحت بھی نصیب ہو سکتی ہے اور کہہ : در اور رنج و الم بھی۔
 زندگی کو اس بار یکہ نفرت دیکھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ غم و اندوہ کے دوران بھی زندگی کے عین پہلوؤں سے غافل نہیں رہتا۔
 عینوں سے بہت ہے۔

نقص ادا ہے یارو صبر سے کچھ تو کہو
 کہیں تو بہر حقد آج ذکر یا نہ چلے
 ابام غم اور فیض کو وہ دافرعطا ہوئے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتا ہے :
 جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
 جب ترا عنعم جگا لیا راست چل چل گئی

درسِ ندیۃ والا فیض اب مدرس بن گیا ہے۔ بنی فوج انسان کو ایک نئے رخ سے دیکھنے کے بعد اسے بہت کچھ کہنا ہو گا اور کہنا
 بھی چاہیے۔ میر و شبیہ برقرار رکھنے والا فیض ہی شیار : کو انضام کی اہمیت سمجھا سکتا ہے۔ اپنے اس فرض کو نگاہیں رکھتے ہوئے اس نے ایک بار کہا تھا کہ
 ہم پرورش لوح دستلم کوٹے میں سٹے
 جوں پہ گذرتی ہے رقم کرتے ہیں گے

دل پہ گزری ہوئی باتیں جب لوح و قلم کے پردہ کی جائیں تو وہ با اثر اور زور اثر بنتی ہیں اور یہ عین ہے کہ اس علم کا شیار فیض سے
 فروزست فیض ہو گا۔ ابدات بھیگ چکی ہے۔ اس نے ہم اس آئینے کے ذکر پر ہی انگٹا کرتے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں کہ
 سے فائدہ سلامت ہے تو ہم سرخی سے
 تڑپیں وہ وہ باہم حرم کرتے رہیں گے :

ابن بشریہ

فیضیہ شاعر

چند فنی پہلو

فردک کا ثبات صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا، اس کے تجربات صرف اپنے ہی تجربات نہیں ہوتے، اس کے افکاری تشکیں میں صرف اس کی تنہا ذات ہی کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ بنی نوع کے قرن باقرن کے تاثرات و تجربات اس تک مستقل ہوتے رہتے ہیں اور یہ تاثرات و تجربات اس کے ماحول میں اس قدر رقیق ہوتے ہیں کہ جب ان کی زندگی کے انداز سے ان تاثرات و تجربات کو غیر معمولی سطح بہت حاصل ہوجاتی ہے تو وہ اس کے جذباتی تجربات سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں، اور انہیں اظہار کو دیا ہی، انداز نصیب ہوتا ہے۔ اس ماحول کے دوسرے افراد کا انداز اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر جب اپنے جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے تو ہم بھی اس سے ویسا ہی تاثر قبول کرتے ہیں جیسا شاعر ہم سے مطالعہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لئے شاعر اور قاری کی زبان میں اجنبیت ہو تو شاعر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ زبان سے مراد لینگویج نہیں، ابلاغ ہے۔ شاعر کا شاعر اپنی برتری، جتانے کے لئے وسائل ابلاغ پر زیادہ زور دیتا ہے، انوسلی تراکیب اور انہی الفاظ کے ذریعے اپنی ذاتیت منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے جذباتی تاثرات کی چھاپ اس کی فکر پر نہیں آتی۔ اس کے رنگ اگر سے تو مزور ہوتے ہیں، لیسکی متناسب نہیں ہوتے، چنانچہ وہ پٹو بڑھن کو شکار ہوجاتا ہے۔ پختہ کار شاعر مسائل ابلاغ پر توجہ صرف کرتا ہے۔ وہ بیانیہ کے انتخاب پر وقت ضائع نہیں کرتا، شراب سے انتخاب کو اہمیت دیتا ہے، کیونکہ اسے یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ جس پیمانے میں بھی شراب ڈال دے گا وہی بیش قیمت ہوجائے گا۔

فیض کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد یہاں تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہم مشرق اور خاص طور سے اردو کی شاعر کا مطالعہ کر رہے ہیں ان کے کلام میں ہمیں جو فضا، ماحول اور زبان ملتی ہے وہ ہماری اپنی ہے، ہم اس سے اس قدر متاثر ہیں کہ ہمیں کسی لمحہ بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم دیباغیہ میں ایک اجنبی بن گئے ہیں، بلکہ یہ بام دور، یہ خلوت و جلوت، یہ محلی و سنبل، یہ بادِ موسم سب ہماری اپنی ہیں اس تاثر کو دیکھتے ہیں کہ فیض کی شاعری میں ہمیں ایک تہذیبی تسلسل ملتا ہے۔ حال کے افکار و نظریات سے وہ جس قدر متاثر ہوئے ہیں اسی حد تک ماضی کو بھی اپنے ذہنی سرچشمے کا جزو بنا لیا ہے۔

ان کے بیشتر کلام کی ہیئت وہی ہے جسے نئی نسل کے شعراء فرسودہ قرار دیتے ہیں۔ جہاں فیض نے نئی ہیئتوں کو انتہی تک پہنچا دیا، وہاں بھی اظہارِ ذہن کے لئے مناسب ترین نسبتیں وہی اختیار کی ہیں جو اب تک مروج رہی ہیں۔ فیض کے سلسلہ میں یہ ایک موسیقی والا ہے جو کہ وہ غزل کے شاعر ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا بیشتر کلام غزل پر مشتمل ہے، لیکن اس پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ جس دور میں انہوں نے غزلیں زیادہ کہی ہیں وہ ان کا دورِ بیداری ہے۔ ان کا ذہن جس کشمکش سے دوچار تھا، اور جذبات جن کچھ کون کو پر داشت کر رہے تھے، ان کے لئے غزل سے زیادہ مناسب ہیئت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ جذباتی تجربات کی رفتار بہت تیز تھی، اس لئے اظہار بھی کاری اور اختصار و ایجاز کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پر ایک گانہ ہونے کی وجہ سے اس کا متعلق ہو سکتا تھا۔

فیض نے غزل کے مزاج کو بھی ہمیں برقرار رکھا ہے۔ ان کی تعلیمات، استعارات، تشبیہات وہی ہیں جو غزل میں اپنے نمک راج رہی ہیں۔ لیکن ان کا جہان معنی بدل گیا ہے۔ اس بدلے ہوئے جہان میں ہی کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہی وہی دی نئی دیوں (Remy De Gourmont) نے داخلِ ادیب کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ فیض پر بھی صادق آتا ہے۔

”ایک مخلص انسان کی ہر جدوجہد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی تاثرات

کو ذاتی احوالوں میں ڈھال دے۔“

فن کار کا کام یہ نہیں ہوتا کہ اُس نے صنائع و درائع سے مرصع کاری کا کام کس مستند دی کے ساتھ لیا ہے۔ بلکہ اس کی اصل معراج یہ ہوتی ہے کہ صنائع و درائع جب اُس کی نوکِ قلم پر آئیں تو اس کی شخصیت کا منہ اور اس کے جذباتی تجربات کا تدارک بن جائیں۔ بالکل مشاعرہ مرصع کاری نہیں کرتا، اُسے آرائشی سے مرادگار نہیں ہوتا، وہ تو ایک ایک لفظ کی رگ و پے میں اپنے ”خونِ دل“ کشیدہ ”روانِ دماغ“ کو دیتا ہے۔ اُس کے یہاں الفاظِ مرصع کی طرح چمکتے ہیں، دل کی طرح بولتے ہیں سے

جان بیچے کو اُسے تو بے دام نیچے دی

اے اہلِ مصر، دُشمنِ تکلف تو دیکھئے

افعات بے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر

اک بار سونے داہنِ یوسف تو دیکھئے

ذہنیاتی و ادبی اور یوسف کی پاک دامنی کی یہ مقبول ترین حکایت ہے جسے شعراء نے مسلسل استعمال کیا ہے۔ فیض نے بھی اسی فرسودہ داستان کو منتخب کیا ہے۔ لیکن اس قطعہ میں فیض کا اپنا تجربہ بول رہا ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ راولپنڈی سازش میں فیض بے گناہ تھے یا غلطوار، لیکن مجرموں کے کہنے سے میں کھڑا ہوا، افسوس کہ جب خود کو بے گناہ تصور کرے تو یوسف کی بے گناہی میں اُسے اپنے جذباتی تجربے کی غفلت نظر آئے گی اور اس کی نظروں میں جا کر مجرم کی، ورنہ پھر اُسے حشر کا مسیران یا د اُسے گا۔

پھر حشر کے سامان ہونے اہلِ ہوس میں

بیچتے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں

ہاں جرم دعا دیکھتے کس کس پر ہمدنابت

وہ سادے خطا کار مردار کھڑے ہیں

فیض کے علامہ بھی وہی ہیں جو انہیں ماضی کے سرمائے سے ملے ہیں۔ انہوں نے مشرق کی طرف پیٹھ کر کے مغرب کی طرف لپٹ پائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اپنے ہی چین کے پھولوں کوئی آب و تاب اور نیا پیر بن بختا ہے۔ جنوں، عبا، شیخ، تاج بھی، سنت، دستور و قیس، نعل و امنی و گج بھی ستے اور وہ شاعری سیکڑوں برس کے مانوس ہے۔ ان کی اداسی حقیقت عشیت ہے۔ فیض نے اس عشق کو دوست دے کر ایک اور میدان میں استرا ل کیا ہے جو سیاسی ہے۔ فیض ان علامتوں کے بجائے اگر راست انداز بیان کو اختیار کرتے تو ان کا موضوع محدود، کم عمر اور وقتی ہو جاتا، چنانچہ انہوں نے ایسے علامہ کو اختیار کیا جو صدیوں کی آبیاری کا شہرہ ہیں، اور جہاں ہمہ گیریت کی بنیاد ہے نہ کوئی آسانی فیض کے مافی الضمیر کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ فیض کے سلسلے اس بحر کی کامیاب ترین نظیر اقبالؒ پر پیش کر چکے ہیں۔ اقبالؒ نے جہاں مرد مومن، شاہین، خودی، کرکس وغیرہ کی نوعیت کئے علامہ پیش کئے ہیں۔ وہیں ملہ، دیر، حرم، بنت کمرہ، تنہا، عشق، فراق، وصال وغیرہ کو بھی فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اگر علامہ کا کام ایمان کے ساتھ ایک وسیلہ تجربہ کی طرف موڑ دینا ہے تو یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ علامہ میں ابلاغ کی اہلی صلاحیت ہو اور قاری ان کے مانوس ہو۔ ایسے علامہ جن کی تختیاں صرف شاعر سمجھا سکے، شاعر کی ذائقہ ملکیت ہو سکے، تین، ادبی سرمایہ نہیں! فیض نے اپنے علامہ کو ادبی سرمایہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ذائقہ ملکیت نہیں ہے

نہ جانے کس نے امیدوار بیٹھا ہوں

اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے

وہ جا رہا ہے کوئی شبہ فہم گزار کے

پوچھ کہ معفت لگا دلا ہے خون دل کی کشید

گراں ہے اب کے لئے لالہ فام کہتے ہیں

ہے وہی عارض یل، وہی شیریں کا وہن

نغمہ شوق گھڑی مہر کو جہاں بھڑی ہے

مقام فیض کوئی راہ میں بچا ہی نہیں

جو کونے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ایسے نادان بھی نہ سکتے چاہے گلہ نہ دلے

نامحو، ہند گور، راہ گذر تو دیکھو

رقبے سے تیز کرو۔ سادگی۔ بے تیز کرو

سوئے سے خانہ سیراب حرم آتے ہیں

اوس کچھ دیر نہ گزرے شہباز قریب سے ہو

دل بھی کم دکھائے دویا بھی کم آتے ہیں

فیض نے ماضی و حال میں مسلسل قائم کر کے مستقبل کے لئے بھی کچھ نئے تجربے کئے ہیں۔ ان تجربوں میں سب سے نمایاں حیثیت ان کی تمثالیات (imagery) کی ہے۔ اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ مشرقی شاعری میں محاکات ایک ایسی صنعت ہے جو شمال کے قریب ہے، لیکن محاکات کا کینوس بہت محدود ہے۔ مشرقی شعراء اس سے مرث اتنا ہی کام لیتے رہے ہیں کہ تصور میں خارجی منظر کا سماں بندھ جائے۔ گویا یہ ایک تھوس بھری اوراک (visual perception) ہے۔ اس میں تمثالیات کی طرح تہہ داری نہیں ہوتی۔ اس کی ترکیب ذہنی یا محسوس براہ راست ہوتی ہے۔ یہ صرف مادی (concrete) ہوتی ہے۔ تجر (abstract) نہیں ہوتی۔ محاکات حاسہ ہنر کے علاوہ دوسری حیثیات (sensations) سے تقریباً نہ ہونے کے برابر تعرض کرتی ہے۔ تمثالیات ہر محسوس کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے۔ کیونکہ تمثالیات کسی بھی ایسی شے کو ذہن یا تصوراتی طور پر پیش کر سکتی ہے جو اصل حواس خمسہ کے راستے موجود نہ ہو۔ تمثالیات کی اصطلاح کے عمومی معنی تو تصویرگری ہی کے ہوتے ہیں، لیکن یہ تصویرگری سے برتر ہے۔ اور اسی وجہ سے محاکات سے مختلف!۔ تمثالیات کے لئے استعاراتی و کنایاتی زبان کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ حیاتی و لفظی زبان کے علاوہ تمثالیات میں ہمیشہ موجود ہوتی ہے لیکن اس کا وجود ہونا ضروری بھی نہیں! اسی طرح تمثالیات کے لئے صنائع و بدائع کی زبان بھی لازمی نہیں۔ کیونکہ تمثالی شاعری صنایعی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تصور (imagination) کو نودہ پیشانی میں ہانے کا ذریعہ ہے۔ تمثالیات سے اگر شاعر صبح کا دلیلینہ پر قدرت رکھتا ہے تو یہ نمل یا شکر کا بز و لالہ محف بن جاتی ہے۔ اور شمر یا نغم کے جامع و کلی معنوم کے ابلاغ کا وسیع بن جاتی ہے۔

اردو شاعری میں تمثالیات کا تجربہ بہت محدود ہے۔ جدید شعرائے اُس کی ایسی مثالیں رائے اور میراجی کے یہاں ملتی ہیں۔ دوسرے شعراء تمثالیات میں جن علامت، استعارات یا تعلیمات سے کام لیتے ہیں۔ ان کا دائرہ ابلاغ اتنا محدود ہوتا ہے کہ تصور میں حیاتیات کی کائنات بھنک کر رہ جاتی ہے۔ فیض کی تمثالیات میں ایک جان بچی سے اور ایک وسعت بھی!۔ اُن کے علامت پر تعین اور گھٹک نہیں ہوتے۔ حیاتی و جذباتی تجربات کا سلسلہ ان سے دراز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

عمری شوق نفس را کا اثر تو دیکھو

مکھلے جاتے ہیں وہ سایہ در تو دیکھو

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن

میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

بیرستہ ہونٹوں کے پھوٹوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک مٹی پہ داسے گئے
تیرے ہاتھوں کی تمنا، کی حسرت میں ہم
نیم تاریک ماحول میں داسے گئے

تازہ ہیں ابھی یادیں اسے ساقی نکل فام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لپکے ہوئے آیام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعۃ
وہ دل سا دھڑکتا ہوا اسیر کا سنگام

اب اشعار میں صرف ایک علامت یا اشارہ ذہن کو ایک مکمل تماشائی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ مثلاً رُخ اور ساقی اور تازہ اور فام، ہونٹوں کے پھوٹوں، ہاتھوں کی تمنا، انکسِ رُخِ یار سے لپکے ہوئے آیام، امید کا سنگام، میں نہو کے دروازے کھول دینے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ فیض نے مسکرت تماشائی کو بڑی فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک جذباتی گند اشکی اور روحانی رضا پیدا ہو گئی ہے جو قاری کو اپنی طرف قدم قدم پر متوجہ کر رہی ہے۔

کسی شاعر کی مثبت لیت کا اگر مشیت مجموعی ماحول کی جائزہ تو وہ اس کی ذات یا شخصیت کے بغض ایسے غفیرہ کھول رہی ہے جن کی طرف سرسری طور پر ذہن نہیں جاتا۔ کیونکہ شاعر تشریحات کے ذریعے حیاتی تجربات کا سرمایہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب حیاتی تجربات کی بات درمیان میں آجائے تو پھر شاعر کا انفرادی رجحان اور اس کی شخصیت کے بغض مضر پہلوؤں کا ماحول پر بحث بن جاتا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

ہر فرد کے حیاتی تجربات یکساں نہیں ہوتے، اور نہ ہر فرد صرف ایک یا دو حواس (Senses) کو اہمیت دیتا ہے، اور باقی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ کوئی فرد حواسِ باصرہ و سامعہ کو اہمیت دیتا ہے تو کوئی حواسِ باصرہ و شامہ کو۔ کوئی حواسِ لامعہ و شامہ کو اہمیت دیتا ہے، تو کوئی حواسِ لامعہ و ذائقہ کو۔ یہ انفرادی طبائع پر منحصر ہوتا ہے۔ اور طبائع کے امتیاز میں ان کو اہم کو بھی دخل ہوتا ہے جن میں شاعر کے حیاتی تجربات ہوتے ہیں۔ مثلاً میراجی کے یہاں ہمیں تشریحاتِ لامعہ اچھی خاصی قہر میں مل جاتی ہیں۔ راقعہ کے یہاں تشریحاتِ لامعہ و باصرہ کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی طرح فیض کے یہاں ہمیں تشریحاتِ باصرہ و شامہ کی فراوانی نظر آتی ہے۔ اس نوعیت کی تشریحات کی کثرت، دستِ مہیا اور زنداںِ تاحہ میں ہے۔ زمانہ اسیری میں فیض خارجی دنیا سے بالکل منقطع رہے، بہت سی یادیں اور بہت سی خواہشیں ان کے ذہن پر چھائی رہیں۔ یہ احساس ہی ان کے لئے کیا کم تھا کہ وہ پابندِ قفس ہیں۔ اس احساس نے ان کو حواسِ باصرہ و شامہ کو غیر معمولی طور پر متحرک کیا اور وہ جیل کی دیواروں سے باہر کی دنیا سے تصور کی دنیا میں ہم کنجا رہ جاتے رہے۔ اس جذباتی و حسیاتی عروج میں ان کے طرز فکر کو متاثر کیا اور انہوں نے تشریحات کے پیمانے میں بڑے عینِ جلوسہ دیکھے شروع کر دیئے۔

رنگ۔ پیراہن کا۔ خوشبو زلف ہلانے کا نام
موسم گل ہے تہا سے یا م پر آنے کا نام

پہر نظریں پیوں تہکے، دل میں پھر نہیں جلیں
چرتھوڑنے لیا اُس نرم میں جانے کا نام

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
حب ترا غم جگایا، رات میں چلی گئی

صبح چھوٹی تو آسمان پر تھے
رنگِ رخسار کی پھوٹا رہ گئی
رات چینی تو روئے عالم پر
میزی زلفوں کی آبشار گئی

میں یہ غم کے سسٹا رکس کر
شوق کا گنار بن گئے ہیں
میں یہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطرہ اندر قطرہ کر رہی ہیں
کے آتشیں بارین گئے ہیں

ان اشعار میں اکثر ترکیب عام اردو قاری کو نا مانوس معلوم ہوں گی۔ مثلاً نظریں پھول مہکنا، رنگ۔ کا پیرہن سے اور خوشبو کا زلف سے واسطہ ہونا، رنگِ رخسار کی پھوٹا رہ گئی، زلفوں کی آبشار، غم کے شرار، گزروں کے آتشیں بار، دینرہ۔ لیکن اگر ان ترکیب کو عام قاری کے معیار سے ماخذ ہو کر ادبی افاداری کی سطح پر دیکھا جائے تو انہیں تشبیہات توسیعی ——— Extended Similes ——— میں رنگ و نور کی ایک دنیا آیا و نظر آئے گی۔ محبوب کا شوخ و رشک پیرہن، غم کی زلفیں، تابناک رخسار وغیرہ سے ہم میں سے کون مانوس نہیں؟ صرف ایک علامتی اشارہ قاری کے ذہن کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ زلفیں حبِ شاد پر کھڑی ہیں تو ایک آبشار سا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ غم میں دل کو جیب کچھ کے گئے ہیں تو درو کی چکار مایاں پھوٹنے لگی ہیں۔ اور ان چٹکار مایوں میں جب الم فیصیب گھر جاتا ہے تو وہ محسوس ہوتا ہے کہ گزروں نے اس کے گرد ایک بالہ بنا لیا ہے جو ہار کی طرح اس کے گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ غرض فیض نے اپنے آثارات اُس طرز پیش نہیں کئے ہیں جیسے رواجِ پیش کے بجائے سب ہیں، بلکہ دنیا انہوں نے محسوس کیا ہے۔ اور اس احساس ہی کو وہ پورے خلوص کے ساتھ قاری میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں ادب۔ انسانی

نہیں ہے۔ اظہارِ ذات ہے۔ اس لئے انہوں نے محاکات پر تکیہ نہیں کیا ہے مثالاً کی وسعتوں میں کھو گئے ہیں۔
فیض کی ابتدائی نثروں میں ہمیں مصرعے یا اشعار زیادہ تر اس نوعیت کے نظر آتے ہیں کہ شعر کے مکمل ہوتے ہی تہذیبی مکمل ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصرعے اور تمام اشعار اپنی نیک پراکھ اکائی بن جاتے ہیں۔ ان کا آپس میں ربط صرف مضبوط کی یکسانیت کی حد تک ہوتا ہے۔ یعنی ربط صرف بحر یا وزن کی حد تک باقی رہتا ہے۔ چنانچہ غزل کے اشعار کی طرح اگر ان اشعار کو نفہ سے الگ کر لیا جائے۔ تو مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مثلاً

محبت کی دنیا میں اسٹام آپ کی ہے

سید پوش ہیں زندگی کی فضا میں

”انہام“ (نقش فریادی)

اور بھی دکھ ہیں زملے میں محبت کے سوا

لاحس اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

”محبت پہلی ہی محبت....“ (نقش فریادی)

اُن کا آئینل ہے کہ رنار کہ پراہن ہے

کچھ تہ ہے بس۔ ہوئی جاتی ہے چلن بگس

”موضوع سخن“ (نقش فریادی)

یہ اندازِ حال کی اکثر نغموں میں بھی ملتا ہے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخ سے

تزمین درویشیم۔ ہم کرتے رہیں گے

”لوحِ قلم۔ (دستِ صبا)

روشن کہیں، ہمارے امکان ہوئے تو ہیں

گلشن میں چاک چہر گرہاں ہوئے تو ہیں

”گنت سہ ۱۹۵۲ء“ (دستِ صبا)

شعلہ دروچہ پہ نہیں پک اٹھے گا

دل کی دیوار پہ ہر نقش دیک اٹھے گا

”خرد و دلے کا ذبے پاؤں“ (زماں نامہ)

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری اب تک ایسا تہ مسلسل (Run on Lines) سے مانوس نہیں رہی ہے۔ قصیدہ، غزل، مرثیہ اور مستوی میں اشعار کی مفروضاتی حیثیت بہرِ نوبہ باقی رہی ہے۔ چنانچہ جدید اردو شاعری میں بھی یہ رجحان عام رہا، اور اقبالؒ جیسے عہد ساز شاعر نے بھی اسی حیثیت میں بلند ترین کلام نہیں کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حیثیت کے تجربے بند ہو چکے ہیں۔ اردو میں آزاد شاعری کا تجربہ اقبالؒ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا، اس کے روشن امکانات میسور

صدی کی تیسری دہائی میں آشکار ہوئے۔ لیکن آزاد نظموں میں بھی مصرع یا شعر کے ساتھ ہی مفہوم مکمل ہو جاتا تھا۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی مثال بھی فیض ہی کے کلام سے پیش کی جائے۔

بول، کہ لب آئنا دہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سوتاں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے

لیکن رفتہ رفتہ فن کی پہنچ کے ساتھ فیض کو یہ اندازہ ہوا۔ — ریاضیاتی اندازہ نہیں — کہ جدید شاعری کے ہستی بکرہ میں ابیات مسلسل خصوصی توجہ کی محتاج ہیں، ان سے نہ صرف بیان میں روانی پیدا ہوتی ہے بلکہ خیال بھی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مزید برآں آہنگ کے نشیب و فراز کو حسب ضرورت پیدا کیا جاسکتا ہے، جس کی بنا پر بدلتے ہوئے اطوار (mood) اور جذبات کا اثر قاری تک منتقل کیا جاسکتا ہے۔

میں فنیق کا موازنہ شیکسپیر سے کرنے کی حاکت کرنا نہیں چاہتا، صرف شیکسپیر کی مثل سے ان کے لئے فوری ایک مشعل لینا چاہتا ہوں۔ شیکسپیر کے ابتدائی ڈراموں میں ہیں ابیات مسلسل نظم میں آتیں۔ ہر مصرع اپنے مفہوم کے ساتھ مکمل نظر آتا ہے، لیکن آخر وہ میں جب اسے یہ احساس ہوا کہ مکمل مصرعہ روانی اور حرکت کا دم گھونٹ دیتا ہے تو اس نے ابیات مسلسل کو اپنا لیا۔ وہ اگر شعاعی کرنا چاہتا تو نمکنت شاعری کرتے دکھا سکتا کیونکہ اسے کمال حاصل تھا، لیکن اس نے سادگی میں بزرگاری اختیار کی اور شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ شیکسپیر کے آخری دور کے ڈرامے شاعرانہ حسن کے لحاظ سے جس قدر مکمل اور فطری ہیں اتنے ابتدائی دور کے ڈرامے نہیں ہیں۔ اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ ابیات مسلسل کا استعمال نہ صرف قدرت شعری کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ پختہ کاری کا بھی۔ ایک مبتدی جب اس وادی میں قدم رکھتا ہے تو قدم قدم پر لڑکھڑا جاتا ہے اور نظم نہ تو نظم رہتی ہے اور نہ نثر، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی عقیقت لاش کو عریان کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہو۔ اسی بنا پر یہ کہنا درست ہوگا، کہ ابیات مسلسل بھی سلیقہ مندی اور ریاضت چاہتی ہیں۔ جب شاعرانہ کے ذریعے نظم میں فطری حسن پیدا کرنے کا اہل ہو جائے۔

فیض نے ابیات مسلسل کے جو تجربے کئے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ میں ہیں بلکہ ان سے نظم آزاد و معرزی کے لئے نئے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اگر ڈرامہ نگار اس تجربے کی طرف توجہ دے تو بد قسمتیوں کا مستقبل سنو سکتا ہے۔ اردو کا یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ اس میں مرکب (Compound) جملے نہیں ہوتے، اس لئے انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں کی طرح ادیب یا شاعر جملے انھوں میں نہیں ہو جاتا۔ اردو کا شاعر اپنی بات کو پیش کرنے کے لئے مفرد (Simple) یا عددہ (Compound) جملوں کو استعمال کرتا ہے۔ اُسے مرکب جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی، اسی وجہ سے ابیات مسلسل کی ناگزیری کا بھی احساس نہیں ہوا۔ لیکن اردو میں ابیات مسلسل کے تجربوں نے زبان کے لئے چھوٹی موٹی رکاوٹوں کو بھی رفع کر دیا ہے۔ مثلاً فیض کی نظم "علاقات" میں کس قدر روانی، تیز رفتاری اور آہنگ کا احساس ہوتا ہے جیسے دست وصال میں چمک جھپکے گا، وہاں ہے یہ رات اس در و کا شجر ہے

یہ رات اس در و کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے ملیم تر ہے

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھوں مثل بخت تاروں
کے کاواں، گھر کے کھوسگے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور دھو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

اور جب اس روانی اور تیز گامی کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب زندگی کی شمع بج کر ہو رہی ہو۔ اور صحت اپنے پر پھیلانے
سروں پر منڈلانے لگے تو اس میں حزن پیدا ہو جاتا ہے۔

جب گلی تیری راہوں میں شام ستم
مچ چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرف غزل، دل میں دستِ یلغ
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیجھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

یہ کون تھی ہیں
جن کے ہو کی

اشرفیوں، چین چین، چین چین
دھڑکی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جوان ہیں ارضِ غم

طریقہ اور المیہ کیفیات کے ابلاغ کے علاوہ آیاتِ مسلسل میں دل گدازی (Pathos) پیدا کرنے کی بھی پوری پوری

صلاحیت ہے۔

یاد کی راہ گزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں بہتیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو

باقی صفحہ ۴۴ پر

سحر انصاری

فیض ایک نثر نگار

شاعری کی طرح فیض کی نثر بھی کیفیت میں زیادہ نہیں ہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "میزان" کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے علاوہ شعری مجموعوں کے دیباچے اور چند اور مضامین ہیں۔ جو فیض نے اپنے حالیہ دورہ انگلستان و یورپ کے دوران پاکستان کے بعض روزناموں اور مہفت روزوں کیلئے سیر قلم کئے تھے۔ یہ مضامین مختصر ہیں۔ لیکن تنوع کے اعتبار سے تقریباً تمام اہم موضوعات پر محیط ہیں۔ ان مضامین میں فکر اور اسلوب کے وہ تمام اتر آچے جو ان کے شخصیت اور مسائل کی جانب ان کی توجہ کے براہ راست زادے نظر آتے ہیں فیض نے "میزان" کے دیباچے میں چند سطریں لکھ کر ان مضامین کی نوعیت واضح کر دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان میں ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث نہیں ہے اور اس میں سخن علمائے نہیں بلکہ عام پڑھنے لکھنے والوں سے ہے۔ جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فیض کے ان مضامین میں رسمی اور روایتی تنقید کا انداز نہیں ملتا اس حقیقت کے باوجود کہ ان میں سے بیشتر مضامین اب سے ہیں پچاس برس پہلے جوانی کے دنوں میں لکھے گئے تھے یہ ان لئے وسیع ہو چکا ہے کہ بنیادی طور پر فیض کو "ان تنقیدی سائنسے" اب بھی اتفاق ہے "اور اسل یہ مضامین ایک ذمے دار اور سنجیدہ شاعر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جس میں ادب، معاشرے اور زندگی کے بہت سارے مسائل ابھرتے ہیں۔ جس کا منصب شعر گوئی اور شعری فیض کے علاوہ زندگی کے بعض اہم سماجی اور فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کرنا بھی ہے۔ ہر شاعر کے قلم سے نثر غالباً اسی صورت میں صفحہ قرطاس پر جلوہ زار ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے بعض خیالات کو نظم میں من و عن پیش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ فنی اور عقل سے وابستہ اور ایجاز و اختصار کے سلیقہ میں ہلکے فنی نظریات لے اشعار جب فکر و عمل اور مسائل کے مجہوم کو دیکھ کر اظہار کے لئے وسعت میں اس کے طالب ہوتے ہیں تو تحریر کی وہ صفت معرّی وجود میں آتی ہے جیسے یونان میں "حرف برہنہ" کہا جاتا تھا وہ ساری قطعیت اور معروضیت اس حرف برہنہ میں سمٹ آتی ہے جسے شاعر کی حجاب اندر حجاب ہنسی سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

فیض کے نثری مضامین کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک کامیاب نثر نگار کی طرح کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کیا ہے اپنے ذہن میں جزئیات اور تمام باریک سے باریک

قصیدات کو مرتب کیا ہے۔ اور اس کے بعد خیال کو تحریر، میکانیکی عمل سے گذار رہے۔ انفرادی زادوں کو اجازت کرنے کے لئے فیض کو اپنے ذہن کے عکس جین کے سیکڑوں زاویے بدلنے پڑے ہونے لگا۔ ان کے خیالات کے رنگ بڑے شیشے کے ٹکڑوں کی ایک ایسی انجمی، فطری اور بیساختہ ترتیب عمل میں آئی کہ اس پر نگاہ ڈالنے ہوئے آپ سرسری نہیں گزر سکتے۔ اس عمل کے بعد مضمون تحریر میں آنے والی نثر میں صنف کے خیال کی روانہ الفاظ اور آپ کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ خود کو خیال کے تمام نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ تحریر یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ کے یکائے خیال کی اہمیت کو محسوس کر کے موضوع کی اچھی طرح تطبیق کر لیں۔ جو فیض ان عمل کی اہمیت سے غفلت واقف ہیں اور انہوں نے خیال کے نسلے پر برہنہ ہوتے ہوئے کیلے اور اس کو وہ تحریر کی اثر آفرینی اور بے ساختگی کا بنیادی عنصر سمجھتے ہیں۔ خیال اور تشبیہ و استعارے کی وضاحت انہوں نے یوں کی ہے کہ "شاعر یا نکلنے والے کی منزل تو اس کا معنون یا خیال ہے۔ اور اگر یہ منزل بالکل صحیح ہے تو اسے کی رنگینی انات و صغریہ شیبہ بنا سکتی، پس تشبیہ استعارہ شعری ادبی تحریر میں کوئی مقصود نہیں"۔

تحریر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آسان الفاظ استعمال کرنے سے تحریر قابل فہم اور سلیس ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ دراصل حقیقت سے بہت دور ہے۔ آسان فکر یہ زبان عام ہے کہ بیشتر فارسی یا عربی کے الفاظ پر شعلی عبارت کو مشکل اور گنجلک سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ خود فیض کے الفاظ میں یہ ضرور ہے کہ "بہار کوئی فارسی ترکیب آئی تحریر میں پیچیدہ گی پیدا ہو گئی اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ہندی بھاشا میں آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے بہت سست ہے اور فارسی میں تو کچھ خاکاکی اور سبیل کے سوا کوئی چیز نہیں ہوا"۔ فیض اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ بنیادی چیز خیال کی صفائی ہے۔ عبارت نعلق اور پیچیدہ ہے لفظ اور سبیل اسی صورت میں ہوتی ہے جب نکلنے والے کے ذہن میں خیال اچھا ہوا اور تحریر کی روانگی کے بارے میں فیض کا یہ مینا بالکل درست ہے کہ روانی "نمال کی موزوں نشست کا مدد ہے الفاظ کے خارجی تسلسل کی پیداوار نہیں، ان کی داغ بیل آہستہ آہستہ ہے"۔ اب اس پورے موقف کی تفصیل جاننے کے لئے یہ عبارت پیش نظر رکھتے ہیں اس میں آپ کو ایک ایسے نثر نگار کا سوجھا ہوا ذہن ملے گا۔ جسے اپنے قاری تک واقعی کچھ پہنچانا ہے اور جس نے ان خیالات کے تشبیہ و فراز کا فائدہ اٹھتے ہوئے ایک قدردانی جتنے کی طرح سطح رنگ کو توڑ کر باہر نکلنے کے لئے دیتا ہوا ہے۔

"اگر خیال نکلنے والے کے ذہن میں صاف ہے اور اس نے اسے سہولت سے آپ تک پہنچا دیا

ہے تو اس کی تحریر میں فارسی کی وہ سبائے لاطینی تراکیب ہوں تو بھی ہم اسے سلیس قرار دیتے، البتہ امکان یہ ہے کہ اگر الفاظ زیادہ مانوس ہوں تو معنوں زیادہ آسانی سے ہم تک پہنچ سکا۔۔۔۔۔ لیکن یہ امکان ہے، بشرط انہیں ہے، سلامت اور روانی کے متعلق ہمارے تنقیدی خیال میں ناقص یہ ہے کہ ہم نے مقدم کو موضوع کو مقدم کر دیا ہے"۔

فیض مقدم کو مقدم اور موضوع کو مرکزی حیثیت سے پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اس لئے ایک اچھے نثر نگار کی طرح ان کی تحریر میں تفصیل الفاظ، قطعیت، معروضیت اور تخلیقی تصرف بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک جگہ موضوع اور طرز ادا پر بحث کرتے ہوئے الفاظ اور ادائیگی کی نکتہ سے انہوں نے خیال اور موضوع کی اہمیت ظاہر کی ہے "اچھے ادب میں موضوع اور طرز ادا اصل میں ایک

ہی شے کے دو پہنچو ہوتے ہیں اور ان میں دونوں کا تصرف غلط ہے، انشاؤں اور ان کے معانی الگ الگ اور یکے بعد دیگرے نہیں، ایک ساتھ اور یک وقت ہم ایک پہنچتے ہیں، اگر کسی کے پاس کہنے کے لئے کوئی ہتھکنڈہ ہے تو اس کا طرز بیان کیا کرے گا۔ اور اگر اسے بیان پر قدرت نہیں تو یہیں یہ گھوج کیسے لئے گا کہ عزت کیا کہنا چاہئے؟

فیض نے اپنے معانی میں ہر جگہ یہی کوشش کی ہے کہ موضوع کو اپنے منفرد اسلوب کے ذریعہ ان حضرات تک پہنچا دیں جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس کوشش میں ان کا انداز بندھے لئے اسلوب کا پابند نہیں ہے۔

نیشن نے نثر میں اپنی تخلیقی ذہانت سے پورا پورا کام لیا ہے۔ لیکن "نثر" شعری نثر ہونے کے بجائے سرمدنی اور تخلیقی نثر ہے۔ اصولاً اور سکل کی بحثوں میں بھی انھوں نے اپنا جاسیاتی شعور برقرار رکھا ہے۔ ویسے بھی عام طور پر ہم "اہم" اقدار اور نثر نگاروں کی رائے کے ایک اچھا شاعر ہی اچھی نثر اور اچھی تنقید لکھ سکتے ہیں۔ نقدیاب اور جانبداری کو بالائے طاقت رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بات غلطی واضح ہے، اصل وجدان اور منطق، خیال اور عقل، جذبہ اور تجربہ، مشاہدہ اور محاکات کے تمام نغیب و خزانہ کا ایک تخلیقی ذہن کو غیر تخلیقی ذہن کے مقابلے میں زیادہ تجربہ ہوتا ہے۔

کوہ ریح، مستور نالٹا، اولٹی، اسین، ابلٹیٹ وغیرہ سے قطع نظر خود اردو میں غائب، حالی، مشتعل اور اتہال سے کرختیہ اسلام، آل احمد سرور، امیراجی، عزیز حارندنی، آجہم، غنیمی اور جون المیائے نثر سے جاسیاتی اور تخلیقی ادب کو اپنے اپنے انداز میں جھکا خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

(اردو میں "نثر" صورت نثر کی ایک اور مثال محمد حسین آزاد، مہدی الافادی، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد اور میر نامرملی دہلوی وغیرہ کی تحریریں ہیں، لیکن ان حضرات نے نوک پیک سے دستا انشا پر بازی اور زبان کے ظاہری رنگ روپ پر اس قدر توجہ دی ہے کہ معروفیت اور قطعیت منقود ہو کر رہ گئی۔ اس اعتبار سے ان حضرات کو "رومانوی نثر نگار" کہا جاتا ہے اور مانوی نثر نگار زیادہ صحیح ہے۔ کسی کی محبت پر دلی گمانا ہونا، ممکن ہے تحریک کا کوئی خاص وصف ہو لیکن جہاں تک کامیاب نثر کا تعلق ہے اس میں جو کوفی اور گپ کا محبت ہی معلوم ہونا چاہئے)

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ فیض نے "نثر" کے وقت اپنی تخلیقی ذہانت سے پورا کام لیا ہے۔ وجدان سے خیال اور انفا لامک ایک تخلیقی ذہن کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کی تصویر فیض نے کئی خوبصورت پیش کی ہے، اور اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیقی اور غیر تخلیقی ذہن میں یکپہلو کیا کیا فرق ہے۔ اگر کسی غیر تخلیقی ذہن سے یا ایسے تخلیقی ذہن سے جس نے خود اپنی تعلیم کو کامیاب سمجھا، یہ ممکن نہ کیا ہو، یا وقت کیا جائے کہ خیال اور جذبہ اپنی تجویذی نوعیت سے گزر کر مخصوص انفاط کے قاب میں منتقل ہو کر دوبارہ اثر انگیزی کی منزل تک پہنچنے میں کن کن مراحل سے گزر رہے تو شاید وہ اس کا یہ جواب دے کہ تخلیقی عمل کا تجربہ انھیں ہے۔ وجدانی طریق کار کے بارے میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر خیال اپنی ایک تصویر رکھتا ہے جو غلط، دھمک یا خطوط کی صورت میں کاغذ مینوس یا قلم پر منتقل ہو جاتا ہے۔

بعض سنجیدہ نثر نگاروں نے خیال اور جذبہ بلکہ خود تخلیقی عمل کی بہت موثر انداز میں تصویر کشی کی ہے اور تجربہ نگاروں کی دلی پر لائے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایک ایسی ہی کامیاب کوشش فیض کی ہے۔ ایسی تحریریں ملتی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے انھوں نے تمہیل کے

----- "ان تنقیدی عقائد سے مجھے اب بھی اتفاق ہے۔"

فیض نے "ہماری تنقیدی اصطلاحات کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جسے آفرادہ نقادوں سے ہوتا ہے۔

ایک تنقید نگار کو جہاں ہماری زبان سے اور بہت
کے شکایات ہیں وہاں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اسے حسب ضرورت تنقیدی اصطلاحات
نہیں ملتی۔ یہ زبان کے عجز پر ضامن نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری زبان میں تنقیدی
لغت موجود ہی نہیں۔ یا اس میں ایسے انصاف کی کمی ہے جو مختلف تنقیدی تصورات کو را
کر سکیں، اس شکایت کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ہمارے ہاں تنقیدی الفاظ و ترکیب کے
استعمال میں اختلافات اور ابہام موجود ہے۔ ان کی اصطلاحی اہمیت زائل ہو گئی ہے۔۔۔ دوسری
بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات کی نئی یا قدیم اہمیت بہت واضح نہیں۔ ہم نے ابھی تک یہ پرکھنے کی کوشش
نہیں کی کہ ہمارے مجوزہ محاسن و مساوی محاسن و مساوی بھی یا نہیں اگر ہیں تو کیوں ہیں۔ مثلاً
جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے کلام میں سلاست ہے، روانی ہے، خلوص ہے، جذبہ ہے وغیرہ
وغیرہ تو نہ ہی اس شاعر کے کلام کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں اور نہ اس کے کلام کے حسن و قبح
کا پتہ ملتا ہے۔"

یہ بات ہماری زبان کے مشترکہ تنقیدی مضامین پر ملحوظ آگاہ ہے۔ کسی ایک مضمون یا اصطلاح کا مفہوم ہماری تنقیدی مشین نہیں
ہے۔ چند ایک جہت طراز انصاف دو چار اصطلاحیں سب سے ہٹا کر لے لیا کرتے ہیں تو بقیہ حضرات اپنے بے شمار مضامین میں جاوے جا طور
پر انہیں استعمال کر کے ان کی اہمیت اتنا آفری کی قوت کو کم کر دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فیض نے تنقیدی مضامین میں مروجہ تنقیدی
اصطلاحوں سے اور مسائل پر قلم اٹھاتے ہوئے سیاسی اور سماجی اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ یہی خوبی فیض کی محفلگو میں بھی پائی
جاتی ہے۔ وہ اپنے موقع کی وضاحت کے لئے سراپہ داری نظام کو بغیر داری نظام استعمال پر دست راستی بورژوازی، آمریت، ناہیت
وغیرہ قسم کی بڑی پٹائی فرسودہ اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ علمی موعظت کے بے درجہ اظہار کے بجائے روزمرہ زندگی سے
انصاف اور اصطلاحیں اخذ کر کے اپنی بات کو زیادہ موثر بنانے کے نمن سے فیض بخوبی واقف ہیں، اسی لئے ان کی تحریر موثر اور شارح
غلام سے بڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مخفی انداز محفلگو کے بجائے ان کی تحریر اور تقریر میں سیدھے سادے اور براہ راست
انصاف ہوتے ہیں جن میں زندگی، حرارت اور توانائی اور روزمرہ تجربات اور مشاہدات کا کرب ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ
احساس بھی ہوتا جاتا ہے کہ ایک نظریہ اور ایک مخصوص نمونہ کو انہوں نے اپنی ذات میں تحلیل کر لیا ہے۔ مسئلے کے بارے میں ان
کا جزیہ اتنا ممکن ہے کہ وہ اصطلاحوں سے مرعوب کرنے یا "کتابی علم کے بل بوتے پر تقریر کرنے کے بجائے افہام و تفہیم
کی بنیاد پر سمجھنے اور بات چیت کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی نثر *ABOL READING* پراورد نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ جہاں کہیں وہ مجلسی
آداب کے ضرورت سے زیادہ پابند ہو کر سوچتے یا سمجھتے ہیں وہاں ان کی تحریر میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں الفاظ بھی
زیادہ تر وہ نہیں ہوتے جو وہ بے تکلفانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی تحریر میں وہ روانی اور قطعیت ہوتی ہے جو نظری مسائل
پر سمجھنے وقت نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع ان کے ہاں بہت کم آتے ہیں لیکن جب بھی ایسا موقع آتا ہے تو ان کا کلام کچھ ایسا ہو جاتا ہے۔

اور ٹیل کا بچے کے ساتھ اور طلبائے قدیم کی جماعت میں اصحابِ علم و دانش کے بہت سے نام مرقوم ہیں۔ اس جماعت کی کئی تقریبیں شریعت کی اعزاز سے کم نہیں۔ صدارت کا مقصد تو روزِ ستارے کا بیدار ہونا اور بھی بہت سے کمالات چاہتا ہے۔ اربابِ انجمن کی اس محنت اور جنابِ صدرناستبالیہ کے کرم و سخاوت کے بغیر ان کے میں انتہائی احسان مند ہوں۔ تاہم اس مشفقہ و غلط بخشی کا قصیدہ مجھ پر نہیں کھل سکا، مجھے اپنے کرم فراوان سے زہارِ کفران نہیں کہہ سکتا صدارت کے لئے ان کے انتخاب میں طنزِ تلخ کا کوئی پہلو نمایاں ہے۔“

معلوم خدا کسی موضوع پر ہر فیض اس کو آغا کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ایسا جیلے سے کرتے ہیں جس کے بعد نفسِ مرموزہ شرمناک آپ کے خیال کا اعلان تمام لیت ہے۔ اور آپ بہترین توجہ جو اس بحث میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اکثر مضامین میں ان کا طرزِ اظہار مضطرب ہے۔ وہ چند اصول مرتب کر کے گفتگو شروع کر دیتے ہیں، دلیلوں اور سوالوں سے اپنی جی قائم کردہ دلیلوں اور سوالوں کا جواب دیتے اور موضوع کے بہت کھوٹے ہوتے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ ایک بحث پر وہ کشائی کے قائل نہیں ہیں بلکہ جو مدعی سے بہت آہستہ نقاب اٹھاتا نہیں زیادہ پسند ہے۔ وہ بے لوث اور پاکیزہ ہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے بجائے ستاب کی ٹہلی ہلکی بھار کے زیادہ دارا ہیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے وہ عام زندگی میں بہت کم سن، شرمیلے اور دھیسے ہیں جسے بظاہر غور و فکر کرنے کے عادی ہیں شاعری کی طرح ان کی نثر بھی ایک طرح کا پاپ یا بے باک ہے۔ لیکن اس دھیسے پر سن استدلال کی کفر وری یا بیان کی نقاب کشائی کے بجائے شریعت اور مذکرانہ انحرافِ مریض شمع ہوتا ہے۔

فیض کے ادبی فیصلوں سے، اصولوں کی بنیاد پر تو نہیں البتہ ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن فیض کی ذاتی رائے یہ ہو۔ ”حسرتِ مدعیان کے بعد بہت کم شعرا ایسے ہونے لگے جنہیں غزل کے مزاج سے ایسی صحیح مناسبت نصیب ہو جیسی خمِ کامل (سینک کا مجموعہ کلام) میں ملتی ہے۔ لیکن جہاں تک شعر کے مزاج اور شاعری کی ترقی تیسرے کو سمجھنے کا تعلق ہے۔ اس منزل میں فیض نے خاصا زہم دار وہ اختیار کیا ہے اور ایسے موقعوں پر ان کی آرا بہت عجیبی اور محتاط ہوتی ہیں۔ اور اس منزل پر پہنچ کر ان سے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ مثلاً سبیت کی بارے میں سمجھتے ہوئے آگے چل کر اپنے موقع کی یوں وضاحت کر دی ہے۔ ”اس سے میرا مراد یہ نہیں ہے کہ حسرت کے بعد سبیت ہمارا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے یا سبیت سے بہتر غزل گو نہیں ملے گی۔ لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ آج کل کے دور میں غزلیات کا ایسا مجموعہ شکل ہی سے پاٹ آئے گا جس میں غزل کے مخصوص محاسن کا ایسا مسلسل اور سہوار اظہار ہو جیسا کہ سبیت کے کلام میں ہے۔ یا اس کا طرح جو شیعہ آبادی کو انقلابی شاعر کی حیثیت سے پرکھتے ہوئے پہلے انھوں نے انقلابی شاعر کا مفہوم متعین کیا ہے اور اسی مفہوم کی روشنی میں جو ش کی انقلابی شاعری کا پتہ لپکھ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ جو ش کی عظمت اور اہمیت کے متعلق نہیں ہیں بلکہ انقلابی ادب اور ترقی پسند ادب کو وہ نمایاں فرق کا حامل سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ صحیح انقلابی شاعری وہ ہے جو اشتراکی عقائد کے مطابق ہے۔ کیونکہ آج کل عام طور سے ”اصلاحی معنوں میں انقلابی نظریے سے اشتراکی نظریہ مراد دیا جاتا ہے۔“ فیض کے خیال میں جو ش نے کامیاب ترقی پسند نقیص لکھی ہیں لیکن بہتر ترقی پسند شاعر کا انقلابی ہونا لازمی نہیں ہے۔ اسی فیض نے جو ش کے کلام کے نظریاتی پہلو پر غور کرتے ہوئے ان سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے جو ش کے کلام کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا ہے وہ اس کے افادی اثرات کے قائل ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو ش نے مروجہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور کسی نظام کے خلاف آواز اٹھانا ہمیشہ جرات اور دیر کی چاہتا ہے۔ اس

یہ شکر نہیں کہ جوش کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا اور انہیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اسی طرح مترژ اردو ناول پریم چند، نظیر، اور جلی اور رتن نامہ سرشار پر ان کے معانی پڑھ کر فیض کے استدلال اور موقف سے اختلاف کے باوجود، جو بہر حال ذاتی ہے، ان کے تجزیاتی اسلوب کی داد دینے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

فیض کی نثر اکثر "بیشتر شاداب، شگفتہ اور واضح اور بر محل ظرافت سے معمور ہوتی ہے۔ تحریر میں طنز و طراوت کی یہ آمیزش نئی ہے اور باوقار رہتی ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی کیرا بھرتی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"اگر آپ اپنی شکایتیں پڑھتے گئے پاس لے جا کر جائیں تو کیا اس جواب سے آپ مطمئن ہو جائیں گے۔

صحابہ آپ کے سب اعتراضات "غیر کرسیا نہ ہیں،"

"موجودہ اردو شاعری کی ایک علامت تو یہ رہا ہے کہ لفظ ہی سے ذرا غور کیجئے اگر آپ آج سے پہلے کسی سے یہ پوچھتے کہ کیوں آپ کی شاعری کی علامات کیا ہیں تو آپ کو جواب سداً "شاعری کی علامات مجھ لاجل و ما قوفہ" شاعری، مہجوری طاعن ہوا۔"

"جہانیاں کے شیراز میں یہ اعتراض کریں گے کہ سبھی مفاد دار، مادی، ہمیت، ایک شاعر کے لئے محل اور یکار باتیں ہیں۔ کسی نقاد کو یہ بتا نہیں پہنچتا کہ وہ طبعاً حسن کو اپنی میراث عزت و زینہ زریں سے مٹ کر اس میں الجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"اس نظر کو یہ نہیں اس لئے درست ہے کہ ان کا کاروبار اس سے سے بندھتا ہے جسے اب سے پہلے کلچر یا تہذیب اور آج کل "ثقافت" کہتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ اسی بات پر غور فرمائیے کہ ہم نے اسی طبعیت کے لئے ایسا "تثقیف" لفظ کیوں چنا ہے جس سے کہ یہ لفظ کو تو وہ بندہ دیکھتا ہے اور اس سے "عجب ہے"

"جہاں سے فنی اور تہذیبی دربار کی کیفیت کچھ ایسی ہے جیسے بڑوں کی آنکھ پر کڑی عینٹ لپی جاتی ہے۔"

مستان و خنجر، شمشیر و سناں تیار اور کند و غیرہ وغیرہ زیادہ دیکھتے ہیں نہیں آتے یا شقی کی دنیا میں DISARMAMENT (تخفیف اسلحہ) ہو چکی ہے۔

ادبی تنقید کے مضمون میں فیض نے قدما اور معاصرین میں سے بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے

ہوتے نہ صرف ادب کی تنقید کے لئے ایک الگ اسلوب ایجاد کیا ہے بلکہ معنیت اور تصنیف دونوں کا جائزہ لیتے وقت اس کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اس صورت میں ادیب یا شاعر معاشرے یا زندگی سے کوئی چیز معلوم ہونے کے بجائے زندگی کے سارے حوالے سے متاثر ہونا اور ایک حساس اور ذمہ دار معاشرتی اکائی کی حیثیت سے مجدد حیات کی حیثیت اختیار کرنا بھی ملے۔ مصنف کی تحریر میں محض روت و عطر کا لفظ استعمال کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ بردار ہونے کے بجائے انھوں نے خود رون و عطر کو پیش کر دیا ہے کہ آپ اس کو کدھت سے غور کر اس سماجی اکائی کے ذہن تک پہنچیں جس نے کچھ عرصے میں کیا اور اس جس کو آپ کچھ مینا نے کی کوشش کی ہے۔ جو باقی نظری مسائل کے ضمن میں تخلیق اور تنقید سے متعلق انھوں نے سوچا ہے، ان کی فرید و مناسبات ان کے ادبی مضامین میں ملتی ہے۔

نثر نگار کی حیثیت سے فیض نے اعلیٰ کی ترتیب اور انتہائی زیادہ اوقات ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ اور خیال کو صحیح الفاظ میں پیش کرنے کے لئے کھربا لیا، ابھرتا اور نا اہمیت، تجزیات کا تجربہ۔ جذبات و فاداری اور اس قسم کی بہت سی تراکیب و فن کی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں نظم کی طرح نثر میں بھی دو بعض ایسی نفسیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو فیض کی کسی بھی قابل تقلید انصاری ادیب کے لئے مناسب نہیں۔

آخر میں یہ بہت اہم مسئلہ باقی رہتا ہے۔ وہ ہے کچھ پرانہ مذہب کا مسئلہ فیض انسانی تاریخ کے مادی اور جذباتی عمل سے باخبر ہیں۔ ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود نے برصغیر کے مخصوص حالات کے ساتھ بین الاقوامی اور عالمی مسائل کا جائزہ لیا ہے اس میں انھوں نے صرف بعض بنیادی حالات کے جواب دہ نہیں بنے خود بہت سے سوال اٹھائے، تاریخی اہل علم کو سوچنے کی طرف مائل کیا ہے۔ ہر شاعر ادیب تخلیق، تخیل، جذبہ، فکر، ذریعہ اظہار، افکار، وجدان، تجربہ، مشاہدہ زمان و مکان عدم وجود جیسے نفسیاتی اور وجدانی و مابعد طبیعی موضوعات کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن اقتصادی قوتوں کو اہمیت دینے اور مذہب کے تصور سے الگ ایک قوی تہذیب کے امکانات پر غور و خوض کرنے والے ادیب کے لئے سب سے اہم مسائل علاقے کی تہذیب کا ہے جس کے اجتماعی شعور کو وہ ایک مندر ہے اور جہاں ماضی کے رشتوں میں وہ حال کے بے تکلف بنے ملتی کر سکتا ہے۔ غریب میں تو فریاد کچھ پرانہ مذہب کو تمام جتنی کسی کی عمر ان جاری رہتی ہیں اور ان دنوں وہاں سائنسی کچھ اور ادبی کچھ جیسا کہ انھیں پرکھت کی جاتا ہے۔ لیکن مندر کا مسئلہ ذرا مختلف ہے، تقسیم پاک۔ سب سے قبل ہندو مت پر ہندو کچھ اور مسلم مت پر کچھ کا مفہوم زمین کرنے کی نوعیت میں ہندو مت کے دو قومی نظریات کا جواز پیدا ہو سکے، ان تحریروں کا خاص اثر ہوا کہ مسلم کچھ ان انڈیا اور ہندو کچھ ان انڈیا جیسے عزائم کے تحت منظر عام پر آئی تھیں۔ لیکن اس میں غور و خوض کی ٹھوس بنیاد اور سائنسی انداز نظر مفقود تھا۔

قیام پاکستان کے بعد کچھ کے مسئلے پر زیادہ توجہ کی گئی ہے اور غور و خوض کیا گیا ہے کچھ ابھی تک اس مسئلے میں کوئی بات واضح نہیں ہوئی ہے۔ اور چند سوالات اب تک تشکیک سے حل نہیں ہوئے ہیں ان کی وضاحت یہ ہے کہ کیا ان کی ایک ہی تہذیبی ملک ہے جس کا مذہب ہندو مت ہے جس کا مذہب ہندو مت ہے جس کا مذہب ہندو مت ہے۔ اس ملک میں مختلف علاقائی کچھ اور ان کے ہندو دھرم کے علاقائی رنگ موجود ہیں۔ یہ سب علاقائی قومیتیں اسلام کے نام پر متحد ہونے کی دعوت دے رہی ہیں۔ لیکن کچھ کہ مسئلہ ذرا مختلف چیز ہے اور اس پر ذرا مختلف نوعیت سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف علاقائی زبانوں یا سبوں اور علاقائی تہذیبوں کے درمیان نظر ہرے باجی ارتباط و اختلاف سے ایک نیا کچھ پیدا ہو رہا ہے۔ جس کا نام پاکستانی کچھ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کچھ صرف حل یا مستقبل

کا نام نہیں ہے۔ اس کا معنی ہے بہت گہرا رشتہ جو تلمبے کچر کا حال درخت کا تنا اور مستقبل اس کے پتے اور ٹہنیاں ہوتی ہیں لیکن ماضی درخت کی وہ جڑیں جن جو کھسکیں دور تک پھیلے ہوئی ہوں۔ ان جڑوں سے درخت کو انکھ کے درخت کا وجود قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس طرح کسی کھیا دی یا طبی علم کے ذریعہ درخت کو نئی جڑوں کی مدد سے باجڑوں کے بغیر زندہ رکھنا ممکن نہیں اسی طرح کچر کے ماضی کو پانے کے لئے کسی شعری خوشی سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ یہ ایک سحر حقیقت ہے کچر کو عقلی بنیاد پر منتخب نہیں کیا جاسکتا۔ صدیوں پرانی روایات سے قوموں کا کچر تاریخی اور جذباتی رشتہ ہو تلمبے اور یہ سارے رشتے ایک نامیائی تسلسل میں آجے بڑھے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک درخت میں کسی دوسرے درخت کی جڑیں نہ کار کی ہے نہ نہ کی ہے۔ اور پروردی پھل پیلے کے جاسکتے ہیں جو شکل و صورت، ذائقے اور درجہ خصوصیات میں بہت اٹکھے اور منفرد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اصل درخت کی جڑیں یعنی پھلجی کا ماضی معنوی نہ ہو۔ ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ سیاسی اعتبار سے ستر سال پرانی اس مملکت کی پانچ ہزار سالہ تہذیب میں مریخ، اور اٹھارہ، اور ٹیکس کے بعد سندھ میں گھوٹن قائم کی آمد اور مل تہذیب میں سطح ایک ربط، تسلسل اور توازن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ماضی کے ان مختلف انوع حقائق کو ایک نوع کی حقیقت کا مظہر کس طرح کہا جاسکتا ہے ؟

انہیں سے پیشہ سوال خود فیض کے ذہن میں ہی فطری طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ فیض نے تہذیب کے مباحث کو ان معانی میں پیش کیا ہے جو تہذیب یا پاکستانی تہذیب پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کے دیگر معانی میں بھی جواد اب اور نظریے سے تعلق رکھتے ہیں تہذیب یا کچر کے موضوع سے متعلق سوالات ابھرتے ہیں۔ نظر تہذیب میں اس سے یہ بھی ظاہر ہو تلمبے کے کچر کے موضوع سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے اور وہ کسی نسبی عنوان اس پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ تہذیب یا کچر ان کے نزدیک "انداز" (value) کا وہ نظام ہے جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتی ہے۔ تہذیب کے مسئلے کو فیض ایک سہ الباعادی استعارے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، انھوں نے سب سے پہلے تہذیب کے طول و عرض اور گہرائی سے بحث کی ہے یعنی تہذیب کی تاریخی عکاسی علاقائی یا جغرافیائی محدود اور مختلف قومی طبقوں اور عوام میں اس تہذیب کا نفوذ اور رسائی۔ پاکستان کی قومی تہذیب کے موضوع پر کچھ وقت وہ سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستانی قوم کیا چیز ہے۔ اور اس کا جواب فیض کے پاس یہ ہے کہ "یہ سوال تہذیب نہیں سیاسی ہے" اس کے بعد تجربے کی پہلی منزل یعنی ہماری تہذیب کے نقطہ آغاز کے سوال کا فیض نے اس انداز سے جائزہ دیا ہے :

پاکستان کی سیاسی تاریخ ابھی ہم انڈے کے مراحل میں ہے۔ لیکن اس خطے کے تہذیبی آثار کی عمر پانچ ہزار سال سے اوپر ہے چنانچہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی قومی اور تہذیبی تاریخ کو سیکھنا صرف دو طریقے سے شروع کریں اگر یہ صورت نہیں قبول ہے تو ہمیں وہ تہذیبی ورثہ یعنی اپنا باپا بزرگ وہ پہلی ادوار میں دیکھ کر، برہنہ ہونا پڑے گا اور ہمہ مشاشر نے پیدا کیا اس میں انھیں یہ ہے کہ ہم اپنے تاریخی، برصغیر ہند میں مسلمانوں کے دور سے شروع کریں۔ اس میں یہ انھیں ہے کہ ہمارے اجداد کسی واحد قوم وطن یا تہذیب کے نمائندہ نہ تھے۔ ان میں عرب بھی تھے، ایرانی بھی تو رانی بھی، افغان بھی۔ ہر ایک کی تہذیب الگ اور مزایا جملہ مذہبی اور اخلاقی قدروں کے اختر اک اور دلیل تاریخی اعتقاد کے باعث ان تہذیبوں میں بہت سی باتیں مشابہ ضرور ہیں۔ لیکن کوئی ترک عرب، تہذیب یا قومیت کو اپنانے پر تیار نہیں، نہ کوئی عرب، ایرانی

تہذیب و تراث کی وراثت قبول کرتا ہے پھر ان تہذیبوں کی ابتداء سے قبل اسلام میں ہوئی ہے اور اسے موجودہ نام لیا اس قدیم وراثت سے نہ منکر ہیں نہ مشرک !

اس تجربے میں ہم کے ساتھ ساتھ فیض کا وہ مخصوص اسلوب نثر نگار کا بھی انتہائی نکھر ہوئی صورت میں نمایاں ہے جس کے سلی ایذا کی تعمیر شعور اور احساس کے باہمی امتزاج اور متوازن ہم آہنگی سے ہوتی ہے اس بحث میں تہذیب کے ذہنی حیوانی حدود کے مسئلے پر اس انداز سے غور و غوص کرنے کے بعد وہ جغرافیائی حدود کو بھی تہذیب کی بحث میں ایک مزاحم عنصر سمجھتے ہیں۔ البتہ اس بحث کی تیسری اور آخری شقی یعنی تہذیب کی پچھڑی گرائی کے سوال میں انہیں اس مسئلے کو حل ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ "اس کا انحصار بیشتر سماجی یا معاشرتی نظام پر ہوتا ہے۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی معاشرے میں علم و فن، تہذیب و دانش کی زندگی کی دو سرخی نعمتوں کی طرح ایک بہت ہی محدود طبقے سے مخصوص ہوں اور یوں بھی ممکن ہے کہ قومی معاشرہ بہت غریب و نادار اسے مختلف طریقوں میں بہت دور رکھ دے۔"

فیض نے اس مسئلے کو بھی اصطلاحی زبان کا شکار ہونے سے بچ کر لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی تہذیب کا مسئلہ صرف اس کے عنصر ثنائی پر ارتکا ز تو جس کے بعد حل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد باقی اور حال کے بہت سے رشتوں سے ہم خود کو ہمہ تن لگے ہیں اور وہ تہذیب عالم وجود میں آئے گی جس سے نہ ہم منکر ہونگے اور نہ مشرک !

تہذیب جیسے مسئلے پر سوچتے وقت ایک ایسے معائنہ اور مفکر کے جوہر سامنے آتے ہیں اور نہ ماہر شریات، ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہر لوگ اس مسئلے کو کس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور میرے سے دیکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ اس وقت ان لوگوں کے چہرے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگتے ہیں۔ جو تہذیب یا فن کا نام سنتے ہی یہ سوال کرتے ہیں کہ اس شے کے فوائد بیان کیجئے اس سے قومی خزانہ میں کتنا پیداوار ہے، زر مبادلہ میں کیا بچت ہوتی ہے، مگدم کی پیداوار میں کیا اضافہ ہوتا ہے؟

فیض نے اس سوال پر غور کر کے بعد اس کا جواب یوں دیا ہے "ان بزرگوں کی خدمت میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ قومی تہذیب کی تشکیل سے یہ سب کچھ تو شاید نہیں ہوتا لیکن اس کے بغیر ان میں سے یقیناً کچھ بھی نہیں ہوتا وہ اس لئے کہ اپنا قومی مقام پہنچانے کی اولین شرط یہی ہے !"

شالی کھجور کی کھوپڑی کے لئے فیض کے ذہن میں کچھ باتیں بہت واضح ہیں اور انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ انہیں بیان بھی کیا ہے۔ ان کے خیال میں ہمیں شالی کھجور کے قیام اور اس کی ترقی کے لئے ایک دو ہرے عمل کی ضرورت ہے یعنی (۱) کھجور کی نوعیت بدلی جائے تاکہ عوام کی زندگی کا مزہ و بھوکہ (۲) "عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اس کھجور کو قبول کر سکیں اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے (۱) سماجی اقدار کی تربیت موزوں کی جائے اور صحیح اقدار کا پرچار کیا جائے (۲) ان اقدار کو عوام کے اجتماعی طور پر سہل الحصول بنایا جائے۔"

فیض کی نثر کے مطالعے سے مجموعی تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ شعروادب کے مسائل ہوں یا تہذیب اور انسانی انکار کے مباحث۔ فیض ان موضوعات پر اس وقت قلم اٹھاتے ہیں جب ان کے ذہن میں موضوع کی نہ صرف جزئیات واضح ہو جائیں بلکہ وہ ان جزئیات کی ایسی مجموعی تصویر بھی موثر اور مکمل انفاذ سے ذریعہ آپ بیک بنی سکیں۔ اسی لئے فیض کی نثر میں ایک انفرادی اسلوب نظر آتا ہے۔ لیکن اس اسلوب کو ہم اردو کے اسامیب شریانی یا تاریخی یا تنقیدی اعتبار سے کیا درجہ دیں گے

اس کا فیصلہ فی الحال مشکل ہے اس لئے کہ سنبلی یا عالی کی طرح فیض کی نثر کا ابھی کوئی "اعتبار" قائم نہیں ہو سکا۔ تاہم یہ ہدیا جاسکتا ہے کہ فیض کی نثر ہمارے اپنے دور کی شریعت، بس میں روان یا انقلاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے بقول فیض صرف اتنا ہی کھودینا کافی نہیں کہ "تراجم ایک ہجوم ریشم رکھو اب ہے سلی" یا "انقلاب ٹنڈہ باد"۔ عہد جدید میں لکھنے والا ایسی حاسناتی کاٹی ہے جو اگر عاشق ہے تو اسے صرف "محبوب کے حسن اور اپنی بیکاری کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ عزم و دگر بگناہ کا خوف، جسم کی تشنگی، روح کی تنہائی، پندے بھارت کا احساس اور ایسی ہمت کی ایک باتیں اس کے تجربے میں شامل ہوتی ہیں۔ سچ اور انقلاب پر عزم کرتا ہے تو یہ بھی کچھ ایسی سیدھی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے اپنے طبقے کا مستقبل، مختلف سماجی قوتوں کے باہمی داؤ پیچ، بین الاقوامی مہر بازی اور کئی ایسے الجھاؤ دکھائی دیتے ہیں۔"

دودھیدے اس سسل رپ اور خدیہ کشمکش سے گزرنے اور اس سے آگاہ ہو جانے کے بعد ابھی کا جبر ہونے کے لئے منزل یا زمان سے بے نیاز ہو کر لوندہ مرجیہ کی منطق پر فلوں اور سچائی سے عن پر اہونا پڑتا ہے۔ ذات کے تمام گوشوں میں جھانکنے اور نظام زندگی کے گردان سیاروں کو دانش و فکر کی دوزخوں سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر اس سارے مشاہدے کو احساس کی وسعت میں جذب کر کے الفاظ کے محسوس پیکر تراشتے پڑتے ہیں یہ سادہ عمل نظام زندگی کو دیکھنے کا عمل ہے جس کے بارے میں خود فیض کا یہ کہنا ہے کہ۔

"نظام زندگی کسی حلقہ کو گھبراہوا، سنبست، مقید پائی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ اس طرح کرے۔ دور دراز، اوجھل دشوار گزار پہاڑیوں میں برفیں گھنٹی ہیں، چٹے ابلتے ہیں، ندی نالے پتروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہیکٹار ہستے ہیں اور پھر یہ پانی گٹنا بڑھتا، دادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں ٹھٹھاتا اور پھینکا چلا جاتا ہے۔ جس دیدہ بینے انسانی تاریخ میں "میں زندگی کے یہ نقش و مرہل نہیں دیکھے، اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔"

"شاعر کا تعزیم جتنا کسہرا اور دھماکتا ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس میں متاثر کرنے کی صلاحیت ہوگی، اور یہ صلاحیت جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یقیناً ایسے جتنا لیاقت خوب ہے، اگر جیسا لیاقت قدر بعض الفاظ کی شستگی اور بندش کی چستی پر منحصر ہو تو چرکیت کو ہمارے چوڑے کے شعرا، میں سے ہونا چاہئے تھا۔"

۔ فیض

احتر جمال

فیض کے دُؤ عشق

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر دماغ ہے اس دلی میں بجز داغِ ملامت

انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پریشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھے

اور

قفس ہے بس میں تمہارے تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم

یہ لہجہ اور یہ آواز بالکل نئی ہے! نکتِ نیا نہیں ہے۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار یہ دو موضوع شاعروں کو ہمیشہ سے محبوب
ہے ہیں۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مہنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غم پہناں سے گر ملے! (غائب)

اور

غم اگرچہ جاں گس ہے یہ کہاں کہیں کہ دل پہ

غمِ عشق گرنہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا (غائب)

فیض کا کمال ان موضوعات کو نیا آب و رنگ دینا ہے۔ فیض کی اس انفرادیت نے ان کی شاعری کو مقبولِ عام بنایا ہے۔

ہم نے جو طرزِ فنوں کی ہے قفس میں ایجاد

فیضِ گلشن میں وہی طرزِ بیاں بھڑی ہے

نفق فریادی میں غم عشق غالب ہے لیکن دست صبا تک پہنچتے پہنچتے غم روزگار غم جانوں پر پوری طرح حاوی ہے اور پھر ایک منزل ایسی آتی ہے کہ دونوں غم پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ غم جانوں روگ نہیں بلکہ علاج بن جاتا ہے۔ اور غم دوراں کا باغ جانوں کے سہارے آسان لگتا ہے! غم روزگار کی ترپانی میں جذباتیت کے بجائے عقلیت کا ردِ مابہ ہے۔ "اے دل بے تاب بھڑ"۔ "سیاسی لیڈ کے نام"۔ "صحیح آزادی"۔ "دوا و آئین"۔ "سرمقش"۔ اور "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" ان کے سیاسی شعور کی ترجمان ہیں۔

فیض کی سیاسی نظریں اہل رنگ و آہنگ کے لحاظ سے اہل زیادہ اور سیاسی کم ہیں! نعرے بازی، جوش، غصہ، لٹکا دھار، پیچ پکار کہیں مشنائی نہیں دیتی۔ ایک پرسکون سی خاموشی ہے جس میں ذہن الاؤ کی طرح سلگتا ہے اور سوچتا ہے اور پھر ایس الاؤ کی چنگاریاں احساسات اور جذبات میں اس طرح آگ سی لگا دیتی ہیں کہ سارا وجود جلیجے لگتا ہے۔ لیکن اس وقت جذبات اور احساسات کے ملاوے میں گھبرا کر ذہن خود کشی پر مائل نہیں ہوتا، بلکہ اپنے ماحول اور حالات سے بھرپور نفرت کا ایک ایسا احساس لے کر اٹھتا ہے کہ ماحول اور نظام کو یکسر بدل دینے کی آرزو جنم لیتی ہے!

ان سیاسی نظموں کا تاثر اس وجہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ ان میں تغافل نہیں بلکہ یہ غم جو جذبات ہیں اور رعایت و عدت کے کامیاب تجربے نے ان احساسات اور جذبات کو فن شعری میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ خوب صورت اور پڑاؤ بن گئے ہیں۔

موشن کہیں بہاؤ کے امکاں جوئے تو ہیں
گلشن میں چاک حیدر گریاں ہوئے تو ہیں

یوں بہاؤ ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پلچھتی ہے گذر اس بار کروں یا نہ کروں

یہ مذہبے یاد حریفانِ یادہ پسیا کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابرائے

وہ جب بھی گزرتے ہیں اس نطق و لب کی فیرگی
فضائے راوی بھی نئے نئے بکھرنے لگتے ہیں

خوب صورت تشبیہات اور استعارات، نئی ترکیب، نئی اور پھر سیاسی شعور کی کثمتی! بات بھی خوب صورت ہو، اور کہنے کا انداز بھی دل نشیں، تو وہ بات دل میں اتنی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری نے اتنی جلدی کی ایک کارِ تہ حاصل کر لیا! فیض کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا یقین سے بھرپور لہجہ ہے۔ جوش و آہ و آہنگ کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ کہیں بھی یاس و اندوہ کی پرچائیں نہیں ملتی۔ یقین، تازگی، آہنگ اور نشاطِ فیض کے ہرے کی خالی پہچان ہے۔ شبِ غم کتنی ہی تاریک بھی، طوق و سلاسل کتنی ہی گرہاں بار بھی، لیکن ان کے ہونٹوں کی دلی دلی مسکراہٹ، ان کی آنکھوں کا پُر وقار غم اور ان کے لہجے میں یقین کی جو پتلی نظر آتی ہے وہ ان کے نصب العین کو بھی خوب صورت بنا دیتی ہے۔ امید اور خوشی کی

فیض اساتذہ میں سودا سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ زنداں نامے کی ابتدا بھی سودا کے ایک شعرے کی ہے اس شعر کا نپ و لہجہ اور انداز جتنا ہے کہ فیض کی آواز سودا کے کس قدر متاثر ہے۔ سودا کے تحمل کی رنگینی اور رعنائی اور ان کی طبیعت میں خوشی اور مسرتی کا ہوا اس ہے وہ فیض کو سودا کے قریب لے آتا ہے !

کہیں کہیں فیض کے اشعار پڑھتے ہوئے مصحفی کی یاد بھی آتی ہے۔ مثلاً 'مصحفی کے مندرجہ ذیل اشعار :

چلی بھی جا جس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو دنا فدا نہ ہو بہا رہیڑے کا

لاکھ ہوا بروئے خاک رنگ شفقِ براسماں
خون کہاں کہاں گرا زخمِ دلِ فگار کا

اس گل کی بارغ میں جو مہا نے چلائی بات
چھپنے سے مسکے کہا میں نے پائی بات

مگر ہے رُخ پر ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
کچھ کوئی کچھ سے پیارے دل کے اے جانے کی طرح

زلفِ رخسار پہ کھولی تھی شامِ انہ نے
کہ سیاہی شبِ ہجران کی تھی آغاز ہوئی

یہاں فیض اور مصحفی میں جو چیزیں مشترک ہیں وہ اعتدال، مزی، صلاوت، رنگینی اور صوفی ہم آہنگی ہے ! مصحفی کے ہاں جوسیت ہے وہ بھی فیض کے ہاں زیادہ واضح اور پاکیزہ نظر آتی ہے۔
فیض کے دو لوگ بات کرنے کا طریقہ و آواز کی یاد دلاتا ہے ۔

پاؤں کھڑکے جتاتے ہیں رو منزلِ شوق
ہاتھ کھستے ہیں قلم لوح و قلم دیتے ہیں
(داغ)

داغ کی جلات، صاف گوئی، اور دو لوگ بات کرنے کا انداز فیض کا اپنا انداز ہے۔ صاف گوئی نے اُن کی مشاعری کو زیادہ خوب صورت بنا دیا ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کے پردے میں اُن کی صاف گوئی کا مٹن اور بھی دل کش معلوم ہوتا ہے۔ فیض کے ہاں صاف گوئی میں ایک قرینہ، احتیاط، اعتدال اور تہذیب ہے۔ داغ ————— کہتے ہیں ۔

جنابِ فتح ہیں آدابِ عرض کرنا ہوں
اندر میری ملات میں چھپ کر کہاں چلے استاد

فیض کہتے ہیں سہ

فیض شہر سے سے کاجوازیہ پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

یا

خیرِ بیابان دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کر دو

فیض غالب سے بھی متاثر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ غالب سے جُدا ہے۔ غالب کی شاعری میں جو تنوع ہے وہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے! اقبال اور غالب ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن غالب کے اس تنوع اور رنگارنگی کے سامنے اقبال کی شاعری بھی باوجود اپنی وسعت، عظمت اور ہمہ گیری کے کم پایہ معلوم ہوتی ہے! غالب کا اثر فیضؔ مجھے مہنی پر کم اور فکر پر زیادہ ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز غالب کا سا ہے سہ

جنا رسے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی غزل
عباسؔ کے رخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گلِ دامن و کچھ بھی

اور سہ

گر فکرِ زخم کی تو خطا کار ہیں کہ ہم
کیوں محمودِ جِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شبِ ضرور سہ کوئے یا رگندی ہے

کر رہا تھا عجب جہاں کا حساب
آئے تم یا دیے حساب آئے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کو بہ کو دلبر
ابھی پسند انہیں ناپسند کیا کرتے

گلوئے عشق کو داورس پہنچ نہ سکے
تو لوت آئے حرسے سر بلند کیا کرتے

تری نظر کا گلہ کیا جو ہے گلہ دل کو
تو ہم سے ہے کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

ان کے اس جسم کے اشعار کی مرزا غالب سب سے زیادہ داد دے سکتے تھے !

پہنچ تو بہت کہ فیض نے صنفِ غزل کا حق جیسا ادا کیا ہے ترقی پسند شعرا میں کسی اور سے ممکن نہ ہوا۔ غزل کے روضہ مقبول
کی سب سے بڑی ضمانت فیض کی غزل ہے !

فیض کی سیاسی شاعری

فیض کے ہاں براہِ راست مخاطب بہت ہی کم ملتے ہیں۔ وہ کسی سیاسی موضوع کو اپنی نظم کا عنوان نہیں بناتے۔ چند نظمیں
”ایرانی صبا کے نام“ اور ”آجوا“ ”افریقا“ وغیرہ سیاسی موضوعات پر براہِ راست کہی گئی ہیں ! فیض کی سیاسی شاعری اشاروں
اور کنایوں میں جھلک دکھاتی ہے، لیکن ان کے خوب صورت اشعار سے اور کنایے اور ان کے مضامین کو اور زیادہ واضح کر دیتے ہیں۔ جو بات
صاف صاف کہی جائے وہ ایک وقتی تاثر رکھتی ہے۔ ایک خوب صورت کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں سے آراستہ ہو کر وہ بات، ایک ایسی
خوب صورت صداقت بن جاتی ہے جو ہر دماغ کے لئے ہوتی ہے ! ایک فن کار کی یہی خوبی ! اسے کلاسیک کا درجہ دلواتی ہے !
اگر صرف سیاسی پیغام اور سیاسی پامی ترقی پسند شاہری ہوتی تو آج دنیا زحید سب سے بڑے ترقی پسند شاعر کہے جاتے،
یہ کہوں کہ ایک خاص لمحے اور وقت میں ایک بڑے ہجوم کو متاثر کرنے والی شاعری وہ ہے ان کی ہے۔ محاتی ادب ایک بڑے ہجوم کو متاثر
کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اگر وہ اس لمحے کے لئے جو جب کسی قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا ہوتا ہے ! — تب وہ ادب
قابلِ قدر ہے ! — لیکن ہر چھوٹے بڑے مولف پر محاتی شاعری کی جانے تو وہ یہ وقعت ہو جاتی ہے — مثلاً ہنس راج رتیر
کی یہ نظم ہے

تو مارتن کو

یا دبے ساتھی

ریل کا پستہ پیام کریں گے

آج آتشوں کو یاد ہے، اور اس کی ادبی اہمیت کیا ہے ؟

محاتی ادب اس خوب صورت پھول کی طرح ہے جو چند ساعتوں کے لئے خوشبو بکھیر جاتا ہے، اور یہ خوشبو ہوا کے جھونکوں میں
مل کر کھو جاتی ہے — وہ ایک چند گزاری ہے جو پل بھر کے لئے دہک کر لکھ بن جاتی ہے ! — اس کے برعکس دہلی ادب سمندر میں
چاندنی ہے جو موجوں کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ہر کنارے کو منور کر دیتی ہے۔ دہلی ادب وہ فیصل بہار ہے جو حیاتِ انسانی کے سب سے
ناؤک اور نصیف گوشوں کو رنگین بنا دیتی ہے !

فیض کا ادب لائق نہیں دوامی ہے !!!

نڈال نامے میں "روادِ نقص" کے عنوان سے سیرِ اسحاق نے ایک جگہ کہا ہے :

فیض کی شاعری میں سمن و گلہبے کی چاہت ہے
مگر سمن و گلہبے کو سینہ پر شادابے کہنے والے کا ذکر اس
طرح نہیں ملتا جب طرح اس کے کا حق ہے :

اور ۔۔

"فیض کی شاعری کو ڈراماٹک روموڈ، اسٹوڈیو

اور کانسرو سے نکلے کر سڑکوں پر بازاریت، کھیتوں اور

کارخانوں میں ابھر بیٹھا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ فیض کی شاعری کا سب سے بڑا فائدہ وہ طبقہ ہے جو قیدِ یافتہ ہے۔ ایک نئی نسل، ذہین اور ہونہار
نسل فیض کی پرستار ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نئی نسل کا محض پرہیز ہے، تو غلط کرتی ہے اور بیٹلر کی پرستار ہے۔
نہیں! یہ بات نہیں! ایک خاص طبقہ کے نوجوان افراد اور چھوڑ گئی نسل حساس اور یا شعرا افراد پر مشتمل ہے جنہیں اپنے ماحول اور
حالات کا کھرا احساس ہے!

ایک عرصے تک یہ نسل اقبال کی پرستار رہی۔ آج بھی ہے۔ مگر جب اقبال پر ایک خاص طبقہ قیدِ جانی اور
جملہ حقوق اپنے لئے محفوظ کرتے تو اس نسل کے پاس فیض ہی رہ گئے! اقبال کے چھن جانے کا غم لگ نہیں سکتا لیکن فیض کو پاکر کم ضرور
ہو گیا ہے۔ اقبال کے اشارے پر بھی سڑکوں، بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں نہ گونج سکے۔ کیوں کہ اقبال ایک فلسفی تھے، عالم تھے،
سیاست دان تھے! اور پھر شاعر تھے!!

اقبال کا مخاطب جی تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ لیکن تعلیم یافتہ طبقہ ہی وہ طبقہ ہے جو ہر طبقے کی ذہنی رہبری کا فرض انجام دیتا ہے!
اس کے رہبرین کراقبال سب کی رہبری کرتے رہے۔ اور اب فیض بھی اسی طبقہ کی رہبری کر رہے ہیں!

جوش کے ہاں یہ بات ہے کہ وہ خواص اور عوام دونوں کو سمجھانے کا فن جانتے ہیں۔ جیسے یہ بات اچھی سمجھ ہوتی ہے
کہ فیض پڑھنے کے لئے پرستاروں میں گھرے ہوئے ہیں! شاعری اخبار کا ایڈیٹوریل نہیں ہوتی اور پھر اخبار کا ایڈیٹوریل بھی کتنے لوگ
پڑھتے ہیں؟ شاعری سنسنی خیزی اور نعرہ بازی بھی نہیں ہے! شاعری تو شاعری ہے! اور اس لئے جیسے جیسے تعلیم عام ہوگی طبقہ وارانہ
سماج ختم ہوگا۔ سب کو نیکیاں سواخ حاصل ہوں گے۔ جب یہ بقول فیض چن میں آتش لگی ہے، اخبار کا موسم آگے لگایا، اس ملک
کی آبادی میں کھیتوں، کارخانوں اور بازاروں میں ہر جگہ کتاب نظر آئے گی، تو فیض کے پرستاروں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔
اور فیض عوامی شاعر کہلائیں گے!

فیض کی عشقیہ شاعری

فیض کی عشقیہ شاعری میں بھی اتنا زبانِ بیان کی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے ان کی سیاسی شاعری میں آپ ورنگ

ہے۔ عشقیہ شاعری میں زیادہ حسن اور شوق ہے۔ رنگینی، رمنائی، لطافت اور احساس کی شدت نے عشقیہ شاعری کو کبھی ایک خاص مقام دیا ہے، ہم فیض کی عشقیہ شاعری اور سیاسی شاعری کو الگ الگ درجے نہیں دے سکتے، نہ الگ الگ خانوں میں بانٹ سکتے ہیں کیونکہ ان کے فکر و شعور میں دونوں عشق اس طرح رتے بس گئے ہیں کہ انہیں الگ کرنا محال ہے!

نفس فریادی کی محبوبہ سے وہ دامن بچاتے نظر آتے ہیں، کیونکہ اس وقت ان کے شعور اور جذبات میں وہ یگانگت نہیں ہے جو شاعری کے دوسرے دور میں ملتی ہے۔ دوسرے دور میں شعور بچتے ہیں، واضح ہے، اور جذبات عشق و زندگیات پر کسی قسم کا نقصا دم محسوس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس وقت غم گماں محبوب کی اور زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ خاجب تک

جہاں میں باقی ہے دلدارِ عروس سخن

تمہارا دم ہے تو دم سازِ بے ہولے وطن

اگرچہ تنگ ہیں اوقاتِ سخت ہیں آلام

تمہاری یاد سے شیریں، سبے تلخی، ایام

یہی نہیں، بلکہ ایامِ اسیری میں محبوب کی خوشگوار یاد انہیں اُداس نہیں ہونے دیتی۔ اردو شاعروں کی وہ روایتی حریفانہ فیضی اور ہجر کے آئینہ فیض کے ہاں نہیں ملے، اُن کو اپنی محبت پر اعتماد ہے اور محبوب پر بھی!

فیض کی عشقیہ شاعری میں ایک ایسا گداز ہے جو اُن کے بیچے اور آئینہ کے ساتھ مل کر ایک لطیف مسرت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایک درد بھری سی خوشی، خاص طور پر ایامِ اسیری میں کہی ہوئی نظموں میں یہ بات زیادہ ہے! ہجر میں بھی وہ اس کی یاد سے وصال کے مڑے لیتے ہیں۔ اس کی یاد کی ٹھنڈک، اس کے پیراں کی خوشبو، اُس کی زلف کی مہک، ان سب چیزوں کا ذکر جہاں رنگینی و رمنائی اور حسن پیدا کرتا ہے وہاں ایک بے نام سی اُداسی بھی چھا جاتی ہے!

فیض کا محبوب

فیض کا محبوب بے حد حسین ہے! سب ہی محبوب حسین ہوتے ہیں۔ مگر اردو ادب کی دنیا میں چند ہی محبوب اتنے حسین ہیں کہ ان کے حن جہاں تاب پر وقت کی پرچھائیں نہ پڑ سکیں اور اس کی چمک چمکاتا آج بھی ویسی ہی ہے۔

اردو ادب کی دنیا میں سب سے زیادہ حسین محبوب تیر کا ہے۔ میر کی شاعری کی ساری محاسن، دس، موسیقی، کسک، گداز، سپردگی اور سچائی یہ سب اس کی دین ہے! اس کیفیت کی کمی سے غالب کا عشق باشعور ہوتے ہوئے بھی متاثر نہیں کرتا! او غالب کا محبوب آفت ہو یا بلا ہو ہمارے دل میں اس طرح گھر نہیں کر لیتا جس طرح تیر کا سڑملا اور بے نیاز محبوب انگلاب کی پیکھڑی میں اُس کے لب، چشمِ غزل میں اس کی آنکھوں کی وحشت، رگِ گل میں اس کی کمر، کلی کے کھنکھ میں اس کی نیم خوابی اور مدھی کہ کم۔ ایک بنِ مجسم، بے دھندلے دھندلے ہم خود بھی تیر کی طرح کھوجاتے ہیں!

میر کا دل، ان کا درد، چوٹ اور شاید میر کا سا محبوب بھی پھر اردو شعرا میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا!

اگر دو دشوار کے محبوب مقابلہ محسن میں حصہ میں تو میر کا محبوب محسن کے اس تاج کا مستحق قرار دیا جائے گا جو صرف وحش اور سانپ کا حق ہے !

دوسرے بنبر پر غالب کا محبوب ہے۔ اس کا چہرہ فروغ سے سے گلستاں ہے۔ سرمے رشتہ ترگاں تیز اور سیاہ زلف رخ پر پریشاں ہے۔ جب وہ سانس اُتے تو آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوئلہ جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں ان کے محبوب کی ہر ہر اداس بناوٹ اور لگاؤ کے انداز اس طرح نمایاں ہیں کہ اس کی شخصیت کا ایک اکٹلا اثر محسوس ہوتا ہے ! لیکن غالب کے محبوب کے سن سے زیادہ اس کی ذہانت متاثر کرتی ہے

میں نہ کہا کہ نرم ناز چاہئے غیر سے تہی
نہیں کے تم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس مقابلہ محسن میں تیسرے بنبر پر حسرت کا محبوب ہے۔

اس کا گلہائی پر سن جو اس کے بدن کے گھڑی بن سے اور زیادہ گلابی نظر آتا ہے۔ اس کے ماتھے پر شرم و حیا کے موتی، اس کے دانتوں میں دو پڑے۔ تپتی ہوئی زمین پر ننگے ننگے پیر ! — یہ محبوب اس محفل میں نہیں بیٹھتا جہاں ہر طرف کئی نیم سہل اور کئی نیم جاں ہوتے ہیں۔ یہ گھڑیلو محبوب اپنی خوبصورتی سے زیادہ شرم و حیا اور سادگی کی وجہ سے دل میں گھر کر لیتا ہے !

جدید ادب میں سب سے زیادہ موہنی شخصیت فیض کے محبوب کی ہے۔ دوسرے بنبر پر مجاز کا محبوب ہے، اور تیسرے بنبر پر اختر شیرانی کی سہلی۔ حالانکہ اس پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے۔ جوش اور جگر کے ہاں محن کی نہیں عشق کی حکومت ہے۔ جوش کی محبوبہ کی نکل بدلتی ہے، باوجود وہیں جنگل کی شہزادی اور جامن والی زیادہ بھاتی ہیں۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اگر تجوہ بیت ناک سے واپس نہ بھی آتی تو بھی جوش کی شاعری میں اتنی کہاں بھی اور رچھٹی نظر آتی کہ کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوتا !

جدید اردو شاعری ہر جس محسن اور نور کی پیوار پڑ رہی ہے اُسے دیکھنے کے لئے فیض کی شاعری کے ورق اُٹھائے۔ یہ

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھنٹہ کی اور ہے بہار شباب

آ کہ کچھ دل کی سن سنائیں ہم
آ محبت کے جگت گائیں ہم
یہ آواز ہمیں بہت تن گوش کر دیتی ہے اور ہماری نظریں ایک کج میں پھڑپھڑاتی ہیں جہاں
تہہ بنجوم کہیں چسانڈنی کے دامن میں
کسی کا حق بے مصروف انتظار رہی
کہیں خیال کے آبا و کردہ کلشن میں
ہے ایک گل کہ ہے تاواقت ہمارا بھی
پھر یہ احساس ہوتا ہے کہ بہار سے پہلے ہی شمع آرزو سے ہمیں بجھ گئی اور

ہو چکا ختم عہد ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی !
یہ کیفیت طبعی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک حسین موڑ پر وہ پھر نظر آتی ہے۔
وہ آنکھ جس کے بناؤ پر سن لیا اترے
زبان شکر کو تعریف کرتے مثرم کئے

اور

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لاد فروش
بہشت و کوثر و شہنشاہ و سنسبیل بدوش
حق کے اس سیل بے پناہ میں شاعر ڈوب جاتا ہے۔ لیکن وہ غلطی یہ نہیں ہے جسے سوائے عشق کے کوئی کام نہیں ہے۔ اسے
روٹی کی فکر ہوتی ہے۔ زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل اُبھالیتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی فضا بڑی ہی کثیف، بوجھل اور تاریک معلوم
ہوتی ہے۔ روٹیوں کے سانچہ کو پتہ و بازار میں جسم بچتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اس کا من کتنا ہی دل کش اور جہاں سوز ہی شاعر
کی نظر و مری سمیت بھی لوٹ ہی جاتی ہے اور پھر وہیں مرتبہ بخ ہو جاتا ہے۔
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
محب سے پہلے ہی محبت مری محبوب نہ مانگ !

حساس شاعر کو اس سے ہوتا ہے کہ

دنیا نے تیری یاد سے۔ یہ گناہ کر دیا
کچھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
اور پھر یہ غم اس کا تنہا غم نہیں ہے۔ ساری دنیا غمگین نظر آتی ہے۔
یہ دیکھ تیرا ہے نہ میسر
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری
اس غم کا کوئی علاج نہیں ہے شاید زندگی مریم کے جتنے جانا ہی ہے۔ کیوں کہ
تو گر میری نبی ہو جاوے
دنیا کے غم یو نہیں گئے

شاید غم اور زندگی لازم و ملزوم ہیں

ہم نہ رہیں۔۔۔ غم بھی نہ رہے گا

ایک ذہن اور حساس آدمی اپنی جنت تنہا نہیں بنا سکتا۔ جنت کا وجود جنت نہیں ہے جب تک کہ دوزخ موجود
ہے۔ ہندوستان کی بدقسمتی اور تیرہ بجتی کے دنوں میں شاعر کے روز و شب کیسے سنور سکے ہیں۔ سماج کے ایک ذمہ دار فرد کی

حیثیت سے سماج کے مسائل اس کے مسائل ہیں! اور عشق خود غرضی نہیں آدمیت سکھاتا ہے۔ اس ہفتی نے اسے دردمندی، عاجزی، غریبوں کی حمایت کرنا اور یاس و حرموں کے، دکھ درد کے معنی سکھائے ہیں۔ ان حالات کے نتیجے میں زندگی بھول گیا، ایک حسین خواب تھی ایک نفس کی قیام گئی۔ جس میں ہر دم درد کے پوند تک رہے ہیں! اس منزل پر شاہ جہاں دلی آ کر کی سچ دھج بھول کر زندگی کی بھول بھلیوں میں اس حزن گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس کا مرگ سو نہ میت نہ سنا نہ کوئی چاہتا ہے! یہی وطن کے گیسو سنار نامہ محبوب کے غم کا کل سلیحانے سے زیادہ ضروری مسلم ہوتا ہے۔ ایک غم سے تک وہ صرخت کر رہا ہے، رنج اٹھاتا ہے اور اذیت سہتا ہے۔ لیکن جوں جوں شعور اترنے لگتا ہے، شاعر کو ان مصائب کا مل جل جاتا ہے، پھر یاس و نوید کی تلخ بچہ کی جگہ امید اور یقین کا اٹھا لانا پڑتا ہے۔

پہلی سے فیض کی شاعری میں جو مود آتا ہے وہ بند وستان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے، جب صدیوں کے ظلم و ستم نے بدعنوانی کے ظلمی کا طوق نئے سے اُٹار کر پہلی بار آزادی کی فضا میں سانس لیا! اب تک مصائب کی ایک ہی وجہ تھی۔ بدی غلامی!۔ مگر آزادی کے بعد بھی فساد کئی، بے روزگاری، جہالت اور افلاس کی تاریکی قائم رہی۔ پھر اس جگہ فساد ہی اور نا کئی کی وجہ سمجھیں آئے گی۔ اگرچہ آزادی سے پہلے بھی فساد ہمارا سماج کی ناہمواریوں کا اور جوں کو احساس تھا، مگر اب یہ احساس زیادہ شدت سے ابھرا۔ یہ بات واضح ہوئی کہ جب تک دولت کی مساوی تقسیم نہیں ہوتی، اور طبقہ دارانہ سماج زندہ ہے، اس وقت تک آزادی کا لفظ بے معنی ہے! فیض نے بھی اپنے دور کا ہم فو اور صحافی مساوات اور اشتراک پر مبنی، ایک نئے سماج کی تعمیر و تشکیل کا خواب دیکھا!

فیض نے یہ بات بڑی خوب صورتی اور اسٹیلی سے سمجھائی، مگر ایک ایسی بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہ تھا، اُن کا جرم بن گئی۔ متاعِ لوح و قلم چین لی گئی۔ ان کے ہاتھوں میں زندگی نہیں پہنچا دی گئی۔ مگر اسیری میں آتش زیر پاہوں کے باوجود ہر جگہ زنجیر موئے آتش دیدہ نہ بنی، بلکہ انہوں نے ہر جگہ زنجیریں زبان رکھ دی!

فرض میں فیض نے چین کی محبت کے جو نکات کائے اور میں طرح اہل چین کا جی موہ لیا۔ یہ بات شاید چین میں رہ کر ممکن نہ ہوتی! بے بات کی مناسبت ایک بے گنہ کے دل میں جو آگ لگی وہی آگ وہی تیش اور حرارت اور شاعری کا سوز و رول بن گئی!۔ اب محبت صرف آرزو کی بات نہ رہی!۔ محبت زندگی کی جدوجہد میں رفیقِ کار بن گیا!۔ اُس نے نہ صرف تنہائی کی زندگی کا پوچھ اٹھایا بلکہ فیض کو فلوں اور بچھڑوں سے بالکل آنا دکر دیا!۔ آڑے وقت میں شخصیت کی پرکھ ہوتی ہے، آلام کی بھی میں اس کی شخصیت کا سونا اس طرح نکلتا بن گیا، اور فیض اسے اس طرح چاہنے لگے کہ نہ صرف فیض کے غمگین دل کو قوت اور یقین کی دولت مل گئی، بلکہ بے یقینی اور امید و بیم کے شکار تمام اہل چین اس کے حق کو سلام کرنے لگے۔

اس دور میں فیض کی عشیتہ شاعری میں سچا فلوں۔ ہڈی بات اور احساسات میں ثابت، درد کی ایک جلی جلی سی آواز۔ محبت حزن و غم کی انجنت و لغات اور رنگ و بہار کا احساس ہی نہیں بلکہ محبت، رفاقت، ہمدردی اور اس کے دیکھ بھاننے کا جذبہ مسلم ہوتی ہے!

حالی نے اردو شاعری کی دنیا میں پہلی مرتبہ عورت سے پاکیزہ مخاطب کیا تھا شعر
لے مارو بہنو بیٹو دنیا کی عزت کم سے ہے!

حزرت سنے قتل، رنگ دل، جھنجھو اور ستم گر کو شریف محبوب کے روپ میں دیکھا تھا۔ عموماً اسے آنچل کو پوچھ بپانے کی دعوت دی جاتی اور فیض کے ہاں وہ عورت خورسات دکھانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ محبوب، مہدم اور رشتہ ہے! سے

تھو کو دیکھ تو یہ چشم ہوتے
تھو کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

فیض کے ہاں تنویر، رنگارنگی، چیل چیل اور نظاروں کی فراوانی نہیں ہے! لیکن فیض کی اس یکسانیت میں ہی ان کی ذرا دیت ہے۔ ان کی آواز اسی وجہ سے غنیمت پہنچتی جاتی ہے اور ان کی شاعری میں جو یقین اور گہرائی دیکھائی ہے اس کی وجہ بھی ان کی یہی یک۔ رنگی ہے!

فیض کی شاعری ایک پرسکون اور نرم رو دریا ہے جس کے کنارے بڑے خوبصورت ہیں۔ اور جس کے پانی کی لہروں کا ترجمہ نہ ہوں وہ میں نے کبھی نہ سنا اور نہ سمجھا کی بات کر رہا ہے!

کھدورت سے ایسا سخت ہے کہ دریا میں بھڑک اڑا گیا ہے!
کاش یہ سکون کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو!!

فیض کی شاعری - چند فنی پہلو (صفحہ ۵۵ سے آگے)

مور پڑتا ہے جہاں رشتہ فراموشی کا

جس سے آگے نہ کوئی ہیں ہوں نہ کوئی تم کو

سانس تھلے میں لگا ہیں کہ نہ جانے کس دم

تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو!

ایمان مسلسل کا استعمال، مانگ بھی حسن ہے، اس لئے قاری و صنف ہے۔ لیکن جب فکر (مستحق) کے سفینہ

کے لئے ہنیت (میں میں) کی موبیں سا رنگارنگ ہو جائیں تو فکر کی رفتار میں بڑی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تکرار ہیئت کو ہم آہنگ کر کے شاعر خارجی صناعی کو بھی باطن کا جزو بنا لیتا ہے، اور ایک ایسا کل وجود میں لاتا ہے جس کے اجزاء کی تحلیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ ابلیت مسلسل یوں تو تقریباً تمام جدید شعرا نے استعمال کی ہیں، لیکن فیض کی طرح روانی اور آہنگ شاید ہی کسی کے حصے میں آیا ہو۔ انہوں نے اس ہیئت کو اردو شاعری میں ایک عین اور قابل توجہ تحریر بنا دیا ہے

اب تک فیض کے فکری سرمایہ کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ان کے فن کی طرف توجہ کم ہی دی گئی ہے۔ جو دو ایک معنایں ان کے فن کے پارہ میں لگے گئے ہیں، ان میں انہیں عود صحن کی یہ ان پر تو لایا ہے۔ فیض کے بیان میں صانع دیدار کے ہستیاں اور عود صحن کی خامیاں ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان خامیوں سے ان کے مرتبے میں کمی نہیں آتی۔ جب اہل قواعد نے مستحکم پیرامیٹر، نہ لب، دریا تھاں نہ کو نہیں بخشا تو فیض کی برائت کا امکان کیسے ہو سکتا تھا۔ اس لئے دیکھنے کی چیز ہے کہ فیض نے مگر ٹھوکر یا کھا دی تو کیا ان بھوکوں کے جود سنبھلنے کی بھی کوشش کی ہے؟ اگر انہوں نے سنبھلنے کی کوشش کی ہے اور آگے بڑھے رہے ہیں تو یقیناً انہوں نے بلند تہنگ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس منظر کے مضمون میں ان کے فن میں اس کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔ ان کے یہی واقعہ کہ ان کے پاس ایک طرف فکری سرمایہ ہے تو دوسری طرف فنی سرمایہ بھی ہے، اور یہ وہ فنی سرمایہ ہے جسے ہمیں نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔

کشیری لال ذاکر

فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور

محبوب کا تصور شاعری کی جان ہے۔ چاہے وہ شاعری کسی بھی زبان کی ہو۔ محبت اور خوب صورتی شاعر کو شریک بننے پر آمادہ کرتی ہیں اس کے جذبات شعروں میں دھن کر نقش و انگار بناتے ہوئے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے پھیلے لگے ہیں۔ کانوں سے ٹکراتے ہیں، ترس گھومتے ہیں۔ محبت اور خوب صورتی ہی وہ خیر ہے جس سے شاعری کی اُپرچ ہو جی ہے۔ اردو شاعری میں محبوب کے فروغ والے اشارے اُچھارے جلتے دیتے ان سے جو تصویر بنتی تھی وہ کوئی محبت خوب صورت اور دلکش نہ تھی۔ محبوب کے ابتدا اس کی "نیکیں، اُٹھ، گئی ناک، اس کی کمر اور ان سب کا بیان پڑھ کر اور ان سب خوب صورت، عزیز، اُٹھ، کھنکھ کر کے جوائی "پیکر بن یا مہ سستا ہے۔ وہ زیادہ پرکشش نہ بن پاتا تھا۔ محبوب کے ظلم، اس کی جفا میں، اس کے ستم ناقابل برداشت حد تک سمٹتے تھے۔ برے سے بڑا سمٹ جاتا تھا۔ انہیں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اردو شاعری کی یہ روایات عرصہ تک قائم رہیں۔ ان کا اپنا ایک کیف تھا، اپنی ایک سحر تھی لیکن بدلتی ہوئی قدر بدل کے ساتھ یہ لٹ۔ زیادہ دیر تک قائم رہنا مشکل تھا۔ ان بدلتی ہوئی سماجی، اقتصادی، نفسیاتی تدریجوں کے متکڑاتے ایک نئی کھنک ابھری، اور یہ کھنک تھی نئی شاعری کی آواز۔ اور جب یہ سمت تھی اپنا روپ لے کر سامنے آئی تو اس کا چہرہ خوب صورت لگا۔ نئی شاعری کا محبوب اسی دین کا جیتا جاگتا انسان تھا، ایک بے رحم اور سنگدل بُت نہیں، اس کے پاس دھرم گنوں کا سنگیت تھا، انسانوں کا زیور یہ تھا، خیالیت کے حسین جاے اور سپہنوں کے تدرج عمل تھے۔ اس لئے اس میں پاپیتا اوجھ ہے جہاں نئی سنگ بھی تھی اور حوصلہ بھی تھا۔ اس کے ساتھ اس کی تذبذب کی پرتھپٹیاں بھی تھیں اور سماج کے رسم و رواج بھی۔ اس لئے کہی بھی وہ اپنے آپ کو اتنا ہی مجبور پاتا تھا جتنا کہ برائی اور دُش آؤں میں گملا جتا ہوا عاشق۔ اردو شاعری میں یہ نیا انقلاب سماج کے یہ سترے ہوئے شعور کی حریفانی تھی۔ قریب قریب بھی نہ لکھے دایرے اسی طرح سوچا اور محسوس کیا لیکن غلو کر بات کرنے والا صرف فیض تھا جس نے اپنے محبوب کو اس طرح محافل کیا ہے

اُن کا تپیل ہے، کہ رخسار، کہ چہرہ ہیں ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلن رنگین
جیسے اس زلف کی ہو، موم ٹھنی چھاؤں میں
نٹناتا ہے وہ آؤنرہ، ابھی تک کہ نہیں

محبوب کے آنچل اور اس کے آؤرے کا ذکر اردو شاعری کے نیا سماں عورت کو محبوب کی حیثیت میں پیش کرنا بڑے حوصلے کا کام تھا۔ اور فیض نے یہ جرأت کی۔ اُس نے عورت کو سماج میں اس کی جگہ کا تعین کرتے ہوئے دکھایا۔ عورت انفرادی مسئلوں کے پیش نظر دفتر میں کام کر سکتی ہے، اسکول کا رائج میں پڑھا سکتی ہے۔ اسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال کر سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ محبت بھی کر سکتی ہے اور جذبات اور احساسات کے تقاضے بھی پورے کر سکتی ہے۔ فیض نے جیب عورت کو اس کی سماجی حیثیت دی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑی ہو کر جدوجہد کر سکتی ہے۔ اور اُنے والے حسین درد کے خواب دیکھ کر اُن کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بھی بٹا سکتی ہے۔ اور پھر شہ نواز نسبت کی اہمیت اور اپنے محبوب کی خوب صورتی کی عظمت کا خیال کرتے ہوئے بھی کئی بل زندگی کی دوسری مہاتکوں کو زیادہ طاقتور اور پُر اثر محسوس کرتا ہے۔ اس کی نگاہیں بے کس اور عظیم لوگوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ

لوٹ جاتی ہے اور کو بھی نظر کیا یہ کبھی
اب بھی دل محسوس ہے ترا حسیں مٹ گیا کبھی
اور بھی ڈکھ ہیں زمانہ میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وطن کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلے ہی محبت مری محبوب نہ مانگ

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کی بھرپور جدوجہد کا بھی فیض کا بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ سائے آجاتا ہے اُن دنوں میں بھی جیب وہ قید و بند کی مصیبتیں سہہ رہا تھا اور اس کی نظر کمزور ہو گئی تھی اس کی نگاہوں میں چاند تاروں کی روشنی تھی۔ رعایت کا وہی روشن جڑی فیض کو اپنے محبوب سے یوں مخاطب کرواتا ہے کہ

عصر دہر کی جھلکی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے یہ یوہنی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے پلٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دکھنا ہوا درد
دل کی یہ سود ٹرپ، جسم کی مایوس پیار
چند روزناور مری جان! فقط چند ہی روز

لیکن فیض یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ صرف اس کے جذبہ تسلی سے، اس کی دل جی اور پیار سے اس کے محبوب کی آنکھوں کی اُداسی اور دل کی جھن نہیں مٹے گی۔ اس کے لئے اُسے خود کو کشمکش کرنا ہوگی۔ مخالف قوتوں سے جبراً آزما ہونا ہوگا۔ محبوب کے آنچل کو بقول مجاز پرچم بنانا بہت ہزوری نظر آیا، اور اس نے اپنے دوست سے کہا کہ

ہر دم سے گیت ترن دکھ کا مدد دہی نہیں

نغمہ جرات نہیں، مونس و عنم خوار سہی

گیت نشتر تو نہیں، مہم آزار سہی

تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے ہوا

اد یہ سفاک میا مرے قبضے میں نہیں

اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں

ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

محبت کی یہ لطیف برہمچاریں ہمیشہ فیض کے ساتھ رہی۔ اور اس کی شخصیت میں اس طرح رس بس گئی کہ خود اس کی اپنی شخصیت

بڑی موسمی ہو گئی۔ اس کا طریقہ، رفتار، انداز، سب میں ایک دھبی سا بھڑاؤ آگیا، ایک لوج اور ٹکپ۔ اور یہی لوج اور ٹکپ اس کی شاوی کی جان بن کر رہ گئی۔ یہ ننگی قیرخانے میں بھی اس سے کھلوانی رہی ہے

تہ آ رہو کہ بجتی ہیں مسیری زنجیریں

نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

اور جب جیل پرشام کے سائے ڈھل آئے تو مجرب کی یاد نے لگ لگایا اور فیض کو موسیٰ ہوا ہے

یوں صبا پاس سے گزرتی ہے

جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات

اور پھر اس کی روح میں رچی ہوئی موسیقی لے انکڑ مائی نے ہے

سٹ نہ بام پر دست ہے

مہرباں چاندنی کا دست ہمیں

خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم

نور میں گھل گیا ہے عرشِ کائنات

اور جیل کی دیواروں کے پہرہ داروں سے اس کی دھڑکنوں نے کہا ہے

جلوہ گاہ وصال کی شمعیں

وہ بجھیا بھی چکے اگر تو کیا

چاند کو کھل کریں تو ہم فانیں

میں سمجھتا ہوں جیل میں گزرے ہوئے برسوں نے محبوب کے خدو خال نکھارنے میں فیض کی بڑی مدد کی۔ محبوب کے بارے

میں اس کا شعور ارتقا کی وہ سب منزلیں طے کرتا رہا، جن میں سے ایک سماعہ کو بننے سنورنے کے لئے گزرا پڑتا ہے۔ محبوب کا علم اب

ان سب کا علم بن گیا ہے۔ جو محبت کہتے ہیں اور جی نوبہ انسان کے لئے ایک حسین مقبل میں یقین رکھتے ہیں۔ ایک ایسی صبح کا یقین جو رات

سے بہت عظیم ہے۔ اپنی بڑی ہی پیاری نظم ملاقات۔ میں فیض کا یہ اشراکت پر مبنی ہے

یہ عنم جو اس رات لے دیا ہے
یہ عنم سحر کا لیتیں بنا ہے
لیتیں جو عنم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

اور یہ کیفیت فیض کی اس نظم میں ہے جس کا عنوان ہے " درو آنے گا وہیے پاؤں "۔

حلقہ زلف کہیں اگوشم رضا رکھیں
بجر کا دشت کہیں گلشن دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اسے دل اسے دل

اور پھر اسی نظم کا آخری بند فکر تنہائی سے گذر کر اتق کی حدوں کو چھو گیا ہے جہاں سے صبح کا اُجالا نمودنے والا ہے۔

ہونہ ہوا اپنے قسطل کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فسیلول کے ادھر

ان کو شمعوں کے رجن اپنا پتا تو رہ گئے
خیرا ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی مدار تو دیں گے
دور کہتی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے

فیض کے محبوب کی پریشانی، اُس کے عارضوں کا رنگ، اُس کی آنکھوں میں کاجل کی بیکرا اُس کی زلف کی چھاؤں میں
نمزان ہوا آؤ نیزہ ایسے سب اکائیاں مل کر اس حسین صبح کا اُجالا بن کر کسائی ہیں، جس صبح کا ہم سب کو انتظار ہے فیض کا محبوب انسانی
سماج کے حسین دور کا پیا بہر ہے اور اسی میں اس کی شاعری کی عظمت ہے۔

— مختصرًا یولہ سمعہ یہے کہ فنِ تخلیق کے عمل میں
مشاہدہ اور تجربہ گوشتے پوستے اور استخوان کے متراویں
ہے۔ جذبہ اسے تخلیق میں لہریں کرم سے پیدا کرتے۔ اور فکر و ملغ
کی روشنی، مناسبت اور تہ رفتہ اظہار سے اسے تخلیق کا شکر
دفقہم اور نوکے پلکے سفارے جاتے ہیں۔ اور تخلیق وہ پراسرار شے
ہے جس سے اسے تن فرسودہ میں جان پہنچ جاتی ہے۔ اسے اپنی جیسی
تصور کیے یا ہوتے کنے نیکون :

— فیض

ماہر القادی

فیض کی شاعری

اول زبانت و بیانی

ادبِ علم و معنی، اہل نقد و نظر اور شعر و ادب پر کھنے والوں میں یہ بحث مایہ النّزاع رہی ہے کہ مضمون، لفظ اور خیال و انہماک میں کس کو ترجیح حاصل ہے۔ اس مسئلہ میں کتابِ المعاد کے شہرہ آفاق مصنف ابنِ رشیق قیروانی کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ مضمون اور الفاظ دونوں اپنی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مضمون اچھا نہ ہو تو اس کی خرابی الفاظ کو بھی عیب دار بنا دے گی، اور مضمون اچھا ہو اور اس کو ادا کر کے لئے الفاظ موزوں اور حسین نہ ہوں، تو بھی شعر بے کار ہو گا!

اس مسئلہ میں اربابِ فن نے خاصی بحث و گفتگو کی ہے مگر اہل فن کی اکثریت کا یہ فیصلہ ہے کہ — لفظ کو یعنی "اظہار" (EXPLANATION) کو مضمون یعنی "خیال" (IDEA) پر ترجیح حاصل ہے۔ علامہ شبلی نعمانی جو شعر و ادب کے سب سے بڑے نقاد ہیں، فرماتے ہیں —

”حقیقت یہ ہے شاعری یا انشا پر فدازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی

پر ہے، گلستاں میں جو مفاہین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نا در نہیں،

لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب و تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے،

انہیں مفاہین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا

رہے گا۔ ظہوری کا۔ ساقی نامہ۔ تازک خیالی، موشگافی اور مضمون پختہ کاظم

ہے، لیکن سکندر نامہ کا ایک شعر پورے ”ساقی نامہ“ پر مجاری ہے۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ ”ساقی نامہ“ میں الفاظ کی وہ متانت، اور شان و شوکت اور نیش

کی وہ پختگی نہیں جو ”سکندر نامہ“ کا عام جوہر ہے!

..... جن مشہور شعرا کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کے کلام میں غمی

ہے، اُس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں متانت، وقار اور نیش کی درست

میں نقص پایا جاتا ہے۔ متوسلین اور متاخرین نے جو شاہنہ لکھے، مضامین اور خیالات میں فردوسی کے شاہنامہ سے کم نہیں ہیں۔ لیکن فردوسی کے شاہنامہ کے سامنے ان کا نام لینا بھی سفاہت ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ فردوسی جن الفاظ میں اپنے خیالات کو ادا کرتا ہے، اُس کے سامنے اوروں کے الفاظ بالکل کم رتبہ اور بے وقعت معلوم ہوتے ہیں.....

یہ واقعہ ہے بلکہ تجربہ اور شاہدہ ہے کہ نازک سے نازک خیال، حسین سے حسین تشبیہ اور اچھوتے خیال کو ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ میسر نہ آئیں تو خیال و مضمون کی نزاکت خاک میں مل جاتی ہے۔ شعرا سی وقت دل کش بیکلا سحر حلال بنتے ہیں۔ جب خیال و انہماک اور مضمون و الفاظ دونوں حسین ہوں، عروس جمیل کے جوہر نیاس قیریں اور زیادہ بہار دکھاتے ہیں اور دنیا کے جتنے بڑے انشا پرداز اور عظیم شعرا گزرے ہیں، وہ سب کے سب زبان کی نزاکتوں کے جاننے والے تھے۔ الفاظ پر تنے کا انہیں سلیقہ آتا تھا۔ اور اس فن سے وہ واقف تھے کہ نثر و نظم میں لفظوں کے نیگیے کس طرح جٹے جلتے ہیں اور تشبیہ و استعارہ کے موتیوں کو الفاظ کی زنجیروں میں کس خوش فہمی کے ساتھ پرویا جاتا ہے۔

شعر میں فنی لفظوں کے درویش سے پیدا ہوتی ہے، الفاظ کو ساز کے پردوں کی طرح شعر میں مرتب کیا جاتا ہے!

غالب کی داری غزل کا مقلد ہے۔

آسودہ باد، خاطر غالب کہ خوں اوست

آئینتی یہ بادۂ صفائی گلاب را

اس شعر میں موسیقیت کے علاوہ کسی قدر حلاوت پائی جاتی ہے کہ شعر دہرانے میں زبان متعاس کا مزہ محسوس کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف غالب کے اردو و زبان میں یہ مصرعہ —

بھوں پاس آنکھ قبضہ حاجات چاہئے

اہل ذوق کو کس قدر کھٹکتا ہے۔ بھوں پاس نے اس مصرعہ کو دھماکے کے لئے کسی قدر ناگوار بلکہ ناگوار بل برداشت نہ کیا۔ علامہ شبلی نعمانی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جہانگیر کے دور میں نورجہاں کو امور سلطنت میں بہت کچھ دخل حاصل تھا اور وہ جہانگیر کے پردے میں دراصل شہنشاہی کرتی تھی۔ اس خیال کو شبلی نے کسی قدر مخبرانہ انداز میں ادا کیا ہے۔

اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی نگرہ

جا کے بن جاتی تھی اور اقی حکومت پہ شکنی

یہ خیال کہ فرد کو مرکز سے وابستگی رکھتی چاہئے۔ علامہ اقبال نے کسی اچھوتے طرز سے بیان کیا ہے

والستدرہ شجر سے امید بہار رکھ

شاعری میں اظہار یعنی پھیلانے کے مقابلہ میں ایجاز و اختصار اور رمز و اشارت حسین تر سمجھی جاتی ہے، جس سے شعر میں معنوی لطف پیدا ہوتا ہے۔ مگر ایجاز اور رمزیت و اشارت کا معاملہ بہت ہی نازک ہے۔ زبان و طرز ادا پر پوری قدرت نہ ہو تو یہ "ایجاز" ابہام بلکہ اجمال بن جاتا ہے! شعر کو چیتاں بنا دینا کوئی کمال کی بات نہیں ہے، شعر کا لطف تو اس میں ہے کہ اس کے

ہو دو رو کے محفل کو چراغاں کر کے چھوڑ دو، راکھ
جناب فیض احمد فیض ادو زبان کے شہرہ آفاق شاعر ہیں۔ ایک دعوت میں زبان و بیان کا ذکر چھڑا تو انہوں نے فرمایا کہ بڑے شاعر
”زبان و بیان کی زیادہ پروا نہیں کرتے“ ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی! اس دعوت میں بحث و گفتگو کا موقع نہ تھا!
میں نے تقسیم ہند سے قبل سنہ ۱۹۴۷ء میں ان کا مجموعہ کلام — انقبض فریادی پڑھا تھا، تقریباً بیس سال کے بعد اس کتاب کے علاوہ
ان کی دو اور کتابیں — ”دست صبا“ اور ”زنداں نامہ“ بھی مطالعہ کیں، ان کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ فیضی صاحب نے
واقعی جھپک کہا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق بڑے شعور زبان کی زیادہ پروا نہیں کرتے! اس قسم کی بے پروائی ان کے یہاں جا بجا فنی
ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

اپنے موصوم تبسم کی نسر ادائی کو
دستِ دید پر نگہار نہ کر دینا تھا

تبسم کی فراوانی کیا ہوتی ہے؟ پھر اس پر مستزاد ”وسعت دید“! اس شعر میں حرف جار دید۔ اور زیادہ کھٹکتا ہے۔ شعر
کا مفہوم کس قدر الجھا ہوا ہے

خمارِ خواب سے لبریز اتریں آنکھیں
سفیرِ رخ پہ پریشانِ غبریں آنکھیں

فیضی صاحب پریشان ہو کر تکی ہیں مگر ”آنکھوں“ کا رخ پہ پریشان ہونا پہلی بار پڑھنے میں آیا۔ پھر ”غبریں“ آنکھوں کی
نہیں زلف و گیسو کی صفت ہے! اس لئے کہ زلفوں کا سیاہ اور خوشبودار ہونا زلفوں کی صفات میں داخل ہے، ہاتھوں کا خوشبودار
دور کا تعلق بھی نہیں ہے! یہ

جھپک نہ ہی ہے جوانی ہر اک بن موعے

رواں ہو برگِ گل تر سے جیسے یلِ شمیم

”خوشبو شمیم“ کے لئے ”یل“ کا لفظ خوشبو کی لطافت پہ یار ہے ”موج شمیم“ کہنا تھا۔

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے

دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

چشمِ میگوں کو عاشق کی طرف کر دینے سے ”دستِ قدرت کس طرح بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔ معرغ ثانی میں شاعر جو کچھ کہنا چاہتا
ہے وہ واضح نہ ہو سکا۔ یہ وہ ”دعوتِ رخسار“ ہے جو موزوں الفاظ استعمال نہ ہونے کے سبب ”ابہم“ بن جاتی ہے
فیض صاحب کی ”شہرہ زلسم“ کا معرغ ہے

مجھے پہلی ہی محبت میرے محبوب نہ مانگ

”محبت مانگنا“۔ یہ زبان و روزمرہ نہیں ہے۔ یوں کوئی نہیں بولتا کہ فلاں شخص سے محبت مانگ رہا ہے!

شاعر کہنا چاہتا ہے اور اسی طرح کہنا بھی چاہئے تھا — کہ میرے محبوب مجھ سے پہلی ہی محبت کی امید نہ رکھو، یا اگلے سے دوستا نہ
روابط کا تقاضا نہ کرو!

لوکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چہرے
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
"خوابیدہ چہرے" یہ کس قسم کے چراغ ہیں، شاید وہ چراغ جو گل ہو چکے ہیں۔ اگر گل ہو چکے ہیں تو پھر ان کا "لوکھڑانا، مٹوڑا" ہے، پھر شمع و چراغ اور فانوس کی صفت ڈگمگانا اور لوکھڑانا زبان کے اعتبار سے درست نہیں ہے۔

دل کے دلوں میں لے لگ شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے پہلے ہوئے اکتائے ہوئے
محبوب کے سیالِ تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھیجے ہوئے پھٹے ہوئے
پہلے شہ کا دوسرا مدعِ غاصہ محلِ فوریت۔ نورِ خورشید سے ہم جانا اور اکتائے ہوئے؟ شعر میں ہر بات کہنے کا قرینہ ضروری ہے! مفسرِ محبوب کا ترجمہ: سیال بھی ہوتا ہے! غیب! یہ لفظ دسیال، غائب، قائل" یا "جان دار و متحرک" کے معنی میں استعمال ہوا ہے پھر ————— کی تاریکی کو بھیجے ہوئے لیٹائے ہوئے ————— اس کے پاس میں کوئی بے جی تو کیا کہے! ————— وجدان کے لئے فضا تو ان اور کئی کشمکش کا سا!

یہ چند اشعار "تعبشِ فریادی" کے تحت "اب" دستِ صبا اور "زندانِ نامہ" کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

بھی زنجیر چپکتی ہے پس پردہ ساز
مطلق الحکم ہے شہزادہ اسباب بھی
"شہزادہ صبا"۔ "مطلق الحکم" کو "شہزادہ" کے مفہوم کو اُلجھا دیا

یقیناً صاحب کی ایک نظم ہے "سیاسی لیڈر کے نام" اس میں فرماتے ہیں: اسے
ساہبا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت وسیہ حین میں پیوست رہے

یہ آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ۔ رات کے سخت وسیہ سبز میں کس طرح پیوست رہے؟ شاعر کے ذہن میں کیا مفہوم ہے، جس کی ان لفظوں میں تربیتی کمی ہے! مظلوم کے ہاتھوں کا رات کے پتے سے کیا تعلق ہے! اسے
اور اب رات کے ٹینگین وسیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا فورے اک جاں ساجن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

شعر کا مفہوم؟ طرہ ادا؟ الفاظ کا استعمال؟ ————— ذہن و فکر آزر کہاں تک "تاویں" کریں۔ پھر "گھاؤ" کو۔ "بھاؤ" کے
دزن بدہوتے اور شعر میں نظم کرتے ہیں۔ اس طرح سے
ترجی نظر سے دل میں مرے گھاؤ کر گئے

”بعد ناز“ کہنا چاہئے تھا! یہ
پھر دنیا و انوں نے تم سے
یہ ساغرے کر چھوڑ دیا
جو مے مٹی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہسپہر توڑ دیا

یہ جہان کوئی پرندہ معلوم ہوتا ہے جس بے چارے کا ”شہسپہر“ توڑ دیا گیا ہے
”نچھ“ وہ بھی ہیں جوڑ بھیس کر
یہ پردے نوحہ بگاتے ہیں
ہستی کے اٹھائی بیگروں کی
ہر چال اٹھائے جاتے ہیں
اس نظم کے اشعار و شوق کے زمانے میں یک حالت ہیں۔

یوں بہار آئی ہے، اسانی کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گدرا کسی بار کوں یا نہ کوں
گدرا سے مراد یا تو داخل ہونا، درگزر نہ ہے یا، جن میں رہ کر گدرا نہ ہے! اس ایک لفظ ”گدرا“ نے اچھے خاصے شعریں
انجن پیدا کر دی ہے۔

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شش جن مٹی
درد کا چاند بچھ گیا، بھری رات ڈھن گئی
”درد کا چاند“ کیا ہوتا ہے۔ پھر چاند کے ڈوب جانے کو ”بچھنا“ نہیں کہتے!
ایک نظم ہے، ملاقات ”اُس کے چند شعر ہیں۔

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو چھوٹے بچے سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشغی بکھڑا رہا
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار ہا سب اس کے سائے
میں اپنا سب ڈر دو گئے ہیں

ملات کسی درد کا شجر بھی ہوتی ہے!! یا اللہ! پھر ہزار ہا سبوں کا ”نور و تا“ اس سے بھی عجیب تر!۔ نور فائے کرنے کو۔ نور
رونا، کون بولتا ہے بے

بات بس سے بھل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

مصرعہ اولی کا دوسرے مصرعے سے کیا ربط ہے! بات قابو سے باہر ہو جائے اور اُس پر بس نچل کے، تو کیا ایسا ہو جانے سے
دل کی حالت سنبھل جاتی ہے، یہ کوئی کاتید ہے یا شاعر کا ذاتی تجربہ! فیض صاحب آخر کتنا کیا چاہتے ہیں؟

سبزہ سبزہ سوک رہی ہے، پھینکی زرد و پھر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
(اے روشنیوں کے شہر،

دوبارہ پھینکی بھی جاتی ہے۔ پھر اُس کا "سوکنا"۔ تنہائی کا زہر کیا ہوتا ہے! اور وہ زہر دیواروں کو چاٹ بھی رہا ہے۔!
تنہائی کا زہر و شہر میں لاسکتے ہیں مگر کہنے کا انداز اور قرینہ چاہئے! اسے

جب غم کی تیسری راہوں میں شام ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم

کیا "شام ستم"۔ راہوں میں "گھلا" بھی کرتی ہے! ایسے ہی موقوفوں پر غماز انگشت بردشاں اور ناطقہ سر بگڑیاں نقل
آتا ہے۔

سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم چلت آؤ، گزر جاؤ۔ یا مگر دیکھو

یا۔ کا۔ "الف" کس جیسی طرح دب رہا ہے۔ اسی قسم کے دبتے ہوئے الف کے بارے میں غالب نے کہا تھا کہ۔ "یہ میں نیزہ کی
طرح لگتا ہے! یا۔ کی جگہ "کہ" آسکتا تھا۔

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کو حینہ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

شرا اچھا ہے مگر "بے نیل و مرام" کی کیا ہے۔ بے نیل و مرام "پڑھ کر ذوق ادب کو چرا کا سالگا۔ داس میں۔ نیل کا لفظ
"جیل" نہیں، "نیل" اور "نیل" کی طرح کرنا چاہئے۔ پھر "نیل" اور "مرام" کے درمیان اضافت ہے واؤ حذف نہیں ہے)
فیض صاحب کے کلام سے یہ چند اشنا میٹیں لگتی ہیں۔ ادیبانہ نقد و نظر کو ان کی شادی کے اس رخ سے حدی نظر نہیں
کرتی چاہئے ورنہ ان کی تقلید میں شبہ کہنے اور لکھنے والے زبان و اظہار کے معاملے میں بے پروائی برتنے لگیں گے!

جناب فیض کا کلام پڑھنے کا مرقع ملتا تو ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ملے، جن سے وجدان نے لطف حاصل کیا ہے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے بھی جاتی
دونوں عالم کا لٹہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

اک طر ز قضاقل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

رنگِ پیراہن کا، خوشبو زلف ہر آنے کا نام
 موسمِ گل ہے، تمہارے بامِ پرکٹے کا نام
 پھر نظر میں پھول مچکے، دل میں پتھر میں ملیں
 پھر قصور نے نیا اس بزم میں جانے کا نام
 مگر راحتِ غم جہاں کا حساب
 آج تم یاد بے حساب آئے
 ذکرِ دوزخ، بیانِ جور و دھور
 بات گویا یہ ہیں کہیں کی ہے
 ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس باتیں سے
 آئیں گے اس طرٹ بھی اکہ روزِ ابرو ابریاں
 ہو چکا عشقِ اب ہو کس ہی سی
 کیا کریں، نسوڑ ہے ادائے نماز
 ساغر تو کھلے، ہیں شراب آئے نہ آئے
 بادل تو گر جتے ہیں گٹھا برسے نہ برسے
 دہلِ عشاق کی خمیر لینا
 پھول کھلے ہیں ان مہینوں میں
 اگر مٹ رہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
 طرٹ طرح کی طلب تیرے رنگِ لب ہے
 چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
 ملتی جلتی ہے سببِ غم سے تری دیرِ ابائے
 شمعِ نظر، خیال کے انجمن، جگر کے داغ
 جتنے چسپاں ہیں تری نعل سے آئے ہیں
 ان شعروں میں کتنا لطف و کیف ہے، اور بعض تو معنوں و خیال کے لحاظ سے اچھوتے ہیں۔ کاش! جنابِ فیض کی شاعری
 کا سلسلہ یہی رنگ ہوتا:

- کسے کلیجہ کے باطنی قدروں کے تعریف، اظہار اور تعین، اور اس کے ظاہری
 صورتوں کے تشکیل، بیان اور صورت گری بدیہتاً ویسے ہی کے ہا نقود تکمیل باقی ہے۔ ایسی ہی
 ۸۱۔ اسیتہ اوپے کو کلیجہ کے ارتقائی عملے میں بھی حاصل ہے۔ - فیض

ڈاکٹر گل حنین

فیض کی شہریت

پس منظر و پیش منظر

اقبال نے اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

میں شاخ تاکہ جوں میری غزل پہ پرانہ
اسی شمر سے مئے لالہ دام پیدا کر

فیض بھی اپنے ابا کے وطن بلکہ پوری دنیا کے یا رانہ نکتہ داں کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت دقت کے ساتھ اپنے مخصوص اشاراتی و متغیر لالہ انداز میں کہہ رہے ہیں کہ

پیو کو مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید
گواہ ہے اب کے مئے لالہ نام کہتے ہیں

اقبال کو فیض نے ہمیشہ ایک خاص احترام و محبت کے ساتھ یاد کیا۔ ان پر نظر (مرثیہ) بھی لکھی جس میں انہیں خوش نوا فقیر اور شاہ گدا نا، جیسے القاب میں خراج تحسین و تحکیر پیش کیا اور ان کے گیت کے تمام محاسن کو ناز و مال قرار دیا۔

اقبال کو اس طرح یاد دلنا بھی فیض کی وسیع النظری کی ایک بہت بڑی دلیل ہے اور فن و ادب کے احترام کا ایک زندہ ثبوت بھی، فیض کی نفس سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ماضی کے دھارس سے بہت ساری غجہ پوری روایات بھی حال میں داخل ہو جاتی ہیں جن کی قطع و برید بھی اذیس ضروری ہے بلکہ فخر محبت مندانہ روایات کے وارث نہ بننے کا مہم بنی اعزاز بھی مستحسن ہے لیکن جہاں تک تعلق مکتب خیال کے قیام و وجود کا تعلق ہے فیض اس سے نہیں گھبراتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کی جدوجہد سے برزخانی اور زندگی کے بہتہ معیار پیدا ہوں گے۔ ایسے افراد کی کمی نہیں جو اپنے ملک و قوم کے ماضی کی بات تو بہت کرتے ہیں لیکن ماضی کو تاریخ طوڑ سے نہیں سمجھتے جو ماضی کو صرف بنیادی نکتہ سے دیکھتے ہیں اور اسے حال کو بھیج دیتے ہیں۔ وہ ماضی کی بی ایک پر تپائیں بنائے رکھنا چاہتے ہیں بغیر اور انقلاب ہی اصل میں زندگی کے ضامن ہیں اور فیض کا سا اکلوم اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ تفسیر و انقلاب کے بہت بڑے حامی اور موید ہیں۔ تبدیلی کو محض جذباتی طریقے سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کا وہ ایک تاریخی شعور بھی رکھتے ہیں۔ فیض کے کلام میں قدما کا اثر بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ قدیم فارسی شعرا میں سعدی، حافظ اور عتی وغیرہ کے فن و نگارشی بازگشت آئیگی جہاں بہت ضرور کھائی دے گی اسی طرح اردو شعراء میں صرف اقبال کا ہی نہیں بلکہ اوروں کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ خاص کر سوڈا اور غالب کا۔ جن کے

نام انہوں نے اپنا غزنیہ جی مندر کی ہیں۔

تقدیرِ حیدر کی طرف سے کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرثیہ کی طرف سے کروں یا نہ کروں

تذکرہ:

گفتاں کہ یہ واقعہ ریاضہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بنان کا ارادہ رکھتے ہیں

اندونیشیا

انڈازِ بیان اور فنی ترکیب میں قدماتِ استفادہ کی انہوں نے پوری نگارش کی ہے۔ ہاں گورنہ تقلید کہیں جی نہیں دے گی۔ بے جا قسم کی اثر پذیری سے فیض نہ جیسا کہ اپنا دامن پھیرا ہے اور دعوے خواہ کے لیے ساتھ کہ رنگ سے اپنا رنگ دے گئے۔ انگریز کا ہے جب ذمہ دہ فہرہ شاعرانہ کی ہے۔

جب ذہن میں فیض کی شاعری کے انداز کی پس منہ ہانکے سے جلائی گئی تھی تب اس میں کچھ شخصیتیں خاص طور سے اجڑتی محسوس ہوتی ہیں اور ہر ایک عرصہ کے ساتھ ساتھ نور بن کر گہری ہوجاتی ہیں۔ ان سب بابیان حوالہ جاتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ خصوصیت سے اس بڑی ادبی تحریک کو ڈھکی چھپی کرنا چاہیے گا۔ اس نے ایک طرف فیض سے شاعر اور محقق کو پیدا کیا تو دوسری طرف عوام کو فکری و ادبی پرورش دینا چاہی کہ وہ اپنے سن فہم اور ادب شناس ہو سکیں۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی یافتہ مصنفین کا قیام، اردو ادب کے لئے ایک نئی دنیا اور ایک نئی زندگی کا پیام کے کرنا۔ اس انجمن کی تحریک نے ہماری شاعری دنیا میں جی ایک انقلاب پیدا کیا، فنی، مواد اور تکنیکی لحاظ سے اس نے اردو شاعری کو کافی متاثر کیا۔

[illegible]

اگر دست تو کاره نادر آید

گناہ ہے ہم اگر باشند ثواب است

جوش کی یہ نظم ذہن میں لائیے

شکست زنداں کا خواب

کیا جنت کا زنداں جاگ رہا ہے گویا زہری میں نگہیں
اٹکائے میں شاید کچھ تیری اور تو دہے میں زہریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے لڑپہ چہرہ سلاک
خیر میں ہے پرچم کھولتے سب سے میں پڑی میں تمہیں

علامہ اقبال جوش نے یہ ترانہ سنہ ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا اور فیض نے اپنے ترجمہ دوست مباحث میں بے غالبان شانہ کے ارد گرد لکھا ہے لیکن

جوش کی اس نظم، شکست زندان کا خواب، کی گرج فضل زلمی کے باوجود فیض کے اس بڑا نہ، میں صاف سنی جاسکتی ہے۔ شاید وہ ایک شعر دیکھئے۔

اے خاک نشین، اکھڑ بیٹھو۔ وہ وقت قریب آ بیچا ہے
جب جنت گرائے جائیں گے جب تلخ اچھالے جائیں گے
اب لوٹ گریں گی زخیریں، اب زندانوں کی نصیب نہیں
جو دریا جھوم کے اگلے ہیں تنگوں سے نہ ٹائے جائیں گے

فیض کی شاعری کے پس منظر میں جوش کے معنوی فرزند مجاز مرحوم بھی آجاتے ہیں جو صرف، شاعر شہر نگار ہیں۔ ہی نہ تھے بلکہ مرد انقلابی ہوئے کی حرمت ہی دن میں رکھتے تھے۔ بات یہ ہے کہ فیض اور مجاز میں طرزیان کے تصور سے بہت اختلاف کے باوجود ایک خاص مماثلت بھی ہے دونوں ہی غنائی شاعر ہیں اور دونوں ہی اپنے عہد کے صحیح ترین ان میں اور اپنے دور کی سچی کھڑی، اور سب سے پہلے آواز۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ مجاز کی شخصیت، نہ تو ادراپی کی بلکہ زندگی کے مارے یادہ عرصے تک برداشت نہ کر سکی۔ اس مجروح زندگی نے اپنے مذاق کو دب آگئیں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ اور اس کردہ دنیا سے بلکہ رخصت ہو گئی۔ لیکن جیہ بھی اس کی انفرادیت امتداد زمانہ کے باوجود کسی بھلائی نہیں جاسکتی ہے مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

یہ آواز آج بھی احرار ہے۔ یہ آواز ہمیشہ احرار ہے گی۔ مجاز نے جو خواب بحر دیکھا تھا وہ آج بھی فیض کے کلام میں زندہ ہے اور ان کی شاعری کی روح بنا ہوا ہے۔

عام محفل میں تو یہ بات ٹھیک ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں رشتہ دھات نہیں جاتے لیکن اس کا یہ مطلب نکلنا کہ شاعر کے لئے کسی محنت یا کسب کی ضرورت نہیں ٹھیک نہیں۔ زندگی میں محنت و کسب کا جی بڑا ہوتا ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے کسی کام میں غفلت پیدا نہیں ہوتی۔ اور فطری صلاحیت بھی پوری طرح نہیں ابھرتی۔ مجاز میں فطری شاعرانہ صلاحیت، فراق سے شاید زیادہ ہی تھی لیکن ان دونوں کے قد وسط میں کتنی فرق نظر آتا ہے۔ مجاز کے یہاں تغزل بہت ہے لیکن وہ فراق کے رچاؤ اور پختگی کو نہیں پہنچ پاتا جو واقعی ایک کمالی اور سخت ریاض کا ثمرہ ہے۔

مجاز مرحوم اپنے مخصوص ڈھب کی زندگی کے ساتھ اتر دس بیس برس اور بھی زندہ رہتے جب بھی شاید نتیجہ کچھ ایسا ہی رہتا وہ دیانت داری کے ساتھ اس بات کا دعویٰ مشکل ہی سے کر سکتے جس کے فراق صاحب بجا طور پر مستحق ہیں۔

فراق احساس کی ایسی ریاضت

حقیقی شاعری بھی ہے بڑا کام

اس بات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خواہ کوئی جی تن ہو جب تک اس میں مجاہدے کی حد تک جان توڑ محنت نہ کی جائے گی وہ اپنے کمال خروج تک نہیں پہنچ سکتا۔

نقش ہیں سب نام خون جگر کے غیر

نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

(اقبال)

لے یہاں کے شہر یاروں کو تیرو

کہ مرد انقلابی آگیا ہے

فیض کاسب سے پہلا شعری مجموعہ، نقش فریادی، کے نام سے سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بھی اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ فیض بنیادی طور پر ایک بہت ہی نرم مزاج، دردمند اور کم گو آدمی ہیں پلے درپلے مصائب سے سابقہ پڑتا ہے، لیکن جدوجہد کی سنت دینی نظر نہیں آتی بلکہ برابر برصغیر ہی رہتی ہے۔ بے وسیع نگاہ انہیں کبھی پسند نہیں رہا البتہ جن باتوں کا دل پر اثر ہوا انہیں فیض نے شعری صورت میں زیادہ سے زیادہ قلموں کے ساتھ منتقل کیا۔ ان، م۔ راشد کے بقول فیض نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ یہ بات ان کے حسب حال بھی تھی اپنے دل کی چوٹ کا ذکر فیض نے خود بھی کیا ہے۔ جذبات کی اصلیت کی شمولیت میں الہامی فنکاری نے شعریت کے جوہر دکھائے چنانچہ ان کی ابتدائی عہد کی غزلیں بھی اپنے اندر ایک دلکشی رکھتی ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تو چھوچھو عید الفت کی، بس اک خواب پریشان تھا
نفل کو رواہ پالائے نہ دل کا مدعا سمجھے

فیض تکمیل آرزو مندرجہ

ہوئے تو یوں بھی بسر کر دے

فیض نے غزل کی صنف میں، غزل مصل، یا غزل غیر مصل کی طرح کوئی تقسیم نہیں کی بلکہ شروع ہی سے ان کی غزلوں میں تسلسل کا احساس تھا۔ یاد دہانہ کے غزل کے آرٹ کے مطابق اشعار اپنی جگہ پر منفرد مگر منہمکے عالم میں۔ عدوان غزل کے پیکر میں پوری طرح ڈھلے ہوئے فیض نے غزل کو بھی شروع کیا۔ لیکن ان کی غزلیں، دو تین دو تین درجہ کی شاعری سے کچھ مختلف ہیں۔ میں غزلیوں میں وہ مضامین سے زیادہ صوفی یا سحرکش نظر آتے رہے اور انداز بیان میں قواعد و زبان سے زیادہ قلموں کا اہم ہوتے رہے۔

غم جاناں جلد ہی انہیں غم دہاں کی کھل دیا۔ محبت سے انفرادی اور سماجی غلوں کا احساس دہایا۔ چنانچہ سماج اور وطن کی کٹر کشمکش خدائی میلانا و محسوسات پر ترجیح پانے لگی۔ حسن محبوب اب بھی دیکش تھا اور اپنے اشعار میں خدیجی لیکن غم زمانہ اس سے بھی شدید تر ثابت ہوا۔ چارونا چارنا غزلیں کو یہ اعتدال کرنا بھی پڑا کہ

محبت پہلی ہی محبت مری محبوب نہانگ

موضوع یہ کہ ان سماجی تقاضوں کے تحت اور اپنے فنی اور ادبی شعور سے مجبور ہو کر بھی فیض دل کی داخلی دنیا سے سنگ و آہن کی بیرونی دنیا کی طرف بھی قدم اٹھانے لگے اور اپنے دل کی میسوں کو دوسروں کے درد نظم کرنے کا پس منظر بنالیا۔ اس رجحان کی ایک نمائندہ مثال، نقش فریادی کی نظم سوچ ہے اس احساس اور رجحان سے ان سے وہ غزلیں کابل میں، جس کے م۔ مکرنت اور خانی طرناں اخبار اور چٹیلے انداز بیان نے تھوڑے ہی عرصے میں انہیں متلاشہ شعری اہمیتیں جڑ دلائی فیض ترقی پسند تحریک سے بے حد متاثر ہوئے یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ وہ ابھی نہ صرف تحریک کے بلکہ تنظیم کے بھی قائل ہیں اور اسے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ تنظیم کی موجودگی سے اتنا ضرور ہے کہ مل بیٹھے اور انجام دہنیم کے لئے موقع باہر آتا ہے اور اس طرح کہنے والے کو انجنت ہوتی ہے۔۔۔ اس میں شمولیت کے یہ سنی نہیں کہ تحریک سے دلنا، وابستگی بھی ہو۔

سنہ ۱۹۴۶ء سے پہلے بھی وہ اپنے خیالات و محسوسات کی ترجمانی کرتے رہے تھے لیکن ان کے اس زمانے کے تجربات میں کوئی خاص گہرائی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت تک ان کے یہاں صرف ایک عشق تھا۔ عشق محبوب۔ جس کی وہ جذباتی ترجمانی کر رہے تھے سنہ ۱۹۴۶ء کے بعد سے سیاست اور شاعری یہ دو فن حیرتیں ان کے یہاں تیزی سے ہم آہم ہونے لگیں

لیکن ان کے امتزاج میں ابھی پورا گھار نہیں پیدا ہوا تھا۔ سکڑہ میں آزاد ہندوستان اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا لیکن آزادی سے جو توقعات وابستہ کی جا چکی تھیں حالات کچھ ان کی خلاف سمت میں ہی جاتے ہوئے سوس ہوئے۔ ان سے متاثر ہو کر فیض نے - مجمع آزادی - کے عنوان سے وہ دلدادہ درد لہزدہ نظم لکھی جس کی مثال اردو کی سیاسی شاعری میں مشکل ہی سے ملے گی کہ

یہ داغ داغ اجالا - یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھاجس کا ، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہل جاسے گی کہیں نہ کہیں

اور جس کا خاتمہ ان مصرعوں پر ہوتا ہے کہ

ابھی گزنی شب میں کی نہیں آئی
نجات دیدہ دول کی گھڑی نہیں آئی
پلے چلو کہہ منسلک ابھی نہیں آئی

فیض کی تراکیب و دران کی زبان پر بہت سارے اعتراضات کئے گئے ہیں حالانکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس میدان میں بھی انہوں نے قابل قدر تخلیقی کام کیا ہے۔ نقش فریادی میں تو انہوں نے زیادہ توقعات نہیں کئے ہیں لیکن دست صبا میں اور زنداں نامہ میں انہوں نے کچھ زیادتی توقعات ضرور کئے ہیں -

• عجیب خبر دست • میں سب آئیں • اور آتشاں سکوت • اسی حسین ترکیبوں وضع کی ہیں اور کچھ الفاظ بھی لکھنے میں جو ہمارے لفظیات کا سرمایہ ہیں ، نئے اضافے کا حکم رکھتے ہیں ساتھ ہی کچھ الفاظ کو انہوں نے تیار راج بھی بخشا ہے مثلاً شہباز ، حیدر ، جویاؤں ، قربت اور طبل و دھن جیل خانہ یا زبوت خانہ وغیرہ - ان توقعات کے بارے میں ہمارے علما کا جو نقطہ نظر رہا ہے وہ ہمارے لئے تکلیف دہ ، بے چارہ اس مسئلے کے بارے میں ہم اپنی بات بھی کہنا چاہتے ہیں -

عام مثل ہے کہ زنداں کا ناکے نہیں آتا ، رونے کی بات تو دیر دوسری ہے لیکن گانا گائے گائے سے خط حاصل کرنا بھی بہ شخص کو نہیں آتا۔ یہی بات شاعری کے فن لطیف پر بھی صادق آتی ہے خواہ کوئی شخص شعر و شاعری کا کتنا ہی مطالعہ کیوں نہ کرتا ہو لیکن ضروری نہیں کہ اس کے اندر شحریت کا بالیدہ احساس بھی ہو - مارکس نے ہی ایک جگہ یہ بات زور سے کر اور صراحت کے ساتھ کہی ہے کہ ہر شخص غفلت کا (غفلت کا) نہیں رکھتا چکا سوتے بھی ایک تہ بہ نسبت بھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ - جیسے دیکھو وہی فن کو سمجھنا چاہتا ہے یہ بات ایسی ہی ہے کہ ہر شخص پرندے کی چہکار سمجھنا چاہتا ہے -

ادھر کچھ عرصے سے شعر و شاعری پر تنقیدیں دیکھتے ہوئے میرا یہ احساس یقین میں بدل چلا ہے کہ یہ باتیں صحیح ہیں دیر ہمارے جدید شاعری اور خاص کر غنائی اور علامتی شاعری پر اتنی تنقیدیں نہ ہوتیں جن کے نمونے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں اور جہاں میں ہمارے بعض اہل علم نے خاص مہارت حاصل کر لی ہے - فیض کی زبان اور ترکیب کو بھی میکا بھی ملے لے سے پرکھا گیا ہے -

ساغر نامہ میں آنسو بھی دھلک جاتے ہیں

نعرش پامیں ہے پابندی آؤب ابھی

(فیض)

غائب۔ فارسی لفظ ہے جس کے معنی صاف عاقل و بے آغیزش وغیرہ کے ہیں۔ مفہوم شعر کا یہ ہے کہ ہماری خوشیوں پر غم کے سائے لہرا رہے ہیں ہماری شراب غائب۔ یہی واقعی شراب نہیں رہ پائی اس میں آنسوؤں کی آمیزش ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا ذائقہ اور کیف و سرور بھی منکدر ہو جاتا ہے جس غرض یہ کہ اپنے ناسے کے ناخوشگوار ذبوں حالات کی وجہ سے نہ تو ہم پیئے کا لطف حاصل کر پاتے ہیں اور نہ ہی پی کر سیکھنے کا۔

بات صاف ہے لیکن میں نے متعدد کتاب خواں معلمین اور کتاب نویس مصنفین کو فیض کی اس ترکیب (ساغر غائب) پر تہ و غضب کی حد تک تیراٹے اور بیل کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ ترکیب، سخت غلط ہے، بالکل غیر شاعرانہ ہے، زبان سے سراسر ناواقفیت کی دلیل ہے، "دیغہ وغیرہ کتنی جلدی فتوے صادر کر دے جاتے ہیں ہمارے یہاں شعر و شاعری کے بارے میں!!

دل ہی کہتا ہے کہ شعر و شاعری کے بارے میں کاش ہم فنی تقاضوں کی حد تک فرق و تیز کر سکتے فیض کی یہ ترکیب مجھے غلط اور غیر شاعرانہ نظر میں آتی۔ اسی طرح جیسے مولانا حالی کی ترکیب "پیرونی مغرب" (بہ معنی پیرونی مغرب) ضرورت شاعری کی وجہ سے غلط نہیں ہے (حالی کے یہاں ایک حرف بڑھا دیا گیا ہے فیض کے یہاں ایک لفظ گھسا دیا گیا ہے لیکن اس طرح کہ کہیں بھی اصل معنی میں فرق نہیں آتا) میر حسن کا ایک شعر بھی مثال کے طور پر پیش کرتا چلوں

پلا سا قیاساغر بے نظیر

(میر حسن)

پھنسی دام بھراں میں بدرمیر

فیض کی ترکیب ساغر غائب (بہ معنی ساغر شراب غائب) اور میر حسن کی ترکیب ساغر بے نظیر (بہ معنی ساغر شراب بے نظیر) میں مجھے کوئی ترکیبی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارا نظام تلازم خیالات (The Law of Association of Ideas) دونوں جگہ بھر پور طریقے سے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

بہ ظاہر نہ کہہ کر بھی جو بات کہی جاتی ہے شاعری میں اس کی بھی خاص اہمیت ہے اس لئے ہمارے خیال سے شعری دنیا میں ساغر غائب، ساغر بے نظیر، ایسی ترکیبیں اپنے فنکارانہ حسن ترتیب کے پس منظر میں جائز سمجھی جانی چاہئیں۔ لطیف شاعری بین السطوری مطالعہ کے بغیر کسی محسوس ہی نہیں کی جاسکتی۔ یہاں تک کہ غزل کے روایتی شعر بھی بغیر اس وصف کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتے۔ مثال کے لئے مومن کا یہ شعر بھی لے لیے۔

تیرے دل قنبر کی تربت پہ عود چھوٹا ہے

گل نہ ہوں گے شریر آتش سوزں ہو گیا

یہاں دو ایک چھوٹی ڈھننی کڑیوں کو جوڑنے اور ان پر زور دینے سے ہی شعر کی بات پوری طرح صاف، جنتی ہے غالب تو عام طور سے اپنے اشعار میں الفاظ صاف کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تو دو ایک معمولی مثالیں ہی جو اس وقت یاد آ رہی ہیں حاضر کرتا ہوں (حال) کھلاک فائدہ عرض مہتر میں خاک نہیں

شاہ علی اب آؤ پیرونی مغرب کی کریں
بس اقتدائے مصطفیٰ و تبر بوبکی

عجیب گل نے کیا تھاواں پر اغاناں تب جو کہو،

(معتوق نکتہ میں ہے غم دل اس کو نائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

(عاشق کا) رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے

یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے نازکا

ظاہر ہے کہ محذوف الفاظ کو ذہن میں لائے بغیر ہم ان اشعار کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔

جہاں ہم ایک بات اور عرض کرنا چاہیں گے اردو والوں کے لئے جہاں عربی اور فارسی کا جانا بہتر ہے وہیں ان کے لئے کم از کم ایک بڑی بین الاقوامی زبان سے خاصی اچھی واقفیت بھی اب لازمی ہے اول الذکر زبانوں سے ہم نے ضرورت سے کہیں زیادہ ہی اثر قبول کیا ہے اب ضرورت اس کی ہے کہ ہم دوسری عالمی زبانوں کے ادبیات سے بھی خاطر خواہ استفادہ کریں اور اپنی تنگ دنیا سے نکل کر ایک وسیع دنیا میں داخل ہوں مثال کے لئے ہمیں انگریزی شاعری کی یہ بات بھی رشک کی حد تک اچھی معلوم ہوتی ہے کہ وہاں قافیوں کی ایسی سخت گیری نہیں جس سے خیال کی طاقت مجروح یا کمزور ہو۔ انگریزی شاعری باوجود اس کے کہ اس کے افضلیات کا ذخیرہ بہت وسیع ہے اپنے شعر گو پھر بھی کچھ نہ کچھ آزادی اور جھٹ دیتی ہے۔ ہم بھی اگر مخصوص حالات میں تین تالیف میں سماعت کے ساتھ ساتھ بصاحت کے محاسن سے بھی کچھ مدد لیں تو اپنی شاعری کے حق میں ایک اچھی بات ہی کریں گے۔ کم از کم ہمیں اتنا تو کرنا ہی چاہئے کہ اپنے سماعت کے معیار اور اصولوں کو وسیع کریں اور انہیں پکھل کر بنائیں۔ انگریزی شاعری سے ہم تمثیل نگاری، علامیہ نگاری، طرز اظہار کے نئے سانچے اور صنعت منقولہ (Transferred Imagery) کے میدان میں بھی بہت کچھ سیکھ کر اپنے شعری تصور کو وسیع کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ بھی درج ہے کہ ہم نے یہ بات کسی طرح کی مرعوبیت یا ذہنی غلامی کے تحت نہیں کہی ہے بلکہ اپنی ذہنی آزادی پر ایک گہرے اعتماد کی وجہ سے کہی ہے جس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آئین نوٹ نہ ڈکر اور۔ فرز کون پر شا ڈکر ہم سیکھنے سکھانے کا عمل بروقت جاری رکھیں۔

فیض نے انگریزی ادب سے بھی بہت ساری اچھی چیزیں لے کر اور انہیں ایک تخلیقی پیکر میں ڈھال کر اردو شاعری کے دامن کو ضابطہ طور پر پزیر کیا ہے۔ فراق صاحب جلد کسی کی تعریف نہیں کرتے ان کی نظریں مختلف زبانوں کے ادبیات میں جن سے وہ بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں اب وہ نیکے موصوف سے بھی کیسے ہی کھول کر فیض کی شاعری کو خارج حسین ادا کیا ہے عالمی ادب کے پس منظر میں انظم۔ رقیب سے۔ کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔۔۔ ٹیکس پیر، گوٹے، کالیڈاس اور سیدی جی اس سے زیادہ رقیب سے کیا کہتے ۶۰

جسے قدما کی دنیا آج کے مقابلے میں ٹھوکتی لیکن انہوں نے شاعری کی پرکھ کے لئے جو معیار قائم کئے وہ بہت وسیع تھے شاعری کے معنی فرضی باتیں بنانے کے نہیں تھے۔ ان کی شاعری اپنے اردو نسل کے ذہان سے عبات تھی شعر ان کے لئے وہ تھا جو عذیبہ داحس اور نگر خیال کی ایک نئی تعبیر ہو سکے بادل کو واقعی دھڑکا سکے اور صاف کا ظہار بھی بے دھڑکے کر سکے چنانچہ وہ زبان دیان کے معاملے میں بڑے فرائڈ تھے۔ سیوا، ایر اور بر حسن، ذرہ کے جہاں اس فرائڈ کی مثالیں ہمیں بہت کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً ستودا کو کثرت سے ہندی، الفاظ استعمال کرنے اور۔ بیہ ہاں۔ و۔ پوشش جینٹ فلم کار۔ وغیرہ جیسی تراکیب وضع کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ ایسا ہی طریقہ میر حسن کا بھی تھا اور

میر کا لوگ بڑا ہی کیا۔ برت ہوتی ہے کد شرفاء کے دور میں بھی شرفاء کی زبان ان کے اسالیب بیان اور ان کا رد و مزہ میر کے کلام کا معیار بن سکے۔ ان کا واسطہ عوام سے رہا اور ان کی زبان انہیں کے بقول جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چلنے والوں سے بنی۔ مسجد کو میر نے سمیت، اور خیال کو اس کی سی۔ دیا کر بھی نظم کیا۔ تربت کا قافیہ میت اور برہم کا قافیہ موسم بھی نظم کیا ہے۔

ایسے ہی میر حسن کی زبان و بیان کا انداز بھی دامن دل کو اپنی طرف کھینچے لیتا ہے۔ الفاظ، تراکیب اور قوافی، سبھی کے برتنے میں ان کے یہاں جو ایک آزادی ملتی ہے وہ بڑی پرکشش ہے۔

کروں اس کی بشواز کیا کیا
فقط ایک پتوڑ آبِ نواں

نئی کہنے چل ری دولتی نہ ہو

کوئی چیز اپنی بگانی نہ ہو !

یہ کہہ اس طرف وہ روانہ ہوا

دل اس طرف اس کا دواں ہوا

خط کشیدہ الفاظ قابل توجہ ہیں اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایک ہی شعر میں ایک ہی لفظ کو وہ دو طرح سے استعمال کرتے ہیں ایک مصرع میں طرف، اور دوسرے میں طرف۔ ان باتوں کو دیکھ کر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان اساتذہ نے زبان کے افلاس کی وجہ سے ایسا کیا، ہمارا خیال ہے کہ وہ پوری طرح ٹھیک بات نہیں کہتے حقیقت یہ ہے کہ ان شعرا نے ارادی طور پر اور ایک بہتر فنی و ادبی شعور کے تحت اس طرح کی آڑ دیا کرتی ہیں۔

قالب کے زمانے میں شرفاء کی نفاست اپنے کمال عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ ناسخ محرم زبان و بیان کی جی بھر کے اصلاح فورا پکے تھے خیالی قافیہ کو کافی رواج حاصل ہو چکا تھا۔ طبعی الفاظ اور عام محاوروں کا استعمال پست مذاقی پر محمول کیا جانے لگا تھا ظاہری آرائش کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ مرزا غالب پر بھی ان باتوں کا اثر ہونے لگا تھا لیکن جلد ہی مرزا کے اندر جو شاعرانہ باگ پڑا اس کے معنی آذنی کو سب شاعری سمجھانے کا قافیہ پیمانی کو۔ اثر آفریں اظہار اصلیت کے باب میں اسے میر ہی کا مستند ہونا پڑا اور کثرت کے ساتھ ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑے جو مرید معیار کے خلاف تھے یہ طور غونہ، مشتے از خروار سے ملاحظہ ہو۔

تھنیا تھک، سو، کو، پرے، چھوٹیں، نا اسید واری، کیو، کیو، تس پر، بیش نہیں، ساغ، کیغنی، جگر... تسی نہ ہوا گشتان ہوا، دہشتی باغ، باغ ہونا، دغیرہ دغیرہ۔

اور یہ کچھ غالب ہی پر منحصر نہیں ہے ہر زبان کے اہل کمال کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ازار کا پڑا ہے۔ مثلاً انگریزی میں ملٹن نے کم بیش آٹھ ہزار نئے الفاظ کا استعمال کیا اور شکسپیر نے تقریباً پندرہ ہزار نئے الفاظ استعمال کئے اور جہاں تک اس کی زبان کا تعلق ہے اس کے بارے میں میل حرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ اپنی تعلیف کے ابتدائی اور انسانی زمانے کو چھوڑ کر باقی دونوں ادوار یعنی دوسیم اور دور چہارم میں اس نے مروجہ زبان و نحو کے سارے زمانے ہائے ادھر دھڑے پھر بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھ لیا اور آج بھی لوگ بڑی ہمدردی اور خلوص نیت کے ساتھ اس کی زبان و بیان کی ایجادات کے معنی و مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمارے یہاں حال یہ ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کو بھی بندے ٹٹے ناندوں کی دنیا سے باہر جانے کی اجازت کم ہی دی جاتی ہے اور اس کے مفید ایسا ہی شہرت پر بھی برابر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے۔ زبان کے بارے میں اور خاص کر شاعری کی زبان کے بارے میں ہمارا زیادہ نظر کتنا عجیب سا ہے۔ اسے ہوا دینے میں ہمارے بعض چوٹی کے صحافیوں کا بھی بہت ہاتھ ہے، ہمارے ادب میں ایسے صحافی کم نہیں ہیں جو شعریت سے توجہ بہرہ میں لیکن جو شعر پر اصلاح دینے کے معاملے میں اور بڑے خود شاعری کا مثالی نمونہ قائم کرنے میں بہت پیش پیش ہیں۔

ہمارے آج کی دنیا تیزی سے سگڑتی اور تنگ ہوتی ہوئی اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ ہر ایک مخصوص ملک کے شہری ہوتے ہوئے ایک پوری دنیا کے باسی بھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اپنے معیار شاعری میں اب تک ہم بہت ساری رجعت پسندیوں کے مارے ہوئے ہیں اور فیض کی شاعری پر بھی بیشتر اسی قبیل کی تنقیدیں کی گئی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ویسی سی ہائے کرنی پڑتی ہے جیسی کہ شہرِ نیک شاعر نے ایک مرتبہ اپنے شعر کے مقدر پر کی تھی کہ:

شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد

ہمارے کچھ نخلوں نے فیض کی شاعری کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے ان سب کا جواب اس چھوٹے مضمون میں تو نہیں دیا جاسکتا لیکن پھر بھی دو چار خاص خاص اعتراضات کا جواب دے لیجئے۔ یہ اعتراضات کچھ اس قسم کے ہیں۔

طیلاً بزم چراغوں رہتی ہے اک طاق آریوں ہے تو کیا

افترض یہ ہے کہ یہاں ”چراغوں“ کا غلط غلط طریقے سے استعمال ہوا ہے جواب میں مختصر یہاں اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ مرزا نثر کو تو ہم فاضی داں مانیں گے ہی جس پر ان کو ہمیشہ اصرار رہا۔ موصوف نے اس لفظ کو متعدد مواقع پر استعمال کیا ہے یہاں ان کا یہی شعر زمین میں لایے ست

مرت جوں بیے یا کر کو بہان کے ہوئے

موش قدرت سے بزم چراغوں گئے ہوئے

موشگافیوں سے علیحدہ ہو کر غور نہ کیئے اور دیکھئے کہ فیض کے یہاں چراغوں کا استعمال بہتر ہوا ہے یا نہیں؟

طیش کی آتش جہر کہاں ہے لاؤ!

افترض یہ ہے کہ آگ کے لئے جہر کی صفت کا استعمال غلط ہے چھپچھپے عرض کرنا ہے کہ جہر۔ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی اپنی طرف پھینکنے والے کے ہیں۔ اردو میں بھی یہ لفظ انہیں معنوں میں رائج ہے جسے ”شکر و مرز“ یعنی وہ شکر جو سبھی کچھ اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے فیض نے بھی جہر کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے مفہوم یہ ہے کہ اپنے اندر جہر طیش کی وہ آگ (جذبہ پیدا کرو جو ساری مخالف قوتوں کو اپنے اندر کھینچ لے۔

”آپاؤ میں نے پھیل دی آنکھوں سے غریب چال“

اس پر اعتراض یہ ہے کہ کھینچ کر کوئی درفت ہے کہ اس سے غم کی چال پھیل گئی۔ یہاں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ شاعری کی دنیا میں کیا ایسی ہی منطق سے کام لیا جاتا ہے؟ اگر شعر و ادب کو ایسی ہی نظر سے پرکھا جائے تو شک و شبہ ہی ”اور“ پورے آدھی اور سمندر لگا لگا The end of the world! جیسے شاہکاروں کا کیا ہوگا۔ کیا یہ ذہل پرانے یا فترت تعانیف پکا کر چینک دینے کے قابل ہیں؟ ایک آدھی چھلی سے بات چیت

لیکے کر سکتا ہے یہ بات دھیرے کے لکھا جھکتے کی ہے نہ کہ اعتراض کرتے کی۔ اگر ہم ایسی ہی واعظانہ منطق سے کام لیں تو شاید ہماری ساری شاعری ہی مایا سمیت ہو جائے گی پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ نظریں تیر کیسے ہو سکتی ہیں۔ معشوق انسان تک، دہن اور ایسا تنگ کر گیا ہے۔ آج ہے۔ ایک مرد گھوڑی کو پیٹنا ہم کیسے دے سکتی ہے۔ اور ع

کئی نے یہ سن کر تمہیں کہیا
تیرے ہوتے ہمارے بھان گردش کتابت (قیال)

یہ ساری باتیں درست کیسے ہو سکتی ہیں

ہاں تو غم کی چھان کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ شاعر مایا سم کو اپنے تصور کی دنیا میں مجسم و عکاس ہے اور یہ بھی غموس ہے۔ ہاں کہ اس کی آنکھوں پر غموں کی کشتی نہیں چھائی ہیں اپنے اس غم سے وہ اپنے حبیب کو غم کو نہا نہیں چاہتا اس لئے اپنی آنکھوں سے اس غمیں کیفیت کو دھڑکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ یہ کہتا ہے کہ اسے دوست اب تو تو آہی جا۔ رکھ کے میں اب خوش ہوں میں نے اپنی آنکھوں سے غم کی چھان یہ میل دی ہے غم کی تہیں اور غم کی کیفیتیں دور کر دی ہیں۔

دیا رمن کی بے صبر خواہنگاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلائے رہے

اپنے بے خواب کوڑوں کو معش کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئیگا

بے صبر خواہنگاہوں اور بے خواب کوڑوں پر یہ اعتراض ہے کہ یہ ترکیبیں بھونڈی ہیں۔ غزوہ کے کون تراکیب میں صفت منفور (Tum akele khatun) کا غیر معمولی سن نکھر آیا ہے۔ ہمیں یہ بھی کہنا ہے۔ فریڈن ٹیس کی جیتی جاتی اور مذکورہ بالا ٹیکل تصاویر سے جیتی جاتی تصویریں ہمیں اپنی شاعری میں غائب بیٹے، فزکار کے یہاں بھگت سے جیتی ہیں مثلاً انہوں نے متعارف دئی۔ گوش بہت۔ جنت نگاہ، فردوس گوش، وغیرہ۔ فیض تک آتے آتے اردو شاعری میں ایک سن یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ یہ تجدیدی انداز فکر آسمانوں میں اڑنے کی بجائے ہمارے پس و احساس اور ہماری آپ و خاک۔ دیوانہ کی دنیا سے پیوست ہو گیا ہے فیض کے یہاں ہمارے احساس یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ اگر ہمارے لئے کوئی بہشت ہے تو وہ صرف اس دھڑکی اور اس مادی کائنات کی ہی بہشت ہے۔

ہم پلے آئے لالہ یہاں تک قدم
لب پہ حرف غزل دل میں قندیل

یہاں یہ انتہائی کیا گیا ہے کہ غزل سے پہلے حرف کا جو لفظ آیا ہے وہ جتنو قیاس سے ہمارا شاعری احساس یہ کہتا ہے کہ یہاں تک نہیں ہے اور زیر بحث مصرع بھی انتہائی اردو حسین سے "حرف تک منی کھر سخن" بات اور لفظ وغیرہ کے بھی بہترین شاعروں کا مقہوم ہے کہ اپنے دل میں غم کی قندیل روشن کئے ہوئے اور اپنے لبوں پر غزل کے بول لئے ہوئے یعنی اس کے کچھ لفظ سے یا مصرعے لگائے توئے تار یک

راستوں میں بھی ہم متاثران طے کرتے رہے۔

باقی ہے ہودوں میں قوم، نکلت پیدا
رجب لب و زسار سنم کرنے میں گئے

بڑا ہے درد کاغذ یہ دل غریب بھی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمناک رہے

ان اشعار پر غرض یہ ہے کہ یہ تشبیہ لفظی کی بدترین مثالیں ہیں۔ "دانا نیال یہ سہ کر علی میں نو تشبیہ لفظی اور تشبیہ منوی دونوں
بجائے غریب میں۔ مثال میں ایک تشبیہ میں اور اس کے اثر سے اردو میں بھی تشبیہ لفظی، بیشتر شاعر اس سے تشبیہ منوی پیدا نہ ہو سکتے
اور کوئی غریب نہیں ہے یہاں ان اشعار میں انہیں سے تشبیہ منوی نہیں پیدا ہوئی اس لئے انہیں بھی ہم بہت خوبصورت شاعریوں
شمار کرتے ہیں۔

ان اشعار کے متناظر میں "میرا غائب" کا یہ شعر دیکھئے جس میں غصہ کی تشبیہ لفظی ہے یہ بھی اسے بہت سراہا گیا ہے۔

لیتا نہ گرد دل تہیں دیتا کوئی دم بدین
کرنا جو نہ متاثری دن آہ و فغان اور

اس سے بڑی تشبیہ لفظی کی مثال شاید یہاں ہے چہرہ کی اس شعر کہ اگر حسین سمجھتا جاتا ہے تو فیض کے مذکورہ بالا شعروں میں کیا عجیب ہے؟

وہ دن کہ کوئی بھی جب دیر انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

غزلیہ کا یہ ایک بہت ہی پُر آشوبہ کین میں پُر آشوبہ یہ کیا گیا ہے کہ اس میں سوا کا لفظ جو مزید یا اور زیادہ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا
ہے غلط ہے۔ میرا غائب کا ایک شعر یاد آتا ہے جسے پیش کئے دیتے ہوں جب نہیں کہ یہ تشبیہ لفظی ہے۔ جو کہ
صفت کا رتبہ یہاں ذات سے سوا دیکھا
دعا ہے تجھ سے زیادہ تری وفا کے لئے (ادارغ)

بھگی ہے رات فیض غزل ایترا کرد
وقت سرود درد کا جنگ نام ہی تو ہے

اس شعر میں عجیب یہ بتایا گیا ہے کہ ایترا کرد کے فقرے میں بڑی غرابت ہے جو سکتا ہے کہ معترض کی یہ بات ان کے اپنے
محبوب زبان کے لئے نہ سے درست ہو لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی زندہ زبان صرف ایک بندے کے معیار کی زیر نگین ہو کر نہیں
رہ سکتی۔ اردو میں اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اقبال کی یہ سطر اس آدھے لکھنے کے قابل ہیں کہ۔ میں زبان کو کوئی بت نہیں

سمجھتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اسے اظہارِ مطلب کا ایک آسان ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اس روشنی میں بھی جب ہم فیض کے اس شمعہ کو دیکھتے ہیں تو یہ ہمیں نہایت درجہ دکش نظر آتا ہے۔ اس میں دروسے اور بے سادگی ہے۔ ایک والہانہ کیف ہے۔ ایک حقیقی تیر۔ ہے جو بے پایاں خلوص کے ساتھ شمع کے پیکر میں وصل گیا ہے۔ غزل کی دنیا ایک سچی عثمانی دنیا ہے تاہم ایتھرو کے جواز میں خدائے سخن کے یہاں۔ ابتدائی۔ کا بھی فقرہ دیکھئے۔

جس سے انھوں نے فیذیہ کیمیا حاصل

ابتداء پر وہی کہانی کی

تنگنائے غزل میں تو کہیں نہیں بدیدہ اساتذہ کے یہاں بھی ایسی زبان مل جاتی ہے جس میں آپ دودھ جدید کے، ایام غزلیات کے ذیل کے شعور میں پاتے ہیں۔

جان کیا چیز ہے رکھیں گے جسے تم سے عزیز

ہو نہ پاور تو لسی دن ہمیں فرما دیجیو (حیرت)

(حقیقت)

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ ہے یہاں

بُییب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

اس شعر میں یہ خرابی بتائی گئی ہے کہ، نے پینا کوئی زبان نہیں ہے اس لئے فیض کے پاس سے پی ہے۔ کا جو فہرہ آیا ہے وہ بہت بھدرا ہے، شعر ہر جواب ہے یہ کہ غالب کی ایک نہایت مرصع غزل کا یہ دیدار و غور کا تمام کڑے پرست کی زینت بنائے اور ہم یہ فیصلہ کیجئے کہ، شے ہے۔ یا۔ پی ہے۔ اردو جو سکتی ہے یا نہیں ہے۔

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کوئے

آئے وہ یاں خدا کرے میر نہ کرے خدا کرے یاں

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے ستمی حرام

اب وہی دشمن دیتے راحۃ جاں ٹھہری ہے

اس شعر میں معتبر بن کے لحاظ سے یہ انقص ہے کہ اگر ہم کو نویں سے زہد کے معنی میں استعمال نہ کرتے ہوں تو یہ بات یہ نہیں کہرام کے معنی، عزت، تعلیم، توتیر اور بزرگی، وقار کے ہیں۔ شاہ کا کیا ہے کہ جس وشن و شراب کو ایشیخ کے جذبات کا اترام کرتے ہوئے اور اس کے اگر ہم ایشیخ، تعلیم میں بہنے چھوڑ رکھا تھا اب وہی شراب ہماری جان کے لئے باعث سکون و صحت ہے۔ خمریات کا یہ ایک اچھا شعر ہے جس میں ایشیخ پر بھی ایک گہرا اثر ہے

انہو جسم قبا جس یہ سچ کے تازرے

دردِ نقدِ جے سرود سہی نما ڈرت

نماز کرے "کو غلط بتایا گیا ہے ٹھیک ہے۔ نماز پڑھنا" جی جی درجہ ہے لیکن اس موقع پر نماز پڑھے۔" یہ نہیں ہے

یہاں آدمی کو نہیں بلکہ سرو سہی کو حصہ۔ قامت حسن احساس بندگی سے جھکا ہے۔ اس لئے اس موقع پر۔ نماز کرے۔ کا ہی فقرہ زیب دیتا ہے۔ میر و سودا وغیرہ کے یہاں۔ نماز کرے۔ کا موارہ کئی مقامات پر آیا ہے۔ عجب تمہیں کہ یہ احترام فیض کو ملحوظ خاطر رہا ہو

ہر شب وہ سیر بوجہ کہ دل بیٹھ گیا ہے

ہر صبح کی اوتیر سی سینے میں لگی ہے

یہاں اعتراض یہ ہے کہ دوسرے مصرعے میں سی کا لفظ غلط طریقے سے نظم ہوا ہے لیکن ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ سی۔ کے معنی "مانند" کے ہیں اور یہ بات بالکل صاف ہے۔ میر حسن کے ذیل کے شعر میں۔ سی کا استعمال مشابہت ہی کے لئے

ہوا ہے

دہلی سی ہر سمت پھرنے لگی

درخوں میں جا جا کے گرنے لگی

تیر سی۔ کا بہت چھا استعمال سودا نے ہی کیا ہے عزیز بن و بیان دونوں کے لئے سن کا کلمہ رکھا ہے

ہمارے سر جام ویزا گزرے ہے

نسب تیر سی سینے کے پر زے ہے

کہ دن پہ کس کس کا نشانی ہے کون سے نام پکڑ گئے ہیں

اس پر غرض یہ ہے کہ نام بھڑ گئے ہیں۔ کا فقرہ محنت زبان کے دائرے سے کس قدر خارج ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی

ہم تو جی بھگتے ہیں کہ یہاں خیال کی پوری صحت کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

بچے سے سرست نام روشن شاعری پا جو گیا

صوفی دیر کے لئے یہاں نام روشن ہو گیا، کا کئی گراں طور مشابہ اور یہ سوچئے کہ اس کے برعکس خیال کو ہم کسے ادا کریں گے؟ اگر یہ کہیں کہ نام مٹ گیا۔

تو اس میں اندوہ کیفیت ہے اور یہ اس کا ٹھیک انت نہیں ہے اس کی صحیح اور مناسب ضد (Antonym) نام بچ گیا ہی سے زبان میں اتنی

دست و دہائی ہی چاہئے کہ وہ ہر طرح سے بڑیے اور مردہ کے احساس کو ادا کر سکے اس ماری ضرورت نے انت اور خیال کی کچی ترجمانی کے زیر اثر ہم یہ

بھگتے ہیں کہ فیض کا یہ فقرہ کہ۔ کون سے نام بھڑ گئے ہیں۔ زبان میں نئی دست پدا کرنے کی حد تک ہم اور صحیح ہے

آجاؤ افریقہ۔

آجاؤ میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ

یہاں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ۔ ڈھول کی ترنگ سنا۔ پریشان گفتاری کی دلیل ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اس کا انداز بیان سے مصرعہ

کی تاثیر میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے حواس غصہ بے ہوا، ہر تو الگ الگ ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ ایک ہیں چنانچہ احساس نامیہ اشخاص (مثال کے لئے

Hellen Kelland) جیسی شخصیتیں انٹرنس سے وہ کام لیتے ہیں جو دوسرے نفس سے لیتے ہیں غرض یہ کہ ہمارے مختلف حواس متضاد نہیں

ہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے امدادی اور تکمیلی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیض نے یہ نظم اس وقت کہی ہے جب وہ منٹگری جیل میں ہیں۔ مادی

وہ اتنی لمبا تھوڑے تو وہ ملحق و میری دنیا سے الگ دوسرے تھے میں لیکن زمینی و دماغی لحاظ سے وہ خود کو ساری دنیا کے ساتھ ہم آغوش محسوس کرتے ہیں۔ بنیادی آدمی کا احساس کند ہو جانا ہے وہاں فیض کو اس اندھی تیز اور شنس ہو گیا ہے اب ان کے اپنے دیگر اثرات ان کے اندر ایک غیر معمولی طاقت پیدا ہو گئی ہے اور ان کی عشق و فانی شدہ سے شدید ہو گئی ہے چنانچہ اس "تند و محسوس حالت میں جس وہ افریقہ کی آواز پر لپک رہے ہیں۔ آج اوں نے سن لی ترس و معلول کی ترنگ" ڈھولوں جیسے ان کی آنکھوں کے ساتھ رہا ہے۔ اس کی تیز و ترنگ کو وہ تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کی پرورش کو اپنے تصور کے کالوں سے سن رہے ہیں۔ ان دونوں کیفیتوں کو انہوں نے نفسیاتی بنیاد پر ترنگ سننے کے فقرے سے نکال کر پڑھا چاہا ہے۔ حدیہ نفسیاتی نگاہ میں مصرعے کی اور اس کے ارتکاز خیال کی محنت کی دلیل ہے۔ محسن کا یہ انداز ہماری روایتی طرز کی شاعری میں ہی کہیں کہیں جھلکتا دکھائی دیتا ہے

بہت ہے نظم کے دست بہانہ جو کے لئے

جو چند اہل بیوں تیرے نام لکھا ہیں

بتے ہیں اہل بولس مدعی مہی منفی بھی

کے دلیل کریں کس سے منفی چاہیں۔

ان اشعار میں یہ نفس بتایا گیا ہے کہ وہ اس اور چاہیں۔ ایک دوسرے کا قافیہ نہیں ہو سکتے۔ یہیں یہ کہنا ہے کہ قافیہ معمولی کثرت کے ساتھ اردو شاعری میں رائج ہے۔ علامہ اقبال کو کچھ اس سے بھی آگے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً ان کا یہی شعر ملاحظہ فرمائیے

وہ دن گئے کہ قید سے میں آئیتہ تھا

زیب و رشتہ لور مرا آشفیہ تھا (غزل، اقبال)

ساتھ ہی یہ کہہ دینا بھی مناسب نہ ہو گا کہ فیض کے یہ اشعار نئی شاعری کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں شاعر کو اپنے موضوع کے لحاظ سے ہیئت اختیار کرنے کی آزادی ہوتی ہے اس پر بھی یہ امر کہ اس نے عام روایات کی حرف بہ حرف پابندی نہ کی۔ ایک بے غل بات ہے۔

ان باتوں کا سلسلہ ہم اب انضمام کے دو ایک خاص اعزازات کا ذکر کرتے ہوئے ختم کرنا چاہیں گے۔ اثر صاحب گونا گوں شیعوں

سے تیار ہے ایک محترم اور قابل قدر شخصیت میں۔ انہوں نے فیض پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ یقیناً احمق ہیں۔ بعض نے ادب و شاعریات

سے فیض کی تعلیقات کو ایک معمولی ادبی نظم قرار دیا تھا بلکہ ان کے پس منظر اس نظم کی داد دی ہے اور اس انداز سے امر کی باز آفرینی و

تعمید کی ہے وہ ایک قابل قدر فن پارہ ہے لیکن جو باتیں مجھ میں نہیں آئیں ان کا غور نہیں، اس صاحب ہی مستحکم ہو۔ یہ موصوف نے فیض کی

شاعری کے بعض پہلوؤں کا بہت سے برتر جائزہ دیا ہے لیکن جہاں انہوں نے فیض کے انداز بیان کی اور ان کی زبان کی اصلاح کی ہے وہ بالکل

باتیں بالکل ہی کیفیت ہو گئی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ وہ شاید مجھے یہ کہنے کا شکر اٹھائے تجربات اور نئے پھیلے دنیا لالت کو پرانی زبان میں اور پرانے

انداز بیان میں ادا کیا جائے گا۔ ہمارے خیال یہ ہے کہ ایسا سوچ نہیں سکتا۔ ادب زبان اور انداز بیان یا بعد میں نہیں ہیں۔ یہ بدعتی ہوئی

زندگی اور مسائل کے یہی ترجمان ہیں اس لئے لازماً تفسیر پذیر بھی ہیں۔ ادب و شعر کے اصناف کا شعور ہمیشہ میں نہیں رہے گا بلکہ کہ پہلے

رہا ہے یا عیاں کہ اب ہے۔ ہاں تسلسل کا سبب بھی اہم ہے۔ ماضی سے زندہ روایات خاص کر کے حال و وقت کی قیہ کی جدوجہد میں نئے

ادب کی اپنی ہی ایک شکل و انفرادیت متعین ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ضرورت زمانہ کے ساتھ ساتھ زبان و بدعتی میں زبان و ادب کے

مواہرہ و ہیئت میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اصناف شعری میں بھی نئے تجربے اور بہت سے درستی

تبدیلیاں عمل میں کرتی ہیں۔ ان میں بیت ساری باتیں قابیل تمدن میں، مدتناہی اہمیت کی حامل ہیں اس لئے کوئی قدامت پسندی یا جنت پسند ناکہ نہیں صرف۔ پریشان گوئی، خرافات، یا، کمپلاس۔ کہہ کر ٹال نہیں سکتا۔ جب مارے یہاں کوئی شاعر معنویت، واقعیت، مومنو معانی حقیقت، شاعرانہ صداقت اور زندگی بخش جوائیائی کیفیت کی طرف بڑھتا ہے۔ ان کا فنی اظہار کرتا ہے، لیکن شعریں انہیں پرستے ہوئے اگر روایت قواعد میں رہے دراصلی تعریف سے کام لیتا ہے تو ہم اس کا احتساب انتہائی درجے کی سختی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم تاثر کو نہیں دیکھتے بلکہ زیادہ تر الفاظ کے حوالہ کو بھی دیکھتے ہیں مثلاً فیض کے یہ چند شعر لیتے ہیں

غم میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں نہ بھٹا کی تاکید اب کے
چاند کو کھاتری آنگوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے
پیرت عجوبہ جانیں گی تمہیں جو بوا تیر جلی
لاکے راکوسرٹن کو بٹی خورشید اب کے

غزل کے اشاریاتی مضامین اور اس کے مخصوص لب و لہجہ اور زبان میں ایسے کہ نئے و دہشت استعاروں اور نئے و تازہ ڈاکٹر انما ہیں میں شاعر نے یہاں آگے بڑھنے کے معنی وہی ہیں وہی حالات کا ذکر بہت کامیابی کے ساتھ کیا ہے ان اشعار میں معنویت، شعوریت و تاثیر ہے۔ اور ایک آفاقی، عذابی، لیکن ان باتوں کو نہ دیکھ کر عادتاً ہم پہنچے قافے ہی کو دیکھتے ہیں۔ اگر آپ نے بھی ان اشعار پر گہرا اسی حور سے کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ "ناپید" تاکید و یوید "و دیگر قافیہ نہیں ہو سکتا۔ جاری گزارش یہ ہے کہ قافے کے ایسے صولی رشتوں اور اس صولی مٹ سہوں کو بھی جائز سمجھنا چاہئے وہ اشعار میں یا مضمون کی اور فنی و فنی کیفیات کی موثر ترجمانی کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ باروں میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ بحر کے ساتھ اکثر دین کی تید ویسے ہی کیا کہ ہے کہ قافے کی عام و صولی پابندی کے بجائے۔ اس کی مد سے سوا سختی ہیں اس پر مسلط کی جاتی رہے۔ اس سختی کے ساتھ قافے اور دین کے بعد و صولوں میں جو اپنے لئے غلطہ پات ہیں انہیں کوئی شاعر اپنے دل کی بات پوری طرح کہوں گرا دے سکتا ہے اس کی معنوی عظمت کو ایسی قیود میں رہ کر کیونکر برقرار رکھ سکتا ہے۔ یہی صورت میں نتیجہ پھر بھی ہوگا کہ قافے ڈھونڈ ڈھونڈ کر "شہید نازکی تربت کہاں ہے" کے مہار کے شعر کہے جائیں گے۔ شاعر فنی رحمت سے گلو خلاصی حاصل نہ کر سکے گا اور اپنے دل کی بات پوری طرح نہ کہہ سکے گا۔

اب رہی یہ بات کہ قادر الکلامی پیدا کی جائے تو "مختار" قافیہ اور مضمون "میں ایسی رسم کشی کا احساس پیدا ہو گا تو ان کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ بات محض ایک ادھر وں سچائی ہے۔ ہر طرح سے سچ نہیں ہے۔ غالب ایک قادر الکلام شاعر تھے لیکن قافیہ کی بات گیری کا احساس اکثر انہیں بھی نہیں رہا اور یہ بات پر داشت نہ ہوئی تو انہوں نے "تبدیلی کر رہی"۔ "تقویٰ"۔ "کو تقویٰ"۔ "یٹا کے" چھوڑا دیا یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے تو معنویت فروع ہوتی ہے اور نہ نزل فروع ہوتا ہے

دل گر کا وہ خیال نہ رہے غریبی

گفتن ہمارے سر زبانی تو نہ ہو

دوسرے انداز کے یہاں ہیں ایسی مثالیں ملتی ہیں اور جہاں تک ترنم، غنائیت و موسیقیت کی بات ہے اس کے بارے میں

یہ عرض کرنا ہے کہ یہ شمولیات ہمیشہ کاغذی بند سے نہیں پیدا ہوتیں۔ ان کا تعلق لفظی سمیت یا کم بقیت قواعد، ذریعہ سے زیادہ مسنویت سے ہے۔ ایک جذباتی فننا اور تاثرات صمود سے ہے خاص طرح کے تخلیقی طرز فکر طریزان اور شعری لے سے ہے۔ انہیں کے فیوض سے ہمارے شریں اور ہماری پابند شاعری آج بھی تابندہ و صبر ہے شاعری میں یہ شعری کے ہی سب سے زیادہ اہم پیر ہے اور ہمارے پرانے قادر العظم شعرا مثلاً سعدی، خضر، یانچاگان، میر، میر حسن، آتش، انیس اور مرزا شوق وغیرہ نے شعری لے اور صوبائی و اسن کو لفظی میر میر سے زیادہ اہم سمجھا ہے غالب کے بیان تقویٰ کا نمونہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ ایک درشت لیں اور ملاحظہ فرمائیے کہ

قتنا لکھی آکھم اس گل کی بو

نہ پانی و نہ شہر کی اپنے یو (میر حسن)

لے ہاتھ میں بیٹے مال نہیں

چمن کو لکس دینے بسا نہ (میر حسن)

کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانے

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا بانیں (مرزا شوق)

اس قدر پیار سے سے جان چہاں رکھا ہے

دل کے رخسار پہ اس وقت حرفی یاد دہاتہ

یہ گون ہوتا ہے گریہ ہے ابھی شام ذوق

ڈھل گیا پھر کائنات آج ہی گن و سلی رات

ایسے پرناثیر انداز بیان پر بھی یہ اعتراض ہے کہ "وہ ایک رضا"۔ مہمل و بے معنی فقرہ معلوم ہوتا ہے۔ بڑی آسانی سے۔ دلچسپا ہے کہ یہ کہتے تھے۔ بدلت پسندیدہ و معنی نیا ہونا چاہتے۔ بدلت نفس بدلت کے سے گن نکلن تک نہیں پہنچاتی۔

افسوس ہے کہ ہم اس تنقید سے ذرا بھی اتفاق نہیں کر پاتے۔ اب اس نے کیا کیا بائے کہ جو فقرہ زبیر کی جان تھا وہی محبوب ٹھہرا یہ مصرعے جس نظم سے لے گئے ہیں اس کا عنوان یہ ہے۔ یاد آ رہا آج دسویں پانچوں دل میں آئی ہے اور اس سیرال مغییب (داع) کو زیادہ سے زیادہ سکون بخش دینا چاہتی ہے۔ پیار کے امانت دہنے پر سے وہ دل کے رخسار پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی ہے اور عاشق کو گویا سب کچھ مل جاتا ہے اسے امانت دیکھش کے لئے ہم شکر و حمد پاس ہے۔ لطیف بہت کا پورائشتم انکھوں میں کینچ جاتا ہے دل کے رخسار کے بغیر یہ لطافت، یہ کیفیت اور احساس و خیال کی یہ پوینا تصویر پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر یاد آ رہا تھا، آواز کے سائے، ہونٹوں کے سراپ وغیرہ کی خیالی صواتیں اُردو دلکش اور قابل قد میں قتل کے رخسار کی تھال بھی واضح ہے اور قابل ستائش ہی

مہر جمالہ شائوں سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تکنیکی اور تصوراتی انداز بیان میں فیض کو ایک ناس کمال حاصل ہے الفاظ کو جکا دینا۔ انہیں متحرک بنادینا اور چند فقرہ میں نیائی کی یقینی تصویر کھینچ دینا ذہن کا خاص کارٹ ہے۔

ہر جاہ لڑکچارہ گری سے گریز تھا
دہن میں جو دکھ تھے بہت لادوانہ تھے

• دکھوں کا بہت یا کم لادوا ہونا کیا۔ بہت کی جگہ کوئی بہت ہوتا •

دہن میں جو دکھ تھے کوئی لادوانہ تھے

آخر صاحب نے ایسے ہی متحدہ شعروں کی اصلاح فذائی ہے لیکن تقریباً ہر ایک میں خصوصاً اس سے جاندار نفوس و معرے کمزور ہو گئے ہیں۔ ایک شاعر کا مخصوص طرز بیان اور اس کے تخیل و تجربے کا اظہار محض نثری صحت سے بڑی چیز ہے فیض کی مذکورہ بالا بہت لادوا کی ترکیب قواعد کی رو سے ہو سکتا ہے تنقید نہ ہو لیکن شاعری زبان کے لہذا سے دست ہے۔ یہ ایک جذبے کا پرجوش تخلیقی اظہار ہے۔

*I loved my friends, forty thousand brothers
not with their quarrels of love, Make
up my sum.* (Hamlet, Act V Sc 1)

لہذا *forty thousand brothers* کی بجائے صرف *forty* بھی رکھا جاسکتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس ترجمہ سے جذبے اور احساس کا تصور بدل جاتا ہے کمزور ہونا ہے اسی طرح بہت لادوا میں شدت احساس کی جو کیفیت ہے وہ کوئی لادوا میں نہیں پیدا ہو پاتی۔ اب رہی گرامر کی بات تو تنقید کے اس فرقے پر ایک ملکی سے نظر ڈال لیجئے:-

This was the most unkindest cut of all (Hamlet, Act III Sc 4)

فن کی زبان میں جب ایسی ترکیب یک صحیح ہے تو شاعری کی زبان میں بہت لادوا کی ترکیب کیونکر غلط ہو جائے گی۔

میں نے اپنے قصا کے حوالے بھی کافی دئے ہیں۔ ان سے میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ زبان اصل میں جذبات و احساسات و خیالات کا وسیلہ اظہار ہے جو سماجی اور شعوری تبدیلیوں کے ساتھ خود بھی تبدیل ہونے پر مجبور ہے۔ اس ضمنی معلومات بھی اس پر اثر انداز ہو رہی ہیں مثلاً یہ کہ اضافیت کا اثر ہمارے دماغ کو متاثر کرے ہمارے طریقہ فکر اور زندگی پر پڑے مگر ہماری زبان و بیان پر نہ پڑے۔ یہ ایک تاریخی بات ہے

ہماری ذہنی دنیا اور شعور تیزی کے ساتھ وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہمارے ماحول بھی شدت کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں ایک عامی و ذوق بہرہ مند ہم پر مسلط ہے بین الاقوامی مبادیات ہم اشد طور سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان سے روزانہ ہماری تقدیر میں یا بگڑ رہی ہے۔ نفسیاتی پیچ اور گھٹیاں ہیں آج ہماری زندگی میں اس کثرت کے ساتھ ہم جن کی پسند کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہماری زبان اس تیزی کے ساتھ نہیں چلی ہے جس تیزی کے ساتھ ہمارے ماحول بڑھ رہے ہیں۔ ہماری ساری ذہنی کیفیتوں کی ترجمانی کے لئے یہ ایہ اظہار کی ضرورت قدمائے زمانہ سے جتنی شدید تر ہے اسے اتنی زیادہی تفادات اور اختراعات کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔ ہاں اس امر میں مذاق سلیم اور سلیقہ ضرور ہے۔

زبان و بیان کے متعلق میں نے جو باتیں کہیں ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ میں پریشان گوئی یا انتشار کا قائل ہوں۔ ایک قاری کی حیثیت سے میں بھی اپنے شعر و ادب کا رچا و دکھنا چاہتا ہوں لیکن ان کا پھیلاؤ معزز تر ہے۔

فیض کے متعلق میں نے اوپر جو باتیں کہی ہیں وہ کسی شخصیت پرستی کے جذبے سے نہیں کہی ہیں۔ فیض کی دنیا طغزل و سحر یا جامد سکندری دنیا نہیں ہے اس کی دنیا تو عام آدمیوں کی دنیا ہے بلکہ پتہ پرچھے تو عوام کی دنیا ہے جہاں مزدور کا گوشت کھتا ہے جہاں قبیضی زندگی کا عام شہوہ ہے جو انیاں مدحوتی اور پیشانیوں پر تدریل سے داغدار ہیں۔ جہاں لوگ یتیم بے آسرا، مجبور و بے بس ہیں۔ ایک دوسرے کے پاسوں میں اور کاغذی آزادی کے لباس میں ذہنی غلامیوں میں پکڑے ہوئے ہیں

فیض کی شاعری ان لوگوں کے لئے جو کہتے ہیں اور انسان بھی فحشر بھی ہے لودہ مرہم آنا بھی!
ان کی شاعری میں زندگی کے خمادے کا صحن میں بہت نکھری ہوئی صورت میں ملتا ہے۔ وہ زندگی کی گندگیوں۔ دندلوں اور تانگیوں سے نیر و آوازوں لیکن ان کی نگاہیں غصہ انہیں تاریکیوں میں الجھ کر نہیں رہ جاتیں۔ زندگی کا۔ ہانا پن۔ اس کی رنگارنگ۔ ایک بہا۔ اس کی بے پایاں خوبصورتی بھی ان کی نظر میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں یہ

آبشاروں کے پیاروں کے چمن نازوں کے گیت
آہنہ بچ کے مہتاب کے سیاروں کے گیت

کی لے اکثر سنائی دیتی ہے۔

اسی طرح ان کے یہاں انہیں آنکھیں، مرمس بازو، آہستہ سے گھٹنے ہوتے ہونٹ وادی کا کھل و غاروں کے فضا سے اور صحن، لہرا کی سچ دھج کی نفاس تیشاں بھی رہ رہ کر جھلکتی رہتی ہیں۔ زندگی کی گھبراہٹ اور اس کے جمال و دلیر و زاہد کبھی انکا نہیں کر سکا۔ قید و بند کی سختیاں بھی وہ اسی لئے جھپٹا رہا کہ زندگی اور بھی زیادہ رفاقت آفریں، سہلائی و دلکش ہو،

فیض کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت اس کی امید آفرینی کی وہ فضا کی ہے جو کبھی سکون پذیر ہوتی ہے اور کبھی تند و تیز لیکن جو اس میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ مخصوص حالات کی پیدا کر دہ فضا کی، وہ ماندگی اور غم کی کیفیت کی بات دوسری ہے ان سب کا ذکر بھی فیض کے یہاں ہے لیکن اس طرح کہ اس سے غم دل سے دھل جاتا ہے اور زندگی اور انسانیت پر اور زیادہ گہرا یقین پیدا ہوتا ہے۔

فیض کے نئے سکون بخش ہیں۔ یہ امید آفریں ہیں۔ افسانہ دوستی کے جذبے سے معمور ہیں اور آفاقی ہیں۔ غم نصیبوں کے حق میں شاید وہ ابھی وہ کام نہ کر سکے جو فیض کے لئے کر جاتے ہیں۔ ان میں انسانیت کا دکھ درد بھی ہے اور رعنائی حیات کا سامان بھی۔ غم غم۔ فیض کی شاعری ایک بہترین دوست اور ساتھی کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنہائی کا ڈسا ہوا شاعر اپنے اہم ترین مسئلے والے انہوں کی موجودگی میں شاید خود بھی تنہا نہیں رہ جاتا اور نہ کسی اور کو تنہا محسوس کرنے دیتا ہے اس کے لئے ملنے ملنے والی حد بندیوں کو پار کر کے۔ ری دنیا میں گوسہ جتے ہیں اس کے اپنے شہر کی بات بھی دنیا کے ہر شہر کی بات ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اپنا شہر ہم سب درد آلود گال کا بھی شہر ہو جاتا ہے

آج میرا دل نکر میں ہے

اسے روشنہوں کے شہر

شب خوں سے مزہ پھر نہ جائے اربابوں کی رز

غیر جو تیسری لیلاؤں کی۔ ان سب سے کہہ دو

آج کی شب جب دئے جلائیں اونچی رکھیں لو۔

(فیض)

اطہر قادری

فیض

عجم جانا لے سے عجم دور لے تک

کسی بڑے شاعر کی شعری تخلیقات کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ بڑے شاعر کے لکری ڈھانچے اور شوق کے پیچھے میں کبھی تضاد نہیں ہوتا۔ یہ بیشک ہے کہ وہ مختلف دور میں زندگی کے گونا گوں اور نئے حقائق سے اپنی شاعری کے تانے بانے تیار کرتا ہے لیکن نغمے کا اتحاد (unity of outlook) اس میں ٹکری بہ راہ روی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ خیال کی رنگارنگی اور بوتلوں کے باوصف اس کے انداز نظر کی زیریں لہر (Under current) ہمیشہ ایک رتی ہے جو بالآخر اس کی تخلیقات کو نقاد کی بھول بھلیوں میں کھو جانے سے بچا لیتی ہے اور راہ کی کٹھنایوں اور تیرگی میں چراغ بن کر منزل مقصود کی نشان دہی کرتی ہے۔ فیض احمد فیض کا شمار ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے۔

فیض کی شاعرانہ زندگی کی ابتدا کب ہوئی، یہ کہنا دشوار ہے۔ مجھے اس وقت اس بحث میں الجھنا بھی نہیں ہے لیکن جب ان کی ریل اور مدھرتاؤں سے ہمارا ایوان شعر و ادب گونجنے لگا تو اس وقت اردو میں ترقی پسند تحریک کو شروع ہوئے بہت دن نہیں گزرے تھے۔ فیض ان لوگوں میں نہیں جو عجم میں اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ فیض کا شمار ترقی پسند تحریک کے بنیادی ممبروں میں ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے جنم لینے کے بعد ادب سے متعلق اپنے نظریات اور اصول و منوال کا کھل کر اعلان کیا، لیکن اس کے باوجود اس امر کے اظہار میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اس کے کچھ نقوش اور یکسر بڑی حد تک مبہم اور اس کے کچھ اشارے غیر واضح تھے جس نے بہت سارے ترقی پسندوں کو حقیقت سے اور ایمان کی پہنچ سے دور رکھا۔ امت کے باوجود غلط راہ پر ڈال دیا۔ جہاں نظموں اور غزلوں میں سستی و سستی کی سیاسی غور بازی اور بھونٹے انداز کے پرہیزگارانہ فنی محاسن کو بیچ چور ہے پر نہایت بے دردی سے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ اور جہاں اس قسم کی چیزیں بھی جانے لگیں کہ کڑی ریل کا پہیہ جام کریں گے

اور—

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماس کو بحرِ وح
وہاں "نغمِ محبوب" کو انتفاہ کی تلقین کر کے "نغمِ دوستان" سے نبرد آزما ہونے اور میدانِ جنگ سے لوٹ کر آسنے کے بعد محبوب کو بیٹنے سے لگانے کا مہجوع بہت سارے ترقی پسندوں کی مشترکہ میراث محض اور رومانیت کی راہ سے انقلاب کی منزل تک رسائی حاصل کرنے کی رسم بھی بڑی حد تک عام ہو گئی۔ قریب تھا کہ یہ رسم ایک دستور کا روپ دھار کر ترقی پسند ادب کے "مینی منسٹو" کی ایک اہم دفعہ بن جائے کہ کچھ یا شعور، یا لٹ نظر اور اہل الرائے نقادوں نے بروقت اس رُحان کی سختی سے تردید کی اور ضربِ کاری لگا کر اس کا سدِ باب کیا۔ فیض کی ابتدائی شاعری کا دستوراً ساحقہ اس رُحان کی غمازی کرتا ہے، اور ان کے پہلے مجموعے — "نقشِ فریادی" میں کچھ نظمیں ضرور ایسی ہیں جہاں رومانیت اور انقلاب کا نظریہ خطِ صلط اور گڈ مڈ ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال میں ان کی دونوں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ ظلم
رستمِ داہلس و کجواب میں جنوائے ہوئے
جا بجا کیے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں نعرے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تمزروں سے
پسپ بہتی ہوئی گتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دل کش ہے ترا من مگو کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زلزلے میں محبت کے ہوا
لاحقین اور بھی ہیں وصل کی راحت کے ہوا
نہجے پہلی ہی محبت مرندِ محبوب نہ مانگ
(غیر سے پہلی ہی محبت مری محبوب نہ مانگ)

تو زخمی بھی ہوئے
دنیا کے علم یوں ہی رہیں گے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن
اپنے کب سے کٹ نہ سکیں گے
(سوچ)

نیک یہ اس وقت کی بات ہے جب ترقی پسند تحریک اپنی ابتدائی منزلوں میں تھی، اور اس کے بہت سارے بنیادی اصولوں کا تھی طرح وضاحت نہیں ہو پائی تھی۔ اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ ہر تحریک چاہے وہ ادبی ہو یا سیاسی، اتفاقی ہو یا تقاضی، اپنے ابتدائی دلد میں دھندلی ہی نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ بہت جلد اس حصارِ فریبِ نظر کو توڑ کر باہر کی صاف و شفاف اور کھلی فضا میں آکر تازہ دم ہو گئی اور ان باتوں کو توڑ کر رکھ دیا جن سے کچھ ترقی پسند ادیبوں نے خم خانہِ ادب کے مختلف طاقتوں کو سجا رکھا تھا۔

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے ابتداء میں فیض بھی کچھ ترقی پسندوں کی طرح رومانیت کو انقلاب کے لئے ہمیز کئے گئے تھے۔ اور دونوں کا الگ الگ تجربہ کرنا کے بجائے رومان سے انقلاب کی منزل تک پہنچنے والے نظریے کے فریب میں آگئے تھے، لیکن ان کے ترقی یافتہ سماجی شعور نے ان پر اس فریب کی محکومت کو مضبوط ہونے نہیں دیا، اور وہ بہت جلد اس لمب کو توڑ کر باہر آ گئے۔ یہاں یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ رومانیت کے لئے ترقی پسند شاعری میں کوئی جگہ نہیں۔ رومان اور انقلاب دونوں ہماری زندگی کا اہم اور سیلو وار حصہ ہیں۔ جس طرح تغیر اور انقلاب انسان کی سماجی زندگی کی تہذیب و تربیت کے لئے ضروری ہے ٹھیک اس طرح رومانیت بھی انسانی زندگی کا بڑا حصہ گوشت ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا ایک نہایت اہم حصہ پھیکا اور بے رونق رہتا ہے۔ انسانی زندگی کا یہ ایک فطری تقاضا ہے۔ ہماری محنت مند روایتی شاعری اور خصوصاً اردو غزل اسی تقاضے کا نتیجہ ہے۔ جب جمالیات کی بنیاد صانع اور محنت مند عناصر پر ہوتی ہے تو ہمیں دلی، میر، درد، آتش، غالب، مومن، حالی، حسرت، وحشت، جگر، مجاز اور فرق جیسے فن کار نصیب ہوتے ہیں۔ لیکن جب رومانی اور جمالیاتی قدیر غیر محنت مند اور مریضانہ شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کا مقصد صرف جنسی یا ذہنی تماش ہوتا ہے تو شاعری ابتداء کے دھندلے میں کھوکھلی کھانے لگتی ہے اور جملات و دماغ جیسے شاعروں کی معاملہ بندی، چھوڑ بھاڑ اور لب و لہجہ کی شوخی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

فیض کی ابتدائی شاعری میں رومانیت کے جو عناصر ملتے ہیں ان سے ان کی محنت مند جمالیات اور شعور حسن کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ حسن کو کوئی غیر مرئی چیز نہیں سمجھتے اور نہ اس کو انسان کے دست رسے کوئی بالاتر شے سمجھتے ہیں۔ وہ حسن کو انسانی گوشت پوست اور اسی زمین کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور اس کو انسانی سماج کی ایک شے لطیف گردانتے ہیں۔ وہ سماج کے دیرینہ اور رسوخہ رسم و رواج اور پابندیوں کے مجال میں جوں جوں سے حسن کے قائل نہیں۔ وہ تو حسن کو فریب سے دیکھنے اور اس کرنے کے قائل ہیں۔ وہ جگر کا وہ بلا پلا کر غم جاناں کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں اور خونِ تناسے حسن کی تصویر میں رنگ بھرتے ہیں: نقشِ فرہادی کی بنیاد فیض ایسی ہیں جو ایک طرف ان کے عہد شب کی پاکیزگی کی تم کھاتی ہیں تو دوسری طرف ان کی بے قرار یوں کی دھنِ احتیاط کی نقاب کشائی بھی کرتی ہیں۔

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھنٹی اور ہے بہت ارشام
آک کچھ دل کی سن سنائیں ہم
آہستہ کے گیت گائیں ہم

(سرودِ شبانہ)

تفاضل کے آغوش میں سو رہے ہیں
 کہتا رہے ستم اور میری وفا میں
 مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
 تمہیں پیا رکرتی ہیں میری دُعا میں
 (انجام)

حُسن کو پانے کی تمنا میں فراق کی پیاد جیسی راتوں کو آنکھوں میں کات کر مٹنے کے آستان تک رسائی حاصل کرنا اور پھر
 اس کو کھو دینا ایسی کیفیات ہیں جنہیں ایک دل گرا خستہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم "تین منظرہ کاشمار اردو کی
 بڑی عین نظموں میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں تین بند درختوں سامنا اور رخصت ہیں جو حسن و عشق کی اوپر بیان کی ہوئی تین
 کیفیات کو ظاہر کرتی ہیں۔ سامنا، اور رخصت " دو بند ایسے ہیں جن پر ہمارا فن بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔

سکامنا

قصتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دنیائیں
 بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، مہتابیں
 کچھ اُلجھی ہوئی باتیں، کچھ بے ہوش ہوئے فتنے
 کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ پھلک جائیں

رخصت

خروہ رخ ہوں ہر اک نیا نیا میسر خاموشی
 تب تم مضمحل تھا، ہر مریں ہاتھوں میں لرزش تھی
 وہ کیسی بے کسی تھی تیری پھر تم کیوں رنگا ہوں میں
 وہ کیا دکھ تھا تیری ہی ہوئی خاموشی آہوں میں

ایک رومانی شاعر جو حسن و عشق کو ان کے سماجی اور تاریخی پس منظر میں دیکھنے کا عادی نہیں بلکہ بہ کہنا زیادہ مجمع ہوگا کہ جو
 اس کا صحیح شعور و ادراک نہیں رکھتا عشق میں ناکامی کا علاج کو خستہ نشینی، صحرانوردی یا پھر زہرِ غم کے سیٹھے ٹھونٹ میں سمجھتا ہے
 یہی نہیں کاشور پہلے اس ناکامی کے اسباب و علل سماجی عوامل میں تلاش کرتا ہے اور پھر حسن پر سماج کی بے جا پابندیوں کے خلاف
 بغاوت کی تحقیر کرتا ہے۔ فیض کا یہی وہ جمالیاتی شعور ہے جو ان کی عشقیہ شاعری کو دوسروں سے میسر کرتا ہے اور ان کے علمِ جاناں
 کو توانائی اور حوصلہ مندی کا اہم عطاکر کے خود کشی کی جگہ جینے پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ ترے حُسن پہ بسپٹی ہوئی آلام کی مگرد
 اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
 چاندنی راتوں کا بے کار دکھتا ہوا درد

دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
 چند روز اور میری جان! فقط چند ہی روز

چاہتے اور چاہے جانے کی تمتلئے رفتہ رفتہ شعور و ادراک کی بامیدگی کے ساتھ ساتھ شخصی محبت سے آگے بڑھ کر آفاقی محبت اور جماعتی چارگی کا احاطہ کر لیا۔ اور آج فیض کی شاعری کا اصل موضوع عوامی محبت اور انسان دوستی ہے۔ اس عوامی محبت اور انسان دوستی نے انہیں ظلم و استبداد اور استحقاقی طاقتوں کے خلاف اُبھارا اور لطیفاتی کش مکش کے آئینے نے انہیں منزل انقلاب کی راہ دکھائی ہے۔ یہی وہ انسان دوستی ہے جس نے ان کے اندر جنگ سے نفرت پیدا کی اور ہزاروں سال ماضی کا اندوختہ سرمایہ علم و فن اور انسانی ہمدردی و تمدن کے تحفظ کے شدید جذبات نے اس کا پرچم ہاتھ میں لینے پر مجبور کیا، اور بالآخر انہیں شاعر امن کا خطاب دلایا۔

فیض نے اردو کی کلاسیکی شاعری کا بڑا گہرا اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ اردو شاعری کی صحت مند اور معارف روایات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے میر، درد، آتش، غالب اور مومن کی جاندار روایات سے صرف کسب فیض ہی نہیں کیا ہے بلکہ انہیں اپنے اندر نہایت حسن و خوبی سے جذب بھی کر لیا ہے۔ جہاں انہوں نے کلاسیکیت اور روایت سے فن کا صحیح انداز اور بوجھ سمجھا ہے اور اس سے پورا پورا استفادہ کیا ہے، وہاں بدلتی ہوئی زندگی کی جدید قدر سے فن اور اسلوب کی مانگ میں نئے انداز سے انشال بھی چمکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بیک وقت قدیم کا تکیہ چاہیں بھی ہے اور جدید کے کڑے تیور بھی۔ قدیم و جدید کے اس خوش گوار اور متوازن فنی امتزاج نے ان کی شاعری میں بڑی چمک، رچاؤ اور باطن میں پیدا کر دیا ہے اور اس باطن میں کا اظہار جس طرح ان کی غزلوں میں ہوتا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔

غزل کوئی فیض کی شاعری کا بڑا طرح دار پہلو ہے۔ جہاں اس میں غم جانان کی کھلائی شام اور شب فراق کی تہ بہ تہ تیرگی ہے وہاں عسبم دوران کی صرغ نشا طبعی ہے۔ اس میں داستان جلوہ جانان کی دودھیا چاندنی بھی ہے اور حدیث دیگراں کے پوچھے کی چھوٹ بھی۔ اس میں خزام ناز محبوب کی سحر انگیز چاب بھی ہے اور رفتار و وقت کی تیز روی بھی۔ اس میں کہیں زلف جانان کا سایہ ہے تو کہیں غم دوران کی ٹھکسا دینے والی کڑی دھوپ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "نقش فریادی" میں "غم جانان" اور "دوران" کے یہ ملے جلے نقوش جتنے گہرے اور دبیر ہیں "دستِ سبا" اور خصوصاً "زندانِ نامہ" میں اتنے ہی مدہم، بے گے اور مٹے مٹے ہیں۔ لیکن فیض کی فنی مہارتوں نے غم دوران میں غم جانان کا رنگ کچھ اس طرح بھرا ہے کہ ایک طرف تغزل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تو دوسری طرف تغزل کے پردے میں "نغمۂ آید در حدیث دیگراں" کے فرض سے عہدہ برا بھی ہو گئے ہیں۔

کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے

وہ آزمائشِ دلی و نگر کی، وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے

کبھی کبھی آرزو کے حواریں آکے کُتے ہیں قاصطے سے

وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی وہ سارے عنوان وصال کے سے

نگاہِ ودل کو قرار کیسا نشا طوغم میں کی کہاں کی

وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بات کی ہے الفت نئے سرے سے

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا کہیں سبک تر کہیں گوارا

وہ درو پہناں کہ ساری دنیا رفتی تھی جس کے ہاتھ سے

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
بکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے تو سے بدن کی سی

صبح بھوٹی تو آسمان پہ ترے
رنگِ رخسار کی پھوہا رگڑی
رات چھائی تو رُوئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار رگڑی

وقفِ حرماں دیاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پکس رہتا ہے

سمتِ مندر و اباست سے نکل آگاہی نے فیضِ کوفن اور اسلوب کا بڑا اچھا ادراک عطا کیا ہے جس سے کام لے کر انہوں نے اپنے خیال و فکر کی جذبیت و تربیت اور آرائش کی ہے۔ ان کی یہی وہ فنی مہارت و صلاحیت ہے جس نے ان کی غزلوں اور نظموں کو خیال اور بے کی مکمل ہم آہنگی بخشی ہے۔ خاص کر غزل کے رُخِ زیبا پر فنی اور اسلوب کا غانہ مل کر انہوں نے اس کو ایسا حسن و جمال عطا کیا ہے جس کی مثال کم شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ اسلوب و خیال کی یہی وہ ہم آہنگی اور سنبلا ہوا امتزاج ہے جس پر ان کی غزل گوئی کا ہائیمین، بوجِ انزاکت اور البیلا بین قائم ہے۔ فنی حماس نے نہ صرف ان کی نظموں کو صریح پرہیزگار بنادیا ہوئے سے بچا لیا ہے بلکہ ان کی غزلوں میں بھی ہلاکی کشش اور ملائکت پیدا کر دی ہے۔

وہ بات سارے سنسنے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ہر اجنبی ہمیں محسوس دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

شبیخ گل ہو کہ شامِ بے خانہ
مدرج اُس رُوئے نازنین کی ہے

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ ملنے کا نام
پھر نظر میں پھول ہیکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

ہے وہی عارضِ یسوی وہی شیریں کا دہن
ننگہ شوق گھڑی بھر کو جہاں بھڑی ہے
وصل کی شب بھی تو کس دریم سبک گزاری ہے
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں بھڑی ہے

تیرے درمک پہونچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے
نہ گئی تیسری بے رخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

اپنی شوق بستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یاد نہیں باقی
تیسری چشم الم نواز کی خیر
دل میں کوئی بکلا نہیں باقی

تجہ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجہ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی
تیرے دست بستم کا عجب نہیں
دل ہی کا فساد تھا جس نے آہ نہ کی

اٹھ کر تو آگئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

جہاں فیض نے اساتذہ کی عطا کردہ تشبیہات و استعارات اور فنی محاسن سے کما حقہ استفادہ کیا ہے اور انہیں اپنی تخلیقات

میں جذب کر لیا ہے وہاں خود بھی نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئی ترکیبیں وضع کی ہیں اور یہ ایک لازمی امر ہے۔ تاریخ ادب عالم اس بات کی گواہ ہے کہ ہر بڑا شاعر ماضی کے جبر کردہ سرمائے سے فائدہ تو ضرور اٹھاتا ہے لیکن وہ اس پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ پرانی چیزوں پر قناعت کرے وہ بنے بنائے حدود میں داخل تو ضرور ہوتا ہے لیکن ان میں مقید ہو کر رہ نہیں جاتا۔ اس کا جینیس (eminent) تمام حدود کو توڑ کر باہر آ جاتا ہے، اور اس کا یہی عمل بالآخر شعر و ادب کے گلستاں میں نئے نئے پھول کھلاتا ہے جن کی خوشبو سے زندگی کی روشیں، دوشک جھک جاتی ہیں۔ اس کے اس عمل کا اظہار خیال اور اسلوب دونوں میں ہوتا ہے۔ نیا خیال اپنے اظہار کے لئے نیا اسلوب ڈھونڈ لیتا ہے۔ جدت اپنے بیان کی لطافت آپ ترتیب دے لیتی ہے۔ یہ بات جس طرح فیض کی شعاعی پرہادق آتی ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ فیض نے اردو کو بڑی نادر تشبیہیں، استعارے اور ترکیبیں دی ہیں۔ ان نئی تشبیہوں اور ترکیبوں کے شانے سے انہوں نے اردو غزل اور نظم دونوں کے گیسو سنوارے ہیں۔ اس کے ثبوت میں یہاں ان کی غزلوں سے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ ان شعروں میں خیال اور اسلوب اس طرح ہم آہنگ اور شیر و فکر ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہے۔

بُٹے نلنر، خیال کے انجسم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری مہفل سے آئے، میں

بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی
جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک ابھی
جب تراغم جگا لیا رات چل چل گئی

صنایئے بزم جہاں بار بار مالد ہوئی
حدیثِ شملہ رقاں بار بار کرتے رہے
انہیں کے فیض سے بازار عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

حبِ اواب سو رہو ہستارو
درد کی رات ڈھل چکی ہے

گر فکر زحمت کی تو خطا دار ہیں کہ ہم
کیوں جو مدبج خوبی تیغ ادا نہ کئے

شاخ پر غون گلِ رواں ہے وہی
شوخ رنگِ گلستاں ہے وہی

کبھی تو صبح تیرے کچ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سیرِ کامل سے شکبار چلے
حضورِ یار ہوئی دفنِ سرجنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

ہم اہلِ نفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

شامِ گلستاں ہوئی حباتی ہے دیکھو تو ہسی
یہ جو نکلا ہے لئے مشبہ رخسار ہے کون

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پر شمع
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دیداد کے

فیض میاں دُکھ اور نظریات کے بہاؤ اور رفتار سے اچھی طرح واقف ہیں اور فنِ کاری کی ذمہ داریوں کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔ 'نفسِ فریادی' کی اشاعت تک وہ غمِ تنہا اور غمِ زمانہ کو ساتھ لے کر چلتے رہے۔ اور قطرہ میں دجلہ کا نظارہ کرنے کو کافی سمجھتے رہے (یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قطرے میں دجلہ دیکھنا بھی ہر شے کا حصہ نہیں۔ یہ بھی بڑی ریاضتِ چاہتا ہے) لیکن فیض کے طبقاتی شعور کی پختگی و بامیدگی نے دفترِ دفتر غمِ تنہا کو غمِ زمانہ میں بدل دیا اور خود کو قطرے میں دجلہ دیکھنے تک محدود رکھنے کے بجائے اسے دوسروں کو دکھانے پر بھی اصرار کیا۔ فنِ کاریِ عظمت اسی میں ہے کہ اس کو فنِ پرانی دسترس ہو کہ وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے نہایت ایمان و داری اور دیانت سے دوسروں تک پہنچا دے اور صرف یہ کہہ کر نہ رہ جائے کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

لیکن فنِ کار کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں بلکہ مجاہدہ بھی ہے۔ اسے اپنے ذاتی کمزوریوں اور المیوں کی حدود سے بچنے کی انسان کی اجتماعی جدوجہد میں شریک ہونے ہے۔ اس کے لئے دریا کی بہروں اور موجوں کو کشا اور طوفان کے زور کو محسوس کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کا رخ بھی اور صیغہ سمجھنا بھی اُس کا فرض ہے۔ اس کا کام طبقاتی کشمکش کا صحیح شعور رکھنا اور انسان اور سماج کی اجتماعی کاوشوں کو بنانا سنوارنا اور آگے بڑھانا ہے۔ اسے عام قومی تعصبات، فرقہ پرستی اور جماعتی رشتوں سے

بالا تر ہو کر انسان کا ناطہ انسان سے جوڑنا اور کائناتی بنیاد پر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانا اور عام انسانی مستحقوں کے لئے کوشاں ہونا ہے۔ قومی اور ملکی عصیت کو بالائے طاق رکھ کر سامراجیت اور ظلم و تشدد کے خلاف ہر آواز کا ساتھ دینا ہے۔ فیض کے یہاں اس نظریہ کی مثالیں وافر ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ان کی تخلیقات کا غالب حصہ اس کی ترجیحی کرتا ہے۔ افریقی حریت پسندوں کا نعرہ "Africa come home" اور ایرانی طلبہ کے نام "دوایسی نفیس ہیں جو فیض کے فن کا رشتہ حیات انسانی کی عالمی جدوجہد سے جوڑ دیتی ہیں، اور فیض کو کسی ایک طبقے کا نہیں بلکہ عام انسانی طبقے اور عالمی امن کا شاعر بنا دیتی ہیں۔ عام انسان دوستی کے لئے فیض کی غزلوں میں جن قدر جھپٹیلی، دھیمی، نرم اور ملائم ہے وہ اُن کی نظموں میں نہیں ہے

ہستم کی رسمیں بہت بھٹیں لیکن نہ بتھیں تری اکبں سے پہلے
سزا حفاظتے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے
نہیں رہی اب ہنوں کی زنجیر پر وہ پہلے اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرپہ دیوانہ پن سے پہلے
غزور سرو و سخن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خشکی والی چین سفتے عذوبج سرو و سخن سے پہلے

رہ حسرتاں میں تلاش بہار کرتے رہے
شب سے طلب حُسن یا کرتے رہے
ہر چاند گر کو چہارہ گری سے گریز بھٹا
ورنہ ہمیں جو دکھ کئے بہت لا دو انہ تھے

جس دھجست کوئی منتقی میں کیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آئی جانی ہے اس جہاں کی تو کوئی بات نہیں
میدان وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

دل نا امید تو نہیں، نا کام ہی تو ہے
بہی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ آیام ہی تو ہے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل منسربہ یہی
تمہارے نام پہ آئیں گے عزم گسار چلے

بیدا کردوں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوٹتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو درد جاتی ہے

فیض کی نظریں آرزو کی بڑی اہمیت اور قد و قیمت ہے۔ شیخ آرزو قلب و نگاہ کو روشنی عطا کرتی ہے۔ وہ دل جہاں آرزو کا گندہ نہیں کچھ اور موسک ہے دل نہیں۔ لیکن صرف آرزو سے کام نہیں بنتا۔ تکمیل آرزو کو عمل درکار ہے صرف بہاری آرزو سے بہا نہیں آتی۔ رہ خزاں میں تلاش بہار کی کڑی مشروط ہے۔ منزل کی راہ مقتل سے ہو کر جاتی ہے۔ آرزو اور عمل کے رشتے کی وضاحت اور قومیہ فیض کی شاعری کا بڑا جاندار پہلے ہے۔ عمل کی تلقین دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اس کی نزاکت اور لطافت فیض سے مخصوص ہے۔

نہ آج لطف کرا متنا کہ کل گذر نہ سکے
وہ رات جو کہ تیرے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیسز ہے مگر مہدم
وصال یا فقط آرزو کی بات نہیں

ہاں جاں کے نیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر ہر جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے

فیض کی مدت شاعری میں 'نقش فریادی' سے 'زندان نامہ' تک کا فاصلہ بہت طویل نہیں، لیکن اس فاصلے کی ارتقائی جست اور منزل کو چھو لینے کی پرداز میں بڑی گیرائی اور توانائی ہے 'نقش فریادی' میں فن کی تکمیل میں وہ گہرائی اور خیال کی پیمائشیں وہ بلندی نہیں جو درست صبا، اور 'زندان نامہ' میں ہے۔ خصوصاً 'زندان نامہ' میں ان کی شاعری فن اور خیال کے لحاظ سے جس معراج پر ہے اس کی مثال اردو شاعری کم پیش کر سکتی ہے۔ اور یہ بات بالکل فطری اور اصولی ہے۔ ہر ادیب کی ابتدائی تخلیق میں بعد کی تخلیق کی یہ نسبت پختگی کم ہوتی ہے۔ فیض کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے بہت کم مدت میں شاعری کی وہ منزلیں طے کر لیں جہاں بہت سارے فن کاروں کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔ فیض کی عموماً شاعری میں ایک شکن دکھائی ہے جس کی طرف سابق میجر عموماً متغی نے بھی بڑی چابکدستی سے اشارہ کیا ہے۔ میجر عموماً 'نقش فریادی' میں تو واضح فن کے تحت لکھتے ہیں۔

• فیض کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوش اور ولولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑک رہا ہے لیکن..... اس کے قوام میں پاکستان کے محنت کشوں کا مبارک پسینہ اور محنت کی حرارت ابھی تک پوری مقدار میں شامل

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

جعفر علی خاں اثر لکھنوی - پروفیسر رشید احمد صدیقی - پروفیسر ذوق گورکھ پوری
 کلیم الدین احمد - مجنوں گورکھ پوری - ڈاکٹر سید اعجاز حسین - عسکری احمد
 پروفیسر اختر انصاری - عابد علی عساید - ڈاکٹر عبادت بریلوی ،
 سردار جعفری - عبدالرحمن چنتائی - احمد ندیم قاسمی

تذکرہ و تبصرہ

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطہ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ فیض نے شاعرت کے جوہر دکھائے ہیں اور مصوم جذبات کو حسین پیکر بنشایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرمیلا کا ایک قول ایک فلسفی فضا میں مست پرواز ہے۔ ایک پرائیم کی پھڑپھڑ ہے اور قوس قزح کے سکاس بادلوں سے سمت رنگی بارش ہو چکی ہے۔ بالکل ایسا منظر جو میں نے ایک شام کو سری نگر سے نشاط باغ ہائے ہوئے دیکھا تھا۔ پانی برس کرکھل نکلتا تھا اور سائے پہاڑیوں پر ایک قوس قزح نہیں بلکہ قطار دو قطار ایک سلسلہ تھا، اور ان سب کو اپنے حلقوں میں لے ہوئے آسمان پر ایک بڑی قوس قزح!

پروفیسر رشید احمد صدیقی

میرے نزدیک ترقی پسند نثر نگاروں میں صرف ذوق اور فیض ایسے ہیں جنہوں نے غزل کو ایک نیا مزاج اور زاویہ دے کر اس کی فنی خصوصیت میں اضافہ کیا ہے۔ گوں کچھ اس طرح بھی کہیں کرتا ہوں کہ یہ اضافہ انشائیہ پسندانہ نہیں جتنا ان عوانہ عارفانہ یا عارفانہ شاعرانہ فیض نے نہیں کیا۔ لیکن فیض کی بعض بعض نظموں میں جو اردو کے بہترین نظموں کے ہم پلور بھی جاسکتی ہیں یہی سبب ہے کہ عید و غزل کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی نظم کی عیال اور زیادہ نکھر اور سنو کر ان کی غزلوں میں دھل جاتی ہیں اور بات میں نے آئینہ کے بارے میں کہی تھی۔

فیض جیسا کہ سب جانتے ہیں اول سے آخر تک شاعر کی ہیں۔ لیکن غزل کا مزاج و مقام جیسا فیض نے بچا ہوا ہے۔ ان کے دو سکریتھوں نے نہیں بچایا۔ فیض کی غزلوں کے مطالعہ سے اکثر یہ محسوس ہوا ہے جیسے شعر کہتے وقت وہ ترقی پسندی اور اشتراکیت کی آرائش خم کا کل میں اتے ہنمک نہیں جتنے اندیشہ ہائے دور دراز میں غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھتے ہیں۔

غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھتے ہیں۔ فیض کچھ کم اشتراکی یا ترقی پسند نہیں ہو گئے ہیں۔ کہنا یہ کہ شاعری میں موضوع کو اس طرح سننا کہ شاعری موضوع اور موضوع شاعر کی معلوم ہونے لگے۔ بڑے شاعر کی بڑی اچھی پہچان ہے۔ جب تک کوئی شاعر اپنا ہونے ہوئے سبک شاعری نہ ہوگا

بڑایا اچھا شاعر نہ کہلے گا۔ ترقی پذیر شاعروں میں یہ امتیاز فیض کے سوا نہ پایا کسی اور کو تیسرے۔

فیض کو میں نے غالب اور اقبال کے قریب بتایا ہے۔ لیکن ایک چیز مجھے دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ فیض کو بان پڑتی دست نہیں ہے جتنی اقبال اور غالب کو کبھی۔ صحت زبان کو اردو و شاعری میں جو اہمیت حاصل ہے فیض نے اس کی طرف توجہ نہیں کی جتنی ان کی شاعری کا تقاضا ہے۔

پروفیسر فراق گورکھ پوری

میں یہ مضمون رواروی اور عین ملائت میں لکھ رہا ہوں اس لئے ان سیکڑوں نظموں کا جائزہ لینا کچھ لمبی محبوریوں سے بھر وقت اور جگہ کی قلت نے ناممکن ہے جو بہت سے اور شاعروں سے ہم کو ملی ہیں جن میں کچھ نہایت لطیف نظموں کے علاوہ کئی مہربانی ہیں۔ لیکن ان سب کا نام نہ لیتے ہوئے بھی پروفیسر فیض احمدی کا نظم جس کا عنوان ہے ”رقیب“ اور جو بہائیوں کے فروری ۱۹۴۷ء کے نمبر میں نکل چکا ہے اس کا ذکر ضرور کروں گا۔ میں بہت کم شاعر کا غور کروں نظموں کے متعلق یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل و دوات کا چور نکالنا نہ یہ نظم ایسی ہی نظم تھی۔ اردو کی شاعری میں اب تک اتنی پاکیزہ اتنی فیصل اور اتنی دوسرے اور مقررانہ نظم وجود میں نہیں آئی۔ نظم میں بہت جلد جیت اور دوزخ کی وحدت کا رنگ ہے۔ شیکسپیر، گوئٹے کا ملی دامن اور سحر کی ملی اس سے زیادہ رقیب سے کیا جیت؟ رقیب کا موضوع اردو شاعری میں بہت بدنام موضوع ہے لیکن فیض نے اسے بے پناہ طور پر خوشتر چھیلا اور پاکیزہ بنا دیا۔ عشق اور انسانیت کے لطیف اور اہم ربط کو کھینچا تو یہ نظم دیکھئے۔ یہ ملکی زبان کی بد نصیبی ہے کہ اس نظم کی غالباً وہ اندر نشانی نہیں ہوئی جس کی وہ مستحق ہے۔ عشقیہ نظموں کو کوئی گھڑستہ اس نظم کے بغیر بے جان رہے رنگ بے گار۔ پروفیسر فیض کا مجبور عجب کی ایک نظم ”رقیب“ کا ذکر آچکا ہے۔ نقش نر-وی کے نام سے نکلا اور اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن اس کا بہت زبردست اثر ملایا شاعری پر پڑا فیض نے اگر احساس کی ایک نئی تکنیک اس میں دی جو اس دور کی ترجمانی کے لئے نہایت موزوں ہے۔ ان کے مصرعوں کی بے پناہ خوشگلیاں مزمرہ (Tilak) ہے اور ان کی فقرہ سازی چمک چمک رہی ہے۔ میں جو بانی و موزو دیتا ہے وہ ان کے اسلوب میں ایک خلافتانہ اثر اور ان کا صورت پیدا کر دیتی ہے۔ فیض نے ایک نیا مدرسہ شاعری قائم کیا۔ شعروں نے جس بعیرت اور زور احساس طرے دکھلائے یا ایک سستی سے شقیہ و ارواح کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا یہ اردو کی شقیہ شاعری میں ایک بانگ کی چیز تھی نئی اور نہایت قدیمی۔ اس موعود میں دس بارہ مصرعوں کی ترقی نظم تنہائی کے عنوان سے تو عقیدہ شاعری کا ایک اقبال فراموش کات مسہم ہے۔ اور یہ نظم ایک زندہ جاوید کلاسک ہے۔ فیض نے ان احساسات کو اور بھی چمکایا جو ان شعراء کی کے قطعات میں قہر تھا رہے تھے۔ فیض کی شاعری آج کل کے مہذب فوجیوں کے احساس اور طرز احساس کا پوتا ہوا سا نہ ہے۔ فیض کی تقلید کثرت سے ہوئی۔ اختر الایمان کا مجموعہ ”گردابِ نایاب“ طرز پر نقش فریاد کی سے قاصر ہے۔ اختر الایمان کی ہولناں آواز میں وہ ٹھہراؤ اور ٹھکرانے کے وہ عناصر تو نہیں آئے ہیں جو فیض کے یہاں ملتے ہیں اور نہ یوست ظفر کے ”زہر خیز“ اور زندان میں فیض کا سنسکارتہ اغلال قمار ہے لیکن اختر الایمان اور کچھ دوسرے شعراء نے جن آواز سے ہمارے نو بہانہ کی پٹی بھٹی اور اقتصاد و رومان کی زندگی کے کھڑا کر پیش کیا ہے وہ موجودہ بھرائی اور عہد کی دور کی بہت حد تک سچی نا املگی ہے۔

کلیم الدین احمد

فیض کے شعر ہی نفس، چین اور حیا — روحانی نفس، چین اور حیا نہیں ہیں۔ اور وعدہ و پیمان بھی نئے ہیں۔ یعنی پرانے فحش کائناتے معزز میں استعمال ہوا ہے۔ یہ گویا ایک پردہ ہی اور پس پردہ نئی سیاسی باتیں ہیں۔ غلامی اور آزادی کی باتیں

ہیں اس لئے پہلے نقوش کی ماحولیت بدل گئی ہے۔ اب شعروں میں رنگ بہا ہاں بزمِ حرفِ خزان، مصلحِ یاراں، مشنِ امنِ چینِ نکتِ دامن گل باد صبا، ننگِ ساون، اے بھان، شاخ گل، نشین، صبح، سحرِ شام کی باتیں ہیں لیکن یہ بدلتی باتیں نہیں۔ یہاں باتیں نئی ہیں، ہونے والے واقعات کی طرف اشارے ہیں پس پردہ سیاسی گفتگو ہے۔ یہ سب سہی 'لیکن ایک کی محسوس ہوتی ہے۔ پہلے ان نقوش کے معنی واضح اور متعین تھے۔ لیکن اب وہ کچھ مبہم سے ہو گئے ہیں ان میں پہلی سی وضاحت نہیں۔ ان کے مذہب و غیر متعین سے ہیں فیض کے شعر میں اسی قسم کی کمی ہے۔ فیض ہندوستان ہے، ان کا نفس ہندوستانی ہے۔ چوندگی ہندوستان ہے صبح چین آزادی ہے، آوازِ ہندستان غلاموں کی آزادی میں مٹا کھٹکے گی۔ 'باد صبا' (EIT GEIST) (روحِ زمانہ) ہے آزادی کی منتا ہے۔ وعدہ دیماں اہل نفس اور بدوصاے ہوئے ہیں باکمی اور سے۔ (کھٹکے گل آزادیوں گے) اس لئے ابھی نید ہے۔ اور نید ہے تو بھر باد صبا سے وعدہ پڑا کیے جوتے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ باتوں کا عالم مذہب و تو سمجھیں، آجائے لیکن پہلی سی وضاحت امد تین نہ ہونے کا وجہ ہے اہمیا جمی ہو جاتی ہیں

جنوں گورکھ پوری

فیض ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظموں میں ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں انھوں نے جاری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں اس واسطے کہ بے بہت سی آزادیاں ہتھیالی ہیں۔ نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن بڑا خود وہ کاشتِ یہ کیف یا کسی شدید قوت کے مالک نہیں فیض کی اہمیت بھی اسلوبی اہمیت پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

پنجاب کی پوری اردو شاعری میں کلام کی اتنی تلیل تمامت پر کسی نے تانا نام نہیں پیدا کیا جتنا فیض احمد فیض نے۔ ان کا مجموعہ کلام فقیر ہے مگر اپنی گو، ناگوں غزلیوں کی وجہ سے جو کچھ ہے انتخابِ علوم ہوتا ہے۔ فنِ کاری اور زبردست تخیل کا انا حسین امتزاج و جدیدیت میں کسی شاعر کے بیان دکھائی نہیں دیتا سیدھے سادے الفاظ کو بغیر زیادہ تشبیہ و استعارے کے شعر کی صورت میں پیش کرنا اور تائید و معنویت پیدا کرونا فیض کا خاص کارنامہ ہے۔ اور یہی فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے جو ان کی نظموں میں قریب قریب ہر جگہ نظر آتا ہے

عزیز احمد

فیض کی شاعرانہ تشبیہوں اور تصویروں کا زندہ گی کی رفتار سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی کامیابی اور خصوصیت ہے۔ تنہائی، درونِ مضموع سخن میں جو غالباً ان کی بہترین نظمیں ہیں یہ خصوصیت، اور نمایاں ہے۔ تنہائی میں استعاراتِ گرد و پیش کا سارا ماحولی شاعر کا ساتھ دیتا ہے۔

ٹوہنِ چکی رات، بکھرے لگاتار دن کا غبار
دُکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چرخ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار

اجنبی خاک نہ دھندلاوے نہ دھوئے لٹو
استعاروں کی سحرکاری، شاعر کے جذبہ کا اتنا ساتھ دیتی ہے کہ خارجی اور داخلی احساس یک ہو جاتے ہیں اور فطرت اور
انسان میں ایک حقیقی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح موضوع سخن میں یہ تئیبہ
ان کا بچل ہے کہ خنسا کہ پیرا ہن
کچھ تو ہے جس سے ہولی جاتی چلن نہیں
اس ایک شعر میں رمزی تئیبہ کی وجہ سے شرفی شاعری کی حیات معاشرہ کی صلہ آباد ہیں۔ کتنی بانڈیاں کتنے
روک، کیسا صدیوں کا مسخ شدہ جمالی میدان اس شعر کے باطن سے جھانکتا ہے۔ یہ غالباً فقیں کا بہترین شعر ہے۔

پروفیسر اختر انصاری

فیض احمد فیض اور ن، م، راشد کی نظموں کے نمونے نقش فریادی اور ماوراءِ حال میں تھے مہنے والی کتا بوں
میں بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ دونوں شاعر اور شاعری کے جدید ترین رجحانات کے اہم نمائندے ہیں۔
فیض اور راشد دونوں اس معنی میں پرانے شاعر ہیں کہ یہ اپنا موجودہ رنگ اختیار کر کے پہلے بہت کچھ اسی پرانے
رنگ میں کہہ چکے ہیں آج سے دس سال پہلے اردو کی نئی شاعری کا عام رنگ تھا۔ یہ بات راشد پر زیادہ صادق آتی ہے کہ
ان کی نظمیں اس زمانے میں بھی اردو رسالوں کے لیے بحث و مباحثہ میں جتنی جگہیں جتنی جگہیں جتنی جگہیں جتنی جگہیں جتنی جگہیں
کے جدید ترین رجحانات کے علمبردار تھے۔ فیض نے غالباً بعد میں لکھنا شروع کیا ہے اور فیض راشد کے بہت بعد شروع ہوئے
مفہوم فریادی میں اور ماوراءِ بین دونوں شاعروں کی پرانی تخلیقات کے نمونے موجود ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ فیض فریادی
میں فیض کے پرانے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں نئے رنگ کی چیزیں کم ہیں اور ماوراءِ بین راشد کے نئے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں
پرانے رنگ کی چیزیں کم ہیں۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر راشد کی شاعری نے اپنے ارتقائی منزلیں آہستہ آہستہ طے کیں تو
فیض کی شاعری نے ایک طویل مدت تک ایک خاص روش پر قائم رہنے کے بعد ایک نکتہ ایک بہت بڑا قدم اگے بڑھایا اور
دفعتاً ایک نیا اور چونکا دینے والا انداز اختیار کر لیا۔

فیض کی شاعری میں یہ اچانک تبدیلی جو ۱۹۵۷ء یا اس سے کچھ پہلے واقع ہوئی تھی ترقی پسند تحریک کے اثرات کا نتیجہ
اسی زمانے میں راشد نے بھی اس تحریک کا کچھ اثر قبول کیا پھر یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک نے راشد کو صرف ترقی پسند بنایا۔ (وہ
ایک بڑا شاعر پہلے ہی تھا)۔ مگر فیض کو اس تحریک نے ترقی پسند بنایا اور بڑا شاعر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر راشد
ترقی پسندی کے اثرات قبول کرنے کے بعد بھی اپنے ابتدائی دور کے روحانی و فرائی رجحانات سے پودے طر پڑاؤ نہیں ہر سہلے
توفیق و اپنی نئی نظموں میں ترقی پسندانہ نظری شعور کا پورا ثبوت دیتا ہے۔

عابد علی عابد

فیض کی شعر گوئی کی خصوصیات کا پورا علم ہمیں ہر سہا ہے کہ آپ فیض سے ملیں اور اس کی ان غلغلہ باتوں سے لطف اندوز ہوں جو جاتی

عبادت، سواض بھری، نیتائی، ندیم

انکار فیض نمبر

مذکرہ و تبصرہ

یہ سراج نرم اور خشک محسوس ہوتی ہے، انھیں کے اشتہار میں بھی جدید کتب کی شہید کیوں نہ ہو کیفیت کتنی ہی نازک کیوں نہ ہو جب وہ ان تمام مصلوں سے گریز چکنی ہے جس میں عمومی طور پر فیض کا تخلیقی شعور کہتے ہیں، تو وہ تھکادی تھکادی دھیمی دھیمی آہیں میں تبدیل ہو جاتی ہے اس کے مزاج کا توازن انھیں کے توازن میں اور تو اگر کب کی شائستگی میں جھکتا رہتا ہے، حیات فیض کو، ہندو عصر کے اکثر شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ درحقیقت جامع معنی اشتہار پر دانا ہے۔ اگر نثر کی شعری روایات پر مطلع غازی غزل کے مزاج سے آگاہ ہو تو لب کی بار کیوں کارا زوار یہی وجہ ہے کہ اس کے بالی کبھی کبھی چڑکھانے والی ترکیب سامنے آ جاتی ہے جس میں ایک جہان معانی پوشیدہ ہوتا ہے اس کے اشتہار میں تشبیہ استعارہ تلخ اور ترکیب جزائے تنجید کا نام نہیں ہوتے بلکہ انھما مطلع کے خوب صورت وسیلے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے جتنی جلدی مکن ہوا اس طبعی نقطہ مستند کے آس پاس پہنچے۔ جہاں سے فیض کی غزل یا فیض کے اشتہار کی کہیں بچھتی ہیں۔

ڈاکٹر عیادت بریلوی

فیض پر دو امتداد کے گہرے اثرات ہیں۔ اس نے غزل میں اپنا پیچیدہ سے پیچیدہ تجربات کو چینی کرتے ہوئے بھی وہ اس روایت کے اثر سے کام لیتے ہیں۔ غزل کی روایت کا اثر نے ایک نئی زندگی دی ہے لیکن نئی زندگی دے کر اسے نئے راستوں پر گامزن بھی کیا ہے۔ فیض کی غزلوں میں حقیقت کے اس اعتراف نے آہستہ آہستہ رومی کو تیرہویں صدی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس سے اُن کے یہاں ایک ہی لے سکتی ہے۔

سردار جعفری

فیض سے اردو میں ایک نئے دبستان شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جدید مزمعیت اور قدیم مشرقیت کا حسین امتزاج ہے جس نے اردو شاعری کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

عبدالرحمن جیعتی

فیض کی انھیں کی فضا اس عالمگیر فضا سے متاثر ہے جہاں اس نے کو اوقات اور اس عظمت سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے جو شاعر کو اور ایک آرٹسٹ کو اپنے فن سے حاصل ہوتا ہے

احمد ندیم قاسمی

فیض کو قاسمی کا ادبی روایات پر بڑا عبور حاصل ہے۔ وہ انھیں اور مزید اور کثرتیں جن سے ہماری کلاسیکی شاعری بھری پڑی ہے۔ فیض کے ہاں تصانیف کا عبور پر معنویت کے ساتھ اس نے نظریاتی ہیں کہ وہ حیرت نوا غالب و مومن کا آزاد اقبال کی قائم کی ہوئی بڑھی ہوئی روایات کا احرام کرنا ہے اور اسے معلوم ہے کہ ترکیب و الفاظ کی بھی ایک تاریخ اور ایک روایت ہوتی ہے اور ہم لفظ کہتے ہیں اور اس کی نازک جزئیات کو سیٹھ ہوسے ہم ہلکے پیچھے نہیں آتے۔ فیض کو الفاظ کی تاریخ کے شعور کے ساتھ ہی مسکرتوں، انسوؤں اور انگلیوں کی تاریخ کو بھی شعور ہے اور یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری حسن معنی کا بڑا حسین امتزاج ہے

فیض اور نئی نسل

نئی نسل کی نمائندگی کو ضروری سمجھتے ہوئے ہم نے پاک و ہند کے تمام کالجز اور یونیورسٹیوں کے طلباء کو فیض احمد فیض کی زندگی، شخصیت اور فن پر مضامین نظم و نثر لکھنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی ہیں ۴۳ مضامین اور ۳۶ نظمیں موصول ہوئیں۔

بہترین مضامین آئندہ صفحات میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان کا انتخاب چار افراد کے ایک بورڈ نے کیا ہے۔ یہ بورڈ سید ابوالنیر کشنی، جمیل اختر اساتذہ شریہ اردو کراچی یونیورسٹی، انجم اعظمی پکڑ گورنمنٹ کالج کراچی اور کشش صدیقی درکن اوارڈ افکار، پر مشتمل تھا۔

بہترین مضامین نظم و نثر پر جن طلباء کو مکتبہ افکار کی جانب سے دوسو روپے سے زائد کی کتابیں بطور انعام پیش کی گئیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

- احفاد ارحمہ دہلہ قانن، سال اول، اردو کالج کراچی۔ پہلا انعام
 - امجد گنداپانی دہلہ قانن، سال اول، گورنمنٹ کالج، قانن۔ دوسرا انعام
 - ساحر الہ آبادی دہلہ قانن، سال اول، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔ تیسرا انعام
 - محمد تقی دہلہ قانن، سال اول، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔ خصوصی انعام
 - سلیم خواجہ دہلہ قانن، سال اول، عبدالمذہبون کالج، کراچی و نظم، پہلا انعام
- دیئے نظم منظومات کے حصے میں شامل ہے،

— ادارہ

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

احفاظ الرحمن

گندم کے کھیت بچوں سے ہاتھ اور شاعری

گندم کے کھیتوں اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھوں سے سب سے محبت کرتے ہیں لیکن جب ایک فن کار ایسی سے اپنی متبعت کا اظہار کرتا ہے تو ہم اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس نے ان کے تحفظ کے لئے اپنے فن کو وقف کر دیا ہوگا۔

فیض کی شاعری کا جائزہ بھی ہم اسی نقطہ نظر سے لیں گے کہ وہ اپنی شاعری کو ایک عمل، ایک ذریعہ، ایک ہتھیار بناتا ہے یا نہیں؟
_____ گندم کے پہلے کھیتوں کی شاہابی اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھوں کی مصروفیت کو دہائی بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا نہیں؟

یہ، زوئی بڑی چیز ہے گرم دم

وصال یا رنقطہ آرزو کی پلٹ نہیں

فیض نے یہ سمجھتے ہوئے شاعری کی ہے کہ صحافت اور خطابت کا اثر ہنگامی اور وقتی ہوتا ہے اور محسوس فنی بنیادوں پر استوار ادب ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اگر ادب میں صحافت اور خطابت کی طرح محسوس واد پر زور دیا جائے گا تو ادب بے جان اور کھوکھلا ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے اپنے مواد کو بیان کی غریبہ رتی، زبان کی چاشنی اور اسماہ کی بلندی سے اسی طرح پراثر بنایا ہے جس طرح ایک گبار مٹی کے بتوں پر غریبہ نقش و نگار بنانے کے عمل میں بتدریج آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ایک عمل کے بعد دوسرا عمل، خاص ترتیب سے کرتا ہے۔ اور اس عمل میں اپنی مدد سمودیتا ہے بالکل اسی طرح فیض نے بھی اپنے اشعار میں اپنی مدد سمودی ہے۔ الفاظ کے تر و بورت اور سلیکے رنگوں سے مدد اشعار پر نقش و نگار بناتا ہے۔ اور یہ نقش و نگار نہ تو صبر ک دار رنگوں سے بنے ہیں۔ اور ان میں کچے فن کا سمونا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فن کی جڑیں مضبوط اور سیاہی و فک اور توانیک ہے۔

اگر مجھ سے چند نظموں میں فیض کی شاعری پر تنقید کرنے کو کہا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ اس کی شاعری اعلیٰ مقصد بلند محفل، گہرے مشاہد اور مضمونی اشعار کا ایک حسین امتزاج ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی مقبولیت اور عظمت کا راز ہی ان مضمونی اشعار میں پوشیدہ ہے جو اس کی شاعری کے بلند مقصد کو واضح کرتے ہیں۔

تیرب ہنٹوں کے پھولوں کی چہرہ۔ میں۔۔۔۔۔ تم
 در کی خوشکھین چہ دار۔۔۔۔۔ گئے
 تیرہ۔۔۔۔۔ باتوں کی صورت میں ہم
 نیم سادیک راہوں میں مارے۔۔۔۔۔ گئے

فیض نے اردو کا یہی شاعری کو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا نہایت کامیاب تجربہ کیا ہے۔ وہ جس انداز سے علم و ادب کا ذکر کرتا ہے، ہماری کلاسیکی شاعری میں وہ غم و انداز کے اظہار کا زریعہ ہے گویا اس نے اپنے نئے خیالات کو پرائے دے گا، سہیہ کیا ہے۔

بوسہ گل، نالاول، دور چہ راغِ مفضل
 جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (غالب)
 شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
 جتنے عہدِ راغ میں تیری مفضل سے آئے ہیں (فیض)

یہاں بزم کے معنوں میں فرق ہے غالب کی بزمِ محراب سے۔ اداس میں داخلیت جھک رہی ہے، اس کے برعکس فیض کی مفضل نامہ، دے۔ اور خارجیت کا پہلو ہے۔

نہ نشیں ذکرِ یار کچھ کر سچ
 سرِ حق مست سے تو پہلتا ہے (مجاہد)
 قہرِ اداس۔۔۔۔۔ پر دے سب سے کچھ تو کہو
 کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یر۔۔۔۔۔ چہ (فیض)
 دے زبانِ توفان کو خونِ بہا دھینچے
 کٹے زبان تو خراب کر کر دیا۔۔۔۔۔ میسر (غالب)
 گرشکرِ دشمن کی زخف دار ہیں کہ ہم
 کیوں خود راغِ نورِ تیغِ در۔۔۔۔۔ دھتے (فیض)
 میرا اور بزم سے سے یوں آستینہ کام آؤں
 گر میں نے کی تھی تیرے ساتی کو کیا ہر اتفاق (غالب)
 عجب کی خیر اپنا ہے ہی کے نام سے
 دھرا، ساتی کا، سے کا، انجم کا ہیہ۔۔۔۔۔ (فیض)

الفاظ اپنی ہیں، رند اور اس کی مراد سب سے ساتی سے، اتحاد، عجب دلی حواسِ داخل اور اس کی مناسبت سے شمع پروانہ، یار، رقیب اور نفس کی مناسبت سے چمن، چول، اکٹھے، آشتیاں، لکچیں، باغ، اتحاد، منہ، شمع، عجب۔۔۔۔۔ لیکن فیض نے ان الفاظ کو وسیعہ علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

مستردی شخص، بچہ کے اشتہار کی گھر، بچوں میں پہنچ سکتا ہے جیسے یہی علم ہر کہ سس کی شکر کا ٹوک کون سا نظر ہے؟

لیکن اب اس کی ایجاد کردہ طرزِ نفاذ عام ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے جو علامات استنہار کی ہیں اب ان کے متعلق علمِ دوسرے طبقے کو یہ علم ہے کہ وہ کتنے فقیر، غصہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جب وہ کہتا ہے۔

”اوسس جہان دول کی بازی لگی تھی، درد
آسان تھی کچھ ایسی راہ دفا شعراں

تو اس کا بڑھنے، آگاہی بات، خودی جانتا ہے کہ یہ کون سی راہ ہے، کون سا صلب العین ہے جس پر اسے فخر ہے اور جس کے لئے وہ جان دول کی قربانی بھی پیش کی ہے۔ گریز نہیں، کسی فنیق کی شاعری زیادہ عظیم و مقدس ہے، اس لئے کہ اس کی شاعری ان کے دلوں میں عزم، امید اور لگن کی روح بھونکتی ہے۔ اور جب اُن پر یاس و خودی کے اندر سیر جھپٹے ہیں تو فنیق کے اشعار روشن ستار بن کر ان کے دلوں میں جگمگاتے ہوتے ہیں۔ اور یہی فنیق کی انفرادیت اور لگن ہے کہ اس نے غم جاناں سے روپ میں شہ و راہ کو پیش کیا ہے۔

ذہن نے پُرانی علامات ہی سے جدید تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اس کی تائید میں جدید روایت کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ اردو شاعری پر اس کا ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اس وقت جب شاعری کی روایات و نظائر اندازِ نگار، افکار اور ہر گواہیِ خیبر کو بے کار سمجھا جا رہا تھا اس نے کلاسیکی شاعری کی خصوصیات کو زندہ رکھا اور پرانی تراکیب، تشبیہات و استعارات کو نئے معنی پہنکائے۔ قنص، زندہ، بچ، بچن، صبح، صفا، صفا، ستم، شیخ، یار، منزل، چراغ، خزاں، بہار، زلف، دار و درسن، جنون، زنجبیر، خرد، دیوانہ، تبخ، اسیر، چاند، راہ، گیسو، وصال، خزان، عشق، مدعی، طلب، قاتل، نقشب، اسد، سے خات، فنیق کی شاعری میں یہ الفاظ ملتا ہیں تو جدید تقاضوں اور نئی قدر کی علامت بن جاتے ہیں۔ فنیق کی یہ علامات و اشارات، فیرواض اور مبہم نہیں رہے۔ بلکہ اب تو یہ بجائے غور ایک تحریک، ایک عمل اور ایک پیغام ہیں اور یہ پیغام چونکہ ایک درد مند اور حساس شاعر کا پیغام ہے اس لئے یہ امن اور انسانیت، خوشحالی اور ترقی، آزادی اور مساوات، امید اور حرکت کا پیغام ہے۔ یہ پیغام کسی خاص فرد یا قوم، نہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے ہے۔

فنیق جدید اردو شاعری کا رنگ میل ہے۔ اس نے اردو شاعری میں جو تجربے کیے ہیں وہ یقیناً مستقبل کی شاعری کی بنیاد بنتے ہوئے ہیں۔ ابھی شاعری سے سماجی شعور کو صحت دے رہا ہے۔ اس نے نئے گھنے دانوں کی پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے اس کو جو صبر و صبر سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا مخصوص طرزِ بیان ہے جو غافلانہ اس کا اپنا انداز ہے اور یہ نیا انداز نئے شعرا میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ اس کی پیروی کرنے والوں میں کچھ تو سماجی شعور کے ساتھ اس انداز کو اپنا رہے ہیں۔

شاعر ادب کے غصتوں کو خبر نہیں

کیا ۴۷ لے رہے ہیں تنزل کے فن سے ہم (حمایت علی شاعر)

اردو کچھ بنسیر سمجھے ہو جیسے، کسی فنکری مقصد کے بغیر اس رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ فنیق نے اردو کے دامن کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ خسروہ روایات اور پابندیوں کی پروا کئے بغیر اپنے ترقی پسند اندازِ رجحان کو عام کیا ہے۔ اور ابھی روایات کو رائج کر رہا ہے۔ فنیق نے ادبی روایات کے احترام کے باوجود انہی تقید کبھی نہیں کی۔ اس کی نظیں، تزیین اور قطعات زیادہ دلکش اور اثر آفریں ہیں۔ اور ان میں ادبیت کا پہلو نظر انداز بھی نہیں کیا گیا ہے۔ روانی اور تازگی کے لحاظ سے وہ قادری کے دل پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔ اس سے آدھن میں بھی لکھی ہیں اور پابندی بھی۔ نئی تراکیب اور تجربے بھی استعمال کی ہیں اور پرانی بھی۔ لیکن ہمیں بھی اس حسن اور تاثیر کی

نہیں ہوتی جو اس کی شاعری کی بہت بڑی خوبی ہے۔ وہ الفاظ کا بہت بڑا جوہری ہے۔ اس کے پاس بے ترتیب اور بے اثر الفاظ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں ڈھل کر یہ الفاظ دلکش اور اثر آفرین بن جاتے ہیں۔ چھپرے ترشے ترشے لفظوں کے موٹی نظموں اور غزلوں کے زیورات میں اپنی موزوں جگہ پر جگہ تک نظر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر فیض کی نظم "یرانی طلباء کے نام" پیش کی جاسکتی ہے یا ان چند مصرعوں کو دیکھئے۔

کھڑکی پر کبھی پیر ہن سر سر — با م
کھڑکی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کبھی جو تامت زبیا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سر و صغیر سر سوز گئے ہیں ہم
بخی بساط غزل جب ڈولنے دل نے
متبارے سایہ رخسار دل میں سا غرو عام
سلام کلمت ہے شاعر تبارے حسن کے نام
یہ دلکش اور اثر آفرین طرز بیان اور الفاظ کی خوبصورتیم، بگلی فیض کی کامیابی ہے۔

فیض جیسے جدید افسانہ نگار بہر حال رک ہے۔ اس کے سامنے ایک عظیم آدرش ہے۔ زندگی کی تحقیق و سچائی سے وہ گونز نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلیت دنیا کو دکھاتے ہیں۔ وہ نہ صرف افسانہ نگار ہیں بلکہ ان کے خلاف آواز اٹھاتا اپنا فن کا راز فرض بحث ہے۔ اس سے "دوست ہوا" کے وسیلے میں لکھا ہے۔

..... شاعر کا مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ ہی اس پر فرض ہے۔۔۔ "اور وہ اپنے اس فرض کو بڑی خوبی اور جرات سے پورا کرتا ہے۔"

فیض کی شاعری تاریخی و شخصی تاثر نہیں چھوڑتی بلکہ ہر جوں وہ کسے پڑھتا چلا جائے افسانہ کی روح اس کے دل کی جگہوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ضمیر کو جمود ہٹتی ہے اور اس کی قوت عمل کو بیدار کرتی ہے۔ اس کا کوئی بھی پڑھنے والا اس کے افسانہ میں زبانی چھٹارے اور لطف اندوزی کے لئے نہیں گنگتا بلکہ وہ خود ان اشارے کا عمل سے متسلک کر لیتا ہے۔ اسے ایسا عرس ہوتا ہے۔ جیسے وہ فیض کے اشارے کا مرکز کی گداز ہے اور واقعی اس پر وہی کچھ سمیٹ رہی ہے۔ اس کے جذبات بھی وہی ہیں جو شاعر کے کج بھابھے نے افسانے کے روپ میں پیش کئے ہیں۔ یعنی کہ وہ افسانہ زندگی کے دو مختلف پہلوؤں کے مطالعے سے حاصل ہوا ہے۔ ایک وہ پہلو جہاں زندگی اپنی حاتمیت با بیوں سمیت جگمگا رہی ہے۔ اور دوسرا وہ جہاں وہ صحت کا اندھا لٹے سسکا رہی ہے۔ یہ دونوں پہلو تار و پود کے آغوش سے لے کر اب تک کسی کسی سریت میں وجود رہے ہیں، ہم انھیں ایک نام سے کہتے ہیں۔ غلام و غلام۔ یہ ہمیشہ سے موجود ہے ہیں اور ان کے درمیان ہمیشہ کشمکش ہوتی رہی ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پرست کو ہر گز کو

نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
 کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑک
 یہ بد سے نرتا گراتے ہیں
 ہمتی کے اٹھائی گیسروں کے
 ہر چال الجھاء پھرتے ہیں
 ان دونوں میں دن پڑتا ہے
 نت ببق ببق ، نگر، نگر
 ہر بستے ٹھہرے سینے میں
 ہر بیتی واہ کے اتنے پر
 یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
 وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
 یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
 وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

(مشیروں کے میٹھا)

کبھی انھیں آٹا اور غلام کا نام دیا گیا ہے ان کا نام جاگیر دار یا کسان رہا ہے۔ اور آج کے نام میں سرایہ دار اور مزدور۔ اور آج یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف میدان میں آپہنچے ہیں زمانہ ان کی اس عظیم جنگ کی تاریخ مرتب کر رہا ہے ایسی تاریخ جو خالص عوام کی تاریخ ہوگی جاہل غلام، مشہقا ہوں، غارت گر جاگیرداروں اور پندے چنے سوا یہ داروں کی تاریخ نہیں ہوگی۔ بلکہ محنت کش انسانوں کی تاریخ ہوگی، امن و انصاف اور آزادی کی تاریخ ہوگی۔ فیض اس جدوجہد میں ایک اہم کوا را دار کر رہا ہے۔ کیونکہ اسے آگ لگانے والوں اور کالک جسنوں والوں سے نفرت ہے، اسے ان لوگوں سے غبت ہے، بواگ بھجائے پھرتے ہیں اور وہ انھیں کامی و مددگار ہے۔

اپنے فن کار کے لئے یہ فزوری ہے کہ اس کے دل میں غلوں اور امن و محبت کا جزو ہو اور عوام کے مسائل سے ہمدلی ہو۔ فیض کے دل میں دنیا کے عوام کے لئے بے پناہ محبت کا جزو موجود ہے۔ انہیں نہت دوست فیض کو اس بات کا احساس ہے کہ دنیا کے عوام کی زندگی ایک سی نہیں ہے۔ ان میں غم اور خوشیاں مشترک نہیں ہے، خوشیاں غلوں میں اور انھیں عام کر کے کی فرست ہے۔

بے فکرے وطن دولت واسے
 یہ آفسر بکوں خوش رہتے ہیں
 ان کا سکھ آپس میں بانٹیں
 یہ بھی آفسر جم جیسے ہیں

(سوت)

فیض کے نزدیک تمام انسانوں کو خوشیاں حاصل کرنے کا حق ہے۔ اس کی شاعری ان عناصر کے خلاف جہاں ہے جو آگاہ پورے
 شہداء کو اپنی گرفت میں لے کر کھوکھلا کر رہتے ہیں۔ یہ چوٹی بھسرا لگ، صنعت و حرفت، تجارت، سیاست، مذہب، طرز معاشرت

اور نہ صرف یہ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی مرضی اور پسند کے حالات پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سن نہ بہتر نہ بدتر ہے۔

فیضِ انوارِ افروز میں سے ایک ہے جن کی زندگی کا مقصد اس جانب اور نظام کی لغتوں کو ختم کر کے ایک نئے اور جامع انداز معاشرہ کی تشکیل کرنا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کے دامن میں دین کے انسانوں کے لئے امن و امان خوشنالی اور ترقی کے خوش رنگ میوں ہوں گے۔

لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ فیض نے بہت کم عوامی لئے لکھے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے اس بات کا احساس ہے کہ وہ جن عوام کی خدمت و دعا وقت کے گیت کا گانہ ہے ان کی آنکھوں پر صدیوں کی قدامت پرستی اور ادب اور تہذیب کا پردہ چڑھا ہے اس لئے انھیں ایسا یہ کسی نئے نہ کری نظر سے روشناس کہ ابہت مشکل کام ہے۔ ان کی عقلیں کسی نظریے کی گہرائی میں جا کر اسے پرکھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔

پھر یہ بھی ایک ذکر کو اپن لینے کے پردہ لے آسانی سے نہیں چھوڑتے بقول حیدر دہلوی ص ۱۰

ابھی ماحولِ عرفان ہنریں بہت ہے محدود

کیا ایک ہر بلند آواز پہنچانی نہیں جاتی

فیض کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ کوئی نئی آواز عوام کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتی۔ مادی مسائل کو حل کرنے ہی سے انھیں کب فرصت ملتی ہے۔ جو وہ کسی اور طبقہ مترجم ہو سکیں۔ برائی نسل روایات اور قدامت پرستی کو چھوڑنا گوار نہیں کرے گی البتہ نئے آنے والوں کی قوت فکر کا زنگی اور احساس کی بیداری ضروری جانتی ہے۔ فیض کی شہزادی ان افراد کے لئے ہے جن میں اس بات کو سمجھنے کی صلاحیت اور احساس ہے۔ اور جن کی عقلوں میں روایات اور قدامت پرستی سے ہٹ کر سمجھنے کی گنجائش ہے۔ فیض نے اسی طبقے کی بیداری اور رہنمائی کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور فیض اس طبقہ کی فکری رہنمائی کرتا ہے اور وہ اپنے اپنے طریقوں سے عوام کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہاں ہمارے سامنے ساحر و صیقلی کی مثال ہے۔ اس نے اکثر اپنے موضوع کا انتخاب فیض کی شاعری سے کیا ہے۔ فیض جس موضوع کو علامات کے ذریعہ بیان کر رہا ہے۔ وہ اسی موضوع کو زیادہ عام فہم واضح اور شدید پراثر الفاظ میں عوام کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اسی لئے اگر فیض کے لئے عوامی نہیں تو اس بات کا الزام نہیں دیا جائے گا کہ اس کے شاعری اس کے مقصد کا ساتھ نہیں دیتی۔ اگر عوام اس کی علامات میں اپنے دکھ درد کا عکس نہیں دیکھ سکتے تو اس کے عظیم مقصد اور اس کی مسلسل جدوجہد کو تو فراموش نہیں کیا جاسکتا اس لئے تو اپنے آپ کو اس طبقہ کے لئے لکھتے ہیں کہ یہاں ہے۔ جڑی نسل کے حقوق، دوسرا دن کا علمبردار ہے۔ اور عوام میں عینی طور پر اس کے لئے ناہین ہوا سکڑ ہٹ۔

فیض کا طرز یہ ہے کہ ہر لطیف اور پراثر ہے۔ طنز و مزاح کا چھپکا ہوا ہے انسان زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ مگر طنز تو ایک ایسا فن ہے جو ہوتا ہے۔

جہاں میں ہمیشہ چھپتا رہتا ہے۔ ص ۱۰

سوں عزم چلے اب وہ بادہ خواراں

گردِ زخم کی تو فضا دار میں کھم

کیوں محرمِ خوبی تنہا ادا نہ تھے

دوستِ شرمین کی اور نرم اور تیغ۔ یہ تینوں الفاظ پوری شدت سے اہمیت میں، فکر یا غور سے مراد سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے اور نرم انسانی حالت کو ظاہر کرتا ہے، تیغ مستحکم کی علامت ہے۔ سوچ سمجھنا عزم ہے جن کی بجائے زکوٰۃ بشرہ دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ اسید بھی کی جاتی ہے کہ مست نصیب اپنی حالت پر غور نہ کرے۔ مست نصیب کی خطا واقعی بہت بڑی ہے کہ انہیں مست کو نصیب معلوم ہو جاتا ہے۔

میں نے فیض کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں اس پر بے عملی اور ایسی کی فصاحت طاری ہے۔ اس کے کلام میں سائنس اور زندگی کے تقاضے سے گریز پایا جاتا ہے۔

عمر بے سوز کٹ رہی ہے فیتھن
کاش افشانے سا نہ ہو جائے

یہ دور فیتھن کی شاعری کا وہ دور تھا۔ جب اسی کی حسن پرستی محدود تھی۔ وہ اپنے غم میں محو تھا۔ خوبصورت تشبیہات اور استعارات کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ اشد مار میں آہنگ تھا۔ لیکن اس کا اپنا رنگ اتنا نمایاں نہیں تھا۔ اور اس کی شاعری محض اپنی غیبی محبوبہ کے وقت تھی۔

... اپنی، بتائی نظموں میں فیتھن ایک حسن پرست اور
مخطا کا دلدادہ شاعر نظر آتا ہے۔ ... فیتھن کی اس
زندگی کی نظموں کی حریر، گلابی جرموں میں لپٹی ہوئی، نواب
سے چوراہہ لذت سے سرشار ستوروں سے معمور پڑی
میں۔ زندگی کا ان سے براہ راست کوئی تعلق نہیں...

(ن - م - راسخ)

فیض کی شاعری کا یہ ابتدائی دور رساتیوں، دل میں تیز گھبرائی ہوئی یاد آرائی سے شروع ہوا کہ مہیلا پر مبنی پر قدم ہوتا ہے۔ اس دور کی غزلیں، نظمیں، قطعات موضوع کی یکسانیت کے حامل تھے۔ درخز کے انفرادی غموں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اگر ہم اس دور کے مہیلا، در سہاجی حالات کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اس وقت سندھوستان کی عوام کے اذیت پر وجود طاری تھا۔ باؤں اور بے عملی کا غلبہ تھا۔ جرات دہشت کا فقدان تھا۔ تعلیم کی کمی تھی اور ملک کی اکثریت اُن پچھڑا دوسرے شہر تھی۔ ان ٹالیوں کن عمارت نے عوام کی طبیعت میں گہرا اور فزادہ پیدا کر دیا تھا اور ان کی توجہ اور دلچسپی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ان حالات کے اثر و اثر میں ان کی طبیعت میں پڑنا پڑا تھا۔ جس کی جھلک ہم فیض کی ابتدائی شاعری میں دیکھ سکتے ہیں۔ "نقش خرابی" کی اکثر نظمیں، غزلیں اور قطعات اس کی طبیعت میں زار اور گریز کے بیان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے پہلے دور کی شاعری اس کے ذاتی غم کی آئینہ دار ہے اور اس کے فن کو محدود رکھتے ہوئے ہے۔

دقت حرمان و یاس رہتا ہے

دل ہے اکثر اداس رہتا ہے

تم تو غم دے گئے بھول جاتے ہو

ہم کو احسان کا پاس رہتا ہے

خداہ وقت نہلات کہ سوگوار ہو

سکون کی نیند تجھے بھی حرام ہو

تری مسرت پیہم تمام ہو

تری حیات تجھے تلخ جام ہو

(خداہ وقت نہلات)

غموں سے بے نیاز دل گداز ہو تیسرا

یہ وہ زاد تھا۔ جب وہ بھٹاتا تھا کہ اس کی محبوبہ کے دامن میں جسٹھ کی رنگینیاں ہیں اور وہ اسے راستے میں نگاہیں بچھاتا ہے۔ تھنا فینق کی شاعری کے دوسرے دُور میں اس کے مشاہدات اور احساسات کے رومان و صند کے اس جال کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جس میں وہ گرفت لڑتا تھا۔ اس نے اپنے غم کو نثر لاندہ ڈر کے فینا کے غم سے دلچسپی لینا شروع کی اور یہ نہیں سے اس کا مخصوص رنگ ابھرتا ہے۔ اس کے فن میں یہ تبدیلی اس دوسرے سیاسی اور ادبی شعور کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کی تاریخ ایک اہم مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ انگریزی سامراج ہندوستان پر ہمیشہ کے لئے تائیں رہنا پڑتا تھا لیکن چند قلمی، ادبی اور سیاسی تحریکیں پورے دورِ شہزادہ ریزہ عمل سے انھیں ہلکا کر گئیں اور مسلم لیگ، دونوں بڑی جماعتوں کا، موقت آزادی کا کل جھنڈا، سیاسی اور مذہبی فضا پر طغیانی سامراج کے خلاف جہاد ہو گئی تھی۔ یہی زمانے میں چند طغیانیوں نے ہندوستان سے جدید غم و فتنوں کی تعلیم ابدی نظریات لے کر آئے تھے۔ بعض قابلِ احترام بزرگوں کی رہنمائی میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک نے ادب کا مقصد واضح کیا۔ اس تحریک کا نعرہ تھا۔ کہ ادیب کو اپنے ماضی کے عقائد سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اور ملتی ہوئی اقدار کو ساتھ دینا چاہیے۔

ان تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے گرفتار ہو کر ادیب کا ایک نوجوان اور شہزادہ انگریزی کا کچھ ادبیات احمد فینق بھی متاثر ہوئے۔ انہیں درہ ملا۔ اور ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود ظفر کے ڈرامنگ روم میں بیٹھ کر خواندہ نقیض سناتے اور شاعری تخلیقات میں دوسرے دلوں کی دھنک بھی شامل ہو گئیں۔ وہ نواہوں کی دنیا سے نکل آیا اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ارد گرد نواہوں کی پیریاں نہیں ہیں، عوض دہ دیکھ کر ہنسنا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے ہیں جنھیں بچپن کے معصوم زمانے میں ہی غریبی کا احساس ہے وہ ننگی ہنسی ہو جھنسی سسواہ کے قہقہے میں نہایا گیا ہے۔ اور وہ بوڑھے ماں باپ ہیں جن کے جہان بیٹے آزادی مانگتے کے جرم میں جیلوں میں ٹوٹا دیئے گئے ہیں۔ وہ چورک بڑا۔ اپنے غم کی نروں والی دیکھ کر اس کا ساس دل زخماں اٹھا۔

شاعر نے اس کے خیالات ہی سے قوت حاصل ہوئی ہے۔ فینق کے عقیدت پسند خیالات نے بھی اس کے فن کو باقاعدہ اور جادو بنا دیا ہے۔ نقض آزادی کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے۔

..... شکر گنا جرم نہ بھی لیکن بے وجہ شکر لکھنے

ایسی دانشمندی بھی نہیں.....

یہیں سے فینق کی شاعری ایک نئے مہر کی طرہ سے نکلی۔ اب وہ اپنی روانہ محدود فضا سے ایک لا محدود اور روشن فضا میں نکل آیا اس نے ایک نظم لکھی۔ "بہ سے پہلی ہی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور ایک شعر کہا۔ "ع دھیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا تجھ سے بھی دل زخماں ہیں غم و زخماں کے

اور یہ ایک نظم اور ایک شعر اس کی شاعری کا مرکز و محور بن گئے۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں جہد و عمل کے دینے و دینے کئے اس کے اس دور کے شعروں کے مقابلے سے یہ غم ہو رہا ہے کہ اس وقت چونکہ اس کے احساسات پر تازہ جوت پڑی تھی اس لئے اس میں اس کا باجہ قدرے سطح اور شدید تھا اس کی جذبہ ثابت کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ع

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گونہ

شاہراہوں پہ غریبوں کا بہرہ ہوتا ہے

یا کوئی توڑ کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
 فاقہ مستوں کو ڈالنے کے لئے آتا ہے
 آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلی ہے نہ پوچھ
 اپنے دل پہ مجھے قاتل ہی نہیں رہتا ہے
 (دقیب)
 چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
 ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
 اور کچھ دیر تم سہلیں، تڑپ لیں، دلیں
 اپنے اہواؤ کی میراث ہے مسدود ہیں ہم
 جسم پہ قید ہے مزیات پہ زنجیریں ہیں
 فکر محسوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں

(چند روز اور)

ان نغموں میں نغمگی اور آہنگ کا عنصر دبا ہوا ہے۔ اسی طرح علامات اور تشبیہات: استعارات کا استعمال بہت کم ہے۔ انداز بیان صاف اور سلی ہے۔ لہذا یہ احساس دور ہوتا ہے کہ شاعری قوت بیان بہت بلند ہے دوسرے دور میں پہلے دور کی دو چیزوں یعنی آہنگ اور تشبیہات کی کمی پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کے تیسرے دور میں پھر شریعت سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ خودی کا احساس جو پہلے دور کی دعائی شاعری میں تھا ختم ہو گیا۔ چونکہ وہ دور ایک تنگائی دور تھا اس لئے فقیہ کے بادلوں میں تلخی شدت سے پیدا ہوئی تھی یا اس کی وجہ یہ تھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ دنیا نیا دھلیت سے خارجیت کی طرف مائل ہوا تھا۔ اس لئے اس میں مزیاتیت آگئی تھی دوسرے دور کی چیز اور نظموں سے مری اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیسرے
 بول زبان اب تک تیری ہے
 تیرا ستواں جسم ہے تیرا
 بول کہ جاں اب تک تیری ہے
 دیکھ کہ آہنگ کی دوکان میں
 تند میں شعلے، سرخ ہے آہن

(بول)

تیسرے دور میں فقیہ کا لہجہ گھٹتا اور برقرار ہے۔ اس کا مزاج معتدل نظر آتا ہے۔ اور مزیات سے بہت دور ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا استعمال زیادہ ہے نغمگی کا عنصر شدید طور پر شامل ہو گیا ہے ادا اب وہ صحت علامت سے ہی اپنی تمام بات سمجھانا چاہتا ہے۔ علامات اس کی شاعری کی خوبصورتی اور جان بن گئی ہیں۔ اس دور کی شاعری کا تمام تر انحصار علامت پر ہے۔

ان میں لہو جلا ہو بہارا کہ جان دول
 محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

کو غمزدی اور خوب صورت تشبیہات میں الجھا دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں اس نازکی کیا وجہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ فیض صاحب کوئی نیا چرچہ کرتے ہوں یا پھر وہ سمجھتے ہوں اب وہ ایسا ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ پہلے کرتے رہے ہیں اسی طرح کی ایک اور نظم ہے۔ رنگ ہے دل کا ہر سہ، غماظ کیجئے۔ جا

تم نہ آتے تھے تو ہر چیز دی تھی کہ جو ہے
آسمان حد نظر، راہ گذر، راہ گذر، شیشے سے شیشے
اور اب شیشے سے، راہ گذر۔ رنگ فلک
رنگ ہے دل کا ہر خون جو گرجے تک
چھپتی رنگ کبھی، راحت دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعت بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا، فس و فدا کا رنگ
سرخ پھولوں کا، دیکھتے ہوئے گڑا رنگ
زہر کا رنگ، اجڑا رنگ، شب سا رنگ
آسمان راہ گذر شیشے سے
کوئی بھیجا ہوا امن۔ کوئی دھکتی ہوئی رنگ
کوئی بر لفظ بدلتا ہوا آئینہ ہے
اب جگمگ ہر تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ کوئی رت کوئی شیشے
ایک جگمگ ٹھہرے۔۔۔

پھر سے اک بار ہر اک چیز دی ہو کہ جو ہے
آسمان حد نظر، راہ گذر، راہ گذر، شیشے سے شیشے

اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اب جگمگ ہر تو ٹھہرو کہ کوئی رنگت، کوئی شے، کوئی رت ایک جگمگ ٹھہرے اور پھر سے ایک بار ہر چیز دی ہو کہ جو ہے۔ لیکن مختلف کیفیات کو بار بار رنگوں سے تشبیہات سے کوئی نیا الجھا دیا گیا ہے۔ ماضی قسم کی ایک اور نظم ہے یہ پاس رہو

ان نظموں میں مٹھاس اور آہنگ نہ بہت ہے لیکن یہ بات واضح نہیں کہ ان کا اطلاق و اعلیت پر کیا جاتے یا غار جیت پر۔
ان نظموں میں اس رنگ کے قائم ہونے کی وجہ شائد یہ ہے کہ اس نے یہ تین طویل سال وطن سے دور ایک ایسے اجنبی ماحول میں گزارے ہیں جو ہم سے نسبتاً زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ ہے۔ وہاں اسے بالکل نئے ماحول، اجنبی لوگوں اور اجنبی روایات سے سامنا پڑا اور اس کے وقت کا بیشتر حصہ یورپی دانشوروں اور اہل قلم کے ساتھ گزرا۔ جس کا اثر اس کی مختصر مصل پر بھی پڑا۔

بہر حال جو غمے درد کا یقین کرنے سے پہلے ہم خود فیض صاحب سے سوال کریں گے کہ کہیں ان کا یہ رنگ مستقل صورت اختیار نہیں کرتا جا رہا ہے۔ علامات و استعارات شاعری ہیں مگر پیدا کرتے ہیں لیکن جو علامتیں اور استعارے زندگی کی رفتار سے مطابقت پیدا

ذکر سکین ان کا من کس کام کا۔

فیض سے علامات کا استعمال اس کثرت سے کیا ہے کہ اس کا مقصد ان کے پیچھے پوشیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے اشاری کی سوچت سمجھنے کے لئے یہ مزوری ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو کہ وہ کس نظریے سے غفلت رکھتا ہے۔ اس لئے اگر کبھی کبھی فیض کے علامات کی مبالغہ کو کرتا نہیں سمجھیں گا تو اس بات کا امکان ہے کہ مقصد کے انکار سے علامات کی راکھ تک مہلے پہلے بچہ جانتی ہے۔ لوگوں کے اذہان میں بار بار یہ بات آتی رہتی چلیے کہ فیض کی شاعری داخلی نہیں بلکہ خارجی مسائل کی منظر ہے اور یہ حرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جسے فیض رشتا توڑتا ہے ایسی انہیں بھی کہتا ہے جس میں اس کا بجز واضح اور شدید ہو۔ بھانے اس کے کہ تاویل غم نکلیں بھی جائیں اور سننے لکھنے والوں کی پوری سسل کو مصوٹ پسند بنا دیا جائے۔

فیض کو جنگ سے نفرت ہے اسے موجودہ ایسی دور کی ممکنہ تباہیوں کا علم ہے جس میں انسانی تہذیب کا تمام اثاثہ ختم ہو سکتا ہے اس نے ان کے لئے کام کیا ہے۔ اسے گندم کے کھیتوں، سفید دھڑوں، دہنوں کے پتھروں اور بچوں کے ہاتھوں سے محبت ہے یہ انہیں یاد دہرتے نہیں دیکھ سکتا۔ جنگ کے دامن میں آگ، خون، تباہی، بربادی، اور آسروں کے علاوہ اور کیا ہے۔ یہ آج کا ہر شاعر شخص اس بات کو سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ پچھلی جنگوں نے انسانیت کو بہت بڑا سبق دیا ہے۔ آٹا ناگہ کی اور پیروشیا کی ایٹم ذرہ خاک مفلح اور مہیا کی خشکوں اور پھول کو جنم دے رہی ہے۔ یہ ہولناکی تصور دنیا کے پاسیوں کی قوت فکر کو ایک نئے موڑ پر پہنچا سکتا ہے۔ جہاں، امن، خوش حالی خوشی، میل ملاپ اور تابانی ہے اور جہاں مکرزب اور غنا، غر خواری، دکھ درد اور تباہی، غم بادی کا کوئی نظام نہیں ہے۔ اس ہولناک تصور کا ادیب اور شاعر بہتر پر پیش کر سکتے ہیں اور محسوس کو امن اور شستی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

جس طرح امریکہ کے ہینکوں نے، برطانیہ کے رٹنڈریس اور ہندوستان کے کرشن چندر نے اس سلسلے میں اپنے ذمہ داریوں کو محسوس کیا ہے۔ فیض پاکستان سے اس صفت میں تمام شدگی کو رہا ہے یہ اور ان کے دیگر ساتھی ان قوتوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں جو صرف اپنی ہی بناؤ کی خاطر دنیا کو جنگ کی مٹی میں بھر نکال چاہتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ جنگ، غارتگری اور ظلم خواہے کبھی نہ پہنچے ہے اور امن کے سنی اس سے بچاؤ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے قوم خوش رہیں اور ان کے مادی مسائل حل ہو جائیں اور درحد در حد ان کا لیت کا فی قدر ہو جائے۔ جیسا کہ فیض نے لینن میں برائے حال کرنے دیکھا تھا

..... "جس تمنا اور آرزو کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں

کو دابھلی رہی ہے یعنی امن و آزادی کی عطا نہ ہوئے خود اتنی عظیم

ہے کہ اس کے واسطے سے ادنا اور حق کارکن بھی عزت و اکرام کے مستحق

مقرر کرتے ہیں..... یوں تو ذہنی طور پر بیڑوں اور جہازم پیہ لوگوں

کے علاوہ سمجھتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت تباہناک ہیں اور یہ بھی

تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں۔ سفید سے درخت

دلہن کا آئین اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ۔ شاعر کا قلم اور مصوٹ

لا مونس قلم !!!.....

یہ تمام باتیں اس لئے لکھی گئی ہیں کہ یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ فیض نے تو اس تک جنگ کے موضوع پر کوئی چیز نہیں لکھی۔ اس کی

پوری شاعری کا موضوع امن، محبت اور آزادی ہے۔ اور امن کے معنی دنیا کے عوام میں خوشحالی پھیلانا ——— رقت کے لیے بہا
ذخائر پر سے یمن صہقوں کی اجارہ داری کا خاتمہ کرنا ہے۔ خوشیوں میں ملال اور محبت کو پھیلانا ہے۔ اور امن محبت اور آزادی اس وقت
مکمل عام نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان تخریب پسند قوتوں کو شکست نہ دی جائے جو زمین کے ٹکڑوں کو ہاتھ لے کر کوشش کرتی ہیں اور انسانوں
کی ٹاپوں پر اپنا سکہ چلانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ہم یہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی پوری شاعری اس خواہش کی آئینہ دار ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو، انسانی تہذیب ختم نہ ہونے پتے
اور زندگی کی بنیادوں پر ٹھہرے جس کی تلقین کا غور و شبہ ازنی نے کی تھی۔ ظلم و انصافی اور غلامی کے غلوں کو نہ روکا گیا تو زندگی اپنی تمام دہائیوں
سمیت موجود رہے گی۔ اور جنبہ اور عل کے بنیہ صافظ کا مذکورہ بالا اثر نشہ رہے گا۔ منزل شرق تک پہنچنے کے لئے ہر فرقہ پر مخالف قوتوں
کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا۔

اکھڑ سب خالی ہاتھوں کو

اس دن سے بلا دے آتے ہیں

نیقین کا دل ایک درد مند دل ہے۔ جو ہر ظلم پر احتجاج اٹھاتا ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی کوئے میں ہو، ہر وہ آزادی انسان کا علمبردار ہے۔
زمانہ کی تاریخ پر اس کی گڑی نظر ہے۔ ایران میں توحید پرست طالب علموں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں تو اس کا قلم ان قدامت پرستوں کے
خلاف حرکت میں آ جاتا ہے۔ جو ان مشورے پھیلے حوالوں پر مظالم روا رکھتے ہیں۔ افریقہ میں سیاہ فام باشندوں کی تحریک آزادی کو کچلنے کی کوشش
کی جاتی ہے تو حریت پسند فیض اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے۔

نیقین کو یقین ہے کہ وہ تحریکیں جن کی بنیادیں بچانی پر استوار ہوں گی، نہیں دب سکتیں تاریخ کے رخصتے ہمیں دھمکے کو کوئی نہیں
روک سکتا۔ ایک آواز جب چادوں طرف پھیل کر لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے تو وہ جھکے نہیں دب سکتی۔ ایک چراغ بجھے گا تو سینکڑوں
چراغ جل اٹھیں گے، ایک آواز دے گی تو سینکڑوں آوازیں ابھریں گی

قتل گاہوں سے جن کو ہمارے علم

اور نیکیوں سے عشاق کے قاتلے

فیض کی پوری شاعری جنگ کے خلاف احتجاج ہے۔ اس لئے اگر اس نے اس موضوع پر براہ راست کوئی نظم نہیں لکھی تو اس کے
معنی یہ نہیں کہ امن کے قیام کے سلسلے میں اس نے کچھ نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس موضوع پر کوئی بڑی نظم لکھی نہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ فیض کے
ذہن میں کسی خاصے میں محفوظ ہو اور نہ جانے کس دن وہاں سے نکل کر کاغذ پر منتقل ہو جائے۔

عام ترک اسلحہ اور امن کی عالمی کانفرنس کے دوران جو ۱۹۶۲ء کی گرمیوں میں ماسکوں میں ہوئی تھی، اس کے مشرقی ادب کے عجائب گھر
ایک کتاب نے لکھی تھی۔ ”شاہراہ امن پر“ اس کتاب میں ایک باب فیض اور فیض پر بھی تھا۔ ذیل کا تجاویز ای کتاب سے لیا گیا ہے۔

..... نیقین کی نظموں کا ایک ایک حصہ جگمگاتی ہوئی مثل

ہے جس کی روشنی میں انسانوں کی بے انصافیاں اور ملامت لاریاں

صاف نظر آتی ہیں۔ ہر شعر ایک ستارہ جو روشنی اور ترقی کی

راہ دکھاتا ہے۔ فیض کے دل میں نہ خوف ہے اور نہ تذبذب وہ

شاہزادہ صلاحتوں سے مالال شاعری نہیں بلکہ اپنے عوام
کی آواز کا ایک بہادر امدادیرسپا ہی بھی ہے۔ غلام مست
کا انتھک دشمن ملان کا لڑکوں کا بھروسہ ہے جس ادھر جی پر
امن کے خواب ہیں۔ جو بچی نزع انسان کے لئے امن
چاہتے ہیں.....

فیض اردو کے ان خوش قسمت اہل قلم میں سے ایک ہے۔ جسے اپنی زندگی ہی میں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے۔ دنیا کی مختلف
زبانوں میں اس کے کلام کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ روس اور چیکو سلوواکیہ میں وہ پہلے ہی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ روس کی نو مہاجرین دوستی میں اس
کی شاعری پر ریسرچ کا کام ہو رہا ہے۔ ایک روسی ادیب گایوت نے فیض کی شاعری کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

”اے ایسا مسلم جو تاسے کہ نبی کی نظمیں ہمارے کے اوتے
پیداؤں کرتی ہوئی آئیں اور ان کے ملک سے دور کے لوگوں
کے دلوں میں اتر گئیں۔۔۔“

روس کے ایک اور ممتاز شاعر اور دست امن کیل کے صدر نوزو نے فیض کے کلام کو اس طرح بیان کیا ہے؛

”فیض کے باقیہذاں دلوں اور امنوں کی مثل ہے جو ایک
ذہنی راہروشن کرتی ہے جس پر کسے ٹھنسا ہے۔ جس پر
چلتے ہوئے جہد کرتی ہے اور اس راہ پر چلتے راہوں
میں شعلہ کا ڈبے اور موت کی پھلہ۔۔۔“
اس زمانہ میں جو سب پر گزرتی ہے سو گزرتی

تہا پس زمانہ کی ہوا سس پانار

(دو عشق)

فیض کی فن صلاحیتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اسے مخالفین کو بھی یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ نوت میان اور الفاظ کی ہم آہنگی پر
تاکید رکھنے والا اس حد تک شاعر ہو جاتا ہے کہ اس کے انداز کی خوب صورتی اور بلند فکریات کے سبب قائل ہیں۔ جینیں اس سے نظری اختلاف ہے
وہ بھی اس کے اشعار کی بڑائی کو ماننے میں۔ فیض کا نگہمیر، سنجیدہ، متین اور بد وقتار ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی شاعری کو توڑ پھوڑ
انتشار کی شاعری کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم نئی سلاہتیں کوٹ کوٹ کر میری ہیں۔ اس نے اپنا موجودہ مقام زبردست علمی اور ادبی
ربا منت کے بدو صل کیا ہے۔ اس کی شاعری اپنے اندر گہری سوزیت لئے ہوسکتے۔ اس کے پاس انداز خلایہ پناہ نہ تر ہے۔ اور موزوں لفظ
منتخب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ ماحول کا ہر مشاہدہ اور اس کے ساتھ ساتھ بلند شاعرانہ تخیل بھی ہے اس کا اظہار بیان علمی نہیں ہے بلکہ وہ
اپنے قاری پر اپنے تمام احسانات نقش کر دینا چاہتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں اس کا مقصد ذہنی میلاری ہے اور وہ اپنے مقصدوں کہاں تک
کامیاب ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا مندرجہ ذیل معروف نثر پرست لڑکوں کی زبان پر مزب المثل کی
حیثیت سے چڑھ گیا ہے۔

اور بھی دکھ میں زلمت میں محبت کے سوا

فیض آج اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ دھرت اپنی ادبی اور علمی عظمت کی دہر سے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ موجودہ زمانے کے ایک عظیم

نظر سے کی تبیین میں ایک اہم کردار اہم ہوتا ہے، دنیا کی خوشحالی، امن اور آبادی کا کام کر رہا ہے۔
 اور جس دن فیضی کے یہ حسین خواب حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ اس دن اس کی شاعری عوام کی زندگی کے دکھ و پشیمانی کی
 ترجمان بن جائے گی۔ آج اس کی زبان پر زمانے کی یہ انصافیوں کے رد عمل میں تپتی ہے لیکن جب یہ انصافیوں کا دور ختم ہو جائے گا
 تو اس کے ہونٹوں پر غبت کے گہیت اُٹھ جائیں گے۔ آج فیضی محبت کے کان ہی جیتوں کو گھٹنے کے لئے بے چین ہے۔ وہ اس دن کا منتظر ہے
 جب اسے زمانے کی صحیح حقیقتوں کو یہ نقاب کسے گا تاوقتیکہ اس کا زمانہ گوارا نہیں دینا پڑے گا۔ اور اسے اپنی محبوبہ سے یہ کہہ کر بے تعلقی نہیں
 برتن پڑے گی۔

غیر سے پہلی ہی محبت مری محبوبہ زباں گ

اس حسین اور جواں دور کے لئے جب دنیا کے دھندلے دھندلے اس کے پیروں میں زنجیریں نہیں ڈال سکیں گے وہ ہر قسم کی قوماں میں سے
 لئے تیار ہے اور اسے احساس ہے کہ اس کی غیور خوبرو کے جھروکوں میں اپنے وسیلے ہونٹوں اور لابی عارضوں کی جست لبا سے اس کا
 اظہار کر رہی ہے۔ لیکن اس کا فن وقت کا منتظر ہے۔ اگر گندم کی سنہری بائیاں ہریں ڈوبی رہیں اور چوکھڑا کر کے ہاتھ قلم کئے جاتے ہیں تو وہ
 بھی اپنی خاموشی کا موجودہ مومنہ برقرار رکھنے پر مجبور رہے گا۔

لب پر ہے تلخی سے آہام ورنہ فیضی

ہم تلخی کا نام پہ مائل ذرا نہ تھے

فیضی - غنیمت جانات سے غنیمت دوراں تک

(مؤرخ ۱۹۵۷ء آگے)

نہیں ہیں سن و گلاب کوئی چاہت سے یا دیکھا کسی چاہت اور تفصیل سے اس
 بے حال، بد نصیب کا ذکر نہیں ہے جس نے سن و گلاب کو اپنے خون جگر سے سپرد کر
 شاداب کیا ہے اور جس کو حق پہونچتا ہے کہ وہ بھی ان سن و گلاب کی نزاکتوں رنگ
 روپ اور عطریاتوں سے مستفید ہو سکے۔ ان کا دل تو ادھر کھنچا جا رہا ہے لیکن
 لاشعری پاؤں ہے پابندی آداب ابھی

ان کی شاعری کو ذرا رنگ و بوموں، اسکولوں، کالجوں سے نکل کر شکرانہ بازاروں
 کمیوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلنا ہے :

فیضی کی شاعری کے اس پہلو پر سیرِ اسحق کا یہ تبصرہ چونکا دینے والا ضرور ہے لیکن بڑا بھرپور ہے۔ اور پوری تنقیدی
 دیانت دہی پر مبنی ہے۔ اس حقیقت سے فیضی بھی انکار نہیں کر سکے کہ ان کی شاعری افسانہ کوئی (قصص و حقائق) کے
 طبقے تک محدود ہو گئی ہے۔ اس میں کسان اور محنت کش عوام کے کچھ نہیں۔ فیضی سے کسان اور محنت کش عوام کے کچھ مطالبہ نہیں
 دیکھنا یہ کہ فیضی انہیں کہا دیتے ہیں۔

امجد کنیانی

فیض

فکرو فن کے ایسے نین

فیض بنبر: وہ شاعر پرست، فزات و احساسات کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں مقصدیت ہے۔ لیکن وہ اپنی شاعری کو مقصد کی تشریح بغیر کاغذ پر نہیں لکھتے۔ بلکہ اس مقصد سے متعلق حالات و واقعات کو چلنے پانے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ تجربہ نظام معاشرت میں روا رکھی جات والی نا انصافیوں کا ذکر کر کے وہ اپنا ترمیم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے فیض اردو کی مقصدی شاعری کی ساری تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کا فن ان کے کردار عملی تشریح نہیں ہے۔ بلکہ ان کے داخلی احساسات، ان کے جذبات، ان کی ہرزوئیں اور تشائش کا اظہار ہے۔ ایک ایسے فن مستقبل کا آئرومند ہے جس میں اگر مہوگا، سکون ہوگا۔ محبت اور صبر کی فراوانی ہوگی اور انصاف، درشت رفت پروانہ نہ رہیں گے جہاں ظلم اور مظلوم کے طبقے نہیں ہوں گے۔

احساسات کا شاعر ہونے کی حیثیت سے فیض کے ہاں سب سے نمایاں تیز فہر پر ہاں۔ ان کے اندر مضم کا دل شکن احساس ہے۔ اس احساس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں بھی ایک طرف کی انفرادی، دل گرفتگی اور دوسری کی غائب پیدا ہو گئی ہے۔ اور ماؤ شاعر ہونے کے وجود ان کے سنہ مفوم سے ہے۔ وہ آج بڑا نہیں رہے۔ مگر ان کی غرض فانی دیکھتے ہیں کہ اردو کی لہروں میں بہہ جاتے ہیں اور ان کی زبان سے ایک احتجاج کی صدا نکلتی ہے، جس کا آہنگ فریاد کا سا جوت ہے۔ گون گون کی کامیابی کا پورا یقین ہے اور ان کی شاعری کی روش ان کے ساتھ ہے۔ البتہ ہے۔ ان سے اگر مرے ہیں کا خوب اور اس کا سبب منظر یہ ہے۔ لیکن ان کے ہاں کچھ بھی نہیں وہ ہاتھ سے قہر نہیں آتے۔ اور تیرنہ لے۔ وہ جہاں موجود حالات پر تبصرہ بھی کرتے ہیں تو مستقبل کی امیدیں اس قدر میں جھلکتی رہتی ہے۔ یہی تجربہ ہے جس میں فیض کی انفرادیت میں گہنا چھپا ہوا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہنا یا سکتا ہے کہ وہ ان کی حالت کو اپنے ذہنی اور جذباتی رد عمل کی روشنی میں بیان کرتے ہیں اور ان کی دل فریبیوں کی تمنا کرتے ہیں۔ اس میں راز۔ امید۔ بیان کی شاعری کی روح وہاں ہے۔ وہ انقلاب کے خواہاں ہیں مگر انقلاب کا نعرہ نہیں لگاتے بلکہ انقلاب کا گیت لگاتے ہیں۔ وہ بیان کی راہ اختیار نہیں کرتے، شائد اور سکون کا دامن پکڑتے ہیں۔ وہ غم و شرم کو نرم و پیلا کرے الگ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ غبار کی آہٹ۔ یہی ہے۔ لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

”ہرے ہرے شاعرانہ ان عناصر رساز، جامِ شمشیر، ہیں ایک فرضی تضاد کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ کوئی فرض ساز و بام کا دوا نہ ہے تو کوئی نقطہ شمشیر کا فرضی، لیکن کامیاب شعرا کے لئے آستانِ سخن کے دروازے میں، شمشیر کی صلابت اور ساز و بام کا گداز و دوڑوں ضروری ہیں۔ دل بڑی باقاری جادوگری است“

اگرچہ کہتے ہیں عام انقلابی شاعر انقلاب کے منتظر گرجتے ہیں، لگاتار تے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے منتظر گرجا نہیں سکتے۔ فیض صاحب انقلاب کا بیعت گاتے ہیں۔ اُن کا شعور انقلابِ فدا پر از اور نکلنے، بہار سے عبارت ہے۔ طوفانِ برقِ درعد سے نہیں اس کا سبب اُن کی طبیعتِ بدمان پسندی ہے۔ سلام کی انقلابی ہی دلہی ہے کہ یہاں اکثر حالات کی تدابیر نہیں کر سکتے۔ خواہ یہ بیان کتنے ہی پُر سرگرم مقبول کا تعجب کیوں نہ ہو یہی وہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں مقصد کا ذکر مراتب کے کبھی نہیں کیا۔ ہمیشہ اُسے رمزیت اور اشاریت کے پردوں میں چھپا دیا ہے۔ اور زندگی کے تلخ فحاشی کو لب کیوں نہ لے لے رومان کے دلربا استعارے استعمال کئے ہیں۔ وہ سختیاں جھیلنے ہیں۔ جن کی راہیں مصائب سے تھکتے ہیں مگر ان کا ہر کبھی درخت نہیں ہونے جاتا۔ ظن کہ شمشیر فیض کے اس شمشیر کی سے لے گا، وہ دعا دے سکتے ہیں۔

دیباچہ یا تیسری پرشش جنوں پر سلام

عیاںِ فرق سے دار کو نظر نہ لگے

اُن کا تو سن سے بیانِ زما دستِ قدر سے لگے، آئینہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اندر کو مروج ہے

بلا قدر کو جھلکا پار گہوار میں

فیض اپنے مقصد کی محبت میں اس قدر ہستے ہیں کہ انھیں خود اس مقصد کا حواس نہیں ہوتا، اور اس کی یہ منزل ”مروج“ ہوتی ہے ان سب نقائق کے درجہ فیض کی شاعری میں ایک نئی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ انہوں نے اکابریت اور اُلفت بہت، انہوں نے وہ اعتبار کیا اور برحق، اندر کو ابھرتے دینے کی اتنی تیز و کوشش کی کہ ان کے یہاں اپنے نظریاتِ حیات کے اصول واضح اور نمایاں طور پر نظر نہیں آتے۔ اقبال کی عرج وہ ہیں اپنے نظام سے آگاہ نہیں کرتے۔ اگرچہ کہ ان کے بیعت صاحب ایک خاص قسم کی اپنی تحریک سے وابستہ ہیں اور اس تحریک کا مشترک نسب العین اُن کے ہی پیش نظر ہے۔ تو اس سے تو یہ لازم نہ آتا کہ فیض صاحب کی شاعری اس تحریک کا پیغمبر ہو کر رہ گئی ہے، فیض ایک تہذیبی حاکم ایک بڑا شاعر خواہ کیسے حالات میں کیوں نہ ہوں۔ اس کی بلند و بالا شخصیت، اپنی انفرادیت، تلخ و عجز ہے اور اس کے نام پر ہمیں، اُن کے نظریاتِ حیات کی وضاحت ضروری زبان میں ہوتی ہے۔ اس کے یہاں کو مذہب ہم آگاہ ہوجاتے ہیں۔ وہ فیض جانتا تھا کہ کافی نہیں جوتے ان کے ہونے یہاں اسلامی نظریہ حیات کے شاعر ہیں مگر ان کی شاعری اسلام کے اصولوں کا بیان یا پیغمبر نہیں۔ اگرچہ کہ خود اس کی شاعرانہ اور تحقیقی تفسیر تشریح ہے۔

پس یہ بھی نہیں کہ اقبال فیض مگر ہوں وہ مذہب کے شاعر بھی ہیں، اُن کے تعالیاں اور اُبال جہول کی زبان میں وہ دنیاؤں کا فرق ہے۔ نسب العین اور نظریہ کے اعتبار سے، وہ کوئی نہ کوئی مذہب یا مذہب پسند واقع ہوتے ہیں، انہیں یہ بھی روہنی ہیں۔ لیکن اقبال نے اپنے شعور و ادب کو شاعری میں ہی بلکہ فنِ نظم کی طرح پیش کیا ہے اس میں ہمیں کہیں نفی نہیں، مگر اس سے کہہ سکتے ہیں، یہ تو بہت حد تک ہے، مقتضاتِ ربانہ و عقائدِ شاعر ہونے کی حیثیت سے نہ صرف اقبال کے یہاں بلکہ تو فیض کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اُن کا CANVAS محدود ہے۔ ابھی اسے اور دیکھنا ہوتا ہے۔ ابھی توسیع کی ضرورت ہے۔ یہی فیض صاحب کے فن میں اقبال کی کمی جاتی بھی نہیں رہتی ہے۔ ”کتنے“ غالباً اقبال کی نظم طاسق کی دعا سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں

بیغازی رہنمائی پر اسرار بندے

جھپٹیں تو نے بخند ہے زوقِ فدائی

دو نیم این کی شوگرست دریا و صحرا سٹلٹ کرپھاٹان کی مہیت سے رانی

”فیض کی نظمیں شروع ہوتی ہے۔ ط

یہ گلیوں کے سہارے پر کھڑے کہ بجٹا گیا جن کو ذوق گداؤ

زمانہ کی چٹکار سہارے پر جہاں ہر کی جگہ ہماران کی کماؤ

دونوں فن کاروں نے جس طبقے کا ذکر کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہی جگہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک غلوئی کی حالت میں ہے اور دوسرے نوکری کی بدولت دروسے باندھ پڑا ہوا ہے۔

فیض پاپ کی فنکار۔ وہ بے انتہا نفوس کی زبان اور قدرہم جانتے ہیں کہ فن کو پسند بہت دھندلا و مبہم ہو جاتا ہے اس لحاظ سے وہ اقبالی کی نسبت قہر سے زیادہ قوی ہے۔ پیرس ہار بوررمندی کا فلسفہ اگر سے فلسفہ کچھ سیکھتے ہیں اظہار ہے اس کی جھلک فیض کے ہاں بھی ہے۔ قہر سحر کس طبیعت رکھتے تھے، ”سمارتان“ دہلیس کی بیرونی کھنکھ کے تان۔ ان کا نظریہ تھا کہ کوئی شخص خواہ درجہ پو ملانہ زندہ رہے یا نہ رہے ایک دن کو ہمیشہ نیا رہے رکھے کہ کسی کے لیے آزاد ہو جس پر ظلم سہ جلنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اداس کے سرائے ہی ہر لیے عرس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ان کی شخصیت پر دوسرے محلی کا لازم آتا ہے وہ صاحب کو مردانہ دار جھلتے ہیں سے جب تک کڑی اٹھائی گئی تو کڑی رہے۔ ایک ایک سخت بات پر بروں ماڑے رہے

فیض کا مزاج بھی اس درد مند سے زیادہ مختلف نہیں۔ فیض بھی ظلم سہ جلنے ہی کو پسند کرتے ہیں علم کوئی میں مار رکھنے کا آغاز ہے۔ (نہیں شکر ہے۔ ہزار.....) ولد تہی کئی اور طے کا مشفقانہ سبب ہے۔ لیکن جو وہ زمانے کے معاشرتی تقاضوں کے پیش نظر دیکھ کر طرح پروردیش برمان درویش کے نہیں۔ لیکن ان کو علم کی سزا بھی دینا چاہیے ہے۔ سامان کا تخت گانہ اور ملانہ اچھانے کی بہت رکھتے ہیں اور اس بہت ک آہر ش سے وہ میر کی درد مند کو زیادہ صحت مند بن دیتے ہیں۔

اسلوب کے عرصے بھی فیض قہر سے زیادہ قریب ہیں۔ دونوں کی سے خیر ہے۔ دونوں میں بے بناہ سپردگی، دلہانہ ربوہ کی اور خود کو مطلب کی لگن میں گھونپنے کا آغاز ہے۔ ورنہ بیہوشے پلنے کی اٹھ دلی میں دشمنان رہتی ہے۔ گر کھی کھی وقت کی صبر، غفلت و زنی..... میں اس کی لودھم کوڑتی ہے۔ اور جہاں بہت ہی کیجیے تو مر جیے قہر

یا آخری خط، یاس، تنہائی، مرگ، سوز و غمت کے لفظوں سے بھر پور ہیں لیکن یہ اضطرابی جذبہ قہر کے ہاں اور نہ فیض کے ہاں مستقل رجحان طبع کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ رجحان طبع تو وہی سپردگی ہے کہ جہاں۔

وہ جو غم بکف نظر یا منیر سو جان سے خفا ہوا

یا۔ غار میں تیری گلیوں پہ۔ اور یا۔ ہرک فائدہ دہر کی تیرگی پہ سلام

یا پھر یاس عزت داراں کا عجز ہے

کو کہ و جنوں کی خاطر وقت روکے ہم نہ گئے عشق میں ہم تو کیر تہا تہا پاس عزت داراں ہے

اور قہر سے ہے آکے والہ میں اس کی یادیں بچے

البتہ عشق کے سلسلے میں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ قہر کا دل صندرا ایسا گہرا ہے کہ گریبا باؤں کی طرا و وسیع نہیں۔ وہ قرآنا پڑھتا سا مند ہے کہ اس میں نقطہ ایک بُت ماسکتا ہے، ایک پری تنہا لاکہ از غریب انش بود، فیض کے ہاں عشق دروہیں ایک سبلی کا اور دوسرا

سیلائے وطن کو فیض نے وطن سے بالکل الٹی، افکار میں شغف کیا ہے جیسے کسی حسینہ سے کیا ہلکے۔ وطن کو ایک عرصہ فرض کر کے اس سے زبانی سخن کی تمام صفات وابستہ کر دی ہیں۔ وہ ایک ایسے کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کی ہلکے ستاروں سے بھی ہے اور اس کے، اتنے پر افغان خاک دفن ہے اور اس کے کٹھن ہی اور ہوس ہے اور اس کا شہر ہے اور اس کے اپنے شمار نام ہیں اور اس کا شہر ہے اور اس کے وہ وطن ہے کہیں نہیں، کہیں غم نہیں، کہیں خود زندگی اور کچھ وہ آزادی کی۔ ساز و سیما جس نے ابھی گھر گھٹا نہیں کھولا ہے۔

اور شاعری کی روایت میں وطن کو حسینہ تصور کر کے اس سے عشق کرنے کی یہ سیل مثال ہے۔ مٹی کو تیار جیسا کہ شاعر ہی ماز، جام اور شیر کو کچا کر کے کے بار جو یہ اچھوتا خیال پیش نہ کر سکا ہمارے متقدمین نے لکھنؤی رشید کے دور میں گھوڑے اور کوا میں، انسانی سخن کی مٹی میں با وضاعت پیدا کر دی تھیں مگر وطن کو اس رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت ان میں بھی نہیں تھی جہاں مجھے دوسری زبان کا شعور تھا۔ یاد آتا ہے۔ وہ انقلابی دور کچا سناڑ، نہ جہے اس کا عشق تھی پچاس قسم کا۔ اُس نے "خوب صورت عورت" اور "ابھی عورت" سے بے نیاز ہو کر دوسری لایا تھا۔ مگر اُس نے دوس کو دنیا دار اور مقام عورت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ایک نظم میں وہ اُسے ساری اخلاقی پستیوں کا الزام دیتا ہے۔ اُس کے دل کو کیلنی سے آلودہ بنا تا ہے۔ اور پھر کہتا ہے۔

مگر اس صورت میں ابھی اسے وہاں ۔ تو مجھے دیکھ کے ہر ملک سے زیادہ غریب ہے

لیکن بلوک بھی زبانی سطح کا اُس میں رنگ نہیں پیر پختہ ہے جہاں فیض ہیں۔ بلوک انسانی عشق کو ترک کر کے دوسرا عشق اختیار کرتا ہے۔ جب کہ فیض کے ہاں دوزخ عشق شانہ بننا نہیں پھر بلوک کی سیلائے وطن ظالم دجا پر اور بد اخلاق ہے اور بلوکی اُس کے کمینہ صفت ہے۔ جب کہ فیض اپنی سیر کو ایسی گامیاں نہیں مہیتے۔ یہ تو مظلوم ہے۔ ستم رسیدہ ہے۔ یہ تو پریشان حال ہے۔ یہ تو دست عاشق کی مشعل کی چاہتی ہے اور دل دی کی طلبگار۔ یہ اعتدال فیض کی متوازن طبیعت کا کمال ہے۔ اور ان کی طبعی مدعاں پسندی کا نتیجہ! فنیٹریک ہومانیت، بڑی باتار، ستین اور بری رفیع ۱۹۴۵ء میں ایک مدعا کی حیثیت سے اُن کے کلام میں خود مرکزیت بشور سے متروک ہے۔ گلشن انا میں ترک خرابی وہ سدا کوئے ہیں۔ اور کسی کو چاہئے بھی ہیں تو اپنے لئے۔

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں دور تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

جنوب سے خست یا دامن سے الفت یا اپنے نظریہ خیانت سے دل بنگلی ان سب کے بیان میں اُن کی خود مرکزیت کا عنصر بے پناہ رہتا ہے اور چراغ تہ دامن نو دنیا، تنہا ہے، نہیں ایک بچے دعائی کی طرح زندگی کی خرد میوں کا بہت احساس ہے۔ اسی لئے تو وہ پیار کر کے اپنی ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب ایک خواہش کی تسکین ہو جاتی ہے۔ تو وہ دوسرے پہلو سے اپنے حواس کے غم کو جگا لیتے ہیں اور وہ اس غم سے پریشان نہیں، اس سے گریزاں بھی نہیں یہی غم ان کے بیان تخلیق کا باعث بننا ہے۔ اور وہ اس غم کو اُس تک سینے سے لگا لے رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اسی سے تو وہ بدروح لوح و قلم کرتے ہیں۔ وہ اس غم سے نفرت نہیں کرتے لیکن اُن کا مدعا ایک ایسے سین مستقبل کا متناہی ضرور ہے جو غم سے پاک ہو۔ ایک ایسا مستقبل جہاں آرام و سکون ہو، اور جہاں ستر وں کے پھول ٹھکیں اور جہاں انوار رحمت کی فضا پائی ہو۔ اور گہاٹ، انب، طاق تاروش ہو۔ وہ مقصدی شاعر ہیں لیکن اُن کے یہاں مستقبل کا تصور غالباً مدعا دہی ہے۔ اور پھر انہوں نے اپنی شاعری کو مستقبل سے اتنا زیادہ وابستہ کر دیا ہے۔ کہ وہاں حقیقت پر غالب آ جاتا ہے۔

فیض کی مقصدیت، روانیت اور عشق کا بازو لینے کے بعد اور ان خیال دہیر سے موازنہ کرنے کے بعد نا صواب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ظری، ارتقا پر روشنی ڈالی جائے۔ فیض نے اپنے فکری ارتقا کو خوریوں بیان کیا ہے۔

مقام فیض نظر میں کوئی بجای نہیں۔ جو کوئی بارے سے نکلے تو سونے وار چلے

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رمان سے حقیقت کی طرف آتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ تفکیک پسندی نے کہا ہے کہ وہ رمان سے رمان اور حقیقت کے سنگم کی طرف آتے۔ یہ بات اگرچہ صحیح ہے لیکن زیادہ واضح نہیں ہے۔ اس سے تو آگلا و انتہائی طرف ہلکا سا اشارہ یوں ملتا ہے۔ فاکری اور نقار پر کوئی روشنی نہیں پڑتی پھر کسی شخص کی "فکر" صرف رمان اور حقیقت ہی پر مشتمل نہیں ہوتی اس کے ادبی کئی پہلوؤں سے پر ہے چھ فیض کے یہاں ہم ایسے کئی پہلوئیں۔

”نقشِ شہزادہ“ کا قصہ اول میں فیتھ خالص رومانی شاغر ہے۔ حیثیات کی رو میں بہہ جانے والے، اضدادی کیفیات پر غور کیے دانستہ اس کتاب کے دوسرے حصے کی پہلی نظم ”لمحہ“ میں حسنِ محبت میری محبوبہ نامک ”میں غیبت کو ترک کر کے گم و دور کی طرف التفات کرتے نہیں لیکن ان کا لب و لہجہ ایسا ہے جس میں حسوس ہوتا ہے۔ کہ وہ ترک الفت کو ہزری سمجھتے ہیں چنانچہ جب ان کے ذہن پر روان کی پرچہ پائیں نہیں ملتیں ”تو وہ“ سوچ ”جیسی بے لطف نظم لکھتے ہیں اس نظم کے تعلق کو چاہے کتنی بہت کیوں نہ ہو جائے اس کی فنی حیثیت سے مولیٰ ہے لیکن فنی نے ذہن کے حقائق کے مشاہدہ کے معاملہ کرنے کے بعد مجھے بالکل ایسی بے دنگ مقصدیت بالکل فیزیکی چیز ہے۔ چنانچہ اہم نے ”موضوع سخن“ بھی ادھر اہم نے ”رسمتِ نیا اور خدا“ نامہ میں دونوں عشقوں کو یکجا کر لیا ہے جس کا سلسلہ بھی جاری ہے اس سلسلے کی بہترین نظمیں ”مبارک حسن کے نام“ اور ”تم مرے پاس رہو“ ہیں۔

مدرسہ پہلو، اٹالی، فکریہ کہ جسے کہ جب تک وہ فاعل و معانی پر دست دے، اُن کے دل و دماغ پر یاس پندہ، اور قنویں صیغہ پچان، برقی
روح کے مبادی تین ہی شدت زیادہ رہی مثلاً نقش فریادی کی نظائیں: آخری خط: یاس نہیں، مرگ سوز محبت و فیرہ، لیکن جو یہ
نہیں تے نرادی عشق کی شکایت سے کل کر وطن اور انسانیت کو شہوت بنایا تو ان معانی پر یاس کم پڑی۔ اور اس کی کی روش پر پروردگار کے در آئی۔
دست صبا میں: اے کل چاہا بے باغ، اس عشق، امر، بدمر، دوست سے شورش برپا ہو۔ کوئی وکل، غرق و درگہ موم، مزاج۔
ناراض تیسری لکھوں پر۔۔۔ اکت ۵۲ اور فیرہ۔۔۔ اے، منظور اور غزلوں، فیرہ میں وہ کمل طور پر درجائی نظر آتے ہیں۔ اب چونکہ اُن کے
اسامات و بذات انفرادیت کی شخص میں فیرہ نہیں۔ ہے، بلکہ انما معنی و معنوں میں پھیل گئے ہیں اس لئے اُن کے زادیہ نظائیں بھی
غرض و ارمیدہ بنی آگئی ہے۔ اور زمانہ ان فیرہ میں تو یہاں معلوم ہوئے کہ وہ اس لئے بنے ہوئے تھے کہ وہی صحیح نہیں سمجھتے بلکہ فیرہ میں کے فیرہ ہیں
تھہرے کے دیکھ باؤں میں کہنے ہیں۔

ہر سلا و نوئی برش غضب کا انگار

طیش کی آتش بڑا۔ کہیں ہے لاؤ : دود بت ہوا غلڑ کہیاں ہے لاؤ

اور کہتے ہیں ۴۵

یوں عرض و طلب کیسے دل شیراز پرانی بختی تم کا صحنِ خودا کو کب نہ سکر مانی ہے

افریقا کی توجہ کو تو فی دفعہ یہ ۱۰۱ جہاز ان افغان کھڑے تھے کہ انہوں نے - AFRICA COME BACK - بیباک کیا۔
 ان پر دشمنوں نے کھسکا لیکن معصوم ایذا ہوا آج کے یہاں کی تیرت کا مرقعہ عجیب۔ ان ہمنوں میں جو خوش و خوش ملتا ہے وہ فیض کے ہاں مستحق
 حیثیت انصاف نہیں۔ نہ ان کو ان کے فرائض کے بعد نہ پھر اپنے غمخسوں۔ جیسے دیکھی غمخس ہوت اسلوب میں نکلیں کہنے لگے ہیں دیباہ دار۔ تم عرب
 ملے گھر۔ نہ ان کیوں انکس فرائض کے بعد نہ ان کے فرائض میں شامل ہو کر ان کی فرائض اور مدت مہاس نقش فرما دی ہے کہ تھک کر نہ رہا۔

پاس رہو۔ منظر۔ دستِ قہر سنگ آئدہ - شام۔ - بوائی - مدد فیلڈ۔

فیض صاحب مختلف ذہنی جہلوں سے گزر کر اب اس غزل پر پہنچ چکے ہیں جب کوئی فنکار عظیم تخلیق پیش کرتا ہے۔ اب انہوں نے ہماری حالات سے متاثر ہو کر فوراً نظم لکھ دینے کی عادت ترک کر دی ہے۔ اب ان کا سماجی شعور بھی عیال کے مواصلے کو یکجہ ہے۔ اب ان کے شاہدے میں مکمل ابعیت لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو "شام"، اور وہ اپنی اپنی حیثیت کو بھی پوری طرح سمجھ گئے ہیں دستِ قہر سنگ آئدہ "ادلان" کا فکری ارتقا اب ایک متوازن صورت اختیار کر چکا ہے۔

اس میں مناسب معلوم ہونا ہے کہ فیض صاحب کے اسلوب کے متعلق چند باتیں کہہ دی جائیں۔ فیض صاحب اگرچہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی نظموں میں بھی غزل کی خشک ہوتی ہے۔ دی ربیت، دی اضریت، دی لا اہتیا ربیت اور سیانی ایماز وفاق غزل کا شعور ایک مطالب رکھتا ہے۔ لیکن اس کے بدلے تو کتنے ہی ہرستے ہیں اور وہ مختلف موقعوں پر پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ان کی لا اہتیا ربیت ہے۔ پھر اس میں خواب کی سی دھندلی نضا ہوتی ہے، غمویت کوئی ہے، اور انزل اور ادب کے سروں کو ملا دینے والی آفاقیت۔ فیض کی نظموں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بعض اوقات کسی ایک واقعے سے متاثر ہو کر نظم لکھتے ہیں لیکن زمانہ رنگائی آفاقیت کے علاوہ وہ غزل کے فخر کی طرح واقعاتی آفاقیت یا لا اہتیا ربیت بھی رکھتی ہے یعنی مختلف انروز واقعات پیش آتے ہیں وہ نظم پر بھی جا سکتی ہے۔ ہم جو ہر ایک راہوں میں مارے گئے، اس کی بہترین مثال ہے۔ غزل فیض کے مزاج میں رہا ہوا ہے۔ چونکہ گزرا اس کے اسلوب کی نمایاں ترین صفت ہے لہذا (PATHOS) ایک صفت اسلوبی ہے جو صنفِ غم کے جذبات میں نہیں بلکہ دوسرے جذبات مثلاً ایثار، محبت، وفائیت، ندرانی وغیرہ کے اظہار و بیان میں بھی پائی جا سکتی ہے۔ گزرا ہمارے جذبات میں ترش پیدا کرتا ہے اور ہمارے احساسات کی تہذیب کا ہے۔ فیض صاحب کے اسلوب میں گزرا جتنا افراد ہے کہ اکثر تہذیب کی یاد رکھتی ہے۔

اس گزرا در غزل — کی فاطمہ فیض صاحب نے عینی تجربات اور دیگر ایسی ذراعات سے صنفِ غزل پر لیا۔ اور کئی حد تک اپنی روایات کے سہارے، میدانوں میں قدم اگے بڑھا ہے۔ انہوں نے غزل کی بروہش کی خاطر ہمیشہ زندگی کے لئے حسن کے استعارے استعمال کئے اور مزاح سے دامن بچا کر شعور و علامت کے اندر تہذیب و معافی کا خمیہ دار بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں شکل سے کسی نظم کی ایک ہی سطح لے گی جبکہ بعض دوسرے بڑے بڑے شعراء کے یہاں ایسا ہے۔ مثلاً — محمد نذیر قاسمی جن کے کلام میں زندگی کی سی گہرائی ہے اور کہانات کی سی وسعت لیکن اسلوب کے اعتبار سے ان کا کلام بھی صرف ایک سطح تک ہے۔ فیض صاحب نے غزل کی ایک سطح کو توڑا سا بدل دیا ہے۔ ہماری قدیم شاعری میں بوسہ بوسہ تھا کہ فریاد کو داخل میں ہو گیا یا معروض کو موضوع کا حصہ بنا کر بیان کرتے تھے فیض صاحب کے یہاں ایسا ہے کہ وہ موضوع کو مزین پر مسئلہ کر کے یا جذبہ کو قاری پر محیط کر کے شریعت میں گویا انہوں نے نیا غزل کو بنایا ہے اور میں پر تہذیب یا ہمارے گنگ جڑھا رہا ہے کیونکہ وہ مادی نقطہ نظر رکھتے ہیں اور اسلئے احساسات و واقعات کے شاعر ہیں۔

نرسہ بونہوں کی مچلوں کی پابستیم

تیسرا انہوں کی خوشی حسرت میں ہم

فیض صاحب فضا کی تعمیر میں بھی منفرد ہیں۔ ان کی فضا میں الفاظ کی صوتی اہمیت کی طرف کم تر مبالغہ کی جاتی ہے اور مزینیت کی طرف زیادہ۔ رات، چاندنی، آواز، حسرت، درد، سوچ، گزرا، انتظار، ممکن، انزوی، گزری ہوئی انبساط کی یادوں، حرم، نائے اور احساسِ سن وغیرہ کے عناصر ان کے یہاں فضا پیدا کرتے ہیں۔ فضا کے لحاظ سے ان کی شاعری انہیں "تہذیبی" —

”تم میسر پاس رہو“ اور منظر ”جس کی ابتدا ابلیس ہے۔

میکوڑ ملنے شہر منزل و در صافہ نام
بام پر سینہ ہنسا ہٹا آہستہ
اس منظر میں موتیہ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

فیض صاحب کی شاعرانہ لہجہ (Diction) اردو میں خاصی اہمیت رکھتی ہے ابھوس نے اکثر دہشتہ تراکیب نامی طرز کی کاوی میں جن میں کچھ تو قديم مشرقی ادب سے لی گئی ہیں اندر کچھ جدید مغربی ادب کی روشنی میں انہوں نے خود روشنی کی میں صفت مقنوب TRANSFERRED EPIHNET کا استعمال ان کے یہاں بہت زیادہ ہوا ہے۔

افکار کے انتخاب کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اعلیٰ تعلیمات و ادب عادات بہت رستے ہیں۔ موسیقی، بام حرم، سفر کے سال، یونس، ایلان موسی، اسس، بوس، مسجد، سنت، مغرور، دیوں ہی ہمیشہ کھلتے ہیں ہم نے آگ میں پھول، ہمارت ابراہیم، اور نظم حسن اور موت میں حسن کے متعلق کہتے ہیں۔

کنار و حرکت حوت میں اسے ملاتی ہے
سکوت شب میں زشتوں کی ترشہ خوانی
عبد اللہ طحان نے کو حنت کے پھول لاتی ہے

خزانے، مینار سے بھی فیض ہیں اسطی رنگ پایا جانکے۔ مثلاً وہ شروع سے آج تک دعائیں دیتے آئے ہیں ”نور و وقت“ نامی سے لیکر ”سکون لے دیکھیں“ عیرب پا لگا دل کو ”نگ ان کی اکثر نظموں کا یہی انداز ہے۔ ہلکاب تراشوں نے ایک نظم ایسی کہ ان جن کا عنوان ”حوت“ ہے۔ مگر شہر زندگی تیسرا شکر کس طور سے ادا کیا ہے اگرچہ اس میں خدا کی حمد نہیں لیکن اس میں ایک مذہبی شخص کی طرح بھان نٹا اور مزاج کی عقیدت کشی اور نواز منق کے عائد فرور میں فیض صاحب کی علامت بھی زیادہ تر اسطی ہیں اس افادہ میں ان کی علی مدلی بھی شامل ہے، ادبی ماضی سے ان کا رگاڑ بھی، اور اس کا بھی ان کی مقصدی شاعری کا خطاب کس معاشرہ سے ہے۔

دیو کی تحریر کرتے وقت وہ نہانی حسن کے لوازمات کا ذکر کرتے ہیں اور ان سب لوازمات کا ذکر مطلوب کی ندرانی کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے، اس اس تراں اور پرموز موسیقی پیدا کرنے کیلئے۔

فیض صاحب کی موسیقی، صمیمی، انفرادی اور سگوارسی ہے۔ اس کا اثر ایسا ہے کہ انسان، ذہن کا جام گوارا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ان کی موسیقی خیال اور الفاظ کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور کثرت (SYLRYC) کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلے کے پیچھے بھی مردان میں مانتے ہیں۔ شہر، شہر پر سکون اور سکون لازمی ہے نیری موسیقی۔ کبھی کبھی فیض خیال کے قافے کے مطابق ایک ہی نظم میں ہی کثرت (PATTERN) تبدیل کر دیتے ہیں۔ مثلاً ”ناریں تیری گلوں پر“ دیکھتے پہلے بند میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہے۔ اور دوسرا اور چوتھا دوسرے بند میں پہلا مصرع منفرد ہے، باقی تین ہم قافیہ تیسرا بند چوتھے مصرعوں کا ہے۔ اور اس میں پہلے تین اور پانچوں مصرع آپس میں قافیہ ہیں۔ باقی دوسرے منفرد۔ چوتھا بند دوسلوں پر مشتمل ہے۔ پانچواں اور آخری بند سب مصرعوں کا ہے۔ اس میں پہلا تیسرا، پانچواں، اور چھٹا مصرع ہم قافیہ ہے دوسرا اور چوتھا آپس میں ہم قافیہ اور آخری مصرع نظم کا عنوان ہے۔ اور منفرد ————— غصہ کہ وہ اپنی موسیقیت کا استعمال خیال اور شاعری کی ضرورت کے مطابق کرتے ہیں، اور اسی لئے ان کی موسیقی تنوع سے ناکشا نہیں ہے لیکن اس (دیکھ صفحہ ۵۵۴ پر)

ساحرِ الہ آبادی

فیض احمد فیض

ادب و فنون کی شاعری

ہرگز کہ بڑے، اگے زمان و مکان کی پیروی نہ کرتے ہیں ادراک کی نظری صلاحیتوں اور ذہنوں کو کسی خاص ملک یا جغرافیائی تقسیم سے وابستہ نہیں ہوتا بلکہ یہ سب چیزیں انھیں مبداءِ فیاض سے ملتی ہیں وہ اپنے ساتھ ایک مکمل دورے کر آتے ہیں لیکن یہ فرد زمان و مکان کی وجہ سے وہ خط اور خط کا ذکر کرتے ہوئے جو صاحبِ یاد آتے ہیں۔ اور اگر سیالکوٹ کا نام آیا ہے تو پہلے انتخاب الہ آبادی کو لیتا آتا ہے۔ اس طرح جب مراد آباد کا ذکر کرتے ہوئے جو صاحبِ یاد آتے ہیں۔ اور اگر سیالکوٹ کا نام آیا ہے تو پہلے انتخاب الہ آبادی کو لیتا آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شہباز کے ساتھ سوئی۔ حافظ اور عرفی کا تصور ابستہ ہے۔

فیض کے ذہنی ارتقاء اور تربیت میں اگر ایک طرف صاحبِ زادہ محمود انظر، ڈاکٹر رشید جہاں پیرس اور تاتیر مرحوم جیسے افراد کا حصہ ہے تو دوسری طرف مغربی اور شرقی ادب کے مطالعہ سے ان کے ذہن کو ادبی بلاتلی ہے۔ خصوصاً انگریزی ادب کے مطالعہ کی وجہ سے وہ ادب کے جدید رجحانات سے بلا واسطہ آگاہ ہوئے۔ عربی زبان کا مطالعہ فیض کی شخصیت کے لئے ایک نیا افق بن گیا۔ اور فیض عشق و زندگی کی معانیات کے اسی زندہ سلسلہ کے رمز آشنا بن گئے جو عربی سے شروع ہو کر فارسی کے وسیلہ سے اردو کی دنیا تک پہنچا۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ میزان میں ہمیں یہ عبارت جلی حروف میں ملتی ہے: "پطرس، ہاتیر، حسرت، محمود، اور رشید جہاں کی یادیں وہ یہ انھیں بزرگوں کی رفاقت کا اثر تھا کہ جب مشاعرہ میں انھیں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پر ترقی پسند فیض اس سے دور ہونے اور اسی تحریک کے ساتھ ساتھ ان کا آئنا شبِ شاعری ہم ادب کے نعت الہا رنگ پر پونجا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے وقت کی کوکھ سے ہماریا قلمس لئے نوجوان طبقے نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور یہ تحریک دیکھتے دیکھتے زندہ حقیقت بن گئی۔ معاشرہ کی مثال ایک دیباچہ میں فیض کی ہے جس میں لفظ بہ لفظ نئی نئی باتیں اٹھتی رہتی ہیں۔ اسدہ چیزیں ہر اس کے نرات سے ہم آہنگ ہوتی ہیں وہ ان میں جو ہیں تحلیل ہوئی چلی جاتی ہیں۔ اور کیفیت اور بے قول ہوتی ہیں وہ گنہگار آگئی ہیں۔ حاتی اور ان کے ہم عصروں کی آوازیں ہمارے ماحول سے گزرتی رہیں اور سفر کار اس نفاذ میں تحلیل ہو گئیں۔ اسی طرح ترقی پسند رجحانات بھی زمانے کی ہم آہنگی کی وجہ سے ہمارے

اگر تیزی سے حرکت کرتے، اور بہتر اثر پذیری کا سلسلہ جاری ہے۔ ترقی ترقی کا فیض صاحب کے الفاظ میں "ان خرمیوں سے عبادت ہے جن سے ملت کے سیاسی اور اقتصادی امور میں ایسی ترتیبات پیدا ہوں جن سے کل ترقی کرے"۔
فیض صاحب نے انھیں نظریات کو پیش نظر رکھ کر پرورش لوح و قلم کی۔ ہندوستانی معاشرے پر ایک مدت تک جمود اور فطرت کا دورہ رہا۔ پھر ادب بھی اپنی روایتی انسان کی وجہ سے ایک ہی ڈگر پر چل رہا ہے۔ لوگ بڑے اور مسرور خیالات سے تنگ آچکے تھے جس کے رد عمل میں جم و جالی اور ان کے ہم عصروں کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں کا اہل علم طبقہ ہر اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار تھا جس میں کچھ حقت ہوئی ایسے وقت میں فیض نے اپنی شاعری کی ابتا کی نقش فرمادی ہے وہ زمان کی فضا سے نکل کر حقیقت کے نیچے برسے میدانوں میں پہنچ گئے۔ ان کا رنگ دوسرے نوجوان شعراء کے کہ میں جھلکے اچھے "دستِ صبا" اور مزدانِ نامہ میں تو وہ اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں انھیں یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے۔

ہم نے جو طرزِ فضاں کی ہے نفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزیں بٹھری ہے
فیض صاحب اس وقت کے طبقاتی کشمکش اور سماجی ناہمواری سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مائوسی نظریات کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں وہ اس جنگِ سرسبز، نعمت میں خود کو ایک سیاسی سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے "مرد مارے سرسبز داری جنگِ حرف مزدور کی جنگ نہیں ہم سب کی جنگ ہے ہمارے دوست اور دشمن بھی مشترک ہیں۔ مزدور اور کسان کی بہبودی سب کی اجتماعی بہبودی کے مترادف ہے"۔

وہ ادب کو سماجی ترقی اور عوام کی بہبودی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر ان کے الفاظ میں: "ہم را فرنگے افلاطون: خبر حمار کے نوجوانوں میں فیض ہی وہ تنہا شاعر ہے جس کے ہاں محسوس انھنوں کے اندر بہت کم ہے اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ فیض کا محبوب اس کا مقصد اور اس کا نظریہ ہے۔ اور یہ سلسلہ حقیقت ہے کہ جس قدر نظریہ عشق میں غفلت اور پاکیزگی کا عنصر ہوگا۔ شاعر کا کلام بھی شہوانیت، سوتیلہ اور منہ پٹائی تو رافع ہوگا۔ اور اس راہ میں جتنی بھی معیبتیں آتی ہیں وہ جذبہ عشق کی سہ کو اور بھی فروں کر دیتی ہیں۔ کسی کا مشہد شاعر ہے۔" ۵۸

وہ راہ راختی راہ نسبت عشق ہم را دست و ہم خود منزل است
ای ما شہر چہینے کے ہاں ہمیں بہت سی غلطیوں سے واسطہ بھی پڑا۔ لیکن جب عشق صادق ہو تو رستے کی گادیں کاوش نہیں معلوم ہوتی۔ زمانے کی طعن و تشنیع سے داغ غم تو ابھر سکتا ہے لیکن داغِ خداست کبھی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ ۵۹
اس راہ میں جو سب پہ گزرتے وہ گزری یہ تنہا پس زنداں کبھی رسوا رہا نہ
گرجے میں بہت شیخ سرگوشہ سبز ۶۰
چو ہاں نہیں غم نہ کوئی ناؤں و شام ۶۱
اس عشق ۷۰ اس عشق پہ کلام ہے مژدوں ۷۱
ہر داغ جاس دل میں بجو داغِ خداست
اس تشنیع و ملامت کے باوجود وہ پرورش لوح و قلم کے لئے تیار ہیں۔ ۵۸

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے ۶۲
جودل پر گزرتی ہے رقم کرتے ہیں ۶۳
وہ معاشرے کی ناہمواریوں کو دیکھتے ہیں۔ یہاں کی منڈیوں میں چاندی جیسے بدن چنگیوں میں، بجتے ہیں۔ سرسبز دار

مزدور کے جسم کا اہم فریضہ ہے۔ اور ذرخشت کرتا ہے۔ کسان کو اپنی قوت اور محنت کے شر سے پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان ناقراؤں کے فریضوں پر سرمایہ دار کی نگاہ چیل اور کوؤں کی طرح جی بستی ہے۔ ہم شاید اس کو جبراً احساس اس لئے نہیں کرتے کہ انہوں نے ہم کو اس کا عادی بنا دیا ہے۔ لیکن شاعر حساس ہوتا ہے۔ فیض نے اس کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔

وہ ان سب حالات پر غور کرتے ہیں۔ ان سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ضبطِ محبت، مشروطِ اذیت، محبت ہے۔ وہ جھنجھلاہٹ اور چیخ و پکار میں یکسر معروف نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی ایک سنجیدہ اور دوامِ انداز میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ٹھہر لو کہ ساتھ ساتھ مشابہت بھی ہوتی ہے اور سلاست و مدد لاتی بھی۔ ان کے کلام کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ دل میں رہ رہ کے ایک کنگ موبیڈا کرتا ہے۔ تیری طرح دلوں کو چھینتا نہیں بلکہ پھانسی بن کر دلوں میں چھتا رہتا ہے۔ میر صاحب کا یہ شعر شعرِ خاص کو یاد ہوگا

نہاں ہی سے بھجا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغِ عکس کا

اس شعر میں جو انسانی اور دروہانگی کیفیت ہے بالکل اسی قسم کا تاثر اور کیفیت فیض کے شعرِ اشار میں موجود ہے۔

آتشِ نیک مرخ و سبیدیلوں کے ساگر گتے اک دم و حقانی اولاد پہ کیا گذری ہے

موت اور زینت کی رشتہ صفت آرائی ہم پر کیا گذری ہے

پھر کوئی آیا دلِ نار نہیں کوئی نہیں راہِ ہموار کھین درجِ طاعت لگا

ڈھلچکی رات کے سرے لگا سوں کاٹنا رکھ کٹانے لگے ایذا اور بین خوابِ بد چراغ

گن کر رہے نہیں ٹھوٹھا اور سے جینا دیا رخ اپنے بے خواب کو اڑوں کو مقتل کرلو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

ان اشار میں نہ سنت و تیر کی طرف کی بجلی انسانی کی آواز ہے بلکہ صوتی اعتبار سے بڑی مناسبت اور روانی ہے فیض کے اشار میں روایت سے بدلتے نہیں بلکہ وہ انسانی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور یوں زندگی کے نئے تقاضے ان اصطلاحات کے آجوتوں میں جگہ جگہ اٹھتے ہیں۔ ہم روایات سے خیر خواہ نہیں کہتے کیونکہ یہ ہمارے ادب کا مزاج بن چکی ہیں۔ اور ہمارا وجدان اور آواز ان سے بالکل ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان روایتی اصطلاحات میں سب ہی بے کار اور بے وجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اگر ان سے کام لینے والے ہیں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ مناسب جگہ اور مناسب الفاظ کی ترتیب کے ساتھ ان کے توکل میں متاثر حسن اور ایجاد کا پیرا ہونا یقینی ہے اور ہم عجیبہ سے عجیبہ خیال اور طنز سے مزین شعری اصطلاحات کی مدد سے ادا کر سکتے ہیں۔ فیض نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ انھوں نے روایات کو ترک کرنے کے بجائے ان میں ایسی جدت آمیزی کی ہے کہ شعروں میں سٹھاس پیدا ہو گئی ہے۔ جیسے مولانا اور سجاد ہاشمی کے ہمارے انہوں نے ایک طویل داستان کو ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔

ہے وقت اب بھی دشتِ آفرین پائے سنوں سہ اب چنڈا مرغیلاں ہونے تو ہیں

جا

نہ لکھ کھلیں زمانہ سے لئے نہ پیلے ہے عیب رنگ میں اب کے ہمارا گذری ہے

سادگی اور روانی کے ساتھ ان کا سبک اور سلاطینِ انداز نے حدِ دلکش اور قابلِ داد ہے۔ یہ اندازِ موزن غزلوں ہی میں موجود نہیں ہے بلکہ شعروں میں بھی طے ہے۔ اگر ہر انداز اور زمانت ہی ہے جو طرزِ انداز کے اعتبار سے انہیں تمام جدید شعرا میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

ہر چند کہ الہ کے بہت سے اشد اور ظہیں ماسی ہیں جن میں رفو یا حیات کا بروہ استاد میز ہو گیا ہے کہ اس کی وجہ سے ذہن شکن کافانی العیر تک نہیں پہنچ پاتا ہے لیکن انفراد اور الفاظ کی صحتی ترکیب ایسا اثر پیدا کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے باوجود متاثر ہوتا ہے اس سے مسٹر لارٹ برج کے اس عجیب و غریب مقولے کی واقعی تائید ہو جاتی ہے کہ۔

فیض لام اور سب الفاظ کی ترکیب کے ساتھ جب دلکش اور پھرتی تشبیہات اور استعارات بھی استعمال کرتے ہیں تو مختار میں بے حد اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن تشبیہ و استعارہ کے متعلق فیض صاحب کے نظریات حقیقت سے زیادہ قریب نہیں ہیں ان کا کہنا ہے ”تشبیہ یا استعارہ خواہ ادبی تجربہ کوئی معقول نہیں فقط ایک راستہ یا ایک آگے اور ہر راستے آگے کی طرح اس کا حق بھی انسانی ہے۔ ہم کسی نثر کو تشبیہوں اور استعاروں کی وجہ سے مستحسن یا مذموم قرار نہیں دے سکتے۔ اگر غصہ سے دیکھا جائے تو یہ نثر کلام کا مظاہرہ نہیں بلکہ غمزہ کا اظہار ہے۔“

لیکن اگر ہم حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ عمدہ تشبیہات اور استعارات وہی شاعر استعمال کر سکتا ہے جس کا احساس جاگتا ہوا ہو۔ جس کی نظر تیز ہو، اور شاہد و سہ ہو۔ در نہ عام طور پر شعراء و موجد تشبیہوں اور استعاروں سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ اس لئے عمدہ اور حقیقی تشبیہوں اور استعاروں کے بغل استعمال سے یقیناً شاعر کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض صاحب کے کلام میں جہاں جہاں ہم کو تشبیہاتی اور ”استعاراتی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً ان کے بہترین منتخبات میں سے ہیں ان کی نظم ”نہاں کی ایک سیج“ ”زندہ کی ایک شام“ یا ”یاد کو نشان کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ غر میں نہ ہر چہری چہرہ صدیق جالیں : دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا دور چلو کوئی زنجیر پھیل کے مدنی : دور اتر اسی تارے کے بگڑ میں فخر

یا

اس قدر چار سے اے جان جہاں رکھلے : دل کے رنسا پہ اس وقت تری یاد باغ
فیض صاحب کے چار شعری جملے ”نقش فریادی“ ”وصف صبا“ ”نہاں نامہ“ اور ”دست تہ رنگ“ ہیں میزان کے نام سے ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کے شعری جملوں کو اگر یکجا کیا جائے تو دوسرے بہت سے شعراء کسی ایک ضخیم دیوان سے بھی حیات میں کم ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں میر درد کے متعلق لکھا ہے۔ کہ ”دیوان مختصر است لیکن چون کلام حافظہ سرا یا انتخاب“ ”یہی بات فیض صاحب کے متعلق بھی جاسکتی ہے۔ ان کا کلام جو کچھ بھی ہے اور جس تند بھی ہے اپنی انادیت کے الفاظ سے گوند پڑے۔

ان کے آغاز و انکار نے عوام اور شعرا کو اپنا تر بیت ہی گرا چھڑا ہے۔ آج کل کے بیشتر نوجوان شعراء کے کلام میں اس کی بارگشت ہم کو ات صاف نائی دیتی ہے۔ فیض سے جو نظریات اور ادبی ہے اس کا عمل اور نہ عمل دہری ہے۔
آج کا دور تہوری نصیب ہے۔ جدید وسائل اور ذرائع نے انسان کو میزانی اعتبار سے دوسرے جوت بھی ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے۔ ہر ملک دوسرے ملک کے رجحانات اور حالات سے نہرونی واقفیت رکھتا ہے۔ پوری دنیا ایک مکان ہے اور تمام انسان اس کے مکین۔

اس لئے آئینہ کے علم و فن میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ اس میں تمام ادراک آدم کے لئے پیغام اطلاع دیکھ کر سامان ہو جس میں فن کو آفاقی نقطہ نظر سے پرکھنا چاہیے اور ہر اس فن کی شہادہت کو سہرا بنانا چاہیے جس میں تمام نساویں کے دل کی دھڑکیں صاف سنائی دیتی ہوں۔ فن کار کا فن کسی شخص کو ملک یا خطہ ارتض کے لئے نہیں بلکہ پوری جی نونہ انسانیت کے لئے ہو۔ جس سے انسانیت پر ہیئت مجموعی ترقی کی بلند ترلوں کی طرف اپنے قدم بڑھ سکے۔ اگر ہم اس نقطہ نظر سے فیض کے کلام اور ان کے سارے کام کا جائزہ لیں تو ہمیں دو یقیناً ایک گنج گراں مایہ معلوم ہوگا۔ اس میں زمانے کے تقاضوں سے نہ بے لگتہ ہی بنے گی اور محو ہوئی انسانیت کی چیخ و پکار بھی اور اس کا کرب و درد بھی۔ فیض کا وطن سارا جہاں ہے۔ ان کا درد انسانیت کا درد ہے۔ اور ان کی کوزہ زمانے کی آواز ہے۔ اس لئے ہمیں مانتی ہے اس پر خوشگوار پرگوش برآواز ہونا چاہیے۔

”گری ہوئی تو میں میخ و مٹا ایسے عالی نظرت انسان شاد و باور پیدا ہوئے نہیں۔ بن کی ذات سے اگر قوم کو براہ راست کرنی۔ مستند نامہ نہ پڑھو پڑھا جو۔ لیکن کسی علم یا صنعت یا لڑائی میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش نمود میں آیا ہو۔ اور سلف کے ذہن میں کچھ نیا سربہ شامل ہوا ہو ایسے لوگوں کی نالافت پر غور کرو ان کے دگر میں جہاں بین کرنی اور ان کے نوا و افکار سے مستفید ہونا تو ہم کے ان ترشوں میں سے بن سے غافل رہنا تو ہم کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے۔“

فیض فکر و فن سے ایسے میں

(صفحہ ۵۵۹ سے آگے)

کا اندر لنی آئیگ ہر بگ ایک ساقی ہے۔

ٹی ایس ایبٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب کوئی شاعر تخلیق کی منزل پر پہنچتا ہے اور فن کا پورا پورا بہار قدرت حاصل کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہ ایک منظم ڈرامہ لکھے جس میں زندگی جیسے ہی سمورے اور اسے اپنا عقلم کار نامہ بنا دے۔ وہ کہتا ہے۔

The first thing of any importance that I discovered was that a writer who has worked for years, and achieved some success in writing other kinds of Verse, has to approach the writing of a Verse play in a different frame of mind that to which he has been accustomed in his previous work.

فیض صاحب اپنی حدود میں مکمل کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور اب ہم ان سے کسی ایسی ہی تخلیق کی توقع رکھتے ہیں جس میں وہ اپنے لیے کوہل کو بات کریں اور کوئی عقلم کار نامہ پیش کریں۔ چونکہ ابھی تک ان کے پاس ایسی کوئی نظم نہیں جس پر فنکاری اور فن کی طور پر ”سنبھ“ کا اطلاق ہو سکے۔ اندھے بین الاقوامی فیض ادب میں پیش کیا جاسکے۔

نغمہ نقی

فیض کی شخصیت

شاعری کے پس منظر میں

فیض کا ادب ان شخصیت کے حامل ہیں جس سے مراد ان کے ہونے والے خون میں لیشرب ہوئے جسموں سے محبت کی ہے۔ ان کے درد کو اپنا درد سمجھا ہے۔ یہ شخصیت کی گرائی نہیں تو انداز کیا ہے؟ ان کی شاعری میں قدم قدم پر اخلاقی اقدار ملتی ہیں۔ یہی شخصیت کی استواری ہے۔ جس نے فیض صاحب کو مریدانہ محبتوں والی محبوبہ کے ساتھ ساتھ "بیلی وطن" کا عشق بھی دلایا ہے۔ ان کی شاعری کے موجودہ دور میں تو یہ وطن کا عشق زیادہ تند و تیز ہے۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہیں ان کے دل سے دھڑکنے لگے ہیں۔ لیکن یہ آئینہ ہمیں اور یہ نئے کسی پیکر انسانی کی جدائی پر نہیں بلکہ لیلی وطن کے غم میں ہیں۔

پہا ہے اسی رنگ میں لیلیٰ وطن کو تڑپے اسی نوریہ دل اس کی گس میں

مستقل مزاجی اور غشی ان کی شخصیت کا وہ عنصر ہے جو ان کے نثر اور نثری دنیا میں نمایاں ہوجاتا ہے۔ انہوں نے ایک خوبصورت امتزاج پر غور کرنا نہ ہونے کا تھا کہ ان تمام فنون لطیفہ موسیقی، ہجو، نثر اور شاعری وغیرہ کی ترقی کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ان کی ادبی زندگی وہ فنون کے لئے کچھ دینا چھوڑ سکیں جیسا کہ ہمارے بزرگ ہمارے لئے پس بڑھ گئے ہیں۔

مہنت وہی عظیم ہوتی ہے جو ماحول کو اپنے مطابق ڈھال لے۔ فیض صاحب نے بھی درگوں حالات میں اپنے عزائم کے ہمہ تن ماحول کو اپنا طبع بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور خود بھی وقت کا ساتھ دیا ہے۔

اگر جذبات میں صداقت ہو خیالات میں پابنداری ہو اور قوی و ملکی ہفتا، پتھر، پتھر کیوں تو بڑی سے بڑی رکاوٹ منزل تک پہنچنے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ فیض صاحب کو پیشہ اپنے عزائم پر بیروسہ رہا ہے اور اسی انداز سے جیل کی تاروں کے فضا کو کو بھی منور کر دیا ہے! کبھی تو ان کے انکار کی بدھشی ان کے ملک و قوم کے لئے چراغ راہ ثابت ہوگی۔۔۔ اپنی اسی تحریک کی تحریک میں نہیں صاحب پر جو گزری وہ انداز کی لیکن نفس مطمئنہ تو دیکھتے کہتے ہیں۔

جو ہم پہ گزری سو گزری بگڑا شرب بھراں ہمارا، اشک تیری عاقبت سونا چلے

تصویر ہماری شاعری کی وہ صفت ہے جس پر تمام گزشتہ اساتذہ نے پس آواہی کی ہے۔ تصویر سے بعض روایات، منسوب کی ہیں یعنی تصویر میں محدود کی تفریق کر کے شاعر اپنی جہول بھر سکتا ہے لیکن نقیب صاحب کی وضع واری سے کسی وقت بھی پنپ دامن کو دسے صلیں بچا اور کی ہوئی دولت سے نہیں بھرا۔ ان کے قصائد کی ذات ایک محدود نہیں۔ بلکہ انسانیت کی مزاج اور وطن کی عظمت کے لئے وقف ہیں۔ انقباض کی طرح نقیب صاحب بھی اُمید کی خوشیوں سے فیضیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے ذہن میں بھی یاموسی کفر ہے۔ پنشنہ پر کمن معرور ہے۔ ان کی زندگی میں ایسے لحاظ بھی آئے ہیں کہ کامل یو جریل میں قید تہائی کے ساتھ ساتھ قلم کا فزکلب رسلے وغیرہ کی ہوائی بھی برداشت کر لی پڑی ہے۔ لیکن اس وقت بھی نقیب صاحب نظر نہیں آتے۔ بڑے فخر استقلال سے کہتے ہیں۔

مستاع روح و قسم چین کی تو کیا ہے ؟ : کر خون دل میں ڈوبی ہیں نگہیں بھرا
زبان بزدلی کو بھی نقیب صاحب کی شخصیت پر سکون سے یہ کہہ کر اپنے لئے باعث تسکین بنا لیا ہے۔
زبان پر ہر گئی ہے تو کیا کر دکھائی ؟ : ہر اک صلف و زنجیر میں زبان چھپا

اور شاعروں کی طرح وہ فلک سے اپنے غم کا گلاب نہیں کرتے یا فلک کو اس کا قدما نہیں ٹھہرتے بلکہ اپنی قوت ارادی پر مجبور دیکھتے ہیں۔

بجائے اس کے کہ وہ شاعری کریں یا فلک سے شکایت کریں۔ وہ امیر و قوت ارادی سے کام لیتے ہوتے کہتے ہیں۔

یہی ہوتے ہیں وہی ہوتے ہیں غم سے خلق ؟ : زبان کی رسم ہی ہے نہ اپنی ہریت ہی

یہی ہوتے ہیں وہی ہوتے ہیں غم سے خلق ؟ : زبان کی ہریت ہے نہ اپنی ہریت ہی

اسی سبب سے فلک کا گلاب نہیں کرتا : تبس قزاق میں ہم دل پر امن کرتا

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شاعر وہ ایسا پڑا نکار تہائی پسند ہوتی ہے۔ نقیب صاحب ایک بڑے شاعر بھی ہیں اور فن کار بھی۔ لیکن ان کا سلاطین بالکل برعکس ہے۔ جس کی مثال ہیں حیدر آباد جیل کے واقعے سے ملتی ہے۔ جہاں ہر قیدی کو الگ الگ کوٹھڑی کے علاوہ ایک بڑا چال بھی ملا ہوا تھا یعنی صاحب کو کوٹھڑی کے بجائے اپنا بستر یاں میں لگایا اور مدد مرصعاتیوں کو بھی وہیں رہنے کے لئے عمارتوں کے لئے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم لوگوں کو بھی میری طرح تہا رہنا پڑتا تو اب دوستوں کی محبت کی قدر ہوتی۔

تہائی کے علاوہ ایک فن کار کو اہل و عیال کی نگرانی سے بھی جبراً مقور کیا جاتا ہے لیکن ان کی طبیعت و مدارج سے فخر کو پسند نہیں کرتی انھیں بچوں سے خاص لگاؤ ہے بچوں کو بے انتہا عزیز رکھتے ہیں۔ ایام تیر میں جب ان سے پوچھا گیا کہ کہاں پر آپ کو سب سے زیادہ کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جواب ملا دینچہ ۵

نقیب صاحب بنایت نازک طبیعت کے مالک ہیں۔ ہسائوں کی نثار دوستوں کی تلخ کلامی یا مہلکے طبیعت پر گزرتے ہیں اور شاعری کا موڈ بھی کاغذ پر موم ہوتا ہے۔ پھولوں سے پیار ہے۔ ایام تیر میں ہر سے پھولوں کے بیج منگا کر ایک خوبصورت باغ لگایا، ہاکی جیل کی کمرہ اور کثرت ماحول میں کچھ نہی پیدا ہو۔ اور طبیعت کو سکون ملے۔

نقیب کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ بقول شاعر اسحاق : ان کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوش اور دلور ہے اس میں پوری قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ ان کی شاعری میں وطن کی نسبت بھی ہے اور قوم کے لئے تڑپ بھی۔

(انقباض)

افکار - فیض نمبر

**"IF SHE ASKS
FOR THE
MOON ...**



**.. GIVE HER A
SHEHERAZADE
SARI!"**

A PRODUCT OF **HM** SILK MILLS LTD KARACHI.

افکار - فیض نمبر

پارکر

دنیا کا مقبول ترین قلم

- فائونٹین پن
- بال پوائنٹ
- میکانیکی پنسل
- رائٹنگ سیٹ



اپنے ذاتی استعمال کے لئے اور تحفہ دینے کے لئے

پارکر

اعلیٰ پسند کا معیار

سروس اسٹیشن :-

سول ایجنس :-

یزرائیٹڈ واپچ کمپنی

رازقی لمیٹڈ

مقابلہ لیمنل سینما بلڈنگ
الغٹسٹن اسٹریٹ - دراجی

سڈھا چیمبرس - بندر روڈ - دراجی

فون : ۲۳۶۱۱

فون : ۵۳۶۳۰

افکار - فیض نمبر

گرمی سے
نجات کے لئے





ہوفمین

فرحت بخش مشروبات

وٹامن
'سی'

تازہ پھلوں کے برہس
سے تیار کردہ

ہوفمین بہترین مشروب!  

دیپ نرہولڈرز، سیدری بیویکیز لمیٹڈ، ریسٹورنٹ سوسائٹیز، سیرس ناؤ اور ہون سوسائٹیز

صحت کی جامع تصویر



اس نے پھر وہی حب معمول کیا: تندرست، ممتی اور چُست دچالاک
 وہ ہمیشہ اول ہی رہا۔ وہ اپنی ماں کو بھی بہت عزیز ہے۔ اور وہ اس کی
 خوراک کا بہت خیال رکھتی ہے۔ وہ اس کے لئے کھانا ہمیشہ مالٹا زنا پستی
 میں پکاتی ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہمیشہ اول ہی رہتا ہے۔



خاندان کی صحت کا ضامن

ای۔ ایم۔ آئی۔ ملز اینڈ سٹریٹریٹس۔ کراچی

لوحِ قلم

ہم پروارِ نبیؐ لوح و قلم کرتے رکھیں گے

نقش فرایدی

(۶۱۹۴۱)

قطعات ، ۵۶۳

سرودِ شبانہ ، ۵۶۴

سرودِ شبانہ ، ۵۶۴

انتظار ، ۵۶۶

تہہ بخوم ، ۵۶۷

آج کی رات ، ۵۶۸

ایک منظر { میرے ندیم ۵۶۹

مجھے پہلی سی محبت ، ۵۷۰

رقیب سے ، ۵۷۱

تہائی { چند نوذو دریاں ۵۷۲

کتنے ، ۵۷۶

بول { اقبال ۵۷۷

موضوع سخن ، ۵۷۹

ہم لوگ ، ۵۸۱

سیاسی لیدر کے نام ، ۵۸۲

اے دل بے تاب تہہ ، ۵۸۳

مرے ہدم مرے دوست ، ۵۸۴

غزلیں ، ۵۸۶-۵۸۷

دستِ صبا

(۶۱۹۵۳)

قطعات ، ۵۸۸

صبحِ آزادی ، ۵۸۹

دو آوازیں ، ۵۹۱

سمرقند تل ، ۵۹۳

... تہہ ہر جس کے نام ، ۵۹۴

دو عشق ، ۵۹۵

نوم ، ۵۹۸

اگست ۱۹۵۲ ، ۵۹۹

نثار میں تری گلیوں پر ، ۶۰۰

شیشوں کا سینا کی تہہ ، ۶۰۲

زندان کی ایک شام ، ۶۰۵

زندان کی ایک صبح ، ۶۰۶

یاد ، ۶۰۸

غزلیں ، ۶۰۹-۶۱۷

زندانِ نامہ

(۶۱۹۵۶)

لے حبیبِ غمِ دوست ، ۶۱۸

ملاقات ، ۶۱۹

اچھے دوستوں کے شہر ، ۶۲۲

ہم جتنا کہے ہیں میں مار گئے ، ۶۲۳

ذریعہ ، ۶۲۴

دروکے گا دہلی پاؤں ، ۶۲۵

AFRICA

COME BACK

بنیاد کچھ تو ہو ، ۶۲۹

کوئی عاشق کی بھویسے ، ۶۳۰

غزلیں ، ۶۳۱-۶۳۵

متفرق شہر ، ۶۳۵-۶۳۷

دستِ تہہ سنگ

(۶۱۹۶۵)

قطعات ، ۶۳۸

دستِ تہہ سنگ آمد ، ۶۳۹

سفر نامہ ، ۶۴۰

آج بازاریں پانچولان پلو ، ۶۴۲

حمد ، ۶۴۳

دو مرثیے ، ۶۴۴

کہاں جاؤ گے ؟ ، ۶۴۶

خوش ضابطہ غم ، ۶۴۷

جیتیری سندھ اکھوں میں ، ۶۴۹

رنگ ہے دل کا مرے ، ۶۵۰

غزلیں ، ۶۵۱-۶۵۵

متفرق اشعار ، ۶۵۶

پہلا مجموعہ کلام

نفسِ فریاد

قطعات

(۱)

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے دیرانے میں چھپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ و شرار آجائے

(۲)

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے، اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احسان کا پاس رہتا ہے

۵

سر درِ شبانہ

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
غاشی سجدہ نیا زیں ہے
خُسن معصوم خوابِ ناز میں ہے

اے کہ تُو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تُو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آ، کہ کچھ دیر سُن سُنا لیں، تم
آ، محبت کے گیت گائیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرت دیدِ نامتِ شام رہے؟
دل میں بے تاب ہے خندائے حیات
آنکھ گوہرِ نثار کرتی ہے

آسمان پر اُداس میں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
اُکے تھوڑا سا پیار کریں ہم
زندگی زرد نگار کریں ہم

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
مغفل ہست و بود دیراں ہے
پیکر التجا ہے خاموشی
ہزم انجمِ فردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جُڑو خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا

سود بی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی بھتکی ہوئی آواز
کہکشاںِ نسیم و انگاہوں سے

کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے ہنوشِ تاروں سے
چھن رہا ہے خمائرِ کیفِ آگیں
آرزو، خواب، بے قراروے حسیں !

انتظار

گذر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آرزوہ بہار ابھی
مرے خیال کی دُنیا ہے سو گوار ابھی
جو حسرتیں ترے غم کی کیفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں
بہارِ سخن، پہ پابندئیِ جفا کب تک ؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریزِ پا کب تک ؟
قسمِ تمہاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں میں
غظِ کھتا دعوئے صبر و شکیبِ آجاؤ
مستراحِ خاطر بے تاب تھک گیا ہوں میں

تہہ نجوم

تہہ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں

انجم شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی

خمارِ خواب سے لبریز احسریں آنکھیں

سفید رخ پہ پرلِ پشان بنریں آنکھیں

چمک رہی ہے جوانی ہر اک بٹی مُوسے

رواں ہو برگِ گل تر سے جیسے سیلِ شمیم

صیائے مہ میں دستِ ہے رنگِ پیرا بن

ادائے عجزت اک پُئل اڑا رہی ہے نسیم

درازِ قد کی لچک سے گداز پیدا ہے

ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں

دلِ حزیں میں کئی جاں بلبِ عائیں ہیں

تہہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں

کہی کا حُسن ہے مصروفِ انتظار ابھی

کہیں نمیال کے آباد کردہ گلشن میں

ہے ایک گل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
 دکھ سے بھر پور دن تمام ہوئے
 اور کل کی خبر کے معلوم؟
 دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حُرد
 ہونہ ہو اب سحر کے معلوم؟
 زندگی بیچ! لیکن آج کی رات؟
 ایزدیت ہے ممکن آج کی رات؟
 آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
 اب نہ دُہرا فسانہ اے اَلَم
 اپنی قسمت پہ سو گوار نہ ہو
 فکرِ فردا اُتار دے دل سے
 عمر رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
 عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
 ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
 آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

ایک منظر

بام و درِ خامشی کے بوجھ سے چُور
 آسمانوں سے جوئے دردِ رواں
 چساند کا دکھ بھرا فسادِ نور
 شاہراہوں کی خاک میں غلطان
 خواب گاہوں میں نیمہ تاریکی
 مضحل بے رباب ہستی کی
 ہلکے ہلکے سروں میں نوہ کنان

میرے نزدیک

خیال و شعر کی دنیا میں جان بھی جن سے
 نصائے فکر و عمل ارغوانِ مہتی جن سے
 وہ جن کے نور سے شاو اب تھے مہ و انجم
 جوں عشق کی ہمت جوان مہتی جن سے
 وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے نزدیک؟
 وہ ناہموار نگاہیں ، وہ منتظر راہیں
 وہ پاس ضبط سے دل میں، دلی ہوئی آہیں

وہ انتظار کی راتیں ، طویل ، تیرہ وتار
 وہ نسیم خواب شبستان ، وہ نمٹیں یا نہیں
 کہانیاں تھیں کہیں کھو گئی ہیں میرے ندیم !
 مچل رہا ہے رگ زندگی میں خون بہا رہا
 الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار
 چلو کہ چل کے چمٹاؤں کریں دیارِ مصیب
 ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
 محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں ، میرے ندیم !

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ !
 میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درنشاں ہے حیات
 تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے ؟
 تری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
 تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ؟
 تو جو مل جائے تو قسمتِ یز نکو ہو جائے
 یوں نہ تھا ، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
 راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
 اُن گنت صدیوں کے تاریک بہیما نہ ظلم
 ریشم و اطلس و کجواب میں بُخوائے ہوئے
 جا بجا کہتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
 خاک میں اٹھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
 پیپ بہتی ہوئی نکلتے ہوئے ناسوروں سے
 لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کبھی
 اب بھی دلکش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجے
 اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
 راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
 مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگتا

رقیب سے

آگہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
 جس نے اس دل کو پری حُسانہ بنا رکھا تھا

جس کی الفت میں بھٹلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دھڑک کو دھڑک کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں، جن پر
اُس کی مدِ بوشِ جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افروزہ مہکت باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
کچھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عسمر گنوا دی ہم نے

ہم پر مشترکہ ہیں احسانِ عنہم الفت کے

اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے؟
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں!

عاجزی سیکھی، عنسریوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناقوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عفتاب
بازو تو لے ہوئے، منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ عنسریوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب نے
فائدہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھے اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

تنہائی

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں!
 راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
 ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
 لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
 سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
 اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سُرِ غ
 گل کرو شمعیں، بڑھا دوئے و مینا و یاغ
 اپنے بے خواب کواڑوں کو معقل کر لو
 اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

چند روز اور میری جان!

چند روز اور میری جان! فقط چند ہی روز
 ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پر مجبور ہیں ہم
 اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
 اپنے اجداد کی میراث ہے معذور میں ہم

جسم پر قید ہے ، جذبات پہ زنجیریں ہیں
 منکرِ مجوس ہے ، گفتار پہ تلخیریں ہیں
 اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں
 زندگی کیسا کسی مفلس کی قیاس ہے جس میں
 ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
 لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
 اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عزمِ دھڑکی جھلسی ہوئی ویرانی میں
 ہم کو رہنا ہے یہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
 اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ بستم
 آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گزر
 اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
 چاندنی راتوں کا بے کار دھکتا ہوا درد
 دل کی بے سود تڑپ ، جسم کی مایوس پکار
 چند روز اور مری جان ! فقط چند ہی روز

کھتے

یہ گلیوں کے آوارہ، بے کار کتے
 کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
 زمانہ کی پھٹکار سے مایہ اُن کا
 جہاں بھر کی دھتکار اُن کی کماٹی

نہ آرامِ شب کو، نہ راحتِ سویرے
 غلاطت میں گھرنالیوں میں، سیرے
 جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
 ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو

یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
 یہ فاقوں سے اُکتا کے مرنے والے
 یہ مظلوم مخلوقِ گرمِ اٹھائے
 تو انسان سب رکعتی جُبولِ جائے

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
 یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
 کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
 کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

بول.....

بول، کہ لبِ آزاد میں تیرے
 بول، زباں اب تک تیری ہے
 تیسرا ستواں جسم ہے ترا
 بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
 دیکھ کہ آہستہ گر کی دکان میں
 تندہیں شعلے سرخ ہے آہن
 کھلے لے قفلوں کے دہانے
 پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
 بول، یہ ہٹوڑا وقت بہت ہے
 جسم و زباں کی موت سے پہلے
 بول، کہ پیچ زندہ ہے اب تک
 بول، جو کچھ کہت ہے کہ لے

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فیر
 آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا

سنان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
 دیرانے کدوں کا نصیبہ سوز گیا
 تھیں چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ سکیں
 پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدائے
 اور پھر سے اپنے دیں کی راہیں اُداس ہیں
 چند اک کو یاد ہے کوئی اُس کی ادائے خاص
 دواک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
 پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
 اور اُس کی لے سے سیمکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
 اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا نوسان
 یہ گیت مثلِ شعلہِ بحوالہ تند و تیز
 اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
 جیسے چراغِ وحشتِ ضرر سے بے خطر
 یا شمعِ بزمِ صبح کی آمد سے بے نیاز

موضوع سخن

گل ہوئی جاتی ہے اندر دہ سسلکتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمہ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

اُن کا آپٹل ہے کہ رخسار کہ پیسراہن ہے!
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلن رنگیں
جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
کلمتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں!

آج پھر حُسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کابل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غارے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حسا کی تحریر

اپنے انکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضمون ہے یہی شاہدِ معنی ہے یہی

آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
 آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
 موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
 ہم پہ کیا گزرے گی، احواد پہ کیا گزری ہے؟

ان دُمکتے ہوئے شہرِ دل کی فسراواں مخلوق
 کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
 یہ حیس کھیت پھٹا پڑتا ہے جو بن، جن کا
 بس لئے، ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے؟

یہ ہسراک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
 جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
 یہ ہسراک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
 جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ کبھی ہیں، ایسے کئی اور بھی معنوں ہوں گے
 لیکن اُس سُرخ کے آہت سے کھلتے ہوئے ہونٹ
 ہائے اس جسم کے کم بخت، دل آویز خطوط!
 آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی آنسو ہوں گے

اپنا موضوع سخن ان کے ہوا اور نہیں !
طبع شاعر کا وطن ان کے ہوا اور نہیں !

ہم لوگ

دل کے ایوان میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے، اُکلتے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیالِ تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل

وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال

مصنوعِ ساعتِ امروز کی بے رنگی سے

یادِ ماضی سے غمیں دہشتہ، فراسےِ نڈھال !

تشنہ ادکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں

سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں

اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں

دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں

اور اک الجھی ہوئی موبہم سی دریاں کی تلاش

دشت و زبلاں کی ہوس، چاک گریباں کی تلاش

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا جگر ٹے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت وسیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم سینر
جس طرح تبتیری کُہا رہے یلغار کرے!

اور اب رات کے سنگین وسیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی بات تو ہیں!
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی بات تو ہیں!
تجہ کو منظور نہیں غلبہ ظلمت لیکن
تجہ کو منظور ہے یہ بات قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کیس گہیں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میست کے تلے دب جائے!

اے دل بیتاب کھڑ

تیرگی ہے کہ اُسندقی ہی چلی آتی ہے
 شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
 چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبض ہستی
 دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
 رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
 یہی تاریکی تو ہے عذابِ زہِ رخسارِ سحر
 صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بے تاب بھڑ
 ابھی زنجیر چھینکتی ہے پس پردہ ساز
 مطلق الحکم ہے شیرانہ اسباب ابھی
 ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
 لغزشِ پامیں ہے پابندیِ آداب ابھی
 اپنے دیوانوں کو دیا نہ تو بن لینے دو
 اپنے خانوں کو نہ خانہ تو بن لینے دو
 جلدیہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی
 یہ گرانیا ریِ آداب بھی اٹھ جائے گی
 خواہ زنجیر چھینکتی ہی چھینکتی ہی رہے

مرے ہمدم مرے دوست!

گر مجھے اس کا یقین ہو مرے ہمدم مرے دوست!
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی ترے سینے کی جھلن
میری دل جوئی مرے پیار سے مٹ جائے گی

گر مرا حزنِ تلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذیل کے داغ
تیری مدقوق جوانی کو شفا ہو جائے

گر مجھے اس کا یقین ہو مرے بھائی مرے دوست
میں تجھے بچنے لوں، سینے سے لگا لوں، جھکو
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں، ہلکے شیریں
آبشاروں کے بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آکند صبح کے، مہتاب کے، ستاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیلے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے تیک لخت بڑاں بستہ ہیں
کس طرح عارض محبوب کا سشفاف بلور
یک، یک بادۂ احمر سے دھک جاتا ہے
کیسے جھکتی ہے ششدری سے خود برگ گلاب
کس طرح رات کا ایوان جھک جاتا ہے
یوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطر
گیست بنتا رہوں، بیٹھا رہوں، تیری خاطر

پر مرے گیت ترے دکھ کا مددوا ہی نہیں
لغزہ ہزاج نہیں، مونس و عنم خوار ہی
گیست نشتر تو نہیں، مردِ سہم آزار ہی
تیرے آزار کا چسارہ نہیں نشتر کے ہوا
اور یہ سفاک مسخارے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی رُوح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگرے تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

غیرین

دو فوں جہان تیری محبت میں بار کے
 وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
 دیراں ہے مے کدہ، غم دسا غرا داس ہیں
 تم کیا گئے کہ روٹ گئے دن بہار کے
 اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چٹا رہن
 دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
 دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
 تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
 بھولے سے مسکراتو دیئے تھے وہ آج فیض
 ممت پوچھ و لو لے دلِ ناکردہ کار کے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
 ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز یا سمجھے

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
 ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

تیسز ہے آج دردِ دل ساقی
 تلخی 'مے کو بے اثر کر دے
 فیضِ تکمیلِ آرزو معلوم!
 ہو سکے تو یوہنی بسر کر دے

دوائے وعدہ نہیں، وعدہ دگر بھی نہیں
 وہ مجھ سے رُوٹے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
 نہ جانے کس لئے اُمید دار بیٹھا ہوں
 اک ایسی راہ پہ جو تیری رگِ زریں بھی نہیں

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
 وہ مضحلِ حیا جو کسی کی نظر میں ہے
 سیکھی یہیں مرے دل کا فرنے بسندگی
 رُسبِ کریم ہے تو تری رگِ زریں میں ہے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سا بظرب میں
 پھر شعلے لپکنے لگے ہر دید و تَرے
 وہ رنگ ہے امساں گلستاں کی فضا کا
 اوجھل ہوئی دیوارِ نقسِ حدِ نظر سے

دسویں صبا

قطعات

متارح لوح و قلم بچن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈوبی ہیں نگیاں میں نے
زباں پہ فہرنگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

نہ پوچھ جب سے تیرا انتظار کتنا ہے
کہ جن دلوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
تیرا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب ترے بانو، تراکنا نہیں

صبا کے مات میں نرمی ہے ان کے باتوں کی
مٹھڑ مٹھڑ کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گٹاں

وہ بات ڈھونڈ رہے ہیں رباطِ محفل میں
کہہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

جاں بیچنے کو آئے توبے دامِ نیچ دی
اے اہلِ مصرِ وضعِ تکلف تو دیکھے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سنوئے دامنِ یوسف تو دیکھے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی نجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصورِ دقین زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گلِ دامنی و کج کُلی

صبحِ آزادی

(اکتے سنہ ۶۴ء)

یہ داغِ داغِ اُجلا، یہ شبِ گزیدہ سحر
وہ انتظارِ رہتا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے بھٹے یا رہ کر مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
 کہیں تو ہوگا شبِ سُست، موج کا ساحل
 کہیں تو جا کے رُکے گا سفینہٴ غم، دل
 جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
 چلے جو یا ر تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
 دیا رِحسُن کی بے صبر خواب گاہوں سے
 پکارتی رہیں باہیں بدن بُلالتے رہے
 بہت عزیز تھی لیکن رُبّ سحر کی لگن
 بہت قریں تھا حسینا، نور کا دامن
 سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تمکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
 سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گم
 بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
 نشاطِ وصلِ حلال و عذابِ ہجرِ حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی ملن
 کسی پہ چپا رہے ہجران کا کچھ اثر ہی نہیں

کہاں سے آئی نگاہِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی سپر ایغ سہرہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی!
نجات دیدہ و دل کی کھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

دواوازیں

(پہلے 'اواز')

اب سعی کا امکان اور نہیں، پرواز کا مضمون ہو بھی چکا
تاروں پر کمندیں پھینک چکے، مہتاب پر شبنوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لئے ان آنکھوں سے کیا پیمیاں کیجے
کس خواب کے جھوٹے امنوں سے تسکینِ دل، ماداں کیجے!
جیسے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کب ہوگا
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نیٹا لیں گے
یہ یترا کفن، وہ میرا کفن، یہ مسیری لحد، وہ تیری ہے

(دوسرے 'اواز')

ہستی کی متاع بے پایاں جاگیر تری، نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

یہ بزمِ چہراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر دیراں ہے تو کیا
 اضرده ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
 کھڑے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جلالِ شمس و قمر
 آباد ہے وادیِ کاکل و لبِ خاداب و حینِ گلِ گشتِ نظر
 مقصوم ہے لذتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدہ تر
 اس دیدہ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو
 اس شام و سحر کا شکر کرو، اس شمس و سحر کا شکر کرو

(پہلے اواز)

گر ہے یہی مسلکِ شمس و سحر ان شمس و سحر کا کیا ہوگا
 رعنائیِ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا
 جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
 اس دیدہ تر کا کیا ہوگا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
 جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نعموں کی فنا میں ٹوٹ گئیں
 یہ ساز کہاں سرِ بچوڑیں گے، اس کلکِ گھر کا کیا ہوگا
 جب کچھ قفسِ مسکن بھڑا اور جیب و گریباں طوق و رسن
 آئے کہ نہ آئے موسمِ گل اس دردِ جگر کا کیا ہوگا
 (دوسرے اواز)

یہ بات سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک

اس دل میں صداقت ہے جب تک اس لطف میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شور و شہر بر لب و سائے
وہ شور جس کے آگے زبوں ہنگامہ طبلِ قیصر و گئے
کڑا دہیں اپنے فکر و عمل بھر پور خیرینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امر و نہ اپنا ہر شہر دا
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کواکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و عسکرم، یہ مال و خیم سب اپنے ہیں

سیرِ مقبل

(حوالہ)

کہاں ہے منزلِ راہِ فنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرتی گئی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
بھڑلے دل، اجمالِ رستے زیا ہم بھی دیکھیں گے
ذرا ہیقتل تو ہوئے تشنگِ بادِ گسارِ دل کی
دیا رکھیں گے کب تک جوشِ صہیا ہم بھی دیکھیں گے
ابھا رکھیں گے کب تک بام و مینا ہم بھی دیکھیں گے
ملا آ تو چکے نسل میں اس کوئے ملامت سے

کسے روکے گا شورِ پند بے جا ہم بھی دیکھیں گے
 کسے ہے جا کے لوٹ آئے کیا ہم بھی دیکھیں گے
 چلے ہیں جان و ایمان آزمائے آج دل والے
 وہ لائیں رشکِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
 وہ آئیں تو میرِ مقل تھا شاہم بھی دیکھیں گے
 یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہم
 جو اس ساعت ہیں پہاں ہے اہلِ ہم بھی دیکھیں گے
 جو فراقِ صبح پر تپکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

.... تمہارے جن کے نام

میر کا نام لکھتا ہے قلمِ تمہارا سے سن کے نام
 بھگے گی جو کبھی رنگِ بیدار بن برنام
 خنجر گئی ہے کبھی صبح دو پہر کبھی شام
 کہیں جو قلمِ مستِ دنیا پہ سج گئی ہے نبا
 بہن میں سرِ دو صنوبرِ سنور گئے یہ تمام
 بنی بساطِ عہدِ نیرں جیبِ ڈپوٹے دل سے
 تمہارا سے سایہ رخسارِ لب میں ساغرِ حیا

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
 تمہارے ہاتھ پہ سبے تائبش مناجب تک
 جہاں میں باقی ہے دل داری عروس سخن
 تمہارا حسن جواں ہے تو مہریاں ہے خدک
 تمہارا دم ہے تو دھما رہے ہوائے وطن
 اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام
 تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیِ ایام
 سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

دو عشق !

(۱۰)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقی لکھنا م
 وہ جسکس رُخِ یار سے پہنچے ہوئے ایام
 وہ بھول ہی تھی ہوئی دیدار کی ساعت
 وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

امید کہ لوحِ گہِ غمِ دل کا نصیبہ
 لوشون کی ترسی ہوئی شبِ ہوئی آہِ سر

لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر لگا ہوں کامقدر

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس رنج سے پھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیلاب
اس راہ پہ پھوٹے گی شفق تیری تبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل دجاں میں فناں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سب بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی کو تیر سی سینے میں لگی ہے

تہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگا یا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

۷۲

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو

تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
 ڈھونڈی ہے یوں ہی شوق نے آسائشِ منزل
 رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اس جانِ جہاں کو بھی یوں ہی قلب و نظر نے
 ہنس ہنس کے صدادی کبھی رورو کے پکارا
 پورے کے سب حرفِ تنہا کے تقاضے
 ہر درد کو اُجیبِ لا ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمانِ جنوں کا
 تنہا نہیں کوئی کبھی آوازِ جرس کی
 خیریتِ جاں ، راحتِ تن ، صحتِ داماں
 سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
 تنہا پس زنداں ، کبھی رُسا سہرا زار
 گر جے ہیں بہت شیخِ سرگوشہ منیر
 کر کے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار

چھوڑا نہیں بیخیزوں نے کوئی ناوکِ دستِ نام

چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت

اس عشق نہ اُس عشق یہ نادم ہے مگر دل

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ملامت

نوحہ

عجب کوشک وہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے

لے گئے مسافتِ مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں

اس میں بچپن تھا مرا اور مرا عہدِ شباب

اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے

اپنے غنیم کا یہ دمکتا ہوا نول رنگِ گلاب

کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں؟

مجھ سے لے لو مری سب چاکِ قیصوں کا حساب

آخری بار سے، لودانِ لو اک یہ بھی سوال!

آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوس جواب

آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول

مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
 گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
 اب بھی حسراں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
 گوشے چن چن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں
 بھڑی ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں، مگر
 کچھ کچھ سحر کے رنگ پافشاں ہوئے تو ہیں
 ان میں ہو جسد ہو بہارا کہ بان و دل
 محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
 ہاں کج کرو کا دکھ سب کچھ مٹ سکے ہم
 اب بے نیاز گردش و دیراں ہوئے تو ہیں
 اہل قفس کی صبح چمن میں کھلے گی آنکھ
 باد صبا سے وعدہ و پیمان ہوئے تو ہیں۔

ہے دشت اب بھی رشت مگر خونِ پائے فیض
 سیراب چند خارِ معنیلاں ہوئے تو ہیں

نثار میں تیری گلیوں پہ.....

نثار میں تیری گلیوں پہ اسے وطن کہ جہاں
چسلی ہے رسم کہ کوئی نہ سراٹھا کے چلے
جو کوئی چسپا ہننے والا طواف کو نکلے
نظرِ چڑا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لئے اب یہ نظمِ بخت و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سنگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہا نہ جو کے لئے
جو چپند اہل جنوں تیرے نام یوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گذرتے ہیں
ترسے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بکجا جو روزِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیرے مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

سلسلہ سنگِ رابستہ دوسراں کشادہ وند (پیشِ صدی)

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام دسحر میں جیتے ہیں
گرفت سایہ دیوارِ دُور میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج کچھ سے جدا ہیں تو کل ہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج آوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو کچھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردِ پیشِ یل و نہار رکھتے ہیں

شیشوں کا میسھا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ در جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کپ ٹکوں سے جڑ سکتا ہے جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر

دامن میں چھپائے بیٹھے ہو

شیشوں کا میسھا کوئی نہیں

کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہیں ٹکڑوں میں کہیں وہ ساغر دل ہے جس میں کبھی

صدناز سے اُترا کرتی تھی وہبا کے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے

یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا

جوئے تھی بہا دی مٹی میں

مہمان کا شہر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید اُن شوخ بلوریں سپینوں کے

تم مست جوانی میں جن سے خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دُقر، بھوک اور غم

ان سپاہوں سے ٹکراتے رہے
 بلہ رحم کھتا چومکا پتھراؤ
 یہ کاپنج کے ڈھانچے کیا کرتے
 یا شاید ان ذروں میں کہیں مولیٰ تہے مہرباری عزت کا
 وہ جس سے تمہارے عجیب بھی شمشاد دوتوں نے رشک کیا
 اس والی دھن میں بچتے تھے
 تاجرت بہت رہن بھی کئی
 بے چورنگو، یاں منسل کی
 گریبان بھی تو آن گئی
 برسا غل شیشے اعلیٰ و گہر سالم ہوں توقیت پاتے ہیں
 یوں کھوٹے کھوٹے ہوں توقف چھتے ہیں، ہو رواتے ہیں
 ہم ناحق شیشے چن چن کر
 دامن میں چھپے بیٹھے ہو
 شیشوں کا مہیجی کوئی نہیں
 کیا اس لنگے سے بیٹھے ہو
 یادوں کے گریبانوں کے رفو پردل کی گزرکب ہوتی ہے
 اک بچہ اُدھیڑا ایک سیا یوں عمر بسرکب ہوتی ہے

اس کا رگہ ہستی میں جہاں
 یہ ساغرِ شیشے ڈھلتے ہیں
 ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
 سب دامن پر ہو سکتے ہیں
 جو ہاتھ بڑھے یا ورہے یہاں جو آنکھ ابھڑے وہ بخت اور
 یاں دامنِ دولت کا انت نہیں ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ مگر
 کب لوٹ بھپٹ سے ہستی کی
 دوکانیں حسالی ہوتی ہیں
 یاں پر رب پر رب پر رب ہیں
 یاں ساگر مگر موتی ہیں
 کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
 ہر پر رب کو، ہر ساگر کو نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
 کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
 یہ پردے نوح گراتے ہیں
 ہستی کے اٹھائی گیروں کی
 ہر چال اُبھائے پھرتے ہیں
 ان دونوں میں رن پڑتا ہے رت بستی بستی، نگر نگر

ہر بسنت گھر کے سینے میں ہر چلیج راہ کے ملنے پر
یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساعز، شیشے، لعل دگر اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو اس زن سے بلاوے آتے ہیں

زندانی کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گذرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صبح زندان سے بے وطن اشتیاق
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامن آسمان پہ نقش و نگار
شانہ بام پر دمکتا ہے

مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاکِ یں گھل گئی ہے آبِ بخوم
نورِ یں گھل گیا ہے عرشِ کائین
سبز گوشوں میں نیلگوں سرائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ منہراقِ یارِ آئے

دل سے پیسہ خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پہل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں، دیکھیں گئے آخر نہ نکل
جس کو گلا دھان کی شمشیں
ود بھجیا بھی جگہ ان کو تو کیا
چاند کو کھن کریں تو ہم جاہیں

زندہ کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے"

جاگ اس شب جوئے ناب ترا حصہ تھی
 جام کے لب سے تہہ جام اُنز آئی ہے
 عکسِ جاناں کو ددِ کر کے اُنھی میری نظر
 شب کے کھڑے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
 جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنڈ
 چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر کر کر
 ڈوبتے، تیرتے، مچھالتے رہے، بھلتے رہے
 رات اور صبح بہت دیر گئے، ملتے رہے

صبحِ زنداں میں رفیقوں کے سہرے چہرے
 سلجِ غلط سے دیکھے تہوئے اُبھرے کم کم
 خیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
 دیس کا دردِ منسراقِ رخِ محبوب کا غم

دورِ توہمت ہوئی، پھرنے لگے بیزارِ قدم
 زردِ فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
 اہلِ زنداں کے غضبِ ناکِ خروشاں نالے
 جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے

لذتِ خواب سے محمور ہوا میں جاگیں
 جیل کی زہر بھری چوڑ صدائیں جاگیں
 دُور دروازہ کھٹا کوئی، کوئی بند ہوا
 دُور حبلی کوئی زنجیر، چل کے روئی
 دُور اُترا کسی تالے کے جگر میں سنجر
 سر پیٹنے لگا رہ رہ کے در سیپہ کوئی
 گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دُشمن جاں
 سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جہاتِ گراں
 جن کے چپکل میں شب و روز ہیں فریادِ کُناں
 میرے بے کار شب و روز کی نازک پر مین
 اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
 جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے تھوئے تیر
 (نامم)

یاد

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لڑاں ہیں
 تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
 دشتِ تنہائی میں دُوری کے خس و خاشاک تلے

کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سن اور کلاب

اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی پگھ

اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دورِ افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ

گر رہی ہے تری دل دار نظر کی شبیہ

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے

دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات

یوں لگاں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق

ڈھل گیا ہجر کا دن، ابھی گئی وصل کی رات

غزلیں

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشقِ بہم کرتے رہیں گے

دیہاتیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخی، ایام ابھی اور بڑھے گی

ہاں اہلِ بستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلمی، یہ بستم ہم کو گوارا
 دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
 مے خانہ سلامت ہے تو ہم سُرخِ مے سے
 تزیینِ در و باہم حرم کرتے رہیں گے
 باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
 رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
 اک طرزِ تغافل ہے سودہ ان کو مبارک
 اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

(۲۵)

روشِ روش ہے وہی انتظار کا موسم
 نہیں ہے کوئی بھی موسمِ بہار کا موسم
 گراں ہے دل پہ عینِ روزگار کا موسم
 ہے آزمائشِ حسنِ رنگا رنگ کا موسم
 خوشِ نظارہ رخسارِ یار کی ساعت
 خوشِ قرارِ دل بے قرار کا موسم
 حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
 حرامِ ابرِ سر کو بہار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
 یہ رقصِ سایہ سرو و چنار کا موسم
 یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم
 کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
 یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم
 قفس ہے بس میں بہتائے بہتائے بس میں نہیں
 چین میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
 صبا کی مستِ خرامی تہہ کند نہیں
 اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم
 بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
 فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

(۳)

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
 تلاش میں ہے سحرِ بار بار گزری ہے
 جنوں میں جتنی بھی گزری بکا گزری ہے
 اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
 وہ شب ضرور سہر کوئے یار گزری ہے
 وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
 وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
 نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ ملے پی ہے
 عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے
 بہن پہ نارت گلپیں سے جانے کیا گزری
 قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

(۴)

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگے ہیں
 کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگے ہیں
 حدیث یار کے عنوان بکھرنے لگے ہیں
 تو ہر حسیم میں گیسو سنورنے لگے ہیں
 ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
 جواب ہی تیری گلی سے گزرنے لگے ہیں
 صبا سے کرتے ہیں عزت نصیب ذکر وطن
 تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطقِ ولب کی بھینچ گری
فضا میں اور بھی نئے بکھرنے لگتے، میں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضِ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

(۵)

رنگِ پیرا ہن کا، خوشبو زلفِ لہرنے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو! اس چشمِ ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلتاں کی بات رنگیں ہے نہ مے خانے کا نام
پھر نظر میں پھول ہکے 'دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

(۶)

دلبری بھڑا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پُری رُوزلف بکھرنے کا نام
اب کسی پہلی کو بھی استمرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
محتسب کی خیر اُوچھا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چین والے، غریبان چین

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام
فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

(۶)

ضیق کی راکھیں جل بجھ گیا ستارہ شام
شب فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو دستاقلہ روز و شام بھڑائے
یہ صدف یا درحلتینان بادہ پیم کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابرائے
صبانے پھر در زندان پہ آکے دی دستک
سحر فریب ہے دل سے کہو نہ گجرائے

جانے کیا وضع ہے اب رہم وفا کی اسے دل
وضع دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس
مدح زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

گرانیِ شبِ ہجراں دو چنہ کیا کرتے
 علاجِ دردِ ترے درد مند کیا کرتے
 جنہیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے
 وہ خموش نوا گلہ قید و بند کیا کرتے
 گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
 تولوٹ آئے ترے سر بلند ، کیا کرتے

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
 وہ اک غلبش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں
 یہی کنارِ فلک کا سیہ ترین گوشہ
 یہی ہے مطلعِ ماہِ مہتاب کہتے ہیں
 پیو کہ معنت لگا دی ہے خوں دل کی کثیف
 گراں ہے اب کے لئے لالہ فام کہتے ہیں
 فقیہہ شہر سے عے کا جواز کیا پوچھیں
 کہ چاندنی کو بھی حضراتِ حرام کہتے ہیں

دل میں اب یوں ترے بھوئے ہوئے غم آتے ہیں
 جیسے بکھرے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے مے خانہِ سفیرانِ حرم آتے ہیں

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے بھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں راحتِ جاں بھڑی ہے
ہے وہی عارضِ میلی وہی شیریں کا دہن
منگہ مشوق گھڑی بھر کو جہاں بھڑی ہے
اک دفعہ بھڑی تو ہاتھ آئی ہے کب مروجِ شیم
دل سے نکلی ہے تو کیا لب پہ فناں بھڑی ہے
دستِ صبا دیکھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل بھڑی نہ ببل کی زیاں بھڑی ہے
ہم نے جو طرزِ فناں کی ہے قفس میں ایجاد
فنیقِ گلشن میں وہی طرزِ بیاں بھڑی ہے

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بُتائ کا ارادہ رکھتے ہیں
بہیں شراب سے رنگیں تو عزنِ خوں میں کہ ہم
نہیالِ وضعِ تمیص و بادہ رکھتے ہیں

عسیم جہاں ہو، غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

یادِ غزال چشماں ذکرِ سن عذاراں
جنب چاہا کر لیا ہے کچھ نفس بہاراں
آنکھوں میں دردِ مندی ہونٹوں پہ فدا خواہی
جانانہ دار آئی شامِ فراقِ یاراں
شاید قریب پہنچی صبح وصالِ ہمد
موجِ صبا لئے ہے خوشبوئے خوش کناراں

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسمِ وراہ سوا کر چمکے ہیں ہم
ان کی نظر میں کیا کریں پھیلے اب بھی رنگ
چمتا ہو مہتا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

زندگانی

اے حبیبِ عمر دست

- ایک اجنبی خاتون کے نام
خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر -

کسی کے دستِ عنایت نے کچھ زنداں میں

کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست

بہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت

ہوا ہے گرمی خوشبو سے اس طرح سیرست

ابھی ابھی کوئی گزرا ہے کل بدن گویا

کہیں قریب سے اکیسویں ویں سنیچر بدست

لئے ہے بوسے رفقت اگر ہوا سے چمکن

تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفسِ ظلم پرست

ہمیشہ سبزی رہے گی وہ سبزیِ مہر و وفا

کہ جس کے ساتھ بند ہی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعر حافظ شیراز، اے صبا : کہنا
 ملے جو مجھ سے کہیں وہ جیب عنبر دست
 ”غلل پذیر بود ہوسر بنا کہ می بینی
 بجز بنائے محبت کہ خالی از غل است“

(سنزل ہیل، حیدرآباد، ۲۸، ۲۹ اپریل ۱۹۵۲ء)

ملاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے
 جو مجھ سے، تجھ سے غنیم تر ہے
 غنیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
 میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
 کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
 ہزار مہتاب، اس کے سامے
 میں اپنا سب نور رو گئے ہیں
 یہ رات اس درد کا شجر ہے
 جو مجھ سے تجھ سے غنیم تر ہے
 مگر اسی رات کے شجر سے
 یہ چند لمحوں کے زر پتے

گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
 الجھ کے گلن رہو گئے، میں
 اسی کی شبہم سے خامشی کے
 یہ چند قطرے، تری جبین پر
 برس کے ہیرے، پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
 اسی سیاہی میں رونما ہے
 وہ ہنرخوں جو مری صدا ہے
 اسی کے سائے میں نور گرہے
 وہ موج زر جو تری نغمہ ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
 کے گلستاں میں مسلگت رہا ہے
 وہ غم، جو اس رات کا کمر ہے،
 کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
 کی آہنچ میں تو یہی شر ہے
 ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے

جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

الم نصیبوں، جگر نگاروں
کی میج افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفتخ یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفیق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار رکروں
کے آتشیں بار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے حلیم تر ہے

دستخطی میل، ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۳ء

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھینکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُورِ افق تک گھنٹی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی ہر

بتا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

کون ہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے بھر کی شہریناہ
مٹھک کر ہر سو مبیٹہ رہی ہے شوق کی مانگ سپاہ
آج مرادل فکریں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شب قون سے منہ پھرنے والے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری میلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُونچی رکھیں لو

لاہور میں، منگلوار کی جیل
۲۸ مارچ، ۱۵ اپریل ۱۹۵۲ء

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

ایتھلے اور چھوٹے روڈ پر گئے کے خطوط سے متاثرہ کرکسٹھ گئی

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم

دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

تیرے ہاتھوں کی ستموں کی حسرت میں ہم

نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے

تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی

تیری زلفوں کی مستی برستی رہی

تیرے ہاتھوں کی چساندی دیکھی رہی

جب گلی تیری راہوں میں شام ستم

ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم

لب پہ حرف غزل دل میں تبدیل غم

اپنا غم بھٹا گواہی ترے حسن کی

دیکھتا ہوں رہے اس گواہی پہ ہم

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر سہتی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر سہتی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم
اور نیکیں گئے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
محقر کر چلے درد کے فاصلے
گر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گزا کر تری دلہیزی کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(شکریہ جیل، ۱۵ مارچ ۱۹۵۴ء)

دیرچہ

گزی ہیں کتنی عیالیں مرے دیرچے میں
ہر ایک اپنے میاں کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصل حسدِ ادا کی اُننگ لئے

کسی پہ کرتے ہیں ابر بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہ تاملناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سہرست شاخار و نیم
کسی پہ باد صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوند گان ہر و جمال
نہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

دمنگری جیل، دسمبر ۱۹۵۴ء

درد آئے گا دے پاؤں

اور کچھ دیر میں 'جب پھر مرے تنہا دل کو
منکر آئے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دے پاؤں 'لے سرخ چراغ
وہ جواک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلہ درد جو پہلو میں پیک اٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش و مک اٹھے گا

حلقہٴ زلف کہیں، گوشہٴ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، اکشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ لے دل لے دل
یہ جو محبوب بنا ہے، تری تنہائی کا
یہ تو وہاں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا

مشتعل ہو کے ابھی اُنھیں گئے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون حشر ایا ہوگا

جنگِ بھڑی ہے کوئی کیوں نہیں ہے اسے دل
دشمنِ جان ہیں سبھی، ہمارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سارے بھی، تنہائی میں
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے لے دل

لاؤ، سڈکاؤ کوئی جوشِ غلبہ کا انکار

طیش کی آتش چزار کہاں ہے 'لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے 'لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے 'سرکت بھی 'توانائی بھی

ہونہ ہوا اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو کا اندھیرے کی فنیلوں کے ادھر
ان کو شعلوں سے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر! ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے لکھی بیچ، ہستا تو دیں گے

(منٹگری سیل، عجم دسمبر ۱۹۵۷ء)

AFRICA COME BACK

(ایکے رجسٹر)

آجاؤ، میں نے سن لی ترے دھول کی ترنگ
آجاؤ، مسکت ہو گئی میرے لبو کی تال
"آجاؤ افریقیا"

آجاؤ، میں نے دھول سے ماسحا اٹھایا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال

✽ افریقی حریت پسندوں کا نعرہ

آ جاؤ، میں نے در سے بازو چھسٹا لیا
آ جاؤ، میں نے نوح دیا بے کسی کا جال
”آ جاؤ ایفریتا“

پنچے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
”آ جاؤ ایفریتا“

جلتے ہیں ہر کچھار میں بجالوں کے مرگ نین
دشمن ہوتے رات کی کالک ہوئی ہے لال
”آ جاؤ ایفریتا“

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریت
دریا متحرک رہا ہے تو بن وے رہا ہے تال
میں ایفریتا ہوں دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں میری چال ہے تیری، بر کی چال
”آ جاؤ ایفریتا“

آؤ بر کی چال

آ جاؤ ایفریتا

(منشوری میں، ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۵۵ء)

بنیاد کچھ تو ہو

(ضوالی)

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو

کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو

بیداد گر سے شکوہ بیداد کچھ تو ہو

بولو، کہ شورِ شرکی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا

اتنا تو ہو کہ باندھتے پائے نہ دست و پا

مقتل میں کچھ تو رنگِ جیہِ جن رقص کا

رنگیں لہو سے پنجرِ صیا د کچھ تو ہو

خون پر گواہ دامنِ جلا د کچھ تو ہو

جب خون بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں رہا ہی آزاد کچھ تو ہو

دشنام، نادم، بُو ہو، فریاد کچھ تو ہو

چیف ہے دردِ اسے دلِ بریاد کچھ تو ہو

بولو کہ شورِ شرکی ایجاد کچھ تو ہو

بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منظر، میل، ۱۳ اپریل ۱۹۵۵ء

کوئی عاشق کسی محبوس سے

یاد کی راہ گزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں بہتیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چپ ر قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشت فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
رہائش بھلا ہے ہیں نگاہیں کہ نہ جلتے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزرے آؤ، کہ غم نہ دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب ہوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلتی گی وہاں اور کوئی راہ گزر
پھر اسی طرف بہاں ہوگا مقابل پیہم
سایہ زلف کا اور جنبش بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھولی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ کوئی دشت کوئی گھات نہیں
جس کے پرے میں مرنا نہ رواں ڈوب کے

تم سے چلتی رہے یہ راہ 'یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

(منشوری میل ۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء)

غزلین

(۱)

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبل گئی
بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بچھ گیا، ہجر کی رات دھل گئی
جب تجھے یاد کر لیا، صبح بہک بہک اٹھی
جب تراغم جگنا لیا، رات مچل مچل گئی
دل سے تو ہر معامہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی
آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی!

جناب اسپتال کراچی
جولائی ۱۹۵۳ء

(۲)

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب بات میں تیرا بات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچہ جاناں میں کیا ایسے ابھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آتی جاتی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازیِ عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں
(منٹگری میل،)

(۳)

ہم پر بہتاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ لعن کوئی جرم تو نہیں
 شوقِ فغول و الفتنِ ناکام ہی تو ہے
 دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
 اے چاہاں جاں یہ حرفِ ترا نام ہی تو ہے
 دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
 لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
 دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
 دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے
 آخر تو ایک روز کرے گی فکروں کا
 وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے
 بھیگی ہے رات فیضِ غزلِ ابتدا کرو
 وقتِ سرودِ درد کا ہنگام ہی تو ہے
 (منظری جیل ۹۰ مارچ سن ۵۴ء)

(۴)

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
 چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کار و بار چلے
 قفسِ اُداس ہے یا ردِ صبا سے کچھ تو کہو
 کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی توجھ تیرے کج لب سے ہو آواز
 کبھی توشب سر کا کل سے مشکبار چلے
 بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب ہی
 مہتا رہے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے
 جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شیبِ حیراں
 ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
 منور یا رہوئی و منتہر جنوں کی طلب
 گرہ میں لے کے گریہاں کا تار تار چلے
 مصفا ، فیض کوئی راہ میں بچا ہی نہیں
 جو کونے یار سے نکلے نو سوائے دار چلے

(شکری جیل، ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۵۴ء)

(۵)

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
 ہم لوگ مرنے رو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں
 شمعِ نذرِ خیال کے ابھم، جسگر کے داغ
 جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں
 اٹھ کر تو آگئے ہیں نرم سے مگر
 کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچہ قاتل سے آئے ہیں
بادِ خزاں کا شکر کرو فیضِ جس کے ہاتھ
نامے کسی بہارِ مشائس سے آئے ہیں

متفرقے اشعار

رستم کی رسیں بہت تھیں، لیکن نہ تھیں تری اجن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے۔ عتابِ جرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت منحرف ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی، نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

غروبِ سرو و سخن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خشِ والی چمن تھے عروجِ سرو و سخن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیرِ ذکرِ وطن سے پہلے

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یاد کرتے رہے

اسی متاعِ پہ ہم روزگار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہ انتظار نہ تھی
 ہم ان میں تیسرا سوا انتظار کرتے رہے
 ضیائے بزمِ جہاں بار بار مانند ہوئی
 حدیثِ شعلہٴ رُحناں بار بار کرتے رہے
 انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
 جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

شاخِ پیر خونِ گل رواں ہے وہی
 شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی
 چسنا نہ تارے ادھرتیں آتے
 ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

کچھ معتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
 ہم بادِ کشوں کے حصے کی، اب جسام میں کم تر جاتی ہے
 بیدارِ گردن کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
 سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے
 ہسم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ وطن
 یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

گرمی شوق نظارہ کا اثر تو دیکھو
 گل کھلے جاتے ہیں وہ سایہ در تو دیکھو
 وہ تو وہ ہے بہتیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
 اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
 صبح کی طرح جھمکتا ہے شب غم کا نق
 فیض، تابستگئی دیدہ تر تو دیکھو

پھر سے بچ جائیں گی ستمیں جو ہوا تیر چلی
 لا کے رکھو ہر محفل کوئی خورشید اب کے

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
 کو پتہ بار سے بے نیل و مرام آتا ہے
 شوق والوں کی حزیں محفل شب میں اب بھی
 آمد صبح کی صورت ترانہ نام آتا ہے

شام گلستا رہی جاتی ہے دیکھو تو سہی
 یہ جو نکلا ہے لئے مشعل رخسار ہے کون

دستِ سنگ

قطعات

یہ خون کی مہک ہے کہ لب یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دکھو
گلشن میں بہا را آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دکھو

آگئی فطیل سکوں چاک گریباں واو
بسل گئے ہونٹ اکوئی زخم بے یانہ سہلے
دوستو! بزم سجاؤ کہ بہا را آئی ہے
کھل گئے زخم، کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

ان دنوں رسم ورہ شہر نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہلاؤں کیا ہے

کوئے جانان ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے

آج کل صورتِ بربادی یاہاں کیا ہے

دست تہ سنگ آمدہ

بیزارِ فضا، در پئے آزارِ صبا ہے

یوں ہے کہ ہر اک ہمدردیرینہ خفا ہے

ہاں یادہ کشتو! آیا ہے اب رنگ پہ موسم

اب سیر کے قابلِ روش آب و ہوا ہے

اندھی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات

چچائی ہوئی ہر دانگِ ملامت کی گستا ہے

وہ چیز بھری ہے کہ سنگتی ہے سُر اُچی

ہر کاسہ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے

ہاں جام اُٹھاؤ کہ میا ولسید شیریں

یہ زہرِ قویا روں نے کئی بار پیا ہے

اس جذبہٴ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے

مقصودِ دیوِ شوق و فغا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے

اُس حُسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے تراروئے بہا ریں
 ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
 ہر بھگی ہوئی رات تری زلف کی شبِ نم
 ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فصاف
 ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
 ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے
 تعزیرِ سیاست ہے 'نہ غیروں کی خطا ہے
 وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے
 زندانِ رہ یاریں پا بسند ہوئے ہم
 زنجیرِ بکفت ہے نہ کوئی بندِ پا ہے
 "مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت
 دستِ تہر سنگِ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

سفرِ نامہ

(۱) پیکنگ

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
 اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے

دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے ہیں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خُندائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزہ کُن فیکوُن
(۲) سنسکیا نگے

اب کوئی طبل بجے گا ، نہ کوئی شاہ سوار
صبح دم موت کی دادی کو روا نہ ہوگا !
اب کوئی جنگ نہ ہوگی ، نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آہنگن میں
وہم منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم ، خون خوار درندے کی طرح آئے گا !

اب کوئی جنگ نہ ہوگی مے و ساغر لاؤ
خون لٹکانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا ، رقص کوئی رقص صبا کی صورت

مطربا! کوئی عنزل زنگِ خاکی صورت

غزل

باطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرشام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ ممتام
چھلک رہی ہے ترے حسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام
گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پس خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک رُوئے حسیں ہو چلا ہے بیشِ حسیں
ملے کچھ ایسے جُدا یوں ہوئے کہ فیضِ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گل ہے داغِ نہیں

ہنگ چاند چین، جولائی ۱۹۵۶ء

آج بازار میں پا بجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں

آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو مست و قضاں چلو

خاک بر سر چلو، خون بُنا ماں چلو

راۃ نکتا ہے سب شہر جاناں چلو

حاکم شہر بھی، مجمعِ عام بھی

تیرا زام بھی، سنگِ دشنام بھی

صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دم سا زاپنے سوا کون ہے

شہرِ جاناں میں اب با صفا کون ہے

دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دلِ فگارو چلو

پھر ہمیں قتل ہو آئیں یا رو چلو

لاہور، میل ۱۱ فروری ۱۹۵۹ء

محمد

ملکہ شہرِ زندگی تیرا

شکر کس طور سے ادا کیجے

دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں

تنگ دستی کا کیا گلہ کیجے

جو ترے حُسن کے فقیر ہوئے اُن کو تشویشِ روزِ کار کہاں؟
دردِ بچپن کے گیت گائیں گے اس سے خوش دقت کا رُبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل

منتِ لطفِ عنم گُسا رکے؟

اشکِ ٹپکا تو کھل گیا گلشن

ربّ کلم ظسرفی بہار کسے؟

خوش نشیں ہیں کہ چٹم دل کی مرا دیریں ہے نہ خالقہ میں ہے

ہم کہاں جنتِ آرمائے جائیں ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی

نقدِ شمسِ دستِ مری کی بات کرے

جس کو شوقِ نبردِ ہوا ہم سے

جائے تغیبِ کائنات کرے

(جلد ۱۹۵۹ء)

دومرثیہ

۱۱، ملاقاتِ مری

ساری دیوارِ سیہ ہو گئی تا حلفتِ بام

راستے بچھ گئے رخصت ہوئے رہ گیرِ ممت

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک تھیلی پہ منا، ایک تھیلی پہ ہو
اک نظر زہر لئے، ایک نظر میں دارو

دیر سے منزل دل میں کوئی آیا نہ گیا
فردتِ درد میں بے آب ہوا تختہ داغ
کس سے کہئے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پچیسر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

(۲۰)

ختم ہوئے بارش سے سنگے

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجا لا ہوگا
بکھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قاتلہ درد کا اب کیا ہوگا

اب کوئی اور کرے پرویش گلشنِ غم
دوستو! ختم ہوئی دیدہ ترکیِ شبِ غم
کھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاک رہ آج لئے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھ دیتے ہیں کس کس کو صدمہ میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریف؟" مے مردِ افکنِ عشق
ہے مکرِ لبِ ساقی پہ صدمہ میرے بعد

(نومبر ۱۹۹۰ء)

کہاں جاؤ گے؟

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر نام پہ چاند
نکس کھجائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدہ مناک سے باری باری
سب ستارے ہر فاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سیٹے گا بچھائے گا کوئی
بے دفائی کی گھڑی ترکِ مدارات کا وقت

اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
 ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
 اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے
 اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں رہنے دو
 کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
 اور ملے گا بھی تو اس طور کہ پچھتاؤ گے
 اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
 زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
 اور ہر کُشتہ دامنِ زندگی، آخرِ شب
 بھول کر ساعتِ درمائی، آخرِ شب
 جان پہچانِ ملاقات پہ اصرار کرے

(دسمبر ۱۹۶۶ء)

خوشا صنم! بحیثِ

دیارِ یار تری جوشِ جنوں پہ سلام
 مرے وطن، ترے دامنِ تار تار کی خیر

رہِ یقیں، تری افشانِ خاک و خون پہ سلام
مرے چین، ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر

ہر ایک خانہ ویراں کی تیسیرِ گئی پہ سلام
ہر ایک خاکِ بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتہٴ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدہٴ پُرنم کی آب و تاب کی خیر

رواں رہے یہ روایتِ خوشِ نعمانتِ غم
نشِ طُختمِ غم کاُمنات سے پہلے
ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

سکوں ملے نہ کہیں تیرے رپہٴ فکاروں کو
جہاں خونِ سہرِ راکو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جہاں سسرقِ مہرِ راکو نظر نہ لگے

سندے

۱۹۶۳ء

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دھوپ کنارہ، شام ڈھلے

ملتے ہیں دونوں وقت جہاں

جورات نہ دن، جو آج نہ کل

پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں

اس دھوپ کنارے، پل دوپہل

ہونٹوں کی لپک

باہوں کی چٹنک

یہ میل ہمارا، جھوٹ نہ پہنچ

کیوں راز کرو، کیوں دوش دھریو

کس کارن جھوٹی بات کرو

جب تیری سمندر آنکھوں میں

اس شام کا سورج ڈوبے گا

سکھ سوئیں گے گھر، رواے

اور راہی اپنی راہ لے گا

(سنن ۱۹۶۳ء)

رنگ سے دل کا مرے

کم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے ،
 آسماں حد نظر، راگزر، راگزر، شیشہ، شیشہ،
 اور اب شیشہ، راگزر، رنگ، فلک
 رنگ ہے دل کا مرے، "خونِ جگر ہونے تک"
 چمپی رنگ کبھی راحت دیدار کا رنگ
 سُرمی رنگ کہ ہے ساعتِ یزار کا رنگ
 زرد پتوں کا، خس و غار کا رنگ
 سُرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
 زہر کا رنگ، ہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
 آسماں، راہگزر، شیشہ،
 کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رنگ
 کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے
 اب جو آئے ہو تو بھڑو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے
 ایک جگہ پر بھڑے

پھرتے ایک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے

آسماں حد نظر، راگزر، راگزر، شیشہ، شیشہ، (ماسکو، اگست ۱۹۶۳ء)

غزلیں

(۱)

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
 صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے
 طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیرا ہن
 جسگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے
 تنک مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
 بھرے جوشیشہ چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے
 تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
 ہراک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے
 ہے انتظارِ ملامت میں نامحوں کا ہجوم
 نظرِ سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے
 بہت عزیز ہو لیکن شکستہ دل یارو
 تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے
 وہ شورِ شِشِ غم دل جس کی لے نہیں کوئی
 غزل کی دُھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

(مارچ ۱۹۵۷ء)

(۲)

جسے گی کیسے بسا طیاراں کہ شیشہ و جام بھج گئے ہیں
 سچے گی کیسے شبِ بنگاراں کہ دل ہر شام بچھ گئے ہیں
 وہ تیرگی ہے روتہاں میں چسراغِ رخ ہے نہ شمع وعدہ
 کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بچھ گئے ہیں
 بہت سنبھالا وفا کا ہیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
 ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پینام بچھ گئے ہیں
 قریب آئے مہِ شبنم نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
 کہ دل پر کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بچھ گئے ہیں
 بہار اب آکے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جوشِ رنگ و نغمہ
 وہ گل سرشاخِ جل گئے ہیں وہ دل تہہ دام بچھ گئے ہیں

(۳)

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
 تم اپنے میچا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
 دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
 خونِ دل وحشی کا صلا کیوں نہیں دیتے
 مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
 منصف ہو تو اب حشر اٹھائیوں نہیں دیتے

ہاں نکستہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
 ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے
 پیمان جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
 دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے
 بریادی دل جبر نہیں فیض کسی کا
 وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

دلاہودیل - ۳۱ دسمبر ۱۹۵۵ء

(۴)

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
 تری رہ میں کرتے تھے سر غلب، سر رہ گزار چلے گئے
 تری کج ادائی سے ہمارے شب، انتظار چلی گئی
 مرے ضبط حال سے روٹھ کر مرے عنم گسار چلے گئے
 نہ سوال وصل، نہ عرض عنم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
 ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

نہ رہ جنون رنج و ف، یہ رس، یہ وار کرو گے کمیا
 جنہیں جبرم عشق پہ ناز کستا وہ گناہ گار چلے گئے

(جولائی ۱۹۵۹ء)

(۵)

کب بھڑے گا درد لے دل کب رات بسر ہوگی
 سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی
 کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
 کس دن تری شنوائی اے دیدہ تر ہوگی
 کب ہیکے گی فعل گل، کب پیکے گانے خانہ
 کب صبح سخن ہوگی، کب شام نظر ہوگی
 واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
 اب شہر میں یا روں کی کس طرح بسر ہوگی
 کب تک ابھی رہ دیکھیں لے قامتِ جانانہ
 کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبیر ہوگی

(دسمبر ۱۹۵۹ء)

(۶)

آج یوں موج در موج غم تنہم گیا، اس طرح غمزدوں کو قرار آ گیا
 جیسے خوشبوئے زلف بہار آ گئی، جیسے پیغام دیدار آ گیا
 جس کی دید و طلب وہم سمجھتے تھے ہم رو برو پھر ہر رہ گزار آ گیا
 بچ فرما کو پھر دل ترسے لگا، عسبر رفتہ ترا اعتبار آ گیا
 رست بدلنے لگی رنگ دل دیکھنا، رنگ گلشن سے اجمال کھٹا نہیں

زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا، اشک اُمڈے کہ ابر بہار آگیا
 خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے داغ جلنے لگے
 محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھڑا گیا
 سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ مشہر میں
 ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کا ندھ پہ دار آگیا
 نینق کیا جائے یا رکس اس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
 مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دلِ نگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

(۷۰)

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کشش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
 جو بچے ہیں سنگِ سمیٹ لو تن داغ داغ ٹا دیا
 مرے چارہ گر کو نوید ہو صفتِ دشناں کو خبر کرو
 جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
 کرو کج جہیں پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
 کہ عزوِ عشق کا بائپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا
 ادھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھے گفتنی
 جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
 جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
 رہ یا رہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

(مشترقۃ اشعار)

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسنِ دستِ میلی تری یادِ دُورے مریم
دل و جاں فداۓ راہے کبھی آکے دیکھ ہمد
سہر کوئے دل نگاراں، شبِ آرزو کا عالم
لوٹنی گئی ہماری یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشہٴ نقس ہے، وہی فضلِ گل کا ماتم

(لاہور جیل، فروری ۱۹۵۹ء)

ہر سمت پر لیشاں تری آمد کے ترینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے
ہر منزلِ غربت پر مگن ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر کام بہت در بدری نے
تجے بزم میں سب دُورِ سر بزم سے شاداں
بے کار حبس لایا ہمیں روشن نظری نے
یہ جامہٴ صد چاک بدل لینے میں کیا بھتا
مہلت ہی نہ دی فیض، کبھی بچینہ گری نے

(لندن، ۱۹۶۳ء)

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ! انہیں کچھ نہ کہو....

وقت بدلا.... تدریس بدلیں.... ڈھنگ بدلے، مگر کچھ لوگ وہ بھی ہیں جن کے پاس رقم کو محفوظ رکھنے کا سب سے اچھا نسخہ یا تو اسے زمین میں پھپھادینا ہے یا مرزنت ساتھ لئے پھرنا.... انہیں کوئی کیا کہے؟

یہ بے جا خوف.... یہ بے جا پریشانی آجکل کے ذہین افراد کے لئے گھمٹے کا سولہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی رقم بینک میں رکھواتے ہیں یوں نہ صرف رقم محفوظ رہتی ہے بلکہ بڑھتی بھی جاتی ہے۔ نہ خوف، نہ پریشانی۔ اطمینان ہی اطمینان۔

یہی نہیں اس طرح بینکاری سے فائدہ اٹھانا ملک کے لئے نیک شگون ہے۔ کیونکہ جتنی زیادہ بینکاری بڑھے گی اتنی ہی ملک میں خوشحالی بڑھے گی۔

یونائٹڈ بینک کے ۲۰۰ سے زائد شاخیں ملک بھر میں بینکاری کی سہولتوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں سرگرمی سے مصروف ہیں۔ کسی بھی شاخ میں جائے یونائٹڈ بینک آپ کو خوش آمدید کہے گا۔

یونائٹڈ بینک لمیٹڈ 

قدید روایات اور جدید وضع کی اینہ دار

ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کی
گھریلو مصنوعات
حسریہ

ڈبلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کی گھریلو مصنوعات مثلاً خوبصورت لباسات
کھلونے۔ آرائشی پارچہ جات۔ تحائف، دوسری زیب و زینت کی
چیزیں آپ کی گھر کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں۔ یہ مصنوعات
اندرون اور بیرون ملک میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔
آپ بھی اپنے گھر کی آرائش کے لئے ان مصنوعات کا
استعمال کیجئے۔



مغربی پاکستان
منصوبہ ترقیاتی کارپوریشن
مرکز
پاکستانی
گھریلو مصنوعات

پریڈی اسٹریٹ اور کچہری روڈ - کراچی۔ دی مال لاہور۔ دی مال راولپنڈی۔ حسن پرواز روڈ۔ ملتان
دی مال پشاور۔ ملک چاؤڈی حیدر آباد۔ جناح ایونیو۔ کوئٹہ

عباسی

پلنگ کی چادریں اوزتیکہ کے غلاف



سکون بخش
طرح بہ رنگ بہ رنگ
پلنگ کی چادریں اور ہم رنگ
تیکہ کے غلاف

کراچی میں مندرجہ ذیل سے حاصل کی جاسکتی ہیں

ہومس اینڈ کمپنی	جلال دین اینڈ برادرز
کورنر پریڈی - وکٹوریہ روڈ - صدر	کلاک اسٹریٹ صدر
فون :- ۷۱۹۳	فون :- ۵۲۷۵۸
ایچ غلام محمد اینڈ برادرز	حاجی ہارون اینڈ سنز
انفینٹن اسٹریٹ فون :- ۵۲۷۵۳	۲/۱ - پوری بازار صدر
سمرسٹ اسٹریٹ فون :- ۵۱۸۳۳	فون :- ۵۲۱۶۶
۲۲۲۸۳۹ فون :- بندر روڈ -	محمد زید اینڈ سنز - ۱۹ نور کلاتھ مارکیٹ - بندر روڈ - فون :- ۲۲۲۸۳۹

عباسی ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر ۴۲۰۹ - کراچی ۷ - فون :- ۳۸۵۹۱/۹۸

سوار - بیس نمبر

BVLER

SWISS

بُولَر

قابل اعتماد

گھڑی

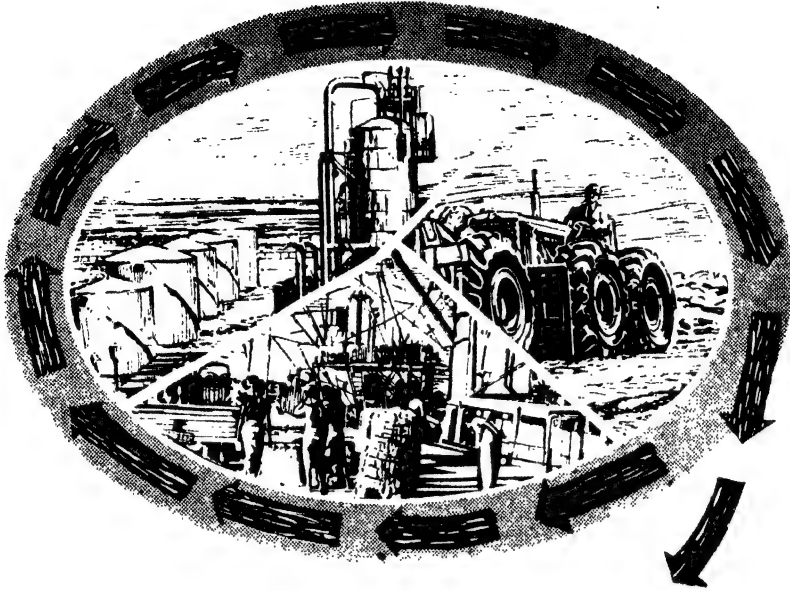
پاکستان میں ہر جگہ دستیاب ہے

انٹرنیشنل واپچ کمپنی -

لکھنؤ بلڈنگ، ہند روڈ، کراچی۔ فون نمبر ۳۴۶۴۰



ORIENT



پاکستان کی معاشی ترقی میں ایسٹ متحرک قوت

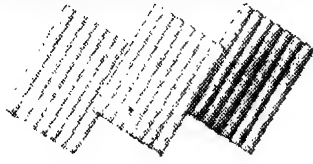
پاکستان معاشی ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ سب پاکستانی عوام کی محنت، پختہ عزائم، ایک روشن خیال حکومت اور غیر سرکاری سرمایہ کاری کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔

پاکستان غیر ملکی سرمایہ کاری کی مکمل حمایت کرتا ہے۔ تیز رفتاری ترقی اور منصوبوں کی کامیابی تکمیل کے لئے پاکستان کو ملکی و غیر ملکی سرمایہ کی اہم ضرورت ہے۔ غیر ملکی سرمایہ سے زیادہ دلچسپی اور فنی و تکنیکی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ روزگار کے بہترین ذرائع پیدا ہوتے ہیں۔ سرمایہ کو فروغ ہوتا ہے اور اس سے صنعتوں و دیگر تجارتوں کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کی یہ خدمات ملک کی معاشی و صنعتی ترقی کے لئے بہت اہم ہیں۔ ایسٹو کو بجا طور پر خوشی اور فخر ہے کہ اس نے پاکستان کی معاشی ترقی اور خوشحالی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔



پاکستان

ایسٹو اسٹینڈرڈ ایسٹرن اینکارپوریٹڈ (مردود زرعی کے ساتھ وائس۔ نے میں قائم شد)



حالت کر کے ان کے غمزدگی سے بے نیاز
 کے ساتھ ان کے غمزدگی سے بے نیاز
 کے ساتھ ان کے غمزدگی سے بے نیاز
 کے ساتھ ان کے غمزدگی سے بے نیاز

وہاں جس کی طرف سے کہ وہاں ہی رہا
 وہاں ہی رہا وہاں ہی رہا وہاں ہی رہا
 وہاں ہی رہا وہاں ہی رہا وہاں ہی رہا
 وہاں ہی رہا وہاں ہی رہا وہاں ہی رہا

اب

ڈاڑھیں

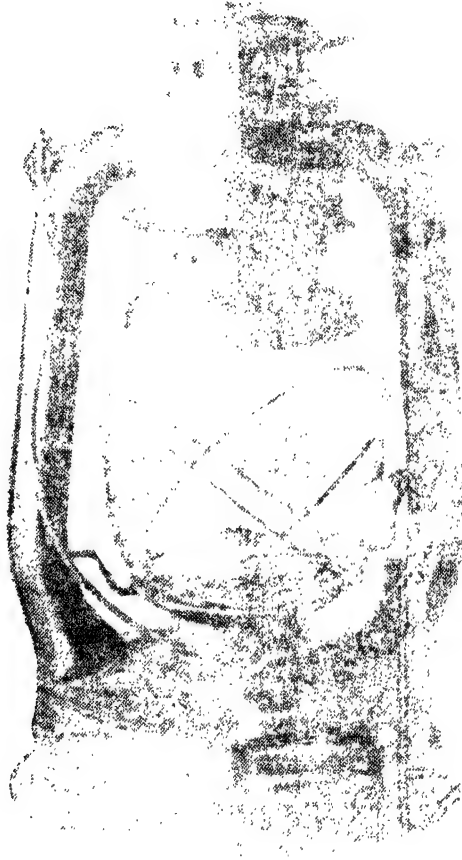
کی رہنمائی کے ساتھ ڈاڑھیں کی رہنمائی کے ساتھ

ایک ایسی ہیئت انڈسٹریل
 ایسی ہیئت انڈسٹریل ایسی ہیئت انڈسٹریل



افکار - فیض نادر

مچاند ستریکمین لالشیمن



تیار کنندگان

مستند انڈسٹریل کارپوریشن

بی - ۳۳ - ایس - آئی - ٹی - ای - کراچی - ۱۶

پاکستان کی ترقی میں قابل فخر کردار



انامل - روپے کی بہت حفاظت اور زیادہ عرصہ تک چمک قائم رکھنے کیلئے متعدد رنگوں میں لکڑی اور دھاتوں پر رنگ کرنے اور ہر قسم کی اندرونی و بیرونی زینائش کیلئے استعمال ہونے والے انامل (۴۱۳)

نیوکلیک پلاسٹک امیشن - سینٹ پلاسٹر، اینٹوں کی عمارتوں، دیواروں، چوٹی اشیاء اور دھات کی چیزوں پر استعمال کیلئے فوری طور پر ری کوٹنگ بہترین بیجی کاری پائیداری اور سوزوں صفائی کے لئے متعدد رنگوں میں دستیاب ہیں

آئل باؤنڈ واشیبل ڈسپنر - اندرونی استعمال کے لئے دھوئے جانے کے قابل ہر رنگ کے ڈسپنر

ریڈی میکسڈ پینٹ - عام استعمال کیلئے متعدد رنگوں میں تیار کئے ہوئے پینٹ جو ساخت میں بے نظیر ہیں۔

وارنش - اندرونی اور بیرونی طور پر گھر، ٹیو اور عام استعمال کیلئے شفاف اور ہلکے زور رنگ کی وارنش

جہاں بھی پینٹ ہے
وہاں بکلی ہے
بکلی پینٹس لمیٹڈ

کراچی - چٹاگانگ - بیروت



عروسان

ہم کی بہت عظیمیہ جو درویش سادہ رکھتے ہیں

- ★ لندن میں ایک ملاقات
- فن کار اور ترقی پذیر معاشرہ
- ★ عریضہ رنگاں
- پاکستان کہاں ہے؟
- ★ داعستان میں چند روز
- ایک یا دو کا رنقرہ
- ★ شہر میں اظہار و ترجمانی
- آہنگ
- ★ کچھ ڈراموں کے بارے میں
- چند دواور
- ★ کچھ داک۔ رنگ کے بارے میں

فیض ہ عبارت

لنزلک ایک لایق

اسکول آف آرٹس ایلڈ افریقن اسٹڈیز کے شعبہ اردو کے لئے گزشتہ سال میں نے اور میں دوست اور رفیق کار رالف رسل نے اردو کے اریبیوں اور شاعروں کے آوازوں کو ریکارڈ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلہ میں ایک وفد ہم نے فیض صاحب کو بھی مدعو کیا۔ انہوں نے دعوت کو قبول کیا۔ اس کے اثناء میں انہوں نے ہمارے ساتھ گزارے۔ میں نے فیض صاحب سے ان کی شخصیت اور شاعری پر چند سوال کئے اور انہوں نے ان کے مفہوم جو ابے رہے۔ ان سے فیض کی شخصیت اور شاعری پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور یہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

اس خیال سے میں نے اس کا مسودہ اشاعت کے لئے تیار کیا۔ یہ کام بہت دشوار تھا، لیکن میں نے عزیز دوست اور رفیق کار رالف رسل کی مدد سے اس کو آسان کر دیا۔ کئی گھنٹے ہم لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ کو بجا کر آواز سننے اور اس کا مسودہ تیار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ ٹیپ ریکارڈ قلم کے مقابلے میں تیز چلتا ہے۔ جن لوگوں کو ٹیپ ریکارڈ سے مسودے تیار کرنے کا تجربہ ہے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کام میں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور کس طرح لہو جلانا پڑتا ہے۔ رالف اس کام میں ہاتھ نہ بٹاتے تو اس کا تکمیل سے ہسکتا رہنا مشکل تھا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ فیض عبادت اور شاعری سے دلچسپی
 لینے والوں کے لئے مسرت دہک دینے والے ملاقات کے تفصیل دلچسپ ہے
 باعزت سؤگے (عبادت)

عبادت : فیض صاحب! آج میں آپ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی شاعری اور شاعری کے بارے میں۔ سب سے
 پہلے تو آپ یہ فرمائیے کہ آپ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی، اور وہ کون سا گھرانہ جس میں آپ نے اپنی زندگی کے
 ابتدائی دن گزارے؟

فیض : ولادت تو میری سیالکوٹ کی ہے۔ تاریخ ولادت مجھے خود نہیں معلوم۔ ایک ہم نے فرض بن رکھی ہے۔ لیکن۔۔۔
 عبادت : اچھا دی بتا دیجئے۔

فیض : ۷ جنوری ۱۹۱۱ء ہے۔ میں یہ محض اسکول کے سرٹیفکیٹ سے نقل کی گئی ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ اس زمانے میں محکم
 میں جتو کہیں لکھی جاتی تھیں وہ سب جعلی ہوتی تھیں۔ (دہقہ)۔ اس لئے کہ وہ اس سب کے لکھی جاتی تھیں کہ خدا
 عمر میں آدمی ہر ملک پاس کرے گا۔ اس کے بعد انگریزی یا سرکاری نوکری کے لئے عمر کم ہوتی چاہئے۔ تو بچپن میں سیالکوٹ
 ہی میں گزارا۔ اسکول میرا اسکاٹش مشن اسکول تھا وہاں۔ اس کے ساتھ اصل میرے استاد جو تھے شمس العلماء مولوی
 میر حسن تھے۔ ان کے سینے پھٹی یا ساتویں جماعت میں عربی کی صرف و نحو پڑھی۔ اور اُس سے زیادہ میرے استاد یعنی
 زیادہ قریبی استاد تھے مولوی ابراہیم میرسیا لکھنؤ۔ بہت بڑے فاضل تھے۔ انکو میں نے اُن سے پڑھی۔ ابتدائی کتابیں
 ان سے پڑھیں۔ اُن کے بعد قرآن اور حدیث ۵ درس اُن سے یا برسوں۔ تو بچپن تو وہیں پڑھ رہا۔ اس کے بعد
 ایف اے تک میں نے سیالکوٹ میں ہی پڑھا۔ اس کے بعد میں لاہور چلا گیا۔

عبادت : اچھا لاہور میں کون سا مدرسہ ایسے تھے جن سے آپ نے استفادہ کیا؟

فیض : لاہور میں میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ وہاں ہر ہمارے انگریزی کے اُت دتے۔ دو استاد تھے۔ اپنے زمانے
 میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ ایک پروفیسر لینگ بارن (Langhorne)۔ ایک پروفیسر فریم جو آج کل
 یہاں پر ہیں۔ اوتیس برس ہمارے بنیادی صاحب تھے۔ پطرس۔ اس کے علاوہ فلسفے میں پروفیسر جنرلی تھے۔ عربی میں
 ڈاکٹر صدر الدین مرحوم تھے۔ اور انجیل میں فارسی کا طالب علم نہیں تھا لیکن قاضی فضل حق صاحب سے ملاسم تھے۔
 اس لئے کہ وہ ہماری جامعہ میں کے صدر بھی تھے۔ ان حضرات کے علاوہ اُن دنوں جو زیادہ متبر اور بزرگ ادیب اور لکھنے والے
 تھے وہ بیشتر ایک جاہلوں کے تھے۔ یہ تاثر مرحوم کے گھر پر یا صوفی قسم صاحب کے یہاں۔ یا بکدی صاحب کے یہاں
 ۔ تو زیادہ قیہ، تو یہاں ہی ہوں کہ کالج کے اندر نہیں ہوئی۔ کالج کے باہر ہوئی۔

۱۷ پروفیسر فریم کا اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں لسانیات کے پروفیسر تھے لیکن
 چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔ (عبادت)

عبادت: بے شک۔۔۔ ان صحبتوں میں۔۔۔

فیض: جی، ان لوگوں کی صحبتوں میں۔۔۔ خاص طور پر پروفیسر ریاض صاحب کے یہاں تو باقاعدگی سے ہر شے ایک محض ہوا کرتی تھی جس کا نام انہوں نے 'برزم اردو' رکھا تھا۔ جو آج کل 'برزم احباب' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اور وہی صاحبؔ دیران خاتمہ تھے۔ وہاں پر تو ہمیشہ لوگ جمع رہتے تھے۔۔۔ اور میرے تاثیر صاحب کا گھر تھا۔۔۔ تو اس زمانے کے بیشتر ندرتوں سے انہیں لوگوں کے دولت کدوں پر ملاقات ہوئی

عبادت: اچھا! فیض صاحب! یہ بتائیے کہ آپ نے شاعری کب شروع کی؟

فیض: یہ سوچنے پر دستہ کہ کب بندی کیسے شروع ہوئی۔۔۔ شاعری اس کے بعد کب سے شروع ہوئی وہ ذرا کتنا مشکل ہے۔۔۔ ٹھیک بندی کا تو فیض معلوم ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خیال آیا کہ لڑکوں کا ایک مقابلہ کرنا چاہئے۔ شاعری نہیں ہونا چاہئے۔۔۔ شاعری کہ۔۔۔ کہا گیا کہ صاحبؔ! طرح پر آپ سب لوگ طبع آزمائی کریں، تو انہیں نام دیا جائے گا۔۔۔ تو اس قسم کا پہلا جو مقابلہ ہوا اس نے نہ صرف اور فتح کئے شمس العلما مولوی میر حسن صاحب۔۔۔ پہلا جب اس قسم کا مقابلہ ہوا تو اتفاقاً سے ہمیں انعام مل گیا۔۔۔ تو گویا کہ انعام سے زیادہ وہ نصیب کیا تھا انہوں نے یہ نہ کیا۔۔۔ اور انعام جتنے یا رہے انہیے رد یہی ہوتا تھا۔

عبادت: بہت خوب!۔۔۔

فیض: اس کے بعد انہوں نے ہمیں مذکورہ مقابلہ میں بہترین کہہ کر نکتہ پڑا۔۔۔ اُس کے بعد میرے گھر کے ساتھ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ جو اب بھی اس پر کھڑا ہے۔۔۔ وہیں پر ہمارا دفتر سے شاعر، ہوا کو لے کر ہمارے شہر میں منشی راج نائن ارمان دہلوی صاحب تھے۔ ان پر ایک خط ملا۔۔۔ اُس نے کہہ دیا کہ چاہیے وہ لاہور آٹھ آئے تھے۔

عبادت: جی ہاں!

فیض: تو انہوں نے ایک مغل مشعر قائم کر رکھی تھی۔ ہمارے گھر کے باغیچے کے ساتھ۔ اس کے باقی عدلی سے شاعر سے جوستے تھے۔۔۔ ایک بزرگ ہوا کرتے تھے منشی سراج دین مرحوم جو کہ علامہ اقبالؒ کے دوستوں میں سے تھے۔ اور ان کا ذکر بھی ہے علامہ کی قبروں میں۔۔۔ تو وہ ہمیشہ صدارت کیا کرتے تھے۔۔۔ وہ کثیر میں میر منشی تھے۔۔۔ تو شاعر اس طریق سے ہوا کرتے تھے جب ان کی ریڈیو نسی سیال کوٹ میں آجاتی تھی تو وہ بھی سیال کوٹ میں آجاتے تھے، اور ان کے ساتھ مشعر وہ بھی آجاتا تھا۔۔۔ تو پانچ چھ مہینے اس کا یا زار گرم رہتا تھا۔۔۔ وہاں پر ہم بھی جایا کرتے تھے۔۔۔ مدرستہ طبع پر مشتمل پڑھی جاتی تھیں۔۔۔ بہت دنوں تک تو خیر میں بہت نہیں ہوئی اس لئے کہ منشی سراج دین صاحب بڑے فترے پاؤں آ رہے تھے۔

عبادت: خوب! دیکھو!

فیض: اور جب کوئی مشعر سنانے کے لئے آتا تو ایک شعر اس نے پڑھا اور انہوں نے دس سوڑا سا تہذ کے اسی مضمون پر پڑا دیئے۔

عبادت: واقعی شکل چیز تھی۔

فیض: تو بہت دنوں کے بعد میں ہمت ہوئی، تو ہم نے ایک غزل پڑھ دی، اور ظرافت تو فتح منشی صاحب نے داد دی۔ کہا: 'برخوردا'

یہ تو اچھا ہے۔ لیکن یہ سب تک بندی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں گیا ہوں تو ذرا تھک گیا۔ تو جب سے تھوڑا بہت شرم کا، یعنی محض مثنیٰ کن کے لئے نہیں۔ بلکہ —

عبادت: یعنی جی پو بتا تھا شرم کے کو۔

فیض: کچھ احوال دل بیان کرنے کے لئے — ضرورت پڑی۔

عبادت: وہ تو آپ کی نظریں سے پتہ چلتا ہے۔

فیض: قویں جب سے شرمی شروع ہوئی۔

عبادت: اچھا، اس زمانہ کی وہی نظریں ہیں جن میں رومانی رنگ و آہنگ ہے اور فحش فریادی کے پہلے حصے میں شامل ہیں۔

فیض: جی ہاں! فحش فریادی، کی نظریں کا پہلا حصہ تو گورنمنٹ کالج ہی کے زمانے کا ہے۔

عبادت: یہ نظریں آپ نے کب لکھی؟

فیض: آپ یہ کیجئے کہ نہ ۶۹ء نہ ۳۰ء کا زمانہ ہے۔

عبادت: اُس زمانے میں، ترقی پسند تحریک اگرچہ باقاعدہ تو نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن اُس کے شروع ہونے کے آثار موجود تھے، تو آپ کو۔

فیض: ہاں، ترقی پسند تحریک اس میں کوئی تین پار برس بعد شروع ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں کچھ کچھ قہر شروع ہو گیا تھا، لیکن باقی زندگی سے نہ ۳۳ء میں شروع ہوئی تھی۔

عبادت: ۳۵ء میں شروع ہوئی تھی۔

فیض: لیکن فنمائیں آثار اس۔ پیدا ہو گئے تھے۔ نہ ۳۵ء میں جب میں نے کالج سے تعلیم ختم کرکامرستریں چھانا شروع

کر دیا تھا، اُسے اوکھا میں۔ تو انہیں دفوں یہ تحریک شروع ہوئی — تو پھر اُس کے ساتھ۔

عبادت: آپ کو کچھ راسخ پیدا ہوا۔

فیض: جی ہاں، رابطہ پیدا ہوا۔

عبادت: اچھا، آپ نے جو یہ نظریں لکھی ہیں، رقیب سے، چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز، — یہ اس اثر کے بعد کی ہیں؟

فیض: اس کے بعد کی — دراصل یہ اُس وقت لکھی گئیں جب تھوڑا بہت سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا — پہلی نظم تو بے

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، — اور یہ ساری نظریں اُس کے بعد کی ہیں۔ یہ ۳۵ء اور نہ ۴۰ء کے

درمیان کی ہیں۔

عبادت: اچھا فیض صاحب! یہ فرمائیے کہ کبھی علامہ اقبالؒ سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی؟

فیض: جی ہاں اُن سے کسی دفعہ شرم نہ کیا زما حاصل ہوا۔ ایک تو وہ ہم وطن تھے، دوسرے وہ میرے والد کے دوست بھی تھے۔

اس لئے کہ دونوں ہم عصر تھے۔ اور یہاں انگلستان میں بھی وہ ایک ساتھ رہتے تھے۔

عبادت: خوب!

فیض: چنانچہ اُن سے پہلی ملاقات تو مجھے یاد ہے۔ بہت بچپن میں ہوئی جب کہ میری عمر کوئی چھ سات برس کی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی

عبادت سے : اچھا فیض صاحب ! ایک بات میں آپ سے اور پوچھا جاتا ہوں ۔ وہ یہ کہ اردو شاعروں میں سے آپ نے کون کون سے شاعروں کا مطالعہ کیا ہے ؟ اور کون کون سے آپ کو زیادہ پسند ہیں ؟

فیض صاحب : اصل میں اگر مطالعہ آپ کبھی تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے ۔ یعنی غالب کا ۔ اس کے بوجہ میں خاندانی مسائل کے ساتھ کچھ وقت گذرا ۔ اور کچھ نظر کاٹا ، کبھی پڑھا ۔

عبادت سے : ظاہر ہے کہ یہ تو اہم شاعر ہیں ۔

فیض صاحب : یوں تو اپنی عمر سے ہی کے زمانے میں ۔ اور پھر ریڈیو وغیرہ کے سلسلے میں تو مجھ کو سب ہی کو پڑھنا پڑا ، لیکن اپنے شوق سے جن کو پڑھنا ہے ان میں کبھی ہیں ۔ میر ، غالب ، سوزا ، نظیر انیس ۔

عبادت سے : اچھا فیض صاحب ! جدید شاعروں میں سے آپ کون پسند کرتے ہیں ؟ جدید شاعروں سے میرا مطلب ہے وہ شاعر جو علامہ اقبال کے بعد آئے اور آپ کے ہم عصر ہیں ۔

فیض صاحب : اپنے ہم عصروں میں اگر میں کہوں کہ مجھے فلاں پسند ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا بہ خطرے کا کہ باقی پسند نہیں ہیں ۔

عبادت سے : نتیجہ نہیں ، مطلب یہ ہے کہ آپ کو کون سے ہم عصروں سے نسبتاً زیادہ ماضیت ہے ۔

فیض صاحب : تو سب لوگ پسند ہیں ۔ لیکن زیادہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک ۔ نور احمد ۔

ہیلو ام : ان ۔ م ۔ راشد ۔

فیض صاحب : بالکل ۔ دوسرے ایک ہی زمرہ میں آتے ۔ اور میر ہیں ۔ علی مدد ہیں ۔ تو میر سے ملنے کے جو لوگ ہیں ان میں یہ ذرا زیادہ پسند ہیں ۔ یوں بہت سے اور بھی ہیں ان کی بہت سی چیزیں پسند ہیں ۔

عبادت سے : جوش صاحب کی چیزیں آپ نے پسند ہی ہیں ؟

فیض صاحب : جی ہاں !

عبادت سے : جوش صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

فیض صاحب : جوش صاحب بزرگ ہیں ہمارے ۔ بہت دنوں سے نیا رہے ان سے ۔ اور ان میں ذرا تم کا ایک وفد اور ایک غامی قسم کی قدرت کلام ہے ۔ تو اس سے تو مجھ کو بڑا شوق ہے ۔ لیکن وہ بہت بڑے بڑے غائب قدرت کلام کی وجہ سے زیادہ لگتے ہیں ۔ میں کہتا ہوں کہ سب بڑے شاعروں کا ایک جھنڈا یہ ہے کہ وہ اپنے اچھے اور بُرے ، اور بالکل خالص یا کچھ نہ کچھ خالص تجربات میں کچھ زیادہ غیر متوازن کرتے ۔ اور احتیاط نہیں کرتے ۔ تو جوش صاحب کا یہی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سچ تو ان کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اس سطح پر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیزیں ہیں ۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محض زور کلام میں بھی ہیں ۔

عبادت سے : فیض صاحب ! نظریے کے بغیر شاعری یا اعلیٰ شاعری یا بڑی شاعری ناممکن ہے ۔ یہی کوئی نہ کوئی نقطہ نظر کوئی نہ کوئی نقطہ خیال کسی شاعر کے پاس ضرور ہونا چاہئے ۔ کیونکہ اس کے بغیر اعلیٰ درجے کی شاعری کی تخلیق ناممکن ہے ۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

فیضؑ : نظریہ کی جو اصطلاح ہے اس کے بارے میں بہت سے مغالطے ہیں۔ نظریے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شعر ہمیشہ بہت باقاعدگی سے کوئی فلسفے کا تیسر یا سیاست کا یا کسی اور چیز کا کوئی منظم اور مربوط نظام ہمیشہ پیش کرے بیچیں سمجھتا ہوں کہ شعر کا تجربہ جو ہے، یا کوئی بھی تجربہ، وہ کسی نہ کسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر آپ ایک ہی چیز کو دیکھیں تو اس کو آپ کوئی نقطہ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ تو مجھے کوئی ایسا بڑا شاغر۔۔۔ بڑا شاغر یا بڑا فن کار ادیب، مصور، موسیقار ایسا یاد نہیں ہے جس کے ذہن میں اپنے گرد و پیش کے متعلق کچھ تاثر، کچھ نہ کچھ احساس، کچھ نہ کچھ نظریہ کہہ لیجئے، جو کسی احساس اور تجربے پر مختصر ہو۔ ایسا شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو کہ یہ دنیا اچھی ہے یا بُری ہے۔ لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا بُری طرح رہتے ہیں، یا ان کے لئے کچھ کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے۔ یا انسانیت کس طرف جا رہی ہے یا کس طرف نہیں جا رہی ہے۔ جس شخص کے ذہن میں اس قسم کا کوئی نظریہ نہ ہو وہ کوئی زیادہ حساس اور ذی شعور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور ہر فن کار اور ادیب کے لئے شعور لازمی ہے۔

عبادت : بالکل صحیح بات ہے۔ اچھا فیض صاحب! اچھی باتیں ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے ان تمام باتوں پر روشنی ڈالی۔ بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی ایک نظم اور ایک غزل بھی ارشاد فرمائیں گے۔

فیضؑ : ضرور۔ حال ہی کے زمانے کی ایک نظم ہے۔

عبادت : ارشاد۔

فیضؑ : عرض کرتا ہوں : تم مرے پاس رہو۔ اس کا عنوان بھی یہی ہے۔

تم مرے پاس رہو

مرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو

.....

.....

عبادت : اب غزل بھی ارشاد فرمائیے۔

فیضؑ : اچھا صاحب! تو غزل بھی اسی زمانے کی ہے۔ بلکہ آپہی کے شہر میں لکھی گئی ہے۔

ہر سمت پریشاں دلی آمد کے ترینے

دھوکے دیئے کیا کیا ہیں باؤں تیری نے

ہر منظر غریب پر لگماں ہوتا ہے گھر کا

بہلا دیا ہے ہر گام بہت درہ درہ دلی نے

تھے نرم میں سب دو دو ہر نرم سے شادوں

بے کار جلایا ہیں روشن نظری نے

مے خلی نے میں عاجز ہوئے آرزوہ دنیا سے

میدگان نہ رکھا ہمیں آشتی سری نے

یہ جانہ مدد چاک بدل لینے ہی کیا تھا
مہلت ہی نہ دی تھی کبھی بخیر گری نے
شہادت : فیض صاحب! ایک اور تازہ غزل آپسے چند روز ہوئے مجھے سنائی تھی۔ وہ بھی عنایت فرمائیے۔
فیض : عرض کرتا ہوں۔

شریحِ فراق مَدَحِ لبِ خشک ہو کر یں
غزبتِ کدے میں کس سے تری گفت گو کر یں
یار! آشنا نہیں کوئی لکوائیں کس سے پیام
کس دل رُبا کے نام پہ خالی سبجو کر یں
سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلامشیں بام
دل ساتھ دے تو آج عشمِ آرزو کر یں
کب تک سننے کی رات کہاں تک نہائیں ہم
شکوے گلِ مہر آج ترسے رُو برو کر یں
ہمدمِ حدیثِ کوئے ملامت سنائیو
دل کو ہمو کر یں کہ گر میاں نہ ہو کر یں
آشفۃ سرِ جہنمِ محبتِ ہوا مُتہ نہ آئیو!
سرنیچے دیں تو فکرِ دل و جانِ عذو کر یں
”ترد امنی پہ شیشِ ہمساری نہ جانیو
دامنِ پتھر دیں تو فرشتے و نونو کر یں“

(لنوں سے)

عبادت، بہت بہت شکر یہ!

کچھ عجیب سے بات ہے کہ ہمارے ہمارے ہر فن کو
فن کہتے ہیں لیکن فلم کو انڈسٹری کہتے ہیں، صنعت بھی
نہیں انڈسٹری۔ گویا جو تہ بنانا اور فلمیں بنانا کچھ
ایک ہی سا کاروبار ہے۔ مگر اس میں مال ہے تو آپ کی پسند
پر جو تہ بنائیے یا فلم۔ بدھ جوتا بنانے کے لئے تو شاید
خچہ سحج بوجھ درکار ہو، صنم بنانے کے لئے یہ بھی
شرط نہیں۔

— فیض

فیضِ حسنہ فیضِ ذبحہ آغا افتخار حسین

فنکار اور ترقی پسند پیرائے نگار

فیض صاحب کا ہم تازہ ترین مصنفوں ہے جو اسلوب سے
چھپاؤ، فنونِ انفرادی، خیالی، کائناتوں سے متعلق لاکھوں میں
پڑھا تھا۔ (ادارہ)

سب سے پہلے میں یہ مان لینا چاہیے کہ ایک تخلیقی فنکار چاہے اندر جو کچھ بھی ہو وہ ایک تاریک میں دھونڈ گیا۔ ریاکار اور بدول نہیں
ہے۔ یہیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس پر جس حقیقت کا انکشاف ہو گا نہ تو وہ اسے سستے دامن میں بیٹے کا اور نہ کسی کے خون سے ات چھلے
گا۔ یہ حقیقت ہی اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ اور اس کے فن کا نتیجہ ہے۔ یہاں سے فنکار کی ذاتی اخلاقیات کا ذکر نہیں کر رہے ہیں،
حالانکہ اس کی بھی اہمیت ہے، بلکہ اس اخلاقیات کا جو اس کے فن پر حاوی ہے۔ اس اخلاقیات کا جو اس کے جمالیاتی اقدار کے اساس بنتی ہو
یہ حقیقت کیا ہے اور اس کی بہت گونا گونا پنے کا یہ مان لے لیا ہے؟ ایک فنکار حیات کے تین ہم کرداروں میں گھونٹا ہے۔ پہلا دائرہ
اس کی اپنی مادہ اور مادی شہیت کا ہے۔ دوسرا دائرہ اس کی برادری اور اس کی قوم کا ہے اور تیسرا دائرہ انسانیت کے اس
دور کا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ وقت کے یہ تین ابعاد (DIMENSIONS) ماضی، حال اور مستقبل ہیں۔ اور حیات کے یہ
تین دائرے ہی وہ حقیقت ہے جس کا وجود فنکار کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صداقت کا حاصل ہے۔ یہ حقیقت اور
صداقت فنکار اور اس کے ناظرین کا زمین اور سامعین سب کے سامنے جلوہ گر ہے۔ لیکن فنکار اس حقیقت سے کس حد تک متاثر ہوا؟
اس کا بیان یہی ہے کہ اس نے اس حقیقت اور صداقت کی عکاسی اپنے فن میں کس حد تک کی۔ حقیقت اور صداقت کا یہ ادراک اور اس کا
فنکار کے لئے کئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ کبھی شبیہ اور ان کے باہمی تعلق کی صورت میں داخل ہوتا ہے کبھی مادہ کے علت و معلول کی
شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے کبھی عروج و نزول کی تعبیریں کرنا اور ہوتا ہے کبھی تضاد کی تصویر دکھانا ہے۔ کبھی ترکیب کی کبھی خوش آہنگ
کبھی بے آہنگ اور اس طرح حقیقت کے اس فنکارانہ ادراک سے اشتیاق اور ان کے عکاسی تعلق کی قدر و قیمت بھی متین ہو جاتی ہے۔

فن کا خود بھی اپنے گرد و پیش کے عناصر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس اثر کا اندازہ ہی لے لے گا جانتا ہے کہ فنکار نے اپنے فن کے
ذریعہ اپنے احساس حقیقت کو کس حد تک اپنے سامعین و نیر و دکھ پہنچایا اس احساس کو فن کے ذریعے سامعین تک پہنچانے سے سامعین

اثر قبول کرتے ہیں۔ اور ان میں ذہنی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور جب سامعین (تلامذہ یا عوام) میں ذہنی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں تو اپنے معاشرے اور سماج کے حقائق کے بارے میں اس کے نقطہ منظر اور رجحانات بھی بدل جاتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ان کے گرد و پیش کے سماجی خدائے سن کے رشتے میں بھی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ اور معاشرتی حقائق اور انسان کے باہمی رشتوں میں تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کافی حد تک خود وہ حقیقت بھی بدل جاتی ہے جس سے اس اور ادراک کو فنکار نے دنیا و دوسروں تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ جب بھی فن کا ایک مشرپا یہ تخلیق ہوتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی دنیا، ایک نئی حقیقت بھی وجود میں آجاتی ہے۔ ایک عظیم فنکار کی تخلیق کا انداز یہی ہے۔

میں معنوں میں ایک تخلیقی فن کار کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کی حدود میں اپنی ذات۔ اپنی قوم۔ اپنے عہد کے ماضی حال اور مستقبل کو معلوم و محسوس کرے اور اس کے بعد اپنے علم اور احساس کی قدروقیمت معین کرے اور اس کی تفسیر و تشریح کرے اس پس منظر میں ایشیا اور افریقہ کی تخلیقی فن کار نے علم اور اس کی قدروقیمت معین کرنے کی کیا نوعیت ہونی چاہیے؟ سب سے پہلے یہ کہ اسے ماضی سے باخبر و ناچاہیے۔ ماضی کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ محض اس قدر ماضی سے باخبر ہو جس میں اس کا ملک سامراجیت اور نوآبادیت کی غلامی اور ذلت کا شکار رہا ہے۔ یہ دور قریب تر ہونے کی وجہ سے محال ہے۔ لیکن محض اس ماضی قریب ہی سے باخبر ہونا کافی نہیں، فنکار کو اس بہت پرانے ماضی سے بھی باخبر ہونا چاہیے جس میں خون۔ دولت۔ مہیا۔ شان و شوکت سب ہی کچھ تھا۔ بعد ازاں وہ ہنسری اور دل کا ماضی اور دوستی اور پیار کا ماضی بھی اور پھر حیات کے ابتدائی دور کا وہ عہد حقیقت جب زمین سے دور شیرازہ جسم کو چھلی بار برہنہ کیا گیا تھا۔

اور پھر حالی جس میں اسید بھی، مایوسی بھی، جس میں کامریاں بھی ہیں نا کامیاں بھی۔ نوحات بھی ہیں اور تلخ حقیقتوں کا سامنا بھی جس میں غمی آرزویاں بھی ہیں اور سنے منہاں بھی۔

اور آخر میں مستقبل ایک مستقبل جس کا احاطہ خود فنکار کے تصور نے کیا ہے۔ اگر فنکار کا تصور محدود ہے تو یہ زمین ایک جھوٹی کم حقیقت سی شے ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن اگر توجہ میں وسعت ہے تو یہی زمین پہنائے نظرت کے افقوں میں بھی نہ سما سکے گی یہی کیفیت فکر کی شخصیت کے تین دائروں کہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فنکار اپنے حیاتی شعور کی حدود میں قید اور اپنی مریضی باطنی شخصیت کے دوسرے مہلکے کی کوشش کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نرد و ماحول کے فوری تجربات کے حدود سے بلند ہو جائے۔

لیکن فنکار کا یہ تصور بھی اس وقت تک غیر حقیقی اور بے پایاں رہے گا جب تک فنکار اس کا مطالعہ اس کے اصلی اسباب و علل عالمگیر معاشرتی محرکات۔ سامراجیت۔ نوآبادیت اور احتمال پسندی کے پرنظر میں نہ کرے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا دماغ میں فنکار کی آخری منازل میں پہنچ جائے۔ اور گرد و پیش کے حقائق اور تضاد کو ایک آفاقی نقطہ نظر سے دیکھے اور اپنی ذاتی تکلیف کو اپنے قوم کے مصائب میں ضم کر دے۔ اور قوم کے مصائب کو اس عہد کے مجموعی تلام و مصائب کے اس آفاقی تصور میں ضم کر دے جس میں منہاں بھی ہیں اور بغاوتیں بھی طرح طرح کا جبر و استبداد بھی ہے اور انصاف کا خون بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کو ضم کرنے کے لئے جبر و جبر بھی جس میں کامریاں بھی ہیں اور نا کامیاں بھی۔

یہ ذاتی تصور ہی فنکار کو اپنے موجودہ عہد کے سطح سے ماورائے بناتا ہے۔ اور آخر کار بھاری کائنات کی بنی حقیقت اور ہمارے عہد کی مکمل صداقت سے روشناس کرا دیتا ہے۔

غری بہرہ وادہ ماشرود میں برسرِ اقتدار جماعت نے کامیابی کے ساتھ فنکار کو اس کو دیر: دیر نشہ نہوایا ہے۔ ان منکوں میں فنکار ایک تہن فرد ہے اس کی کوئی جماعت نہیں، اس کا کوئی ماتر نہیں، اس کا کوئی مستقبل نہیں وہ کسی کے ساتھ جوابدہ نہیں سولے اپنی ذات یا ان لوگوں کے جو اس کا مال خریدتے ہیں۔ ترقی پذیر معاشروں میں گذشتہ سامراجیت اور نوآبادیت کے اثر کی وجہ سے فنکار خود اپنی ذات اور اپنے ساتھیوں سے بہت دور ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معاشروں کا فنکار ایسی زبان، ایسے الفاظ، ایسے محاوروں کی حیثیت رکھتا تھا جنہیں اس کے پیشتر عام نہیں سمجھتے تھے۔ اس نے تصورات کی ایک ایسی دنیا بنائی تھی جس کے عام لوگ اجنبی تھے۔ فنکار خود اپنے سے بیگانہ اس لئے ہو گیا تھا کہ۔ اس نے اپنے آپ کو تنہا پایا۔ اور اسے اس نئی احساس ہوا کہ اس کے نالہ و نغان کی کوئی خود اس کی ذات کے دیرانے سے جو تھی ہے۔ اس لئے وہ باطنی اور مقصد فنی تخلیق کے راستے سے جھک گیا۔ اس نے اپنے اندر اپنے ساتھیوں کے شعور کو گہرا اور وسیع کرنے کی کوشش چھوڑ دی اور اس کی فوج دوسری نہایت کم اہم چیزوں کی طرف توجہ مرکب کی۔ اہل شے کو سنانے کی بجائے اس کے سانچوں کی طرف توجہ دینے۔ اعلیٰ خیالات کی تخلیق کی بجائے الفاظ اور آوازوں و ذریعہ کو دلکش بنانے کی کوششوں اور مشغول ہیں اپنے تخلیق خواہش کی تسکین میں شگولے لگا۔ نیک اور بد، حیرا و شہر، انصاف اور استبداد، خوبصورتی اور برصورتی کے فرق کو بے سامان کرنا تو درکنار اسے ان تصورات کے احساس سے بھی سترم آئے لگے۔

ترقی پذیر معاشروں کے احساس دور میں تخلیقی فنکار کا یہ کردار نہیں ہو سکتا۔ عدم توحید اصل ہے کہ وہ مقابلہ کرے کہ ان کا فنکارانہ اس زبان میں باتیں کرے جسے وہ سمجھتے ہیں کہ اگر فن کے حدود میں وہ عوام کی جدوجہد، سلام و معائب، عجز و انبساط میں ان کا مشربک رہے ان میں سے بہت سے معاشرے میں صوبی صمدی میں پیدا ہوئے اور اچھی ابتدائی مائزے لے کر رہے ہیں۔ یہ معاشرے جس نئے دور میں پیدا ہوئے ہیں وہ سائنس اور صنعت کا دور ہے۔ اس دور میں نئے تصورات اور معاشری تعلقات میں مساوات کے نظریات نے جنم لیا ہے۔ یہ نئے معاشرے فنکار سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس نئے دور میں ابتدائی مائزے طے کرے ہیں۔ اپنے اپنے فن کے ذریعہ۔ اپنے معاشرے کے مدد کے۔ یہ معاشرے توقع کرتے ہیں کہ فنکار نئی اور پرانی بے انصافیوں نے اور پرانے نظام اور استبداد اور ان تمام رجحانات کے خلاف جدوجہد میں معاشرے کی مدد کرے جو زندگی، عزت نفس اور آزادی کی نئی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ فنکار اس خوشی پسند صبح کے تصور پر یقین رکھیں۔ معاشرے کی مدد کرے جو جلد بخود داہوگی۔

وہ جانتے ہیں کہ ان کے جذبہ کار کی روح بقول روسی شاعر نکراسوف کبھی عام اور انتقام کی آگ بجھ کر گائے اور کبھی امید و کاروائی کا پیغام دے۔

اقبال کو کسی شریک کے چار دیواری میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اے کا ایکہ تمام پرانے وطن پرستوں میں ہے اور دوسرا موجودہ ترقی پسندوں میں۔ قوم اور وطن کے بعد انقلاب اور مزدور و سرمایہ کا جو دور آیا اس کے پہلے جھکے ہیں اُن کے حال دکھائے دیتی ہے۔ - فیض

فیض احمد فیض

حشر رفتگان

پروفیسر مولوی محمد شفیع، راجہ غضنفر علی
اور شوکتے تھا نوی کے یاد میں،

①

ایک صبح لندن کی برفانی فضا اور برساتی موسم سے بیکار ایسی وحشت ہوئی کہ ہم نے رخت سفر باندھا اور چٹا بٹا واک آؤٹ کر گئے یورپ میں رخت سفر باندھنا محض محاذ سے کی رعایت ہے ورنہ یہاں بستر پورے کی حاجت کہاں، سفر شرط ہے اور شہر سایہ دار پہاڑ میں نہ ہی مسافر نوا بہتر ہے، شاید پہلے دفتروں میں ہمارے ہاں بھی صورت ہوگی ورنہ تین سو سی اور ابن بطوطہ جیسے آشفتم سر لوگ بوقت اقیلم کی سیر کیوں فرماتے، ہمارے ہاں خلیفے، مساجد، دھرم شے، خیر لوگوں کے گھر ابن السبیل کے لئے ہزار ہا سے تھے۔ ہمارے ہاں یہ مسافر نوازی خیرات تھی یورپ میں تجارت ہے لیکن یہ تجارت بہت احترام اور ٹھکانے کی ہے ہم جیسی صورت نہیں کہ خیرات سے ہاتھ کھینچ لیا اور تجارت کا سلیقہ نہ آیا دو چار بڑے شہروں میں تو خیر گرہ ہیز مال جوتو کچھ ایسی گھبراہٹ کی بات نہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ بیکار بیکار کو جی چاہا مٹھا کھا کر چل دئے۔ شجر عایہ داوگے سمجھ رہے تھے تو با پولیس والے ایک سونو میں چالان کر دیں گے یا کسی چور کو کے ہاتھوں جان پین آئے گی اور پھر بھی ہنس شکایت ہے کہ ہمارے ہاں سیاحت ترقی نہیں کرتی۔

خیر یہ تو مترنمہ بلکہ محض اس وقت میں لائڈن یونیورسٹی کے کیرن الٹی ٹیوٹ کے بالمقابل ایک چھوٹے سے لیٹوران میں بیٹھا ہوں، یہ ادارہ مشرقی زبانوں کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں ایک زمانے سے شہرہ آفاق ہے، میرے میزبان شجر عربی کے استاد پروفیسر بروخین ابھی ابھی رخصت ہو کر گئے ہیں، باہر پرلٹ سے پہلو چھتیر والے مکانوں کے نیچے اور دو تہی می میٹروپول کے دوستان شہر کی آب جو کا سنری ناٹل پانی چپ چاپ بہہ رہا ہے، دھوپ چھٹی پڑی ہے اور دیوڑھوں میں بہت سے بھول گھر رہے ہیں یہ سب وجہ اہم تھی نہ ہو ناچا ہے تھا لیکن آج گھر سے انجاء پہنچا تو راجہ غضنفر علی مدظلہ کی رحلت کی خبر پڑی۔ اس سے پہلے یہاں کے کتب خانے میں ایک کارکن کی زبانی معلوم ہوا کہ چند دن پہلے اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مولف پروفیسر

مولوی محمد شفیع مرحوم وفات پا گئے ہیں۔ ان دونوں بہادر گلوں سے میری بچپن سے نیاز بند ہی تھی۔ ایک میرے استاد تھے ایک دوست اور کرم فرما۔ ایک علم و فضل میں بے مثال، ایک سیاسی تدبیر اور فاضل آرائی میں لاجواب۔ اب جوان نہیں باور کرنے میٹھا ہوں تو وہ وطنی مفقود مگر کیاں متنازع شخصیتیں آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مولوی صاحب کم گو کم آواز، تنگ مزاج اور سخت گیر۔ کتب اور خطوط کے حدود کو بے ذوقی تھا۔ مصائب تحقیق و تدریس کے علاوہ ذوقی تفریح نہ مشغلہ۔ جملہ تکلفات سے بے نیاز، لباس و آرائش سے بے پروا، و ذہن نشینی اور خاندان نشینی کے علاوہ کسی فاضل سے سروکار نہ تھا۔ عمر بھر دور ویشوں کی طرح گوشہ گیر رہے۔ اس کے خلاف راجہ صاحب خوش باش، ہنسور، چھیٹے۔ بیل بھر میں ہر کسی سے شیر و شکر۔ دہلی کے خالصہ سے لے کر خوبانِ عجم تک ہر کسی کے منظور و نظر جس فاضل میں دیکھو دو لبایت بیٹھے ہیں خوش لباس خوش گفتار۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک نکلنے میں بیگانہ لوگ پاکستان کو تو ہی نشان سے کم مچاتے تھے۔ راجہ صاحب کے شہر و دستار سے زیادہ۔

اب سے قریب تیرہ تیس برس پہلے میں اور میرے ایک دوست ڈاکٹر محمد الدین جواب گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد ہیں۔ اوڈنیل کالج لاہور میں ایم۔ اے عربی کا داخلہ لینے پہنچے۔ ہم دونوں دوسرے مضامین میں گورنمنٹ کالج سے ایم۔ اے کی سند حاصل کر چکے تھے۔ حمید الدین فلسفہ اور لغیات میں۔ میں انگریزی میں۔ اس لئے ہمیں دو سال کے بجائے ایک سال میں نمائندگی مکمل کرنے کی رعایت تھی۔ بشرطیکہ متعلقہ شعبہ کے استاد کی منظوری حاصل ہو۔ مولوی شفیع مرحوم ان دنوں اوڈنیل کالج کے پرنسپل بھی تھے اور شعبہ عربی کے صدر معلم بھی۔ چنانچہ ہم دونوں کی پیشی ہوئی۔ حمید صاحب کے والد ڈاکٹر محمد الدین مرحوم گورنمنٹ کالج میں عربی کے استاد اور مولوی صاحب کے رفیق کاہن تھے اس لئے ان سے تو کچھ تعرض نہ ہوا البتہ مجھ سے کافی دیر عرض کرتے ہیں مولوی صاحب کو شکایت تھی کہ نوابانِ زمان عربی کو بہتر ذوق رکھتے تھے۔ آج کے بھٹے گھری مولیٰ بھٹے ہیں اور کالی بیاضت اور سمجھ بوجھ کے بغیر اسی استاد کے درپے ہوئے لگتے ہیں، میں نے شمس العلماء، سید میر حسن مرحوم اور مولوی محمد ابراہیم میر باکوٹی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، اسے بیاضی آئینہ کا حوالہ دیا تو مولوی صاحب مشکل رائی ہوئے۔ اگلے دن ہم مولوی صاحب کی کلاس میں پہنچے تو چہ چلا کو اغذہ کا مریخ تو خاص ابتدائے عشق کی منزل تھی آگے آگے کسی سخت مقام آنے والے ہیں۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج میں ہم ایم۔ اے کے طلباء کا تہہ اساتذہ سے کچھ ہی کم ہوا کرتا تھا۔ کسی پروفیسر سے شفقت ہے تو ان کی کلاس میں باتاھنگی سے لگے، کسی اور صاحب کی صورت یا آواز پسند نہیں تو نہ گئے۔ پابندی اوقات پر کسی کو کچھ اصرار نہ تھا۔ بہت سے اساتذہ سے دوستا نہ اور بے تکلف مراسم تھے، یہاں اوڈنیل کالج میں جو پہنچے تو مولوی صاحب کی کلاس میں پرلے۔ روایتی کتاب کا ماحول پایا کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ مولوی صاحب کے دہلی سے اچھے خاصے بقراء لوگوں کے اوسان خطا بہتے تھے اور وقت، قاعدے قانون کی وہ پابندی کہ الٹنگی نہا، ہم دونوں گورنمنٹ کالج کے کلک چڑھے پہلے ہی دلی حسب معمول دس پارچ منٹ دیر سے پہنچے تو مولوی صاحب نے واسکٹ کی جیب سے طلائی گھڑی نکالی اور دیر تک کہی ہم کو کبھی گھڑی کو دیکھا اور پھر کچھ کہی گھڑی جیب میں ڈال لی۔ پڑھائی کا دستور یہ تھا کہ ایم۔ اے کے طالب علم بالکل اتھرائی مدارس کے بچوں کی طرح نصاب کی کتاب یعنی ہجو کی الکامل، ابن قتیبہ کی الشعر والشعر اور موطا امام مالک سے کچھ پڑھتے اور مولوی صاحب ہر اقتباس کے بعد انگریزی میں متن کی تشریح اور تفسیر کرتے جاتے، پڑھتے میں کسی کو اعراب پر ڈانٹ پڑتی، کسی کے تلفظ پر کان ایٹھ جلتے پس منہس محاورے میں، لیکن اس ناگوار تہمید کے بعد ان کے حسن بیان اور خوبی تقریر سے کافی سے زیادہ تلافی ہو جاتی مولوی صاحب کے

اوقات اور طریقہ تدریس کی طرح ان کا لباس بھی پوشیدہ سے اٹل تھا۔ سرخ اونچی دیوار کی دودی ٹوپی، سیاہ جوتے تنگ موری کی پتلون سر میں دی ایک نکلا کوٹ اور گرہ میں اسی طرح قطع کا سفید بایا وانی، چنانچہ بعض زبان وراز شاگرد انھیں اسٹیشن ماسٹر کہہ کرتے تھے، رسمی تقریبات میں کبھی اچکن اور شلوار بھی پہن لیا کرتے لیکن ان تقریبات میں وہ آتے ہی کب تھے، طلباء کے لئے کالج کے اوقات کے بعد ملاقات پر مدعو نہیں کیے۔ کبھی کوئی مشکل لے کر پہنچ گیا تو مولوی صاحب کالج کے پھوٹے بیسہ اخبارنگی میں اپنے مکان کی بالائی منزل سے کھڑکی میں کھڑے کھڑے گفتگو فرماتے درون درباری یا کاشرت شاید ہی کسی کو حاصل ہوا ہو، بعد میں البتہ وہ ہم سب پر اتنا ہی شفقت فرماتے رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سر سفید ہوجانے کے بعد بھی ان کی طبی پر نیت سی بھراٹ مزدور ہوتی تھی۔

نبی طالب علمی کے دنوں تک اب تک دیں پڑیں مہدیوں اہل فضل سے شرف نیاز رہا ہے لیکن السنہ شرقیہ و غرب میں جیسی وسیع البصیرت اور عیسا یکساں عبور مولوی شفیع مرحوم کو حاصل تھا اس کی نظیر ڈھونڈنے سے سلیکی، ضعیفی کی عمر میں امتحانوں نے اردو میں انہیں بیکو پیڈ آف اسلام کی تابعت کا بار گزرا ان اپنے سر پہ تھا اس نوع کی مہم کے لئے جیسے ذرائع اور حتیٰ سہولتیں لازم ہیں وہ مولوی صاحب کو زندگی میں فراہم نہ ہو سکیں ہماری بد قسمتی ہے کہ وہ یہ کام ادا ہو چکا ہو نہ ہو نہ ہو گئے اس لئے کہ اس کی تکمیل کے لئے ان کا پہلی مشکل سے لے گا ہمارے ہاں گذشتہ کئی برس سے علم و ادب کے لئے سرکاری اعزازات بٹنے لگے ہیں نہ جملہ مولوی صاحب کا نام سرور بار نہ پھینکا۔ اگر نہیں پہنچا تو حقیقت ہے ہر چند ان جیسے اہل کمال رسمی اعزازات کے محتاج اور ضمنی نہیں ہوتے لیکن کسی جگہ رسم ٹھہر جائے تو پھر ایسے نبردگروں کے اعزاز و اکرام میں کوتاہی کسی طور پر سہا نہیں۔

(۲)

راجہ منظر علی خاں مرحوم سے اولین ملاقات بھی طالب علمی ہی کے دوران ہوئی۔ راجہ صاحب ہمارے محبوب استاد و فیصلہ احمد شاہ بخاری (پطرس) کے بچوں میں سے تھے اگرچہ ایک نانا سے ان دنوں کے مشرب میں کافی فرق رہا ہو گا راجہ صاحب کو کالج کے باغی قوم پرست طلباء کے سرخوہ تھے۔ بخاری صاحب ادب کے ورکھل، سیاست سے کوسوں بھگتے تھے لیکن اس بات سے قطع نظر خوش طبی، چار یاوی، حقیرے بازی، بد لہجہ سنجی، بھٹل آرائی، حتیٰ کہ بھلی بڑ باری میں دونوں ہم شغل اور ایک نالز تھے ہماری طالب علمی کے دنوں میں بخاری صاحب کے گھر پر بیٹے بندھوٹے شوقین طلباء اور مہر دت ادب کی ایک ملی جلی بھٹل منعقد ہو کر تھی قیام میں عہدہ ہونے والی ن م راشد آغا عبدالحمید سابق کٹر کراچی، سید رشید احمد سابق ڈاکٹر طرین زلیخا بیو شری محمد حمید، چودھری بی بی خاتون محفل کے ہر گرم کارکن تھے، مقتدر رکھنے والوں میں اساک مرحوم، ہندت ہری چندا، اختر مس۔ سید امتیاز علی تاج، مو فی تسمہ باطلہ کے سے شرکت کرتے۔ کبھی بھی حفیظ جالندھری بھی تشریف لاتے، بھٹوں بایں ہوتیں، بھٹوں شاعر و سخن اور کثرت و تنقید کا بازو گرم تھا البی ہی ایک صہبت میں راجہ صاحب بھی تشریف لائے۔ قومی سیاست میں ان کا نام جب تک کافی معروف ہو چکا تھا اور غلامان دنوں وہ ولسرائے کی بیلٹڈ سٹیلا اسمبلی کے رکن بھی تھے۔ ایک ہی شام میں راجہ صاحب حسب معمول سمب لوگوں سے ایسے گھل مل گئے۔ گویا برہمن کی ملاقات ہے اور اس کے بعد ہم میں سے کسی کو ان سے دوبارہ متعارف ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کے بعد برسوں اور بار بار راجہ صاحب کو غلوٹ و جلوت، وزارت، سفارت، گھوڑہ نشینی، ہر رنگ میں دیکھا اور غشیہ یک رنگ پایا۔

اپریل ۱۹۵۷ء میں جیل سے رہائی کے بعد گھر پر میرا پہلا دن تھا۔ صبح ہی صبح راجہ صاحب تشریف لائے محبوب وہ دہلی

میں ہمارے ہائی گسٹر تھے، آتے ہی انھوں نے اپنا مخصوص تعہد بند کیا اور کہنے لگے "بھئی خوب وقت پر آئے کیا؟" میں نے کہا "ہاں، میں نے تم کو بلایا ہے۔" انھوں نے کہا "ابال پر دی ہیں مشاعرہ کر رہے ہیں، تم بھی جاؤ۔" میں نے کہا "راجہ صاحب ابھی تو پوری طرح گلو خلاصی بھی نہیں ہوئی تھا۔" انھوں نے کہا "میں پڑی ہے مہلا بھئی، دلی کون جانے دے گا، جھاک جاؤں تو؟"

"بھائی جی، وہ ہمارا ذمہ ہے۔" راجہ صاحب نے فرمایا۔ میں نے ہاں تو کر دی، لیکن مجھے یقین تھا کہ راجہ صاحب اپنی مسلمہ قدرت کار کے باوجود ایسی جگہ میں کادیاب نہیں ہو سکتے۔ چند دنوں کے بعد واقعی دلی جانے کا پروانہ مل گیا تو میری سیرت کی انتہا نہ رہی، اگلے مہینے دہلی میں راجہ صاحب کا دربار دیکھا، ان کے دروازے پر تھی تو نہ جھومتے تھے نہ اہل دہلی اور خاص طور سے خالصا کے محنت ضرور لگے رہتے، کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بائیسویں صدی کا مکان ہے، یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کسی حکام اعلیٰ کا ایوان ہے۔ بہت دھوم کا شاعر ہوا موجودہ صدر، پرنسپل ڈاکٹر راہگا کرشنن صدر تھے، راجہ صاحب کا مکان سلیٹے اور سیاہ وٹ میں پہلے ہی کچھ کم تھا اس شام اور بھی چمک چمکایا۔ دین لان اور برآمدے خلعت تھیں، چھپرے تو باہر کی دیوار پر لٹاؤں پیکر نصب کئے گئے۔ اندر بڑے اعلیٰ کے نمونے رات میں میرا شعر سنا۔ اگلی دوپہر راجہ صاحب میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے میں نے رات پر تو ٹوکول (۵۰۰۰ روپے) کے خیال سے بیٹل منہ روک دیا تو نہیں کیا تھا۔ ابھی انھوں نے ٹیلیفون پر شکایت کی ہے اور آج شام صرف پاکستانی شاعر کو نہایت یہاں آ رہے ہیں تم ذرا تندرستی اور زہرہ نگاہ کو اطلاع کرو۔

راجہ صاحب کے سفارتی کمالات تو خیر ایک الگ باب ہے۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ راجہ صاحب نڈرا و دھن کے بچے آ رہے تھے جس بات پر ٹٹ جاتے مام فور سے منہ اکر رہتے ورنہ ہاں اچھے خاصے مجھے انھوں کو بھی ایسی آسانی سے باسپورٹ اور دیار غیر کے سفر کی اجازت کہاں ملتی ہے۔ جہیزوں ناگ، گرگرو، سپیشٹ کی چھان بیننگ کر دیا، جب کسی نے عنایت کی تو خیر ورنہ خیر قضا۔ اور اگر کسی کا نام ہماری طرح پولیس کے دس نمبر میں درج ہے، ٹیپے بٹسے، افروں اور لیڈروں کا مخفی سفارش کی درخواست پر پتہ پانی ہونے لگتا ہے لیکن راجہ صاحب مرحوم کو ایسے معاملات میں قطعی کمی باک نہ ہوا۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ راجہ صاحب نے پاکستان چین دوستی کی تعلیم اس وقت خاتم کی جب اس عظیم جہ سے کا نام ہمارے ذمہ، ذی انتدار مسطور میں بالکل مقبول تھا بہت سے صحافی اور سیاسی بزرگ جو آج کل چین کی تحریف میں اس قدر غلبہ انسان اور چین و پاک کو، دوستی پر اتنے مضمر نظر آتے ہیں کل تک کسی امریکی نمران سے سر موثرات تحریف اور گناہ گروا تھے اور جیسا کہ ساری دنیا جانتی ہے امریکی حکمت عملی میں چین دشمنی ہمیشہ سے سرفہرست ہے، ان دنوں میں سے دوستی کی بات کرنا ان بزرگوں کی نرسٹوں کی نرسٹوں کی نرسٹوں کی دشمنی کا ایک بہانہ تھا اور یہ الزامات کسی شریف آدمی کو دشمنی اور گروں زوئی ٹھہرنے کے لئے کافی تھے؛ جلتے تھے راجہ صاحب نے انھیں دنوں اس تنظیم کی صلاحت سمجھا لی اور ہر سال چین کے یوم انقلاب پر دھڑلے سے تقریبات منعقد کرتے رہے۔

مختلف سفارتی عہدوں کے دوران راجہ صاحب کے کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا تکمیل حاصل ہے، یوں گمان ہوتا ہے کہ انھیں اپنے بزرگوں سے جذب و گزبات کا حصہ دیتے ہیں لاپرواہی کا کہہاں بھی جلتے عوام و خواص و دنوں کو اپنا گرویدہ بنالیتے اور اگر یہ غیر عقلی بات قابل توجہ نہیں تو ان کی کامیابی اور مہدولیت کے لئے ان کے اپنے اوقات کی کچھ تھمے خلوص، بے مرضی اور ملنساری حسن فوق، بے باکی اور جرات زندان، بڑے چھوٹے، اجمہر فقیر ہر کسی سے ایک سا برتاؤ کرنے، کسی سے دیے نہ کسی سے کہنے ملازمت کے دوران کوئی کام علیہ راہ ہم سمجھا تو دفتر کی قاعدے، قانونی کوتاہی پر رکھا، گھر کی دوز، توں کی مین منج پر لفت بھی اودھن مانی کرتے رہے۔

پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنے ابتدائی ایام میں وکالت اور سفارت کے لئے ایسا بلینڈ اور موثر کارکن ہاتھ آیا اور یہ قسمتی ہے کہ لجنہ کے ایام میں نہ ان کی خدمات سے مکمل استفادہ کیا جاسکا نہ کوئی ان کا بدلہ بروئے کار آیا۔

”جید اکابر ہیں لیکن پرانندہ طبع لوگ“

(۳)

شوکت تھانوی مرحوم یکایک مغل سے اٹھ گئے۔ اس جہم دیرندہ کی جدائی برا حجاب کے دل پر جوڑ کر رہی ہو کر رہی، لیکن ذاتی غم سے زیادہ ان بات کا دکھ ہے کہ نخل وطن میں جہاں رلانے کو بہت کچھ ہے، لیکن نہانے کو صرف شوکت تھانوی تھے۔ اور ان کی جگہ اب کون سنبھالے گا۔ بیسوں سے ان کا نام تکیہ کلام کی صورت گھر گھر روز بان تھا۔ یہ فقرہ، وہ لطیفہ وہ نفل۔ ہزار ہا کے ہزار بات شوکت تھانوی سے روایت تھی۔ پیران کا، لطف صحبت اس پر مستزاد، آٹھ اچھل مارتے دور، بیسوں مچھلیں بیسوں سویتیں اور طرح طرح کے بزرگ بھی تھے جن میں مرحوم اپنی شہینہ بازی مت دم سبھ کو زندہ کرنا کرتے تھے لیکن شوکت کوئی مشاعرہ پلورے کے کسی رئیس کی جھٹک۔ دلی میں کسی حکیم کا دطب۔ یہ ثابتہ لکھنوی ہیں۔ یہ نور ناروی ہیں۔ یہ احسن ماہروی ہیں۔ یہ ذلیل حکیم صاحب ہیں اور یہ نادر نواب صاحب۔ شوکت مرحوم اپنے مددگار کی نفل نہیں امارتے تھے۔ خود ہی بن جاتے تھے اور اس پر طرفہ یہ کہ جس صحبت کا تذکرہ کرتے اس کی فضا اس کا سماں اس کا پودہ انقضاء آنکھوں میں گہر م جاتا ہوں تھا کہ ان کے دم سے ایک عالم زندہ تھا۔ اب جو وہ رحمت ہو، تو ان ان نسبت مفصل کا ذکر بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تو ان کے گروں کی لائٹ کا بہت چھوٹا سا ڈرو تھا۔ ان کی ذہین اور بقیہ و شخصیت نے جولائی مہینے کے لکھنوی مہمان منتخب کیا اس میں یکے کے بعد دوسرے کو کھائے، کھلم نہ شرمشیں۔ ان کا نہ شجاعت نگاری۔ نامہ نویسی۔ ریڈیو صحافت۔ بذلہ شجی۔ بدیہہ گوئی۔ ان کی طبع زبان اور قلم پر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ ان کی ملاقات میں سخت اور آدرو کو قص دیتا تھا۔ بے تکلف اور بے تکان جلسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں ان کی طبع کو خیر حاضریا نہ تحریر میں ابھی انھیں قلم پر زور دیتے دیکھا اور اس مشافی کارزار یا منت نہ تھی۔ ان کی خدا داد ذہانت تھی جو التساب کی محتاج نہیں ہوتی۔

شوکت مرحوم اپنی ہم عصر دنیا کے ان محسنوں میں سے تھے جن میں زندگی کی آسائشوں میں بہت کم حصہ ملا۔ لیکن وہ اپنے سوا سب کے لئے فرحت اور انب کے اسباب بہم کرتے رہے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو ان کی محرومی پر رنج ہے کہ ان کی باغ و بہار صحبت اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی اور اس سے زیادہ رنج ان کی محرومی پر ہے جو اس لحظہ سے کبھی بھی آشناء ہو سکیں گے۔ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔

قومے کلچر سے مشہور، مغل، مغل یا کسی چھوٹے سے طبقے یا
گھونٹے کے پسند یا نا پسند کو نہیں کہتے۔ سارے معاشرے
کے اجتہاد عامی ملا ہو باطن کو کہتے ہیں۔

فیض

بیرونی ممالک میں پاکستان کے
سہذیب و ثقافتی تعارف کا مسئلہ

482

ایران، عرب، عراق، ترکی، مصر، حبشہ، کینیا، گھانا کسی چھوٹے بڑے ملک کا نام لیجئے، نام کے ساتھ کوئی نہ کوئی تصویر ذہن میں مزدور مجسمہ، گج غزوت، تالین، باقلا، محلات، مناد، بیگڈھے، سادھو، مجھے، نقاد، برزاق، ریت کے ٹپے، گھوڑے کے دخت، موہیل، ہاتھی دانت، تخت منبر، حافظ و خیام، الف بلبل، ملکہ سبا، اہرام فرعون، البابلون، گیتے، شیر سجائے، تبرکمان، کچھپی، ہری، ہرماگ، ناسپہ، ناسی، د حال کے خلت، آئن سے کچھ ایسی علامتیں یا خود منتخب کر رکھی ہیں یا یہ چیزیں پہلے سے معروف تھیں۔ اور اب، انہیں، ایک نیا قومی رنگ پہنا دیا گیا ہے۔ لیکن کرسی کے پاس کوئی سرخاب کا پر ہے ضرور، اور اس غلامت کی نشہ ہیر کے لئے لوگ طرح طرح کے جنم کرتے ہیں۔ بیچ بچے، پھر بڑے، جبریں، اول بچے بنائے، ڈھالے، بچے اور بانٹے جاتے ہیں۔ میں، الا قادی، جماعوں، و تبادلوں، دونوں میں یہ تحفے تحائف کے کام آتی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہر ملک نے اپنا ایک ٹریڈ مارک بنا رکھا ہے جو ہر موقع پر تعارف اور جان پہچان کے کام آتا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ ہمارا جی پاکستان کا ٹریڈ مارک کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو اب غور فرمائیے، درمزدور میں، بار بار، بڑے بڑے، گو ایسے ہی سوالات کا ساتھ ہو گا جو ابتدا میں لکھ چکا ہوں۔ اور اگر آپ کو ہندو پاکستان کی تاریخ، کانگریس، اور مسلم لیگ کے سیاست، منہدم چٹلش اور سکے، کثیر کی نفسیات، بیان کرنے کی ذہنت اور داغ ہے تو کسی آخر آپ انفرادی سعی و سہ سے کہتے اشیاء کو "شرعیہ پاکستان" کہیں گے اس سلسلے میں ہمارے سعادت خاں کے مقالہ پر مدبروں جبہ، اندر اور سلسلہ نویس حضرات اکثر سختے کرتے ہیں، نال ملک میں پاکستان کی پہلی تہاوت ناقص ہے۔ آخر ہمارے سفارتی نمائندے کس مرض کی دوا ہیں؟ غلام شہرت مجھے آگیا۔ شاخہ موسوں جوا ہے جس پر پاکستان "انڈیا" لکھا ہے ہمارا سفارتی علم کیا کر رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ شاید ہمارے سفارتی دفاتر اس بار میں قطعی بے خطا بھی نہیں لیکن یہ یہ سمجھ لیتا جاہے کہ ایک حد تک دھڑا بھی ہیں ہماری قومی تنبیہ، شعانت، یا شخصیت کا تعین ہمارے سفارتی، اور دل کا منصب یا ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری تو گھڑاؤں کی ہے جس میں حکومت مل، انیس اور باب سیاست بھی شامل ہیں سفارت خانے تو آپ کے بارے میں، دی گئیہ شہر گزینے کے جواب، ان ملک پہنچائیں گے اور اگر آپ کو خوش و پناہ لگے، لغتہ نہیں معلوم تو سچا ہے سفارتی، افراسے، میرا دل کے سلسلے کس مخلوق کی تصویر پیش کریں

تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ شاید آپ فرمائیں کہ ہمارے قومی "شہر" پرستارہ، دلال، موزوں ہے۔ یہ اسلامی نشان ہے ہمارے قومی کو دار کی وضاحت کے لئے یہ علامت کافی ہونا چاہیے۔ اگرستارہ، دلال صرف پاکستان کا نشان، استیاز، میٹا، لوٹا، دیاس کی تفسیر و تشریح سے کچھ شکل مل چکا ہے، لیکن یہ نشان تو کسی مذہبی صورت میں قریب قریب ہر اسلامی ملک کے عقیدوں اور عقول کا حصہ ہے۔ اور اسے پاکستان کی سرزمین سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تاریخی اعتبار سے اس نشان پر تو کول کا حق بہر حال ہم پر فائق ہے ہمیں اپنے تعارف کے لئے لاجمالہ اپنی تاریخ تہذیب اور جغرافیہ کے ایسے مظاہر سے جو کرنا چاہئے گا جو ناسل ہمارے اور بلا مشبہ پاکستانی ہوں اور ان کوئی بھی صنف لے لیجئے، تاریخی آثار و مقامات، عوامی فن و ہنر کی اقسام، مناظر، فطرت کا جلوس ہمارا دس توں لچا طے بہت حسین اور بہت پھر پر مزین ہے۔ تاہم عمل اور لال نظارہ اور ہر گے ٹوکیا جو، اور ہمارے ہیں، ہمیں سلیقہ، بنا رکھا ہے، ایسا ہی مقبول بنا یا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کچھ ٹو کیجئے کہ آپ کو کیا عزیز ہے فرد سے نونے کی باری تو جہتیں آئے گی۔

اور پھر کسی ایک چیز پر گفتگو کرنا کی ضرورت ہے، موزوں دار سے کہ نہ مسجد اور رنگ زیب لگا، موزوں اقبال ملک کے ٹوٹے کے کہ کاکس بازار، ایک، ان کے پاکستانی نام کب کہتے جاتے گے، سوات کے چوٹی، انوار، مراد سے کہ پٹیا کا رنگ کے قبائل کیلین، ملک اپنی سرزمین کی تاریخ، فنی اور، مناظر سے کوئی ایسی دہی میں، جہیں جہیں جن میں جہیں آپ کسی انہی کے سلسلے کو کہیں اور کہیں گے، دیکھو بلادیہ ہم ہیں، یہ ہندوستان نہیں ہے، اور افغانستان بھی نہیں ہے، یہ تریلا، بے ادب، نوان، نہ عرب ہے نہ عجم، یہ سب کچھ جو تم دیکھتے ہو پاکستان ہے یہ دیکھو سوات کا چنہ ہے،

— یہ سنہ کی دہائی ہے۔ یہ پشادری حق ہے۔ یہ جیاد و ہر کی نعرہ ہے، یہ ملت کی پستی ہے اندر کو میل کی پٹکیاں۔ یہ دورہ خیر ہے، یہ شاندار، یہ شاندار رکن عالم کا مزا ہے۔ یہ سات گنبد وانی مسجد ہے۔ یہ چیل اور دیوار کے پر ہیں۔ یہ جیاد و ابنا س کے حیدر، یہ سرس کے کعبت ہیں، یہ ہوس کی باڑھ ہے، یہ میگنٹا کے کٹے چھوڑ کی کشتیاں ہیں، یہ گیلڈی جری ہے۔ یہ نیرہ بازی، یہ خشک ناچ، یہ علم اٹھ رہے ہیں، یہ نماز ہو رہی ہے، یہ دودھ بلویا جا رہا ہے، یہ پتے سن کی فصل سیٹی جا رہی ہے، یہ انڈورہ ہے، یہ اکتارہ ہے، یہ شاعرے کی خصل ہے، یہ سپر انٹون کا میلہ ہے، یہ عمارتیں، یہ کھنڈر، یہ وادی، یہ صحرا، یہ کھلی تاشے، یہ خشوع و خضوع، یہ نوادریہ دستگاہیاں، یہ سب چیزیں ہماری ہیں یہ سب کچھ ہمیں اور ہم پاکستان میں۔

ہمارے بال خیر سے ذرات تعلیم بھی ہے اور ذرات اطلاعات بھی ہے، سیاست کا محکمہ بھی ہے، چھوٹی صنعتوں کا محکمہ بھی ہے، ذرات خارج بھی ہے، بی آئی اے بھی ہے، آسٹ کونسل بھی ہیں، اولی اور فی ادارے بھی ہیں، اور عالمگیر میں پاکستان اعلیٰ پاکستان کی دلکش نیسیک تخلیق ان سب کے ذرائع میں شامل ہے اور سچہ خیر کھانا میں اور کتنا بچے، تضاد کے سیٹ مائشی امثال وغیرہ کے لئے کچھ، سیافان کا خزانہ بھی دکھار نہیں، محض شوق فضول اور ذوق نظر کی بات ہے، یہ اس لئے بیان نہیں ہیں کہ اول تو ہم کھڑکی مرنے کو والے سے اور پسمیت نہیں دیتے اور دوسرے ایک قوی ملک کی حیثیت سے ہم نے اس امر پر کبھی غور نہیں کیا۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے ہماری تہذیبی اور فنی روشتی پر بالکل غور نہیں دی، ذرات اطلاعات کی زیر نگرانی بعض تہذیبی موضوعات پر کچھ رسالے چھپ چکے ہیں محکمہ صحت نے بھی تھوڑی بہت طبع آزمائی کی ہے ہمارے "بارنجی نوادریہ" ایک آدھ مائشی بھی امریکہ اور جاپان کا دورہ کر چکی ہے۔ لندن کے ایک بہت بڑے بازار میں پاکستانی مصنوعات کی ایک بہت گنبد اور کان بھی موجود ہے اور ہماری میگنٹا بھی کبھی کبھی ملک کے اندر باہر اس سلسلہ کی کچھ شوقی خرابا میں لیکن ڈیڑھ اینٹ کی اتنی بہت سی مسجدوں کے بعد بھی کسی مکمل عمارت کے نام دور کریں دیکھیں ہم نے ان بے ربط، بے سلیقہ اور سطحی کوششوں میں جیسے بھی بہت گوارا ہے، اور نتیجہ وہی دھاک کے تین پات،

یعنی جس ایک شکل پر بھی ان پڑی ہے کہ قوی تہذیب، ثقافت، باکھر کا نام لینے تو ایک طبقہ کا ذہن فوڈ میلز منڈی سرشارہ مس تارہ اور زورہ ناچ گانے کی طرف منتقل ہوا ہے، اور اچھے خاصے معقول اور ثقہ لوگ بے لگتے ہیں کہ کچھ نئے نم پر لٹا فٹ کی آؤں، ان کے واسطے محبت پرست و لٹا کا اہتمام کیا جا رہا ہے، اگر کچھ ثقافت یا تہذیب سے محض وہی شے مراد مل جائے جسے ہمارے ہاں کچھ لٹا شوقیت ہیں تو شاید یہ دانا دیا سیاب جا بھی نہیں لیکن قوی تہذیب یا ثقافت کی یہ فرض غلط اور نامقول تاویل آخر کیوں ضرور رکھے، مجھ پر تو خیر ذاتی طور سے اس سلسلہ میں اتنی خشت باری ہو چکی ہے کہنا یہ میری رائے آپ کی نظر میں زیادہ وقیع نہ ہو لیکن آپ خود سنجیدگی سے غور فرمائیے کہ اوپر اتنی بہت سی چیزیں جو میں نے گواہی ہیں کیا سب کی سب ناطق و پردہ دشمن تقویٰ ہیں، مثلاً آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ مردود فخر حسن پر لٹا نقد نہایت محض تجریدی گانوں اور گھنٹا مغزنی مسیغی سے عبادت نہیں، اس میں ہیز بلھے شاہ، ماہیا، چپ، صفیائی، قوالی حتیٰ کہ مردود فخر اور قوی تارہ بھی شامل ہے کیا آپ کی رائے میں یہ سب کچھ فخر ہے؟ لیکن اس پر بھی مجھے بڑے کی ضرورت نہیں، اگر آپ سخن و سماع کو کسی طرح بڑا شوق رکھنے پر تیار ہیں اور ان کی ہر ایک حکومت کو مردود اور غیر مشرور جانتے ہیں تو نقاشی، خطاطی، دستکاری، تہذیب، ادب، کھیل، بیرونکار، دشت و مرغزار اپنی زندگی کے کسی تہذیبی مسئلے سے کچھ بھی پسند فرمائیے جیسے باہر کی دنیا آپ سے غفوں اور غفوں کر سکے۔

بات تو قوی ٹریڈ مارک سے ابتدا ہوئی تھی لیکن اس بنیادی مسئلے سے متعلق بہت سی ذروی، انہیں ادبی میں مثلاً پرہیز میں قوی اور مذہبی توازن کا سوال ہے۔ انگلستان کے لوگ کس "نیاسال" اسے نگرانی ڈاکس وے وغیرہ کا معقول پہلے سے اہتمام کرتے ہیں اور قوی برادریوں نے بھی اپنی مخصوص تقریبات کے لئے رسوم و راسخ طے کر رکھی ہیں ہمارے ہندوستانی بھائی بھی ہوں، دیوالی، اسنت اور دھرم پر کچھ

بڑھانے کے لیے ہیں، لیکن ہمارا کوئی تہذیبی اور آجائے تو جس پر انہیں بھیانکے کے سوا کسی کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ جہاں لندن میں عہد آئی ایڈ گورنری، یوم پاکستان آباد ہوا گیارہ گھنٹے کے کان پر چونکے نہیں رہ سکی۔ یوم پاکستان پر بار بار ای کیٹین میں چائے اور دھائی خر دو تقسیم ہوئی اور سچ۔ یہ کہ سٹھائی بہت عمدہ تھی لیکن *Clarendon Square* لاؤنڈری اسکوٹس میں برتنوں کی گٹھ کے علاوہ اس ساری مرزین میں جہاں قریب دو لاکھ پاکستانی مقیم ہیں کوئی حریف و سدا اپنے کانوں تک نہیں پہنچی نہ صرف لیڈز (دندہ صحت) کی فیزیوسٹی کے کچھ مستعد طلباء جن جن پاکستان کا سٹامپ لیا کرتے تھے، وہاں کھلیا ب رہا میں سمجھتا ہوں کہ اگر گھر کے اندر بہت بہت سے رسی سب سے ٹھیکے حاضر بھی گئے ہیں تو کوئی ایسی بات نہیں لیکن گھر سے باہر ایسی تقریبات پر کچھ یاد ہو کر صحت ستیہیز سے سوکے تو بار غبا۔ ددولوں کے لطف سے بڑھا۔

یہ تصویر کایک ہیجوت اور درمزدار ہے۔ یہ کہ اگر گندہ نواسہ ایک کونائے کو کسی عنوان پر پہنچا آجائے تو کیا جال و جانتے وطن کو بھی جوگیاں
ہستہ پہلے اور بہت زیادہ رسوائی تو میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ جھگڑے کے نتیجے میں ہوئی۔ اگرچہ مسٹر جواد میں نے وہ دوا دیکھ لی ہے کہ ایک مسعود در شصت طرہ کا کھانا
لیکن اس میں کچھ نہ کیے دخل ہمارے۔ ان کے ڈاکٹروں اور سفیر ماروں کا بھی حذر ہو گا۔ یہ تو کچھ دھکی جھکی بات نہیں ہے کہ پانچ دس روپے کے کنوٹ میٹیک کا
جھوٹا نمونہ ایک اکثرین یا ایکڑیہ متعارف بہت قواب برائی ہو چکی لیکن مالی میں حسیب بینک اور اس کے طلبین کا مضبوطی ہے۔ لندن کے بیشتر اخبارات
میں سرخیال لگیں۔ تصویریں پیس۔ اسد پاکستان کو خطوط گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ ایک سوال کیا اور پھر کہیں جس معاملہ دفعہ ہو اور ہر ساری جگہ
مباح کا جاسمیں پاس ہو کر کی خاطر حق پر کن خان کو نہیں تھا۔ نتیجے میں معلوم ہو سکیں، مگر اتنا دیکھ میں نہ آتا ہے۔ تھی جی جی کی رستم کے لئے اتنے بڑے
ادارے کا کیا فیصلہ کر دیا ہے کہ ضرورت نہ تھی۔ یہ قسم نشاؤں ہمارے۔ یہ کمیشن کے غیر تقسیم وہ کہ تیناویں علیا کی فیدریشن میں توڑ کا مقصد ہوئی اس
تکرار کو ہر سب سے کچھ ہمارے یہ نہیں پڑے۔ مسی سٹی۔ یہ کہہ کر کسی کمیشن والے مصرعے کہ فیڈریشن کا مقصد راجا بانی نادر لندن سے ہمارے والے طلبہ کو
زیادہ عزت دینا کی اس کے فیڈریشن والے کہتے تھے کہ ہم نہیں ہرے کو تیار ہیں۔ لیکن اب ہمارے معاملات میں دخل دینے والے کون۔ اس طرح ایک طرف فیڈریشن
کے دفعہ پائے پڑ گئے اور دوسری طرف مشہور بازاری اور میان۔ بڑی کے دروازے کھل گئے۔ یہ سننا ہے اب یہ معاملہ جو سلجھ گیا ہے۔

لیک بعد از خرابی بسیار

[illegible]

ایک ہم ہیں کہ نیا انتہی صورت کو بگاڑ

ایک دو میں نہیں تصویر بنا آتی ہے

ادب کوئی بے جان کھل نہیں ہے جس کے عمل پہ ہمیں

اختیار نہ ہو۔ انسان کے ہاتھ میں اس کی حیثیت مکنی می سے

زیادہ نہیں اور اس کے لئے مصلحت سے بچ کر انتفاع کرنا انسان ہی

منہ

2288

فیض احمد فیض

کاخِ ستارہ کا چاندرو

بچپن کا کتبہ مذکور ہے۔ اب بھی بے خیالی میں کوہِ قاف کا نام لیجئے تو مشکل سے یاد آتا ہے کہ ایسا کوئی علاقہ واقعی کہیں موجود ہے جہاں جن بریاں نہیں پیا جیسے انسانیت میں اب بھی گمان ہو سکتا ہے کہ کوئی جھڑپانی لفظ نہیں نفسِ خواب و خیال کی سرزمین ہے جو سنہ ۱۹۵۰ء سے دیکھی کہیں نہیں۔ میں نے ایسے ہی کچھ نام اور بھی سنے ہیں۔ دوردور زار و برادر، انہیں میں داغستان کا شمار بھی ہے اور کیوں نہیں آخر یہ خود قاف ہی کا ایک گوشہ تو ہے اگرچہ اس کے تصور میں جن و پری کا دخل کبھی نہ اور نہ فروش تیغ زنوں، برقِ رحمت، توبوں اور نذرِ حال آ زمانوں کا زیادہ اضافہ ہے۔ داغستان کی انجمنِ مہذبین کی طرف سے ایک تقریب میں شرکت کی دعوت آئی تو مجھے یہ سیر و تماشائی کی گئی کہ باوجود زحمت سفر یا نہ تھے میں ایک گونہ منت محسوس ہوئی۔

ہمارا پھوٹا سا ڈیڑھ گھنٹہ کا جہاز داغستان کے صدر مقام مہاجنہ قلعہ کے لیے ہوائی میدان میں اترا، جہاں ہوائی جہاز سے ملے، داغستان کے ملک الشعراء و سول غمرہ (مقامی لفظ میں غمرہ) پندیرائی کو اس کے طے، گئے بلے اور میر بانوں سے ہمارا تعارف کروایا۔ "یہ جہیز داغستان کی صدر ہیں، بیگم عبدالعزیز بیگم نسواری تنگے کے کوٹ اور اس کوٹ میں مایوس ایک خاتون لگے لطیف

بظاہر تیس بیٹیاں کاسی ہوگا، کوئٹا چار تنگ، باریک نقش، سیاہ بالوں میں ہلکی سی سرخی کی جھلک سنہری ذریعہ کچھ شہرہ لگے، بیگم البیگم کاسی ذرا مختلف ہوتا تو ان پر اسے ہاں لاہور یا کراچی کی کوئی پروفیسر یا ڈاکٹر ہونے کا گمان ہو سکتا تھا۔ داغستان کی محلوں میں ان کی شخصیت ہمیشہ الگ تھلک دکھائی دیتی رہی، مہاجنہ کے لوگ بہت کھاتے ہیں، بہت پیٹے ہیں، بہت بولتے ہیں، بہت ہلکے کہتے ہیں لیکن بیگم عبدالعزیز ہمیشہ متین، کم گو اور کم آمیز، بہت ہوا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل گئی اور بس۔

ان کے بعد اور لوگوں سے تعارف ہوا۔ عبدالرحمان وائیل، عبداللہ خان، حبیب اللہ، محمد لغزب، عبدالوہاب سب نام مجھے یاد نہیں، یہ سیاسی قائد ہیں، یہ پرنسپل کے صدر، یہ پلاننگ تنظیم کے سربراہ وغیرہ وغیرہ اور پھر ہم ایک پتلی سی سڑک پر شہر کی جانب روانہ ہوئے، سڑک کی حالت کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ کئی بار ڈراموں کو جھٹکے سے گاڑی اور دھڑکنا پڑی، "بھئی، موٹر کے جھٹکنا ناچ کو معات کر دینا" رسول جہیز نے سنتے ہوئے کہا، بات یوں ہے کہ اس سڑک پر اکثر تین سو گاڑیاں

آجاتا ہے اور گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ ہم سے ذرا دور کیسپن سمندر کا پانی جیل کی طرح ساکن تھا، مہاجر قلعہ کے گرد اور پہاڑیوں پر شام کی نیلاہٹ چھا چکی تھی، دائیں جانب بہت دور ایک چوٹی کے کنارے کاسنی بادلوں میں گھرا ہوا قریزی سوچ و حکم دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا، کسی نے منظر کی تعریف کی تو رسول حمزہ کہنے لگے "اُس منظر پر مت جاؤ و ستر" یہ اصل داغستان نہیں ہے، اصل داغستان تو ان پہاڑیوں سے اُدھر ہے جہاں میرا گاؤں ہے اور میرے عزیزوں کے گاؤں ہیں، تمہیں دکھائے گا" رسول حمزہ داغستان کی سب سے بڑی مقامی بولی، آوار میں شعر کہتے ہیں، داغستان کی آبادی صرف دس لاکھ سے ذرا اور ہے لیکن یہاں سب ملکر کوئی پچیس سو چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ بڑی اور نو یا دس زبانیں ہیں "نادر زنگ" دیگر "آذربائیجانی، کولیک وغیرہ اور باقی ان کی مختلف مقامی صورتیں۔ ان زبانوں کا سببہ نسب چار بڑے خانوادوں قفقازی، تاتاری، ترک اور فارسی سے ملتا ہے۔ ان کی اصوات اور مخارجات عربی سے مشابہ ہیں، کئی صدیوں سے ماضی قریب تک یہاں کی دوسری زبان عربی تھی۔ اور مقامی زبانوں میں کہنے پڑھنے کی کوئی سہولت میسر نہ تھی، غالباً اسی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی ترقی کر کے دوسری بولیوں پر غلبہ نہ پاسکی، یہاں لفظ نہ مشہور ہے کہ جب قیام اہل کے حضور مختلف قوموں میں مختلف زبانیں بولتے لگیں تو عربوں کو عربی ہی، عجموں کو فارسی، چینیوں کو چینی لیکن قوموں کی گنتی ختم ہو گئی اور زبانیں بہت سی بچ گئیں۔ چنانچہ حکم ہمارا کہ ان سب کو ایک طرف پھینکو اور یہ سب داغستان میں آگرس۔

تاریخی اعتبار سے چوتھی صدی عیسوی سے انیسویں صدی تک، داغستان کی سرزمین پر ہر جانب سے رینا رہو تھی، ہزن، ہرنی، آذربائیجانی، ایرانی، گرجستانی، عرب، تاتار، مغول، ترک، روسی، یوکرانی، یہودی، کوئی تاجک نہ کر آیا، کوئی بٹاہہ کر یوکر، اس کے پہاڑوں اور وادیوں میں ان گنت لڑائیاں لڑی گئیں جن میں ہزن اور ایرانی، عرب اور تاتار، روسی اور ترک صدیوں نبود آزمائی کرتے رہے، چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں داغستان اور شمالی آذربائیجان کی مشترکہ سلطنت سارے قفقاز کی تجارتی منڈی تھی۔ اور ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ کی تجارتی شاہراہوں کا بہت اہم مرکز، پانچویں صدی میں اس سلطنت کا شمالی علاقہ ایرانیوں نے فتح کر لیا اور داغستان کے سب سے مشہور اور قدیم شہر دربند کی بنا ڈالی لیکن ایرانی اس پر سے علاقے کو مطیع فرمان نہ بنا سکے اور ساسانیوں کے زوال کے بعد یہاں کے قبائل پھر خود مختار ہو گئے۔

تاریخ کے اگلے دور میں کوئی تین سو برس تک یہاں عربوں کی حکومت رہی جس کے نقوش اب داغستان کے مذہب اسلام، ان کے لب و لہجے، اور ان کے آداب و اخلاق سے اب تک عیاں ہیں خلافت عباسیہ کا چراغ گل ہوا تو یہ بسا اچھی الٹ گئی اور چودھویں صدی میں امیر تیمور نے داغستان پر لشکر کشی کی جو یہاں کے گوہ و دمنی کا سب سے خونخوار باب ہے، کہتے ہیں کہ تیمور نے یہیں سربیدہ مردوں کے مینار بنائے تھے اور سرسبز یہ لاشوں کے انبار رکھائے تھے، داغستان کے بہت سے پرانے عوامی گیت، جنگ نلے اور قومی سرفروشیوں کے قصے کہانیاں اسی دور سے متعلق ہیں۔

سولہویں صدی میں روسیوں نے قفقاز کی طرف پیش قدمی شروع کی اور اس صدی کے وسط میں قازان اور استراخان پر قبضہ کر کے دولت تاتاری کی کمر توڑ دی، لیکن اس سرزمین پر روسیوں کے قدم جتنے نہ پائے تھے کہ ایشیائے کوچک کی ترک فوجوں کا بالائی پرچم مشرق و مغرب میں دھانسا ہوا بڑھا اور شعلہ عیسوی میں ترک جبرئیل نے گرجستان اور آذربائیجان کو زیر کر کے داغستان میں قدم رکھا، داغستان کے قبائلی مرد اور وادیوں میں بٹ گئے، کچھ ترکوں کے مطیع ہو گئے۔ کچھ

روس کے خلاف ہے، برسوں بدال و قتال کا بازار گرم رہا آخر ۱۹۱۸ء میں امیر امام قلی خاں نے دارالکودمت ورنہ کی چابیاں زار روس پر عظیم کے حوالے کر دیں لیکن ترکوں اور روسیوں کے مکر کے قہم نہ ہوتے تھے کہ ایران میں نادر شاہ نے بھاری فوج جمعیت منظم کی اور شمال و جنوب میں پلہ اول دیا اور داغستان کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا، انہی ا نصف صدی میں یہ چھوٹا سا ملک تین بڑے قوتوں یعنی روس، ترکی اور ایران میں بار بار بک بکھڑا ہوا تھا، انیسویں صدی کے اوائل میں بارہ سال مسلسل خونریزی کے بعد معاہدہ گلستان کی رو سے داغستان، گرجستان اور شمالی آذربائیجان مستقل طور سے زار روس کی قلمرو میں آ گئے۔ اگرچہ ان علاقوں میں داخلی خود مختاری کی کوئی مذکورہ صورت نہیں تھی اب تک قائم ہے۔

داغستان کی آبادی دس لاکھ باسٹھ ہزار اور ترقیاً آئینس ہزار مربع میل ہے، شمالی مشرقی قفقاز میں اس کی سرحد ایک جانب گرجستان اور دوسری سمت آذربائیجان سے ملتی ہے۔ قدرتی سطح کے گوند و زمین بھر و چٹانی کے اس کے دشت و صحرائیں بھی اپنے خزانوں و لون و باحقوں سے لٹے ہیں، جہاں زمین کوٹے، ایسے، گزر رکھک اور جیسیم کے ذخیرے ہیں۔ سیدلو میں تیل کے کنوئیر پھیلے ہیں، زیر زمین قدرتی گیس پچھ و تاب کھاتی ہے، یہاں کی زمین سونا اگھتی ہے، چالو، اگھم، ملکی، پھل، ترکاری ہر نوع کی فصل کی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں گرم باقی کے سخت بخش چشے ہیں، اخروٹ، سفیدے اور شاہ بیوٹ کے بن خریدانی، سیب، ہشہرت اور انگور کے باغات، زرگری، اخروٹ سازی، قالین باقی اور شیشہ زرگری کی قدیم دستکاریاں ہیں اور خیلا، دستی آلات اور کیمیاوی مصنوعات و مرکبات کے جدید کارخانے، انقلاب روس سے پہلے ان میں سے بہت سے خزانہ برہم ہو چکے تھے لیکن اب جمہوریہ داغستان کا شمار سو ویٹ روس کے اہم صنعتی علاقوں میں ہوتا ہے۔

رہیل حمزہ کا ذکر شروع کیا تھا اور بات کہاں سے کہاں نکلی، رسول حمزہ کو جاس ہی میں او بی خد رات کے صلی میں لینن انعام عطا ہوا ہے۔ سو ویٹ روس میں رسول حمزہ کے علاوہ دیگر اعزاز و صرفت بہار شتو، جس کو حاصل ہے جن میں ردوایب میں ایک عمارت گراؤ ایک چھتہ ساز، ہم لوگ اسی تقریب پر داغستان آئے ہیں۔ رسول حمزہ کی عمر صرف بیالیس برس ہے لیکن سرک بال مجھ سے زیادہ سفید ہیں، فیر کشیدہ قامت، بہت چھوٹی آنکھیں، بہت لمبی ناک، سرخ و سفید رنگ سخت باتونی، بہت ہنسور، زبان پر دت فچی کی طرح چلتی ہے، بات بات پر تھہر گئے ہیں، پہلے سے معنوم نہ ہو تو ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ انتہائی غیر سنجیدہ مزاج شخص، انتہائی سنجیدہ شاعر بھی ہو سکتا ہے اور یہ سن کر لو مجھے بھی تعجب ہوا کہ یہ حضرت داغستان کے ملک انتہا ہی نہیں سو ویٹ یونین کے نائب صدر بھی ہیں۔

مہاجر قلدیں چاری آما کے اگھے دن جمہوریہ داغستان کے ایوان حکومت میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں رسول حمزہ کو لینن انعام کا طلافی تمغہ پیش کیا گیا۔ عبدالرحمانی وانیال نے صدارت کی، لینن پرائز کیٹی کی صحت سے ناسکو تھیر کے ڈاکٹر کوٹنیک کی صاحب نے رسول حمزہ کو سنداد تھہ دیا، روسی، آذربائیجانی، گرجستانی، ترکیانی اور گرجزادیوں کے علاوہ ایک طالب علم ایک سپاہی، ایک کسان خاتون اور ایک مزدور شامند نے تقریریں کیں اور اپنی اپنی تنظیم کی طرف سے رسول کو تحفے پیش کئے، سپاہی نے ایک منقش پیش قبض کسان خاتون نے چاندی کا درانی اور مزدوروں کے شامند نے ایک چوبی جستمہ، ہال کی باکشی پر داغستانی سازندوں کا ایک طائفہ بیٹھا تھا جو مختلف دھنوں کے بعد شانیانے سجاتے تھے۔ سب کچھ ہوجا کلا و جالغی کمروں میں مہانوں کی شربت پانی سے تواضع کی گئی اس کے بعد ہال میں شہر و دیویتی کی جھان منعقد ہوئی

میں نے انہوں کو بالکل ہمارے ہاں کے کسی وسیعاتی، المان کا نقشہ ہے، اس پر ان صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا، یہ تو وہاں خانہ ہے
سباں اور نہ اپنے گھر میں ہم میز کر کسی پر کہاں بیٹھتے ہیں، خارش ہی پر جو کڑی رہتی ہے۔

اتنے میں کھانا چاہتا تھا، اب اسے چوٹے گوشت کے بڑے تھلے، کچن، پیپر، لہسن، ملاو، دہی، کئی اور پیر کے پلٹے، اجار
پیاز اور پودینے کی چٹنی اور بہت سی کچی ہنریاں یہاں کا کھانا بہت سادہ اور غیر مریض ہے لیکن صحت بخش اور لذیذ کھانے کے
ساتھ جھرتے تقریروں اور جاہلے صحت کا سلسلہ شروع ہوا۔ رسول حمزہ کے لئے میز مالوں کے لئے مہانوں کے لئے مہانوں
میں بدلی صوف میں تھا، باقی سب لوگ فٹنٹ سوویت جہورتیوں کے معرذات اوپر تھے جنہیں بیشتر لوگ پہلے جانتے
تھے، چنانچہ جب پاکستان کا نام آیا تو جمع میں سنیسی ہو گئی، بہت تاکیاں پٹیں، بہت جنگامہ ہوا، صرف انھوں کی
کسریاتی روٹی، میرے ساتھ ایک کرستانی شاعر بیٹھے تھے انہوں نے افغانستان اور پاکستان کا قافیہ صحرانے کے ایک فی البدیہ
قلم بھی کہہ ڈالا، دوڑھا لی گئے لوگ کہاں کی کر سیر ہو چکے تو ایک کونے سے متافی ملیشا، (رضا کار فوج) کے سردار مقصود
حمزہ نے بلند آوازیں کہا، "ما جو ناشتے پر کب تک بیٹھے رہو گے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا، اب میرے ہاں چل کر
کھانا تناول فرمائیے۔"

"لا حول ولا قوتہ میں نے اپنے ہمسائے سے کہا، "تو گویا یہ صرف ناشتہ تھا۔" مجھے تو ابھی آپ نے کھایا ہی کیا ہے؟
وہ صاحب نے، اب ہم تھک رہے تھے، صاحب کے ہاں چینی، ان کا گھر بھی نسبتاً زیادہ مکتف تھا کھانا بھی، اب کے کھانے میں
افغانستان کی مخصوص غذا کے علاوہ گرجستانی اور روسی ماکولات بھی شامل تھیں، مزید تقریریں اور جام صحت ہم لوگوں نے جو
توں کو مطلق سے اتارا لیکن اطمینان کا سانس لینے سے بیشتر چھپر کہیں سے آواز آئی "دوسترا اس چار دیواری میں کب تک
بند رہیں گے؟ دوڑ کو تو باہر دو چل کر حسین نے، سر کو دہنہ زار پر چلا ڈھو جہاں ہر طرف پھیل گئی تھی اور موطیہ میاں چل رہی تھی چلا
وہ شفاف دارآجوداں ہے ہیں، دسترخوان نیا کرتی تھی کھانے پینے کا باقی پروگرام وہاں ہو گا۔"

اب ہم نے جس جگہ برڈیرٹ ڈالے اگر دفتر خان نے واقعی سنانے کے لئے یہ مقام منتخب کیا تھا تو اس کے ذوق کی
داد دینا چاہیے، یہ جگہ نیلے نیلے خورد و خوراک کے ہولوں سے اٹھی ہوئی وسیع لہریاں سبزہ زار سے، شمال اور جنوب میں سرخسک پہاڑ کھڑے
ہیں۔ مشرق میں جدھر سے ہم آئے ہیں سادا، حمزہ اور دوسری آبادیاں ہیں اور مغرب میں نصف دائرے کی صورت کئی ہزار
فٹ گہرا تریب قریب عمودی کھڑے ہیں یہاں پر مختلف سمتوں سے آتی ہوئی تپتی پتلی دودھیا نالیوں کے آبشار رگرتے ہیں اور
درباروں کی شکل میں چلتے لگتے ہیں۔

سبزہ زار جگہ تالین بھی تھے، ایک طرف تو دھیمے لہجے تھے، ایک میں گوشت دوسرے میں دیگیں چڑھتی
تھیں، ہم صبح سے کھا کھا کر چینی سے ڈھال ہو چکے تھے، سب تالینوں پر دراز ہو گئے، ایک افغانی صاحب میرے
پہلو میں آکر بیٹھ گئے۔

"مسلمان الحمد للہ؟" میں نے کہا الحمد للہ۔

"بس الحمد للہ الرحمن الرحیم؟"

میں نے دھمکیاں۔

انہوں نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنا تعارف کر دیا "محمد علی" میں نے کہا "بہت خوشی ہوئی"۔

اب انہوں نے میری ترجمان خاتون سے کہا "تم ہٹ جاؤ ہم خود بات کریں گے" پھر بی بی عربی نارسہ اور شادون سے پیٹ دوستی اور محبت کا اظہار کیا اور پھر جٹ یا کہ لگے دن ان کی بیٹی سعادت کی سالگرہ ہے اور میں اپنے ہاتھ سے بچی کے لئے کچھ لکھ دوں، اس نام سے اتفاقاً اپنی بچی کوئی بھجولی بسری یاد دالبتہ ہے، میں نے غالب کا شعر لکھا ہے

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے یوں دن جیسا ہزار

ترجمہ سنایا کہ تو اس پاس کے سب سننے والے پھر لگ گئے غالب کے احوال اور مزید کلام کی ذرا تلاش ہوئی اور گرفتار شاعر کا دیکھو نہ پھر کئی اشعار کو فی بی بی گرجستانی میں منظوم کر دیا۔

پھر لڑکیوں نے پلایا نہ بھگے پرانے اور نئے داخلہ کی گیت گائے، پورخ اور افغانی کے عشق کی داستان جو یہاں کا مرزا صاحبان سمجھ لیئے، ہزیں اور باہر جو رگے جنک ناٹ، مذہبوں اور مہا لڑکیوں کے گیت، لیمن اور اطفال کے گیت، ملیشیا کے کرطیں بانگے سرو اور متھور و رضا میسے پاس آکر بیٹھ گئے "دیکھو میرے دوست ان پہ لڑا ہے" اور ان کے عقابوں کی طرح حفاکش ہیں اور سبک پرواز، ہم دوستوں کے دوست ہیں، ہمیں دنیا نہیں دیتے بھی بیوی تو انہیں ہارتے، ہم سے دوستی کرنا اور جب کوئی انا دے پڑے ہمیں پھر رد، ہم دوسلوں کی آواز نہ جوروں میں سے ہیں۔ سورج دھل رہا تھا اور روبرو گرام کے مطابق پانچ بجے مباح قلعة واپسی کے لئے ہمارے پتہ پر پانچ بجے تھا، اس کے رسول حمزہ سے کہا "پانچ بج چکے، ہوئی جہاں رچھوٹ جا لگاؤ کہتے گئے مگر ڈیجی، یہی کوئی ماسکو ہے، یہاں تو سب اپنے جہاز میں، جب بی جا ہے گا چلیں گے۔"

خیر کوئی چھ بجے کے قریب ہم ہوائی میدان میں پہنچے تو کسی ٹیارے کا دودھ دھوئی نشان نہ تھا، کچھ دیر گھومتے رہے رسول حمزہ کنٹرول روم کے ایک دو جکر لگا کر باہر آئے اور کہنے لگے "بہت عداوت ہو گئی، ہم نے صبح پانچ کو دعوت میں نہیں بلایا اب وہ کہتا ہے کہ میں جہاز نہیں لاتا۔"

کسی نے مجھ سے سرگرمی میں کہا "بالکل خلافات ہے، جہاز تکب کے آکر واپس جا چکے، یہ سب پاگندہ تھم لوگوں کو ایک رات یہاں روکنے کے لئے ہے۔"

مجموعاً ہم سب پھر پانچ بجے میں سوار ہوئے اور دوبارہ گاؤں کا رخ کیا۔ کسی ایک گھر میں جس آدمیوں کو ٹھہرانے کی گنجائش کہاں تھی، چنانچہ ایک ایک دودھ مہان مختلف گھروں میں بٹ گئے، میرے میزبان رسول کے گاؤں حمزہ کے کوٹھوڑ، Koz Koz، یعنی مشترک فارم کے صدر محمد خلیل صاحب تھے، نہایت مہذب، شائستہ اور باخبر، چھ فٹ کے قریب قد، کسرتی جسم، بہت سمرنگ رنگ، سر گھٹا ہوا، داغستانیوں کی خصوصیتیں عقابی ناک اور تیز عقابی آنکھیں ان کا گھٹن بستی، وضاحت ہے، میری صحن میں انار، نار، شپائی اور صید کا باغ اور ترکاریوں کی کھاری، اس کے بعد چار پانچ میز پر بٹھ کر ادنیٰ کرتی کے مکان میں داخل ہوتے ہیں اس سرے سے، اس سرے تک بانی دار بالکنی ہے جس میں ایک

سمت نشست کے لئے آرام کر سکیاں ہیں درمیان میں ہاتھ دھوئے گئے تھے پھر ٹاسا-ٹاسا ماساژ اور سنی اور سری طرف کھانے کی میز اور سیڑھیاں جو غصہ لگنے کو اترتی ہیں، ہچا رکائی کشادہ کمرے میں جو اس بات کی من گھڑی کھینچے ہیں، بجلی اور ٹیلا تو خیر ہمارا ہر گھر میں ہے، خطیب۔ صاحب کے یہاں ان کے علاوہ دو ریڈیو سیٹ اور ریفریجریٹر بھی ہے۔

خطیب صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے کونوڈوں، سات گاؤں شریک ہیں جن کی آبادی چار ہزار افراد کے قریب ہے اس کونوڈ کے زیرِ اہام گندم اور مختلف پھلوں کی کاشت ہوتی ہے اور پھلوں کے ٹپے پالے جاتے ہیں جن کی فروخت پر وہ خود کی بیشتر آمدنی کا دار و مدار ہے، یہ پھل شریک حکومت کو بیج جاتی ہیں۔ لیکن گندم اور سیل کونوڈ کے ممبروں کی اپنی ضروریات سے انہیں بیوقوف معافی مندریوں میں فروخت ہوتا ہے، ذرا سیٹا جالیس ہزار پھلوں کونوڈ کی حدت ہیں اس کے علاوہ چار شیش ایک کمارے اور جن پھلوں کی ذاتی حدت میں رکھ سکتے ہیں ہر گھر کو ایک ایک گھر کے قریب زمین ذاتی باغ یا کیتھ باڑی کے لئے رکھنے کی اجازت ہے، ہر گاؤں کا اپنا اسکول ہے، آٹھویں جماعت تک تعلیم ہر منصفی زبان آواز میں دی جاتی ہے، پانچویں جماعت کے بعد روسی زبان لازمی ہے، کونوڈ کا اپنا ہسپتال ہے، نجس میں ایک سو بیس مرلے زمین کے واسطے گئے تھے، پندرہ لیتھ میسر ہیں۔ دوزخ کی گھنٹے ہیں، ایکس۔ رے اور دو مسر اے اور ہر حاجی سا دوسمان موجود ہے۔ روزانہ ہوائی مسرور ہے اور ہوائی اور موٹر گاڑیوں کے لئے پکی ٹرک / شب گزارنے کے لئے خطیب صاحب نے میرے لئے اپنا گھر وغیرہ دکھائی کہ وہ جاتا ہے اس کمرے کو دیکھ کر ہرگز یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ داخلہ انسان کے دروازے وہ علاقے کے ایک دروازے کا دروازہ ہے۔ قیرک۔ کاکڑ ہے، شہر کے گھر پر وہ مسر کی بیٹھک معلوم ہوتی تھی، دیواروں پر نقشے اور مختلف شہروں کی تصاویر، چاروں طرف گناہوں کی امداد، پڑھنے کی میز پر اخبارات اور رسالے، ریڈیو سیٹ، ہڑا سا کھلک، پڑھنے کا لمپ، کھانڈ پھیل، در مسگریٹ۔

حق یہ ناستہ کر چکے تو رسول حمزہ آئے اور آئے ہی غلہ در معذرت کے پس بانا ہوئے "سبھی آپ آجیتے ہیں گے کہ شب بد تمیز آدمی ہے، تمہارا کسی کے گھر پہنچ کر جانے کہاں، غائب ہو گیا۔ لیکن بات یہ ہے کہ مفسر دینت کے باعث گاؤں آتے کا اتفاق کم ہوتا ہے، اس دوران کسی گھر میں ناظم ہوا ہے۔ کہیں شادی کسی کے ہاں ہو جوا ہے کسی کے لڑکے نے یونیورسٹی میں کامیابی حاصل کی ہے، ان سے تعزیت کرنا ہے کسی کے ہاں تہنیت پہنچانا ہے، اب مشکل سے سب کو پٹا سا کہوں، چلے! اب ناستہ کو چلیں۔"

"ناستہ تو ہم نہ چکے" میں نے کہا۔

"ابھی تو اس سے کیا ہوتا ہے، جانے سے پہلے آپ کو دیکھنا ناستہ اور کرنا ہے۔"

دو دیکھنا ناستہ کرنے کے بعد ہم لوگ بوائی بیلان پہنچے تو فیادوں کے سامنے کچھ ڈنڈے، دیہی اجلا ہوا گوشہ، اور تھرو بات لے کھڑے تھے۔

"ایں یہ کیا؟"

"کھانا پڑے گا" محمد علی نے کہا "ہمارے ہاں کی رسم ہے۔"

فیض احمد فیض

ایک یادگار تقریر

فیض صاحب کے تقریر جو اس سہ ماہی نے ماسکو میں بین الاقوامی
لیگ آف وائس آف انجمن کے پر مشکوہ تقریر کے موقع پر اردو زبان میں کی

میں اس کی جس صراحت، قوت، اور نظرات، انسانی تخلیق و تخیل، انشاء و سادہ سادہ کاسٹیز - لیکن زندگی میں فیض
موجود ہے۔ یہ بھی اس میں جیسا کہ ہم نے - یہ نظم خواب و خیال - یہ آج بھی یہاں لکھا گیا ہے - یہ روح و ریشہ - یہ ایک سو کوئی - انسانی تخیل
نہیں، اس کی بھی میں اپنی عزت افزائی کے لئے لیکن یہاں لکھی، سو وہ یہ یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور آپ سب
خوانین، حضرات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں، اس لئے اس کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لیکن کا حق
تمام و مقدس لفظ و عبارت ہے لیکن جو دور حاضر میں انسانی تربیت کا سب سے بڑا علم بردار ہے اور اس میں جو انسانی زندگی اور
اس زندگی کے ضمن و خوبی کی نشاۃ اول ہے اس کے لئے اپنی تقریر و علم میں اس کوئی کام نہ کر سکتا تھا جو اس کی عظمت اعلا کے شایان شان ہو لیکن
اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس نے ان اداروں کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی دے دی ہے
یعنی امن اور آزادی کی تمنا وہ مجھے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حق اور ان کی کارکن بھی عزت و احترام کے مستحق
سمجھتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجھوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ کبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک
چیزیں ہیں اور یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گمراہ کے کھیت ہیں اور سفید سے درخت، اور وہ ان کا آج بھی ہے اور بچوں کے
ہنستے ہوئے ہاتھ لٹکا رہا ہے اور صورتوں کے قلم اور ان کی سب صفات کی خاص اور غلامی ان سب خوبیوں کی قائل ہے جو انسان
اور حیوان میں تیز کرتی ہے۔ یہ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، اذکار و مشیعت، نیکی اور رواداری، اس لئے بظاہر امن اور
آزادی کے حصول اور ان کی کھیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔ اس
لئے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں جھڑپیں رہیں ہیں یہ قوتیں ہیں
تخریب و تہذیب، ترقی اور زوال، خوشی اور تیرگی، انصاف و دوستی اور انصاف و دشمنی کی قوتیں ہیں صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت

فیض احمد فیض

شعر نیلے طہار اور ترجمانی

فیض صاحب کا یہ نایاب مضمون جو ان کے مجموعہ مضامین "میزان" میں شامل نہیں ہے، اتفاقاً ہمیں مل گیا۔ یہ مضمون ۱۹۳۵ء سے ۲۵ سال قبل "ادبی دنیا" کے سالانہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا اور ایک ممتاع گمشدہ کن حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ دور "ادبی دنیا" کے شباب کا تھا۔ اور اس کے مدیروں میں مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے علاوہ میراج بھی شامل تھے۔ مولانا مرحوم نے اپنے ادارتی کالے میں فیض کے اس مضمون پر ایک تدارقی نوٹ بھی لکھا تھا جسے ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

"پروفیسر فیض احمد نے ایک مختصر لیکن نہایت پر مغز مضمون لکھا ہے۔ شعر میں اظہار اور ترجمانی، غالباً مولانا حالی کا شعر ہے۔ اے شعر دلنشین نہ ہو مگر تو تو غم نہیں پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہودل گداز تو

اہل ذوق کے ہاتھ اشعار کی قدر و قیمت جانچنے کا جو پیمانہ مقرر ہے یہ شعر اس کے مختصر تفسیر ہے۔ مگر فیض صاحب نے اپنے قیمت مضمون میں تفصیل سے بتایا ہے کہ شاعری میں ترجمانی کا کیا درجہ ہے؟ — اظہار اور ترجمانی میں کیا فرق ہے؟ — اور کسی شعر کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا صحیح معیار کیا ہے؟ — مضمون نہایت خیاں انگیز ہے اور ہمارے تنقید سے اسٹریچر میں ایکے بیسے قیمت اضافہ — صلاح الدین احمد، ۲

آپ کو کیا آپ کے تھاگو کو کیا حق ہو چننا ہے کہ شاعر اپنے اس کام کی تعمیل پر مجبور کرے شاعر کی نیکین ہو یا نہ ہو آپ کا مطلب نکل جائے! اس کا ہم یہ جواب دیں گے کہ اگر شاعر میں شعور سنا ہے تو اسے ہم اپنے ہی معیار سے جانچیں گے اگر لے یہ معیار پند نہیں تو اپنے شعر اپنے پاس رکھے اور بڑی خوشی سے پڑیاں بانٹھ کر ان میں بانٹھ کاچورن۔ سب کرے۔ میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہمارا مغز چائے کا تو ہم اس سے معاذ بھی طلب کریں گے اور وہ ہے کہ شعر کے تصور اور تخلیق میں جراثیم اس نے محسوس کی ہے۔ اس میں ہیں بھی شریک کرے۔ اس نے جو کچھ دیکھا ہے میں دکھائے اور جو کچھ سنا ہے میں سنا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ تھیندے اصول جیش پڑنے والے ذہن کرتے ہیں اور پڑنے والوں کے نزدیک شعور کی پہلی خوبی ہے کہ شعور کا مفہون ان تک زیادہ سے زیادہ مؤثر طریقے سے پہنچے پہلی خوبی اس لیے کہ جب تک ہم شعور کو سمجھیں گے نہیں شعری باقی خوبیاں ہیں نظری ہیں آئیں گی۔ مٹ کے نگرے ہیں کتنی وسعت اور کتنی کھرا لی کیوں نہ ہاگو ہم واپسی کو کشش کے باوجود اس تجربے کو ذہن میں نہیں لاسکے تو شعر کو لازماً کامیاب ٹھہرائیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ اڈول تو اس مفہون میں وسعت نہیں ہے۔ اور اگر بے توفی بدن شاعر ہے۔ فی بدین شعر نہیں۔ غالباً دنیا کا کوئی شعر یا لکھنا ہو۔ اور بے معنی نہیں ہوتا۔ کیونکہ شعر کتنے وقت شاعر کے ذہن میں کوئی نہ کوئی خیال تو ہوتا ہی ہے لیکن ہم ہر اس شعر کو مہل کہنے میں حق بجانب ہیں جس میں یہ خیال تک نہ پہنچے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں ہر وہ شعر جو ذہن میں آجائے چاہے اور ہر شعر جو ذہن میں نہ آئے۔ ہم، اکثر شعور تو ذہن میں آجائے تو یہ ایک فی تصور ہونے تک نہیں شاعر میں بہت سی برائیاں ہوں جو اس خوبی کو رد کریں یا شعر کا مفہون اتنا پامال ہو جس پر تجربہ کرنے کے ضرورت ہی نہ پڑے۔ اسی طرح اگر شعر جو ذہن میں نہ آئے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر نے شعریں اسے تصور تک پہنچائیں گے نہ کہ ان کا ایک ذہن میں لکھا جاتا ہے۔ اس صورت میں ہم شعر پر تنقید زیادہ غور کریں گے اسی قدر اس سے لطف اندوز ہوں گے اور میں اس میں سرگردانی کو جو تصور کی نظر آئے گی۔ اس سبب سے نتیجہ یہ نکلا کہ شعری کامیابی اظہار پر نہیں۔ تہنائی پر منحصر ہے ہم کسی اظہار کو اس وقت تک کامیاب کہہ سکتے ہیں جتنے جب تک وہ دوسروں کے لیے ترجمان کا حق ادا نہ کرے۔

یہاں ایک اور وقت پیش آتی ہے۔ شاعر کا کام باقی رہتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاعر کا کام اس سے عہد کے لوگوں کے لیے سمجھ نہیں لیکن بعد میں آنے والی۔ میں اسی کلام کو شاعری کے معراج قرار دیں گا کوئی شاعر اپنے عہد میں آسان کہن آواز دے مانتے ہیں مگر باقی ہم بد جائے۔ غالب کو جو بے لچھے ناسب کام بہت بڑا شاعر اصرار ہے۔ لیکن سنا ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں اس کا کوئی چہ چاہیں تھا۔ اور لوگوں سے اہل گوشت تھے۔ اکثر شاعر کا مقصد ترجمانی یا اپنے مفہون کو دوسروں تک پہنچانا ہے تو وہ لوگ بھی سمجھتے تھے اور ہم بھی سمجھتے ہیں اور اس طرح ترجمانی کوئی قطعی معیار تو نہ تھا۔ اس کا جواب کئی طریقوں سے دیا جاسکتا ہے۔ اولیٰ تو یہ بات ہے ہی غلط کہ غالب کے زمانے میں اس کے قد۔ وہ ان نہیں تھے۔ غالب کو سنا ہے والوں کی اس زمانے میں بھی کسی نہ تھی اور غالب کو کو سننے والے آت بھی رہے ہیں۔ غالب سے کوئی کو انتہا اس کے مضامین کی وجہ سے نہیں اس کے نظریہ شاعری کی وجہ سے تھا۔ آخر ناسمجھی کی کو قدر ہوئی اور اسنا و فوق کا کام ہم تو زیادہ سلیس نہیں۔ مگر اصل میں یہ تھا کہ نگہ فطری منتظر کو کمال شاعری سمجھتے تھے لیکن غالب اس زمانہ سے مٹ کر نیا لہجہ بناتے۔ اس کوئی کو جانتے تھے۔ بعض انتہا صحران پر چیر عجبیہ معلوم ہوئی اور وہ اس کی فنی اہمیت کا اندازہ میر کے دوسری بات سے کہہ کر لکھی غالب کی غلطی اس کے سلیس شمار کی وجہ سے قائم ہے نہ کہ شکل اشعار کی وجہ سے۔ اب بھی غالب بعض اشعار میں اتنے ہی مہمل مہم ہوتے ہیں جتنے کہ ڈاکٹر ٹیگور کی

فیض احمد فیض

’اھنگ‘

’اھنگ‘ کا پہلا ایڈیشن اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

دیکھو شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ

توجہ شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

شمشیر ساز اور جام، تباہی کی مشاعری انہی تینوں اجزاء سے مرکب ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کا کلام زیادہ مقبول بھی ہے۔ ہمارے بیشتر شعرائے انہما میں ایک ذہنی تضاد کی دواریں کھڑی کر دی ہیں۔ کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ ہے تو کوئی فقط شمشیر کا مددنی۔ لیکن کامیاب شعور کے لئے (آجکل کے زمانے میں) شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گندادھنوں ضروری ہیں۔

دلبری با قاہری جادوگری است

جہان کے شعر میں یہ امتزاج موجود ہے۔

اس امتزاج میں ابھی تک شمشیر کم ہے اور ساز و جام زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمشیر زنی کے لئے ایک خاص منہم کے دفاعی زہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن عمارت کی طبعیت میں زہد کم ہے لذت زیادہ ہے۔ شمشیر زنی کو میں انقلابی شاعری کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ دماغی زہد سے میری مراد ہے ایک مخصوص انقلابی مقصد کے نشروانہا میں ذہنی اور جذباتی یکسوئی۔ تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز۔ یہ یکسوئی اور محنت طلب عمل ہے۔ عمارت میں سے اکثر کی طرح لا اُپالی اور سہل انگار انسان میں چنانچہ جب بھی انہیں ذوق پہنایا کی آسودگی کا موقع ملے باز نہیں رہ سکتے۔

عجاز کے شعر کا ارتقا بھی ہمارے بیشتر شعرائے مختلف ہے۔ عام طور سے ہمارے یہاں شعریا شاعری کا ارتقائی عمل یہ صورت اختیار کرتا ہے۔ ساز و جام۔ ساز و جام + شمشیر۔ شمشیر، عمارت کے شعر میں اس عمل کی صورت یہ ہے کہ ساز و جام۔ شمشیر ساز و جام + شمشیر۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رحبت نہیں ترقی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کے معنوں اور تجربہ میں مطابقت اور موافقت زیادہ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ شاعر کی طبعیت فادجی اور انقلابی مضامین کے اینٹ پتھر کو تراشنے اور جوڑنے جمانے میں زیادہ لذت محسوس کرنے لگی ہے۔

عجاز بنیادی طور پر اور طبعاً فاضل شاعر ہے۔ اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں۔ باغی کے ولی کی آہ نہیں،

نفسِ کنگے کا وفور ہے۔ یہی وفورِ مجاز کے شرکِ سب سے بڑی خوبی ہے اور اس کے شرکِ کامیابی کا سب سے بڑا امین۔ بیچ کے ایک مختصر سے دوس کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گاتا رہا ہے۔ اُس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہیں آیا کبھی اس نے آغا زبوعف کی رنگین بے فکر خوابِ منامیت کے گیت گائے۔

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور نیا
مہکیں ترے غرض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کیسے نعرِ شباب اور زیادہ

نورِ ہی نور ہے کس سمت اُٹھاؤں نہ نہیں
حسن ہی حسن ہے تاجِ نوازِ آج کی رات
اللہ اندر وہ پیشانیِ سمیں کا جمال
مہ گئی جم کے ساروں کی نظر آج کی رات
وہ تبسم پہ تبسم کا جمال پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

کبھی اس خواب کی شکست پر آسو بہائے

کچھ توبہ کو خیر ہے ہم کیا کیا اسے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریش بھول گئے، وہ دیدہ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہئے، نغموں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ نقوش کیا کہئے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

کبھی اس خالص تجزیہ اور مجبورِ بیچ و تاب کا اظہار کیا جو موجودہ ماحول کے متعلق ہر نوجوان کا اضطرابی اور پہلا جدلیاتی ردِ عمل ہوتا ہے۔

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوحِ کوں
اس کنارے نوحِ کوں اور اس کنارے نوحِ کوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوحِ کوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں؟
بڑھ کے اس اندر بھاگنا ساز و سامان پھونک دوں
اس کا لکڑی پھونک دوں اس کا لکڑی پھونک دوں
نخستِ سلطان کیا میں سارا قہر سلطان پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں؟

بھی اس تعمیری انقلاب کے اسباب و آثار کا تجزیہ کیا جس کے نقوش صرف غور و فکر کے بند دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اک نہ اک در پر جبین شوق گمتی ہی رہی

آدمیتِ ظلم کی جگہ میں لپکتی ہی رہی

رہ ہی جسٹاری رہی پیغمبری جاری رہی

دن کے پرصے میں جنگِ زندگی جاری رہی

ذہن انسانی نے اب اودھم کے ظلمات میں

زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کہہ سکتے خوابِ سحر دیکھا تو ہے

جس طرف دیکھا نہ تھا اب ہملا دھر دیکھا تو ہے

یہ کافی تھوڑا مرکب ہے لیکن اس میں کہیں بھی مجاز کا ترنم نہ آہنگ، اُس کی دھن چھپکی یا اُس کے مڑے مڑ نہیں ہوئے۔

مجاز کے کلام میں روایتی شعرا کی سہولت، انہماک رہے۔ لیکن ان کی جذباتی سطحیت اور محدود خیالی نہیں، انے شعرا کی نزاکت کا

احساس ہے، ان کی لفظی کھینچا تانی اور توڑ مروڑ نہیں۔ اس کے ترنم میں چاندنی کا سا نیا فاناہ حسن ہے، جس کے پر تو سے تا ایک ادھ

روشن چیر میں یکساں دلکش نظر آتی ہیں۔ غنائیت ایک کیپی وی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ الفاظ عجیب پراسرار اور پرمی

صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بیدہ بھی عفو ان مشابہ میں سادہ یا نیئے رنگین دکھائی دیتا ہے، یا نیئے رنگین کے اثر سے بے رنگ

چہرے عبا بی ہو جاتے ہیں۔ مجاز کا اس کیما وی عمل پر قدرت ہے۔

مہدم بھی ہے رہ گزرد یا ر خوش خرام

گزرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

ضو فلک روئے حسین پر شب ہنابِ شباب

چشمِ مخمورِ شادِ شب ہناب لے

نشہ نازِ جوانی میں شرابِ روا

جہمِ ذوقِ گہرا طلس و کنواہ لے

سکونِ دیر، تقدریں کلیا

گداڑ امتِ خیر البشر بھی

یہ تربت ہے امینِ بکارِ رواں کی

یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گزری

یہی غنائیت مجاز کو دوسرے انقلابی اور فحاشی شاعروں سے میٹر کرتی ہے۔

تجارت کی غنائیت عام غنائی شعرا سے مختلف ہے۔ عام غنائی شعراء محض غنوان شباب کے دوچار تمدن ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن مکتوڑ سے ہی دونوں میں ان تجربات کی تحریک: ان کی شدت اور قوت منحصر مروجاتی ہے۔ تمام غنائی شعراء کی شاعرانہ عمر بہت کم ہے۔ ان کا اوسط عمر مایہ پانچ دس کامیاب عشقیہ نظمیں ہیں۔ بعد میں وہ عمر بھر اپنی پانچ دس نظمیں کو دہراتے رہتے ہیں یا خاموش ہو جاتے ہیں۔ تجارت کی غنائیت زیادہ وسیع، زیادہ گہرے، زیادہ مستقل مسائل سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ابھی تک ارتقا کی گنجائش اور پیشے کا امکان ہے۔ اس کے شباب میں، بڑھاپے کا رنگ نہیں جھلکتا۔ عام نوجوان شاعر کی غنائیت زندگی سے بیزار اور موت سے وابستہ ہے۔ انہیں زندگی کی لذتوں کی آرزو نہیں۔ موت کے سکون کی ہوس ہے۔ تجارت گرم زندگی کے نشے سے چھوڑا اور موت کے سرد جموت میں سربسزاد ہے۔

مجھے پیٹ دے پیٹ دے کہ ترے جامِ بلیں میں

ابھی کچھ آدھ ہے کچھ اور بے کچھ اور بے ساقی

یہی وجہ ہے کہ مجاز کے شعر میں تصنع نہیں ملتی ہے۔ اداسی نہیں، سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیست عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متوجہ کر دیتے ہیں۔ لٹکارتے ہیں۔ سینہ کڑتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق کا نہیں سکے۔ ان کے ذہن میں آمد انقلاب کا تصور طوفان برق و عورت سے مرکب ہے۔ نئے ہزار اور رنگیں بھار سے عبارت نہیں۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں۔ اُس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔ یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے۔ یہ برق و عورت کا دور یا زبردستی گزر چکا ہے۔ لیکن اب تجارت کی غنائیت اُسے اپنا چکی ہے۔

تو، مانتے یہ یہ آئیں بہت ہی خوب ہے مگر
تو اس آئین سے اک پرچم بناتی تو اچھا تھا

نقدیر کچھ ہو کا دشمنِ ندیر بھی تو ہے

تخریب کے لباس میں تمیر بھی تو ہے

فلمات کے چاب میں تنویر بھی تو ہے

آمنتظر ہے عشرتِ فردا، ادھر بھی آ

برق و عورتوں میں غلوم اور تین تو ہے۔ یہ لوح اور نغمہ نہیں۔ ان میں انقلاب کی قاہرہ ہے، دلیری نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجازی "خوابِ سحر" اور "نوجوان خاتون سے خطاب" اس دھمک مٹل اور کامیاب ترقی پسند نظموں میں سے ہیں۔ مجاز انقلاب کا ڈھنڈو دہی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔ یہ ساری باتیں میں صرف مجاز کی اچھی نظموں کے متعلق کہہ رہا ہوں، اور ابھی تک غنیمت میں بیٹھیں بہت زیادہ ہیں۔ مجاز کے مجموعے میں بہت سی کروڑا درشت نظمیں بھی ہیں۔ لیکن میں نے انہیں عمداً نظر انداز کر دیا ہے کہ میری رائے میں کسی کلمے والے کے حماس کا جائزہ لینے وقت صرف اس کی بہترین تحریر سامنے رکھنا چاہیے۔

(دیباچہ، آہنگ۔ انجمن اصرار المی مجاز دسمبر ۱۹۳۸ء)

فیض احمد فیض

کچھ ڈراموں کے بارے میں

ہمارے صغیر کا عوامی تھیٹر براعلاج جیسا بھی تھا غالب سے برسوں اُدھر نسلی موت مریچکا۔ لیکن اسے ہمارے کھنے والوں کی تہمت کہیے، ہٹ دھرمی کہیے یا امید بچستی کر ڈرامے جب بھی لکھے جاتے رہے۔ اور اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ اس صنفِ ادب میں ضرور کوئی نیکر معمولی کشش ایسی ہوگی کہ بہت سے مشتاق لکھنے والے اپنی اور دوسروں کی پسندیدہ اصناف سے ہٹ کر بھی اکثر اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیشتر ڈرامے میڈیو کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ یا مغربی تقاضا سے اخذ و ترجمہ کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ ریڈیو موجود ہے اس لئے ریڈیو ڈرامے کی مانگ بھی موجود ہے۔ مغربی تراجم کا یہ ہے کہ اصل کی شہرت کے باعث نقل کی قبولیت کے امکانات خود ہی بڑھ جاتے ہیں۔

ریڈیو ڈرامہ اپنی جگہ ایک الگ اور متعلق صنفِ تحریر ہے۔ جسے ایٹمچ ڈرامہ کا بدل نہیں نظر آسکتے۔ ریڈیو ہوائی چیز ہے۔ اس لئے ریڈیو ڈرامے پر بھی مقام اور نگاہ کی قید نہیں۔ نہ تعمیر، نہ اسٹیج، نہ اداکار۔ نہ تماثلی۔ جی چاہے تو اس میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیجئے۔ لیکن ایسے ڈرامے اسٹیج پر منتقل کرنا محال ہے۔ ریڈیو کی اپنی مخصوص حدود و قیود ضرور ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت اسٹیج کے تقاضوں سے مختلف ہے۔

رہے مغربی ڈراموں کے تراجم یا چرلے تو ان کی افادیت اپنی جگہ مسلم، لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے۔ کہ بیشتر ڈراموں پر کسی مخصوص معاشرے اور زمانہ و مقام کی چھاپ ہوتی ہے۔ جسے آپ آسانی سے بدل نہیں سکتے۔ یوں تو سچی ادب اپنے عہد اور گرد و پیش کی عکاسی کرتا ہے لیکن ڈرامے کے لکھنے میں اس بقویہ کے ضد و غالب اور بی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی جہنی معاشرے کے بارے میں لکھا مہا ڈرامہ کیسے ہی سلیقہ اور دہارت سے کیوں نہ اپنا یا جائے۔ تلافی یا تصنع یا اجنیت کا کچھ نہ کچھ تڑپا رہی جا تا ہے۔

باحسہ مسرور اداکارانہ لٹریچر جثیت سے ہمارے ہاں ایک نذرانے سے معروف ہیں۔ تیشل نگاری کے میدان میں یہ مجموعہ ان کی پہلی کاوش ہے۔ لیکن اس نقشِ اول میں بھی بعض منفرد اوصاف نمایاں ہیں۔ مثلاً ایک بات تو یہی ہے کہ یہ ڈرامے نہ ریڈیو ڈرامے ہیں نہ مغربی تعینات کے چرلے یا تراجم، ان کے مضامین، واقعات اور کردار سب دیسی ہیں۔ اور کسی کردار میں بدلیسی پن کی جھلک ہے بھی تو سہو بہو ایسی ہے جیسی ہم اپنے فیشن میں لطیفہ میں روزانہ دیکھتے ہیں۔ ان کرداروں کی لہجیں اور ان کے فعل، جھپٹائیں اور سلجھاوے، افعال اور محسوسات سب ہماری جانی پہچانی باتیں ہیں جس ساز و سامان کے ساتھ اور جن پردوں کے سامنے یہ ٹانگ کھیلے جاتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ ماحول کا جزو ہیں جو

تمثالیہ لوگ برپا کرتے ہیں۔ ہر روز ہمارے آگے ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ان ڈراموں میں سچائی اور حسیں موجود ہے۔ جو کسی تحریر میں دیدہ نہ بنا اور اور دل درد مند کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔

باجرہ مسرور کی تربیت جدید فنکاروں کے مکتب میں ہوئی ہے۔ اس لئے حسیں خارجی واقعات کی نسبت اپنے کرداروں کے داخلی اور جذباتی ارتقا سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان ڈراموں میں جو مرکزی مسائل یا مضامین بیان ہوئے ہیں ان کی رعایت سے مناسب ہی نہیں تھا۔ ہمارے سعید پوش طبقے میں ہر واقعہ صحت کے جذباتی کاروبار کے خسارے اور ناآسودگیوں اس کاروبار کی ریلنگی اور بے رونقی، اس کے چھوٹ اور بے کاریاں، اس کی معصومیت اور نادانیاں۔۔۔ ان ڈراموں کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسانی تجربے کی طرح ان تجربات کی تشکیل میں بھی خارجی عوامل اور داخلی کیفیات دونوں باہم پیوست ہوتی ہیں۔ جنکے عمل اور رد عمل سے کسی کردار کی ذہنی اور جذباتی شخصیت ہم بدلتی رہتی ہے۔ باجرہ مسرور نے انسانی شخصیت کی شکست و ریخت میں ان داخلی محسوسات کی گرفت اور دخل اندازی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اور خارجی واقعات شیراز شائریاں لکھے ہیں مثلاً ”نوری خاں“ میں رضا ناموں کی برسوں پہلے کی جذباتی شکست ایک نئے میاں سے جوڑے کے لئے عذاب جان بن جاتی ہے۔ ”درستک“ میں ایک نو عمر گھریلو لڑکی اپنے بچے ہی پر پہلے کی محبوب سے بکثرت آشنا اور اپنے بچے کو، باکے لئے عمر بھر انتظار پہنچاتی ہے۔ ”کھلی کھڑکیاں“ میں ڈاکٹر نور اور اس کی بیوی انیسریں ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں چھٹکارا بھی پانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ رہنے کی عادت اور حسی دنیائے خوف نے دونوں دونوں میں ایسی زنجیریں ڈال رکھی ہیں جن سے نجات ممکن نہیں۔

”وہ لوگ“ اس مجموعے کے باقی ڈراموں سے مختلف رنگ میں ہے اور تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے شاید سب میں مؤثر، اس کے کردار زیادہ حقیقی ہیں۔ جن کی ہونٹانگ جدیدیات میں خیالیت اور جذباتیت کو دھل نہیں۔ ان کی جھڑک و شمشاد کی ڈرامائی وضاحت کے لئے وقت اور (SITUATION) کا مرکزی نقطہ بہت صحت سے چنا گیا ہے۔ اس کش کش کے تمام پہلو اس مرکز کے ارد گرد بہت خوبی سے مرتب ہو گئے ہیں۔

کردار اور مؤثر مکالمہ لاری پر باجرہ مسرور کی قدرت ان سب ڈراموں میں یکساں بنایا ہے۔ ان کی مخلوق میں بچے بوڑھے، امیر، غریب، ملازم، آقا، انے فیشن کی دو شیرازیں اور پرانی وضع کی یکمیں سبھی شامل ہیں۔ اور یہ سبھی مخلوق دلچسپ اور حقیقی جاگتی مخلوق ہے۔ حتیٰ کہ ”نوری خاں“ جیسے کردار بھی جو بالکل سامنے ہی نہیں آتے مائوس اور بھانڈا معلوم ہوتے ہیں۔

ڈرامے کے اصل جوہر تو اسٹیج پر ہی جا کر نکلتے ہیں۔ ان تحریروں کے بارے میں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ادبی محاسن کے علاوہ ان میں اسٹیج کا امتحان پاس کرنے کی سبھی صلاحیتیں اور لوازم موجود ہیں۔ یہ مجموعہ ہمارے ادب میں بہت ہی قابلِ قدر اضافہ ہے۔

(دیباچہ ”ہم لوگ“ - از باجرہ مسرور ۶۱۹۶۱ء)

ادبِ ریاضی نہیں ہے، اس میں کوئی کلیہ قاعدہ صحیح

نہیں ہوا کرتا۔ ہر قاعدے کے مستثنیات مل جاتے ہیں۔

— فیض

فیض احمد فیض

چند و اَو

”چند و اَو“ خدیجہ مستور کے افسانوں کا قلمی مجموعہ ہے۔ آج سے کوئی چار برس پہلے ان کا دورہ لاہور ہوا۔ ان کے بارے میں سنا تھا کہ اور جب سے موجودہ ادب کے طلباء کو اس بک دست افسانہ نگار کے متعلق کافی تجسس چلا آتا ہے۔ ”چند و اَو“ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مہذبہ کے دوسرے مجموعے سے کئی بنیادی باتوں میں مختلف ہے۔ میں مختلف کہہ رہا ہوں، بہتر نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے خدیجہ مستور کے پہلے افسانوں کی تحقیق مقصود نہیں۔ ہمارے ہاں آج کل عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ نوجوان لکھنے والے اپنی ابتدائی تحریری زندگی میں ایک آدھ کتاب لکھ چکے کے بعد عرصہ راجی ہی نفل امارت میں مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک خاص عرصہ کے بعد ان کی تخلیقات میں نمودار ارتقا کا عمل دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن ”چند و اَو“ اس بات کی شہید ہے کہ خدیجہ مستور نے ابھی تک اپنے یہ ذہنی اور فنی ارتقا کے دروازے بند نہیں کئے۔ نہ اپنی تحریروں کو تجربات اور شہادت کی کسی محدود نوع سے اتنا مخصوص کر رہا ہے کہ ان میں وسعت اور نیرنگی کی صلاحیتیں منقو و ہو جائیں۔

خدیجہ مستور کے ابتدائی افسانوں میں دو تین خوبیاں بہت زیادہ واضح ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ انہیں سچ کہنے میں بہت کم دریغ ہوتا ہے۔ لہذا اس خصوصیت کو حقیقت نگاری یا واقعیت نگاری کہتے ہیں۔ لیکن دقت یہ ہے کہ ان کے سچ کہنے میں کئی مبالغہ جوتے ہیں۔ جن مہنموں کو ہم حقیقت نگار کہتے ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جن کا تاہم حقیقت کی نقاب کشائی کرنے میں کسی نہ کسی پردے تک پہنچ کر رک نہ جاتا ہو۔ جو کبھی نہ کہیں اپنی جھجک یا پڑھنے والے کی رعایت سے واقعیت کے بہت سے مقامات سے انہیں میچ کر گزر نہ جاتے ہوں۔ بیشتر مصنف حقیقت کی درستی میں اتنا لاپرواہ ضرور پیدا کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کی سطح ذہن پر ان کی تحریر کا سفینہ غیر ضروری جھکڑوں کے بغیر گزر جائے۔ خدیجہ مستور اس بارے میں پڑھنے والے سے بہت کم مبالغہ کرتی ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں ان کی یہ ہٹ دھرمی اور سچی واضح اس لئے ہے کہ انہوں نے سچ بولنے کے لئے موضوع بھی ایسا تلاش کیا جس کے متعلق ہم ہمیشہ سے جھوٹ سننے کے عادی ہیں۔ یعنی عورت مرد کے جنسی تعلقات اور محسوسات، اس معاملے میں وہ والڈ وائٹڈ وغایا زبناں اور ریہا کار باں جو مرد و عورت ہمیشہ ایک دوسرے سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ہماری ذہنی عین باقی اور سماجی زندگی میں اس قدیم عورت جو ہمیں کہ ان کی پروردہ درسی مشکل بھی ہے مقبول بھی۔ خدیجہ مستور نے اس بارے میں بہت سفاکی سے کام لیا ہے، جس کے لئے

غائباً مرد عورت میں سے کوئی بھی ان کا شکر گزار نہ ہوگا۔ لیکن اس سفاکی کے باوجود ان کے افسانوں میں درشتی، مردم بیزاری اور انسان دشمنی کا تاثر ذیاب قریب لاپید ہے اس لئے ناہید ہے کہ خدیجہ مستور کو انسانی دکھ اور مصیبت سے بہت لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کی وجہ سے ”بورجھار“ اور ”چندر روزادر“ کے جملہ افسانے ایک خاص نوع کے سوز اور رقت کا احاس دلاتے ہیں۔ یہی خدیجہ مستور کے افسانوں کی دوسری خوبی ہے۔ جنسی معاملات کی منظر کشی میں بھی ان کی نظر لذت کے کسی پہلو کی بجائے ہیئہ دکھ کے کسی پہلو پر پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنسی افسانے واقعت کے باوجود عریاں نہیں ہیں۔ اور ان کا صحیح مقصود جسم و دل سے مجبور و غفلت، سمدردی ہے۔ ان کا استہزاء نہیں ہے۔

اس سوز اور ہمدردی کا اظہار مختلف عام طور سے دو طرح کرتی ہیں پہلی بات یہ ہے کہ خدیجہ کے افسانوں کا منظر عام طور سے نیچے دیے یا چھوٹے مفلس طبقوں کے کھٹے ہوئے فلاکت زدہ گھر ہوتے ہیں۔ اور انہیں طبقوں سے ان کے بیشتر افراد تعلق رکھتے ہیں۔ بمبوک، بے بسی، ناداری اور بے مروت سامانی کا یہ مستقل پس منظر، افسانوی افراد کی چال ڈھال اور افعال و اعمال میں اس طرح جھلکتا رہتا ہے کہ ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے سمدردی کیلئے بغیر نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنفہ ان کوتاہیوں کو بے نقاب کرنے میں کسی پر حکم بن کر نہیں پہنچتیں، نہ ان سے کبھی نفرت اور بیزاری کا اظہار کر کرتی ہیں۔ عام طور سے وہ عورت مرد کے جنسی اخلاق کو سماجی ماحول سے انتہا مروط ضرور کر دیتی ہیں کہ اپنے افعال کے لئے اذرا کی ذمہ داری بہت حد تک کم چھاتی ہے۔

نچوڑے مستور کے افسانوں کی قریب ہی خصوصیت جزئیات سے ان کا شغف ہے۔ وہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ۔ شاید اسی مناسبت سے ان کی ابتدائی کہانیوں کا ظرف بھی محدود ہے، محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے دور بین سے کسی وسیع منظر کو سامنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ خوب سے ایک نقطے کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خوبی بھی ہے اور خرابی بھی خوبی اس لئے کہ یہ طریقہ افسانہ نگار کے موضوع کے لئے نسبتاً زیادہ موزوں ہے خرابی اس لئے کہ اس سے بڑھنے والے کو کٹا دے دل دوتا کا احساس نہیں ہوتا جو ادب عالیہ کی سب سے اہم و دلچسپ ہوا کرتی ہے، جزئیات نگاری بیشتر زبان و بیان کی چابکدستی یا انحصار رکھتی ہے اور اس میدان میں خدیجہ مستور یقیناً مال رکھتی ہیں۔ ان میں ہماری چند اور معروف لکھنے والیوں کی سی چمک اور تیکھ پن تو ہے ان کی کسی ایک رنگی اور اترا ہٹ نہیں ہے۔

ان میں سے بیشتر باتیں خدیجہ کے لئے ادھر پر لئے افسانوں میں مشترک ہیں۔ واقعیت یا یوں کہئے کہ پروہ درمی کا شوق جیسا انہیں پہلے تھا اب بھی ہے۔ ان کے افراد اب بھی مجبور اور بے کس مخلوق میں سے ہیں جو پیٹے تھے۔ تفصیلات اور جزئیات کو اجاگر کرنے میں اب بھی ان کی ہنگامہ وسیع ہے، زور دے ہے لیکن اب ان کے سماجی اور فنی تصور میں پہلے سے نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اب انہیں محض جنسی جبر و ستم، محض حیوانی فریب اور راکار، محض نجی انجمنوں اور گھرمیلو سازشوں کے علاوہ ان بنیادی حقائق سے بھی آشنا ہو چکی ہے، جن کی وجہ سے جلد ذہنی، جذباتی اور سماجی امراض پیدا ہوتے ہیں وہ اسباب جو مرد کو ظالم اور ہوسناک، عورت کو محکوم اور مظلوم، گھروں کو تاریک اور بے رونق، گھر والوں کو جھگڑوں اور خود غرض بناتے ہیں۔ محض افراد کے تجزیہ اور مطالعے سے سمجھ اور سمجھائے نہیں جاسکتے۔ اس لئے کہ ان کی جڑیں کسی جنموں سماجی نظام اور طبقاتی تربیت میں پیوست ہوئی ہیں۔

”چند روز اور“ میں مصنف نے انہی زیادہ اور وسیع تر مسائل کی طرف رجوع کیا ہے جو لائق ارقا کی اگلی منزل سے طلباتی تعلقات اور ان کے سیاسی نتائج یعنی امن، جنگ، فسادات، لعیش اور ناداری، شقاوت اور خلوص اذاد اور واقعات کو کس طرح مختلف صورتوں میں مرتب کرتے ہیں۔ ”چند روز اور“ کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خدیر مستور کو اس نئے مواد کی تلاش تلاش میں ابھی اتنا ملکہ پیدا نہیں ہوا۔ جتنا انھیں اپنے ابتدائی موضوعات پر ہے اس لئے انہیں کبھی کبھی واقعات سے ہٹ کر تفسیر و تشریح سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر فرقہ وارانہ فساد کا المیہ ”میںوں نے چلے بابلا“ میں افسانوی واقعات بذکر کسی تشریح کے نہایت موثر طور سے واضح ہوتے ہیں، لیکن ”ٹانک ٹوٹے“ میں بھی کچھ بتانے کے لطیف طبعی مبالغوں سے کام لینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے فنی نگہیوں کی طرح کہانی کی حرکت اور رفتار رک جاتی ہے۔ اس طرح ان افسانوں میں فلکات زدہ طبیعت کی جدید حیات کا سوز اور دکھ بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے، لیکن اس جذبہ کشاکش کو ادھر سبلاں ٹھیک نہیں دکھائی دیتا۔

ان بنیادی مسائل سے مکمل فنی اور فنی تطبیق پیدا کرنے کے لئے خلوص، وقت اور محنت تینوں درکار ہوتے ہیں خلوص موجود ہے (جو ”چند روز اور“ میں لائقاً موجود ہے) تو فن کی باقی منازل تک پہنچنے کے لئے مہمزن رہنا ہی کافی ہے۔ اس لئے اسد اوجب کے شاہدین نہ صرف افسانوں کے اس مجموعے سے اپنے دیرینہ تجسس کی تسکین پائیں گے، بلکہ خدیر مستور کے اگلے مجموعے کا ادبی تجسس سے انتظار کریں گے۔

(دوسرا ”چند روز اور“ از خدیر مستور)۔

ایکے کیا دکا رتقرر۔ (صفحہ ۶۹۶ سے آگے)

دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب دن کو تسخیر کائنات کو چلو۔ جہاں جگہ کوئی تنگی نہیں ہے۔ جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں لا محدود فضا تباہی اور ان گنت دنیا میں بجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور دشمنوں کے وجود ہم وگ اپنی انسانی برادری سے بیات منوا کر دین گئے بجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہمارے نہیں بھائی اب بھی فتح یا بھوک رہے گی۔ اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کمزورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنیاد ہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی۔

خلل پذیر بود ہر سب کا بی بی

مگر ہائے محبت کہ خالی نہ خلعت (دوست تہر سنگ، فروری ۱۹۶۹ء)

شعور میں اظہار اور ترجائے (صفحہ ۶۹۹ سے آگے)

تصویریں پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں لیکن زندگی کے نیپ دی تجربات اور جذبات نہیں بدلتے۔ اگر تاعلم ان کا کامیاب ترجمانی کی ہے تو ان اشعار کی قیمت وقت اور مقام کی پابندی نہیں۔ مگر یہ سب دلیلیں رو کر دی جائیں تو بھی ہم یہی کہیں گے کہ اگر غالب کو اس عہد میں اور نہیں ملی تو اس وجہ سے کہ لوگ اس کے اشعار سمجھ نہیں سکے اور ہم اسے داودیت ہی تو اس وجہ سے کہ ہم اس کے اشعار سمجھ سکتے ہیں۔ معیار پھر بھی ایک رہا اگرچہ اس کے دائرہ اور وسعت میں تبدیلی واقع ہو گئی اس لیے آپ کے اچھے شعر باہمی نظر کی کامیابی ہے کہ اس کا قصور نہ ہوتے قانون تک سہولت اور ہمدردی سے پہونچنے تاکہ وہ اسے سمجھ سکیں۔ اس سے قاتر ہر سکیں اور لہنے قاتر کو داوی صورت میں خاور ملک پہونچائیں۔

فیض احمد فیض

سُچھ رَاگ لے نَگے بَار سِیئے

فنون لطیفہ میں سے صرف موسیقی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ خواص و عوام اس کے رسیا ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور سچا رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اس سے منظر حاصل کرتے ہیں۔ مگر اردو زبان میں علم موسیقی کی کتابوں کی، خصوصاً ننگ کی ہے، اور جس موضوع پر عنایت الہی ملک نے قلم اٹھایا ہے اس پر تو اردو میں کوئی کتاب شاید ہی نہیں۔ یہ مختصر سی کتاب بھی اس بہت بڑی کمی کو کما حقہ پورا نہیں کر سکتی۔ البتہ قلمانی کے دلوں میں مسلم موسیقی سے متعلق کچھ جاننے اور کچھ سمجھنے کا احساس ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالت میں یہ بھی موسیقی کی (اردو) واسطہ طور سے اردو زبان کی بھی کوئی معمولی خدمت نہیں ہے۔

مصنف نے رَاگ رنگ میں نہ علم موسیقی کا کوئی خاکہ پیش کیا ہے۔ نہ تحقیق کے سمندر کھنگالے ہیں اور نہ ہی ان کے مد نظر کانگولوں کا عکاسہ تھا۔ انھوں نے صرف آتنا کیا ہے کہ آسان زبان میں روایتی اور وضاحت کے ساتھ موسیقی میں گزشتہ ایک صدی کی روایات و تجربات کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس امر کا التزام رکھا ہے کہ یہ جائزہ ہر لحاظ سے غیر جانبدارانہ ہو۔ اس کے علاوہ چند ایک مضامین میں موسیقی کے تعارفی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مصنف نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنے لئے ایک حد مقرر کر لی۔ بصورت دیگر ایک مختصر سی کتاب میں موسیقی کے وسیع علم کے تمام مباحث کو بیٹے کا نتیجہ یہ نکالنا کہ قارئین پہلے سے بھی زیادہ الجھ جاتے۔

یوں سمجھ لیئے کہ مستقبل کے لئے یہ کتاب خام مواد کا کام دے گی۔ اور اس مضبوط بنیاد پر تنقید و تحقیق کے بڑے بڑے تصورات کئے جاسکیں گے۔ اس کتاب کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مستقبل کے قاری کو ہمارے دور کی موسیقی کے بارے میں مستند معلومات حاصل ہوں گے اور اسے معلوم ہو سکے گا کہ اس دور میں اس فن نے کہاں تک ترقی کا قیام کیا۔ اس میں کیا کی تفرقات رونما ہونے والے تھے۔ اس دور کے بڑے بڑے گائیڈ کون تھے۔ اور انھوں نے اس فن کو اپنی انفرادیت اور اپنے اسلوب سے کس کس نادیدے سے متاثر کیا۔

(مزید رَاگ رنگ از عنایت الہی ملک کلکتہ)

تیس سال کے بعد

نقشِ حقیقی

کا

نیا ایڈیشن نہایت آب و تاب اور رعنائی سے شائع کیا گیا ہے

یہ ایڈیشن تصاویر کی ندرت، حسنِ طبعیت، سائز، کاغذ، جلد، ضخامت کے اعتبار سے پہلے ایڈیشن سے بالکل مختلف، نہایت جاذبِ نظر اور دلکش ہے۔
چچاٹا ”رہے“ کی رنگینیوں کا بے مثل مرقع ہے۔ اس کی اشاعت پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔

یہ نیا ایڈیشن چھ رنگین تصاویر، سولہ ایک رنگ تصاویر اور تین صفو ہیل سے مزین ہے۔ ہر ایک صفو نقشِ حاشیہ کے ساتھ دور رنگ میں اور تمام متن جگہ میں دلائی کاغذ پر چھپا ہے۔ ”نقاشِ نقشِ ثانی بہرِ کشد زاول“ کی مثال قائم کی گئی ہے۔

”رہے“ اور ”دیکھنے“ کے اس غیر فانی نقش کو دیکھ کر آپ پر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہوگی۔ مصوری کی عظیم النظیر خدمت کے علاوہ اردو ادب اور طباعت کی تنظیم اٹن خدمت انجام دی گئی ہے۔

جلد سنہری نہایت خوب صورت بائبل نما۔ قیمت: ۲۵ روپے

احسن برادرز

لوہار کی گلی۔ لاہور

شاعر مشرق علامہ اقبال کی زندگی اور افکار پر ایک اور
معرکہ اور کتاب ہے

روزگارِ فقیر (جلد دوم)

(مصنف: فقیر سید وحید الدین)

جلد اول کے چھ ایڈیشنوں کے نمایاں مقبولیت کے بعد
جلد دوم دوا سیتی 'ابے و ستا بے' شائع ہو گئی ہے

- علامہ کی بنی زندگی سے متعلق وہ اسرار و رموز جو دنیا سے علم کے سامنے پہلی بار لائے گئے ہیں۔
- کم و بیش آٹھ سو غیر معروف اردو فارسی اشعار جنہیں علامہ کے خاندانی ریکارڈ سے حاصل کیا گیا ہے۔
- "حیات اقبال" تصاویر میں "کتاب کا ایک اچھا نمونہ" جس میں علامہ کی زندگی کے ہر دور سے متعلق ۷۰ ناوروں
نمایاں تصاویر جمع کی گئی ہیں۔
- نفیس آرٹ پیسک پانچ سو صفحات پر تمام کتاب کا عمدہ کتابت اور عکس بلاکوں کے ذریعے دو خوش نما رنگوں میں چھاپی
گئی ہے۔ قیمت جلد دوم - ۱۶ روپے جلد اول ۵۰/۷ روپے

رسولِ کریم صلیم اور خلفائے راشدین کے مبارک
حالاتِ زندگی کا جگہ مع و دلکش مرقعِ اردو زبان میں
پندرہ ہزار جلدوں کے چھ ایڈیشنوں کی مقبولیت کے بعد

انگریزی، عربی، سندھی، گجراتی، پشتو
اور ہنگامی ترجمے بھی شائع کر دیئے گئے

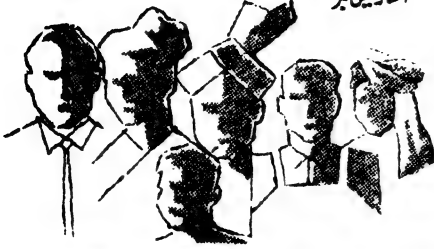
محسنِ اعظم اور محسنین

(فقیر سید وحید الدین)
قیمت: فی جلد پانچ روپے

مطالعہ کا پتہ

لائسنس آرٹ پریس لمیٹڈ، منیر روڈ، کراچی۔ فون نمبر ۳۲۱۵۷

انکائیٹنمبر



آپ کوئی بھی ہوں



کہیں بھی ہوں



کچھ بھی پس انداز کریں

آپ کے لئے
پوسٹ آفسیونگ بینک
میں ساری سہولتیں موجود ہیں

آپ کم سے کم ۲ روپے سے اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں اور اس کے بعد کم سے کم ایک روپیہ نکلوا یا جمع کرا سکتے ہیں عام ڈپازٹ پر ۶ فیصدی اور ایک دو یا تین سال کے میعاد ڈپازٹ پر ۳ فیصدی ۳ فیصدی اور ۳ فیصدی منافع ملتا ہے۔ منافع پر ٹیکس محاسبہ ہے۔

آپ اپنے ہیڈ پوسٹ آفس کے طبقے میں
کسی بھی ڈاکخانہ سے روپیہ نکلوا سکتے ہیں

پوسٹ آفس

سیونگ بینک

افکار - فیض نمبر

Subdued Elegance...!!!

double **2** two



Tetoron



SHIRTS

an ideal blend of...

65% POLYESTER

35% EGYPTIAN COTTON

(IMPORTED FABRIC)

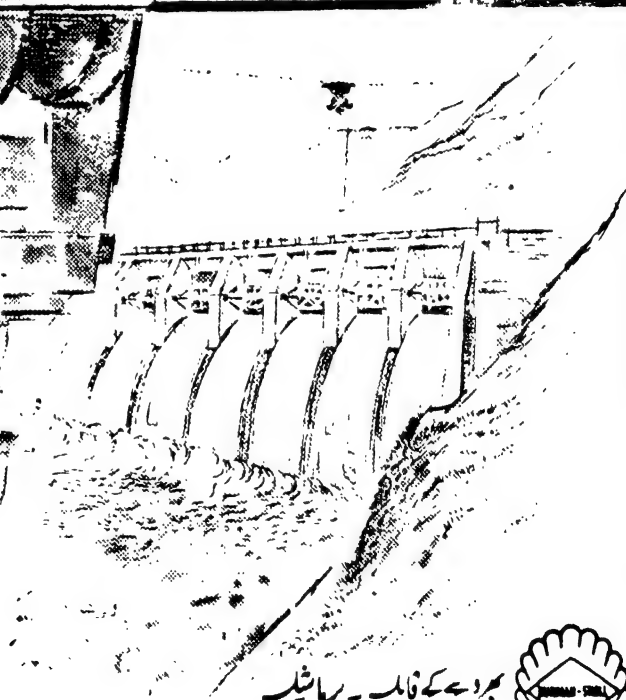
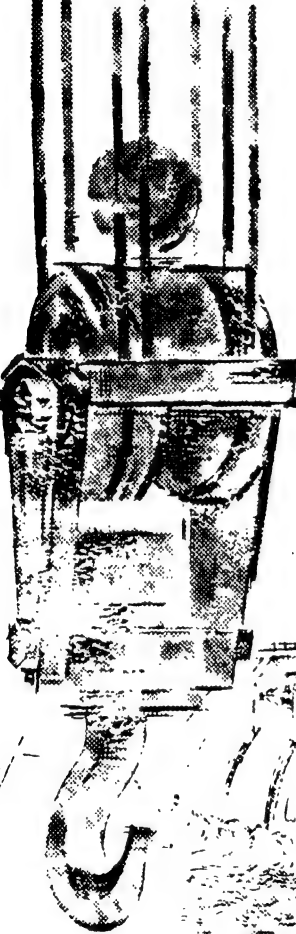
KARIM'S TETORON Shirts are
distinctive and stands clearly
apart - amidst the contemporary ones .



**KARIM SILK MILLS LTD.
KARACHI**

ترقی میں دوش بدوش

تیل کیا ہے؟ روشنی اور توانائی۔ روشنی اور توانائی ترقی و خوشحالی کا منبع ہیں۔
توانائی کو عظیم قوت میں منتقل کرنے اور دور در تک روشنی پہنچانے کے لئے
بندقیسر کے جاتے ہیں۔ وارمک بند پاکستان کی زبردست ترقی کا مظہر ہے۔ اسے
وجود میں لانے کے لئے برما شیل کے تیل سے چلنے والی میسین مشینیں راست
ون معروف رہیں۔ اور اب وارمک کے بعد مگلا بند کی تعمیر شروع ہو گئی ہے
اس عظیم بند کی تعمیر کے لئے بھی برما شیل ہی تیل فراہم کر رہی ہے
برما شیل کو سب سے پہلے طور پر فیسر ہے کہ وہ ترقی و خوشحالی کے ان عظیم
منصوبوں میں پاکستانی عوام کے دوش بدوش ہے۔



بمروہ کے قابل۔ برما شیل



افکار - فیض نمبر

سازگی اور بھار کے لئے

سیندر دھونے کیلئے

بہر مقصد کے لئے

موزوں اور بہترین

صابن

جراثیم اور بیماریوں کی روک ٹوک کے لئے

مبلر اور پینکٹا دھونے کیلئے

میہنات کے لئے مثالی

عہدہ بہتر اور بہترین

صابنوں میں ایک سے ایک بہتر سلسلہ

ہم آپ کی خدمت میں دھونے اور نہانے کے معیاری صابنوں کا سیٹ پیش کرتے ہیں۔
جنہیں حفظانِ صحت کے جدید ترین اصولوں پر تیار کیا جاتا ہے۔

ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ

افکار - فیض نمبر



مجھے تو ٹو فلاورز
کی خوشبو
بے حد پسند ہے

ٹو فلاورز

چاکلیٹی رنگ کے خوشبودار سیگریٹ

سنٹرل ٹوبیکو کارپوریشن

CTC-4/65

Crescent

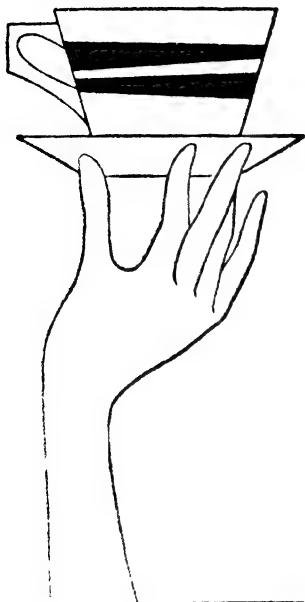
سرم مارچ مارچ ۱۹۶۵ء

آج سے ایک راج صدی پہلے سرم مارچ شہر کو ہر تعمیر کے مسلمانوں نے اپنے
لئے مبدعہ و وطن پاک سرزمین حاصل کرنے کا نام کیا سات برس کی
مسل جدوجہد کے بعد ان کے نصب العین پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

آج قارہہ پاکستان کی پیسیو میں ساحرہ پرنی نوادہ آدم جی قیام پاکستان
کی جدوجہد میں حق لینے والوں اور پاکستان کو عظمت کی بندلیوں پر پہنچانے والوں
نچا بدوں کو حشران عقیدت پیش کرتے ہیں۔

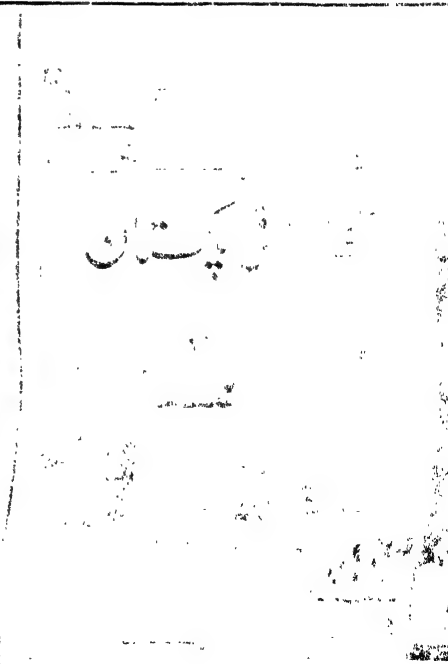


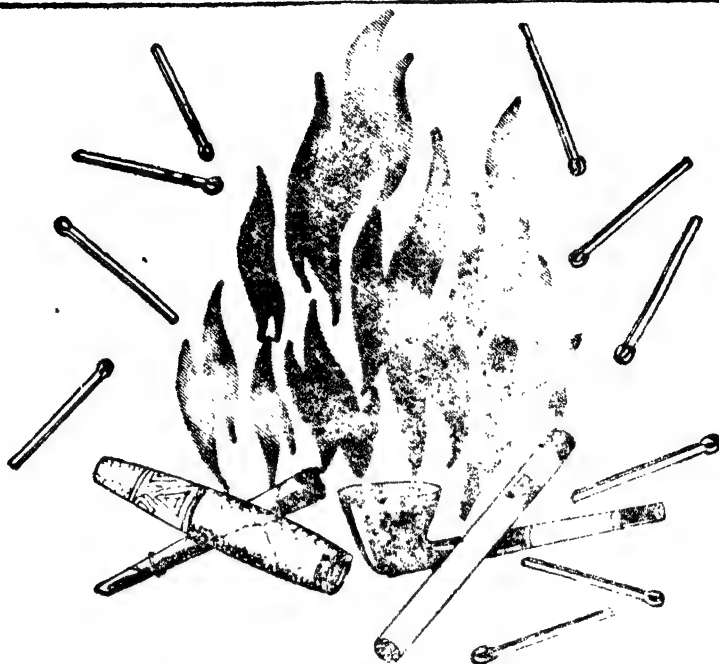
نوادہ آدم جی پاکستان کی ترقی اور خوشحالی میں برابر کے شریک



پین

کے معنی
عمدہ چائے





A TINY MAGIC WAND

That dispels the gloom and
engulf the darkness. Brings
flaming warmth and happy
brightness amid frustration and
chaos.



FAIR MATCHES

ARE NON-FAILING



CHOOSE A BRAND NOW FROM A LONG RANGE

HABIB INDUSTRIES LIMITED

DACCA

تحفہ ہو تو ایسا ہو..



کہ ہر تقرب اور موقع کو زیب دے اور جسے دیکھتی ہی طبیعت کھلا دے
ایسے تحفہ کیسے ویسٹ اینڈ واچ
کا انتخاب عین موزوں ہے

ویسٹ اینڈ واچ سوئٹزرلینڈ کے ماہر گھڑی سازوں کی
کاریگری کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ دقتی اور نفاست
کے علاوہ صحیح وقت دینے میں بھی لا جواب ہے
جی ہاں! آپ بھی دل موہ لینے والی
ویسٹ اینڈ واچ ہی کا تحفہ پیش کیجئے۔



ویسٹ اینڈ واچ کمپنی

پاکستان میں واحد تقسیم کنندگان: کامریڈ واچ کمپنی، کراچی۔ دھاکہ

روشنیوں کا ستار

بنا ہے اسے کھڑک پیچھ رویشولہ کا شہر

- بُک سیرِ فیض
- ★ فیضِ صاحبِ اوریں
- مرے دریچے میں
- ★ نثار میں تری لگیوں پہ !
- سارے فاصلے میں جس کا ذکر نہیں
- ★ تاریک راہوں میں مارے گئے
- دروازے گا دے پاؤں
- ★ فدا وہ وقت نہ لائے

ایراہیم جلیس

بکٹیلر فیض

دوستو آؤ جن کے دیجیں گے

فیض صاحب کتاب بیچیں گے

وہ فیض احمد فیض، شیر علی لب، خوشبوئے دہن، اشادائی دل اور تفریح نظر، انقیب شاہ، فیض احمد فیض۔

وہ فیض

جس سے سنت منصور و قیس زندہ ہے۔

وہ فیض

جس سے باقی جہاں میں کچ بکھی

دم سے بے کوسے جہاں میں اب بھی بخیل

وہ فیض جس کے

عبائے شیخ و تہائے امیر و تاج شہی

وہ نیم، جو کبھی "تہا پس زنداں تھا" آج بیٹھا سر باز دار ہے، تاکہ

اے مکنتہ کھنڈہ _____ ترا کا روبرو بارے

پاکستان! اردو کے رستہ اتنی دلائل و گلاں لے پھرتا تو ملک کے سب سے زیادہ ذہین ادیب سے زیادہ مظلوم انسانوں، ادیبوں اور شاعروں کو کچھ مہر، انتشار، خواری و نزاری سے کمال حاصل کر کے باعزت اور ایمانسانوں کے شانہ بشانہ کھڑا کیا۔ ان کے اتحاد کی غانہ آبادی کی، اور ان کے کھائے کھانے کے لئے (حوالہ اصلاح و کمنداری)

"ایک دکان کر کے دے دی ہے۔"

مراقب فیض صورت شامراہ و کوئٹہ روڈ پر کتوں کی جواں بکشی دکان ہے پاکستان کے علم نواز ادیب دوست وزیر خزانہ جناب محمد شعیب نے مذہب اس کا اختراع کیا تھا بلکہ اس دکان یار دق کے پہلے خریداری ہی تھے اور شاید یہ محمد شعیب کے ہاتھوں کی برکت ہی ہے کہ دکان کا بجٹ نمبر پلس

ہی جا رہا ہے۔ دکان خوب چمک اٹھی ہے اور پتہ ہی تن سے مع

بڑی دھنوں پر سبے گڈ گڈی دکان

اس دکان سے پہلے ادیب عرف ماسٹر زے رائے تھے۔ اب ماسٹر گلڈ نے ہر ماسٹر کو رائے کے عاویہ

"رائے ماسٹر پبلشر اینڈ بک سیلر"

بھی بنا دیا ہے۔

اب فیض ہوں یا حفیظ انیم جی ازی ہوں یا احمد ندیم قاسمی، ماسٹر لغادہنی ہوں یا انیس، مدین عانی، ہارہ مسرور ہوں یا قندہ، اشد شہا پ۔۔۔۔۔

یہ دل پیچے دلہ، یہ سڑ پیچے دارے، یہ جان پیچے دے قلہ کار کے نعرہ ریز، دکنس مار کے گمنام

یہ مکہ بے گلڈ، سلامت سے تو ادبا

تصنیف و تجارت کو کہہ کر تیرے

واہ سترے حقیقت جان رہی صر

خوب کر رہے ہو گمنام

انبار میں خبر چھی ہے کہ آج سہ پہر میں بیچ رہے ہیں ساری کتابیں۔ فیض صاحب نے ان کے لئے یہ زمانہ اور موقع ہے۔

کے لئے ہے۔ اب فیض صاحب کے وہ مداح اور عشاق جنہوں نے فیض صاحب کو کبھی نہیں دیکھا اور جو فیض صاحب کا غریب و بیمار ہیں، پائیا پائیت ہیں اور ان کے قہقی مستحق سے ان کی تعریف عاقل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ زمانہ اور موقع ہے۔

"دست پا" بھی نو دست خط بھی نو

آنکھوں سے دیکھو تم دست صبا کو

ہوٹوں سے دیکھو تم دست خلوں کو

کیونکہ بقول فیض سے

میرا سراپا ہے اسی آکس ہی ہاتھ تو ہیں

اور کچھ بھی تو نہیں پاس ہی ہاتھ تو ہیں

اب یہ حرف غزل دل میں تبدیل غم دیکھو وہ شاعر فیض بھی بیٹھا ہے۔ وہ دیکھو "بے سیر فیض" کو بیٹھا ہے۔ فیض کو دیکھو، فیض سے ہم کلام

ہوئے اور فیض سے خود "کلام فیض" خریدے بھار بہت سے لوگ جائیں گے وہاں (پونہ، بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس مغرب میں مبتلا جائیں گے۔

وہاں جائیں یا نہ جائیں نہ جائیں کہ جائیں ہم (فیض)

آج فیض اپنی تصنیف کے آبدیدہ باری پتہ ہیں تو کھ حقیقتاً غائب ہری گئے پر مٹیں گے۔ باری باری سب کی باری آئے گی۔ فیض مجازی، احمدی،

قاسمی، جمیل الدین خاں، قلیل شغاف، شوکت صدیقی، انور، ضیاء جالندہری، ابن انشا، ہارہ مسرور، خدیجہ ستور، شاد ۶۱، دہلو، رشکت عثمان

جسیم الدین، فارغ بخاری، ممتاز حسین وغیرہ وغیرہ سب کے سب دکان پر بیٹھ گئے گا، آئیں گے، فرمائش کریں۔
"فیض صاحب! ایک پیکٹ نقش فریادی دیدیجئے۔"

"نسیم حمادی صاحب! ایک کنسرت ناول چاہیئے۔"

"ہاجہ سرور صاحبہ! "جبری پچھ" ایک افسانہ بیک میں دیدیجئے۔"

"مدیم قاسمی صاحب! پانچ میرزائیں تول دیدیجئے۔"

"انشائی! آپ کے پاس "چاندنگ" کی گائیڈ بک ہوگی۔"

"سٹریٹ لانا! ذرا ولایتی شاعری کا سیسل تو دکھائیئے۔"

"ضیا جالندہ صاحبہ! "ڈڈی زار" سے پوری غزل تولئے۔"

عابد، ابراہیم، دوہو، "کی ایک بورہ، تاری اور ایک، پوری گوری دیدیجئے۔"

"شاد احمد دہلوی! آپ! ذرا ایک سیر دل کے چٹارے دار مجاوسے تو بندھ دیئے۔"

امید تو یہی ہے کہ دکان خوب چنے گی، خوب چنگے گی اور ان کے اندر اس دکان کا باں دسا در بھی جایا کرے گا۔

امداد ہے کہ آپ سہ چہرہ ہی اس دکان کی رونق دیکھیں شاعر فیض کو تو بارہا دیکھا ہے، بک سیر فیض، کو آج بک نہیں دیکھا، ذرا دیکھیں
تو سہی کہ ان کی دکان داری کچی ان کا شہزادی کی طرح سے کہ نہیں، دکان پر سنس کھڑا دکان کی طرح بیٹھے ہیں کہ ادھر رکھائے بیٹھے ہیں؟
ان کی دلفروشی اور سہ: دشتی کو تو آڑا لکے اب ذرا ان کی کتب فروشی بھی دیکھیں۔

ہیں ان کی "دست سب" بھی چاہیئے اور "دست خط" بھی۔

بم تو خیر: "کے پرلئے" بندہ بے دام" ہیں، اس لئے اگر انہوں نے "دام" مانگے تو ہم یہ شکوہ ضرور کریں گے کہ

اے فیض اپنی وضع تجارت تو دیکھئے

دیوان بیچتے ہیں تو بے دام کیوں نہیں

ابن النشا

فیضِ امین

بڑے لوگوں کے دوستوں اور ہم علیوں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دوستی اور ہم جیسی کا استنبہار دے کر خود بھی ناموری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ بجز خود کوئی کے سچے جو شہرت سے بے رغبت ہیں کم از کم اپنے محدود کائنات میں۔ ہاں اس پر بعد رسالوں کے ایڈیٹروں کے پرزور اصرار پر انھیں اپنے تعلقات کو اہم اشرع کرنے والے خود دوسری بات ہے ڈاکٹر فقیر الدین کا کیسے۔ جیسے اور پر وقصیر ہوتے ہیں ویسے ہی یہ تھے۔ لوگ فقط اتنا جانتے تھے کہ علامہ انبیاء کے ہاں مفت بیٹھے تھے۔ سو یہ بھی کوئی نئے دھبے کی بات نہیں۔ یہ انکشاف علامہ کے انتقال کے بعد ہوا کہ جب کوئی فلسفے کا دقیق مرشد ان کی سمجھ میں نہ آتا تو انہی سے رچو بھر کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر فقیر الدین نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز ادھی رات کو میں بونک کر اٹھا اور کربا بند سے جھانک کر تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ میرور کا خادم غاس علی بخش ہے۔ میں نے پوچھا۔ فہریت تو ہے۔ بولا علامہ صاحب نے یا در بایا ہے۔ میں نے کہا اس وقت؟ بولا جی ہاں اس وقت اور تاکید کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آنا میں حاضر ہوا تو اپنے لفافے میں جگہ دی اور فرمایا۔ آج ایک صاحب نے گفتگو میں رازی کا ذکر کیا۔ تم جانتے ہو میں تو شاعر آدمی ہوں۔ آذریا کیا پڑھوں؟ اس وقت یہ پوچھنے کو تکلیف دی ہے کہ یہ رازی کون صاحب تھے۔ اور ان کا فلسفہ کیا تھا؟ میں دل ہی دل میں ہنسا کہ وہ کچھ والد والے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ بہر حال اقبال ارشاد میں نے امام فخر الدین رازی اور ان کے مکتب فکر کا میر حاصل احاطہ کیا اور اب رت چاہی۔ علامہ صاحب دروازے تک آئے اور آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔ ادھر کہا "تم نے میری شکل آسن کر دی۔ اب اس شہر میں اور کون رہ گیا ہے۔ جس سے کچھ پوچھ سکوں۔"

اُٹی اتوار بونیز مندار کا پرچہ کھولا تو صفحہ اول پر علامہ موصوف کی نظم تھی جس میں وہ مصرع ہے :-

مزین اگرچہ میں رازی کے کتے ہائے دقیق

اگرچہ میں نے واضح کر دیا تھا کہ رازی کا فلسفہ خاموشی یا افتادہ ہے۔ دقیق بزرگ نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ مگر مریم کو ایسا ہی معلوم ہوا۔

مدرسہ علمیہ شرمیہ ممبئی دروازہ کے پرنسپل مرزا الشدہ خیال نے جو چھ ماہ میں میٹرک اور دو سال میں بی۔ اے پاس

کرائے کی کارٹھی لیتے ہیں۔ ہاتھانہ تصویر تیاں میں پہلی بار اس بات کا اعتراف کیا کہ علامہ مرحوم کو شہزی مولانا دم کے بعض مقامات میں الجھن ہوتی تو مجھے یاد دلاتے تھے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ منشی فاضل کیوں نہیں کر لیتے۔ تمام علوم آپ کے لئے پائی ہو جائیں گے۔ بولے اس عمر میں اتنی محنت شاق نہیں کر سکتا۔ "بعد میں میں نے سوچا کہ واقعی شہزادہ امیر الرحمن ہوتے ہیں۔ ان کو علم اور سیر پر کچھ ہیلوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ تو ہم جیسے سرسبزوں کا کام ہے۔

علامہ کے ایک ہمراہ دوست رجسٹرار قزوین پوری کو بھی لوگ ٹوشہ گمانی سے نکال لائے۔ ایک بصیرت افروز مضمون میں آپ نے لکھا تھا کہ سارے اپنے لئے شاعری کو کبھی در بدر عزت نہیں جاتا۔ بزرگ ہمیشہ سچے سچے مندی کرتے آئے تھے۔ اس میں حنا نے مجھے برکت دی چونکہ ہوتا ہوا کام نہیں ارجحال کرتا تھا۔ علامہ صاحب کی نذر کر دیتا تھا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ مغلانہ جزیرہ وغیرہ کتابوں میں سینکڑوں ہی مصرعے جو اس میدان کے بچ زبان نے علامہ کے ٹکڑا کر رکھے تھے۔ گینوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ حکیم درازی مصنف طب البقاعی نے کائناتہ صبح و شام کو انٹرویو دیا تو بتایا کہ ایک زمانہ میں حکیم الامت کو کبھی غیب کا شوق ہوا۔ بندہ سن کر گھبرا گیا اور علامہ مرحوم پر مایاں بنائے۔ اور جو شانہ سے کوٹے چھانٹتے۔ اس دوران ان کو فکر سخن میں ترقی ہو چکے تو کبھی کبھی ہاؤن دسٹے میں اپنا انگوٹھا سچوڑ بیٹھے۔ دوسرے روز عقیدہ مند پوچھتے کہ یہ کیا ہوا تو فقط مسکرا کر انشت شہادت آسمان کی طرف بلند کر دیتے۔

عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ علامہ مرحوم عمر کے آخری سالوں میں کہو تر بازی اور پہلوانی پسند کرتے تھے۔ اور سبب دھمے لڑانے کا شغل بھی ترک کر دیا تھا جیسے صورت حال سے میں معراج الدین گوجر الودائی نے رسالہ غزل الغزلات کے اقبال بنر میں پردہ اٹھایا۔ پھر علامہ مرحوم کے احوال میں اکثر ایسا ہے کہ فلاں بات سنی اور آبدیدہ ہوئے۔ فلاں ذکر ہوا اور آنسوؤں کا تار بند ہو گیا۔ اس کا سبب بھی علامہ مرحوم کے ایک اور قریبی دوست ڈاکٹر عین الدین مامر ارمینی چٹم نے لکھ دیا۔

اسی زمرے میں ڈاکٹر محمد موسیٰ پرنسپل بانگ درا موسیو میتھک کالج گڑھی شاہ کو رکھے۔ جنہوں نے علامہ اقبال مرحوم کی زندگی کے ایک اور غیر معروف گوشے کو بے نقاب کیا۔ اپنی کتاب "تہلیل اہو موسیقی" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ ڈاکٹر اقبال فقط نام کے ڈاکٹر تھے۔ اس عاجز کا مطالعہ اتنا نہیں کہ ان کے شاعرانہ مقام پر پہنچ سکیں۔ ہاں اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرثیہ کی کٹھن میں اپنے بعد میں نے اپنی کو دیکھا۔ یعنی اوقات دعاؤں کے کھن میں ہی یہ تابیر قدر مشورے دیتے کہ یہ عاجز اپنے تجربہ کی باوجود حیران رہ جاتا۔ بہر حال شاہد تو ہمارے ہاں اب بھی اچھے اچھے پائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک علامہ مرحوم کی وحدت ہو موسیقی طب کے لئے ایک ناقابل نفی نقصان ہے۔ میں مرثیوں پر توجہ دیتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھے حق پیتے رہتے۔ تاہم اس عاجز کے مطلب کی کامیابی میں جو مایوس مرثیوں کی آخری امید گاہ ہے۔ اور جہاں خالص چمن، ادویات، کیفیات، فرہم کی جاتی ہیں ان کے نام نامی کا بڑا دھن تھا۔ جانتے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اپنی ایک مشہور تصنیف کا نام بھی عاجز کے مطلب کے نام پر رکھا۔

فیض صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔ دناہا سداں بدیں سے خالی نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہم نے تو اس شخص کو کبھی فیض صاحب کے پاس اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تو کون ان کا قلم پکڑ سکتا ہے۔ مدیر افکار راہ اندازہ کرتے تو یہ بندہ بھی اپنے گوشہ گمانی میں مست رہتا۔ پھر بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ لکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ آیا یہ لکھنے ہیں یا

یا نہیں۔ مثلاً یہی کہ فیض صاحب جن زمانہ میں پاکستان نامہ کے ایڈیٹر تھے۔ کوئی ادارہ اس وقت تک پریس میں نہ دیتے تھے۔ جب تک مجھے دکھانا سلیقہ نہ ملتا۔ کئی بار عرض کیا کہ ماسٹر ارشد آپ خود اچھی انگریزی کتھ لیتے ہیں۔ لیکن وہ نہ مانتے اور انہیں کوئی لفظ یا نفاذ بدل دیتا تو ایسے مسنون ہوتے کہ خود مجھے شرمناک مہولے ملتی۔ فیض صاحب کے تعاقب سے وہ راقی یاد آتی ہیں جب فیض ہی نہیں بخاری، سالک، خلیفہ عبدالعظیم وغیرہ ہم بھی ہم بیاد وہم نوالہ دوست راوی کے کنارے ٹپتے رہتے۔ اور ساتھ ہی ساتھ علم و ادب کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ یہ حضرات مختلف مذاہبوں سے سوال کرتے اور یہ بندہ اپنی فہم کے مطابق جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتا۔ اور یہ بات تو نسبتاً حال کی ہے کہ ایک روز فیض صاحب نے صبح صبح مجھے آن پڑا۔ اور کہا ایک کام سے آیا ہوں ایک توجہ کرنا چاہتا ہوں کہ یورپ میں آج کل آرٹ کے کیا رجحانات ہیں۔ اور آرٹ میرا کیا چیز ہوتی ہے۔ دوسرے میں واٹر کراؤنٹ پینٹنگ کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پھر یہ اور داد کا فرق بھی چند نقطوں میں بیان کر دیں تو اور چاہے؟ میں نے چائے پیئے پیئے سب کچھ عرض کر دیا۔ اٹھتے اٹھتے پوچھنے لگے۔ ایک اور سوال ہے۔ غالب کس زمانے کا شاعر تھا۔ اور کس زبان میں لکھتا تھا۔ وہ بھی میں نے بتایا۔ اس کے کئی ماہ بعد تک ملاقات نہ ہوئی۔ ہاں اخبار میں پڑھا کہ لاہور میں آرٹ کونسل کے دائرہ گٹر ہوئے ہیں۔

اکثر نونوں کو تعجب ہوتا ہے کہ گفتنی فریادی کا ٹک کلام اور ہے اور فیض صاحب کے بعد کے مجموعوں دست صبا اور زندان نامہ کا اور۔ اب چونکہ اس کا پس منظر راز میں رہا۔ اور بعض حلقوں میں بات پھیل گئی ہے۔ لہذا اسے چھپانے کا کوئی نامہ نہیں۔ فیض صاحب جب جیل گئے ہیں تو ویسے تو ان کو نذرانہ تکلیف نہیں ہوئی لیکن کاغذ قلم ان کو نہیں دیتے تھے۔ اور نہ شعر کہنے کی اجازت تھی۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ان کی آتش نوازی پر قدرتی رے اور لوگ انہیں سمجھوں بھال جائیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں تیرہ گز بندہ تقدیر کند خندہ۔ فیض صاحب جیل سے باہر آئے تو تانکرے کے سید میرے پاس تشریف لائے، اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔ اور تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن سوچنا ہوں میرے ادبی مستقبل کا اب کیا ہوگا؟ میں نے مسکراتے ہوئے میری کڑواہی سے کچھ مسودے نکالے اور کہا یہ میری طرف سے نذر ہیں۔ پڑھتے جاتے تھے اور میرا ہوتے جاتے تھے۔ فرمایا۔ بالکل ہی حیات میرے دل میں آتے تھے۔ لیکن ان کو قلم بند نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے اس خواہش سے نالے کو پانہ نہ کیلئے کہ مجھے اپنا ہی کلام معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا بوزین۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ تم پر جیل میں جو گزرتی تھی اسے میں بیان شیخے شیخے محسوس کر لیتا تھا۔ ورنہ من اکم کہ من داکم۔ بہر حال اب اس کلام کو اپنا ہی سمجھو۔ بلکہ اس میں نے تخلص بھی بٹھارایا ہے۔ اور ہاں نام بھی میں تجویز کرتے دیتا ہوں۔ آدھے کلام کو دست صبا کے نام سے شائع کرو۔ اور آدھے کو زندان نامہ کا نام دو۔ اس پر بھی ان کو تامل رہا۔ بولے یہ برا لگتا ہے کہ ایسا کلام جس پر ایک محب صادق نے اپنا خون جگر لٹایا ہو اپنے نام سے مستوب کروں۔ میں نے کہا فیض ہمارے دنیا میں چراغ ہے چراغ جلتا آیا ہے۔ شیکسپیر بھی کوئی سو لکھوا ہوا ہی کرتا تھا۔ اس سے اس کی عظمت میں کیا فرق آیا۔ اس پر بلا جواب ہوئے اور رفت غار کی ہو گئی۔

فیض صاحب میں ایک اہمیت میں نے دیکھی وہ بڑے ظرف کے آدمی ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے کی پیروی راز انداز کیا کہ مجھ کو ان کا جو کلمہ دوسری طرف جب میں انعام لیکر لے کر آتا ہوں اور آدھے روٹی پرے سلنے دیکھ کر کہیں کس کے اس قدر آپ ہیں۔ اس طرح کے اہمیت سے واقف ہیں جنہیں بیان کرنے میں تو تائب ہو جائے لیکن صبا کے لیے عرض کیا ہاں میں بدین سے مغرب میں اسے بچے تولی میں پڑا رہا ہوں۔ یہ بھی صبا صاحب کا کمال سمجھنے کا امر کر کے یہ چند سطروں پر مجھ سے کہنا چاہیں۔

کوثر چاند پوری

مرے در پہ میلے

اندر گہری تاریکی اور خاموشی تھی اور ہر ایک صبا تک سناٹا ماحول پر مکمل سکوت عازم تھا جس کے نتیجے میں وہ ان کو دیکھ لیتا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے ابھی ابھی اخبار فروش پر ڈال دیا تھا وہ اتنا بے چارہ ہے اداریوں سے لگتا تھا جیسا کہ وہ ان کے ہاتھوں سے بچھڑے ہوئے تھے ایک طرف مظلوم کے حلق سے چپیلیں بلند کرتے تھے۔ دوسری طرف مسکراتے انداز میں وہ بار بار اوڑھ کر ٹھکرا کر جواز ادا کر لیا کرتا تھا۔ یہی ثابت کرنے کے لئے وہ ٹانگیں پیش کرتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ بت دوں کہ وہ بے گناہ اور آزاد ہے۔ وہ خود ہی نہ رہے اور زندگی سارے جہانوں سے آزاد ہو کر مسرت کا ایک دل افروز لمحہ بن جائے۔ یا پھر حیات کی یہ لوٹری جس میں وہ مقید ہے اور اس میں ہر آدمی ہار گیا ہے۔ اتنی چیزیں بے گناہ کو پوری کشتیاں اس میں سما جائیں گی جسے وہ اپنی دنیا کہتا اور سمجھتا تھا۔ اب بھی ایک وسیع و عریض جہان نہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ جس میں بات کرنے کی آزادی نہ تھی اور محبت کا جبر سنا سن لیتی تھی اسی وجہ سے وہ دورانی اور صنعت آمیز تحریروں سے بہت زیادہ جڑ گئے تھے۔ حالانکہ وہ ان کے ہنگامہ آساں کی عادت میں نہ تھا۔ اخبار پھینک کر وہ اس گھٹا ٹوٹ اندھیرے کو ہاتھ لے رہا تھا۔ اس میں کوئی تشبیہ نہ تھی۔ ڈھونڈ رہا تھا۔ جس میں صبح کا نور ہو۔ صبح جو اس کے نزدیک یقینی تھی اور اس کے سبب گزیدہ سحر کے بعد نئے درخشاں ہونے والی تھی جس نے دنیا بھر کو سمیرنا پسینے کے کوہنڈے سے رہا تھا اور اس کے ہاتھ والی اصلی لہجہ کا تصور کرتے کرتے وہ اپنے نوجوان ساتھیوں کی دائمی جدائی پر آنسو بہانے لگا تھا۔ بے آنسو رنج کے تئیں تھے۔ غم اور بیزاری بھی ان میں نہیں تھی۔ بس مہبت اور محبت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے ماحول سے بیزار تھا اور خفا بھی اور کھیر سے بدل ڈالنا چاہتا تھا۔ تلوار کو وہ قلم پر ترجیح نہ دیتا تھا۔ اس نے اپنا اور تہذیب کی باتیں بھی لکھتے تھے۔ اپنی انگلیاں ڈنگار کر ڈالتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قلم پر بھی لکھتی تھیں۔ یہی جگہ جگہ سولہویں پر لکھے نظر آ رہے تھے۔ ان کے کپڑے خون آلود تھے زبانی باہر نکل آئی تھیں جیسے زنگ کی گانگ لاسٹے ہوئے ہوئے اور مرنے کے بعد بھی چپ رہنا پسند نہ کرتے ہوں، یہی باہر نکل ہوئی ہے جان زبانی ان کی فریادیں تھیں۔ وہ اپنے ہی خون کی جرات سے بھر جی لگتا چاہتے تھے۔ یہ عزیمت اور یہ خوش رنجی دس روز تئیں کی گویوں اور لائیوں کا نشانہ بنے تھے۔ اور ان

کی ناشی کے پاس ہی گھڑی تھی اور لایا وناغ کے ماسرے، انبار سوسکے پرلے تے۔ اس کا منہ بند تھا اور زخم کے لموں پر خون کی بوندوں نے مہر لگا دکھا تھی۔ اس میں بسنے کی مست نہ پا کر کٹرین رو پڑی۔ اسے اپنی زندگی پانی کا ایک بلبہ معلوم ہوئی وہ سوچنے لگی۔

کیا میں ایسی اسے اٹھا سکتی ہوں ؟

وہ سوچ کر رہ گئی۔ وہ بادل کے نشان کنیز آستیانہ کی محبت پر دائر کرتے ہوئے پیاسے ٹھکے کی مانند راستے اڑتے نہ جانت کہ ان غائب ہو گئی۔ اور اسی وقت وہ چند پرورش نوجوانوں کے جھرمٹ میں بندوقوں کے سانے اٹکے، اور جیسے کاغذ لٹکان کر زمین پر گرنے لگے، ان کے مرنے پر کچھ چلے گئے۔ اس کی آنکھوں پر لائے والی ٹیس کی دھندہ تھی، اور اس کے پیچھے شعلوں کی زبانیں دھکی رہی تھیں۔ انھوں نے وہ لقمہ پوری کر لیا تھا کہ اسے زبردستی اٹھا کر دوا میں ڈال دیا گیا۔ اس نے بہت کمپن سینے سے فیکوں کو کھینچا تھا، جبکہ اس کے ساتھ مڑا پاتا ہوا ہمارے خون سے کل رہا تھا میں رائیوں کے آگے گئی تھیں، ان کی آنکھوں سے رسی۔۔۔ اور اب وہ ٹیل بن گئے تھے۔ جس کی دلیاریں جھمک رہی تھیں، ان کے اوپر کدے رسیوں سے گھسے گھسے منجھٹ بڑا دیں، ان کی ٹانگیں تھاریں ہوں وہ ان واقعوں میں کبھی نظر نہ آئے تھے، وہ اب جا تھا۔ ان کے اچھا نہ تھا، کچھ تھیں، ان کے لئے چھوٹا سا پلٹا تھا۔ بار بار وہ ان آنکھوں کو دیکھ کر رات کی طرح رات بھر اٹھتا تھا، ان کی جوتیوں میں وہ روایت کی طرح اپنے لقمے سے تر ڈالتے۔

سزا پر پہنچا، اور وہاں وہ نہیں کے لاشے اس کے ذہن پر یوں بٹیر رہے تھے۔ جیسے، اسان کی جڑوں و سسٹوں میں بنا بر باریجا ر سفید سمجھوڑا رہا ہے، جس کے پیہل میں امن اور دوستی کے پھل بن گئے ہوں۔ وہ ان پر دیکھ کر ہنسنے لگا۔ وہ ان کے دل میں اور جہاں جہاں ہوں، پھر شے کے بعد ہی زندگی کے ہیبت بھل رہے تھے۔ اسی لمحے آہنی سلاخوں کے اس پار کھیا ک ناز کی اور ناموشی پھان تھی، اسے کڑھیل میں سی گھڑی دکھائی دیں۔ اس نے مویا ستا یہ ان سلاخوں کا سایہ ہو چھپا، ان کے سر پر تے۔ اسے کا وجود بھل گیا۔ وہ نہیں ہی تھیں۔ ان کا سلاخوں سے ایک اپنا وجود تھا۔ ان پر اس کے ساتھی سے۔ وہ کسی کی داستان غم و پریشانی تھے، بسنے پر جا رہا، اپنے وقت کے سینے ہوں۔ اس نے صبح کر لیا۔

تم مرنے نہیں ہو ساقیو، اس قربانی کے بعد تم ہی تہہ رات زندہ اور پائندہ رہے جس مقصد کے لئے تم کو بنا کھایا اور منصوبہ کی طرح اٹھائے ہوئے اور دوسری کی جانب ہے۔ وہ کبھی نہیں سکتا۔ وہ بھڑوں کی مہک اور رائیوں پر مسکراتے کو۔۔۔ زندہ کیا ہی ہے وہ سردمان کی تابانی میں ہمیشہ رقص کرتی رہیگی اور ہلائی بھرنے کی مانند گئے بڑھتی جلتے گی۔ وہ دھنسنے، چول آٹھیں جو ابھی ابھی اندھیری فضا میں جھک رہی تھیں ایک دم لال ہو گئیں۔ جیسے ان سے مرنے والوں کا خون ٹپکے والا ہو۔ ان میں شعلات ٹپکنے لگے وہ ان موٹی اور موٹی نما سلاخوں سے خوب بھر کر کھڑا ہو گیا جن کے آگے کھپ اندھیرا اور غماغہ اندھیرا کھپ ہوئی وہ ننگ و ناریک کی گھڑی تھی جس میں لے بند کر دیا گیا تھا۔ اسے سینہ میں دلی بہت زور سے دھک دیتا تھا، جس سے ہوا اور سالن میں تیزی آتی تھی، جگہ جگہ ابھرنے لگی یہ تیرے قریب آتی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک ایک اب کھجوا عاشق کے گریبان کی طرف ابھا پڑا پڑا، سمجھوٹا ہو رہا تھا گویا

کوئی اس کو کھانگوٹھ رہے۔ دوسری ایک خوبصورت چہرہ یوں لپٹا ہوا تھا۔ جیسے چاند بہت اونچی گھوڑے تیر رہا، ایک نور کیا ہوا ایک صلیب پر ایک نوحہ ہوئی شاخ کھنکھانے لگا تھا۔ ایک دوسری تھیں۔ یہیں رست کی رانی کی مہک تھیں۔ سب سے اشتیاق کے ساتھ پیرم رانی تھیں۔ جیسے وہ خوراک پر لٹک جانا چاہتی ہوں۔ اچانک اس نے جیسے غریب، جمال، ارمان، دلہن، خون آلود کپڑے پہنے سلاخوں کے دیوہوں سے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بہ اختیار بول اٹھا۔

۱۰ آواز کی پونگ ہے :

تم تو روزِ آسے دے پہا مناجو۔

تم مسافر روزیہ خواتین بھائی بنے میرے پاس نہیں آتے؟

مہر دہی کسی نے ان شہیدوں کو بہت اونچا اٹھایا وہ حیران ہو کر دھوا دھوا دیکھنے لگا۔ تاریکی میں اسے کچھ دھندلے سے رہا تھا جیسے آئینہ گیسے اس کی نگاہیں بیکار کر دی ہوں۔ سہیل کی اونچی دیواریں چٹانوں کی مانند سرٹاٹے ٹھنڈی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا اس کے سامنے اوپر جہاز کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالیں گے۔ ان کے جسموں میں فرماؤ کی ریت اٹھائی ہے۔ اور پھر کونوں میں تین تین چٹانے آئے ہیں۔ سہیل بھی ہاتھ لگائے کی طرف بڑھ دیتے تاکہ اندھیرے میں پلٹے ہوئی ان لال لال سلیبیوں کو اٹھائے اور نیچے لے آئے۔ جو سہیل اور ٹھنڈی لاشوں کو نہریں دبا کر کھڑی تھا۔

بیتابہ بڑی رہی گپ اندک تابانی اور سورج کی روشنی میں اضافہ نہ ہو گا اور سہیل کے ہونے پوری شوق اور رواق کے ساتھ چل سکیں گے۔ اس کی انگلیاں ٹھنڈی اور موٹا آہنی سلاخوں میں الجھ کر روئندہ اور وہ انہیں پوری طاقت سے نکھینچنے لگا۔ ہوا تیز ہوئی۔ اور سہیل سہیل کرنے لگی۔ دور کوئی آہنا رہا رہا تھا اور اس کی سہلی آواز میں موسیقی میں ڈھل کر اس کے دھڑکنے والے دل سے پیسے کہہ رہی ہوں۔ ان مقتولین کے خون کی سرٹھی اس تاریکی میں اجالا بن کے نکلے دار ہونے والی ہے وہ کائنات کے ہر رنگ کو بھل دے گی!

آج کل ہمارے ہاں یہ نیا رواج چلا ہے کہ ہمارے گھر میں ادب ہیں جو کبھی اچھائی، برائی ہے سب انگریزی کے سر منٹھ دی جاتی ہے گوئی ہمارے ادیب تو اس کا غلط کے اُتو ہیں۔ ادھر انگریزی میں ایسے خبر چھپی ادھر ہمارے ادیبوں نے اندھ دھند نقل کر دی۔ اپنے ادیبوں کے متعلق میرن رائے اتنی گھٹیا نہیں ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جو کچھ سمجھتے ہیں، بیشتر اپنے حالات سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ انگریزی زبان اور انگریزی ادب ہمارے ماحول کا ایک حصہ ضرور ہیں پھر ماحول نہیں ہے۔

فدغیے

یونس بن مزنی

تیار ہیں تیری گیلوں پر

یہ تھوڑا کچھ میری خون آشام آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ رات بے رات گون مگوتم، تب مجھے باہر میں تو کیسی بے توجہ اور بے لگنی ہوئی تھی۔ یہ تھوڑا کچھ میری خون آشام آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ رات بے رات گون مگوتم، تب مجھے باہر میں تو کیسی بے توجہ اور بے لگنی ہوئی تھی۔ یہ تھوڑا کچھ میری خون آشام آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ رات بے رات گون مگوتم، تب مجھے باہر میں تو کیسی بے توجہ اور بے لگنی ہوئی تھی۔

[illegible]

اب یہ جان لیا ہو کہ وہ مجسمہ انوریز بریل کا ہے۔ — میرے ہاتھ میں عین کی لاسٹ پریڈ ہے۔

[illegible]

ملہ کے سلسلے سے یاب جولاں انسانوں کا کارواں گزر رہا ہے۔ ان کے ذہن ستاروں کی مرکز چوک رہے ہیں۔ میں تجسمہ کے سنے منفرد مقرر ہوں۔

سوچنا ہوں آزاد کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ تمام کاغذی اجراء میرے دھوے چل رہے ہیں۔ اور مجھے عبدلی سرگوشی سنائی دے رہی ہے۔ آزادی
پست حوصلہ، اقوام کی قسمت نہیں ہے۔ آزادی صرف سماج کا عقد ہے۔ اور ان کا تقبہ جنگ باہمی خود ہے۔ اور بن کی طرح کا ایک سماج دوسرے
سے جاملتا ہے۔ ہم نوآبادیات کے آقا ہیں۔ نوآبادیات کے لوگ، ان کے مسلمان، ان کے کفر و فساد، ان کی عورتوں کی ہمت، ان کی زندگی، ان کی شہرگ۔ ان
کا خون، ان کی موت، ان کی خوشی پر ہر شے کی قربانی ہے۔ اتنا مالک بھی ہے۔ یہ ایک کاغذی ہے۔ یہ ان کی تھوڑی سی زندگی میں زندگی نہیں ہے۔ زندگی
رنگ کے ان میں۔ رنگ رنگ کے شے ہیں۔ اور یہ رنگ اور بھونچوں۔ انہوں نے مندر کی کتنی چھائی کوئی کرنا نہیں ہے۔ جاس اور بریت پسند
انسانوں سے ٹکر کے رکھا نہیں ہے۔ ان پر تو پانی ہے، اور بے گنہگار کی کہیں نہیں ہے۔ اپنے بے گنہگار کی کہیں نہیں ہے۔ بھلا مومن کی تجارت
کی ہے۔ ان کے ہوسے چراغ اٹھائے گئے دنوں کے اندر بے درد کے ہیں۔ بھیتوں کو جہاں سے ہے۔ اور جہازات کے ذریعے ہمارے بھائی بھائی
بنیے۔ بھائی اپنے *Meerut* کا ٹیوٹر ہے جس نے یہاں تک فرزند نہیں ہے اور جو اس سے بڑا نہیں ہے۔
اور چونکہ انہوں نے یہاں تک فرزند نہیں ہے کہ ان کی قومیت کو دیا تھا، جو تاریخ میں خود کو ایک خاص کام آتی ہے اور
یہ بھائی کی حکومت ایک مرتبے سے لے کر دوسرے مرتبے تک پہنچتی ہے۔

[illegible][illegible]

میرے ارد گرد پہلی سوئی دنیا کتنی دہشت ہے۔ مجھے درماؤں کے نتیجے میں ہاتھ ہونے کی حد تک جیسے کوئی حیرت انگیز خواب دیکھا ہو۔ مجھے ہرگز شب، یہ گیت کہنے آتا ہیں۔ ان میں کون خیر کس کو سکتے۔ مراعت سے نزدیک، مراعت سے پہلے پروا۔ مورتا اور گہری یہ آواز بڑی آوازوں ہے۔ کتنے حیرت انگیز دنیا کے سینہ میں بد وقت کی سٹیجی ہوئی تو میں تندی ہوئی کتنی ہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے نہ ہو گئیں۔ خوبصورت ہونوں پر موت کی جگہ گئی۔ نہیں، آواز تو بھونڈی کی ترنل میں جا بجا رہا کہ ہے۔ جہاں کے ساحل سے لڑائی مٹی ہے۔ آواز کا ستر آوازوں ہے۔ وہ خلا میں کتنی مٹی ہے۔ ہمارے آیت تو ہم ہونوں کا ہوس میں، انھوں کی وہ چمکے جو پیار کے پیچھے احساس پر بہت چمکے سے دگ، کھوئے۔ تنگ کی کوئی بول نہ ہے۔ ایک خوشبو ہے۔ آواز سے کتنی بھی اٹھل پاتھل۔ ایک جیسا موانداز آگیاں احساس ہے۔

میں انھیں ہونٹوں کے لئے گیت سنتا ہوں اور مکھڑا ہونٹوں کا۔ مکھڑا ہر اساقا نہیں ہے۔ آنکھوں سے پھیلتی سرسبز گی کی ہے عمارت، لوگ کھوے کھوے سے ملتے ہیں۔

یہ کس کی تلاش ہے؟

شاید آزادی کی ہاں آزادی بڑی نعمت ہے۔ شُبک کے بادلوں نے طیاروں کی گونگنہ مٹا دیوں

رضیہ فصیح احمد

سارو ساہین کا ذکر نہیں

[illegible][illegible]

پہلے ہی سے یہ بات طرے کی تھی۔ لیکن حج کے گھر اٹھانے ان کے لئے کھٹے سے لے کر طوطوں کے پرانے جڑے تک کی تعریف کی پھر ان کے چوتھائی صدی پرانی فیضیہ کے پرٹ کی تعریف کی۔ اس کے بعد کافی سے ساتھ آنے والی چیزوں کی لذت کو سراہا کافی پینے کے بعد اطمینان سے یہ ذکر چھڑا کہ نئی ممبریے انتہائی تمیز اور بہ لحاظ طبع۔ بیگم کے کچے کھنے سے پیٹ بیگم دسے بڑیگوں کی عزت نہ کرنے کے سلسلے میں مایا چوڑا خطبہ دیا اور بیگم نے کی ہوئے والی جانشین بیگم نے کہا بیگم نے کی ہوئے والی جانشین چوڑا کھانا لیا ٹھکرا ہے اس لئے آئندہ انھیں بیگم جانشین لکھا جائے گا۔ کسی کی عزت کرنے سے کوئی چھوٹا نہیں ہر جانا بلکہ خود اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ ایسی ہی دیکھ کر اس کے کھڑے نہ ہونے سے ہم سب کے دل میں اس کی عزت دو کوڑی کی نہیں رہی ہے۔ بیگم نے اتنے مہربان سے پرورش کیا تو میں پھر زیادہ ہونا مناسب سمجھا اور ان سب کی باتوں پر ہمیں ہی لکھ کر ادا کرتی ہیں۔

بیگم جانشین ہی ممبر کے دل میں گئیں۔ انھوں نے کہا کہ چلو خود اس رسم کے خلاف نہیں۔ مگر وہ عورتوں کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے بلکہ یہ ایک طبع ہے۔ اچھے اخلاق کا مظہر ہے کہ بڑے بڑوں کے اپنے بڑے بڑے گھر سے ہوں۔ نئی ممبریے کھڑے ہونے میں اپنی مثال آپ تھی۔ بڑے بڑے کی تعریف پوچھ گئی۔ اور یہ کہ کتب میں محنت لکھ کر عورتوں کے ہونے کی وجہ سے بڑے بڑوں کو لیک بوا۔۔۔ سدا بہار۔ میں ہی وہاں بہت سونا کی بڑے ہوں اور آپ ہی مگر جو عورتیں سب سے بڑی ہوں ان کی تعظیم کو ضروری ہے۔

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ بیگم نے۔ نئی ممبریے ہاں ہر ممبریے اسلامی سے طراز دی اور جانشین بیگم یہ اثر لے کر لوٹیں۔ کہ انہوں نے جن کرشمے کے آثار لیے۔ اچھی ممبریے جان تو مجھ کو وہ بیگم کے ساتھ آئیں۔ لکھ انھیں ایک نوجوان شہناز ہے۔ دوسرے عورتیں ان کے سر اڑتے آگے کی عادی ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ نئی ممبریے نور ہوئے کا: یادہ اطف اطف اسکین۔ جیسے بیگم نے دروازے میں قدم رکھا ساری عقل جو نہ تھی ساریوں کو تنگ کر دیا۔ خیر خیر اور بولنا میں نے بڑے بڑے بھولوں سے بگڑ کر ہی تھی اٹھ کھڑی ہوئی مگر نئی ممبریے اس طرح پہنچی رہی۔ بیگم نے اور بیگم جانشین نے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اور عورتیں گئیں۔ انہیں نے بیگم جانشین کی ہر جیسے کھڑی دو ان کی زبان پر چڑھ گئی۔ ان کے چہرے پر ہر جگہ کی ہو۔ بیگم جانشین نے کھڑی ہوئیں۔ ساری کا یہ بھی پاؤں پس سے ہی ہوئی ہنسنے کو بیٹھا اور کچھ کھڑی کی کہ اور واورہاتی بیگم جانشین کی عزت و تکریم کو اپنی ہلکا سیجے دلا رہا کہ خوب سی توں واں کیا آپ کی اٹھو طرے میں تو بگڑی نہیں ہوتیں آپ کی ساریوں کو آپ۔ یہ کتب نہیں آتیں۔ یہ کہ اس اور چاقی شریف نہیں تو آپ کے بڑے ممبریے نہیں۔ پھر کہ وہ یہ کہ اسی طرح جب آپ کی نوئی بڑی عقل پر آپ کو آپ کھڑی نہ ہوں۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ بیگم جانشین۔ ایک بڑے ہنسنے کی بیگم ہیں۔ بڑے ہنسنے کی بیگم ہونا ان کی اتنی بڑی عقلی نہیں کہ آپ ان کو وہ تعلیم ہی نہ دی جو آپ کی ساریوں کی آپ کا معاشرہ آپ کو سکھاتا ہے۔ سب کا کہتے ہیں کہ کالج کے زمانے میں مباحثوں میں انھیں ہانے والی بات کہ وہ اکثر بڑے بڑے کی تھیں۔ سر سے غلط نہیں ہے۔ جب وہ تقریر کر کے نہیں تو تقریباً ساری بیگم سطر رہا ہیں جو خواندہ آتے ہی وہ کی بغیر۔ وہ وہی وہی دل میں شہنشاہ دی رہی تھیں۔ فقط غلط ہوئی تھی۔ کسی کی مسجد میں نہیں آتا ہنگامات کہاں شروع کرتے اس لئے چلتے کہ اعلان کر دیا گیا۔ چاہے ہر ان حوائثین نے جو آج پہلی مرتبہ گنتی کی ممبریے ہوئی تھیں۔ موقعاً ہر بار کی باری بیگم حج سے منع نہ کر لی ایک نے کہا کہ وہ پاس والی سے باتوں پر اتنی منہ خوں نہیں کہ انھوں نے بیگم حج کو آنے سے منع نہیں دیکھا۔ دوسری نے کہا کہ آج ان کی ٹانگوں میں سخت درد ہے۔ ہنسنے کی کسی کا یہیں یہاں تک پہنچی ہیں۔ اور وہ درد دے کچھ عجیب قسم کا کہ اگر کھڑی ہوں تو بیٹھا نہیں جاتا اور بیٹھی ہوں تو کھڑی نہیں ہوتا جاتا۔ تعبیری۔ یہ کہ آج ان کے پیچھے سے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ آج اسپتال میں لگا ہے۔ اس لئے ان کے موصاف بالکل بے قابو ہیں۔ اور انھیں پہنچ ہی نہیں میں دیکھ کر ان کے اس پاس کیا ہوا ہے۔ وہ اس قدر پریشان ہیں کہ ابھی چائے پیتے ہی واپس چلی جائیں گی۔

بیگم اور بیگم جانشین کی مہر کے لئے کاغذ لکھ کر دی گئی تھیں۔ مگر وہ دو رکھڑی ایک عروپ میں بائیں کر رہی تھیں۔ اس کے اور گرد و کھڑی عورتوں کو بیگم خود بیگم جانشین کے اس پاس کھڑی عورتوں سے زیادہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بیگم جانشین کے پاس رہنا اور باہر ڈال دیا جائے اور باہر عورتیں اس کی طرف بے غی ستر کھینچ رہی ہیں۔ بیگم جانشین نے کہا کہ جسے جو کہہ گئے ہیں کہ لوگ اچھی باتیں مدتوں میں نہیں سیکھتے اور بری باتیں جھٹ اپنا لیتے ہیں۔ اس کی کسی اچھی صاف ستھری مثال اس وقت ان کے سامنے تھی۔ اس وقت کاب پارٹی جمی نہیں بلکہ اچھی خاصی اکھڑی اٹھ رہی۔ بیگم جانشین کے کپڑے کی تعریف کرنے والیوں کی بھی کمی نہ رہی۔ مدتوں یہ سوچی کہ بیگم جانشین کے نازہ نے فیض کے بٹے ہوئے کپڑے کا کسی نے ٹکڑا نہیں لیا حالانکہ وہ پورے وقت بائیں ہاتھ سے سموسہ اٹھا کر کھاتی رہیں۔ اور اسی ہاتھ سے چائے پی رہیں۔ تقریب کے دوران ہی وہ بار بار اپنا ہاتھ ہاتھ ہوا اچھا رہی تھیں۔ اس نئی مہر نے ان کو کچھ برائی یاد دلا دی تھی کاب کی حب وہ وہاں بیٹھے والے کمرے میں جا رہی تھیں تو انھوں نے سنا کہ سیلاب زدگان کے لئے پیسے اور کپڑے جمع کرنے کی کپڑا بات ہو رہی ہے۔ جس میں ساری عورتیں بیگم جانشین کے لئے جمع کر رہی ہیں۔ بیرون سے لائے گئے اس قسم کی باتیں کاب میں پہلی بار نہ رہی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ صرف اس لئے کی جا رہی تھیں کہ کوئی صاحبزادہ مقبول ہونا چاہتی تھیں۔ اور یہ اسی نئی مہر کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ اسی وقت بیگم جانشین نے بیگم جانشین کو حکم دیا کہ اس قسم کا کوئی سہنگامہ بدنامی کی اجازت کے لئے نہ کیا جائے۔ اگلے ہفتے وہ عورتوں کے خود کچھ اعلان کر رہی تھیں۔

اگلے ہفتے کا سب سے پہلا جینی سے تھا۔ اسی دوران میں بیگم جانشین اور ایک مرتبہ مہر کی مہر کی تھیں۔ اس سے کہا تھا کہ ایک ہفتہ سیلاب زدگان کے لئے کچھ کام کر لے گا اور وہ ہے۔ اس لئے وہ عورتوں کے لئے کچھ بھرا ایک مرتبہ مہر کی مہر کی تعلیم دیکر کے موضوع پر انھوں نے چند محلے کھینچے تھے۔ جس کا کافی مہر پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ بلکہ خود اس نے کہا تھا کہ میرا میں جو بہت بڑی اور عریضہ ہوں۔ بلا غلط اس کے کہ ان کے مہر کا عہدہ کیسا ہے۔ سب کون کی عزت کرتی چاہیے۔ ان کی بات مانتی چاہیے۔ اور ان کی کو کاب کی صدارت کا عہدہ سونپنا چاہیے جن صرف شیشے ہیں۔ تو کیا فضا دیکھ انھوں نے اس پر کس کر ڈالے وہی لگے وہی تھی۔ پس اب اگلے ہفتے اس جن کو بیگم جانشین کی خدمت میں پیش کرنے کی دہائی تھی۔

نئی مہر وقت کی بڑی پابندی رہی۔ کاب میں بیگم جانشین کے لئے لکھا جاتا کہ دس ساڑھے دس ٹک سب اکٹھی ہو جائیں مگر سنا گیا تھا کہ نئی مہر ٹھیک ٹھیک اپنی بات اور چند رسالے لے کر پہنچ جاتی تھیں۔ اور انھوں نے بھی سنا تھا کہ پچھلے ہفتے چند اوقات میں بھی ٹھیک ٹھیک پہنچ گئی تھیں۔ پورے دس بجے بیگم جانشین نے بیگم جانشین کو کون کیا کہ اگر وہ تیار ہوں تو وہ ان کے گھر پہنچ جائیں۔ تاکہ اگلی کاب جلیں۔ بیگم جانشین نے کہا کہ وہ بالکل تیار ہیں۔ صرف کپڑے بدلنے اور بال بٹانے ہیں۔ چنانچہ سوا دس بجے بیگم جانشین نے مہر کو فون کر کے مہر کو کڑی دنگائی۔ اور بیگم جانشین کے ہاں جا پہنچیں۔ بیگم جانشین نے کاب میں لے کر پہنچ گئی۔ بیگم جانشین آگے اور بیگم جانشین ایک قدم پیچھے رہے۔ وہ ب سے کاب میں داخل ہوئیں۔ اس وقت انھوں نے سوچ کر کہا تھا کہ اگر نئی مہر نے اپنی ضد جاری رکھی تو اگلی مرتبہ وہ ایک ریڈیو میں پس کر دے اس کو مہر شپ سے نکال دیا گی۔ بیگم جانشین کاب کے روز پھر بیگم جانشین نے بیگم جانشین سے اس سے ایک فائدہ یہ تھا کہ مناسب فرائض موقع پر ڈھالے جاسکتے تھے۔ یہ قدم پر دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ زندگی اور موت کی کشمکش نہیں تھی۔ مگر امید وہ کیا ایک عجیب علم ضرور تھا۔

جن وقت انھوں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ سب گھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے اسی کڑی دیکھنے کی کوشش کی جہاں کوئی

عورت پیشی ہو سکتی نہیں سب کھڑی نہیں۔ لیکن اندر خوشی کی لہر دونوں کے چہروں پر دوڑ گئی۔ ایک دم دونوں کے سنے ہرے سبز پہرے مسکرائے۔ بیٹھتے ہوئے دونوں نے اس پاس والوں سے ذرا عافیت پوچھی۔ پھر یادی باری سب پر نظر ڈالی۔ نئی مہراں میں نہیں تھی۔
 —————
 نوات نے وہ بار کریدیاں چھوڑ گئی تھی۔ اس میں خوشی کی بات تو تھی مگر ایک دکھی فغا کچھ اس قسم کا جو بادشاہوں کو اس دشمن کو برا کرنا ہو گا۔ جو میدان چھوڑ کر بھاگ تو گیا، مگر پابہ زنجیران کے سائے حاصر کیا باسکا۔ اگر آج وہ ان عورتوں میں کھڑی ہوتی تو ان کی کامیابی مکمل اور خوشی بھر پور ہوتی۔ بیگم نے بھی سب دیکھا اور محسوس کیا مگر اس وقت کچھ نہ کہا۔ باتیں تشرع بگھنیں۔ بیگم جانشین نے کہا کہ سیلاب زدگان کے لئے میں خود کچھ کرنا چاہیے۔ اس کے لئے بیگم نے بیگزیم بہ کریم۔ سب اپنے گھروں سے بے کام مگر کم اور غصہ شدہ کھڑے اور جگہ لاکر اکٹھے کریں۔ ذہنی پارس بنائیں اور پھر ان کو شمع اور ان کے ساتھ دو ایک اور بیگم مسرور یا رس منظر کے حوالہ کرتی ہیں سب عورتوں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔
 بیگزیم نے خوشی اور امین سے پہلو بولا۔ اچھا اسی وقت کیا دیکھنے میں آیا کہ کلب کے دووانے سے نئی مہراں ایک اور صاحبہ کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہیں۔ دوسری صاحبہ سفید دودھی اینٹ ساڑی میں بیوس میں۔ ایسا ہی ان کا بلاؤز اور جاک جیسے سفید ہی ان کے پالتے۔ وہ بڑی بڑی باری سے پس رہی تھیں ایک دم چھپتی مٹی مٹی۔ سب کی نظر ان پر اچھی ہوئی تھیں۔ بڑی عکس خاتون کو چند ایک عورتیں جاتی تھیں۔ چند نہیں جاتی تھیں۔ وہ بیگزیم کے میاں کے دفتر میں کام کرنے والے ایک معمولی کلرک کی بیوی تھیں۔ جب وہ دونوں اندر آئیں تو آپس کی بات چیت یا غل بند ہو چکی تھی۔ اور سب ان کو اس طرح دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اب کوئی عجیب و غریب ظہور میں آنے والا ہے۔ مگر کوئی بات ایسی نہیں ہوئی۔ نئی مہرے ساتھ آنے والی خاتون نے اندر آکر سلام علیکم کہا۔ نئی مہرے بھی سلام کیا اور بیگم سے کہا کہ یہ ہمارے کلب کی نئی مہرے آئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کی تمام مہراں سے بڑی ہیں۔ اس نے میں ان کے اعزاز میں کھڑا سونا چاہیے۔ اور بیگم صاحبہ نے تمنا کیا کہ سب سے بڑی خاتون ہی اس کلب کی پریسیڈنٹ ہوتی ہیں۔ آج یہ مہراں جائیں تو اگلے ہفتے سے پریسیڈنٹ بھی۔

”شٹ اپ“ بیگم جانشین دھارن ٹی بیگزیم کی توہین کر رہی تھیں۔ بیگزیم نے جواب تک منہ پھاڑت دیکھ رہی تھیں۔ بیوس میں آگئیں اور ہاتھ جھلا کر بولیں۔ اس کلرک کی بیوی کے آنے پر کھڑی ہوں چہ خوب! اور ان کے بعد یہ کلب کی پریسیڈنٹ بنے۔ کچھ خوش ٹھکانے میں تھارے۔
 تبہیں معلوم ہوتا میرا میاں کون ہے۔ اس شہر کا سب سے بڑا افسیہ۔ سب سے بڑا۔
 ”میں لیا آپ نے نئی مہرے دوسری خواتین کی طرف منہ کر کے کہا۔ سائے خانے میں جس بات کو ذکر نہیں تھا۔ وہ میں نے آپ کو سنا دیا ہے۔ باقی آپ جانیں آپ وہ کام خدا حافظ۔ کلرک کی بیگم کا ہاتھ پکڑ کر وہ جس راستے سے آئی تھی۔ اسی سے لوٹ گئی۔

دوسرے ہفتے اس سے پہلے کہ بیگم جانشین نئی مہر کو مہر شپ سے نکلنے کا انکشاف تھا، کلب کے چارسی نے ایک اتفاق لاکر دیا۔
 بیگم جانشین نے کھول کر ڈپھا اور گھر کی بیگم کے کاٹون بڑھلایا۔ یہ نئی مہر کا بیگزیم کی مہر شپ سے اسٹیٹ تھا۔

مسکے طور پر ادھا شعور ہے جو حق سے معیار
 پرھے نہیں، زندگی کے معیار پر بھی پورا
 اتنے۔ — فیض

سجاد نظر

نارنگیے ہوں بے مار کئے

مقید درو گھٹنے سے کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ اور وہ گھٹنے پگھل کر کھڑکی سے بچ کر گئے تھے۔ اور اگر دوپہر بن گئے تھے۔ مٹی اکیلی دوپہر چھ مڑ کر
برے جیانی سے بڑی ہانپ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بہت دور ٹوٹی پوٹی بد صورت کوٹھنوں کے کچے گھنے درختوں سے پتے ٹوٹ کر وائیں اُڑ رہے تھے
اور بول ٹک رہے تھے جیسے بہت سی مارتیں۔ ہوں۔ تسلیاں۔ خود دہر کی زد دی کی کمر گئی تھیں۔ سسڑک پر ہوا درو ہوں کا ایک بہت بڑا
ہموں گھوم رہا تھا جس کے پیچ بے بس کا ایک ٹکٹا اور جس کی چند تینیاں نے سی سے پھن پھن کر رہی تھیں۔ مستحضر رہے۔ بھٹ کر دیکھا

اس چلبلی کا کیا پائے ہے؟

کہاں ہے وہ سفر جو اس ٹکٹ کو بے منزل بن گیا؟

اور کہاں ہے وہ شعلہ بوزان تیلوں کو بھڑک گیا؟

اس ہموں کا کیا لڑنے ہے؟

اس کامی چاہ کہ وہ اس تنگی روپہ کی کمریں پاؤں ڈال رہا تھا اور اسے ساتھ لیکر کہیں دور کسی لیے سفر پر چلا جائے۔ اور اس سے ندر کر کھڑے ہو کر
بارش کا انتظار کرے۔ جہاں پاؤں کی شیل تے۔ اس نے بے دھیانی میں کھڑکی کی سلاخوں پر ہاتھ پڑا اور وہ ساری سلاخیں بچا بچک
جیسے موت کی چکیوں سے پھوٹا اٹھیں جتیلے۔ نے چٹک کر دیکھا۔ ان سلاخوں سے خون کی ڈاڑھی تھی۔ اس نے پھوٹے پیار سے پہلی سلاخ پر اپنا ہاتھ
رکھا اور اس کی آٹھویں تہے انگریزی ہوئی سانسوں کا دھواں چھائیے۔ بیٹے جہاں تک دوپہر پہنچی ہوئی تھی وہاں تک سڑک، ریگستان بن گئی اور اس کے
ہاتھوں سے سلاخیں جل کر ایک سلیب بن کر ریگستان کے چوں پچ بن کر گر گئی۔ اس نے دیکھا سلیب پر فانیل اتھوٹا لگا تھا۔
جیتلے نے گھور کر انھیں بند کر دیں۔ یکس کا چہرہ تھا۔ وہ ایک ایک کر کے ڈرے لگا اور اس کے سامنے چہروں کی ایک بھرنگ لگی آواز مل
کا ایک جوس کھڑا ہو گیا۔ کتنی ہی آنکھیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ایک ایک کو ٹوٹنے لگا۔

یکس کا چہرہ تھا؟

زندگی کا ایک جیسے کس ہو کر ہو رہی ہوئی راہوں پر اس چہرے کو ڈھونڈھنے لگی، کھوتے ہوئے موزوں ہیں۔ اس کا سایہ تلاش کرنے
لگی۔ کتنی ہی بساتیں، ادھر کتنی ہی پت جھڑ۔ وہ ایک ایک بے بس سے بچا رہنے لگا۔

یکس کا چہرہ تھا؟

اس بات مائیکل اسٹو جب اپنے برسرِ لیشا تو اسے مریم بہت یاد آتی۔ اسے بہت سے دوسرے ہاتھ بھی یاد گئے جن کے جال سے وہ بچا بچا اپنے مذہب کی لہجہ رکھتا ہوا یہاں تک آیا تھا کیسے کیسے موجودت میں دینے والے ہاتھ۔ اور ان کے وہ اشارے۔ مگر یہ ہاتھ۔ یکس کے ہاتھ تھے؟ مائیکل اسٹو کو بہت دنوں بعد خیال آیا کہ وہ اب تک بوڑھا نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی عمر ابھی عرفِ ہفتہ سال ہے۔ اور ہندوستان بہت خوبصورت ملک ہے۔ اسے برما کی وہ لڑکی یاد آتی جو ہر روز بظانہ اس کے کمرے میں میزوں پر آتی تھی اور میزوں پر لکھ لکھ دیتی تھی اور اسے ایک ٹمک دم سادھے دیکھے چل ماتی تھی۔ مائیکل کو بہت سی باتیں یاد تھیں۔

"تم لوگ شادی نہیں کرتے فادر۔؟"

"نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"کیتھو لک کلر بنی شادی نہیں کرتے۔"

"کیوں نہیں کرتے۔؟"

"اس سے کہیں ہمارا مذہب سکھاتا ہے۔"

"تو مذہب کی بس یہ بات مجھے پسند نہیں۔"

"مذہب بہت سی خواہشات کو مارنے کی کا نام ہے۔"

"تم لوگوں کا دل بھی نہیں چاہتا فادر؟"

"نہیں۔؟"

"تو پھر تمہارے ہاتھ دے دیئے ہوئے گہرے مجھے اتنے نیلے کمرے معلوم ہوتے ہیں؟"

ہیرسینٹن کی وہ سائلو لڑائی جو چیلہ چیلہ اس پر مڑتی تھی، جوں میں کوئی کٹی بار اس کے چہرے کے سامنے سے گزرا کرتی تھی اور جب وہ ہندوستان

آجاتا تو اس کے ہاتھوں کر چین ہو گئی تھی۔

"تم پھر کبھی سیلون نہیں آؤ گے فادر؟"

"نہیں۔؟"

"تم نے اب تک کتنے عیسائی بنائے ہیں۔؟"

"ڈیڑھ سو۔"

"ان میں میرا نام بھی ہے نہ؟"

"ہاں۔"

"کیا نام لکھا ہے۔؟"

"فورا اسٹو۔"

"کیا۔۔؟؟"

"فورا اسٹو۔"

پھر کہو۔۔۔

"نورا! سمجھ۔"

بانیانِ استمداد! انھیں بند کئے گئے ان بیوقوف لوگوں کے ہارے میں سوچا رہا۔ وہ سب اب کہاں ہوں گی اور کیا کریں گی۔ ہر مسافر اور مسیونر تین وہ پھر کبھی پلٹ کر نہیں جاسکے۔ لیکن ہندوستان۔۔۔ شاید وہ ہندوستان بار بار پلٹ کر گئے شاید یہاں سے کبھی نہ ہائے۔ اس نے پھر ہر لمحہ کرنا دیکھا۔ اور بہت۔۔۔ وہ تک یا کرتا رہا۔ لیکن بھائی جب آدھی رات کا گھنٹہ بجایا تو اس نے نادم ہو کر اپنے گھر کے کراس پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ سب باپ تھا۔۔۔ شاید وہ اب تک اپنے دل کو نہیں مار سکا ہے (Oh, Heavenly Father)۔۔۔۔۔ یہ سب باپ ہے۔

اس رات وہ بہت کم سو سکا۔ صبح ساریت جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے گھر کی سڑک کے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں اب بھی وہ درخت کھڑا تھا اور اس پر سرخ سرخ بے شمار پھول کھلے تھے اور انکاروں کی طرح سبز پتوں سے لگے لگے رہے تھے۔ جیتندرنے بھائی کے ہاتھوں کو دس۔

اب دوپہر بچہ رہی تھی۔ اور سڑک پر جہاں اور جہاں کا ایک دیکھا جہاں اٹھلا ہوا تھا۔ لوگ آ رہے تھے توں جا رہے تھے اور اس طرح چپے بڑے کا بچہ نہ کچھ عقلمان ہوا جو۔

"تمہارا ہندوستان بہت خوبصورت ہے"

جیتندرنے چونک کر سنا۔ یہ لیکن استمداد کی آواز تھی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور دیکھا کہ مجھ کی بڑی بڑی آنکھیں کھل چکی ہیں اور مجھ کے چرخاں کی طرح جل اٹھی ہیں۔۔۔ وہ اپنے گھر کے باقیوں کے گھروں کو اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے اس کا ایک ایک دانہ مائیکل استمداد کا ایک ایک لفظ ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔ "اٹھن چو۔۔۔" مرنے پر تقریباً دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگ آئی۔ فادر مائیکل استمداد نے اپنے گھر کے کراس پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ باپ نہیں ہے۔

وہ رات بہت استمداد سے سی و صبح رات تھی۔ فادر مائیکل استمداد کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار فیصلہ آیا کہ وہ کبھی نہ۔۔۔ وہ محبت نہیں کر سکتا۔ نہ شادی نہیں کر سکتا۔ وہ حج کو مہم کو پکار نہیں سکتا۔۔۔۔۔ اور یہ سب باپ ہے تو وہ اس باپ سے دیکھو۔۔۔ میں سکتا ہوں وہ اس باپ کے لئے توپ ہا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ کہ وہ لڑکی یا لڑکا۔

"تمہارے مذہب کی بس جی بات تجھے بند نہیں۔"

بس جی بات کہ وہ کبھی تک ہے۔ بس جی بات کہ مہم کو دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ بس جی بات کہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔۔۔۔۔ فادر مائیکل کی سوچ پوری رات کو ایک بلینڈ کی طرح کافی ہوئی گئی۔۔۔۔۔ صبح ساریت جیتندرنے دیکھا۔ وہ چرچ کے گیٹ کے پاس دھندیں اٹھانے لگیں۔ اور سرخ چروں دانے دخت کے تھے۔ پھر جہاں تو سے مرنے کا نام کھود رہا ہے۔ اور پش توں پر سبز چوٹے ہاگ لگے ہیں اور بھگ کر مائیکل کو دیکھ رہے ہیں۔ اور کھد رہے ہیں۔

"مائیکل استمداد! مبارکباد۔"

قبیلہ پر چڑھے۔ کہ اللہ بنا۔ خلیفوں، سنی، ائمہ، میں اس نے کئے تھے اسی در سوچنے سے واقعات اس کے دماغ میں گم نہ ہوئے۔ گئے اس سے اپنے باپ کو کہیں جو کہہ سکتا۔ اور اس کا سچا بیٹہ ایک چوتھے بریکر تھا اور اس کے ارد گرد کے لوگوں کی جیڑ تھی وہ غصے میں تھے کہ باپ تھا اور پوری بیڑ پر ایک سناہ تھا یا تو قبیلہ کو بھی مارا یا تو قتل کا وہ دن اس کے یاد کی بیشت سب سے اور بچ تھی کہ نہ وہاں کا ایک ایسا عجیب تھا اور سب سے زیادہ میں اس کی بے باک سے اس نے مسنا وہ بھی سے کہہ رہا تھا۔

[illegible]

میں نے یہ سب باتیں نہایت دلچسپی سے سنی ہیں۔ اب کے جن میں کلمہ ہجرت سے اس کلمہ کو یاد رکھ رہا ہے جس نے غفرت کی آگ بھڑکائی ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ میں نے کیا فعلیات کی ہیں۔ تو یہ چاروں نے ہنسنے لگے۔

نوی نما سے تمام فہم کا رُوبہ ان بڑا کیا جس اور حج بجز بکا ہے اور کہیں کہیں ہارے عمل آئے ہیں جلیقہ رکھ کر کھنگھنگے قدموں سے ایک بہرہ سے ایک ایک پہرہ پہنچا دیا اور وہاں سے جس کے کچھ کی طرف نہ دیکھو اور مایکل اس کے چپ بنا پ ایک پتھر کی طرح کھڑا ہے۔ اس کا لباس سفید کا ریشہ زرد تھا اس سے ایسے ہیچ بڑے ہارے جیسے کسی بہت بڑے پندے کا لڑا ہوا ہانکھو۔ مایکل ڈنڈا والی آنکھوں سے مریچک دیکھو رات بجز زمین، آسمان، درختوں، پھولوں، نہ پانی، چرہ چھپائے چھوٹ بھوٹ کر دروہی ہے۔

یہ نامعلوم ہے۔ یہ باب ہے۔

یہ پاپا پیپ نہیں ہے۔ مائیکل اسٹون نے جھگڑا کر مریم کے کانٹھ پر اٹھ رکھ دیا۔ یہ پاپ نہیں ہے۔

درست نہ ہو، گھٹیا انکار اس بات کو نہ سمجھنا۔ ہاں یہ پاپ ہے۔ پاپ بہت خوبصورت ہوتا ہے اس لئے انیکل بھی خوبصورت ہے۔ پاپ میں سادہ ہے، ان سے ایک بلک انکوار میں بھی نشہ ہے۔

’دیر۔‘ ”ناجیکل نے۔ سر کے شانہ زور پکڑ کر بٹھایا اور ایک جھکے سے اپنے سینے سے لگا کر بڑا کر بلا مجھے مت ڈرو۔ اس بھڑے مندوستان میں میرا توئی نہیں ہے۔ میں جہت دو روئیں کا رہنے والا ہوں۔ مجھے مت ڈرو۔“

’ناجیکل۔۔۔ یہ ان کے بے ہوش کئے ہوئے تھے۔۔۔ یہ پاب ہے۔۔۔ یہ پاب ہے۔‘

[illegible]

’ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔‘ پورا مجمع چلا اٹھا

’کیا یہ انیائے نہیں؟‘

’ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔‘ لاکھوں ہاتھ فضا میں بلند ہو گئے۔

جیتندے ذکر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سارا شور ایک دم غائب ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک چاندنی رات پازیب عجبائی

چلی آئی۔

’میں تو کافی ہوں پھر تمہیں کیسے پسند آئی؟‘ مریم نے مسکرا کر اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ پھیرا اور مائیکل کو دیکھنے لگی۔

’دل پرس کا بس ہے۔؟‘ مائیکل نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

’اچھا یہ بتاؤ تمہارے ملک کی عورتیں تو بہت خوبصورت ہوتی ہیں، بہت گوری گوری۔۔۔‘

’ہاں۔‘

’ان میرے تمہیں کوئی پسند نہیں آئی؟‘

’نہیں۔‘

’جھوٹ۔ بولتے ہو۔‘

’نہیں۔‘

’جھوٹ۔‘

’نہیں۔۔۔ میری آنکھیں دیکھ لو کیا جھوٹے کی آنکھیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔‘ مائیکل اس پر جھک آیا۔

’میں کیا جانوں؟‘ مریم کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

’آج اس دفا باز قوم کا ایک پتھر اس گاؤں میں بھی آیا ہے۔ جیتندرا کا باپ پھر روٹنے لگا۔ یہ مائیکل استمغہ جو فادر کہلاتا ہے جو مرد گاؤں میں

گہروں بامشا ہے۔ یہ ساری عورت سے اپنی خوات کے دام مانگنے لگا ہے۔ لیکن کیا ہم اتنے بے حیائیں۔۔۔؟‘

’نہیں نہیں۔۔۔ ایک دلا دینے والا شور اٹھا۔‘

’کیا بھوک نے نہیں بزدل بھی بنا دیا ہے۔۔۔؟‘

’نہیں نہیں۔‘

’انجھوٹوں۔۔۔ جیتندے پھر گھبرا کر گاؤں میں اٹھکیاں ڈال لیں۔ اور پھر سارا شور دب گیا اور اس نے دیکھا۔‘

’میں جی ہے۔ دھندہ پٹے ہوئے یہ بیکشوز کی ٹوٹی کی طرح نظر آتے ہیں۔ اوہ گڈنڈیاں شبہم سے پیگ کرنا ہتی ہوتی دور تک چلی گئی ہیں۔‘

اور رگڑ جکی چٹی پیمہ لاکھلا سا تھ دھندہ کچتا چلا جا رہا ہے۔

’نہی کے پاس ایک کھلے درخت کے نیچے مریم بڑی خند سو رہی تھی۔ ایک لمبا سفید گاؤں زمین پر کھجے اور مائیکل استمغہ مریم کو اٹھا رہا ہے۔ مریم کے

ہاتھوں میں بہت سے ننھی چول لٹکے ہوئے ہیں۔ اور اس کے ہونٹوں پر ان ساری باتوں کا رنگ سے جوہ زندگی بھر مائیکل سے کہنے والی تھی۔‘

’جاک آئی۔ کھنڈ لاری کو رستہ ملی دی۔ مائیکل نے ہنٹ کر دیکھی۔ اس کے سامنے گاؤں کا زمیندار جیتندرا کا باپ کھڑا ہے۔ ایک ننھی لہر مائیکل

استھ کو جھنپٹا ہوتی گزر گئی۔ ایک لمحہ کو اس کی آنکھیں زمیندار کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اور پھر ٹھیک گئیں۔ زمیندار کے ہونٹوں پر ایک ہلتر پر سکراہٹ چلی گئی۔ اور وہ بڑھکچہ کہے واپس مڑ گیا۔ مائیکل نے دیکھا اس کے پیچھے وہ آدمی اور تھے اور ان کے ہاتھوں میں لائیاں تھیں۔

”مریم اس سانسے کاؤں کی عزت ہے۔“ جیندر کا پانچ کرکینے لگا۔ ”وہ تباری بیٹی ہے۔“ وہ تباری بیٹی ہے اور تھ ہا۔ ہی اس بیٹی کی قیمت مائیکل استھ صحت دھ سرگرمیوں لگا رہا ہے۔ کیا ہم اب بھی چپ رہیں گے؟“

”نہیں نہیں۔“ ساری پھل میں جیسے آگ لگ گئی

”کیا تباری پرش کی آواز یہ نہیں بتاتی کہ عزت لینے سے بہتر ہے۔“

”ہاں۔“

”کیا ہم ان ہا دروں کی اولاد تہیں جنہوں نے ایسے ایسے کرڈروں مائیکل استھ کے سر کاٹ کر خاک میں ملا دیئے ہیں؟“

”ہاں۔“

”تو پھر کیا دیکھتے ہو۔؟“ وہ رہا کر جا، مائیکل وہیں ہو گا۔ جاؤ۔ اور اس کے خون سے اپنے کو ڈھکے دھبوں کو سناں کر لو۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے اسے تم سب کی بیٹی کو ہنگام کرتے دیکھا ہے۔“

ایک جگہ میں کھلی چ گئی۔ ایک دن ہادیسے والا شورا تھا۔ نغما میں لاکھوں لائیاں، انڈلے سے ادھر بھجیاں ہر لے لگیں۔ اور ہزاروں لوگ ہاتھوں کی طرح دوڑتے ہوئے کُرب میں ٹھس گئے۔

”ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔“ جیندر نے تجھے کر کہا۔

”ٹھہرو۔“ مریم قیود کر چلائی۔ مگ کوئی نہیں نکلا کوئی نہیں پٹا۔ جیندر کو اپنے باپ کی خوفناک سنی سناپی دی۔ اس نے دیکھا مریم اس کے باپ کے پیروں پر سر رکھے کچھ پھوٹ کر دو رہی ہے۔۔۔ روک لو انھیں۔۔۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔۔۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔۔۔ روک لو انھیں۔۔۔“

”روک لو۔۔۔؟“ زمیندار ذرا سا جھک کر بولا۔ ”یاد ہے تجھے وہ رات۔ جب تو میرا ہاتھ جھٹک کر چلی گئی تھی۔ آج اس رات کی صبح بھی کچھ لے۔ اس دن تو نے مجھ پر رحم نہیں کیا تھا۔ آج میں تجھ پر رحم نہیں کروں گا۔“ جیندر کے باپ نے اس کے سر پر زور سے ٹھوکر ماری اور مریم اچھل کر دوڑ جا گئی۔

گرچے کے اندر بھی ایک شوریچا ہوا تھا۔ مریم سستی رہی اور پھی پھی آنکھوں سے گرچے کی غرت دیکھتی تھی۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟ خیر نہیں۔

بہت دیر بعد اس نے سنا کہ گرچے کی گھنٹی زور زور سے بج رہی ہے۔ اور چاروں طرف ایک خوفناک سنا پھیلنا ہوا ہے۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر تھکے قدموں سے گرچے کی طرف بڑھی۔ وہاں ایک بھی آدمی نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے پھاٹک کھولا۔ اندر تین چار یا دروں کی لائیں پڑی تھیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ سب سے آخر کی لائیں مائیکل استھ کی تھی۔ سرخ۔ لہو میں غرق۔ وہ آہستہ آہستہ بغیر آنسو بہائے اس کی طرف بڑھنے لگی

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم

”مائیکل۔“ مریم آہستہ سے بولی۔

دار کی خشک لہنی پہ دھارے گئے۔

"مائیکل! مریم نے پھر بچا رہا۔

تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم۔

"مائیکل! مریم زور سے چیخ پڑی۔

نیم "اریک" راسوں میں مارے گئے۔

"مائیکل!۔۔۔" مائیکل! جیتندہ نے دیکھا وہ مائیکل اسمتھ کی دانش سے لہجہ بیٹ بیٹ کر یو۔ی۔سہ نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی۔

"مائیکل!۔۔۔ مائیکل! اس! اس کے مردہ مونٹوں پر ہم نرف رکھ بیٹے۔

تیری الفت تو اپنی ہی حدیر تھی۔

وہ اسے ہاتھوں کی طرح چوسنے لگی۔

"س کوشک وہ ہے گرشوق کے سلسلے۔

"مائیکل!۔۔۔ مائیکل!

بحر قتل کا ہوں سے سب جانے۔

"یہ باب ہے۔۔۔ یہ باب ہے۔۔۔ میں پہلی ہی جانتی تھی۔"

جیتندہ نے بجائیک! نگھیں کھول دیں۔

شام ہو چکی تھی۔ دور گئے درختوں کے پتے پر اچانک اس سادھوی طرح ابیر ہاتھ جسے اپنی تیسرا سے پتہ پڑا۔ حائل زور ہو جیتندہ نے دیکھا

کھڑکی سے باہر مائیکل اسمتھ اسی طرح صلیب پر ہٹکا کھڑا تھا۔

"مائیکل! جیتندہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔۔ "سریا واقعی تمہیں باب کیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔" مائیکل! آہستہ سے جواب دیا۔۔۔ جیتندہ نے چمکے۔۔۔ دیکھا وہ سکارا ہوا تھا۔

"تم زندہ ہو جاؤ۔۔۔" جیتندہ حیرت سے بولا۔

"ہاں۔۔۔" مائیکل نے ہنسنا شروع کیا۔۔۔ "یہ ایک اس کے پردوں اور تھیلیوں کی کینیں کھل کر خود بخود ڈھکیں اور وہ مرن میں

ترس رہا ہوا ہے۔۔۔ آہستہ آہستہ جیتندہ اس کی کھڑکی سے کمرے میں آگیا۔۔۔ "ہاں میں زندہ ہوں۔"

"مگر تم تو۔۔۔۔۔"

"ہاں میں مر گیا تھا مائیکل میں پھر بھی زندہ ہوں۔ مجھے انتظار ہے اس دن کا کہ باب بچے، نیکر گزریں میں میں تھے گا۔۔۔۔۔ تم بہت دیر پر

کیا گذری۔۔۔"

"مریم۔۔۔" جیتندہ نے سوچا۔

"ہاں۔۔۔" مائیکل! استغاثہ اپنی پیشانی کے خون کو پونچھتا ہوا دوار

"ہاں! میرے بعد اس پر کیا گذری۔۔۔؟"

"تمہارے بعد سے کاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔"

تھوں سے دہکتے ٹپ رہی ہے۔

پھراک جیج اور پوری لائن ایک دائرہ بن گئی۔

پھراک جیج اور جیندر نے سنا کہ مریم کہہ رہی تھی۔ ”میں ہوں۔“ میرا نہیں۔ ”میں ہوں۔“

اس نے دیکھا اس کی راتوں کے بیچ ایک کڑوا سا بچہ لعاب اور خون میں لت پت پڑا ہے اور اپنی ماں کے ساتھ چپے جا رہا ہے۔ ”میں ہوں۔“

”میں ہوں۔“

یہ ایک سٹنڈر بچہ کی طرح تھا اور آگے بڑھا۔ اس کی ہچکچاہٹیں، آواز تھا۔ اس نے اپنی اسکو ل کی کتابیں پھینک دیں اور پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک ٹی لپوں نکالا اور مریم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ مریم نے ایک بار کس کر تھیلی کھینچی اور پھر ڈھیلی پھوڑ دی۔

جیندر نے دیکھا وہ مریم کی تھی۔ گرے کی تھنڈی زور زدہ سے بچنے لگی۔ اور اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور کھڑکی کے باہر دیکھا۔

مریم اسی طرح صلیب پر لٹکی تھی۔

”مریم! جیندر کی آنکھیں پھر ڈھلکا گئیں۔ تمہارا باپ کیا تھا؟“

کچھ بھی نہیں! اسے مریم کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ مگر مری تھی۔

”تم زندہ ہو۔“

”ہاں۔“ مریم نے مسکرا کر اپنا سر اٹھایا۔ بھلائی اس کے پیروں اور تھیلوں کی کیلیں کھل کر خود بخود گرائیں اور وہ خون میں تر ہواؤں پر آہستہ آہستہ پہنچتی ہوئی گھڑکی سے اس کے کمرے میں آگئی۔

”ہاں میں زندہ ہوں!“

”مگر تم تو۔۔۔۔۔“

”ہاں میں مری تھی۔ مگر میں پھر بھی زندہ ہوں۔ مجھے اتنا ہے اس سرخ کا جو ایک دن آئینکا اور میری زندگی کی تاریخ پھر سے لکھ گا۔“

”اور تمہارا بچہ؟“

”میرا بچہ۔۔۔؟“ مریم کی آواز بھرائی۔ ”میرا بچہ ابھی گھوم رہا ہے۔ وہ بہت دنوں تک اسی طرح اپنا معصوم سوال لئے گھومتا رہے گا۔ کبھی وہ پہلے

یا پھر کبھی ایک ماٹھے گا۔ اور کبھی شیم خانے میں مجھے دیکھنے کے لئے قند کرے گا۔ لیکن ہر جگہ یہی پوچھے گا۔

”میں کون ہوں؟ میں دیکھوں گی زمانہ کب تک جواب نہیں دیتا۔“

جیندر نے دو گھنٹے دو خوں کی حلق دیکھا۔ وہ اتنے آنسو کہاں سے لئے جا سکیں گے کہ انہیں کو اندھا کر دیں کہاں سے لئے؟

اسے یاد آیا کہ وہ درپہر سے اب تک بچہ کے انتظار میں گھڑ رہا ہے۔ ”میں بچہ تو اب کبھی نہیں آئے گی۔ اس کی محبت تو کوئی خرید کر لے

یا ہے۔ اب اس سے اس کا کیا سمبندھ؟“

”بچہ۔۔۔“ آنسو ڈھلک کر جیندر کے گالوں پر آگئے۔

”بچہ۔“

”بچہ۔۔۔“ تجھ سے میرا کیا سمبندھ؟“

جیندر نے دھیرے سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ لاش۔ لاش۔ تجھ سے کچھ سمبندھ ہوتا؟“

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

دکار الرحمن

درائے گادے پاپوے

بچہ اگر میں یہ بتاؤں کہچہ حالت برس پہلے شہاب کیا تھا۔ نزوگ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن مجھ سے بہتر اسے کون جان سکتا ہے۔ یہ اس کا گھر میسر مکان کے عین سامنے تھا۔ اور ہمارے دروازوں کا درمیان فاصلہ بمشکل آٹھ گز تھا۔ اس کی بہن شاہدہ مہربانی بہن کی بہن تھی۔ وہ دونوں ایک ہی گاہ میں پڑھتی تھیں۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب شاہدہ ہمارے ہاں نہ آتی مہربانی بہن اس کے گھر نہ جاتی ہو۔ ایک نہ تو ایسا بھی آیا تھا جب میں شاہدہ کے بارے میں بڑی ٹویدگی سے سوچنے لگا تھا..... وہ تو بھی بہت پیاری لڑکی۔ اتنی پیاری کہ بچہ ایسے بڑکے کے اعصاب پر بھی سوار ہو جاتی۔ میں برو بچپن سے ہی نامساعد حالات کے باعث ان روشن روشن لمحوں سے محروم رہا ہوں جب نظر کسی کے حسن سے ممکن رہتی ہے اور دل کسی کی بے سے ہلکا ہوتا ہے..... شاہدہ کا بڑا صاف اور گلاز بزم تجھے کتنی بھی یاد ہے..... اس کی آواز میں آسمانی گیتوں کی تڑپ تھی۔ اس کے زخموں کے شفق نما رنگ گرا بھڑاؤ تھا۔ سورج سلام کرتا تھا۔ اور اس کی شمشیر انگلیاں جب نیلے تو بر مسوں کا جامہ جگاتی تھیں تو کم از کم تجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ پوری کائنات اعجاز طلسم کے سوا کچھ بھی نہیں۔

شہاب ان دنوں بی۔ ایڈ میں پڑھتا تھا۔ اور میں ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے تعلیم کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے اپنی سندرہ زندگی کی راہ منہ بند کر لی تھی اور میں..... میں حسب معمول، سامنے کتے والے کسی بھی راستے پر چلنے کے لئے تیار تھا۔ اس سے بے نیاز کہ وہ راستہ کونسی داد میں جانے لگا۔ کونسی منزل پر ختم ہوگا۔ میں نے نتائج کی بھی پردہ نہیں کی۔ میں گدہ تھی نہیں ہوں۔ لیکن طبیعت کا سانچہ کچھ اس طرح تشکیل پہ چکا ہے کہ عواطف میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں ان اہل جنوں میں سے ہوں جن کے لبوں پر حرف غزل جلتا ہے۔ جن کے دلوں میں قنبر غم زونداں بختا ہے جو دہان تک جلتے ہیں جہاں تک قدم سے جا نہیں۔ جو تار یک راہوں پر مارے مہلتے ہیں اور اس وقت بھی شکوہ نہیں کرتے۔ جب شوق کے قام سلسلے بھری گئی توں گا ہوں ستہ جا لیتے ہیں۔

شہاب ایک خوبصورت لڑکا تھا جس کی اور یہاں گھنٹہ یا لے ہاں والا لڑکا اس کے پیچھے کر دیکھ کر اس نے دھکاب کانیاں اٹھاتا تھا جو بارانی رات کے جیگے جیگے لمحوں میں سکھتا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جینے کچھ نکاش کرتی ہوتی۔ انجانی گھڑائیوں میں اتنی ہوتی محسوس ہوتی تھیں، وہ بڑی عمدگی، بڑے فکاسے بات کرتا تھا۔ زندگی کے ساتھ اس کا ہر معاملہ بیان تک کہ اس کا ہر بھی اسی عمدگی اور فکا کا حامل تھا..... وہ ذاتی ایک فیئر معمولی لڑکا تھا اور اسے پشیمون اور اپنی درس نہ توں کا مکمل عمارت کے اور نہیں مدعو کے اندر کھنے کی بے پناہ قوت حاصل تھی۔ شاید ہی قوت

کون سے کام کا وقت ہے۔۔۔۔۔ بعض اوقات اسے اپنی سبقت کو یاد دلاتے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو یاد دلاتے ہیں اور یہ کام و مشکل سے ان کے لئے ہوتا ہے۔
پہلے سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ بعض اوقات اسے اپنی سبقت کو یاد دلاتے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو یاد دلاتے ہیں اور یہ کام و مشکل سے ان کے لئے ہوتا ہے۔
پہلے سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔ بعض اوقات اسے اپنی سبقت کو یاد دلاتے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو یاد دلاتے ہیں اور یہ کام و مشکل سے ان کے لئے ہوتا ہے۔

جس قدر کامیں دیکھ کر ہوں۔۔۔۔۔ ہم دونوں کے لئے اس کی عبادت ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس میں فرق ہے۔۔۔۔۔ ہم دونوں کے لئے۔۔۔۔۔

میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔

میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔

میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔

میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔

میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔

میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔ جب میں نے یہاں سے کہہ کر غصہ نہیں رہا۔۔۔۔۔

.....
رات کا گرم لہر اور بھی بہہ جانے دو
میں تابیگی تو ہے غارہ رخسار سحر
مجمع ہونے ہی کو ہے، اسے دل بیتاب ٹھہر

اور تھپس۔

.....
پلٹے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
پلٹے میٹھاؤں کو مینا نہ تو بن لینے دو
جلد یہ سلطرت اسباب بھی اٹھ جانے کی
وہ گراں باری آواز بھی اٹھ جانے کی
نواہ نہ تھیں تھیں تھی تھی، چھٹا ہی رہے
اس شہ میں واقع طور پر کچھ لکھنے کی بجائے شہاب نے جوفیق کی یہ نظم لکھ چھٹی تو مجھے بھی بے اختیارانہیں کا رہے شعر یاد آ گیا۔
ابو نصر قاضی بن سحوت کے ابو نصر قاضی سے رد دل ہے
زبان تجا میں کردار بھی نہیں اسیر ذکر و دہن سے پسے
دور اس کے ساتھ ہی چھوڑ دیا گیا، تب شہاب نے کہا تھا۔
"ہاں نہیں کے بارے میں یہ میری تھیں تھی، رستہ ہے کردہ ایک تھیں
شہر ہے، جیسے وقت کی ایک تیز زد سطح سے اُٹھار دیا ہے۔ ایک
دور آئے گا کوئی اسے بھول جائیں گے۔"

میں نے، سکرلت ہرے لقا ذخا ہ کے حوالے کر دیا، جسے ایک غصے کے موطن پر گم شدہ سہانی کی خبر ہی تھی۔
اس کے بعد میں مسلسل شہاب کے خط لکھتے رہے۔ اور ہر خط میں وہ واضح طور پر لکھنے کے بجائے فیض کی کوئی نظم یا غزل لکھ کر بھیجتا تھا۔ وہ ہر
اپنی زبان میں کچھ ذکر کرتا تھا، فیض کی زبان میں سب کچھ کہتا تھا۔ اور سنہ ۱۹۷۱ء اپنی بہالت کے طعنے، یہ سب کچھ تم تک اور ان سب تک
بن کو شہاب مخاطب کرتا تھا، پہنچا دیتے تھے۔ وہ یہ پیارے رخسار کے تم اور کمال کی زبان کی سمجھیں۔ ۹۔
دن گذشتہ رہے۔ اور خورہ دن بھی آ گیا، جب ہاں سے پہلے وعدہ و بیان پر سے کے اور دل قفس کی اس کھٹکے میں ہیں میں کھلی زبان کی غارہ
رخسار سحر بن گئی۔ شب سست موج کو ساحل مل گیا اور سفید غم دل انقلاب کے کنارے آن لگا۔ نہ تو دل میں تو نہیں نہیں اور دل کو لڑتے ہیں۔
میں شہاب کو لکھتے مٹان گیا جب وہ بیل سے باہر نکلا تو اس کے ہوں پر مسکراہٹ کے چہرہ کھل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ میں
نے لبیک کو اس کو گھٹے سے دگایا۔
"یا آخر تم رہا ہو جی گئے۔ ہم تو دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ رفوہ جذبات سے میری آواز گانہ پاد ہی تھی۔ وہ خاموش تھا۔"

”ہاں میں کہتا تھا۔ لیکن غلط کہتا تھا۔ دوا سے اس وقت تک میں زندہ ہی رہتا تھا۔ جو دوا میں نے شریک نہیں تھا۔ بلکہ اس جدِ بید ہزار تک ہی نہیں رکھتا تھا۔۔۔ یہ ادراک مجھ بخیر نہ دے سکا کیا۔“

وہ کوئی غلطی - ہا - شہاب نے یہ نام میرے سامنے پڑا۔ لیا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ ایک ایسی خوش شہاب کو کتنا توڑ کر رکھا ہے۔
وہ..... - شہاب کی آواز جتنا زوردار ہوئی کی وادعہ میرے آدھی تھی..... وہ..... کیا ایسی رنگی ہے توڑ کر رکھنے کو کبھی نہ کہیں
کہیں نہ کہیں ہر فرد کو شہ - یہ دوسری بات نہ کو کوئی اپنے بیان نہ کہتے وہ دیکھ بھال ہے..... میرے سے سے بچیں یہ باتھا.....
میں نے غور سے شہاب کے چہرے کی حقیقت دیکھا۔ اس کی آنکھیں میرے کہیں غور و خوض میں کھنکھاتی ہوئی تھیں۔

”وہ نچھان دونوں ملی جھپٹیں طلبہ میں اچھو بھڑکے گئے کہ کام کرنا تھا۔ جس کو انہیں خبر نہ ہو کہ استاد کے خلاف جہاد تھا۔ جو وطن کے شہر و دروازہ کو تار و مار میں بناتا ہے۔ جتنی بھی آدمی اس کی پاؤں میں لپکتے ہیں۔ وہ ایک مٹاؤ گزرتا ہی ان کو بلی جیٹرس ہے اور ان دنوں ۱۰۵ سال تک ملک میں مہادی، رفیق خٹمی“

وہ ایک شعلے کے لئے رکنا اور عجب۔ گنہہ لگا۔

”میں اپنے اس غم سے بڑا سہارا قائم ہوں کہ شہادتِ مبارک سے مزاجِ حسرت اٹکا نہیں کھاتی۔ میں یہ بھی سمجھا ہوں کہ زندگی باریکست کا۔“

”نہیں۔ لیکن زندگی عشرِ بھلازم، عیسیٰؑ یا اسلامؐ کا نام نہیں کہیں۔ زندگی بھری ہے اور اسلام ہی۔ زندگی رنگِ بزمِ ہے، اچھیلی تپیلی ہے

خترک ہے۔ سنجیدہ بھی ہے اور گستاخ بھی، گزین بھی ہے اور غنا بھی، ذمہؑ غنیمت ہے۔..... عشقِ کو غنیمت، انصافیٰ، تفریقِ دریا، ہر جہ

نورِ دنیا کا شاعر ہے، ایسی شہادتِ بدہاں اور عظیمِ زندگی کا شاعر۔..... ہر سب کچھ کچھ بڑی نے بتایا تھا۔

”ہر شے میں منہؑ لو کہیں سے گھسیٹ لے۔ تم بچہ زیدؑ نے اسے میں تار ہے کہ“ میں نے کہا۔

[illegible]

کیا تم مذاہبے ہو۔ یا "مجھ سے پوچھا تھا۔"

میں نے یہ قلم اسے حوالے کیا، اپنی نگاہ ہٹا کر ہنس کر: (اگرچہ اردو۔

۵ اور فیکس ۔۔۔۔ اس نے محمد ناصر ایساکا بیٹا تھا اور وہ دینی کویہ عظیم شاعر ہے :

”اسے میں ایک نثر کی شاعر نو مانتا لگا ہوں۔۔۔ یسین نئی اصناف پرستہ بھی اور غفیم ہے۔ اس میں مجھے شک ہے۔“ میں نے کہا تھا۔

میں نے انہیں تنہا نہ چھوڑا اب میں ۔۔۔ وہ بھی سوائے باتیں دھڑلے پر گئی۔ لیکن اس نے کہا: اللہ

۱۔ سر کی وجہ سے کھانے پینے کا بار سنبھالنا، یا سہلہ، نوٹیں لگنا، اندر کچھ بھی نہ مانا لوگوں کی طرف سے کیا، ایشیائی شاعر سمجھتے ہو۔ ۲۔ انکار کا
 ایشیائی شاعر نہیں ہے۔ وہ تو رنگ، رنگ زندگی کا شامیہ۔ تجربے اس کی در نظر بھی ہے، جس کا کمزور در آواز ہے۔ ۳۔ ان میں بھی بھی ہے
 تو پر حور۔ ان نظم میں اُمیدوار، اُمیدوار، عزم اور اُپاسی، یعنی اوسے علی کی کشش کا شاعر اظہارِ اہمیت ہی دلکش ہے۔ سو میں مے میں تائی پولا

پہلی آرتھ ہے۔

جب کچھ نفس نسکے ٹہر اور صیب درگیاں دفعہ رسن
آئینے کے آئینے موم کل اس دودھ لگا کیا ہوگا

مدد می آریں ہوسلہ دیتی ہے۔

ان ہون و سلاسل کو تم بکھلائی کے شورش برید و سن
وہ شورش جس کے آگے تریوں، ہنگامہ طبل تیر کے

میں کے علاقہ فزین کی نکلیں..... "تہائی" "کتے" "شاہراہ" "ہم رنگ" "اور اسے دل ہے تاب ٹھہرا..... وہ

نکلیں ہیں تو بعد ہی ہیں اور علامت در مرکز منزل استمال کی وجہ سے نہایت ہی وسیع اکثر ہو گئی ہیں۔"

اور صوبہ یہ باتیں کری رہی تھیں کہ دھانسیہ پر پوسن نے دنک دی اور مجھے گنتا کر رہا گیا۔ مجھ زیدی کو انہوں نے، بنائے کیوں،
صاف کر دیا۔ لیکن جد میں ہستہ چلا کہ کچھ دلوں کے جدہ بھی گزرتے رہو گئی تھی..... مجھے تب پوسن اپنے ساتھ لیبلنے لگی تو مجھ نے کونین
کی شوری مجھ سے دیئے اور کہا۔

"یہ تعلیم کتا ہیں تھیں بلیا میں صیب کی یاد دلاتی رہیں گی۔"

اور پوسن تھیں کا دروہ یہ رن مسٹر رگ وریش میں سرایت کر گیا۔ اور کچھ مجھے اب ان الفاظ کا خیال آتا ہے جو میں نے بہت مدت پہلے
تم سے کہے تھے..... فیض ایک ہنگامہ کی شاعر ہے..... تو مجھے منہ کی آتی ہے۔ زندگی کا دروہ بھی ہنگامہ نہیں موزا
یہ کچھ کر شہاب فاضل ہو گیا۔

"مجھ زیدی کچھ کل کہاں ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"اھی اسکر میں ہے، جہاں پہلے تھی"

"تم اس سے شادی کیوں نہیں کرتے۔" آکیلے میں ہمارا ارشاد وہ کامی ہو رہا ہوگا۔" میں نے فراموشی میں کہا۔

"شہاب سہ عجیب ہی نظروں سے مجھے دیکھا..... اس کی سیاہ آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔

"شادہ تمہارے ساتھ تنہا نہیں رہے گی۔ اور میں..... میں واقعی مجھ سے شادی کر لوں گا۔ تاکہ فیض بہت سے سیریب رہے،

مجھے حوصلہ دے گا کہ بھٹنا رہے۔ اس کے دروہ میں تاہم زندگی اپنے سینے کے ساتھ لگاتار رکھنا چاہتا ہوں۔"

صیب کی لپکیں فرور ہو رہی تھیں..... شادہ اپنے لے آئی اور پہاڑی میں پہنچ گھمٹے ہوئے میں نے دیکھا کہ بک تھیل میں رکھے ہوئے

فیض کے شوری ہو چکے تھے۔ نصف انہار کے سورج کی ستارنگی شعاعیں، روشندان میں سے آ کر تیرے آگے مڑ رہی تھیں۔

بارہ ضاؤں میں، بہار کی خوشبو ہوسے ہوسے پھیل رہی تھی۔

"مستحق اگر اتنا بڑا انسان بھی ہوتا جتنا بڑا فن کار تھا

تو شاید میں اس کا ماتم اتنا ملد نہ کرنا پڑتا۔"

فیض

ایک انوگراف

رفت

خدا و وقت نہ لائے

اُس نے آہستہ سے ناہید کی آنوگراف ٹپک اٹھائی۔ صفحہ پلٹے۔

..... یہ کیا..... یہ کیا.....

ہمیں ماضی اُس کے سامنے تاج اٹھا۔

اُسے کس قدر رعایت تھی۔ عقیدت بھی نہیں بس فیض کے ایک ایک شعر پر تہم میں نیل سی لہر دوڑ جاتی... حبيبِ شہپر
اُس کا کلام پڑھا کرتی، بلکہ فیض کا ابتدائی کلام تو اسے زبانِ یاد تھا۔

فیض تمہارا کیا محتاج ہے ؟ .. اس نے شہر چلتے ہوئے بار بار اپنے آپ سے پوچھا تھا ۔۔۔ اور ہم میں اُمتیق سوئی ہر لمبے لمبے بڑا نشیلا سا جواب دیتا تھا

کیا مین بھی کسی سے محبت کرتا ہے؟ کسی کو چاہتا ہے؟ وہ کون ہے؟ وہ کیسی ہے؟ کہتے ہیں ہرشاغر کی ایک مہمو بہ ہوتی ہے جسے وہ چاہتا ہے جس کی عیادت میں وہ شکر کہتا ہے۔ مجرود فراق کی ہی تڑپ تو اسے سوز میں ڈبے ہوئے شجر عطا کرتی ہے۔ وہ مجرب وہ کون کم کثرت ہے جو اس کے قریب نہیں آتی۔ اُسے تڑپا ہے یہ کس کے ریسپے بونٹ اور حسین رنگیں مانگتا ہے او جو فیض کی قیہ کیا پتہ۔ تیرے لئے تو خود کسی کا حق بنے قرار سا ہے۔ وہ خود ہی شرم کا اس ریلے میں چرو چڑھتا ہے جس میں اور بس صفے پر مین کا کلام چھپا ہوتا۔

پھر ایک بابا ایسا بھی ہوا۔ اسے فیض کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا.... تمہارا دل جسے چاہتا ہو، تصور ہی تصور میں جسے کہتے ہیں لکھا ہو.... جب وہ عین تمہارے سامنے آجائے تو پھر.... ہائے یہ دل چاہا اس بے شکم طریق سے کیوں ڈھول بیٹھا ڈالتا ہے.... اور شکم کی ساری لغانت، ساری ہبک، قطرہ قطرہ بن کر خندے پیچھے کا روپ یکدم دھار لیتی ہے.... وہ کبھی نہ پائی۔ اب تک سمجھ نہیں سکی۔ شاعر اس پر وہ کالج ٹرینٹ لائے تھے۔ لڑکیاں مری مٹی تھیں.... اس نے اپنی ٹوکراف ایک سنجائی اور فیض ملک جانے کا راستہ تلاش کرتی رہی۔ مینوہ ختم ہو گیا۔ فیض کے گرد ڈھیر ساری آؤگراف ایک نظر آئے تھیں۔

ہیں کہ طرح بڑھوں — اس سے کس طرح کہوں وہ تو جلنے کو تیار ہے کیا میری یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوگی — پھر وہ دھیرے دھیرے آگ بجی یہ تاخیر میں اور یہ بڑس شاید میری مدد کر دیں تم دوڑ کیوں کھڑی

ہو۔۔۔ آگے آجاؤ ناں۔۔۔ فیض! ایس وچاری لوں وی کچھ دے۔۔۔ اہمہ تے بڑی اداس اور اس کھنوتی ہے اس نے اس شفقت جبری وار کی طرف دیکھا۔۔۔ پھر بے پرسکون بٹ اور مکہ بٹھیں خصوص نہیں فخر۔۔۔ آؤ۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ اس نے بڑھ کر آؤ گراف بک فیض کو ختم دے۔۔۔ اتنی اتنی سی باتوں پر یوں۔۔۔ یوں اور اداس نہیں ہوتے کہتے ہوئے انہوں نے کچھ کھنا اور آؤ گراف بک واپس کر دی۔ شکر ہے کہتے ہوئے جیسے اس کا سارا جسم کانپ گیا آنکھوں میں جذبات کی ایک دنیا امد آئی۔۔۔ وہ دوسری بار پٹی اور فیض کے دوست کا شکریہ ادا کر کے واپس آگئی۔۔۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس نے فیض کی تیر کا سامنا کیا۔

• خدا وہ وقت نہ لائے کر سو گوار ہو تو۔۔۔

اس کے قدم ڈمک گئے۔ جذبات قطرہ قطرہ بن کر روئیں روئیں سے پھوٹنے لگے۔

”یہ تم نے دعا دی ہے۔۔۔ یا۔۔۔ کیا تم نے میرے کانپتے ہوئے جسم اور سہمی اور ناخوش نظروں سے کچھ سمجھ لیا۔؟ کیا تم نے جان لیا کہ میں وہ ہوں جو تمہارے شعروں میں رہتا ہوں جس نے ان کے پوچھا کرتی ہوں۔۔۔ کیا تم اب بھی اچھاؤں میں من اور سر مانگا کر دگے؟ اسے تم فائز لیں نہیں کرتے؟ تم نئی قدریوں کے حامی ہو۔ تم نے نئے تقاضوں کو محسوس کیا ہے۔۔۔ تم ان شہر الی کی طرح اپنی محبوب کو سات پردوں میں چھپا کر صرف اپنے لئے ہی محدود رکھو گے!“

ادوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ مجھے سر عام نہ پاؤں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس نے دیر سے آؤ گراف بک کو گھڑی موئے پکھ کاغذ کو ہونٹوں سے اگایا۔

فیض نے آخری عورت سے شادی کر ڈالی۔۔۔ یہاں کی لڑکیوں میں غم و غصہ کی اور دھڑلی۔۔۔ یہ پنہ پڑے کھیل لوگ قاب ہوتے ہیں تو بار بار لڑکیوں کو قبولیت کا شرف بخشتے ہیں۔۔۔ مہجرت! اس دن اس نے اپنی آؤ گراف نکال کر دکھی۔

”اتنی اتنی سی باتوں پر یوں یوں اور اداس نہیں ہوتے۔۔۔ فیض نے کہا تھا۔۔۔ یہ تو فیض کی اتنی ہی بات ہے۔“

بات۔۔۔ شاعری بیوی مٹنا تو آسان بات ہے۔ بڑا مرتبہ تو محبوبہ کا ہونا ہے۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس نے جی جی جی میں اپنے غائب ہوتے ہوئے ذہن کو تس دے ڈالی۔ اچھا ہوا۔ ہلکی دھڑکی کو بیوی نہ بنایا۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ اگر وہ بھی میری ہی دھڑکی۔ بار بار دھڑکی ہوتی تو میں مادے ثابت کے خود کشی کر ڈالتی۔

اگر وہ مکی بیوی سے شادی کرتا۔ تو پھر یہ فکر کون لکھتا ہے یہ بے نیکم۔ کو اپنے فائدے کوں ستار فیض محبت ہے یہاں کی محبتیں فنا ہو گئیں۔ مشرقی محبت تو مشرقی لہجہ طرح ذراستے دباؤ میں آتا اور تہی ہو جاتی ہے۔۔۔ اس نے فیض کی بات اور تصویر اپنے الہم میں لگا ڈالی۔

فیض کی شاعری کی عرصہ کی زندگی بھی قدم قدم پر مٹی جاتی گئی۔

فیض کی اپنے ملک سے وابستگی پر مٹی گئی۔۔۔ اسے اپنے قدم اور چوں میں بہن لگا دی۔۔۔ مل گیا۔۔۔ خیرات اور بدعت۔۔۔ عہد ہے۔۔۔ مٹنے کا وقت ہے۔۔۔ یہ مٹنے کا وقت ہے۔۔۔ اس نے یہی کوئی نہ کوئی۔۔۔ وہ مٹنے کا وقت ہے۔۔۔ مٹنے کا وقت ہے۔

یہ فیض چاہا کرتے تھے کیا تھے؟ - نری بکواس - یہ سب شام کا وہ نہیں کسی - یاسی لیڈر کا ہے - فیض کو ریاست

نہیں تھی۔۔۔

فیض محبت میں نہیں جاتا تھا۔ فیض کے پاس کوئی الجھن نہ تھی - کوئی رقیب نہیں تھا اس لئے اس نے ملک کے ایک شخص پر لہ لکھ کر پانچوں میں الجھ کر رقیب و محبوب کا جھول پیدا کر لیا۔

یہی توجیدِ نظر ہے - اب کیا فیض پرانے شاعروں کی طرح جالی دار چولی اور مواف بندھی چوٹی کے قفسے نہ سٹاتا - بھی دیکھو - فیض کی شاعری میں بھی دیکھتے ہوئے شاعروں، مرثیہ گوؤں اور نیم خواندہ فضاؤں کا ذکر ہے مگر وہ ان میں محو ہو کر اپنے گرد و پیش کو بہت نہیں - وہ محبوب - ست حضرت چادیت ہے

پھر سے پہلی سی محبت یہ ہے محبوب نہ مانگ

صاف ظاہر ہے وہ محبت کرتا بھی ہے لڑنا جتنا بھی بلکہ جتنا بھی ہے کہ محبت کرے - مگر اس کے ذہن کے خوبصورت خیالوں پر وہ تصویریں چھ جاتی ہیں جو اس کی نگاہ میں دیکھتی ہیں - اُتر آج وہ ان سب سے نظر ہٹا کر محبوب کے جسم سے لطف اٹھاتا ہے وہ اسے تو دل آئے والی نہیں اسے یہ دیکھنے کی جوتیہ ہونے روم کی طرف سے انھیں ہونڈے اپنی بالری بکھاتا تھا - ہمیں خوشی ہے فیض نے اپنے جیم سے بغاوت کر کے اپنے ذہن پر قبضہ کر لیا - اپنی محبوب کو مومنوع سخن دے کر اسے بولنا بھی سکھا دیا، اور اسے چند روزہ درو کی امید دلا کر شیشیوں کے میسے کے نہ ہونے کا بھی یقین دلادیا - فیض نے اپنی محبوب کو کبھی دعوے میں نہیں رکھا۔

یہ دیکھ کر کون کافنی باؤس اور نہ ہی بیٹنگوں میں فیض کا تذکرہ کرتے تو وہ جی ہی جی میں خوش ہوتی - یہ فیض کو لوگ کس کس - رپ میں کس کس رنگ میں ڈھان رہے ہیں - اس نے انہی دنوں فیض کی ایک تصویر اپنے ڈرائنگ روم میں لٹکائی تھی - اور اپنے ملنے والوں سے فیض کا تذکرہ جتنی شان سے کرتی - میں نے ان کے فلاں شعر، یوں داد دی - فلاں جگہ یوں کہا: اپنے شعروں کی ہوئی باتیں وہ محفل میں سناتا کر لوگوں پر رعب ڈالتی - اور پھر انہیں پکا یقین دلانے کے لئے اپنی آؤگراف بک دکھا دیتی - فیض نے کتنے پیار سے لکھا تھا - وہ کہتے تھے ہمارے نوجوان طبقہ کو ہماری نئی نسل کو بہت کچھ کرنا ہے - ملک و مائیں میں انقلاب لانا ہے - میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہم لوگ آپ کی پارٹی میں شامل ہوں گے - وہ ایسی باتیں سن کر رات گئے دیر تک خود ہی سوچتی - اب اگر فیض ملیں - اوجوں وہ کہاں مل پائیں گے - کاش فیض! تم نے آخر تیرا کی طرح اپنی محبوبہ کا نام سے دیہ جوتی - ہم میں اپنا جوتی تھی - مگر کھلتی - اور اپنی بی بی زندگی کے اس کچھ کچھ سے یوں خوں کی گھٹن سے خاست پائے کو کبھی بھی تمہارے شعر دن کو پڑھ کر واقعی کسی کر لیتی - مگر تم تو بس غم کے شاعر ہوئے پھر جا رہے ہو، تم اپنی محبوبہ سے کیوں نہیں کچھ مانگتے - تم اس کے قریب آن کر بھی اسے یہ کہیں - آدائیں - سناتے ہو کہ وہ حیران حیران ہی ہو کر چہرہ کو اپنا سمجھتے جاتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ میں کچھ نہ پا کر خاموش ہو جاتی ہے - فیض!

مگر یہ چند روز کی تسلی دے کر فیض کو زندان کی شام منانے نکل گیا۔

یہ کیا - یہ وہ کاپ اٹھی - اتنے فمد دار اضر کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ڈرائنگ روم سے فیض کی تصویر اتار کر وہاں چٹائی کا فرش آویزاں کر دیا۔

فیضؔ میں نے توسو جاتھا۔ آخر شہر لائی کی سلی کی طرح لگی سے نکل کر۔ میں جنازہ روک کر اس پر پھول ڈالوں گی اور برقعے میں لپٹی لپٹی دوڑ چلی جاؤں گی۔ لوگ کہیں گے! فیض! جس سے کیسا ہونٹ اور عریں باہیں نکلتا رہا۔ جس کے حسن کو سام اور پسے چند روز اور کی تسلی دیتا ہوا اپنے دل کی بیانی کو پرسکون ہونے کا مشورہ دیتا رہا۔ یہ وہ تھی۔ وہ آئی تھی۔ وہ فلاں لڑکی تھی۔ نہیں۔ وہ فلاں عورت تھی۔ اس کی ماں ہے۔ نہیں فلاں بڑے آفسیر کی بیوی تھی وہ اس سے عشق کرتی رہی۔۔۔ فیض کو اس کا پتہ تھا۔۔۔ زندگی میں دونوں حالات کے ہاتھوں مجبور رہے اور موت کے بعد۔۔۔ موت کے سامنے تو ہر فرد مجبور ہوتا ہے۔

مگر فیض تم تو چھتے جی۔۔۔ چھین لئے گئے۔ تمہیں انگریز بیوی کے ساتھ دیکھ کر دل میں رشک کا جذبہ ابھرتا تھا۔ مگر تمہیں اب اتنے بڑے رقیب کے قریب میں دیکھ کر تو ہول اٹھتا ہے۔ مگر۔ اچھا ہوا تم۔۔۔ زنداں کی صبح و شام سے بہل گئے۔ زنجیروں میں تمہیں آہٹ۔ لغے اور دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

کئی بار وہ فیض کے اس دوست کو دیکھتی۔ اس کا کلام سنتی اور مسکراتی۔ اب تو وہ واقعی بزرگ ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ اور میں۔۔۔ اس نے اپنی نادان عمر اور نوان آنسوؤں کی گواہ اس آؤگراف بک کو کہیں درمیانے کسی فالتو کبس میں ڈال دیا۔ زندگی خراباں چلتی پنی گئی۔۔۔ اب تو اپنی چکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ کالونٹ اور سینٹ جوزف میں پڑھنے والی لڑکیاں۔ اردو ادب کو کیا جانیں۔ مگر۔ بید کو تو فیض پسند تھا۔ اس کے لئے اس دن "فلڈر" پڑھا ہوا تھا۔ سینا کا کہی نے اپنے حالات لکھے تھے اور اس نے فیض کے چار شعر عوں سے آواز کیا تھا۔ ناہید نے یہ فہم سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

جی۔ دیکھ۔ مینا کا رہی نے لکھا۔ اپنے شعر چنے میں فیض کے۔ کتنے سوئے۔ بالکل اسی ریڈروزی طرح جو مینا کا رہی نے پڑھا ہے۔ نمی آئی! ایک فیض اینڈ ہر پونٹ ہی ویری پرچ۔۔۔

اس نے ناہید کے کال تمہیں دینے۔ پگلی۔ کل کی کی۔ فیض کو کیا سمجھ پائے گی۔ میں بھی اسے نہیں سمجھ پائی جو اس کے ساتھ عمر اور زندگی کی منزل میں لے کر چلی آ رہی ہوں۔ فیض۔ وہاں کا شاعر قرار دیدیا گیا۔ جدید تقاضوں کا علمبردار کہلایا ترن پسند کیا گیا۔ اور پھر یہی نئے احساسات یہی جدید تقاضوں کی پسندیدگی اور پرانے نظریوں سے بناوٹ۔ ات کمریسٹ بنا کر قید خانے تک لے گئی۔ اور میری پی ناہید اس کے رومانک شعر عوں کو پسند کرتی ہے۔ اس نے جھک کر سینا کا رہی والا نظم پڑھا دیا۔

لے گئے ساتھ میری خوشنودی کتاب

اس میں تو میری بہت تھی تصویر میں

ہوں۔ واقعی۔ وہ ہنس دی۔

فیض تو بول رہا ہو گیا اب۔۔۔ اب تو اس کی شاہری پر بھی غزاں آ گئی۔ لینن پراؤ تو لے جی گیا۔ مگر حکومت اسے کیوں کراہانت دے گی۔ یہ بھی حکومت کی پالیسی ہے۔ حکومت کی پالیسی۔ وہ مسکراتی۔ وہ تمہیں لوگ کن کن رنگوں میں رنگتے اور کیسے کیسے روپ دیتے ہیں فیض۔!

آرٹ کونسل سے واپس آن کر ناہید نے آؤگراف بک میز پر ڈال دی تھی اور چپ چاپ اپنی کتاب لے کر بیٹھی

پڑھ رہی تھی۔ وہ بہت تندر کے آرٹ کونسل گئی تھی۔ فیض کی شام کے پروگرام میں شرکت کرنے۔ اچانک ٹیلی فون کی گنگنی پئی۔ اور وہ اس کی طرف بڑھی۔ تاجمہ کی ہسپتال کا فون تھا۔ وہ اسے بتا رہی تھی۔

”ہاں۔ ہاں۔ میں پاپا کے ساتھ گئی تھی۔ ارے سنو تو۔ ایک شخص ملل کاکرتا پاجامہ پہنے تھا۔ سگریٹ پر مگر پٹے جا رہا تھا۔ ہاتھ ہاتھ کر بات کرتا تھا۔ یہ فیض تھا۔ مایوسی نہیں آگے سنو۔ پروگرام ختم ہونے پر میں نے پاپا سے کہا کہ مجھے ان کا آؤگراف چاہئے۔ وہاں ایک صاحب اور تھے۔ سر جپکنا ہوا۔ سر کے گرد سفید بالوں کی جھانر۔۔۔ پانکھ لارڈ ہسٹنگز کی طرح۔ مگر کتا پاجامہ پہنے ہوئے۔ پاپا نے اپنی طرف لے۔ اور مجھے فیض کے پاس لے گئے۔۔۔ یہ وہ وحید کی لڑی اسے۔۔۔ فیض۔۔۔ ایوں ڈرا۔۔۔ ابھی وہ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ فیض نے میرے کندھوں کے گرد بانہ لٹا کر کہا۔ اوسو۔ تو پھر تو یہ اپنی ہی بیٹی ہے۔ ناؤ بیٹی۔ میں بھی لکھ دوں۔ بیٹی! اتنا غیر شاہانہ لفظ سن کر میں کانپ گئی۔ وہ پاپا سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ارے جی پاپا سے پراسنے کلاس فیلو میں۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ وہی دوست۔ وہی آؤگراف بک۔ اب بتاؤ۔ کیا لکھو یا فیض سے؟ اس نے آؤگراف بک دیکھی۔ خداوند وقت نہ لانے کہ سوگوار موٹر۔

میں!۔۔۔ ارے فیض! تم فلمی میہ پئی عرج کبھی پورے نہیں ہو گے کیا! یہ تمہاری جوان شاعری کا رنگ ہے یا بچا پلے کا رنگ۔ وہ چپ چاپ آؤگراف بک پکڑے جیسے کسی شعلہ کی سپک اپنے ارد گرد محسوس کرتی تھی اور سارے لئے پراسنے جذبات فطرہ تغرد بن کر اس کی ریشمی فیض میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔

نشا میں تری نگلیوں پہ (صفحہ ۴۷، ۴۸)

میں وہی پیدا آسمان ہے۔ بھروسہ قید کیسے ہوں۔

ایک عمر بیت چلی ہے۔۔۔ ان آنکھوں نے کتنے انقلاب دیکھے ہیں۔ کبھی کبھی احساسِ موت ہے کہ میں تھک گیا ہوں۔۔۔ یہ شکنہ اگرچہ مجھے زندگی سے بے بسی و حزن نہیں لے جاتی۔ اس لئے کہ میرے اندر سبز و آواز شاہنشاہ ہے۔ دورِ عیش و بخت ہے گا، کیونکہ اس کے گیت امر ہیں۔ میں اس دنیا میں نہ بھی رہوں تب بھی وہ روح ضرور زندہ رہے گی۔ اور گلی گلی اور ٹرنگٹوڑے گئے جن نے صد وقت اور دمن سے محبت کی خاطر کبھی سقر اٹھ کر حرج نہ رہا۔ اور کبھی فیض احمد فیض کی حرج دندان میں لبرکی۔

تاریکے راہوں میں مارے گئے (صفحہ ۵۰، ۵۱)

مگر اس سے کیا کیا ہوا ہے۔۔۔ اس نے ٹھوکی ہے بہت دور اندھیرے میں دیکھا۔

تو گمیری ہی ہو جائے۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی سکراہٹ آگئی۔

دنیا کے غم پونہی رہیں گے

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور بہت دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کھڑکی کھلی رکھے یا بند کر دے۔

کنہیا لال کی پور

تنہائی
(پیر وختی)

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں دین،



فون پھر آیا دل زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
دھل چکی رات اُترنے لگا کھجور کا بھار
کپنی باغ میں لنگرن لگے سرور چراغ
تھک گیا رات کو چلائے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افردم کے بوسیدہ دارغ
یا داتا ہے مجھے سرمہ دینا لہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو وہیں لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

سید ابوالبرکات نظمیں

پاس رہو (پسینہ ڈیے)

تم مرے پاس رہو۔ میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس ہو،

تم ذرا دودھ ہو
میرے قاتل، مرے ہمد، میرے پیارے سگریٹ
جس گھڑی دوست خریدیں سگریٹ
چند سکوں کا ہودے کے خریدیں سگریٹ
"کیپٹن" کوئی سنہ اور کوئی "سیئرز" نے
"ڈائمنڈ" ہی کوئی ہونٹوں میں دیئے
بڑھ کے اخلاق سے بیکٹ کو مری سمت بڑھائے
تم ذرا دودھ ہو
میرے قاتل، مرے ہمد، میرے پیارے سگریٹ
"جب کوئی بات بنا کے نہ بنے"
جیب سے اوروں کی بھی جیب کوئی سگریٹ نہ ملے
"محنت سگریٹ" کی امید نہ برائے
مجھ کو رہ کے بجا ہی آئے
اپنا سکیٹ ہی مرے ہاتھ کی رہ تیسے لے
تم مری جیب میں انگڑائی لو
لشہ کام دوہن کی مجھے دعوت دے دو
ہاں یہی وقت ہے پیارے سگریٹ
میرے قاتل، مرے ہمد، میرے پیارے سگریٹ

گلڈاشاعت گھر کی مطبوعات

کمانے	افسانے
۴/۵۰ شیخ عقیل پنجابی وک کہانی	۵/۵۰ باجہ مسرور تیسری منزل
ڈرامہ	۵/۵۰ غریب مستور بھٹے ہارے
۴/- فیصل شب میرزا ادیب	۵/۵۰ انور سورج بھی تماشائی
بچوں کے کتابیں	سنادلے
۹۰ پیسے شہزادی کنول کلی بیگم عصمت جعفری	آبلہ (آدم جی ادبی انعام یافتہ)
۴/- سائنس کے دلچسپ تجربات نجات سلطانہ	۸/- رضیہ فصیح احمد
۴/- ایک تھنا پور انور عنایت اللہ	۴/- اے حمید چائے والا
۴/- لکڑہا پور رحمان مذب	لال چادر سید ولی اللہ
۴۰ پیسے درخت کے بچے مسلم فیاضی	۲/۵۰ ترجمہ: یونس انمر
۲ روپے سیر پاکستان رضیہ فصیح احمد	
زیر طبع کتابیں	تنقید
قصص الاسلام پرنسپل ابراہیم خان	اردو میں سوانح نگاری دواؤد ادبی انعام یافتہ
پاکستان منزل بہ منزل شریف الدین پیرزادہ	۴/- ڈاکٹر سید شاہ علی
ظلمت نیمروز (ادبیات پر انسانوں کا انتخاب)	
مرتبہ امت ز شیریں	
(بچوں کے لئے)	
۴/- غلام عباس چاند تارے	
۳/۵۰ سائنس نامہ	

ملنے ناپکتے

گلڈ انجمن کتاب گھر - بالمقابل پوسٹ آفس
وکتوریہ روڈ - صدر - کراچی

ڈیلائیٹ
انڈس

بلیڈ
عمدہ ادپڑست
شیو کے لئے

DELIGHT
INDUS

DELIGHT
INDUS

پاکستان بلیڈ اینڈ سیٹریز
اے۔ اے۔ ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای، مید آباد

انکا مارٹن بکر

THE FILM for
ALL OCCASIONS

Agfacolor

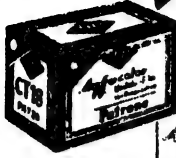
TRANSPARANCIES

35 M.M. CT. 18

MOVIE FILMS

CT. 13 TYPE S

8 M.M. & 16 M.M.



AVAILABLE FROM
ALL AGFA DEALERS



PROCESSED IN KARACHI

AGFA PAKISTAN LIMITED

KARACHI

LAHORE

CHITTAGONG

PRODUCTS OF: AGFA GEVAERT AG, LEVERKUSEN (W. GERMANY)

حمید کاشمیری کے شاہراہ عظیم جیسے
عظیم انسانوں کا مجموعہ

دیواریں

شائع ہو گیا ہے
تقریباً تین سو سو سات - آئینہ کی چھپائی
قیمت پانچ روپے
ملے کا پتہ

مکتبہ ماحول | اسٹینڈرڈ بک سٹال
بہادر شاہ قاری | الفنسٹن اسٹریٹ
بندر روڈ کراچی | صد ر کراچی

SUN GLASSES
in a variety of colours to match
modern Ladies Dresses



EASTERN OPTICAL CO

10, N. E. ROAD, KARACHI

سٹیزن

گھڑیوں کا

شاگ پرفکٹ

حال ہی میں

کراچی ہوٹل انٹرکانٹیننٹل

کی استقبالیہ پارٹی میں

کیا گیا جس میں سٹیزن

گھڑیوں کا ۱۰۰ فٹ کی بلندی

سے ہیل کا پٹر کے ذریعے

پھینکنے کے متوازن مددے

سے لٹکایا گیا، اور سب

گھڑیاں ۱۰۰ فی صدی

کامیاب رہیں۔

شاگسے پروف کے علاوہ دیگر

خصوصیات کے کامیاب تجربوں

سٹیزن نے گھڑی کو دنیا بھر میں

مقبول ترین گھڑی قرار دیا ہے

سٹیزن

صحیح وقت مپاری

گھڑی



ایکسپریس وائچ کمپنی لمیٹڈ

بندر روڈ کراچی - فون ۲۳۰۳۳۶

مبارک ٹی ٹوشرٹ

اچے کے لئے ایک باوقار شرٹ



اچے کے رفیع کا بہترین مصروف

شرٹ، بش شرٹ

جسڈیٹرز اور انتہائی دلکش و جاذب نظر
لافٹی فلیکس کالر سے مزین

کائرڈ اور پولیسٹر فیبرکس کے
تیار کنندگان

مبارک سکھائون کراچی

ہرانچہ افینڈے

۱۲۔ رحمت مارکیٹ۔ انارکلی۔ لاہور

ڈبلیو ڈی ولس اینڈ کمپنی

دُنیا کے مندرجہ ذیل مشہور اداروں
کے پاکستان میں واحد نمائندے

- ۱۔ ہوڈرائیڈ اسٹیشن لمیٹڈ
- ۲۔ جوناکھن کریپ لمیٹڈ
- ۳۔ جارج۔ جی۔ ہیرپ اینڈ کمپنی لمیٹڈ
- ۴۔ ہمیش سہیل لمیٹڈ
- ۵۔ ہینڈ اینڈ ہینڈ کمپنی لمیٹڈ
- ۶۔ ہیمپس پمپنگ گروپ
- ۷۔ کراسبی لاک وڈ اینڈ سن لمیٹڈ
- ۸۔ ای اینڈ ایس لونگسن لمیٹڈ
- ۹۔ وکٹر گولڈنر لمیٹڈ
- ۱۰۔ انگلش یونیورسٹیز پریس لمیٹڈ

جوٹائبر سے ایسے کتابوں کے درآمد کے لئے
جو ملک کے ترقی کے لئے ضرور درج ہیں ہماری
خدمات اور مشوروں سے فائدہ اٹھائیے

ڈبلیو ڈی ولس اینڈ کمپنی

۶۔ کرشنا مینشن۔ انور ایٹی روڈ۔
صدر۔ کراچی۔ ۵۳۔ فون: ۵۱۴۶۱

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی



نقشہ ہر ماہ اردو کے معیاری رسائل سے افسانوں
عزلوں اور نظموں کا انتخاب پیش کرتا ہے

نقشہ کوپاک و ہند کے مشہور ادباء اور
مستند رسائل کا تعاون حاصل ہے

نقشہ کی ایجنسیاں مغربی اور مشرقی پاکستان
کے ہر بڑے اور چھوٹے شہر میں قائم ہیں

نقشہ ادب کے خدمت کرتا ہے
آپ نقشہ کی سرپرستی کیجئے
نقشہ خریدیے ————— نقشہ میں اشتہار دیکھئے

فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی

ماہنامہ نقشہ کراچی

ہمارے سب سے بڑے قوموں میں سے ایک کے فکرانگیز کتاب ہے

پاکستانی کلچر

قوموں کے کلچر کی تشکیل کا مسئلہ

از:۔ جمیل جالبی

○ یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت، اپنی منہوی خوبی اور فاضل مصنف کی خوش دلانہ کاوش کے لحاظ سے بڑی قابل قدر

تصنیف ہے۔ اس کی زبان اس کا اسلوب بیان اس قدر شگفتہ، سلیس و دلکش ہے کہ وہ ایک دلچسپ داستان

معلوم ہوتا ہے۔ — نیاز فتح پوری

○ اس کتاب میں بے شمار مسائل ایسے ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ نذاکرے کی یہ کتاب تعلیم یافتہ لوگوں کو بیدار کر دے۔

— ڈاکٹر سید عابد اللہ

○ پہلی مرتبہ اس ملک کے ایک دانشور کو یہ سادت نصیب ہوئی کہ وہ اس مشکل مسئلہ پر ایسی مدلل اور تفصیل

بحث کرے۔ یہ کتاب خیال و اظہار کی قابل تریف مثال پیش کرتی ہے۔ — ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

○ جمیل جالبی صاحب نے جس طرح مسئلہ کی پیچیدہ گیوں کا تجزیہ کیا ہے، وہ اپنی جگہ نہایت سنجیدہ اور

ہوش مندانہ ہے۔ — محمّد حسن عسکری

اس دور کی ایک بہترین کتاب

جسے ۱۹۶۵ء کا داؤد ادبی انعام بھی ملا

عمدہ سفید کاغذ ○ پراساز ○ مضبوط جلد ○ خوبصورت گروپوش کے مرتب

قیمت:۔ آٹھ روپے

تاجران کتب دلائیروٹیوں کو خاص رعایت — فہرست کتب بلا قیمت — محصول ڈاک بذمہ خریدار

مشافہ یکے ڈپو

نزد اردو کتابچہ ○ شیلڈن روڈہ کراچی

مکتبہ افکار کے

خوب اور خوبصورت کتابیں

★	چاندی کا گھاؤ	نیا ناول	کرشن چندر	۹/۰۰
○	دھواں دھواں سویرا	"	انور عظیم	۸/۰۰
★	ایک عالمی سمندر کے کنارے	"	کرشن چندر	۶/۰۰
○	ایک عورت ہزاروں جانے	"	"	۵/۰۰
★	سڑک واپس چاہی ہے	"	"	۶/۷۵
○	باؤں پتے	"	"	۶/۵۰
★	ایک خوشبو اڑی اڑی سی	نئے انسانے	"	۶/۲۵
○	کالا سورج	انسانے	"	۴/۵۰
★	اک بوند بہکی	ناول	جوگندپال	۴/۵۰
○	تاریخ صفت سماوی	اسلامیات	پروفیسر قلاب علی	۵/۰۰
★	معارف الدین المعروف بـ	اسلام اور سائنس	"	۴/۷۵
○	میرے خوابوں کی سرزمین - مشرقی پاکستان	سفر نامہ	صہبا لکھنوی	۴/۰۰
★	ہتھیاب و قریب	تفہیم	جمعی احسن	۵/۰۰
○	ادب و ادبگی	"	"	۷/۰۰
★	نبض دوراں	مجموعہ کلام	پروفیسر شورش علیگ	۶/۰۰
○	سی حنی	اردو نظم	فتا صدیقی	۴/۵۰
★	جوش نمبر	قیدی ایڈیشن	سفید کاغذ مع ضمیمہ مرتبہ صہبا لکھنوی	۲۱/۰۰
○	عقیدہ نمبر	شخصیت و فن	مرتبہ صہبا لکھنوی	۱۰/۰۰
★	فیض نمبر	"	مرتبہ صہبا لکھنوی بخش صدیقی	۱۲/۰۰
○	عجاز ایک آہنگ	"	دوسرا ایڈیشن باغداد زیر طبع	۱۲/۰۰

فہرست طلب فرمائیے

مکتبہ افکار

دبستان روڈ، کراچی

ہر وزڈم گھڑی کی

شاک پروف، واٹر پروف کی گارنٹی دی جاتی ہے

ہمارے ہاں ہر قسم کی بہترین گھڑیاں اور ٹائم پیس
مثلاً ویسٹ اینڈ، فیور لیوبا، دومو، کیمن
وزڈم، لاریکس، آل سائن وغیرہ
بکفایت فروخت ہوتی ہیں،

بہترین کاریگروں کی نگرانی میں تسلیم شدہ مرمت کی جاتی ہے!
لوڈو دینے پر ممالک بذریعہ پوسٹ پارسل بھی روانہ کیا جاتا ہے

وزڈم واچ کمپنی

بندر روڈ، کراچی ۷



شخصیت و فن پر

افکار

کی چند دستاویزی اشاعتیں ہیں

- جوش نمبر (پہلا ایڈیشن) ۱۹۶۱ء
- جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن - مجلد) ۱۹۶۲ء
- حفیظ نمبر ۱۹۶۳ء
- فیض نمبر ۱۹۶۵ء

۱۰ سڈہ پروگرام

- عبدالرحمن چنڈالی نمبر
- کرشن چندر نمبر
- شاہد احمد دہلوی نمبر
- احمد ندیم قاسمی نمبر

مشہور شاعر عبدالعزیز خالد کی

(آدم جہانم یافتہ)

مائیت نازت تخلیق

فارقلیط

۱۳۸۲ شعروں کی مہسم قافیہ نظم

قیمت ۸ روپے

گلدانِ سخن کتاب گھر

وکتوریہ روڈ - صدر کراچی

મસૂરી

MUSSOORIE

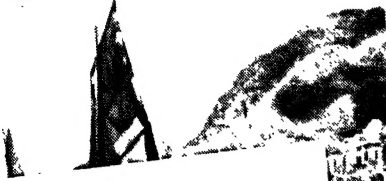
यह पुस्तक निम्नांकित तारीख तक वापिस करनी है।

This book is to be returned on the date last stamped

[illegible]

مشہور عالم کیپسٹن

جسے صاحب ذوق حضرات ساری دُنیا میں پسند کرتے ہیں جس کا ہر کیش لطیف اور تسکین بخش ہے۔ اپنی اعلیٰ کوالٹی کی بدولت پچاس سے زائد ملکوں میں مقبول ہے۔



اخراجت س. 1007
ACC. No. 1007
1.4730
کتاب س.
Book No. 1007
کلاس س.
Class No. 1007
لکھک
Author.
چاپک
Printer :
Title.

کیپسٹن لندن میں پگ بین کے قریب۔

U 18207
91-43905 LIBRARY
LAL BAHADUR SHASTRI
National Academy of Administration
MUSSOORIE



Accession No.

1. Books are issued for 15 days only but may have to be recalled earlier if urgently required.
2. An over-due charge of 25 Paise per day per volume will be charged.
3. Books may be renewed on request, at the discretion of the Librarian.
4. Periodicals, Rare and Reference books may not be issued and may be consulted only in the Library.
5. Books lost, defaced or injured in any way shall have to be replaced or its double price shall be paid by the borrower.

Help to keep this book fresh, clean & moving

سڈنی جیسے دور دراز شہر میں باسانی دستیاب

بین سگریٹ کے پکیٹ کی قیمت ایک دہیمہ ۶۰ پیسے اور دس سگریٹ کی

SORS TO W.D & H O WILLS, BRISTOL & LONDON

PGC-134